بسم اللہ الرحمن الرحیم

المیزان کی تاریخ ساز پیش کش

صوفیہ نمبر

جلد اول

ترتیب

پروفیسر مسعود انور علوی

صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی

سجادہ نشیں خانقاہ منعمیہ، پٹنہ، بہار

قاری محمد میاں مظہری نقشبندی

ایڈیٹر: روزنامہ سیکولر قیادت، نئی دہلی

سید محمد جیلانی اشرف

بانی وامیر صوفی فاؤنڈیشن

محمد شہباز عالم مصباحی

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر انتظام

صوفی فاؤنڈیشن

انڈیا

المیزان کی تاریخ ساز پیش کش

صوفیہ نمبر

جلد اول

ترتیب

پروفیسر مسعود انور علوی

سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی

قاری محمد میاں مظہری نقشبندی

سید محمد جیلانی اشرف

محمد شہباز عالم مصباحی

زیر انتظام

صوفی فاؤنڈیشن

انڈیا

باسمہ تعالیٰ

نام کتاب	:	صوفیہ نمبر (جلد اول)
تصحیح	:	محمد شہباز عالم مصباحی، مولانا محمد ناصر رام پوری، مولانا رفعت رضا مصباحی
حروف سازی وصفحہ آرائی	:	محمد وزیر عالم مصباحی وانظر صدیقی عبیدالرحمٰن صدیقی وعتیق الرحمٰن
ناشر	:	تنویر احمد اشرفی
معاونِ دفتر	:	محمد شمیم
زیر انتظام	:	صوفی فاؤنڈیشن، 1543، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔2
قیمت	:	300/-

۱- صوفیہ نمبر میں شائع ہونے والے ہر مقالہ کے لئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
۲- مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
۳- صوفیہ نمبر کے مضامین وعبارات میں تصحیح کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کہیں کسی قسم کی غلطی راہ پا گئی ہو تو ادارہ کو ضرور مطلع فرمائیں۔ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔
۴- صوفیہ نمبر میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ یا اقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے، بشرطیکہ ماخذ کا ذکر کر دیا جائے۔

مراسلت و زر تعاون کے لئے رابطہ قائم فرمائیں

صوفی فاؤنڈیشن

Command Office:

1543, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-110002

www. spiritualfoundation.org.uk, E-mail: sfindia@yahoo.com

فہرست مضامین

صوفیہ نمبر جلد اول

I	عرض ناشر	تنویر احمد اشرفی	7
II	دو دو باتیں	سید محمد جیلانی اشرف	9
III	حرف اول	پروفیسر مسعود انور علوی	15
IV	تصوف عطر شریعت ہے	سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی	21
V	مطالعۂ تصوف کا مغربی تناظر	علامہ سید محمد حسینی اشرف	23
باب اول	افکار تصوف		27
1	تصوف: ماہیت، منبع، منہج	ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی	29
2	تصوف اور ترک دنیا	پروفیسر سید وحید اشرف	44
3	عالم تمام حلقہ دام خیال ہے	ڈاکٹر سید رقیہ زین الدین	50
4	کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟	مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری	55
5	شیخ نور الدین ریشی کا تصور دین	پروفیسر محمد اسحاق خان	66
6	خواجہ باقی اللہ اور وحدۃ الوجود	حافظ شبیب انور علوی کاکوروی	75
7	اقبال اور تصوف	قاضی عبید الرحمن ہاشمی	87
8	خواجہ میر درد اور تصوف	پروفیسر قاضی جمال حسین	89
باب دوم	اقدار تصوف		97
9	صوفیہ اور انسانی اقدار	اسرار اکبر آبادی	99
10	حضرت نظام الدین اولیاء اور شب و روز کے معمولات	حافظ نسیم اختر	102

انتساب

خانقاہ نبوت کے تربیت یافتہ

اصحابِ صُفَہ

کے نام

فقیر اشرفی

سید محمد جیلانی اشرف
کچھوچھوی

عرض ناشر

تنویر احمد اشرفی
سکریٹری صوفی فاؤنڈیشن

الحمدللہ! تصوف وسلوک پر دور حاضر میں جس قدر کتابیں شائع ہورہی ہیں ماضی قریب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔
وقت وحالات کا شدید تقاضہ ہے کہ سسکتی انسانیت کی فوز وفلاح کے لئے منظم انداز میں اسلام کی اخلاقی، روحانی اور انسانی تعلیمات و ہدایات کو عام وتام کریں۔ خانقاہ نبوت کے وارثان حقیقی صوفیائے کرام کے افکار ونظریات اور حیات وخدمات کو نئی نسل تک پہنچانے کے لئے وسیع پیمانے پر ہمہ جہت ورک کیا جائے انہیں خطوط پر شیخ طریقت علامہ سید محمد جیلانی اشرف اپنی ٹیم کے ساتھ جہد مسلسل میں مصروف ہیں۔
شیخ طریقت کا قول ہے کہ:

''اندھیرے کو کوستے رہنے سے بہتر ہے کہ ایک چراغ روشن کردیا جائے۔''

وہ اکثر کہتے ہیں کہ تخریب کا جواب تعمیر سے، منفی کردار کا جواب مثبت عمل سے، نفرت کا جواب محبت سے دینا ہی اخلاقی اقدار کی علامت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا یہ قول شیخ طریقت کے سامنے رہتا ہے کہ ''اگر کانٹوں کا جواب کانٹا بچھا کر دیا گیا تو ساری دنیا کانٹوں سے بھر جائے گی۔''
وہ کہتے ہیں کہ تخریب وتوہین، نفرت وعداوت کرنے والوں کو دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ بے چارہ مجبور ومعذور ہے کیونکہ برتن سے وہی ٹپکے گا جو برتن میں ہوگا۔
شیخ طریقت کا ماننا ہے کہ اخلاص، اخلاق اور استقامت کے ساتھ راہ مولیٰ میں چلنے چلانے والوں کی دستگیری مولیٰ تعالیٰ کے ذمہ کرم میں ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ طریقت حضرت سید محمد جیلانی اشرف کی تمام تحریکات کو کامرانی نصیب ہوتی جارہی ہے۔
علوم تصوف کی انسائیکلو پیڈیا ''کشف القلوب'' (۶ ہزار صفحات پر مشتمل ۷ جلدیں) جس کی پانچ جلدیں عبادات، معاملات، مہلکات، منجیات اور معمولات صوفیا طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ''تاریخ تصوف'' اور ''تذکرۃ الصوفیا'' طباعت کے انتظار میں ہیں۔
علوم تصوف کا عالمی ادارہ ''جامعہ صوفیہ'' کی پرشکوہ عمارت تکمیل کے مراحل میں ہے۔
ان تمام امور کے انجام دہی کے باوجود شیخ طریقت کا یہی کہنا ہے کہ ۔

مری طلب بھی انہیں کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

زیر نظر ''صوفیا نمبر'' ہی کو لیجیے! حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے میں خود یہ ایک تحقیقی ادارے کا کام ہے، مگر شکر الٰہی کہ یہ بھی تکمیل سے گزر کر تبلیغ کے لئے منصۂ شہود پر موجود نظر آرہا ہے۔
''صوفیا نمبر'' کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے شمال سے جنوب تک کے اہل فکر ونظر ایک جگہ جمع ملیں گے۔ تصوف وسلوک پر تحقیق و ریسرچ کے لئے صوفیا نمبر سنگ میل ثابت ہوگا۔ صوفیا نمبر جلد دوم کی اشاعت آئندہ سال ہی ہوسکے گی— کیونکہ اسے مزید نکھار کر ماخذ ومواد کا منبع بنانے کا ارادہ ہے۔

''صوفیا نمبر'' کی اشاعت میں ان تمامی حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مضامین کی فراہمی، ترتیب وتدوین، کمپوزنگ وڈیزائننگ میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔

حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ صوفیا نمبر میں مضامین، کتابت وطباعت میں کوئی غلطی وخامی نہ رہے، مگر پھر بھی اگر کوئی خامی وغلطی نظر آئے تو براہ کرم صوفی فاؤنڈیشن آفس کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے۔

چلتے چلتے آپ سے گذارش ہے کہ صوفیا کی روحانی واخلاقی وراثت وامانت کی حفاظت واشاعت میں دست تعاون دراز کریں۔ اپنے احباب واصحاب کو راغب کریں کہ ثواب جاریہ کی نیت سے ہماری مطبوعات کو دوسروں تک پہنچائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سیدھے راستے پر قائم ودائم رکھے۔ آمین۔

تنویر احمد اشرفی
سکریٹری صوفی فاؤنڈیشن
1543، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔2

دو دو باتیں

چل میرے خامہ بسم اللہ

خواتین وحضرات! صوفیا نمبر حاضر خدمت ہے۔ صوفیا نمبر کی شانِ وجود پر آگے گفتگو کروں گا، ابھی یہ عرض ہے کہ فقیر اشرفی کے عالمی روحانی اسفار میں ہر رنگ ونسل، قوم وعلاقہ کے لوگوں سے ملاقاتوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ملتی ہے جو روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں وپیچاں ہیں جب کہ ان کے پاس مال وزر، عہدہ ومنصب، حیات دنیا کی زینت اور ظاہری شان وشوکت سب ہے مگر سکون دل اور طمانیت قلب سے محروم ہیں، مادیت کا کمال اور روحانیت کا زوال ہر شعبہ ہائے زندگی میں نظر آتا ہے۔ ہماری نئی نسل اخلاقی وسماجی بندھنوں کو توڑ کر مغربی تہذیب کو اپنانے میں مصروف عمل ہے۔ بیشک تہذیب نو نے انسان کو آزادی تو دی ہے مگر انسانیت کو قیدی بنا کر رکھ دیا ہے۔

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

(علامہ اقبال)

یہ حقیقت آفتاب نصف النہار کی طرح ہے کہ انسانی وجود کے دواٹوٹ حصے ہیں۔ جسم اور روح، دونوں کی سلامتی میں دنیا وآخرت کی سلامتی ہے۔ اثاثہ آخرت اور امانت دینی سے دنیاوی جاہ وحشم وفانی دولت وعزت کے بدلے محروم ہوجانا وقار آدمیت کے خلاف نظام قدرت سے بغاوت ہے، یہ کسی فرد یا افراد کا نہیں قوم وملت کا اجتماعی گناہ ہے۔ قدرت سے بغاوت ملت کا ناقابل معافی جرم ہے جس کا اشارہ شاعر مشرق نے یوں کیا ہے:

فطرت افراد سے اغماض کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

قارئین کرام! سچ تو یہ ہے کہ جب انسان رب تعالیٰ کی بجائے دنیا کو مقصود ومطلوب بنالیتا ہے تو جسم وروح، ظاہر وباطن اور قلب ونظر کی انرجی ماند پڑ جاتی ہے۔ اگر ہدایت ربانی مل گئی تو سبحان اللہ! ورنہ انسان مرجاتا ہے صرف حیوان باقی رہ جاتا ہے، جسم رہ جاتا ہے، روح ماند پڑ جاتی ہے، ظاہر سنورا دکھائی دیتا ہے مگر باطن بکھر جاتا ہے۔ ایسے ہی حیوان کو انسان بنانے اور ان میں شان بندگی جگانے اور بندۂ مولیٰ بنانے کے لیے حکیم تعالیٰ نے انبیائے کرام کا سلسلۃ الذہب قائم فرمایا جس کی آخری کڑی خاتم النبیین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین علیہ التحیۃ والتسلیم ہیں، جن کی ذات قدسی صفات نے مدینہ منورہ میں انسان سازی کا ایسا کارخانہ قائم فرمایا جو صبح قیامت تک جاری وساری رہے گا۔ کیونکہ باب نبوت بیشک بند ہو چکا ہے مگر کار نبوت نہ بند ہوا ہے نہ بند ہوگا۔

یقین جانیے! مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خانقاہ نبوت کا یہ فیضان کرم رہا ہے کہ ہر فرد وبشر، مرد وعورت کا ظاہر وباطن سرچشمہ عبادت بن گیا۔ ایسا طیب وطاہر گروہ وجود میں آیا جس کی سعی پیہم رہی کہ دنیا وآخرت پر حاکم مطلق ہی کی حکمرانی رہے۔ وہ جینے کے لئے عبادت نہیں کرتے بلکہ عبادت کے لئے جیتے ان کی بندگی ہی زندگی بن گئی جیسے جیسے قرن خیر جاتا رہا روح بندگی بھی لے جاتا رہا، وقت گزرتا رہا انسانی اقدار میں تبدیلی آتی رہی عبد ومعبود کے رشتۂ عشق حقیقی کی اثر آفرینی ماند پڑتی گئی۔ پھر بھی ہر دور وقرن میں ایسے قدسی صفات موجود رہے ہیں جنہوں نے وراثت نبوی، اخلاق محمدی اور احسان وسلوک کی راہ میں رشد وہدایت کی شمع فروزاں کو بجھنے نہ دیا۔

پاجا سراغ زندگی

حق یہی ہے کہ تصوف وسلوک اور صوفیا نے قرآن وسنت سے مربوط ایسا آفاقی نظامِ ہدایت جاری فرمایا جس کے ذریعہ انسان خودشناسی تک پہنچ کر خداشناسی کی منزل رفیع اور سراغ عظیم پالیتا ہے، اس حقیقت کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اسی سراغ زندگی کو پالینے کے لئے تاریخ اسلامی کے سنہری صفحات گواہ ہیں کہ وقت کے ائمہ ومحدثین، فقہا ومفسرین کسی نہ کسی خانقاہی مردکامل کی بارگاہ میں پیشانی عقیدت جھکائے ملتے ہیں۔ خودشناسی سے ہوتے ہوئے خداشناسی تک کی منزل رفیع تک پہنچنے کا وہ عزم ہی تھا جس نے علامہ اقبال جیسے عظیم محقق ومدبر شاعر وادیب کو مرشد رومی کے قدموں میں لاکھڑا کیا کیوں کہ عرفان نفس اور خودی کی یافت ہی عرفان رب کی نشانِ جلی ہے۔ لہٰذا صوفی کے تربیتی نظام میں ''اپنا تو بن'' پر زور دیا جاتا ہے اور پھر بندہ کے لئے رب کا بننے کی راہ وا ہو جاتی ہے۔

روپیہ کمانے کی مشین

ناظرین محترم! صوفیا انسان کے اندر عمل احتساب اور فکر آخرت کی حرکی قوت کو بالیدہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ انسان میں ایک مسافر کی حیثیت سے جینے کا شعور قائم رہے۔

صوفیا فرماتے ہیں انسان کو چاہیے کہ صرف روپیہ کمانے کی مشین، عیش وطرب کلب اور خواہش نفسانی کا غلام بے دام بن کر نہ رہ جائے۔

مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں مسافر کی طرح جینے رہنے اور بزنس وکاروبار اور بال بچوں کے ساتھ حیات دنیا کے لئے ضابطۂ اخلاق کا پائندہ دستور حیات عطا فرمایا ہے، ہم ان ضابطوں کی بجا آوری ہی کے ذریعہ منزل مقصود تک بہ عافیت پہنچ سکیں گے۔

صوفیا فرماتے ہیں کہ ہر وہ انسان سورہا ہے جس نے اس دنیا کو اپنی منزل سمجھ رکھا ہے کیوں کہ ایسے انسان کے نزدیک سامان موت اور توشہ آخرت کی تیاری بے معنی ہو چکی ہے۔ یہی وہ گم رہی، خود فراموشی اور خودسری ہے جو انسان کو ساری مادی کامیابیوں کے باوجود بے چین ومضطرب رکھتی ہے۔ انسان تو چل رہا ہے مگر منزل مقصود سے بے خبر ہو کر چل رہا ہے، جی رہا ہے مگر بے سمتی کا شکار ہے، صوفی تصور آخرت کو بیدار رکھنا چاہتے ہیں۔ کامیاب ترین زندگی گذارو، مگر اس یقین کامل کو اپنے باطن کا حصہ بنا کر کہ یہ دنیا عارضی کیمپ (Temporary Camp) ہے، آخری منزل نہیں ہے۔ آخری منزل مولی تعالیٰ تک پہنچنا ہے۔

اموال خوب کماؤ طریق حلال پر، اولاد کی اچھی پرورش کرو تاکہ اولاد صالح بن کر ثواب جاریہ کا ذریعہ بنیں۔

الغرض اپنی دنیا کو آخرت کی کھیتی بناتے چلو، اگر ایسا نہیں ہے تو انسان بندۂ ہوا وہوس تو بن جائے گا، بندۂ مولی نہ بن سکے گا۔ اسی نبوی فکر کو صوفی مختصراً یوں کہتے ہیں: **''دنیا میں رہو دنیا کے نہ رہو''**

یہاں بھی علامہ اقبال بول پڑے۔

عیش منزل ہے غریبان محبت پر حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم

شانِ بندگی اور آنِ غلامی یہی ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کا نہیں مولیٰ کا ہو کر رہے، تصوف وسلوک کی بنیاد یہی ہے، شریعت وطریقت کا محور یہی ہے۔

جناب اکبرالہ آبادی کو صوفی نظریات کا کتنا حصہ ملا وہ اللہ کریم جانے پھر بھی ایک جگہ کہتے ہیں۔

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیش نظر یہ ہے طریقت

خانقاہیت یا درگاہیت

میرے عزیز! تصوف وصوفیا کے تعلق سے تقریباً چار صدیوں سے منفی خیالات نے جنم لینا شروع کیا۔ ادھر دو صدی سے وہابی، سلفی تحریک نے تصوف وصوفیا پر اوچھے الزامات کا سلسلہ شروع کیا۔ منفی رجحانات کی جارحانہ تبلیغ واشاعت نے اکابر صوفیا واولیا کی کردار کشی کی منظم تحریک شروع کر رکھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مستشرقین یورپ کے چبائے نوالوں کو بھی ماخذ ومنبع بنانے میں دریغ نہیں کیا جارہا ہے۔ اور اس کام میں مغربی علوم کی دانش گاہوں کے چند فضلا کی اندھی جانب داری اور یک طرفہ مطالعاتی تحقیق سے ''مطالعۂ تصوف'' کے نام پر تصوف وسلوک کو ''شجر ممنوعہ'' بنانے کی سفیہانہ مہم تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف ہماری خانقاہوں، حظیروں اور زاویوں کا حال یہ ہے کہ ع

اللہ رے خاموشی آواز نہیں آتی

زمانہ احسان وسلوک کے نظام تعلیم وتربیت کے حصول کے لئے صدا لگا رہا ہے۔ مشرق ہو کہ مغرب حق جاننا چاہتا ہے۔ نسل نو تک خانقاہی نمائندگی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ کاش! پھر نعرۂ مستانہ کے ساتھ کوئی مرد حق آگاہ میدان عمل میں آ کرامت کو بیدار کرتا کہ۔

کیوں رضا آج گلی سونی ہے

اٹھ مرے دھوم مچانے والے

بندہ عاصی کو یہ کہتے ہوئے کوئی باک نہیں ہے کہ آج خانقاہیت کی جگہ خودساز درگاہیت کو فروغ دیا جارہا ہے، جس کا یہ نتیجہ سامنے آرہا ہے کہ موجودہ درگاہی سسٹم اور مروجہ نظام اعراس ہی کو تصوف وسلوک سمجھا جانے لگا ہے۔

صوفیا کی اخلاص واخلاق سے بھری انسان سازی کی تحریک کو معاندین صوفیا سے بھی زیادہ خودساز درگاہی سسٹم سے جڑے ہوئے موجودہ حامیان صوفیا سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس جانب ہمیں خود احتسابی کی عزیمت بھری کوشش کرنی ہوگی۔ تاکہ صوفیا کی حقیقی خدمات وہدایات سے عالمی برادری کو روشنی مل سکے۔

خانقاہیت اور خود احتسابی

محترم حضرات! ہم کھل کر باتیں نہ کریں گے تو کام نہیں چلے گا۔ اپنی کوتاہیوں کو اپنے سے نہ کہیں گے تو کس سے کہیں گے؟

اخلاص بھرے جذبے سے ہماری فروگذاشتی کی نشاندہی نہ کی گئی تو ہم اپنی اصلاح کیسے کرسکیں گے، ضرورت ہے متعلقہ افراد کی تذلیل واہانت کی تخریبی ذہنیت سے اوپر ہو کر جذبۂ اصلاح میں پاکیزگی نیت کے ساتھ ورک کیا جائے جبھی درگاہوں کے موجودہ حالات ومعاملات میں مثبت نتائج کی امید کی جاسکتی ہے، ہمارے سامنے درگاہ سرکار غریب نواز اجمیر شریف اکتوبر ۲۰۰۷ء میں بم بلاسٹ کے ردعمل سے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ کشمیر سے کنیا کماری، آسام سے گجرات پر مشتمل ''صوفی کوریڈور'' کا عملی ورک شروع ہوا، شرق وغرب کے صوفیا ومشائخ اور علما ومفتیان کرام کا تاریخ ساز اجتماع ہوا اور آزاد ہندوستان میں پہلی بار ''پارلیمنٹ مارچ'' اجمیر بم بلاسٹ کے احتجاج پر راجدھانی دلی میں دسمبر ۲۰۰۷ء کو کیا گیا۔

عظیم خانقاہوں ودرگاہوں کی نمائندگی نے بڑا کام کیا جس نے خواجہ غریب نواز کانفرنس میں خانقاہوں ودرگاہوں کی تنظیم ''صوفی فیڈریشن آف انڈیا'' کی داغ بیل ڈالی گئی اور ''صوفی کوریڈور'' پر سروے کا کام جاری کیا گیا، یہ سارے اہم ترین امور منظم ومثبت انداز میں خانقاہی وارثین کو انجام دینا ہوگا، انہیں بہر حال خانقاہیت کی طرف پلٹنا ہوگا۔ فقیر اشرفی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں جن حقائق کی طرف نمائندگان خانقاہ ودرگاہ کی توجہ مبذول کرائی تھی اس کے چند اقتباس ملاحظہ کرتے چلیں:

اسلامیان ہند کا مرکزی پوائنٹ

حضرات گرامی! علوم تصوف کے احیاء وارتقاء کے لئے ملک کی جامعات اور مرکزی وصوبائی حکومتوں کے نصاب ہائے تعلیم میں داخل

نصاب کرنے کی جہد و سعی کرنی ہے۔

شیخ العالم سرکار نورالدین ریشی چرارشریف کشمیر کے طرز پر نوبل صوفیز پر تحقیق و ریسرچ کے لئے چیئرز کے قیام کی کوشش کرنا ہے۔اسی طرح لسانی اکاڈمی کے طرز پر صوفی اکاڈمی کا قیام ہوتا کہ صوفی افکار و نظریات منظم انداز میں فروغ پذیر ہوں۔

درگاہ سرکار غریب نواز صرف ایک مزار و آستانہ ہی نہیں ہے اسلامیانِ ہند کی دینی پہچان اور دائرۂ عقیدت کا مرکزی پوائنٹ اور برادران وطن کی عقیدت و آستھا کا کیندر ہے۔ سرکار خواجہ میں حاضری و نذر و نیاز کیلئے یہ قدیم دستور رہا ہے کہ خدّامین خواجہ ہی کو وکیل بنایا جاتا ہے۔ برصغیر کی تمام خانقاہوں کے اکابر صوفیا کے معمولات کل بھی یہی تھے اور آج بھی یہی ہیں۔ مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ درگاہ اجمیر شریف کیلئے درگاہ کمیٹی کی تشکیل کے وقت اکابرین و زائرین کی اس عقیدت و تعلق کو ہرگز ہرگز فراموش نہ کرے جو درگاہ خواجہ کے خدامین سے نسل در نسل، وراثتاً جاری و ساری ہے۔ یہ سرکار خواجہ کے خادم ہیں، قوم کے مخدوم ہیں۔

درگاہ خواجہ صاحب کے نظم و نسق میں صالحیت و شفافیت لانے میں اس مرکزی نقطہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔حکومت چاہے تو ہندوستان کی ساری درگاہوں سے وابستہ صوفیا و علما سے سروے کرالے۔ کروڑوں زائرین کا خدامین خواجہ سے روحانی رشتہ و تعلق واضح ہوجائیگا۔

حضرات! جماعت صوفیہ کو اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے فرار ہونے والی ٹولی ہرگز نہ سمجھا جائے۔ حیات انسانی کی کُنہ، سماج کی حقیقتوں کا صحیح ادراک، صالح افکار کی تحفیظ اور معاشرے کی بگاڑ کا حقیقی حل، مشکلات و مسائل میں گھری انسانی برادری کے لئے نجات کا نسخۂ شفاء سب کچھ صوفیا کی تعلیمات و ہدایات میں موجود ہے۔ روحانی بیماریاں، غصہ، حرص، حسد، غیبت، نفرت و عداوت، حب مال، طلب جاہ جیسے روحانی امراض کا انسانی فطرت کے مطابق علاج بھی صوفی خانقاہوں و درگاہوں سے حاصل ہوتا ہے، طبی دنیا میں ان روحانی بیماریوں کا علاج کل بھی نہ تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس آج بھی غیبت وحسد جیسی بیماریوں سے نجات کے لئے نہ تو انجکشن نہ ہی کوئی کیپسول و مکچر تیار کرسکی۔ جب کہ صوفیا کی خانقاہوں میں ان بیماریوں کا جڑ توڑ علاج ہے۔

خانقاہیت کی جانب پلٹنا ہوگا

آج کی صوفی بزم میں ہمیں اپنا محاسبہ کر کے اپنے اسلاف کی خانقاہیت کی جانب پلٹنا ہوگا۔ ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ اسلاف کی امانت و خانقاہیت، صرف درگاہیت (نذر و نیاز، چڑھاوے و چادر، صندل و گاگر) تک محدود نہ رہے بلکہ امت دعوت و امت اجابت کے تئیں ان کی روحانی انسانی و اخلاقی قدریں کچھ نہ کچھ باطن کی پنہائیوں میں بسی رہے اور خانقاہ نبوت کی رشد و ہدایت کو مخلوق خدا تک دیانت و صیانت کے ساتھ پہنچاتے رہیں، ساتھ ہی یہ بھی جدو جہد و سعی مسلسل جاری رہے کہ خانقاہیں و درگاہیں صرف زرکشی کا ذریعہ بنکر نہ رہ جائے بلکہ ان دونوں امانت و علامت سے مصطفےٰ جانِ رحمت کے اخلاقی اقدار پر عملی ورک جاری و ساری رہے جن کے لئے ہمارے دیش میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، علامہ فضل رسول بدایونی، علامہ فضل حق خیرآبادی، امام احمد رضا مجدد بریلوی اور شیخ الاسلام امام انواراللہ فاروقی (رحمہم اللہ اجمعین) نے پوری زندگی نثار کردی، شرق و غرب میں فیض رساں صوفی درگاہیں ہم سب کی امانت بھی ہیں اور علامت بھی، ہمیں اپنے کو بچانے کے لئے ان تمام امانتوں و شعائر کے تقدس کو قائم رکھنا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ انہیں اہداف جلیلہ کے حصول کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

چلتے چلتے فقیر اشرفی آپ حضرات کی خدمات عالیہ میں عرض پرداز ہے کہ آیئے! رنگ و نسل، قوم و قبیلہ اور مشربی عصبیت سے بلند ہوکر متذکرہ بالا مقاصد جلیلہ کے تکمیل و تنفیذ میں صرف ''رضائے مولیٰ'' کی پاک و طاہر نیت کیساتھ سفر کا آغاز کیا جائے۔ ہماری نیتوں کی پاکیزگی ہمارا جذبۂ اخلاص ہمیں گرنے، پھسلنے، ٹوٹنے، بکھرنے سے بچاتا رہے گا۔ راہ مولیٰ میں چلنے چلانے کا شوقِ آبلہ پائی، خارِ مُغیلاں کو گلستاں بنانے میں مہمیز کا کام کرے گا۔ انشاء المولیٰ تعالیٰ!

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

بات کہاں سے شروع ہوئی؟

حضرات! چلتے چلتے صوفیا نمبر کے وجود مسعود اور اس کے پس منظر پر ایک ہلکی سی جھلک گوارا کرتے چلیں تو مہربانی ہوگی، حالانکہ یہ ڈگر تھوڑی سی کٹھن ہے مگر چلتے ہیں تاکہ سَند رہے۔

دلی میں ایک بے چین روح (ضعف پروف) اور منحنی جسم والا سخت جان، بہار ہو کہ خزاں، وہ نت نئے ورک کو وجود بخشتے نظر آتا ہے، وہ کام کے گھیرے میں نہیں رہتا بلکہ کام ان کے گھیرے میں رہتا ہے۔ ان کی چھوٹی سی جیکٹ کی ہر جیب میں قومی وملی امور کے دیسی بدیسی مرغی بچے انڈے ہلچل مچائے رہتے ہیں، اس بندے نے جو کام کیا اور جتنا کیا اپنی استطاعت کے مطابق ہی کیا بال بچوں کی ضرورت اور دنیاوی تقاضوں کا بوجھ بڑے بڑوں کا پتہ جلا کر رکھ دیتا ہے، ان حضرت کا بھی یہی حال ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کر کب کے بکھر جاتے، ختم ہو جاتے مگر نسبت مظہریت کا مشاہدہ ومظاہرہ نئی توانائی کے ساتھ کھڑا کرتا رہتا ہے، عقل ودل میں جب جنگ ہوتی ہے تو یہ بندہ، دل کی جگہ کر عقل کی پاسبانی میں لگ جاتا ہے اور جب مار پڑتی ہے تو ٹھکانے پر آجاتا ہے، یہ حضرت دلی میں جمے، دلی کو دیتے رہے مگر دلی سے کچھ نہ لے سکے۔ میں گواہ ہوں کہ عسرت وبے مائیگی کا عالم ہے مگر یک وتنہا پرانی دلی کی سنگلاخ زمین پر اہل سنت وجماعت کا پرچم لہراتا رہا، جب اعلیٰ حضرت کا نام لینا بھاری تھا یہ شخص ان پر کام کرتا رہا۔ نہ جانے کتنوں نے شاندار بنگلے بنوا لیے مگر یہ فقیر کے فقیر ہی رہے، عہدہ ملا، کمانے کا موقع ملا مگر کمانے کی بجائے کم آنے کو ترجیح دی، موجودہ سماجی لغت میں ایسے کو شریف نہیں بیوقوف کہا جاتا ہے۔

قارئین! حیران ہوں گے کہ وہ کون شخص ہے؟

جی ہاں سنیئے! وہ ہیں سدا بہار **''قاری محمد میاں مظہری''** کئی اداروں واشاعتوں کے سابق وموجودہ مدیر وصدر کے ذریعہ بات یہاں سے شروع ہوئی کہ ۲۰۰۷ء میں دلی سے لکھنؤ پہنچے جب میں روزنامہ آفتاب عالم کی اشاعت کا قطب نما لے کر ـــ فقیر اس وقت اپنی زندگی کے سخت ترین ابتلا وآزمائش میں مبتلا تھا۔ مولائے کریم کسی دشمن کو بھی ایسے تباہ کن دور نہ دکھائے، خیر قاری صاحب نے اخبار کی رسم اجرا میرے ہاتھوں سے انجام دلائی اور اپنائیت کے ایسے ڈائلاگ سنائے کہ مجھے قلم کو حرکت میں لانا پڑا ـــ چند دن بیتے تھے دار العلوم وارثیہ کے مہتمم اعلیٰ قاری ابوالحسن قادری علیہ الرحمہ، قاری شفیق عالم صاحب کے ساتھ، قاری مظہری ایک نئے پروگرام واعلان نامہ کے ساتھ غریب خانہ تشریف لائے اور فرمایا کہ روزنامہ آفتاب عالم کا ''شیخ طریقت نمبر'' نکالنا ہے، ہم نے اس کا باضابطہ اعلان بھی کر دیا ہے۔ اس تعلق سے پوری تیاری جاری ہے۔

میں نے عرض کیا کہ واقعتاً اگر آپ کو خصوصی اشاعت نکالنے کی کھجلی ہے تو میری ذات کو امتحان کی بھٹی پر تپنے دیجیے اور اگر آپ میری سنیے خصوصی اشاعت تو ضرور نکالیں مگر تصوف وسلوک کے احیا وارتقا اور صوفیا کی حیات وخدمات پر نکالیں جو میری زندگی کا محور ومرکز ہے، قاری صاحب پر میری تجویز کا اثر ہوا اور شیخ طریقت نمبر کا منصوبہ قاری صاحب کی جیب میں رکھا رہ گیا اور اس کی جگہ ''صوفیا نمبر'' کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ہے صوفیا نمبر کے شان وجود کا پس منظر! بعدہ عم محترم حضرت سید امین اشرف صاحب قبلہ (سابق پروفیسر شعبۂ انگلش علی گڑھ یونیورسٹی) سے رابطہ قائم کیا گیا اور تحریک شروع کر دی گئی اور جو لیٹر بھیجا گیا اس کے چند اقتباس حاضر خدمت ہیں:

> ''آپ بخوبی واقف ہیں کہ برصغیر میں علوم شریعت وطریقت کے نبوی چراغ تابناک بنائے رکھنے میں روحانی سلاسل کا اہم رول رہا ہے خصوصاً قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور ان سے پھلے پھولے ذیلی سلاسل نہ صرف جنوب ایشیا وبرصغیر بلکہ پورے عالم اسلام اور یوروپ وافریقہ کی سرزمین پر بھی متلاشیانِ راہ حق کو رشد وہدایت سے روشن ومنور کرتے آرہے ہیں۔
>
> یاد رکھیں محبت ورواداری، حسنِ سلوک وخدمت خلق صوفی ازم کی گھٹی میں ہے۔ اسی لئے صوفیا نے نوع انسانی کو نفرت وعداوت، تشدد ودہشت کی جگہ محبت واخوت، امن ویکجہتی کی دعوت دے کر اپنی خانقاہوں، آستانوں، درگاہوں اور درسگاہوں سے مہذب معاشرہ کی تشکیل کا شعور حقیقی عطاء فرماتے آئے ہیں اور اپنی روحانی وتبلیغی خدمات کے ذریعے شرق وغرب میں بسی انسانی برادری کو اپنی پاکیزہ تعلیم وتربیت سے منزل حق تک پہنچانے کا تاریخ ساز فریضہ بھی انجام دیتے رہے ہیں۔

محبت گرامی! موجودہ عالمی تناظر میں جبکہ روحانی، اخلاقی اور انسانی اقدار کا گراف کم ہوتا جا رہا ہے ضروری ہے کہ تمام سلاسل کے صوفیائے کرام واولیائے عظام کی خدمات جلیلہ جو تقریباً چودہ صدی پر محیط ہیں ان قدسی صفات اسلاف کے پاکیزہ وروشن حیات وخدمات پر سر

جوڑ کر متحدہ ومشترکہ طور پر ورک کیا جائے تا کہ موجودہ نئی نسل صوفیائے کرام جو خانقاہِ نبوت کے حقیقی نمائندے کی حیثیت سے اپنے موعظت حسنہ اور صفائے باطن کے ذریعے دیگر اقوام وملل کے گم گشتگان راہ کو راہ مولیٰ دکھاتے رہے ہیں ان کے کردار وعمل سے واقف کرائیں۔اس سے نہ صرف خانقاہی موجودہ وارثین اور وابستگان سلاسل بلکہ پوری عالمی برادری کے لئے عظیم دینی وملی خدمات انجام دی جاسکتی ہیں۔

محترم المقام! ہمیں اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ شیخ طریقت حضرت علامہ سید محمد جیلانی اشرف کچھوچھوی (نبیرہ حضور محدث اعظم ہند) جیسی پر خلوص فعال اور تحریکی ذات کی ۶۳ رسالہ زندگی کے ۴۲ رسالہ حیات وخدمات میں علوم تصوف اور شریعت وطریقت سے مربوط خانقاہی رشد وہدایت کے احیاء وارتقاء کے لئے عالمی سطح پر جو جہدِ مسلسل جاری ساری ہے اس سے تحریک وحوصلہ پا کر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ صوفیاء نمبر شائع کیا جائے۔صوفیاء کرام کی خدماتِ عظیمہ پر مواد یقیناً آپ کی لائبریری میں ہوگا۔برائے کرم آپ قلم کو ضرور حرکت میں لائیں۔" (لیٹر کا اقتباس)

اور گل سے گلستاں بنتا گیا

الغرض صوفیا نمبر کا اعلان کرنے کے بعد قاری صاحب کی بے چین روح کو کہاں چین۔روز نامہ سیکولر قیادت میں جٹ گئے۔

صوفیا کی تعلیمات وہدایت کی اشاعت وتبلیغ اور تحفیظ وتنفیذ چوں کہ فقیر کی شاہراہ حیات کی متاع گراں ہے۔لہٰذا انشراح صدر کے ساتھ صوفی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام صوفیا نمبر پر ورک شروع کردیا گیا۔۷۰۰ رصفحات کا ٹارگیٹ تھا مگر دو ہزار صفحات سے زائد مضامین کی آمد نے ہمارے حوصلوں کو دو چند کردیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس تسلسل کو ختم نہیں کرنا ہے،مضامین کی آمد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے،ہم بھی معاونین کا صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

خصوصاً حضرت سید امین اشرف،حضرت مسعود انور علوی،حضرت سید شاہ شمیم الدین منعمی،حضرت سید حمید الدین شرفی،حضرت صوفی سید شاہ اعظم علی، حضرت پروفیسر اسحٰق خاں،حضرت سید حسن مثنیٰ انور،حضرت سید احمد میاں علوی،علامہ توصیف رضا خاں صاحب،حضرت مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی، محترمہ رقیہ زین الدین،حضرت سید امین اشرف مارہرہ شریف،محترمہ جاویدہ حبیب،محترمہ فاطمہ زہرہ بلگرامی،حضرت سید وقار پاشاہ حیدرآباد،حضرت علامہ مفتی خلیل احمد قادری،جامعہ نظامیہ حیدرآباد،محترم مفتی ارشاد قادری سنبھلی،حضرت سید وحید اشرف،محترمہ بشریٰ اعجاز،حضرت اسید الحق عاصم القادری بدایونی، حضرت سید فضل متین چشتی اجمیری،حضرت سید مہدی معینی اجمیری،حضرت سید اسلم وامقی بریلوی،محترم قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی،محترمہ سیدہ رقیہ کشمیر،محترم سید علیم اشرف،محترم مفتی محمد عیسیٰ رضوی،حضرت سید تنویر ہاشمی،حضرت سید مظہر الدین اشرف،حضرت شیخ ابوبکر (الثقافۃ السنیہ)،محترم عبدالحکیم ازہری،محترم سید واقف میاں شیخ الجامعہ جامعہ صوفیہ اور دیگر اہل قلم واہل نظر کو ہدیۂ تبریک پیش خدمت ہے۔کیونکہ گل سے گلستاں بنانے کا کام جاری وساری ہے۔

یاد رہے صوفیا نمبر میں مختلف افکار ونظریات کے اہل قلم شامل ہیں،ان کے مضامین سے اتفاق ہمارے لئے ضروری نہیں ہے۔

کہاوت ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے اسی تناظر میں عرض ہے کہ صوفیا نمبر کے مضامین کی اشاعت وطباعت کے شرعی وقانونی ذمہ دار صرف اور صرف اس کے ناشر رہیں گے۔

آخر میں تامل ناڈو،جموں کشمیر،حیدرآباد،علی گڑھ،ممبئی،احمد آباد،ناگپور،لکھنؤ،دلی،بنگلور،پونا،بنارس،گورکھپور،گلبرگہ،پٹنہ،کولکاتا وغیرہ کی جامعات اور دینی درسگاہوں وخانقاہوں کے صاحبان قلم سے پر خلوص گذارش ہے کہ صوفیا نمبر کی آئندہ اشاعت کے لئے مضامین کی ترسیل کی زحمت گوارہ فرمائیں۔رابطے کا سلسلہ جاری وساری رہے گا۔انشاء اللہ تعالیٰ

مولیٰ تعالیٰ جل جلالہ بطفیل رسول اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے چلاتے رہنے کی توفیق دائمی عطا فرمائے،آمین ثم آمین۔

طالب دعا

فقیر اشرفی

[signature]

سید محمد جیلانی اشرف کچھوچھوی

۱۰ رجنوری ۲۰۱۰ء ۱۴ رمحرم الحرام ۱۴۳۱ھ

حرف اول

پروفیسر مسعود انور علوی

صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصوف کے لئے عام طور پر انگریزی داں حضرات مسٹیسزم (Mysticism) کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور یہی لفظ کسی قدر غلط فہمی کا باعث بنتا ہے کیونکہ اس سے کسی خیالی اور تصوراتی علم کا گمان ہوتا ہے۔ حالاں کہ تصوف ایک ایسی با قاعدہ سائنس ہے جس کے تمام اصول اور تفصیلات مرتب ہیں۔ اس کی بنیاد ذاتی تجربات و مشاہدہ پر ہے۔ یہ تمام تجربات مقررہ حالات پر دہرائے جاسکتے ہیں۔ چودہ سو برس پہلے بھی اس کی وہی تعریف کی جاتی تھی جو آج کی جاتی ہے۔ وہ ایک ناقابل تردید حقیقت اور مکمل طرز حیات ہے۔ وہ ایک ایسا دستور زندگی ہے جس کو اپنی زندگی میں رچا بسا کر انسان احسن تقویم کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔

تصوف سے ہمارے قول و فعل کا تضاد اور فرق ختم ہو کر اخلاص و للّٰہیت پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا اولین مقصد یہ ہے کہ ہم جیسے ہوں ویسے نظر آئیں اور مخلوق و خالق دونوں کے لئے سراپا اخلاص بنیں۔ اسی لئے ارباب تصوف سورۂ بینہ کی اس آیۂ کریمہ کو اپنی اساس بناتے ہیں: **وما امروا الا لیعبدو اللہ مخلصین له الدین حنفاء و یقیموا الصلوة ویوتوا الزکوة و ذلک دین القیمة** ۔(ان کو تو صرف اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ خلوص و بے غرضی اور یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی عبادت کریں، نمازوں کو قائم کریں، زکوۃ دیں اور یہی دین قیم ہے۔) چوں کہ نفس انسانی کی فریب کاریاں اور اس میں پوشیدہ خواہشات دل کو خراب کرتی ہیں اس لئے اخلاص لابدّی اور لازمی قرار دیا گیا۔

تصوف ایک حال و کیفیت کا بھی نام ہے جس کے مالکوں کے پاس سے ہمیں اخلاق و کردار کی تشکیل، تزکیۂ نفس، تصفیۂ باطن اور اپنی روح کے نکھار کا سبق ملتا ہے، ان کی صحبت میں اپنے آپ اور اپنے پروردگار کی پہچان کے ساتھ ہی کائنات کے رموز و اسرار اور اپنی پیدائش کے مقصد سے آگاہی ہوتی ہے اور قدموں کے اٹھتے ہی منزل کا نشان ملتا ہے۔ مخلوق سے الفت و محبت، مسکنت، قناعت، مروت، امانت، رعایت، تواضع و انکساری اور للّٰہیت جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں اور نفس و نفسانیت سے دستبرداری نصیب ہوتی ہے۔ ارباب تصوف نے قرآن مجید کی مختلف آیات سے تصوف اور اس کے اصول و ضوابط کا استخراج کیا ہے اور عام لوگوں کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تصوف کی لفظی تعریف بھی کی ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ حضرات صوفیہ نے اپنے اپنے الفاظ، حال و کیفیت میں اس کی جو تعریف تعبیر اور تشریح کی ہے سب کا ماحصل ایک ہے۔

> **"منکرین و معترضین اور معاندین تصوف سے ضرور مؤدبانہ درخواست اور مخلصانہ گزارش ہے کہ اکیسویں صدی کے اس دور میں خدا کے واسطے فروعی اختلافات، جزوی تفرقے اور مفاد پرستی و انانیت اور خود پرستی کے جھگڑوں سے اوپر اُٹھ کر انسانیت کی بقا اور معاشرہ و سوسائٹی کی صحت مندی اور صاف ستھرے ماحول کی تعمیر و تشکیل جیسے اہم ترین کام میں ایک ہو جایئے، مذہب کی آڑ میں نفرت کے جذبوں کو پروان نہ چڑھنے دیجیے"**

داستان شوق جب پھیلی تو لا محدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام بن کر رہ گئی

کلام پاک میں جس طرح لفظ عشق کا بیان نہیں بلکہ اشد حبا للّٰہ (اللہ کی محبت میں بہت سخت) ہے۔ اسی طرح با قاعدہ صوفی اور تصوف کا لفظ

نہ آکر مخلصین، مقربین، ابرار، صادقین ومحبین جیسے الفاظ آئے ہیں۔ صوفی کا لفظ ان تمام مذکورہ متفرق الفاظ پر حاوی ہے۔

تصوف کے لغوی و اصطلاحی معنوں اور اس کے مشتقات کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس میں متعدد اقوال اور توجیہات ہیں۔ تصوف تفعل کے وزن پر ہے جس کے معنی اون (صوف) پہننے کے ہیں۔ اگلے زمانوں میں حضرات اولیاء اللہ تواضع و انکساری کی خاطر اون کا بنا لباس پہنتے تھے۔ بعض پیغمبروں کی روش بھی یہی تھی۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں روایت ہے کہ جب آپ کوہ طور پر کلام ربانی سے سرفراز کیے گئے تو اون کی کملی بھی آپ کے زیب بدن تھی۔ اون کا موٹا جھوٹا لباس پہننے سے ان کا مقصد تواضع اور منکسر المزاجی نیز دنیا کی زیب و زینت کا ترک تھا اور بے وقعت لباس سے نفس میں ایک قسم کی شکستگی پیدا ہوتی ہے جو اس کا منشاء ہے۔

تصوف، صوف (ص کے زبر سے) ماخوذ ہے جس کے معنی اعراض وروگردانی کرنے اور یکسو ہونے کے ہیں۔ چوں کہ اہل اللہ، اللہ کے سوا ہر ایک سے یکسوئی اور روگردانی اختیار کرتے اس وجہ سے ان کے اعمال وافعال کو تصوف اور ان کو صوفی کہا جاتا۔ صوفیہ کو اہل صفہ کی جانب بھی منسوب کیا جاتا۔ اہل صفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ ان کی تعداد تقریباً چار سو ۴۰۰ تھی۔ وہ لوگ مسجد نبوی کے چبوترہ پر بے سروسامانی کی حالت میں رہتے۔ تارک دنیا تھے جنگل سے لکڑی لاکر بقدر ضرورت بیچتے اور اس کی قیمت سے کھجور و چھوہارے خرید کر اپنا پیٹ پالتے بقیہ رات ودن کلام پاک کی تلاوت اور تسبیح وتہلیل کرتے اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف قسم کے علوم ومعارف سیکھتے اور بھوک کی سختی، معاش کی تنگی اور جاں فشانی میں خوش وخرم رہتے اور اپنے قلب کو دنیاوی مصائب اور شدائد میں فارغ رکھتے۔ جن لوگوں نے اصحاب صفہ کے جیسے اعمال وافعال کرنا شروع کیے اور ان کی پابندی کی وہ صوفیہ کہلائے۔

صوفیہ کا وجود قرن اول یعنی اسلام کے ابتدائی دور سے مسلّم ہے۔ سرور کونین ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑے اور اس امت کے سب سے پہلے صوفی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مبارک عہد میں چوں کہ صحابیت سے بڑی کوئی فضیلت نہیں اس لیے لوگ صحابہ سے ملقب اور مشہور ہوئے۔ اس کے بعد تابعین کا دور آیا جن کو صحابۂ کرام کی صحبت وہم نشینی کافی تھی اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے اعزاز نہ تھا کہ وہ تابعین کے نام سے مشہور ہوں۔ ان کے بعد کے لوگ تبع تابعین کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان کے بعد دین میں مختلف قسم کے فرقے وجود میں آئے۔ نئی نئی بدعتیں پیدا ہوئیں۔ عوام میں جہل بڑھا، لوگ حبّ جاہ اور طلب دنیا کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے اور اس میں کثرت ہوئی اب خواص میں جو لوگ دنیا اور اہل دنیا سے دامن کو بچاتے اور اپنے انفاس کی حفاظت کرتے وہ حضرات صوفی کہلانے لگے۔

اس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے عہد میں ان صحابۂ کرام کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جو آپ کے باطنی علوم کی ترویج واشاعت کرتے ان میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ خاص ہیں۔ اسی طرح تابعین میں حضرت امام علی بن حسین زین العابدین، حضرت امام محمد باقر، حضرت محمد بن الحنفیہ، حضرت حسن بصری، حضرت کمیل بن زیاد وغیرہ۔ اور تبع تابعین کے طبقہ سے حضرت امام جعفر صادق، حضرت امام موسیٰ کاظم، حضرات ائمہ اہل بیت، حضرت سفیان ثوری، حضرت مالک ابن دینار، حضرت محمد ابن سماک، حضرت حبیب عجمی، حضرت داؤد طائی اور حضرت شیبان راعی علیہم الرحمۃ والغفران وغیرہ ہیں۔

تبع تابعین کے بعد وہ حضرات جو ان کے علوم ومعارف اور رموز باطنی کے امین و مالک ہوئے وہ صوفی کہلائے اور ان کی بڑی تعداد ہے جیسے حضرت بایزید بسطامی، سہل بن عبداللہ تستری، حارث بن اسد محاسبی، بشر حافی، سید الطائفہ جنید بغدادی، ابراہیم ادہم، معروف کرخی، شقیق بلخی، فضیل بن عیاض، سرّی سقطی، سفیان ثوری قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم وغیرہ۔

تصوف اور تذکرہ کی کتابوں میں جن بزرگ کے نام کے ساتھ باقاعدہ صوفی مشہور ہوا وہ سید ابوہاشم محمد بن احمد (۱۵۰ھ) ہیں جن کے بارے میں ان کے معاصر مشہور بزرگ حضرت سفیان ثوری فرماتے تھے کہ: ''اگر ابوہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریا کی باریکیوں کو کبھی نہ پہچان پاتا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ صوفی کیسے ہوتے ہیں جب تک میں نے ابوہاشم کو نہ دیکھا''۔ حضرت ابوہاشم صوفی مرض الوصال میں تھے ایک صاحب نے

مزاج پوچھا تو فرمایا بلائے عظیم معلوم ہوتی ہے لیکن دوستی ومحبت اس بلا وآزمائش سے کہیں بڑھ کر ہے۔ فرماتے تھے کہ سوئی سے پہاڑ کھودنا آسان ہے اور کبر وخودی کو اپنے سے دور کرنا مشکل۔

جیسا کہ اس سے پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرات صوفیہ صافیہ نے اپنے اپنے انداز بیان، ذوق ومشاہدۂ حال اور کیفیت میں تصوف اور صوفی کی تعریف وتعبیر کی ہے۔ تصوف کی کتابیں ورسائل ان کے اقوال سے پر ہیں یہاں نمونۃً چند تعبیرات درج کی جا رہی ہیں۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے کہ تصوف یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ بغیر علاقہ رہے۔ وہ اپنی خودی سے زندہ اور تمہاری خودی سے مردہ کرے۔ تصوف خیالات کی صحت کا نام ہے۔ یہ صفا سے مشتق ہے، جس کے معنی برگزیدگی کے ہیں تو جو شخص حق کے سوا ہر ایک سے برگزیدہ ہو وہ صوفی ہے۔ اس کا دل حضرت ابراہیم کی طرح، دنیا سے علیحدہ اور حق تعالی کا فرمانبردار ہو، وہ رضا وتسلیم میں حضرت اسمٰعیل کی طرح غم واندوہ، میں حضرت ہود، فقر میں حضرت عیسی، صبر میں حضرت ایوب، مناجات کے وقت شوق میں حضرت موسی اور اخلاص میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مثل ہو۔ تصوف کا یہ مطلب ہے کہ دل کو پاک وصاف اور خواہشات نفسانی سے دور رکھے مخلوق کو امر حق کی نصیحت کرے اور شریعت کی مکمل پیروی کرے۔ حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ تصوف یہ ہے کہ اپنے نفس کو خدا کی مرضی اور مراد پر حاوی کرے۔ تصوف کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔ فقر وافتقار، بذل وایثار کو شیوہ بنانا اور اعتراض واختیار کو بالکل خیر باد کہہ دینا۔ حضرت سہیل بن عبداللہ تستری فرماتے کہ ہر حال میں اللہ تعالی کے ساتھ رہنا تصوف ہے۔ شیخ ابو محمد جریری کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ ہر اچھی صفت کو اختیار کرے اور بری صفت سے بالکل باہر آ جائے۔ ابوعبداللہ محمد بن فضل فرماتے کہ بلا وآزمائش سے صاف ہونے اور عطا سے غائب ہونا تصوف ہے۔ شیخ ابوالحسن نوری فرماتے کہ تصوف نہ علم ہے نہ رسم، اگر علم ہوتا تو تعلیم وتعلم سے حاصل ہو جاتا۔ رسم ہوتا مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا بلکہ تصوف اخلاق ہیں۔ **تخلقوا باخلاق اللّٰہ**، یعنی اخلاق الٰہی کو اپنی ذات میں رچا بسا لو۔ نفسانی خواہشات کا حق کے لیے ترک کر دینا ہی تصوف ہے۔ تصوف ہمہ تن آزادی، جواں مردی اور ترک تکلف ہے۔ حضرت شیخ ابوبکر شبلی کا ارشاد ہے کہ اپنے حواس کو ضبط کرنے اور انفاس کی رعایت کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔ جب تک تمام مخلوق کو اپنا عیال نہ سمجھے اس وقت تک صوفی نہیں۔ حضرت سید نجم الدین غوث الدہر قلندر فرماتے کہ تمام حظوظ نفسانی کے ترک کو تصوف کہتے ہیں۔ (**التصوف ترک کل حظ النفس**)

مختصراً دو لفظوں میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ظاہر میں اخلاق اور باطن میں اخلاص۔ اپنی ذات میں اخلاق الٰہی کا رچا بسا لینا ہی تصوف ہے۔ **تخلقوا باخلاق اللّٰہ** کے یہی معنی ہیں۔ انسان کے ظاہر وباطن، اخلاق واخلاص کا مطلب یہی ہے کہ وہ دوسروں سے اپنے کو کمتر سمجھے، ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔ خدمت خلق اس کا شعار ہو، مذہبی رواداری، آپسی میل محبت، صلح جوئی ووضع داری کی فضا قائم کرے۔ دوسروں کی تکلیف وپریشانی کو اپنی تکلیف سمجھے۔ غیروں کے دکھ درد کو اپنا درد جانے اور ہمدردی وایثار کو اپنا نصب العین بنائے۔ اللہ تعالی کو رب العلمین اور اس کے محبوب کو رحمۃ للعلمین سمجھے اور اس پر یقین رکھے۔ اسی وجہ سے صوفی طبقاتی اور نسلی تقسیم سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانی مخلوق کو اکائی اور وحدت میں باندھ کر نیرنگیوں میں یک رنگی تلاش کرتا ہے۔ انسانیت کی سلامتی وبقا کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔

نیک وبد سب ہیں تراب اس کے ظہور اسماء
مجھ کو یک رنگ نظر چاہئے ہر فرد کے ساتھ

حضرات صوفیہ کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ انسانوں میں تواضع وانکساری، خوش خلقی وملنساری، اخلاص، علم باعمل، دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی، اپنے کردار وعمل محبت سے دوسروں کو اپنا بنانا اور ان کے مقابل اپنے آپ کو برتر وافضل نہ سمجھنا پیدا ہو۔

تو سب سے آپ کو ناقص تراب سمجھے جا
یہی تو دیکھتے ہیں ہم بڑا کمال ترا

ایک صوفی صافی نہ لوگوں پر کفر وشرک کے فتوے صادر کرتا ہے، نہ منظم تحریکوں کی بنیادیں ڈالتا ہے، نہ اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو

لائق گردن زدنی جانتا ہے، نہ غلط کام کرنے والوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر تبلیغ کرتا پھرتا ہے کہ یہ کام چھوڑ دو اور وہ کام چھوڑ دو، نہ صرف اپنے کو نجات یافتہ اور دوسروں کو گمراہ اور گم گشتہ سمجھتا ہے بلکہ وہ اپنے کردار و عمل، دل آسائی اور محبت سے اپنے اردگرد ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ اس کی صحبت میں بیٹھ جانے والے برے سے برے لوگ بھی خود بخود راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ اور جب اس میکدۂ محبت سے باہر نکلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

جس طرح پیغمبروں کی بعثت مخلوق پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے اسی طرح صوفیوں، رشیوں اور خدا رسیدہ ہستیوں کا وجود بھی۔ عالم انسانیت کی تاریخ کے صفحات ان پاک طینت بزرگوں کے ناقابل فراموش احسانات کے تذکروں سے مزین ہیں جنہوں نے انسانیت کی بقا و سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ فلاح و بہبود، کامیابی و کامرانی اور امن عالم کے قیام کی ہر ممکن کوشش کی اور آدمیت کو انسانیت کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے نمونے ہر سمت نظر آنے لگے۔ انہوں نے اپنے اخلاق و کردار اور حسن عمل سے لوگوں کے دلوں کو اپنا بنا لیا، ان سے ایسی محبت کی اور ایسے فوائد پہنچائے کہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (تم میں سے کوئی تب تک اللہ پر پورا پورا ایمان لانے والا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے) بالکل سچ ہو گیا۔

صوفیائے کرام نے روتی بلکتی اور سسکتی روحوں کو مسرت و شادمانی سے ہم کنار کیا گناہ گاروں و شرمساروں کو گلے لگایا اور یہ یقین دلایا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین (تمام جہانوں کا پالنہار) اور پیغمبر اسلام رحمۃ للعالمین (تمام جہانوں کے لئے رحمت) ہیں۔ انہوں نے برائیوں اور گناہوں سے نفرت ضرور کی مگر بروں اور گناہ گاروں کو نفرت کی نظر سے نہ دیکھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات و احساسات کو سمجھا اور ان کی عزت و احترام کرنا سکھایا، وضع داری، پاس آداب وفا، خیر خواہی، دوستوں و دشمنوں سے یکساں سلوک اور بے نفسی و بے خویشی جیسی صفات پر عمل پیرا ہو کر دکھایا اور اپنے حاشیہ نشینوں و حلقہ بگوشوں کو اس کی دل نشیں تعلیم دی مشہور صوفی بزرگ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ اکثر فرماتے تھے۔

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد — وانکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہ ما از دشمنی — ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

(جو کوئی ہمارا دوست نہ ہو، اے اللہ! تو اس کا بھی دوست ہو اور جو ہمیں ایذا و تکلیف پہنچائے اس کے بدلے اس کو مزید آرام و آسائش عطا ہو۔ ہم سے دشمنی کی خاطر جو کوئی ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے، تو اس کی زندگی کے باغ کا ہر پھول بے خار ہو جائے۔)

کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی سمت جانے کے کتنے راستے ہیں؟ فرمایا کہ موجودات کا ہر ذرہ حق کی طرف جانے کا ایک راستہ ہے مگر کوئی راستہ بھی دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ آسان اور قریب ترین نہیں۔

حضرات صوفیہ کی تمام مخلوق خدا سے بلا تفریق ملت و مذہب محبت، صلح و آشتی کا برتاؤ، وضع داری و رواداری، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات اور خواہشوں پر ترجیح دینے اور مقدم جاننے میں پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کے نمونے رہتے ہیں، انہوں نے ہمیشہ اپنے حاشیہ نشینوں کو اسی کی تعلیم دی اور محبت الٰہی کی اس عملی راہ پر خود بھی سختی سے گامزن رہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہارا نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

(تمام اولاد آدم بمنزلہ ایک جسم ہیں، کیوں کہ پیدائش میں سب ایک ہی اصل سے ہیں۔ زمانہ اگر کسی ایک عضو میں درد و تکلیف پیدا کرتا ہے تو

دوسرے اعضاء کو بھی قرار نہیں رہتا۔تم جو دوسروں کی تکلیف سے بے غم ہو اس قابل نہیں کہ تمہیں آدمی کہیں۔)

اس مقام پر صورت کی سراب نمائی کا راز فاش ہو کر یگانہ و بیگانہ کا وہم مٹ جاتا ہے۔ حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) اسی حقیقت کی نقاب کشائی فرماتے ہیں۔

تراب از راہِ معنی گر ببینی جملہ عالم را ہمہ باہم یگانہ اند یک کس نیست بیگانہ

(تراب! اگر حقیقت کی راہ سے تمام عالم کو دیکھو، تو سب آپس میں ایک ہیں کوئی بیگانہ ہے ہی نہیں)

یوں تو تمام صوفیائے کرام کا نصب العین یہی خدمت خلق کا جذبہ رہا کہ۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(مخلوق خدا کی خدمت کے علاوہ طریقت اور کچھ نہیں ہے، یہ صرف تسبیح مصلیٰ اور گدڑی ہونے سے نہیں ہے)

اس میں تمام مکارم اخلاق اور حیات انسانی کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کرنے کے زریں اصول مضمر ہیں مگر برصغیر ہندو پاک میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بزرگوں کے یہاں اس صفت کا جس اہتمام اور شدومد سے ذکر ملتا ہے اس کی نظیر نہیں، اسی بنا پر مشائخ چشت کی تعلیمات کی عصر حاضر میں معنویت و اہمیت سب سے زیادہ ہے کیوں کہ ان کا تعلق براہ راست عوام الناس سے بھی رہا ہے۔ انہوں نے بڑے موثر انداز میں اصلاح و تربیت اور اخلاق و کردار سنوارنے کا کام انجام دیا اور خلق سے الگ تھلگ ہو کر خالق میں مشغول ہو جانا کبھی نہ پسند کیا۔ ان صوفیائے صافیہ کے نزدیک مذہب کی اصل روح خدمت خلق، مذہبی رواداری، آپسی میل محبت، صلح و آشتی، دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی، دل گیری و دل آسائی رہے، یہ ان کا حال بن گئے ان کی خانقاہیں اور حلقے بیماروں، شکستہ دلوں درماندہ حال غربا، مساکین اور ظلم و ستم کے ہاتھوں ستائے ہوئے اور نفس امارہ کے ذریعہ مارے گئے گناہ گاروں کی آماجگاہ رہے۔ انہوں نے برائیوں اور گناہوں سے ہر حال میں نفرت کی، انہیں قابل مذمت گردانا، مگر بروں اور گناہ گاروں کو قابل نفرت اور اچھوت نہ سمجھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ولی اللہ کی پہچان ہی یہ بتائی کہ جس میں دریا کی سی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کی سی تواضع ہو۔ غرض کہ تصوف ابن آدم کی سرشت کا ایک گراں مایہ راز سربستہ ہے۔ اس کا حصول مادیت اور ظاہری چکا چوند کو شکست دینے کے بعد آسان ہوتا ہے۔

آج دنیا جس افراتفری تخصی بغض وعناد، معاشرتی بے ترتیبی، اخلاقی تنزل، خود غرضی اور مفاد پرستی نیز ہر ممکنہ بدعملی کا شکار اور برائیوں میں گرفتار ہے اس میں اگر اُسے کوئی چیز درکار ہے تو وہ صرف رحمت و عافیت ہے اور اس کا واحد راستہ تصوف ہے۔ دنیاوی انتشار اور تفریق کو ختم کرنے کا بھی واحد ذریعہ تصوف ہے۔ تاریخ اس کی گواہ ہے بلکہ حجر اسود نصب کرنے والا واقعہ بھی اس کا واضح ثبوت اور تصوف کے روحانی پیغام کا علمبردار ہے۔ اس واقعہ کی روشنی میں آج کے بہت سے اختلافی مسائل کے حل نکل سکتے ہیں۔

قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ محبت و آشتی، صلح کل ماحول، صالح وصحت منداور پُر امن معاشرہ کی تشکیل و تعمیر اور ملک وملت کی بقا کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ صوفیائے کرام اور ان کی تعلیمات، حیات و خدمات سے متعلق علمی مذاکرات کرائے جائیں اور عمومی طور پر ان کے افکار کی اشاعت و ترویج کی جائے۔

تصوف اپنی ہمہ گیری اور افادیت کی بنا پر مغربی علمی دنیا کا بھی ایک محبوب و مقبول موضوع بن چکا ہے۔ برصغیر ہندو پاک سے کہیں زیادہ اہل مغرب اس کی اہمیت و افادیت اور ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں اور اپنی اپنی سطح پر اس کی ترویج و اشاعت میں ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، کیوں کہ انسانیت کی بقا و سلامتی کا مسئلہ عالمگیر بن چکا ہے، اور اس کے حل کا واحد ذریعہ صرف اور صرف تصوف ہے۔

بڑی مسرت اور خوشی کا مقام ہے کہ شیخ طریقت حضرت مولانا سید محمد جیلانی میاں اشرف صاحب مدظلہ کچھوچھا شریف، ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا فرما رہے ہیں اور تصوف، ارباب تصوف، تعلیمات اور افکار کی نشر و اشاعت کے واسطے "صوفیاء نمبر" کی اشاعت صرف خاص سے فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے ان کے دردمند اور حساس دل جو ہر دور میں کم یاب ہوتے ہیں، کو مزید قوت مرحمت فرمائے اور

ان کی فیض رساں اور اور بابرکت ذات عالم کے لیے نمونہ بنے۔ آمین۔

نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ شیخ طریقت حضرت جیلانی میاں نے ہر قسم کے لکھنے والے فضلا وارباب دانش کی ایک کہکشاں جمع فرمادی ہے۔ یہ مضامین اور فاضلانہ مقالات راقم احقر کے پیش نظر نہیں ہیں اور نہ خود کو ان پر تجزیہ اور محاکمہ کا اہل سمجھتا ہے مگر منکرین ومعترضین اور معاندین تصوف سے ضرور مؤدبانہ درخواست اور مخلصانہ گزارش ہے کہ اکیسویں صدی کے اس دور میں خدا کے واسطے فروعی اختلافات، جزوی تفرقے اور مفاد پرستی وانانیت اور خود پرستی کے جھگڑوں سے اوپر اُٹھ کر انسانیت کی بقا اور معاشرہ وسوسائٹی کی صحت مندی اور صاف ستھرے ماحول کی تعمیر وتشکیل جیسے اہم ترین کام میں ایک ہوجائیے، مذہب کی آڑ میں نفرت کے جذبوں کو پروان نہ چڑھنے دیجیے۔

ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے اور اب سے ہزار سالہ قبل کے منظر نامے کو انصاف کی نظر سے دیکھیے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان پاک طینت، اخلاص ودردمندی سے بھرے صوفیوں نے مذہب کی نشر واشاعت کے لیے یہاں کے سادہ لوح لوگوں کے مزاج وفطرت اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر بعض اُن ہندوستانی رسم ورواج بھی کو اپنایا جو شریعت اسلامیہ میں قطعاً حرام وناجائز نہ تھے اور نہ مفروضہ عقائد سے متصادم۔

بہرحال میری دعا ہے کہ ''صوفیا نمبر'' جو وقت کی اہم ضرورت ہے اس کی نشر واشاعت میں شریک ہر فرد عنداللہ وعندالناس ماجور ہو اور یہ خصوصی نمبر مقبولیت حاصل کرے۔ آمین۔

احقر مسعود انور علوی
شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصوف عطر شریعت ہے

سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی
سجادہ نشیں خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، بہار

کسی نے پتہ نہیں کس نیت سے حضرت ذوالنون مصری سے پوچھا، حضرت یہ تو بتائیے کہ سب سے بڑا عقل مند کون ہے؟
ذوالنون نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا۔ میں ہوں۔ پوچھنے والے کی ذہانت و ذہنیت کو ایک اور سوال کا موقعہ ملا اور اس نے مسکراتے ہوئے فوراً پوچھا۔ اچھا تو اب یہ بتا دیجیے کہ سب سے بڑا بیوقوف کون ہے؟
ذوالنون نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فرمایا۔ وہ بھی میں ہی ہوں۔ سوال کرنے والے کی ذہانت کو اس کی توقع نہیں تھی اور ذہنیت بھی اس زلزلے کے لئے تیار نہیں تھی چنانچہ بوکھلا کر پوچھا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سب سے بڑے عقلمند ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے بیوقوف بھی ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ سنجیدہ ہیں تو بتائیے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ذوالنون بولے۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں سب سے بڑا عقلمند اس لئے ہوں کہ مجھے اپنے تمام قصور، اپنی تمام غلطیاں، اپنے تمام گناہ اور داغ دھبوں کا پورا علم ہے اس سے بڑی عقلمندی اور کیا ہوسکتی ہے اور میں سب سب بڑا بیوقوف و نادان اس لئے ہوں کہ مجھے تمہاری کسی غلطی، کسی گناہ اور داغ دھبے کا علم نہیں اور اس سے بڑی نادانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی نادانی کی راہ کو سلوک کہتے ہیں اور اسی عقلمند کو صوفی۔
پوری زندگی موازنہ و مقابلہ میں گذار دینا شیطانی سلوک ہے جس کا وظیفہ ہے، اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ اور اپنی پوری توجہ اپنی ذات کے احتساب و مراقبہ میں مرکوز کر کے یہ وظیفہ بنانا رحمانی سلوک ہے۔

> **”ہر مثبت فکر کی انتہا تصوف ہے۔ شریعت اگر عود ہے تو تصوف عطر عود ہے، شریعت اگر مشک ہے تو تصوف عطر مشک ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ عطر بنانا تیل پیڑنے جیسا نہیں ہے۔ عطر کشید کرنا ایک صبر آزما، لطیف و نازک اور متین و سنجیدہ عمل ہے۔ ہر اہل تصوف اور غلام صوفیا کا یہ فرض ہے کہ ایمان داری کے ساتھ شریعت کے عطر تصوف سے عوام و خواص کو معمور و معطر کریں“**

ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین
یکے آنکہ خود بیں مباش دیگر آنکہ بد بیں مباش
ازل سے ابد تک کا یہ کلیہ ہے اور یہی آسمان سے زمین تک کا آزمودہ نسخہ ہے۔ ذاتی سے لے کر اجتماعی مسائل کا حل بھی اس اصول پر عمل کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ دنیا میں امن کا فارمولہ بھی یہی ہے۔
اسلام نے جن علوم و فنون کو دنیائے علم و دانش میں متعارف کرایا ان میں ایک علم تصوف و احسان بھی ہے۔ ہر مثبت فکر کی انتہا تصوف ہے۔ شریعت اگر عود ہے تو تصوف عطر عود ہے، شریعت اگر مشک ہے تو تصوف عطر مشک ہے۔ جس چیز کا عطر کشید کرنا ہو اگر وہ عمدہ و مہیا نہ ہو تو عطر کا کیا سوال اٹھتا ہے اور جس چیز کا عطر کہلاتا ہے وہی چیز اس میں ندارد ہو تو وہ نقلی عطر ہے، فریب و سراب ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ عطر بنانا تیل پیڑنے جیسا نہیں ہے۔ عطر کشید کرنا ایک صبر آزما، لطیف و نازک اور متین و سنجیدہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عطار تو گلی کوچے میں آواز لگاتے ہوئے مل جاتے ہیں، لیکن عطر کہاں ملتا ہے۔ راہ تصوف مشکل ہے، صوفی ملتا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ آج کل یہ تن آسانوں کے شب و روز کے وظیفے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تم اگر چینی کو مرغوب رکھتے ہو، لیکن خریدنے کی صلاحیت نہیں تو چینی کے بوروں پر اس کی دکان میں مکھی اڑانے (مگس رانی) کی ادنیٰ

ملازمت ہی حاصل کرلو۔ شب و روز مرغوب کا ساتھ یہ بھی تو کچھ کم نہیں۔

سورج کے غروب کا شکوہ کیا ایک شمع روشن کرلو۔ بزرگوں کی رخصتی کے مرثیے سے اچھا ہے کہ ان کی تصنیفات و تالیفات و ملفوظات و مکتوبات کی دنیا میں گم ہو جاؤ۔

علم تصوف پر قلمی سرمایہ پوری دنیا میں پایا جاتا ہے اور کافی بڑی تعداد میں تصوف کے مختلف پہلوؤں پر اس راہ کے مسافروں نے اپنے اپنے تجربات و مشاہدات قلمبند فرمائے ہیں۔ علم تصوف پر کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ضرورت ہے تصوف پر ہونے والی علمی تحقیقی کاوشوں کی صحیح رہبری و رہنمائی اور تعاون باہمی کی۔ بھلا ہو حضرت جیلانی میاں کا جنہوں نے علم تصوف کی خدمت پر ہمہ جہت کوششوں کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ جامعہ صوفیہ کا باضابطہ قیام اور وہاں خشت اول سے ہی عرفانی و احسانی نشانہ طے کر کے نونہالوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا بلاشبہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے نتائج آنے والے دنوں میں یقیناً بہتر اور عمدہ ہوں گے۔ غریب نواز کانفرنس کے حوالے سے کشمیر سے کنیا کماری تک کے مشائخ اور ذوق تصوف سے مالا مال علماء کا جمع کرنا لاریب ایک ایسی سعی تھی جس نے الفقراء کنفس واحدہ کو زمین پر حقیقت بنا کر اتار دیا۔ صوفی کاریڈور یا گلیارے اور ملک کے اتحاد و سالمیت میں اس کے کلیدی کردار کو اجاگر کرنے میں آپ کی مساعی یقیناً ایک دن رنگ لائے گی۔ علم تصوف اور صوفیائے کرام کے افکار و خدمات سے متعلق مقالات و مضامین اور نگارشات کے شائع کرنے کا فیصلہ بھی نہایت ہی مفید ہے۔ یہ چوں کہ پہلی کوشش ہے اس لئے اس کی ترتیب و تہذیب میں تھوڑی تن آسانی و قبولیت و عمومیت یقیناً جھلکے گی، لیکن دوسری کوشش میں انشاء اللہ اس قندیل کے مندرجہ ذیل گوشے کچھ اس طرح منور ہوں گے:

افکار تصوف، اقدار تصوف، اعمال تصوف، اصحاب تصوف، خدمات تصوف، تحقیق تصوف، تنقید تصوف، تدقیق تصوف، اسئلہ و اجوبہ تصوف، تاریخ سلاسل، تاریخ صوفیا، تراجم و حواشی اور شروح کتب تصوف وغیرہ۔

امید قوی ہے کہ بہت جلد تصوف کے اس مقولے پر سب کے سب عمل کرتے ہوئے لبیک کہیں گے انظر ما قال ولا تنظر من قال۔

آج دنیا گولی و بارود اور بدعقیدگی کی بدبو سے پریشان و پست ہے۔ ہر اہل تصوف اور غلام صوفیا کا یہ فرض ہے کہ ایمان داری کے ساتھ شریعت کے عطر تصوف سے عوام و خواص کو معمور و معطر کریں

آیئے مل کر کہیں ——— السّعی منا والاتمام من اللہ

سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی
سجادہ نشیں خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، بہار

مطالعۂ تصوف کا مغربی تناظر

علامہ سید محمد حسینی اشرف
ایم اے، ایم فل (یوکے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اذا سالک عبادی عنی فانی قریب

اللہ تو اپنے بندوں سے قریب ہے۔ لیکن اب یہ اس کے غلاموں کو محاسبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے رب سے کتنے قریب ہیں۔ قرب الٰہی، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب سے حاصل ہوتا ہے۔ بندوں کا تزکیہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا ایک اہم حصہ ہے اور جس کی دلیل و یزکیھم (۲:۶۲) ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قرب الٰہی اطاعت رسول کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ اللہ اسی سے قریب ہے جسے تزکیۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہو اور جب وہ اطاعت رسول میں فنا ہوتا ہے تو اس پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ایک مقدس نبی، صادق الامین، مرشد کائنات، محسن انسانیت ہیں۔ جن کی تعلیم و ہدایت ہی اصل تصوف ہے۔ جب قلب و روح اللہ کی طالب ہوتی ہے تو صفائے باطن حاصل ہوتا ہے اور ہم اسی کو تصوف جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔

تاریخ تصوف کا طالب علم یہ خوب جانتا ہے کہ وقت کی دھول نے بہت حد تک اس کی حقیقت کو دھندلا کر دیا ہے، جس عظیم طریقت کا مقصد حقیقت کے مقام کو حاصل کرنا تھا آج وہی صراط مستقیم اپنی حقیقت سے محروم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ المیہ تنقید اغیار کی کثرت کا نہیں بلکہ خود پرستوں کی جہالت کا ہے۔ اسی لئے اکثر صوفیائے کرام نے آواز اٹھائی کہ تصوف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک حقیقت تھی جس کا کوئی نام نہ تھا اور آج کے پُر آشوب دور میں تصوف ہے مگر اہل تصوف نظر نہیں آتے۔

''تاریخ گواہ ہے کہ مغربی غیر مسلمین نے ہمیشہ اسلام کے تعلق سے ایک منفی نظریہ اختیار کیا جس کا اثر و نظارہ اس دور میں بھی موجود ہے۔ جب اسلامی روحانیت کے مقاصد و معاملات مستشرقین یورپ کی نظر سے گذرے تو اسلام سے منفصل کرنا ان کا ذاتی ایجنڈا ہو گیا، لیکن ان ساری منفی حقیقتوں کے باوجود بھی تصوف مغربی ملت کا ایک ضروری حصہ بن چکا ہے جو نہ صرف ذریعۂ تزکیۂ نفس ہے بلکہ انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے ایک بڑی طاقت بنتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔''

مغربی معاشرہ میں تین ایسی وجوہات ہیں جنہوں نے تصوف کے قدیم مقاصد و معاملات کو دشوار گذار بنا دیا اور جب ہم تصوف اور مغربی معاشرے کا تقابلی جائزہ لیں گے تو ظاہر ہو جائے گا کہ مغربی کلچر کا عام مسلمان منہاج تصوف میں انہیں کانٹوں سے منفی طور پر متاثر ہو رہا ہے:

ظاہر پرستی

اگر مغربی معاشرہ بالخصوص برطانیہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلامی روحانیت کو ذاتی رسوم میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ روحانی علاج کے نام پر بڑی تعداد میں مخلص عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ وہ جہلا ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف حصول دنیا ہے۔ یہ وہ نادان صوفی ہیں جو مقام فنا میں بقاء کے مراقبے سے محروم ہو کر جیب میں مال کی بقاء کے حساب میں مشغول رہتے ہیں۔ دراصل ان کی خود پرستی کا شکار کبھی کبھی کئی مخلص صوفی بھی ہو جاتے ہیں۔

جدید نظریہ

ہر دور میں تصوف کا عظیم مقصد باطن و روح کو سنوارنا رہا ہے اور تزکیۂ نفس کا طریق ہر زمانے میں ایک جیسا رہا ہے۔ ربنا ظلمنا انفسنا یہ اول بشر اور اللہ کے پہلے خلیفہ کی دعا ہے، تو پھر کیا دور حاضر کا زاہد و سالک یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ دعا قدیم ہو چکی ہے۔ ہر گز نہیں کیونکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید کلچر سے ظاہر کے متاثر ہونے کو معقول تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے باطن کا متاثر ہونا یقیناً ایک بے شعوری دعویٰ ہے۔ مغربی ممالک میں ''صوفی آڈرز آف دی ویسٹ'' جیسی تنظیمیں اس بات کو فروغ دے رہی ہیں کہ صوفی بننے کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں، یہ ایک ایسی فکر ہے جس کی تردید ہر صالح اور متقی صوفی نے ہر دور میں کی۔

امام شعرانی فرماتے ہیں:

" التصوف، انما هو زبدة عمل العبد باحكام الشريعة" (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ:۸)

ترجمہ: تصوف کیا ہے بس احکام شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ ہے۔

حضرت سید عبدالوہاب محمد بن خفیف فرماتے ہیں:

" التصوف، تصفية القلوب و اتباع النبي في الشريعة"

(طبقات کبریٰ، امام شعرانی)

ترجمہ: تصوف اس کا نام ہے کہ دل صاف کیا جائے اور شریعت میں نبی کی پیروی ہو'

غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں:

" اقرب الطرق الى الله تعالىٰ لزوم قانون العبودية و الاستمساک بعروة الشريعة "

ترجمہ: اللہ عزوجل کی طرف سے زیادہ قریب راستہ قانون بندگی کو لازم پکڑنا اور شریعت کی گرہ کو تھامے رہنا ہے۔

(بہجۃ الاسرار، ابوالحسن علی الشطنوفی)

نبی کی اطاعت کرنا حقیقت میں مسلمان ہونے کا درجہ رکھتا ہے اور اگر کوئی مندرجہ بالا اقوال کو چند افراد کی ذاتی فکر مانتا ہو تو یہ اس کی لاعلمی 'احسان' کا نتیجہ ہے کیونکہ ایک صحیح صوفی 'محسن' ہوتا ہے اور 'احسان' کا مقام بغیر اسلام و ایمان حاصل کرنا اتنا ہی غیر معقول ہے جتنا کہ خدا سے محبت کا دعویٰ کرنا بغیر اطاعت نبی اور محبت اہل بیت و صحابہ۔

مستشرقین یورپ

ان حضرات کا ہر دور میں ہمیشہ دو مقصد رہا ہے۔ پہلا تو محبت رسول کو اہل اسلام کے دلوں سے خارج کرنا۔ اور دوسرا علوم تصوف کو ایک غیر اسلامی فکر ثابت کرنا۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی ثابت ہو جائے تو اسلام اپنی جوہر وانفرادیت سے خالی ہو جائے گا اور اسلام ایک عظیم دین کہلانے کا مستحق نہیں رہے گا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مغربی غیر مسلمین نے ہمیشہ اسلام کے تعلق سے ایک منفی نظریہ اختیار کیا جس کا اثر و نظارہ اس دور میں بھی موجود ہے۔ جب اسلامی روحانیت کے مقاصد و معاملات مستشرقین یورپ کی نظر سے گذرے تو اسلام سے منفصل کرنا ان کا ذاتی ایجنڈا ہو گیا۔ جیسے کہ Sir William Jones (The Sixth Discoveries on the Persians, 1807), Colond Sir John Malcolm (The History of Persians, 1815). James William Graham (A Treatise on Sufism or Mahamedan Mysticism, 1819) اور Re- thinking Islam in the contemporary world-2004 کی تحقیق مندرجہ بالا گفتگو کا اعتراف کرتی ہے اور یہ بھی واضح کرتی ہے کہ تشدد پسند مسلمان کا دور حاضر میں تصوف کے خلاف رائے رکھنا دراصل اسلامی تاریخ

میں ایک نئی فکر ہے۔ (ص:۱۱۔۱۰)

مستشرقین یورپ کی کثرت علم اور جید قابلیت پر گفتگو کرنا اس مختصر مضمون کا مقصد نہیں بلکہ ایک ایسے اہل علم ''اسلاموفو بیک'' فرقے کی نقاب کشائی کرنا ہے جن سے بڑی تعداد میں علماو مشائخ بے خبر ہیں۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات تو ظاہر ہو جاتی ہے کہ خالص علم ہی کافی نہیں ہے رشد و ہدایت کے لئے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا گفتگو جو مختصر سے ورق اور وقت میں تیار ہوئی اس سے مغربی معاشرہ اور تصوف کے متعلق کچھ حد تک خلاصہ ہوا۔ تین اہم مسائل پر بھی مختصری گفتگو ہوئی، لیکن ان ساری منفی حقیقتوں کے باوجود بھی تصوف مغربی ملت کا ایک ضروری حصہ بن چکا ہے جو نہ صرف ذریعۂ تزکیۂ نفس ہے بلکہ انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے ایک بڑی طاقت بنتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اکیڈمیز (Academies) جیسے شیخ مائیکل مومیسا (Michel Mumisa) یونیورسٹی آف کیمبرج میں اور مصطفیٰ ڈرپر (Mustafa Darper) یونیورسٹی آف برمنگھم میں تصوف کے تعلق سے عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ علماو مشائخ میں سلسلۂ نقشبندیہ حقانیہ، شیخ فیض الاقطاب صدیقی، شیخ نور الاقطاب صدیقی شیخ زین الاقطاب صدیقی، علامہ سید عرفان شاہ مشہدی، پیر علاء الدین صدیقی، پیر عبدالقادر جیلانی، پیر معروف اور شیخ طریقت حضرت سید محمد جیلانی اشرف جیسے اور بھی شخصیات متحد ہو کر اپنے اپنے سلاسل کا پرچم لہرا رہے ہیں۔ جس کی دور حاضر کے مغربی معاشرے میں سخت ضرورت ہے۔ آج اس تصوف کو جو ایک حقیقت ہے اسی حقیقت کا احیاء کرنا وقت کی پکار ہے۔ بالآخر ''صوفی فاؤنڈیشن'' کے زیر انتظام ''المیزان'' کا ''صوفیہ نمبر'' تصوف کو اس کے قدیم ترین مقام پر پہنچانے کا ایک اہم اور تاریخ ساز قدم ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس کے منتظمین و مرتبین کو مبارک باد دیتا ہوں اور جس عظیم مقصد کے لئے ہمارے آباواجداد نے اپنی حیات وخدمات وقف کر دی اور کرتے جا رہے ہیں۔ اس عظیم مقصد کو نئی نسل تک پہنچانے کی کوشش ہم آخری سانس تک کریں گے۔ ایسی ہمیں توفیق دائمی اللہ سبحانہ وتعالیٰ عطا فرمائے۔ آمین۔

سید محمد حسینی اشرف
ایم اے۔ ایم فل، انگلینڈ

اسپریچول پبلیکیشنز، دھلی

"المیزان" کی فخریہ پیش کش

(جلد اول)

کی اشاعت پر

دل کی گہرائیوں سے

مبارک باد پیش کرتا ہے

اسپریچول پبلیکیشنز

1543، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی

باب اول
افکار تصوف

تصوف: ماہیت، منبع، منہج اور مقامات

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی .... استاذ شعبۂ عربی مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تصوف، ضرورت واہمیت:

شریعت مطہرہ نے انسان کی صلاح وفلاح اور دنیا وآخرت میں اس کی کامیابی وکامرانی کے لئے اسے دو قسم کے احکام دیے ہیں: ان احکام کی ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کے جسم اور قالب سے ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کے روح وقلب سے ہے۔ پھر قلب وقالب دونوں سے متعلق احکام مزید دو دو قسموں میں منقسم ہیں: اوامر اور نواہی۔

جسم سے متعلق اوامر ہیں: نماز، زکاۃ، روزہ اور حج وغیرہ؛ نواہی ہیں: چوری، شراب نوشی اور زنا وغیرہ۔ اسی طرح قلب سے متعلق اوامر میں اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں، آسمانی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانا وغیرہ شامل ہے۔ صدق وتوکل، رضا اور شکر وغیرہ بھی اوامر قلبیہ کا حصہ ہیں۔ جبکہ قلب سے متعلق نواہی میں کفر، نفاق، کبر، بغض، ریا، حسد اور خود پسندی وغیرہ داخل ہیں۔

نجات کے لئے قلب وقالب دونوں کی اصلاح ضروری ہے، اور شرعاً دونوں سے متعلق احکام کی بجا آوری مطلوب ہے۔ لیکن احکام قلبیہ - اوامر ہوں یا نواہی - اس حیثیت سے زیادہ اہم ہیں کہ انھیں پر جسم کے اعمال کی صحت وقبولیت کا دارومدار ہوتا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، و إذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب"[1]

(بلاشبہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر یہ درست ہے تو پورا جسم درست ہے اور اگر یہ فاسد ہے تو پورا جسم فاسد ہے، ہوشیار رہو یہ ٹکڑا دل ہے۔)

جسم میں یہی وہ ٹکڑا ہے جو رب تعالیٰ کا محل نظر ہے، ارشاد نبوی ہے:

"إن الله لا ينظر إلى أجساد كم ولا إلى صور كم ولكن ينظر إلى قلوبكم"[2]

(اللہ تعالیٰ نہ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے، لیکن وہ تمہارا دل دیکھتا ہے۔)

لہٰذا دنیا میں اعمال کی صحت اور آخرت میں نجات دونوں کا دار مدار دل کی اصلاح پر ہے۔ اس سے قلب اور اس سے متعلق احکام دونوں کی غیر معمولی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں قلب سے متعلق احکام کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جسم کے برخلاف دل کے امراض وعیوب بہت خفی اور باریک ہوتے ہیں، جن کا علم وادراک بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ہم اپنے دل کے عیب کو ہنر اور نقص کو کمال سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی اپنے ٹوٹے ہوئے پیر کو صحیح نہیں سمجھتا، نہ ہی بخار اور سر درد کے شعور میں کبھی کوئی غلطی کرتا ہے، لیکن بے شمار لوگ ایسے ہیں جو تکبر کو عزت نفس، تملق کو احترام غیر، غیبت کو حق گوئی، اہانت ذات کو تواضع، بزدلی کو حزم واحتیاط، تہور کو شجاعت اور بخل کو اقتصاد سمجھتے ہیں۔

تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کے ذریعے دل کے تمام عیوب و امراض حتی کہ وساوس وخطرات کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔ اور دل سے متعلق احکام کی اچھی طرح سے بجا آوری کی جا سکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"قد أفلح من زكها" (الشمس: ۹) یعنی کامیاب وہ ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔

تصوف اسی تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کا نام ہے، جس کے ذریعے انسان اپنے ظاہر و باطن کی تعمیر کر سکتا ہے، تاکہ وہ ابدی سعادتوں سے ہمکنار ہو سکے۔ قاضی زکریا انصاری متوفی ۹۲۹ھ، تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"التصوف: علم تعرف به أحوال تزكية النفوس وتصفية الأخلاق و تعمير الظاهر و

الباطن لنيل السعادة الأبدية" ۳؎

(تصوف ایسا علم جس کے ذریعے نفوس کے تزکیہ، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال کو جانا جاتا ہے، تاکہ ابدی خوش بختی حاصل ہو سکے۔)

مختصر یہ کہ اعمال کا دارو مدار قلب پر ہے، اور وہی رب تعالیٰ کا محل نظر ہے، پھر قلب کی صلاح و فلاح تزکیہ پر موقوف ہے اور تزکیہ کے قواعد و وسائل کی معرفت تصوف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ان واضح اور یقینی مقدمات سے ہم اس واضح اور یقینی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: تصوف کی ضرورت واہمیت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

منبع تصوف:

دین کے تمام شعبوں کی طرح تصوف وتزکیہ کا منبع بھی منبع رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، بلکہ قرآن کریم تو تزکیہ کو ان کی بعثت کا مقصد قرار دے رہا ہے:

"لقد من الله على المومنين إذبعث فيهم رسولا من أنفسهم يتلو عليهم آياته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب و الحكمة" (آل عمران: ۱۶۴)

(بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت فرماتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

تزکیہ ہی کی طرح تصوف کے جملہ اصول وفروع کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔ تصوف اور علم تصوف میں تمیز نہ کرنے والے حضرات زبردست غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور اکثر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ یہ عہد صحابہ میں کیوں نہ تھا؟! اگر ان کی مراد علم تصوف ہے تو بلاشبہ یہ قرون اولیٰ میں نہیں تھا نہ اس وقت اس کی ضرورت تھی، بلکہ علم تفسیر اور دیگر علوم قرآن، علم حدیث، علم توحید وکلام اور علم فقہ واصول وغیرہ کوئی بھی علم اس مبارک ومسعود عہد میں نہیں تھا، اور نہ ان کی ضرورت تھی۔ اور اگر مراد تصوف ہے تو بلاشک وشبہ یہ اس عہد میں موجود تھا۔ خود مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام کا تزکیہ فرماتے تھے اور انھیں مجاہدۂ نفس یا "جہاد اکبر" کی تربیت دیتے تھے۔

شیخ محمد صدیق محدث غماری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أما أول من أسس الطريقة فلتعلم أن الطريقة أسسها الوحي السماوي في جملة ما أسّس من الدين المحمدي، إذهي بلا شك مقام الإحسان الذي هو أحد أركان الدين الثلاثه التي جعلها النبي صلى الله عليه و آله وسلم، بعد مابينها واحدا واحدا، دينا بقوله: "هذا جبريل عليه السلام أتاكم يعلمكم دينكم" وهو الإسلام والإيمان والإحسان. فالإسلام طاعة وعبادة والإيمان نورو عقيده، والإحسان مقام مراقبة و مشاهدة" ۴؎

(رہا یہ کہ تصوف کی بنیاد کس نے ڈالی تو جان لو کہ اس کی بنیاد وحی آسمانی نے ڈالی ہے جس طرح کہ دین محمدی میں ہر چیز کی بنیاد وحی آسمانی نے ڈالی ہے۔ بلاشبہ تصوف وہی ہے جسے (حدیث شریف میں) احسان کہا گیا ہے۔ احسان دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کر کے بیان کیا اور انھیں دین قرار دیا، بایں طور کہ فرمایا: "یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے"۔ یہ تینوں ارکان اسلام، ایمان اور احسان ہیں۔ اسلام: اطاعت وعبادت ہے، ایمان: نور وعقیدہ کا نام ہے، اور احسان: مقام مراقبہ ومشاہدہ ہے۔)

حدیثِ جبریل:

شیخ غماری نے جس حدیث شریف کی طرف اشارہ کیا ہے اور جسے انھوں نے تصوف کی بنیاد قرار دیا ہے، اصطلاح میں یہ حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے یہ حدیث نہ صرف تصوف بلکہ شریعت مطہرہ کی ایک اہم اصل ہے۔ یہ ایک صحیح ومشہور حدیث ہے۔ بے شمار اصحاب صحاح وسنن وآثار ومصنفات ومسانید نے اس کی روایت کی ہے۔ چونکہ یہ حدیث اہل تصوف کا بنیادی ماخذ ہے اور بقول صاحب فتح الباری یہ "بغیۃ السالکین، کنز العارفین اور عمدۃ الصدیقین" ہے، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے۔

امام مسلم اپنی الجامع الصحیح میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

"بين نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم، إذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب، شديد سواد الشعر، لايرى عليه أثر السفر، و لا يعرفه منا أحد، حتى جلس إلى النبي (صلى الله عليه و آله سلم) فأسند ركبتيه إلى ركبتيه، ووضع كفيه على فخذيه، وقال يا محمد! أخبرني عن الإسلام؟ فقال رسول الله: " الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، و تقيم الصلاة، و توتى الزكاة، و تصوم رمضان، و تحج البيت إن استطعت إليه سبيلا" قال: صدقت، قال: فعجبنا له يسأله ويصدقه، قال: فأخبرني عن الإيمان؟ قال: "أن تومن بالله، وملائكته، و كتبه، ورسله، واليوم الآخر، وتومن بالقدر خيره و شره"، قال: صدقت، قال: فأخبرني عن الإحسان؟ قال: "أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فانه يراك"، قال فأخبرني عن الساعة؟ قال: "ماالمسؤل عنها بأعلم من السائل"، قال فأخبرني عن أمارتها؟ قال: "أن تلدالأمة ربتها، وأن ترى الحفاة العراة، العالة، رعلة الشلة، يتطاولون في البنيان"، قال: ثم انطلق، فلبثت مليا، ثم قال لي: "يا عمر! أتدري من السائل؟" قلت: الله ورسوله أعلم، قال: "فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم" ۵

(ایک دن ہم لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں تھے کہ ہمارے درمیان ایک شخص آیا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال خوب کالے تھے نہ تو اس پر سفر کا کوئی اثر تھا نہ ہم میں سے کوئی اس سے واقف تھا۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا بایں طور کہ اس نے اپنے گھٹنوں کو حضور کے گھٹنوں سے ملا دیا اور اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر رکھ لیا۔ اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا کہ: "اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، زکاۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت ہو تو حج کرو"۔ اس شخص نے کہا: آپ نے سچ فرمایا: راوی (حضرت عمر) کہتے ہیں کہ: ہمیں اس شخص سے بہت تعجب ہوا کہ خود سوال کر رہا ہے اور خود ہی تصدیق کر رہا ہے، پھر اس شخص نے پوچھا مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے؟ فرمایا: "کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور اچھی، بری تقدیر پر"۔ اس شخص نے کہا: آپ نے صحیح فرمایا، اور کہا کہ: مجھے احسان کے بارے میں بتایئے؟ فرمایا کہ "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہ دیکھ سکو تو (یہ یقین رہے کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" اس شخص نے کہا: مجھے قیامت کے بارے خبر دیجئے؟ فرمایا: "جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا"۔ اس شخص نے عرض کیا: اچھا تو پھر اس کی نشانیوں کے بارے میں مطلع کیجئے؟ فرمایا: "کہ باندی اپنی مالکن کو پیدا کرے گی، اور تم دیکھو گے کہ برہنہ پا و برہنہ بدن، دوسروں پر گزارا کرنے والے، بکریاں چرانے والے، کوٹھیوں میں اترائیں گے"۔ راوی فرماتے ہیں کہ پھر وہ شخص چلے گئے، میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے عمر! کیا تم جانتے ہو کہ یہ سوال کرنے والا کون تھا؟" میں نے عرض کیا: اللہ ورسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: "یہ جبریل (علیہ السلام) تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے"۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمارہ ابن قعقاع اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ علاوہ ازیں اکثر روایتوں میں "أن تعبد الله" ہی آیا ہے البتہ بعض روایتوں میں "أن تعمل لله"۶ (اللہ کے لئے یوں عمل کرو...) اور بعض دوسری روایتوں میں "أن تخشى الله"۷ (اللہ سے ایسا ڈرو...) وارد ہوا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علما و محدثین نے بڑے ایمانی وعرفانی نکات بیان کیے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر یہاں صرف ایک بات عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان حق ترجمان

سے ایک نہایت مہتم بالشان امر کا بیان کروارہا ہے، ارکان دین متین کی وضاحت کروارہا ہے، لہٰذا اس مہتم بالشان امر کے شایان شان اہتمام بھی کیا جارہا ہے، حضرت جبریل کو سائل بنا کر بھیجا جارہا ہے تا کہ حدیث شریف میں بیان کردہ امور کی قدر وشان کا اندازہ ہوسکے۔ اس حدیث میں حضرت جبریل نے تین سوالات کیے: اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ اوراحسان کیا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سوالوں کے جواب مرحمت فرمائے اور پھر فرمایا کہ: ''یہ جبریل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے'' ۔اس طرح یہ حقیقت آفتاب نیم روز کی طرح واضح ،اوراس امر میں ظاہر بلکہ نص ہے کہ ایمان، اسلام اوراحسان دین محمدی کے تین ارکان ہیں جن میں سے کسی ایک کے بغیر دین مکمل نہیں ہے۔اور کسی ایک کا بھی انکار دین کا انکار ہے۔

احسان وتصوف:

حدیث جبریل میں جسے احسان کہا گیا ہے بعد میں اسی کا نام تصوف ہوگیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: احسان یہ ہے کہ ''أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فانه يراك'' یعنی خدا کی بندگی یوں کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اس کا مشاہدہ کررہے ہو، اوراگر تمہیں یہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہو تو کم ازکم یوں اس کی بندگی کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پہلا مرحلہ مرحلۂ مشاہدہ ہے جو اعلیٰ درجے کا ہے یہی تصوف کی منزل ہے، یہی سالکین طریقت کی منتہائے آرزو ہے۔اور دوسرا مرحلہ مرحلۂ مراقبہ ہے یعنی اس تصور کے ساتھ عبادت کرو کہ تمہاری نگرانی ہورہی ہے۔اور مراقبے کا یہ مسلسل تصور کبھی بھی اخلاص کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔تصوف انھیں دونوں مرحلوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے کہ تصوف نام ہے سلوک اور وصول کا،صوفی یا تو سالک ہوتا ہے یا پھر واصل ہوتا ہے۔ سلوک راستہ (طریقت) ومراقبہ ہے،اور وصول: منزل ومشاہدہ ہے۔

شارح مسلم امام نووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف متوفی ۶۷۶ھ، فرماتے ہیں کہ:

''قوله صلى الله عليه وسلم: (الإحسان أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك) هذا من جوامع الكلم التى أوتيها صلى الله عليه وسلم، لأنا لو قدرنا أنّ أحد نا قام فى العبادة و هو يعاين ربه سبحانه تعالى لم يترك شيئاً مما يقدر عليه من الخضوع و الخشوع و حسن الصمت'' ۔8

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کہ: ''احسان یہ ہے کہ تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر اسے نہ دیکھ سکو تو یوں گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ یہ ان جوامع الکلم میں سے ہے جو آپ اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیے گئے ہیں۔اس لئے کہ اگر ہم اندازہ کریں کہ ہم سے کوئی اس حال میں عبادت کے لئے کھڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے رب سبحانہ تعالیٰ کا مشاہدہ کررہا ہو، تو وہ خضوع وخشوع اور جمال سکینۂ ووقار میں سے حسب مقدور کوئی چیز ترک نہیں کرسکتا ہے۔)

اس حدیث کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جسے امام نووی نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

"وهذا الحديث قد اشتمل على شرح جميع وظائف العبادات الظاهرة والباطنة من عقود الإيمان و أعمال الجوارح وإخلاص السرائر، و التحفظ من آفات الأعمال حتى أن علوم الشريعة كلها راجعة إليه، و متشعبة منه، قال: وعلى هذا الحديث وأقسامه الثلاثه ألفنا كتابنا الذى سميناه بالمقاصد الحسان فيما يلزم الإنسان، إذ لا يشذ بشئ من الواجبات و السنن والرغائب و المحظورات و المكروهات عن أقسامه الثلاثه والله أعلم'' ۔9

(یہ حدیث شریف ایمان کے ارکان، اعضاء کے اعمال، باطن کے اخلاص اور عمل کی آفتوں سے حفاظت غرض یہ کہ جملہ اعمال ظاہر و باطن کے شرح وبیان پر مشتمل ہے۔ یہ تمام شرعی علوم کی اصل ہے اور سارے علوم اس کی شاخیں ہیں۔ہم نے اس حدیث میں مذکور تینوں ارکان دین پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''المقاصد الحسان فيما يلزم الانسان'' رکھا ہے، کیونکہ واجبات، سنن، مستحبات، ممنوعات اور

مکروہات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان تینوں قسموں سے باہر ہو۔)

امام ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، حدیث جبریل میں مذکور احسان اور اس کی تعریف کو دین کا رکن رکین اور تصوف کی اصل متین قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"وهذا القدر من الحديث الشريف أصل عظيم من أصول الدين وقاعدة مهمة من قواعد المسلمين. وهو عمدة الصديقين، و بغية السالكين، و كنز العارفين، ودأب الصالحين. وهو من جوامع الكلم التي أوتيها رسول الله صلى الله عليه وسلم"۔[10]

(حدیث شریف کا یہ حصہ (أن تعبد الله كانك...) دین کے اصول میں سے ایک عظیم اصل ہے اور مسلمانوں کے قاعدوں میں سے ایک اہم قاعدہ ہے۔ یہ صدیقین کا معتمد علیہ، سالکین طریقت کا ہدف و مقصد، عارفین باللہ کا خزانہ اور صالحین کا طریقہ ہے۔ یہ ان جوامع الکلم میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیے گئے ہیں۔)

نووی وعسقلانی رحمہما اللہ کی طرح تمام علمائے حق کا اجماع ہے کہ حدیث جبریل میں مذکور احسان - جو دین کے تین رکنوں میں سے ایک رکن ہے - تصوف ہی ہے۔ اور مرتبۂ احسان کا حصول علم تصوف کے ذریعے ہی ہوتا ہے، کیونکہ جیسے دین کے رکن اول ایمان کی تفسیر علم کلام نے کی ہے، رکن ثانی کی تفصیل و بیان کا کام فقہ نے کیا ہے، ویسے ہی رکن اخیر یعنی احسان کی شرح وبسط اور اس کی عقدہ کشائی کا عمل علم تصوف نے انجام دیا ہے۔ اور ان تینوں کا مصدر و منبع رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات وستودہ صفات ہے، ان کی لائی ہوئی کتاب ہے، ان کی سنت وسیرت ہے، اور ان کی تعلیم وہدایت ہے۔

ذیل میں تصوف کے عملی منہج کے اہم اور ضروری عناصر کے ساتھ ساتھ سلوک الی اللہ کے چند احوال ومقامات کا کتاب وسنت سے ثبوت پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ تصوف پر عجمیت کا بہتان لگانے والی یا اسے عیسائیت، بدھ ازم یا ہندومت سے ماخوذ قرار دینے والی نام نہاد "دانشوری" کو مجال سخن نہ رہے۔ واضح رہے کہ یہ ایک محدود و سرسری جائزہ ہے، جس میں نہ پورے نظام تصوف کا احاطہ ممکن ہے، اور نہ سارے احوال ومقامات کے ذکر کی گنجائش ہے۔ یہاں تو صرف اس بات کا اثبات مطلوب ہے کہ جس طرح اصل تصوف یعنی احسان کا مصدر سنت نبویہ ہے، اسی طرح اس کے تمام اہم فروع اور سلوک الی اللہ کے تمام مراحل اور احوال ومقامات کا منبع بھی کتاب وسنت ہے۔ لہٰذا مقالے میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ نہ منطقی دلائل پیش کیے جائیں نہ عقلی حجتوں سے تعرض کیا جائے، نہ فقہی، کلامی، تفسیری اور تاریخی روایتوں پر اعتماد کیا جائے اور نہ صوفی یا غیر صوفی کسی بھی غیر معصوم کے قول کو سند بنایا جائے، بلکہ صرف اور صرف حجت معصومہ پر اکتفا کیا جائے۔ محض اللہ عزوجل کی کتاب اور سنت صحیحہ ثابتہ کو ہی دلیل بنایا جائے۔ تاکہ یہ ایک طرف اہل تصوف کے لئے حجت ہو اور دوسری طرف معارضین تصوف کے لئے عبرت ونصیحت ہو۔

منہج عملی

۱- صحبت:

صالحین کی صحبت؛ سالکین طریقت کی پہلی منزل ہوتی ہے، حکم ربانی ہے:

"يا ايها الذين آمنو اتقو الله و كونوا مع الصادقين" (التوبة: ۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔)

صحبت کی اہمیت وضرورت کا بیان، سورۃ الاحزاب: ۲۳، الکہف: ۲۸، ۶۶، ۶۷، لقمان: ۱۵، الفرقان: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۵۹، اور الزخرف: ۶۷، میں بھی ہوا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحبت کے اثرات کو لازمی قرار دیتے ہوئے بے حد دلکش اور یقین افروز مثال پیش فرماتے ہیں:

"إنما مثل جليس الصالح و جليس السوء كحامل المسك و نافخ الكير، فحامل المسك إما أن يحذيك، وإما أن تبتاع منه، وإما أن تجد منه ريحا طيبة. و نافخ الكير، إما أن يحرق ثيابك و إما أن تجد منه ريحا منتنة"[11]

(اچھے اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے مشک رکھنے والا، اور لوہار کی دھونکنی دھونکنے والا، مشک رکھنے والا یا تو تمھیں ہدیہ دے گا یا

تم اس سے خریدوگے یا اس سے اچھی خوشبو پاؤگے، اور دھونکنی والا یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا یا تم اس سے بری بدبو پاؤگے۔)

یعنی صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے چنانچہ اچھوں کی صحبت سے فائدہ ضرور ہوتا ہے کم ہو یا زیادہ اسی طرح بروں کی صحبت سے نقصان ضرور ہوتا ہے کم ہو یا زیادہ۔ بلکہ ایک دوسری حدیث میں تو آپ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ لوگ اپنے دوستوں کے عقیدہ و مذہب پر ہوتے ہیں، چنانچہ امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، اور امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الرجل على دين خليله فلينظر أحد كم من يخالل" [12]

(ہر شخص اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے لہٰذا تم میں سے ہر ایک غور کرے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔)

۲-بیعت:

سالک و صوفی ابتدائے سلوک میں شیخ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام کر نیکیوں کے التزام اور گناہوں کے اجتناب کا عہد کرتا ہے۔ اسی عہد کا نام بیعت ہے۔ تصوف میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ اس بیعت کی ضرورت اور اس کا مقصد و طریقہ سب کچھ کتاب و سنت سے ماخوذ ہے۔

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

"إن الذين يبايعونك إنما يبايعون الله، يد الله فوق أيديهم، فمن نكث فإنما ينكث على نفسه، و من أوفى بما عاهد عليه الله فسيؤتيه أجرا عظيما" (الفتح:۱۰)

(جو لوگ آپ کی بیعت کر رہے ہیں درحقیقت وہ اللہ کی بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، تو جس نے بیعت کو توڑا اس کا وبال اسی پر ہوگا اور جس نے اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جلد ہی بڑا اجر دے گا۔)

سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں اخذ بیعت اور حصول عہد کی متعدد صورتیں ملتی ہیں، جیسے مردوں کی بیعت، عورتوں کی بیعت، فرد واحد کی بیعت، پوری جماعت کی بیعت وغیرہ، یہاں تک کی نابالغ بچوں کی بیعت بھی سنت صحیحہ میں ملتی ہے۔

امام بخاری علیہ رحمۃ الباری متوفی ۲۵۶ھ، حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کرتے ہیں کہ، ارشاد نبوی ہے:

"بايعوني على أن لاتشركوا بالله شيئاً، و لا تزنوا، ولا تقتلوا أولادكم ولاتأتوا ببهتان تفترونه بين أيديكم وأرجلكم، ولا تعصوا في المعروف، فمن وفى منكم فأجره على الله، ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدنيا فهو كفارة له، ومن أصاب من ذلك شيئاً ثم ستره الله فهو إلى الله إن شاء عفا عنه و إن شاء عاقبه، فبايعناه على ذلك" [13]

(اس شرط پر میری بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراؤگے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے، بہتان کے ذریعے کھلی افتراء پردازی نہیں کروگے، بھلائی میں نافرمانی نہیں کروگے۔ پس تم میں سے جو بھی عہد کو پورا کرے گا اس کی جزاء اللہ کے ذمہ ہے، اور جس سے ان میں سے کوئی چیز سرزد ہوگئی پھر دنیا میں اسے سزا مل گئی تو وہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوگی، اور جس سے ان میں سے کوئی گناہ سرزد ہوا پھر اللہ نے اسے پوشیدہ رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چاہے گا تو معاف کردے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا۔ پھر ہم نے اسی پر آپ کی بیعت کی۔)

۳-مجاہدہ:

جہاد کی طرح مجاہدہ بھی فعل: "جاهد/ يجاهد" کا مصدر ہے: جیسے "عاقب/ يعاقب/ معاقبة وعقابا"، البتہ عام استعمال میں مجاہدہ: جہاد بالنفس کے لئے، اور جہاد: ظاہری دشمن سے مجاہدہ بالسلاح کے لئے بڑی حد تک مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن اصل معنی کی رعایت میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ بھی خوب استعمال ہوتے ہیں۔ مجاہدے کی تین قسمیں ہیں: ۱-ظاہری دشمن سے مجاہدہ، ۲-شیطان سے مجاہدہ اور ۳-نفس سے مجاہدہ۔ اور مجاہدے کی یہ تینوں قسمیں شرعاً مطلوب ہیں لیکن آخر الذکر یعنی مجاہدۂ نفس کو بقیہ دونوں قسموں پر ایک گونہ فضیلت

حاصل ہے کیونکہ جولوگ مجاہدۂ نفس کی منزل سے گزر چکے ہوتے ہیں وہی صحیح معنوں میں ظاہری دشمن سے مجاہدے (جہاد) کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ اسی لئے مجاہدۂ نفس کو ''جہاد اکبر'' کہا گیا ہے۔ آج امت اسلامیہ غیر مزکی نفوس کے جہاد سے جس قدر آزردہ اور جس طرح اقوام عالم کے سامنے متہم ہے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اگر گزشتہ ۲۰/۲۵ سالوں میں ان نام نہاد مجاہدوں کی ''پروگریس رپورٹ'' دیکھیے تو ان کے ہاتھوں سے مرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کی تعداد سے ہزاروں گنا زیادہ ہے صرف ایک الجزائر میں لاکھوں مسلمان اس ''جہادی جنون'' کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان مظلوموں کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ ائمہ کی تقلید کرتے تھے اور تصوف کی تائید کرتے تھے۔

مجاہدۂ نفس بھی کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ آیت کریمہ ''وجاهدوا في الله حق جهاده'' (الحج:۷۸) یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حکم ہے۔ اور آیت کریمہ: ''وجاهدوا بأموالكم وأنفسكم في سبيل الله'' (التوبۃ:۴۱) یعنی اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، ان آیتوں میں ظاہری دشمن، شیطان اور نفس تینوں سے جہاد شامل ہے۔ یعنی یہ آیتیں جہاد کی تینوں قسموں کا احاطہ کیے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب جہاد کی تین قسمیں ہیں تو کتاب وسنت میں جہاں جہاں جہاد کا حکم ہوگا اس میں یہ تینوں قسمیں داخل ہوں گی ہاں اگر کسی آیت یا حدیث میں ایسا کوئی قرینہ ہو جو اسے ایک ہی قسم میں محدود کردے تو وہاں قرینے کے مطابق جہاد کی وہی مخصوص قسم مراد ہوگی۔ مثلاً اگر قتال کے شروع ہونے سے قبل اور جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے کسی آیت میں جہاد کا حکم ہے تو یہ ایک قرینہ ہے کہ یہاں جہاد سے مراد مجاہدۂ نفس ہے: جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' (العنکبوت:۶۹)

(جنھوں نے ہماری رضا کی طلب میں مجاہدہ کیا ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھائیں گے۔)

یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور قتال کا حکم مدینے میں فرض ہوا۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ آیت میں مجاہدے سے مراد مجاہدۂ نفس یا مجاہدۂ شیطان ہے۔ مفسرین کرام نے بھی اس کی تائید کی ہے، امام قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد متوفی ۶۷۱ھ، فرماتے ہیں:

''قال السدي وغيره إن هذه الآية نزلت قبل فرض القتال'' [۱۴]

(امام سدی اور دوسرے ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت جہاد کی فرضیت سے قبل نازل ہوئی۔)

شیخ ابومحمد عبدالحق اندلسی متوفی ۵۴۶ھ، اپنی کتاب ''المحرر الوجیز فی تفسیر کتاب اللہ العزیز'' میں فرماتے ہیں کہ آیت میں جہاد و مجاہدہ سے مراد ہے:

''مجاهدة النفس في طاعة الله عزوجل وهو الجهاد الأكبر'' [۱۵]

(اللہ کی اطاعت میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہے، اور وہی جہاد اکبر ہے۔)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، فرماتے ہیں:

''أي من جاهد بالطاعة هداه سبل الجنة'' [۱۶]

(جس نے اطاعت و بندگی کے ساتھ مجاہدہ نفس کیا تو اللہ نے جنت کے راستوں کی جانب اس کی ہدایت کی۔)

علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی متوفی ۱۲۷۰ھ، لکھتے ہیں کہ:

''قال ابن عطا: أي الذين جاهدوا في رضانا لنهدينهم إلى محل رضانا'' [۱۷]

(ابن عطا فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی ہے کہ جن لوگوں نے ہماری رضا کے حصول کے لئے مجاہدہ نفس کیا ہم انھیں مقام رضا تک ضرور پہنچائیں گے۔)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مجاہدہ نفس کو جہاد کی تینوں قسموں میں سب سے افضل قرار دیا ہے۔ اور اپنی امت کو اس کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''المجاهد من جاهد نفسه في الله'' (حقیقی مجاہد وہ ہے جو راہ خدا میں مجاہدۂ نفس کرے۔) امام ترمذی نے کتاب فضائل الجہاد میں اس کی تخریج کی ہے اور فرمایا ہے: ''حديث حسن صحيح''۔ [۱۸]

بعض روایتوں میں 'لله' یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے مجاہدۂ نفس کرے، بھی آیا ہے۔ [۱۹]

۴-ذکر:

قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے کبھی یہ کتاب اللہ کے معنی میں آیا ہے (إنا نحن نزلنا الذکر)، کبھی نماز جمعہ کے لئے استعمال ہوا ہے (فاسعوا إلی ذکر اللہ)، تو کبھی علم کے معنی میں استعمال ہوا ہے (فاسألوا أهل الذکر) لیکن بایں ہمہ کتاب اللہ میں اس لفظ کا غالب استعمال اسی معنی میں ہوا ہے جس معنی میں اہل تصوف کے یہاں یہ لفظ رائج ہے۔ یعنی تسبیح وتہلیل وتکبیر وحمد وثنا اور درود وسلام وغیرہ، ارشاد ربانی ہے:

"یا أیها الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا وسبحوه بکرة وأصیلا" (الاحزاب:۴۲،۴۱)

(اے ایمان والوں اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کیا کرو اور صبح وشام اس کی پاکی بیان کیا کرو)

اس کے علاوہ بے شمار آیات میں ذکرالٰہی کی اہمیت ،فضیلت اور ثمرات کا ذکر ملتا ہے مثلا: البقرہ: ۱۵۲، ال عمران ۴۱، ۱۹۱، الاحزاب ۳۵، الرعد: ۲۸، البقرہ: ۱۱۴، النور، ۳۶، ۳۷، المنافقون: ۹، اور الاحزاب: ۳۵، وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم سنت نبوی کی طرف دیکھیں تو اس میں تصوف کا "ذکر" (یاد کرنا) بھی ملتا ہے "تذکیر" (یاد کرانا) بھی ملتی ہے، "مذاکرہ" (شیخ پر احوال قلب کو پیش کرنا) بھی ملتا ہے اور "حلقہ ہائے ذکر" کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

ا-ذکر:

نذکر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مثل الذی یذکر ربه والذی لایذکر ربه مثل الحی والمیت" ۲۰

(اپنے رب کا ذکر کرنے والے اور اپنے رب کا ذکر نہ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ)

یعنی ذکر کرنے والا ہی حقیقت میں زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے، شاید اسی لئے تصوف میں ذکرالٰہی کو روح کی غذا کہتے ہیں جس کے بغیر روح زندہ نہیں رہتی ہے۔

ب:تذکیر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وذکر فإن الذکری تنفع المومنین" (الذاریات:۵۵)

(یاد کرایئے اس لئے کہ یاد کرانا مومنین کو منفع پہنچاتا ہے)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی متعدد مقام پر تذکیر کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کا شوق دلایا ہے۔ حدیث قدسی "أنا عند ظن عبدی بی" (میں اپنے بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے) میں اللہ رب العزت جل جلالہ فرماتا ہے: "وإن ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منه" (اگر میرا بندہ ایک گروہ میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے بہتر گروہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور مجمع میں ذکرالٰہی کرنا، یا لوگوں کو ذکر سنانا اور انھیں ذکر کرانا یہ سب تذکیر ہے۔

ج-مذاکرہ:

اہل ذکر سے سوال واستفسار مذاکرہ کہلاتا ہے، آیت: "فاسألوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون" (الفرقان:۵۹) اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: "المستشار مؤتمن" (۲۲) یعنی مشورہ کرنے والا امامون رہتا ہے، مذاکرے کو بھی شامل ہیں۔ مذاکرہ سالک کا اپنے شیخ سے مشورہ ہی ہوتا ہے۔

امام مسلم بن حجاج نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ، اپنی الجامع الصحیح، کتاب التوبہ میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

"ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مجھے ملے تو پوچھا کہ: اے حنظلہ کیسے ہو؟ میں نے کہا کہ: حنظلہ تو منافق ہوگیا، کہا: سبحان اللہ! کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ جب ہم رسول اللہ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت و دوزخ کی تذکیر (یاد) کراتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، لیکن جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے نکلتے ہیں تو ہم بیوی بچوں اور روزی میں لگ جاتے ہیں اور بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم مجھے بھی اس طرح پیش آتا ہے۔ تو ہم دونوں چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ حنظلہ تو منافق ہوگیا، فرمایا کہ: وہ کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ یا

رسول اللہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت و دوزخ کی یاد کراتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو گھر والوں اور کاروبار میں لگ جاتے ہیں اور بیشتر باتیں فراموش کر دیتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر تم لوگ جس حالت میں میرے پاس اور ذکر کے وقت ہوتے ہو اسی پر ہمیشہ باقی رہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے (یہ تین بار فرمایا)'' ۲۳

الحمد للہ کہ اس حدیث شریف میں ذکر، تذکیر اور مذاکرہ تینوں کا ثبوت موجود ہے۔ حضرت حنظلہ نے اپنے دل کے خیالات کو جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں جس طرح جواب مرحمت فرمایا۔ اس کو تصوف میں مذاکرہ کہتے ہیں۔

د-حلقۂ ذکر:

حلقۂ ذکر کا انعقاد صوفیا کے معمولات کا اہم حصہ ہے۔ اس کا مرجع بھی نبوی تعلیمات ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''إذا مررتم برياض الجنة فارتعوا''، قالوا: و ما رياض الجنة ؟ قال: ''حلق الذكر'' ۲۴

(جب تم جنت کی کیاریوں سے گزرو تو چرلیا کرو یعنی اس سے استفادہ کرلیا کرو، عرض کیا یا رسول اللہ جنت کی کیاریاں کیا ہیں؟ فرمایا حلقہ ہائے ذکر۔)

امام ترمذی رحمہ اللہ کی تخریج کردہ یہ حدیث جسے انھوں نے ''حسن'' کہا ہے، نہ صرف حلقۂ ذکر کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے بلکہ اس میں حلقۂ ذکر میں شرکت کرنے کی زبردست ترغیب بھی ہے۔ اسی طرح ذکر الٰہی کی تمام دوسری قسمیں جیسے: سری وجہری، لسانی وقلبی، حرکی وسکونی، فردی واجتماعی وغیرہ تمام معمولات صوفیا کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔

۵-خلوت:

تصوف میں خلوت کی بڑی اہمیت ہے۔ ظاہر بیں لوگ اسے صوفیا کی بدعت سمجھتے ہیں لیکن صوفیائے کرام اس کا التزام اپنے رب کی اطاعت اور اس کے حکم کی بجا آوری میں کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

''واذكر اسم ربك و تبتّل إليه تبتيلا'' (المزمل: ۸)

(اپنے رب کے نام کا ذکر کیجئے اور پوری طرح سب سے علاحدہ ہو کر اسی کے ہو جائیے۔)

اس آیت میں خطاب اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، لیکن اس میں موجود خلوت کا حکم سبھی کے لئے عام ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی حکم دیا جائے لیکن آپ کے ساتھ اس کے مخصوص ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو تو پوری امت سے اس حکم کی بجا آوری مطلوب ہوتی ہے۔

حکم ربانی کی پیروی کے ساتھ ساتھ صوفیا کی خلوت نشینی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے اتباع میں ہوتی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جاورت بحراء شهرا'' ۲۵ یعنی میں نے ایک ماہ غار حراء میں خلوت نشینی کی۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ابتدا سوتے وقت رویائے صالحہ سے ہوئی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ دن کی مانند واضح طور پر پیش آتا تھا۔ مزید فرماتی ہیں کہ:

''ثم حبب إليه الخلاء ويخلو بغار حراء، فيتحنث فيه ـ وهو التعبد ـ الليالي ذوات العدد'' ۲۶

(پھر آپ کو خلوت نشینی محبوب کردی گئی، اور آپ کئی کئی رات غار حراء میں خلوت نشیں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔)

ب-احوال مقامات

ا-توبہ:

شرعاً قابل مذمت سے لائق ستائش کی طرف رجوع کرنے اور لوٹنے کا نام توبہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا (التحریم: ۸)

(اے ایمان والو! اللہ تعالی سے سچی اور کھری توبہ کرو۔)

توبہ واستغفار کا ذکر قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ قلب سالک کا

پہلا مقام ہے لہٰذا تصوف میں توبہ کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ صحیح توبہ پر ہی سلوک کی اگلی منزلوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفیا کے یہاں توبہ کا بہت اہتمام ملتا ہے، اور اسے فاتح باب سلوک مانا جاتا ہے۔ خود ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"یا أیھا الناس توبوا إلی اللہ، فإني أتوب فی الیوم إلیه مائة مرة" ۲۷

(اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو، میں بھی ہر روز اس سے سو بار توبہ کرتا ہوں۔)

۲-محاسبہ:

نفس سے حساب لینے اور اس کی نگرانی کرنے کو محاسبہ کہتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

"ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ" (التکاثر:۸)

(پھر اس دن تم سے ضرور ضرور نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔)

چنانچہ صوفیا آخرت کے حساب سے پہلے ہی ہمہ وقت نفس کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں، تاکہ آخرت میں محاسبہ کے وقت شرمندگی نہ ہو، اور یہی سچی دانائی ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"الکیس من دان نفسه، وعمل لما بعد الموت" ۲۸

(عقل مند اور دانا وہ ہے جو اپنے نفس کا اچھی طرح محاسبہ کرے، اور مرنے کے بعد کے لئے عمل کرے۔)

۳-خوف:

مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز کی توقع کی وجہ سے جو قلبی تکلیف ہوتی ہے اسے خوف کہتے ہیں۔ تصوف میں خوف کا درجہ بہت بلند ہے۔ کیوں کہ یہ عرفان خداوندی کی دلیل ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے:

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (فاطر:۲۸)

(بے شک اللہ سے خوف کرنے والے اس کے عالم بندے ہی ہیں۔)

خوف خداوندی ایمان کی نشانی ہے:

"وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (آل عمران:۱۷۵)

(اگر ایمان والے ہو تو مجھ سے ڈرو۔)

خوف کا یہ مقام ہے کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرنے والوں کے لئے دو دو جنتیں ہیں دنیا میں جنت معارف، اور عقبی میں جنت زخارف، ارشاد الٰہی ہے:

"وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ" (الرحمان:۴۶)

(جو اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔)

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من خاف أدلج ومن أدلج بلغ المنزل، ألا إن سلعة اللہ الغالیة ألا إن سلعة اللہ الجنة" ۲۹

(جس نے خوف کیا وہ اندھیرے منہ چل پڑا، اور جو اندھیرے منہ چل پڑا وہ منزل پر پہنچ گیا۔ یاد رکھو! متاع الٰہی بہت گراں ہے، یاد رکھو! متاع الٰہی جنت ہے۔)

۴-رجاء (امید):

یہ مقام مقام خوف کا متمم اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ: الإیمان بین الخوف والرجاء "یعنی ایمان امید وبیم کے درمیان ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

"قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" (الزمر: ۵۳)

(کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے خود پر ظلم کیا ہے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک اللہ تعالی تمام گناہوں کی مغفرت فرماتا ہے، وہ بڑی مغفرت اور نہایت مہربانی کرنے والا ہے۔)

اللہ تعالی سے ہر حال میں رجاء وامید رکھنی چاہیے اس لئے کہ وہ فرماتا ہے کہ:

"وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" (الاعراف:۱۵۵)

(یعنی میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔)

امام بیہقی نے سعید ابن مسیب سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر مریض ہوئے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے، اور پوچھا: "اے عمر خود کو کیسا پار ہے ہو؟" عرض کیا: امید بھی رکھتا ہوں اور ڈرتا بھی ہوں، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ما اجتمع الرجاء والخوف فی قلب مومن إلا أعطاه اللہ الرجاء وآمنه (من) الخوف" ۳۰

(جب بھی کسی مومن کے دل میں امید اور خوف اکٹھا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس مومن کی امید پورا فرماتا ہے اور اسے اس خوف سے امن رہتا ہے۔)

۵-صدق:

صدق سیر الی اللہ کا ایک اہم مقام اور احوال قلب میں سے ایک بلند مرتبت حالت ہے۔ صوفیا کے نزدیک صدق کا تعلق عوام کی طرح صرف زبان سے نہیں ہوتا ہے بلکہ دل، اعمال اور احوال سے بھی ہے۔ تصوف میں صدق کی فضیلت واہمیت کتاب وسنت کا ہی اثر ہے۔ اللہ کی کتاب میں صدیقین کا درجہ انبیا کے فوراً بعد آیا ہے (النساء: ۶۹) اور مومنین کو صادقین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (التوبہ: ۱۱۹)

شیخین رحمہما اللہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"إن الصدق یهدی إلی البر وإن البر یهدی إلی الجنة" ۳۱

بیشک صدق نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔)

۶-اخلاص:

اخلاص خدا اور بندے کے درمیان ایسا راز ہے جس پر کوئی مطلع نہیں ہوتا ہے۔ تصوف میں اخلاص کا بلند مقام سنت وکتاب ہیں اس کے بلند مقام کا ہی پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ" (الزمر: ۱۱)

(کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کروں خالص اسی کا ہو کر۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"إن الله لا یقبل من العمل إلا ما کان له خالصا" ۳۲

(اللہ تعالیٰ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لئے ہو۔)

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث ہے کہ:

"إن الله لا ینظر إلی أجسامکم ولا إلی صورکم ولکن ینظر إلی قلوبکم" ۳۳

(اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے وہ بس تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔)

اخلاص اعمال کی روح ہے جس طرح کوئی جسم روح کے بغیر زندہ نہیں رہتا اسی طرح کوئی عمل اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا ہے۔

۷-صبر:

اللہ کے سوا کسی سے بھی تکلیف ومصیبت کی شکایت نہ کرنا صبر کہلاتا ہے، صبر وہ کسوٹی ہے جو سالکین طریقت کو کندن بناتی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں صبر کی فضیلت کا بیان ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ صبر سے مدد مانگنے کا حکم دے رہا ہے، تو کہیں صابرین کے ساتھ اپنی معیت کا ذکر کر رہا ہے (البقرہ: ۱۵۳)؛ کہیں صابروں کو بشارت دینے کا حکم دے رہا ہے (البقرہ: ۱۵۶)، تو کہیں صابروں سے اپنی محبت کا تذکرہ فرما رہا ہے (آل عمران: ۱۴۵)؛ کہیں صابروں کے بے حساب اجر دینے کا وعدہ کر رہا ہے (الزمر: ۹)، تو کہیں انھیں سچا اور متقی ہونے کا تمغہ عطا کر رہا ہے۔ (البقرہ: ۱۷۶)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ما أعطی أحد من عطاء خیراً وأوسع من الصبر" ۳۴

(صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع عطیہ کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔)

۸-ورع:

حرام میں مبتلا ہونے سے خوف کے شبہات سے بھی بچنے کا نام ورع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بغیر بندہ متقی نہیں ہو سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"لایبلغ العبد أن یکون من المتقین حتی یدع مالا بأس به حذرا مما به بأس" ۳۵

(بندہ اس وقت تک متقیوں میں شامل نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ حرج والی چیزوں کے خوف سے غیر حرج والی چیزوں کو نہ چھوڑ دے۔)

صوفیا کے لئے اس سے بڑی کوئی سند اور مقام ورع کے لئے

اس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں ہوسکتی کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے بلند مرتبہ عبادت قرار دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ:

"یا أبا هريرة كن ورعا تكن أعبد الناس" ۳۶؎

(اے ابو ہریرہ ورع اختیار کرو تو سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔)

حضور کی انھیں تعلیمات کا اثر ہے کہ صوفیا کی کتابوں اور ان کے اعمال دونوں میں ورع کو بے حد نمایاں اور امتیازی مقام حاصل ہے۔

۹-زہد:

دل کو دنیا کی خواہش ومحبت سے خالی کر کے اسے اللہ کی محبت ومعرفت سے آباد کرنے کا نام زہد ہے۔ زہد کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کو نا قابل اعتناء سمجھے۔

مادہ پرستی کی یلغار اور اس کے تسلط کے اس دور میں کچھ لوگوں نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حقیر و نا قابل التفات سمجھنے کے صوفی رویے کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ اور اس کا رشتہ عیسائی رہبانیت اور عجمی تقشف سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ساری تگ ودو کتاب وسنت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں دنیا کی تحقیر اور بے ثباتی کا ذکر ہے۔ کئی مقام پر دنیا کے مال ومتاع کو دھوکہ، فتنہ اور لہو ولعب قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: سورۃ الروم: ۶۰، العنکبوت: ۶۴، الکہف: ۴۷، وغیرہ۔

دوسری طرف شارع علیہ السلام کی تعلیمات میں نظری طور پر اور ان کی حیات طیبہ میں عملی طور پر دنیا ومتاع دنیا کی تحقیر ومذمت ملتی ہے۔ دراصل صوفیا کا زہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا کردہ انھیں نظری وعملی نمونوں سے ماخوذ ہے۔

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ سے کہتے ہیں: "فاتقوا الدنيا" ۳۷؎ یعنی دنیا سے ڈرو، تو کبھی آپ حضرت ابن عمر کو دنیا میں اس طرح جینے کی تلقین کرتے ہیں جیسے مسافر ہوتا ہے: "كن في الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل" ۳۸؎ کہیں دنیا کی بے وقعتی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "لو كانت دنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ماسقى كافرا منها شربة ماء" ۳۹؎ یعنی اگر دنیا اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے بھی برابر ہوتی تو کسی کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی نہ ملتا؛ کبھی ننگی چٹائی پر لیٹنے سے جسم مبارک پر اثر ظاہر ہو جاتے تھے جب صحابہ عرض کرتے کہ: اے اللہ کے رسول آپ اس پر کوئی گدا وغیرہ کیوں نہیں ڈال لیتے تو مالک کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں یہ جواب دیتے:

"مالي والدنيا، ما أنا في الدنيا إلا كراكب استظل تحت شجرة ثم راح وتركها" ۴۰؎

(مجھے دنیا سے کیا لینا دنیا، میں تو دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو کسی درخت کے نیچے سایہ لینے کو رکتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔)

۱۰-رضا:

تقدیر وقضا کی سختی پر دل کے سکون واطمینان کا نام رضا ہے۔ یہ مقام مقام صبر سے بلند ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں یہ بندے کو اللہ تعالی کی سب سے بڑی عطا ہے۔ باری تعالی فرماتا ہے:

وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ (التوبہ: ۷۲)

یعنی مالک جنت کی رضا جنت سے افضل ہے اور رضائے الہی پانے کے لئے پہلے اس کی قضا سے راضی ہونا پڑتا ہے۔ "رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ" (البینۃ: ۸)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رضا کی اعلی ترین مثال پیش کی ہے۔ اہل طائف نے جب آپ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا تو آپ اپنے رب کو مخاطب کر کے انتہائی گریہ وزاری سے عرض کرتے ہیں:

"إن لم تكن ساخطا علي فلا أبالي" ۴۱؎

(اے رب اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے۔)

ارشاد نبوی ہے:

"وارض بما قسم الله لك تكن أغنى الناس" ۴۲؎

(جو اللہ نے تمہاری قسمت میں لکھا ہے اس سے راضی ہو جاؤ تو سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔)

نبوی تعلیم کے مطابق اللہ سے راضی رہنے میں ہی انسان کی سعادت وخوش بختی ہے۔

"من سعادة ابن آدم رضاه بما قضى الله له" ۴۳

(ابن آدم کی خوش بختی اس میں ہے کہ وہ اپنے لئے اللہ کی بنائی تقدیر سے راضی رہے۔)

واضح رہے کہ تصوف میں رضا کا مطلب ترک اعتراض ہے، ترک کوشش نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں شام میں طاعون پھیلا تو آپ نے اسلامی فوجوں کو شام میں داخل ہونے سے منع کردیا اس پر حضرت ابوعبیدہ نے کہا: "أفرارا من قدر الله" کیا آپ قضا وقدر سے بھاگ رہے ہیں۔ تو حضرت عمر نے کہا: اے ابوعبیدہ کاش کہ یہ بات آپ کے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی: نحن نفر من قدر الله إلى قدره" یعنی ہم تو اللہ کی تقدیر سے اس کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ۴۴

۱۱-توکل:

توکل سیر الی اللہ کا ایک اعلیٰ مقام اور طریقت وتصوف کی بلند مرتبت منزل ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ رحمان کے نزدیک شرط ایمان ہے۔

"وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" (المائدہ:۲۳)

(اگر تم مومن ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔)

اللہ تعالیٰ متوکلین سے محبت کرتا ہے (آل عمران:۱۵۹) اور اس نے متوکلین کی کفالت کا وعدہ کیا ہے۔ (الطلاق:۲۳)

ارشاد نبوی ہے:

"لو توكلتم على الله حق توكله لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصا وتروح بطانا" ۴۵

(اگر تم لوگ اللہ پر کما حقہ توکل کرتے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسے کہ پرندوں کو رزق دیتا ہے، جو صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔)

امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کی شرطوں پر صحیح ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ ۴۶

واضح رہے کہ صوفیا کے یہاں توکل کا یہ معنی نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کیوں کہ سعی وعمل اور جدوجہد توکل کے منافی نہیں ہے۔ صوفیائے کرام کا توکل یہ ہے کہ ان کے لئے جو اللہ کے پاس ہے اسی پر بھروسہ ہو اور جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہو اس سے پوری طرح سے مایوسی ہو۔ تصوف میں ترک اسباب اور کوشش کو توکل نہیں بلکہ اسے "تواکل" کہتے ہیں جو اسلام کے منافی اور ایک مذموم صفت ہے۔ اگر کسی نے تصوف کے نام پر "تواکل" کو اپنایا ہے تو تصوف اس سے بری ہے۔

امام قشیری فرماتے ہیں:

"التوكل محله القلب، والحركة بالظاهر لا تنافى التوكل" ۴۷

(توکل کا محل قلب ہے یعنی توکل دل سے ہوتا ہے اعضائے ظاہرہ کی حرکت وکوشش توکل کے منافی نہیں ہے۔)

بلاشبہ توکل کا یہ مفہوم حدیث نبوی "اعقلها وتوكل" ۴۸ یعنی اونٹ کو باندھ کر پھر اللہ پر توکل کرو سے ماخوذ ہے۔

۱۲-شکر:

دل سے منعم کی محبت، اعضائے بدن سے اس کی اطاعت اور زبان سے اس کی ثناء ومدحت کا نام شکر ہے۔ اور شکر کی یہ تینوں قسمیں تصوف نے کتاب وسنت سے پائی ہیں۔

الف-شکر لسان:

ارشاد ربانی ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱) یعنی اور اپنے رب کی نعمت تو اسے بیان کیجیے، اور ارشاد نبوی ہے: "التحدث بنعمة الله شكر" ۴۹ یعنی ذکر نعمت شکر نعمت ہے۔

ب-شکر ارکان:

اعضائے بدن سے اطاعت کر کے شکر ادا کیا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

"اِعْمَلُوْا آلَ دَاوٗدَ شُكْرًا" (سبأ:۱۳) یعنی اے آل داؤد بطور شکر عمل کرو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات میں اس قدر طویل قیام کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آجاتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول آپ

یہ سب کیوں کرتے ہیں، آپ تو مغفرت یافتہ ہیں تو آپ نے فرمایا: "أفلا أكون عبدا شكورا" ۵۰ یعنی کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

ج-شکر جنان:

دل کا شکر یہ ہے کہ رویت نعمت رویت منعم کے لئے حجاب نہ بننے پائے، یعنی دل نعمت کے سبب منعم سے غافل نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" (النحل: ۵۳) تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

"اللهم ما أصبح بي من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لا شريك لك" ۵۱

(اے اللہ! جو نعمت مجھے یا تیری کسی مخلوق کو ملی وہ سب منتہا اور بلاشرکت غیرے تیری ہی ہے۔)

یہ سرسری اور عاجلانہ مطالبہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ صوفیا اپنے تمام افکار و معمولات میں کتاب و سنت کے پیرو ہیں۔ تصوف کا منہج عملی اور سلوک کے تمام منازل منبع تصوف مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے ہی ماخوذ ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ کتاب و سنت سے اس قدر قریب اور اس کی روح سے اتنا ہم آہنگ نہیں ہے جتنا کہ صوفیائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔

بقول امام غزالی:

"إن الصوفية هم السالكون لطريق الله خاصة وإن سيرتهم أحسن السير، وطريقتهم أصوب الطرق، أخلاقهم أحسن الأخلاق، .... فإن جميع حركاتهم وسكناتهم في ظاهرهم وباطنهم مقتبسة من نور مشكاة النبوة، و ليس وراء نور النبوة على وجه الأرض نور يستضاء به" ۵۲

(بے شک صوفیا ہی صحیح معنوں میں اللہ کے راہ پر چلنے والے ہیں ان کی سیرت سب سے بہتر سیرت ہے، ان کا راستہ سب سے صحیح راستہ ہے، اور ان کا اخلاق سب سے بہتر اخلاق ہے، .... کیوں کہ ان کے ظاہر و باطن کی تمام حرکات و سکنات مشکاۃ نبوت کے نور سے ماخوذ ہیں، اور نور نبوت کے سواد نیا میں کوئی ایسا نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جاسکے۔)

مصادر و مراجع

۱- صحیح البخاری، بار سوم: بیروت: دار ابن کثیر، ۱۹۸۷ء، ۱: ۲۸، وصحیح مسلم، بیروت: دار احیاء التراث العربی، غیر مؤرخ (تحقیق: محمد فواد عبد الباقی) ۴: ۱۳۱۹۔

۲- صحیح مسلم، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ۴: ۱۹۸۶۔

۳- شرح الرسالۃ القشیریۃ، مصر، مصطفیٰ بابی حلبی، غیر مؤرخ، ص/ ۷۔

۴- الانتصار لطریق الصوفیہ، مصر: مطبعہ دار التالیف، غیر مؤرخ، ص/ ۶۔

۵- صحیح مسلم، ۱: ۳۷؛ وصحیح البخاری، ۱: ۲۷، ۴: ۱۷۹۳؛ وسنن الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ متوفی ۲۷۹ھ، بیروت: دار احیاء التراث العربی، غیر مورخ (تحقیق: احمد محمد شاکر وغیرہ) ۵: ۶؛ وسنن ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی متوفی ۲۷۵ھ، بیروت، دار الفکر، غیر مورخ، ۱: ۲۴، ۱: ۲۵؛ ومسند ابو داؤد طیالیسی بصری متوفی ۲۰۴ھ، بیروت: دار المعرفہ، غیر مورخ، ۱: ۵؛ وسنن النسائی، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب متوفی ۳۰۳ھ، بار دوم؛ حلب: مطبوعات اسلامیہ، ۱۹۸۶ء (تحقیق: عبد الفتاح ابو غدہ) ۸: ۱۰۲؛ وصحیح ابن حبان، محمد بن حبان تمیمی بستی متوفی ۳۵۴ھ، بار دوم؛ بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۹۹۳ء، ۱: ۳۷۵؛ وصحیح ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق متوفی ۳۱۱ھ، بیروت: المکتب الاسلامی، ۱۹۷۰ء، ۴: ۵؛ ومصنف ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد متوفی ۲۳۵ھ، بار اول؛ ریاض: مکتبۃ الرشید، ۱۴۰۹ھ، ۶: ۱۵۷؛ ومسند احمد بن حنبل شیبانی متوفی ۲۴۱ھ، مصر مؤسسہ قرطبہ، غیر مورخ، ۱: ۵۱، ۱: ۳۱۹، ۲: ۲۲۶، ۴: ۱۲۹، ۱۶۱؛ ومسند البزار، ابو بکر احمد بن عمرو متوفی ۲۹۲ھ، بیروت: موسسۃ علوم القرآن، ۱۴۰۹ھ ۹: ۲۱۹؛ والسنن الصغریٰ للبیہقی، ابو بکر احمد بن حسین متوفی ۴۵۸ھ، مدینہ منورہ: مکتبۃ الدار، ۱۹۸۹ء، ۱: ۲۴؛ وموارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی، علی بن ابی بکر متوفی ۸۰۷ھ، بیروت: دار الکتب العلمیہ، غیر مورخ ۱: ۳۵؛ ومجمع الزوائد للہیثمی، قاہرہ: دار الریان للتراث، ۱۴۰۷ھ، ۱: ۳۸؛ ومسند ابی حنیفہ للاصبہانی، ابو نعیم، بار اول؛ ریاض مکتبۃ الکوثر، ۱۴۱۵ھ، ۱: ۱۵۲۔

۶- مسند ابی حنیفہ، ۱: ۱۵۲۔

۷- السنن الکبریٰ للنسائی، بار اول؛ بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۱ء، ۳: ۴۴۶؛ ومسند ابی داؤد طیالسی، ۱: ۵۔

۸- شرح النووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف متوفی ۶۷۶ھ، بارسوم: بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۳۹۲ھ، ۱: ۱۵۷۔

۹- شرح النووی، ۱: ۱۵۸۔

۱۰- فتح الباری، بیروت: دارالمعرفہ، ۱۳۷۹ھ (تحقیق فواد عبدالباقی وغیرہ)، ۱: ۱۲۰۔

۱۱- صحیح البخاری، کتاب الذبائح، ۵: ۲۱۰۴؛ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، ۴: ۲۰۲۶ عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ۔

۱۲- سنن الترمذی، کتاب الزھد، ۴: ۵۸۹؛ وسنن ابی داؤد، سلیمان بن الاشعث بجستانی، متوفی ۲۷۵ھ، کتاب الادب، بیروت: دارالفکر، غیر مؤرخ، (تحقیق: محمد محی الدین عبدالحمید)، ۴: ۲۵۹۔

۱۳- صحیح البخاری، کتاب الایمان، ۱: ۱۵۔

۱۴- تفسیر قرطبی، باردوم، قاہرہ: دارالشعب، ۱۳۷۲ھ، ۱۳: ۳۶۴۔

۱۵- بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۳ء، (تحقیق عبدالسلام عبدالشافی)، ۴: ۳۲۶۔

۱۶- التفسیر الکبیر، باراول، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۲۵: ۸۳۔

۱۷- روح المعانی، بیروت: داراحیاء التراث، غیر مورخ، ۲۱: ۱۶۔

۱۸- ۴: ۱۶۵۔

۱۹- صحیح ابن حبان، ۱۰: ۴۸۴۔

۲۰- صحیح البخاری، کتاب الدعوات عن ابی موسیٰ الاشعری، ۵: ۲۳۵۳۔

۲۱- صحیح مسلم، کتاب الذکر، ۴: ۲۰۶۱؛ وصحیح البخاری، کتاب التوحید، ۶: ۲۶۹۴؛ وسنن الترمذی، کتاب الدعوات، ۵: ۵۸۱۔

۲۲- سنن الترمذی، ۴: ۵۸۳۔

۲۳- ۴: ۲۱۰۶۔

۲۴- سنن الترمذی، ۵: ۵۳۲۔

۲۵- صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۱: ۱۴۴۔

۲۶- صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی، ۱: ۴۔

۲۷- صحیح مسلم، ۴: ۲۰۷۵۔

۲۸- سنن الترمذی، عن شداد بن اوس، ۴: ۶۳۸۔

۲۹- سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ۴: ۶۳۳۔

۳۰- بیہقی شعب الایمان، باراول، بیروت: دارالکتب العلمیہ ۱۴۱۰ھ، ۲: ۵۔

۳۱- صحیح البخاری، کتاب الادب ۵: ۲۲۶۱ (واللفظ لہ) وصحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۴: ۲۰۱۳۔

۳۲- سنن النسائی، ۶: ۲۵۔

۳۳- صحیح مسلم، ۴: ۱۹۸۶۔

۳۴- ۲: ۶۹۷۔

۳۵- سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامہ، ۴: ۶۳۴؛ وسنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، ۲: ۱۴۰۹۔

۳۶- سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد ۲: ۱۴۱۰۔

۳۷- صحیح مسلم، کتاب الذکر، ۴: ۲۰۹۸۔

۳۸- صحیح البخاری، کتاب الرقاق، ۵: ۲۳۵۸۔

۳۹- سنن الترمذی، کتاب الزہد، ۴: ۵۶۰۔

۴۰- سنن الترمذی، کتاب الزہد عن ابن مسعود، ۴: ۵۸۸۔

۴۱- الاحادیث المختارہ، ابومحمد عبدالواحد مقدسی، متوفی ۶۴۳ھ، باراول؛ مکہ المکرمہ، مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، ۹: ۱۸۱۔

۴۲- سنن الترمذی، کتاب الزہد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ۴: ۴۵۱۔

۴۳- سنن الترمذی، کتاب الزہد عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ۴: ۴۵۵۔

۴۴- صحیح البخاری، کتاب الطب، ۵: ۲۱۶۳؛ وصحیح مسلم، کتاب السلام، ۴: ۱۷۴۰۔

۴۵- سنن الترمذی، کتاب الزہد، عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ۴: ۵۷۳۔

۴۶- ابوعبداللہ محمد نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ المستدرک علی الصحیحین، باراول، بیروت: دارالکتاب العلمیہ، ۱۹۹۰ء، ۴: ۳۵۴۔

۴۷- الرسالہ القشیریہ، قاہرہ، مصطفیٰ بابی حلبی، ۱۳۳۰ھ، ص/ ۷۶۔

۴۸- سنن الترمذی، عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، ۴: ۶۶۸۔

۴۹- مسند احمد، عن النعمان بن بشیر، ۴: ۲۷۸۔

۵۰- صحیح مسلم، کتاب صفۃ المنافقین ۴: ۲۱۷۲؛ وصحیح البخاری، ۵: ۲۳۷۵؛ وسنن الترمذی، ۲: ۲۶۸۔

۵۱- سنن ابی داؤد، عن عبداللہ بن غنام، ۳: ۳۱۸۔

۵۲- المنقذ من الضلال، مصر: مطبعہ صبیح واولادہ، ۱۳۷۱ھ، ۱۳۲۔

❁❁❁

تصوف اور ترک دنیا

پروفیسر سید وحید اشرف .... بڑودہ، گجرات

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کے عقائد، اصول اور اعمال انسانی فطرت کے مخالف نہیں ہیں اور جو چیز فطرت کے خلاف نہ ہوگی وہ عقل کے بھی خلاف نہ ہوگی۔ مثلاً نکاح کرنا، تجارت وحرفت میں مشغولیت، کھانا پینا اور سماجی وسیاسی زندگی میں شریک ہونا، یہ تمام باتیں انسانی فطرت کے تقاضے ہیں، اسلام ان امور میں ہمیں جائز اور ناجائز طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ آدمی مجرد رہ کر، جنگل میں جاکر پوجا پاٹ میں زندگی بسر کردے۔ دین فطرت کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اسلام کی تعلیمات پر عمل کرکے ہدایت پاسکتا ہے اور خدا کی رضا حاصل کرسکتا ہے، جبکہ فیثا غورثی فلسفہ اور ہندوستان کے اکثر مذاہب میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک وہی انسان نجات پاسکتا ہے جو ایک خاص روحانی بلندی تک پہنچ چکا ہو، جہاں تک پہنچنے کے لئے علائق دنیوی سے کنارہ کشی کرنا پڑتی ہے۔ اگر وہ اس خاص معیار تک اپنی زندگی میں نہ پہنچ سکا تو مرنے کے بعد اس کو دوسرا جنم دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روحانیت کی تکمیل کرسکے اور اس وقت تک بار بار جنم لیتا رہے گا جب تک وہ اپنی روحانیت کی تکمیل نہ کرلے۔ بدھ مذہب کے مطابق انسان کا عمل کسی بھی شکل میں جنم لے سکتا ہے، مثلاً مچھر، مکھی، بلی، پتھر یا انسان وغیرہ

لیکن بعض دوسرے مذاہب میں انسان اپنے آئندہ جنم میں بھی انسان ہی رہتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے جو صلاحیتیں دی ہیں وہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق احکام کی پیروی کرے (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا) یہی اس کی نجات کا ضامن ہے، کیونکہ جس کو خدا نے صلاحیت ہی نہ دی ہو اس کے لئے عمل کا بلند ترین روحانی معیار مقرر کرنا فطرت کے خلاف ہے، اس لئے شریعت نے کم سے کم معیار مقرر کردیا ہے۔ جس پر ہر شخص عمل کرسکتا ہے۔ توحید پر ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حقوق العباد اور برائیوں سے اجتناب، یہ وہ اعمال ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ مالی عبادت کے لئے صاحب نصاب ہونے یا صاحب استطاعت ہونے کی شرط ہے، رسالت، آخرت اور اس کے جزئیات پر ایمان عقیدۂ توحید ہی کے تابع ہے اور حالات کے مطابق بعض اعمال میں کمی بھی کی گئی ہے، لیکن ایسا بھی ہے کہ بہت سے لوگ عقل وفہم میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن میں تدبّر سے کام لیں، اس کے بعد ان کا ایمان زیادہ مدلل اور مستحکم ہوگا۔ بعض اشخاص ایسے بھی ہوسکتے ہیں کہ قرآن کے اس دعوے کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہیں کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس جگہ سے روزی دے گا جس کا تمہیں وہم وگمان نہ ہو۔ اور کچھ ایسے بھی ہوسکتے ہیں، جو یہ دیکھنا چاہیں گے کہ خدا ان کے لئے کس طرح کافی ہوجاتا ہے جو اپنے کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کردیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں تمام لوگوں کے لئے اسلام نے نجات کے لئے کم سے کم ایک معیار مقرر کردیا ہے وہاں روحانی ترقی کی راہیں بھی کھول دی ہیں۔ تاکہ جو لوگ صاحب استعداد، باہمت اور بلند حوصلہ ہوں اور روحانی ترقی کی تڑپ رکھتے ہوں، جو عقل کو مطمئن کرنے اور روح کی پیاس بجھانے کے لئے بے قرار ہوں، وہ اعلیٰ روحانی مدارج حاصل کرسکیں اور جب یہ لوگ اپنی عملی زندگیوں کا نمونہ لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کا توکل صرف خدا پر ہے تو وہ لوگ قرآن کی اس آیت کا گویا عملی نمونہ ہوتے ہیں اور قرآن کی صداقت ان کی عملی زندگی سے ظاہر ہونے لگتی ہے، اور جب یہ لوگ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خدا کس طرح ان کا مددگار ہوجاتا ہے تو اس کی محبت ان کے دلوں میں تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے اور خدا کا عشق پوری طرح ان کے دلوں پر چھاجاتا ہے، تقویٰ اور

توکل کی راہ میں کوشاں رہنے والے یہ عاشقان الٰہی صوفیہ کہلاتے ہیں۔لیکن یہ تصوف کی بلند منزل ہے۔ دراصل ہر وہ عمل تصوف کے دائرے میں آتا ہے جو اللہ کے لئے خالص کرلیا جائے جیسا کہ قرآن میں ہے کہ،اے رسول کہہ دو کہ میری نماز ،میرا حج ،میری زندگی اور میری موت،سب اللہ کے لئے ہے جورب العالمین ہے۔اس مسئلہ کو ایک دوسرے رخ سے دیکھیے ۔بُدھ مذہب کے سوا ہر مذہب میں خدا پر عقیدہ لازمی ہے،مذہب والوں کے لئے اس دنیا میں خدا کی اطاعت ضروری ہے۔ ہر مذہب یہ بتاتا ہے کہ خدا کی اطاعت کا صلہ انعام کی شکل میں آخرت میں ملے گا اور خدا کی نافرمانی کا انجام عذاب ہے۔ مختلف مذاہب میں اس انعام وعذاب کی جو بھی صورتیں ہوں بہر حال انسان اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔عذاب کا تصور انسان کے دل میں خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور خدا کے خوف سے وہ اس کی اطاعت میں لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ انعام کے لالچ میں خدا کی عبادت کرے،لیکن بندہ خدا کی عبادت کرے یا نہ کرے اس سے خدا کی ذات میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔اس پر ایمان نہ لانے سے بھی یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی حقیقت میں کوئی فرق پڑ جائے گا۔ چاہے ہم اس کو رب مانیں یا نہ مانیں وہ بہر حال رب العالمین ہے۔

یہ تصور کہ وہ ہمارا رب ہے ، رزّاق ہے ، پالنہار ہے ، ہماری شرافتِ نفس کو جگاتا ہے،جنہیں خدا کے انعامات اور اپنی شرافتِ نفس کا احساس ہے،وہ خدا کی محبت میں غرق ہوجاتے ہیں۔ اگر جنت اور جہنم نہ بھی ہوتے تب بھی وہ اپنے سب سے بڑے محسن اور رب العالمین کی اطاعت کو شرافتِ نفس کا تقاضا سمجھتے ،وہ اگر چہ اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں کیونکہ خدا غنی ، بے نیاز اور مالک حقیقی ہے۔وہ ہماری عبادتوں کا محتاج نہیں ہے۔وہی حق ہے،اسی کے زندہ رکھنے سے سب زندہ ہیں ،اُسی کے انعامات سے سب بہرہ مند ہیں ، اسی کے پاس پھر لوٹ کر سب کو جانا ہے۔ یہ جذبہ فطری طور پر محبت اور اطاعت کا بے پناہ جذبہ پیدا کردیتا ہے اور درحقیقت شرافتِ نفس کا تقاضا بھی یہی ہے ،خدا کی محبت میں عبادت کرنے والے یہ لوگ صوفیہ کہلاتے ہیں ، جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہے جیسا کہ خود اللہ کا فرمان ہے کہ اے رسول کہہ دو کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

شریعت اور عشق کے مجموعہ کا نام طریقت ہے اور صوفیہ عاشقان الٰہی ۔تمام صوفیہ کی زندگیاں اس پر گواہ ہیں۔ حضرت بندہ نواز گیسودراز کی زندگی عشق کا نہایت ممتاز نمونہ ہے، یہاں تک کہ انہیں وجود میں عشق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور ان کا وہ روحانی فیض تھا کہ ان کے مریدین کے دلوں میں بھی عشق کی شمع روشن ہوجاتی تھی ۔ حضرت بندہ نواز کے مرشد حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

ہر کہ مرید سید گیسودراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

تصوف کی تعریف صوفیہ نے مختلف انداز میں کی ہے یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کی بتائی ہوئی ان تعریفوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ایک ہی چیز کی تعریف مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے، یہاں تصوف کا تعارف مختصر طریقہ سے کرایا گیا ہے ۔اس میں جس نقطۂ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہوجائے کہ تصوف دین فطرت کے مطابق ہے اور اس کے بنیادی اصول قرآن سے ماخوذ ہیں،لیکن جب اس کی تفصیلات سے بحث کی جاتی ہے تو اور بہت سے موضوعات کے ساتھ اس کا ایک موضوع ترک دنیا بھی آتا ہے، کیونکہ توکل سے ترک دنیا کا گہرا رشتہ ہے۔ دنیا کیوں پیدا کی گئی ہے؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ دنیا کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ یہ سب تعلیمات ہمیں قرآن اور حدیث میں ملتی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہٹ کر تصوف میں دنیا کا کوئی تصور نہیں ہے۔صوفیہ نے دنیا سے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ سب ہمیں قرآن وحدیث میں ملتی ہیں۔مثلاً قرآن میں اس طرح کی آیات ہیں :دنیا آزمائش کی جگہ ہے تاکہ یہ عیاں ہوجائے کہ کس نے اچھے اعمال کیے اور کس نے برے [1] اور مال اور اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں [2] اور اے رسول کہہ دو کہ میری نماز، میرا حج ، میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہیں۔[3] اور دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے [4] اور دنیا کی پونجی دھوکا ہے۔ [5] احادیث بھی بہت ہیں ایک حدیث ہے کہ دنیا کی محبت برائیوں کی جڑ

ہے۔ان تمام آیات اور احادیث کا نچوڑ یہی ہے کہ دنیادارِ عمل ہے۔ وہ عمل جو صرف اللہ کے لئے ہو۔ اور دنیا کی محبت کے لئے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے، اسی کا نام ترک دنیا ہے۔لیکن صوفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے ترک دنیا کی اصطلاح سے غلط فائدہ اُٹھا کر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفیہ بے عمل تھے۔ انہوں نے تمدنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اگر ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو دنیا مادّی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی۔ ان اعتراضات میں بھی بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ہم اس مضمون میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاسکتے۔ یہاں ہم صوفیہ کی عملی زندگی اوران کی بعض تعلیمات کو پیش کر کے دکھائیں گے کہ صوفیہ نے دنیا کی عملی زندگی میں کس طرح حصہ لیا۔ البتہ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ صوفیہ کا ہر عمل خالصۃً للہ ہوا کرتا تھا۔صوفیہ نے بالعموم کوئی نہ کوئی پیشہ کسب کے لئے استعمال کیا ہے اور جو لوگ فتوح پر بسر کرتے تھے، وہ اس لئے تھا کہ ایک تو یہ جائز ہے، دوسرے بعض حالات میں ان کو قبول نہ کرنا خدا کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے، تیسرے وہ اس میں سے صرف اتنا لیتے تھے جو اُن کی نہایت اہم ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ باقی دوسروں پر خرچ کردیتے تھے اور دوسرے دن کے لئے بچا کر نہ رکھتے تھے، دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کا نام تصوف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال تین طرح کے ہیں۔:ایک وہ اقوال جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل کیا اور دوسروں کو ان پر عمل کرنے کا حکم بھی دیا۔ دوسرے وہ اقوال جن میں بہت سے کاموں کے کرنے سے منع کیا ہے، یعنی یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر ونواہی ہیں، تیسرے وہ اعمال جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا لیکن نہ اُن کے کرنے سے منع کیا اور نہ ہی اُن کے کرنے کا حکم دیا مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے کل کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے۔[6] یہ توکل کا بہت بلند مقام ہے۔قرآن میں مال خرچ کرنے کا پہلا حکم یہ آیا کہ جو کچھ بچے وہ دوسروں پر خرچ کردو۔[7] بعد میں زکوٰۃ کا حکم آنے کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا اور یہ بھی کہا گیا کہ نہ اپنے ہاتھوں کو بالکل بند کردو اور نہ بالکل کھول دو۔[8] لیکن دوسرے حکم کے آنے کے بعد بھی پہلے حکم کا استحباب باقی رہا اس لئے اجلّہ صوفیہ نے پہلے حکم پر عمل کیا جو معالی الامور سے ہے۔

اس سے یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ کل کے لئے کچھ بچا کر رکھنا صوفیہ کی تعلیمات کے خلاف ہے، یا تمام بڑے صوفیہ نے بچا کر نہیں رکھا۔ یہ معاملہ دراصل حالات، وقت اور سب سے بڑھ کر نیت پر موقوف ہے۔کسب اور مال کا رکھنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ اصل چیز جو گناہوں کی جڑ ہے وہ حبِ دنیا ہے۔اس طرح ایک بادشاہ بھی صوفی ہوسکتا ہے اور ایک تاجر بھی یا اور کوئی جائز پیشہ رکھنے والا بھی۔ توکل کی مزید توضیح کے لئے صوفیہ کے کچھ اقوال آگے بیان کیے جائیں گے۔

اب غور کیجیے کہ ایک مدرّس درس دیتا ہے تو وہ اس کا معاوضہ لیتا ہے۔ سپاہی تاجر، صنعت وحرفت والے سبھی اپنے نفع کے لئے کام کرتے ہیں۔ صوفیہ نے روحانی اور اخلاقی تعلیمات دیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

صوفیہ کے اہم ترین اصولوں میں ہے کہ فرض عبادات کے بعد سب سے زیادہ ضروری اور بڑا کام خدمت خلق ہے۔ خدمت خلق اور دوسروں کی حاجت روائی اور وہ بھی صرف رضائے الٰہی کے لئے وہ عمل ہے جس پر ایک صالح معاشرہ اور بابرکت تمدن کا انحصار ہے، درحقیقت صوفیہ نے تمدنی زندگی کی اُن بنیادوں کی آبیاری کی ہے جس سے شجر انسانیت ہرا بھرا رہ سکتا ہے۔آج اس کمی کے سبب انسانیت کراہ رہی ہے خدمت خلق ہی کا ایک خاصہ ہے کہ کسی کے دل کو تکلیف نہ دینا کیونکہ جب دوسروں کے دلوں کو راحت پہنچانا سب سے بڑی نیکی ہے تو دوسروں کے دلوں کو تکلیف پہنچانا سب سے بڑی برائی ہے۔ یہ وہ زرّیں اصول ہے جس کی بنیاد پر ہی انسانی سماج میں انسانیت کا احترام ممکن ہے جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے، خدمت خلق ہی کا وہ تصور ہے جس کی وجہ سے صوفیہ نے عوام کے لئے ان اعمال پر زور دیا ہے جن سے لوگوں کی مادّی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ صوفیہ میں ہر شخص کو جس طرح کے مواقع حاصل رہے انہوں نے خدمت خلق کا فریضہ انجام دیا۔ صوفیہ نے بادشاہوں، امیروں، وزیروں، حاکموں، عالموں، جاہلوں، تاجروں اور کسانوں سبھی کو اپنی تعلیمات وہدایات سے

نوازا ہے اور سبھی لوگ صوفیہ کے معتقد تھے، لیکن یہ کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ صوفیا نے ان لوگوں کو دنیاوی امور سے کنارہ کشی کی تعلیم دی ہو۔ وہ علما جن کو تزکیہ نفس کے لئے ریاضت ومجاہدہ کی تعلیم دی گئی وہ اس لئے ضروری تھا کہ وہ لوگوں میں تبلیغ وارشاد کا کام بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے روحانی ذوق کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا جس کے بغیر روحانی ترقی ناممکن تھی۔ صوفیہ کی تعلیمات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عشق حقیقی کی لذت، قلب کے سوز وگداز اور دوسروں سے ہمدردی کے بغیر ریاضت ومجاہدہ سودمند نہیں ہوتا۔

صوفیہ کے یہاں توکل اور ترکِ دنیا کا کیا مفہوم ہے اور انہوں نے عملی زندگی پر کس طرح زور دیا ہے، اس کے لئے ہم چند اہم اقتباسات ان کی تحریروں سے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت سید اشرف جہانگیر (متوفی درحدود ۸۲۹ھ) فرماتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے صرف ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

''جو لوگ زراعت اور صنعت وحرفت کے دوسرے کاموں میں مصروف ہیں وہ اتنے ثواب کا کام کرتے ہیں جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ خدا نے دنیا اس لئے پیدا کی ہے تاکہ یہ آباد رہے اور ترقی کرتی رہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ دنیا کے لوگوں کی بھلائی کے کام کرنا کتنا بڑا کارِ ثواب ہے تو لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ قابل کاشت زمین کو بیکار اور بغیر کاشت کے چھوڑ دینا کتنا بڑا گناہ ہے تو کوئی بھی تخریب کے کام کرنا پسند نہ کرے گا۔ اگر کسی کے پاس اتنی زمین ہے کہ اس سے ایک ہزار من غلّہ پیدا کیا جاسکتا ہے، لیکن صرف اس کی کاہلی اور بے توجہی کی وجہ سے ایک سو من کم غلّہ پیدا ہوا تو اس کے لئے قیامت میں اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس سے صرف وہی شخص مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے، جو خدا کی محبت میں ایسا جذب ہو جسے خود اپنا ہی ہوش نہ ہو اور وہ دنیاوی امور کی طرف توجہ دینے کے قابل نہ رہ گیا ہو، لیکن اگر وہ صرف اپنی کاہلی کی وجہ سے ان امور کی طرف توجہ نہ دے سکا اور اسے وہ زہد وتصوف کہتا ہے تو وہ مقلدِ شیطان ہے اور دنیا کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ بیکار شخص کاہل ہے۔ دنیا کی خوشحالی اور ترقی بادشاہوں اور حاکموں کی کوششوں اور ان کی نیک دلی سے بہت زیادہ وابستہ ہے۔'' (لطائف اشرفی)

اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے:

''تمام بادشاہ، امراء، وزراء، کسان اور تمام لوگ جو مختلف صنعت وحرفت اور پیشوں میں لگے ہوئے ہیں درحقیقت وہ عبادت میں مصروف ہیں اور راہ سلوک کے سالک ہیں بشرطیکہ وہ خدا کے فرمانبردار ہوں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں: دنیا کو ایک خانقاہ فرض کرو، خدا اس کا مرشد ہے، انبیاء خدا کے خلفاء اور نائب ہیں۔ اولیاء خدا کے دوست ہیں، جو انبیاء کے نیچے اور ان کے تابع ہیں۔ بادشاہ اور وزراء ملازمین ہیں انبیاء اور اولیاء کے جو خانقاہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف ہیں۔ کسان، مزدور اور تمام پیشے والے مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس طرح انسان کا کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو خدا کے دوستوں کی خدمت میں مصروف نہیں ہے۔''

(لطائف اشرفی)

''محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک مرید سیف خاں جو اودھ میں کہیں حاکم تھے انہوں نے امارت ترک کرکے گوشہ نشینی اور فقر کی زندگی اختیار کرنی چاہی تو آپ نے منع کیا اور فرمایا: ''اصل مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا ہے، یہی مقصودِ زندگی ہے'' (لطائف اشرفی)

اور پھر انہوں نے غنا کی فضیلت پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ شیخ سعدی نے گلستان میں فقر وغنا پر ایک دلچسپ مکالمہ لکھا ہے اور غنا کی فضیلت بتائی ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسودراز اور ان کے معاصر صوفیہ میں کئی ایسے تھے جو امرا اور بادشاہوں کی اصلاح میں مصروف تھے۔

حضرت سید اشرف جہانگیر فرماتے ہیں کہ ''مجھے یہ صرف

ہندوستان میں نظر آیا کہ یہاں کے بہت سے پیرزادے محنت اور کسب کو عیب سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے مفلوک الحالی میں مبتلا ہیں، حالانکہ کسی پیشے کی توہین کرنا گویا کفر ہے۔ کیونکہ جتنے بنیادی صنعت وحرفت کے کام ہیں، ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی نبی نے کیا ہے (مثلاً زراعت، تجارت، حدادی وغیرہ۔ آج کے بہت سے پیشے جو اُس زمانے میں نہ تھے وہ سب اسی اصل کی فرع ہیں) اور نبی کے کاموں کی توہین نبی کی توہین ہے اور نبی کی توہین کفر ہے" (لطائف اشرفی)

حضرت بندہ نواز گیسودرعلیہ الرحمہ اپنی کتاب اسماء الاسرار میں لکھتے ہیں:

"توکل درحقیقت این است کہ مردی صوفی را ہفتاد سال نفس مع اللہ شود، درعین حرفت ودرعین صنعت ودرعین تجارت وکسب متوکلاً علی اللہ باشد، قول وفعل خویش را محو بیند وفاعل حقیقی بکشف وعیان جز او رانبیند وندا ند۔"

ترجمہ: توکل حقیقت میں یہ ہے کہ مرد صوفی اگر ستر سال حرفت، صنعت وتجارت میں مشغول رہے، تب بھی اس کا نفس خدا سے غافل نہ رہے۔ اس کا توکل صرف خدا پر ہو۔ اپنے قول وفعل پر اس کی نظر نہ ہو بلکہ مسبب الاسباب ہی کو فاعل سمجھے، اور سوائے اس کے کسی کو نہ دیکھے نہ جانے (یعنی یہ نہ سمجھے کہ رزق اس کی اپنی محنت سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اسے خدا کی دین، اور اس کا فضل جانے)

سیر الاولیاء (ص:۵۵، مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان) میں حضرت نظام الدین اولیاء کا بیان ترک دنیا کے متعلق مرقوم ہے، اس سے ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"ترک دنیا آن نیست کہ خود را برہنہ کند ولنگوتہ بندد، ترک دنیا آنست کہ بخورد وبپوشد وبپوشاند، وبخوراند ومنفعتہا برد لہائے شکستہ ومستحقان رساندہ، دل خود متعلق بدنیا ندارد، وہمت بلند باید گرداند، واز سر شہرت باید خاست۔"

ترجمہ: ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ اپنے کو ننگا کردے اور لنگوٹہ باندھ لے، ترک دنیا یہ ہے کہ کھائے، پہنے، پہنائے، کھلائے اور شکستہ دلوں اور محتاجوں کو فائدہ پہنچائے، اور اس کے باوجود اپنا دل دنیا سے نہ لگائے، ہمت بلند رکھے اور شہرت کی طمع نہ رکھے۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات سہ صدی میں (مطبع اسلامی لاہور ۱۳۱۹ھ) مکتوب پنجم بنام شیخ عمر، ترک دنیا سے متعلق ہے۔ اس کے ایک اقتباس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ طوالت کی وجہ سے اصل کو یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے، ہم نے جو وضاحت اپنی طرف سے کی ہے اس کو قوسین میں لکھ دیا ہے۔

"جان لو کہ جو کچھ دنیا میں ہے اس کی تین صورتیں ہیں :ایک تو یہ کہ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے دنیا ہے یعنی ایسا فعل جس میں خدا کی اطاعت کی نیت بالکل نہیں ہے، یہ سراسر معصیت ہے اور بزرگوں نے مباحات کی کثرت کو بھی اسی نوع میں داخل کیا ہے کیونکہ مباح چیز یں بھی نفس کی خاطر ہیں جس طرح تمام معصیت کے کام نفس کے سبب ہیں۔" (مباحات کی کثرت کا سبب بھی لذات نفسانی کی کثرت ہے جو انسان کو خدا سے غافل کرتی ہے اور دنیا میں مشغولیت کا سبب بنتی ہے)

دوسری صورت وہ ہے کہ بظاہر خدا کی اطاعت میں ہو، لیکن نیت و قصد حصول دنیا ہو۔ مثلاً ترک شہوات تاکہ لوگ اُسے زاہد سمجھیں اور علم کا حاصل کرنا تاکہ لوگوں میں اعزاز وافتخار حاصل ہو اور اس سبب سے دنیا حاصل ہو۔ اور اسی طرح کی سب چیزیں ملعون ہیں اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ تمام خدا کے لئے ہیں۔ یہاں کا مقصود بھی اللہ اور اس کے رسول سے شدتِ محبت یعنی عشق ہو اور یہی تصوف ہے۔

حواشی

۱- سورۂ الملک، پارہ ۲۹، آیہ:۲، اَلَّذِی خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً.

۲- سورہ الانفعال پارہ ۹، آیہ ۲۸، وَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ اور سورۂ تغابن پارہ ۲۸، آیہ ۱۵، اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ.

۳- سورۂ انعام پارہ ۸، آیہ ۱۶۲، قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰالَمِیْن.

۴- سورۂ نساء پارہ ۵، آیہ ۷۷، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ۔

۵- سورۃ الحدید پارہ ۲۷، آیہ ۲۰، وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۱۳۔ (۱) فتح خیبر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے ہر ایک کے لئے اسی وسق کھجور اور بیس وسق جو سالانہ مقرر کردیے تھے اور دودھ کے واسطے ہر ایک کے لئے ایک ناقہ شیردار ملا کرتی تھی۔ لیکن ازواج مطہرات کا بھی یہ حال تھا کہ مایحتاج (بقدر ضرورت) رکھ کر بقیہ یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کردیتی تھیں،

(رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری، حصہ اول)

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شکم سیر ہوکر نہیں کھایا اور کبھی فاقہ کا شکوہ کسی سے نہیں کیا۔

ناداری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غنا سے زیادہ پیاری تھی۔ بھوک کی حالت میں بھی اگلے دن روزہ رکھ لیتے تھے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کی حالت دیکھ کر رو پڑتی اور کہا کرتی دنیا میں سے اتنا ہی قبول کرلیجیے کہ جسمانی طاقت رکھنے کو کافی ہو تو جواب میں فرماتے:

''عائشہ، مجھے دنیا سے کیا کام۔ میرے بھائی اولوالعزم رسول تو اس سے زیادہ حالت پر صبر کیا کرتے تھے، اور اسی چال پر چلے اور خدا کے سامنے گئے۔ خدا نے ان کا اکرام کیا اور ان کو پورا پورا ثواب دیا۔ اب اگر میں آسودگی کی زندگی بسر کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ کل اُن سے کم رہ جاؤں۔ دیکھو جو چیز مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے بھائیوں اور خلیلوں سے جاملوں۔''

(رحمۃ للعالمین حصہ دوم)

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرماگئے۔ (رحمۃ للعالمین حصہ دوم)

یعنی رسول اکرم سید عالم رحمۃ للعالمین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اختیاری فقر میں گزری۔

۶- حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں اپنے مرید اور خلیفہ شیخ علاء الدین کو تحریر فرماتے ہیں:

''بذل و ایثار کمترین حال صوفی باشد، ہر چہ بدستش افتد وہم آن بزد کہ اگر امروز بتمام خرچ شود فردا چہ تو اں کرد و پیشہ توکل علی اللہ شیوۂ کار خود سازد۔''

ترجمہ: عطا کرنا اور ایثار کرنا صوفی کا کمترین حال ہے اور کمترین حال میں سے بھی سب سے کمتر چیز مال کا خرچ کرنا ہے۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہو اس کا وہم بھی نہ آنے پائے کہ اگر خرچ کردیا تو کل کیا ہوگا۔ اپنا پیشہ اور طریقہ کار توکل علی اللہ بنائے۔

۷- سورہ بقرہ پارہ ۲، آیہ ۲۱۹، وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ۔

۸- سورۃ الاسراء پارہ ۱۵، آیہ ۲۹، وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْهَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔

❀❀❀

وضاحت

''صوفیہ نمبر'' کے اندر قارئین کو صوفیہ کا رسم الخط 'صوفیہ' اور 'صوفیاء' دونوں نظر آئے گا۔ ہم لفظ ''صوفیہ'' کے املا میں یکسانی قائم رکھنا چاہتے تھے، مگر بکثرت اہل قلم حضرات اسے ''صوفیاء'' لکھتے یا لکھنا پسند کرتے ہیں، پیش نظر نمبر کے لئے موصول ہونے والی تحریروں کی خواندگی اور ترتیب و تنسیق کے دوران ہمیں اس کا واقعی چشم کشا تجربہ ہوا۔

ہم نے یہ بھی چاہا کہ پھر جس نے جیسے لکھا ہے اُسے ویسے ہی باقی رکھا جائے، مگر کتنے ہی صاحبانِ قلم خود اپنی تحریروں میں اس کی رعایت باقی نہ رکھ سکے، انہوں نے کہیں 'صوفیہ' لکھ دیا اور کہیں 'صوفیاء'۔ نتیجتاً ہم کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ پیش نظر صوفیہ نمبر میں آپ اس چیز کو محسوس کرسکتے ہیں۔

(ادارہ)

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ڈاکٹر رقیہ زین الدین .... پروفیسر شعبۂ تعلیمات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خیال ہی کائنات کی اصل ہے۔ یہ تمام عالم تخلیق سے پہلے اللہ کے علم میں تھا۔ دیگر الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے خیال کیا عالم کی تخلیق کا اور کُن پر فیصلے آن کی آن میں تمام ہوئے۔

سارے انسان بمثل ظروف ہیں ہر ایک کی اپنی اپنی استعداد ہے، کم یا زیادہ۔ ہر برتن کا اپنا الگ الگ ایک رنگ ہے، ابن العربی کہتے ہیں کہ تمام اشیاء اللہ کے کسی نہ کسی نام کا مظہر ہیں۔ ایک انسان میں اللہ کا جو نام ظہور پذیر ہوا وہ اللہ کی تجلی ہے۔ تجلی نور ہے، استعداد اُس تجلی کی مطابقت سے ہے۔ جس صفت یا جن صفتوں کی تجلی اُس پر عالمِ ارواح پر ہوئی وہی اس کی عین ہے یعنی اصل۔ ابن العربی کے یہاں یہی اصل اعیانِ ثابتہ کے نام سے ہے۔ اعیان عین کی جمع ہے جس کے ایک لغوی معنی آنکھ کے ہیں اور دوسرے لغوی معنی چشمہ کے ہیں یعنی چشمۂ حیات۔ صوفیا وجود کے مراتب سمجھانے کے لئے جن تنازل ستہ کا سہارا لیتے ہیں وہی ایک انسان کی روحانی ارتقا میں عروج یا معارج ہیں۔ یعنی بحکم الٰہی احدیت سے وحدت، واحدیت، عالمِ ارواح، عالم مثال اور عالمِ اجسام وغیرہ تنزیلات ہوئے۔ عالم اجسام میں ایک صوفی روحانی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا عروج کی طرف جاتا ہے یعنی عالمِ اجسام سے عالم مثال، عالم ارواح، واحدیت اور وحدت کی طرف جاتا ہے۔ سالک کی راہیں کٹھن ہیں دشوار گھاٹیوں سے گذرنا ہے۔ ہر مقام پر فنا ہے، ہر مقام کی توبہ ہے، ہر فنا کے بعد بقا ہے۔ لہٰذا مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری اپنی کتاب مکتوبات صدی میں لکھتے ہیں کہ سالک ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو تائب ہوتا ہے اور ہر گذرنے والے مقام پر توبہ کرتا ہے لہٰذا انسان کی ابتدا بھی توبہ ہے اور انتہا بھی توبہ۔

وحدت الوجود کی منزل اونچی ہے اس مرتبہ کو پہنچنے والے ولایت کبریٰ سے سرفراز ہوتے ہیں۔ وحدت الوجود کے معنی ہیں کہ ایک صوفی جب اخلاص اور اللہ کی مدد سے لامقصود الا اللہ پر عمل کرتا ہے تو وہ اللہ کی مدد سے لاموجود الا اللہ کی منزل تک پہنچتا ہے۔ یعنی وجود صرف اللہ کا ہے۔ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال و الاکرام (سورہ رحمٰن پ ۲۷، آیت ۲۶) ہر شئ کو فنا ہے، سوائے اس کے چہرے کے۔ چہرہ لفظ علامتی ہے اللہ کا کوئی چہرہ نہیں۔ چہرہ چونکہ شناخت کا ذریعہ ہے اس لئے چہرہ معنی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ کی شناخت یا معرفت۔ رب انسان کے تعلق سے ہے۔ وہ انسان اپنے رب کو دیکھتا ہے، سمجھتا ہے اور پہچانتا ہے، رب اور مربوب ایک تعلق ہے، ایک رشتہ ہے۔ ابن العربی کہتے ہیں مربوب یعنی بندۂ خاص اپنے رب سے متعارف ہوتا ہے جس رب کی تجلی کا وہ مظہر ہے یعنی وہ اپنے عین سے واقف ہوتا ہے۔ اس اصل سے جس کے وجود نے اسے عدم سے وجود میں لایا ورنہ وہ کچھ نہ تھا۔ قرآن کی آیت شریفہ کا مفہوم ہے کہ انسان پر ایک وقت ایسا بھی تھا جب وہ کچھ نہ تھا، ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیأً مذکورا (سورہ دھر۔ آیت ۱) ایک انسان کا اصل یا اُس کا عین اللہ کے کسی نام کا مظہر ہے۔ وہ اپنے سرّ (بھید) کو جان لیتا ہے کہ اللہ اُس کے ذریعہ اپنی کسی صفت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس لئے میدان جنگ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پریشان ہو کر دشمن پر مٹھی بھر خاک پھینکی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ خاک آپ نے نہیں میں نے ڈالی تھی۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے رب سے واقفیت یا معرفت اپنی اصل کے مطابق پاتا ہے جس نوع کی تجلی (مختصراً اجمالی یا جلالی صفت) اس پر عالمِ اروح میں ہوئی تھی، لہٰذا ہم اسی کی طرف سے آتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

آگے دیکھیے رب کیسا؟ وہ رب جلال والا ہے رعب و دبدبہ

والا ہے اور اکرام والا ہے۔ (ربک ذوالجلال والاکرام)۔ صوفی جب اس درجہ کو پہنچتا ہے تو اللہ کے اکرام سے مالا مال ہوتا ہے وہ اسے اپنے جلال کا لباس پہنا تا ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پہنچ کر فانی ہو کر اپنے رب کو دیکھ رہے تھے اپنی ہستی بھول گئے تھے اور یہ شطحیات اُن کی زبان پر جاری ہو گئے، **سبحان ما اعظم شانی** (میری شان کتنی بلند ہے)۔ کہتے ہیں اُن کے مریدوں نے جب ہوش میں آنے کے بعد انہیں یاد دلایا کہ آپ تو یہ کہہ رہے تھے۔ کہنے لگے اب کہوں تو مجھے چھری سے مار دینا۔ پھر ایک دفعہ اسی عالمِ جذب میں تھے اور کہہ رہے تھے میری شان کتنی بلند ہے۔ مریدوں نے جب چھری ان پر چلائی تو انہیں محسوس ہوا کہ ہر طرف پانی ہے اور ہر طرف بایزید بسطامی کا عکس ہے اور چھری صرف پانی پر چل رہی ہے۔

غالباً کچھ اسی قسم کی جلالی تجلی میں منصور علیہ الرحمہ نے بھی "**انا الحق**" کا دعویٰ کیا تھا۔

اگر تجلی جمال الٰہی کی ہے تو بندہ حسن و جمال حقیقی میں کھو جاتا ہے۔ ایک مشاہدۂ جمال الٰہی کی گھڑی میں حضور پاک نے کہا تھا کہ کہہ دو کہ وہ سب کے سب بخش دئے گئے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں مراقب تھے سامنے سے ایک شخص گذرا جسے بلا کر انہوں نے یہ فرمایا۔ اس شخص نے تعجب سے کہا یا رسول اللہ! میری بات پر کون یقین کرے گا؟ حضور نے ثبوت کے طور پر اپنی نعلین مبارک اسے دے دی وہ شخص خوشی خوشی چلا جا رہا تھا کہ سب کو مغفرت کی خوش خبری دوں گا۔ راستے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے انہوں نے دریافت کیا کہ نعلین کہاں لیے جا رہے ہو اُس نے پوری بات بتائی، سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُس سے نعلین لے لی اور ڈانٹ دیا۔

ہستی اور وجود پر غور و فکر کرنے والے شعرا بھی ہیں، ماہرین نفسیات بھی ہیں، ان کے علاوہ وہ شخص جو عقل رکھتا ہے سوچتا ہے کہ میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، انجام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ غالب پر اسی سوچ میں آمد ہوئی کہ "ہستی کے فریب میں مت جائیو اسد۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے"

یونگ (Jung) جو ایک ماہر نفسیات ہیں وہ بھی ابن عربی سے متاثر نظر آتے ہیں، عام انسانوں کی نفسیات اور وہ لوگ جو ذہنی مریض ہیں اُن کی نفسیات کو سمجھنے کے بعد وہ بھی اعیان ثابتہ کے قائل ہیں جسے انگریزی میں آرکی ٹائپ (Archetype) کہتے ہیں۔ یونگ نے شخصیت کی ارتقا میں روحانی ترقی کو ضروری مانا ہے۔

فرائڈ (Freud) اور یونگ (Jung) دونوں نے ہمارے ذہن (دماغ) کے تین حصے بتائے ہیں، شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ (Conscious, Subconscious and Unconsious) ان کے مطابق ہمارے دماغ کا تقریباً دو تہائی حصہ لاشعور ہے جن تک ہمارے شعور کی رسائی نہیں ہے۔ مگر ایک انسان کی تخلیق یا اُس کے خوابوں کے ذریعہ اس کے لاشعور تک کسی حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ یونگ کے مطابق لاشعور کا کچھ حصہ (روز آفرینش سے لے کر موجودہ وقت تک کی) ایک انسان کے لاشعور میں ثبت ہے مگر اُن واقعات کا اُسے شعوری طور پر علم نہیں ہے۔

یونگ کے مطابق خوابوں، آرٹ اور مصوری کی کئی علامتیں (Symbols) بہت ہی قدیم زمانے سے ہر تہذیب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں بلا تفریق وقت (historical time) اور محل (Space) ان تخلیقات یا خوابوں کی ہیئتیں (forms) کچھ الگ ہو سکتی ہیں مگر معنی کے اعتبار سے اُن سب میں یکسانیت ہے۔ لاشعور سے نکلنے والی ان علامتی ہیئتوں (forms) کو انہوں نے آرکی ٹائپل خیال (Archetypal Image) کہا۔ کئی آرکی ٹائپس (archetypes) کے انہوں نے نام بھی دیے، مثلاً۔

''آرکی ٹائپل ماں'' (Archetypal mother)

''ضعیف دانا یا حکیم'' (Old wise man)

''خدا کی آنکھ'' (God's Eye)

یونگ نے یوں تو کئی آرکی ٹائپس دیے ہیں اگر ان تینوں پر اکتفا کیا جائے تو یہ تینوں اللہ کے اسماء 'حنان' اور 'حکیم' اور صفت بصری کے مظاہر ہیں۔

سنریھم ایتنا فی الا فاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم الحق (سورہ شوریٰ، آیت ۵۴)

ترجمہ:۔ ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھادیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کی جانوں (انفس) میں بھی حتی کہ انھیں حق کا یقین ہو جائے۔

یونگ نے کہا کہ عمر کے درمیانی حصے کے بعد بھی اگر ایک انسان روحانیت کی جستجو نہیں کرتا ہے اور اس سے غافل رہتا ہے تو اُسے لاشعور خوابوں کے ذریعہ یا کسی اور علامتی کاموں کے ذریعہ اُسے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے۔ یعنی یہ علامتیں اس کے لاشعور کی پکار ہیں۔

صوفیائے کرام تفکر کی راہ کے مسافر ہیں، ہستی اور وجود کے مسائل کا حل مشاہدات کے ذریعہ انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ ابن العربی کے علاوہ مولانا روم بھی وحدت الوجود کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ وحدت الوجود خالص توحید ہے۔ ابن العربی کے کلام میں چونکہ فلسفے کا زور ہے عام انسان گھبرا جاتا ہے۔ اور کئی افراد نے تو وحدت الوجود کو اسلام اور توحید کے خلاف سمجھا۔ پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے اپنی کتاب تصوف اور سریت میں لکھا ہے کہ ابن العربی کے وحدت الوجود میں یہ کہیں نہیں ہے کہ دنیا اور اللہ میں اتحاد ہے یا اللہ کا حلول ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''شیخ فتوحات مکیہ کے باب پانچ سوستاوں (۵۵۷) میں فرماتے ہیں کہ عالم حق تعالی کا عین نہیں ہے حق تعالی اور عالم متحد نہیں۔ عینیت اور اتحاد ابن العربی کے کلام میں ہے تو بمعنی اصطلاح جس کا حاصل تابعیت خلق للحق فی الوجود ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ فرق یہ ہے کہ ہم اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں اور ہمارا وجود اس پر موقوف ہے بوجہ اس کے کہ ہم ممکن ہیں اور وہ اس چیز سے غنی ہے جس میں ہم محتاج ہیں'' (صفحہ ۲۵)

اللہ احدیت میں احد (اکیلا) ہے، صمد (بے نیاز) ہے، نہ اسے کسی نے جنم دیا اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک ہے اپنی ذات میں وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کی ذات دائرۂ احدیت میں لاتعین ہے۔

تنزیل کے پہلے درجے پر وحدت آئی جس میں نور محمدی یا حقیقتِ محمدی کی تخلیق ہوئی۔ یہ نورِ محمدی تمام عالم کا تخم تھا۔ وحدت اللہ کے پہلے تعینات میں سے ہے اور واسطۂ تخلیق ہے۔ یہ نور محمدی، اللہ جو احد ہے (جس تک رسائی ناممکن ہے) اور عالم (مظاہر کونیہ) کے بیچ کی کڑی ہے۔ یہاں اللہ کی ذات اپنی ساری ہونے والی تخلیق کو ایک اکائی یا ایک جامع حیثیت سے دیکھتی ہے۔ یہاں وہ خود ہی شاہد ہے خود ہی مشہود۔ دوسری تنزیل واحدیت ہے جہاں اسماء وصفات منقسم ہوتے ہیں اور تمام اشیا کے ناموں کا تفریق کے ساتھ تعین ہوتا ہے۔ اس کی مثال ہم ایک ذرہ (atom) سے دے سکتے ہیں جس کا ایک مرکز ہوتا ہے جسے نیوکلیس (nucleus) کہتے ہیں۔ الیکٹرونس (Electrons) اس کے باہری سطح پر گردش کرتے ہیں۔ مرتبۂ وحدت ویسے ہی ہے کہ ہم نور محمدی کو مرکز (nucleus) سمجھ لیں اور اس کے باہر گھومنے والے اجزاء بمثل عالم جبروت یا عالم واحدیت کے ہیں۔ مراتب احدیت، وحدت اور واحدیت غیر آنی اور غیر زمانی ہیں۔

ایک سالک جب توفیق الٰہی سے اپنے عین کو سمجھ لیتا ہے، اپنے واجب الوجود سے متعارف ہوتا ہے جو واحدیت سے متعلق سمجھی جاسکتی ہے تو وہ کائنات کی دوئی (Duality) مثلاً رات دن، خیر وشر سے اوپر ہو جاتا ہے یعنی اس دوئی میں بھی وہ ایک اتحاد دیکھتا ہے۔ اس کے مشاہدات بلاقید وتفریق زمان ومکان کے ہو سکتے ہیں۔ زمان ومکان محض اضافی (relative) ہیں یہ ہمیں صوفیا مثلاً ''مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، ابن العربی اور سائنس داں دونوں ہی بتلاتے ہیں۔ نظریۂ اضافی (theory of Relativity) سائنس داں آئن سٹائن کی دین ہے جس کے مطابق زمان ومکان صرف ہماری نسبت سے ہیں ورنہ ان کی اصل کچھ نہیں۔ آئن سٹائن سے پہلے حضرت ابن العربی اور حضرت مولانا روم نے یہ بات کہی تھی وہ سائنس داں نہ تھے صرف مشاہدۂ عرفانی نے انھیں اس حقیقت سے روشناس کرایا تھا۔

وحدت اور واحدیت کے مراتب ہی ممکنات کے حقائق ہیں۔ انہیں امکانات کو ابن العربی اعیانِ ثابتہ کہتے ہیں۔ عیان ثابتہ اللہ کے علم کا تعین اور ثبوت ہیں مگر ممکنات میں سے ہیں ان کا خارجی وجود نہیں صرف علمی ثبوت ہے، حکم الٰہی سے یہ امکانات (ممکن الوجود) واجب الوجود بن جاتے ہیں۔

حضرت ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے کائنات کو اللہ کا ظل یا سایہ

بتایا ہے۔ اس سے بھی بات سمجھ میں آتی ہے کہ عالم اور اللہ ایک نہیں ہے۔ نقاش نقش بناتا ہے اس کا نقش اس کی شخصیت کی نشاندہی تو کرسکتا ہے مگر وہ نقش نقاش نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح ایک اور مثال درخت کی دی جاسکتی ہے کہ درخت کے سائے کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سورج کی سمت پر منحصر کرتا ہے۔ سمت بدلنے سے سائے میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے، سایہ ختم بھی ہوسکتا ہے مگر پیڑ موجود رہتا ہے۔ لہذا پیڑ اور اس کا سایہ ایک نہیں۔ سورج جو سائے کا محرک ہے اُسے بمثل اعیانِ ثابتہ سمجھ لیں۔ سائے کے وجود کو سمجھنے کے لئے ہمیں سورج کو جاننا ہوگا اُسی طرح کائنات کو سمجھنے کے لئے اعیانِ ثابتہ ہوئے۔

ہر شخص کا عین اس کا واجب الوجود ہے۔ وحدت الوجود کی منزل اس سے بالا ہے۔ وحدت الوجود پر رسائی کے معنی ہوئے حقیقت محمدی یا حقیقتِ جبرئیلیہ تک رسائی اور اس کا مشاہدہ۔ اس مشاہدے میں عالم امر کی معرفت سالک کو حاصل ہوتی ہے چونکہ عالم امر میں وحی کا ایک خاص مقام ہے اس لئے اسے حقیقتِ جبرئیلیہ بھی کہا گیا ہے۔ وحدت الوجود تک پہنچنے والا نور وحدت میں گم ہوجاتا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے والا سالک ذات الٰہی کے تمام اعیان اور اسماء کے تمام صفات سے باخبر ہوتا ہے۔ اسے عالم کے احکام جاریہ کی اطلاع کما حقہ ہوتی ہے۔ شیخ اکبر نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ وہ اس مقام پر فائز تھے اور عالم کے احوال سے باخبر تھے کشف اللہ عن بصری و بصرنی الکل (اللہ نے میری آنکھ کھول دی اور مجھے سب چیزیں دکھا دی گئیں۔)

لہذا وحدت الوجود کے معنی ہوئے کہ وجود صرف اللہ کا ہے، باقی سب کو فنا ہے۔ صوفی کے مشاہدۂ عرفانی میں جب یہ حقیقت آتی ہے تو وہ پکار اُٹھتا ہے لاموجود الا اللہ۔

اگر وحدت الوجود سے مراد تنزلات ستہ کے وحدت کی تنزیل لی جائے تو نور محمدی یا حقیقت محمدی ہے جو بعد از تخلیق کائنات یعنی دائرۂ وحدانیت اور اس کے بعد کے مراتب پر فیض رساں ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سارے نبی نورِ محمدی کے فیض سے ہی نوازے گئے۔ عالم اجسام میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں سے بلند و بالا ہیں۔ آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنی صورت پر بنایا (حدیث قدسی) فرشتوں میں صرف جمال ہے، جنات میں آگ،

انسان جمال اور جلال دونوں کی آمیزش سے بنا۔ جمال اور جلال دونوں جب ملتے ہیں تو کمال پیدا ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا یعنی اپنی صفات پر۔ حضور پاک انسان کامل ہیں اللہ کی جمیع صفتوں کا سب سے اکمل مظہر ہیں۔ عبدالکریم جیلی اپنی کتاب انسان کامل میں رقم طراز ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ہر صورت میں متصور رہوں۔ آپ کا یہ دستور جاری ہے کہ ہمیشہ ہر زمانے میں اس زمانے کے اکمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں تاکہ اُن کی شان بلند ہو، زمانے کا اس کی طرف میلان ہو اور درست اور قائم ہو۔ حضور عالم جسم میں آخری نبی تھے عالم اجسام چوں کہ ایک تخلیق ہے اسے فنا ہے۔ لہذا حضور اس ساری دنیا سے تو پردہ کر گئے لیکن حقیقت محمدی چوں کہ وہ اللہ کی ذات سے نسبت رکھتی ہے باقی ہے۔ یہی حقیقت محمدی ہر زمانہ کے انسان کامل کے اندر ظہور پذیر ہوتی ہے جس پر کائنات کی بقا کا دارومدار ہے (قیامت کے وقت یہ ولایت کبریٰ بھی اٹھالی جائے گی۔)

اول، آخر، ظاہر، باطن صفات الٰہی ہیں۔ اللہ کی ذات ازل سے ہے وہی اول ہے اور وہی آخر، جب کچھ نہ تھا، تو اللہ تھا جب کچھ نہ ہوگا تو اللہ ہوگا۔ اللہ اپنی نشانیوں کے ذریعہ ظاہر ہے جب نقش ہے تو کوئی نقاش بھی ہے۔ مگر اس کی ذات مخفی ہے۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ "لا تدرکه الابصارُ وهو یُدرک الابصار وهو اللطیف الخبیر" (سورہ انعام، آیت ۱۲)

اللہ کی صفات بے شمار ہیں انسان کو اللہ نے اپنی صفت پر پیدا کیا۔ اگر ہم مندرجہ بالا صفتوں کی روشنی میں دیکھیں تو ابن العربی کے مطابق اللہ کے ارادہ کے اعتبار سے انسان اول ہے اور ایجاد کے اعتبار سے آخر۔ اگر انسان کے جسم کو دیکھیں تو ظاہر ہے اور اگر اس کی اصل پر نگاہ جائے تو باطن۔ اللہ کی نسبت سے انسان عبد (بندہ) ہے اور کائنات کی نسبت سے وہ کائنات کا رب ہے۔ انسان کے اندر مخفی خزانے مکمل طور پر انسان کامل میں اجاگر ہوتے ہیں۔ محمد اللہ کی جامع صفتوں کا اکمل مظہر ہیں اور بواسطۂ حقیقت محمدی ہر دور کا انسان کامل بھی ان صفات کا مظہر ہے۔ کائنات میں مرکزی کردار انسانِ کامل کا ہے۔

ابن العربی کہتے ہیں کہ کائنات میں اللہ کے ناموں کی ہر آن

ایک نئی تجلی ہورہی ہے۔ کل یوم ھو فی شان (سورہ رحمن) ہرآن اس کی ایک نرالی شان ہے۔ ہر سانس ایک نئی تخلیق ہے۔ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون (اقبال)۔

حوالے

۱- انسان کامل۔ عبدالکریم جیلی ترجمہ فضل میران، وقار علی مالک تھانوی پریس، دیوبند ۱۹۸۳ء

۲- تصوف۔ سید وحید اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی۔ دائرۃ المعارف ویلور۔ تامل ناڈو

۳- تصوف اور سرّیت۔ لطیف اللہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۶ء

۴- لطائف اشرفی۔ حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ۔ اردو ترجمہ مولانا محمود عبدالستار، امبیڈکر نگر، مطبوعہ نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ، یو، پی، سن اشاعت ۲۰۰۴ء

۵- محی الدین ابن عربی حیات و آثار۔ ترجمہ احمد جاوید سہیل۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ طبع اول۔ ۱۹۸۹ء

۶- مکتوبات صدی۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری۔ اردو ترجمہ حضرت شاہ نجم الدین فردوسی علیہ الرحمۃ، حضرت شاہ الیاس بہاری فردوسی مکتبہ بیت الشرف خانقاہ معظم، بہار شریف نالندہ۔ ۱۹۷۳ء

7- Corbin , Henry (1969)"Creative imagination in the Sufism of Ibn-Arabi",Princetion University Press.

8- Ibn Al'Arabi "The Meccan Revelation"edited by Micheal Chodkiewicz,Translated by William C. Chittick and James W. Marris, volume I and volume 11,New York, Pir Press (2002).

(9) Psychological Reflections- An Anthology of the Writing of C.G. Jung, Selected and edited by Jolande Jacobi Routledtge &Kegan Paul Ltd. London (1949)(Second Edition).

❂❂❂

کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری .... خانقاہ عالیہ قادریہ، بدایوں شریف

تصوف صدیوں سے اہل علم کے درمیان موضوع بحث رہا ہے، ادوار زمانہ کے ساتھ بحث کی جہتیں بھی مختلف ہوتی گئیں۔ صدیوں کے اس علمی اور نظریاتی سفر میں تصوف کو جہاں قدم قدم پر ایسے لوگ ملے جنہوں نے اپنا سب کچھ نثار کر کے اس قافلۂ عشق و مستی میں شامل ہونا اپنی سعادت سمجھا، تو وہیں ہر موڑ پر تصوف کو ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑا جنہوں نے اس فکر کو بے سمت اور اس پورے کارواں ہی کو گم کردہ راہ قرار دیا۔ جہاں تک تصوف کے مخالفین کا سوال ہے تو ان کو ہم متعدد طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں وہ ظاہر پرست علما بھی ہیں جنہوں نے اس کو روح اسلام کے منافی ثابت کرنے کی کوشش کی، خود کو ''موحد'' کہنے والے وہ زاہدان خشک بھی ہیں جنہوں نے اس کو بدعات وخرافات کا مجموعہ قرار دے کر درخور اعتنا نہیں سمجھا، ان مخالفین میں وہ جدت پسند محققین بھی ہیں جنہوں نے اس کو امت کے لئے افیون قرار دے کر نکسال باہر کر دیا، کچھ لوگوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور تصوف کو ''چنیا بیگم'' کا لقب دے کر اس سے برأت کا اعلان کر دیا۔ یہاں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ تصوف کو کسی دور میں اس کے مخالفین سے وہ نقصان نہیں پہنچا جو اس کے نادان دوست اپنی کم علمی اور نادانی کی وجہ سے پہنچا گئے۔ تصوف کی آڑ لے کر بے بنیاد عقائد ومراسم کو سند جواز عطا کرنے والوں کی کمی نہیں، بے شمار بدعات وخرافات اور خلاف شرع امور کو اسی راہ سے جواز و استحسان کا درجہ حاصل ہوا، رنگ برنگے کپڑے پہننے والے نام نہاد صوفیا اور فقرا کے لئے اسی کے نام پر کھلم کھلا شریعت مطہرہ کی مخالفت کا دروازہ کھلا۔ بقول اقبال ع

بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

اس قسم کے نادان دوستوں سے دو طرح کا نقصان پہنچا، ایک تو تصوف کی اصل شکل مسخ ہوگئی اور دوسری طرف ظاہر پرستوں کو تصوف کی مخالفت کے لئے مواد مل گیا۔

اسی سلسلہ میں بدایوں کے ایک علمی خاندان کے فرزند پروفیسر ضیاء احمد صدیقی بدایونی مرحوم (ولادت ۱۸۹۴ء/ وفات ۱۹۷۳ء) سابق صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے آج سے لگ بھگ ۶۵ سال قبل ایک طویل مضمون بعنوان ''کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟'' تحریر فرمایا تھا، یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا شمار بدایوں کے ان فرزندوں میں ہوتا ہے جن پر سرزمین بدایوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ موصوف کے وسیع مطالعے، تاریخ پر گہری نظر اور معقولی انداز استدلال کے پیش نظر اس مضمون کو ایک وقیع علمی کاوش کہا جا سکتا ہے، مضمون کے مندرجات سے کلی یا جزوی اختلاف واتفاق سے قطع نظر حق تو یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس طویل مضمون میں انہوں نے تاریخ تصوف کا جائزہ لیتے ہوئے تصوف کے مخالفین وموافقین کے نظریات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا ہے، پھر تصوف کے بنیادی مسائل اور ان کے مضمرات ونتائج پر سنجیدہ پیرایہ میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے، مگر چونکہ ''مقطع میں آن پڑی ہے سخن گسترانہ بات'' اس لئے جب مذکورہ مضمون شہزادۂ تاج الفحول حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر عاشق الرسول قادری بدایونی قدس سرہٗ (ولادت ۱۳۱۱ھ۔ وفات ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۸۹۳ء/۱۹۶۰ء) کی نظر سے گزرا تو آپ نے تصوف اور صوفیا کا دفاع کرتے ہوئے ایک علمی اور سنجیدہ تحریر سپرد قلم فرما کر بصورت مکتوب پروفیسر صاحب موصوف کو ارسال کی۔ آپ نے اپنی تحریر میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو عام طور سے تصوف کی طرف سے اہل علم کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں، ساتھ ہی ان نادان دوستوں کی بھی تردید کی ہے جنہوں نے تصوف کو بازیچہ اطفال بنا کر اس کی روح کو مردہ اور اس کی شکل کو مسخ کر دیا۔

زیر نظر مضمون میں ہم پروفیسر صاحب کی تحقیق اور اس پر حضرت عاشق الرسول کی تنقید ہدیۂ قارئین کریں گے، خیال رہے کہ اس مضمون کا مقصد تصوف کے سلسلہ میں کسی نئی بحث کا آغاز کرنا نہیں ہے اور نہ ہی دو اہل علم کے درمیان محاکمہ کرنا مقصود ہے، اس مضمون کو سپرد قلم کرتے وقت تین امور پیش نظر ہیں۔ پہلا تو یہ کہ حضرت عاشق الرسول کی تحریر سے تصوف کے سلسلے میں ذہنوں میں پائی جانے والی بعض غلط فہمیاں کسی حد تک دور ہوں گی۔ دوسرا یہ کہ حضرت عاشق الرسول کے وسعت مطالعہ، تصوف و تاریخ تصوف پر گہری نظر اور غیر معمولی تنقیدی بصیرت کو اجاگر کیا جا سکے گا۔ تیسرا یہ کہ حضرت عاشق الرسول قدس سرہٗ کی تحریر سے یہ اندازہ بھی ہوگا کہ اپنے مخالف پر طنز و تعریض اور اس کی تحقیر و توہین کے بغیر بھی داعیانہ اور عالمانہ اسلوب میں کس طرح احقاق حق اور ابطال باطل کا مقدس فریضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر صاحب کا مضمون سہ ماہی ''مصنف'' علی گڑھ (شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۴۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون (ص:۱۲۷ تا ص:۱۴۸) بائیس صفحات پر مشتمل ہے، مضمون کی فوٹو کاپی اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ حضرت عاشق الرسول کا تنقیدی مکتوبات ساڑھے پانچ صفحات پر مشتمل ہے، اس پر تاریخ و سن درج نہیں ہے، یہ مکتوب حضرت کے بڑے صاحبزادہ مولانا عبدالہادی محمد میاں قادری علیہ الرحمہ (سابق استاذ شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن) کی تحریر میں ہے اور آخر میں حضرت عاشق الرسول کے دستخط ہیں، یہ مکتوب کتب خانہ مدرسہ قادریہ بدایوں کے ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ ہے، پروفیسر ضیاء احمد صاحب کے نام مشاہیر کے خطوط بعد میں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیے گئے تھے، اس مجموعہ میں بھی مذکورہ مکتوب کا کچھ حصہ شائع کیا گیا ہے۔ ان ضروری وضاحتوں کے بعد اب ہم صاحب نظر (پروفیسر صاحب) کی تحقیق اور صاحب دل (حضرات عاشق الرسول کی تنقید کی طرف آتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے مضمون کا آغاز عشق حقیقی اور عشق مجازی پر ایک دل آویز تمہید سے کیا ہے، وہ عشق کو ایک شراب قرار دیتے ہیں اور اس کی مستیوں کا تذکرہ کرکے آخر میں فرماتے ہیں:

''آج کی صحبت میں ہمیں یہ جستجو کرنی ہے کہ یہ شراب خاص میکدۂ اسلام کی کشید کی ہوئی ہے یا کسی باہر کے شراب خانہ سے لائی گئی ہے۔''

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف کا اصل ماخذ کیا ہے؟ یہ خوش نما پودا کس نے لگایا؟ ابتدا میں کس نے اس کی آبیاری کی اور اس کا حسن و جمال کس کے ہنر چمن بندی کا رہین منت ہے؟ اس سوال کے جواب میں پروفیسر صاحب نے کافی تفصیلی بحث کی ہے، ان کے نزدیک اس سلسلے میں پانچ نظریے ہیں۔

۱- تصوف ایک خودرو پودے کی طرح ہے جو مناسب زمین پا کر اگتا اور پھولتا پھلتا رہا، اسلام میں بھی کسی داخلی یا خارجی اثر کے بغیر یہ تحریک از خود پیدا ہوئی اور موافق حالات میں ترقی پکڑتی گئی۔
۲- تصوف سامی مذہب کے خلاف آریائی دماغ کا ردعمل ہے۔
۳- صوفیانہ عقائد مسیحی افکار کے مرہون منت ہیں۔
۴- یہ عقائد فلسفۂ یونان کی صدائے بازگشت ہیں۔
۵- تصوف عین تعلیمات اسلام کا خلاصہ اور ارشادات کتاب و سنت کا عطر ہے۔

پروفیسر صاحب نے ان پانچوں نظریات کے دلائل بغیر تائید یا تردید کے ذکر کیے ہیں، جو تقریباً ۹ صفحات (ص-۱۲۸ تا ص-۱۳۶) پر محیط ہیں۔ اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اولین چار نظریات کو باطل قرار دیتے ہیں جب کہ پانچویں نظریے سے جزواً انہیں اتفاق ہے اور جزواً اختلاف۔ اس کے بعد اسلامی تصوف کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا ہے۔

حضرت عاشق الرسول کے خط کی ابتدا ان الفاظ میں ہوتی ہے:

''اعز و اکرم مولانا ضیاء احمد زید مجدہٗ بارک اللہ لہٗ- السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ - الحمد للہ علیٰ کل حال، عنایت نامہ مؤرخہ ۲۴ کل موصول ہوا اور آج جواب لکھ رہا ہوں، اس سے قبل آپ کا کوئی خط آنا یاد نہیں، میں کوتاہ قلم ضرور ہوں مگر نہ اس قدر کہ آپ کے خط کا جواب نہ دیتا۔''

اس کے بعد کچھ ذاتی نوعیت کے امور تحریر فرما کر حضرت لکھتے ہیں:

''آپ کا مضمون تصوف وصول ہوا، اول سے آخر تک ایک ساتھ پڑھ گیا، بعض احباب نے مبالغہ سے کام لیا تھا، اتنا سخت تو نہیں،

تاہم اصولی طور پر سے، بہت سے امور متکلم فیہ ہیں۔''

اس کے بعد تصوف کے بنیادی نظریئے ''مسئلہ وحدۃ الوجود'' پر اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مختصر یہ کہ میرے نزدیک عقیدۂ توحید وجودی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ حقیقت واقعہ کے طور پر ہر اس شخص پر منکشف ہوتا ہے جو احسان کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو، پھر ان میں سے بعض حضرات نے اس کو بغلبہ شوق علم سینہ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کردیا جس سے عوام میں فتنہ برپا ہوگیا۔ اسی باعث اکثر اکابرین نے سکوت فرمایا اور بجز محرم راز دوسرے سے کچھ نہ کہا یہی طریق احوط ہے، ظاہر ہے کہ عوام الناس نہ اس کے لئے مکلف ہیں اور نہ مکلف ہو سکتے ہیں۔''

اس کے بعد پروفیسر صاحب کے پیش کردہ تاریخ تصوف کے خاکہ پر چند تنقیدی اشارات فرمائے ہیں۔ سب سے پہلے صوفی کے لقب سے کون بزرگ ملقب ہوئے؟ اس کے بارے میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''پہلے شخص جو صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابوہاشم کوفی معاصر سفیان ثوری تھے، بعض کے نزدیک اس لقب سے پہلے مشہور ہونے والے جابر بن حیان کوفی تھے۔''

مگر حضرت عاشق الرسول اس تحقیق سے متفق نہیں ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''آپ ناراض نہ ہوں بعض دیگر امور کی طرف بھی چند اشارات مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کے پہلے دس صفحات تاریخ تصوف پر محتوی ہیں، جن میں بہت سے امور متکلم فیہ ہیں، لیکن چند امور پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شعرانی نے تحقیق فرمائی ہے کہ سب سے پہلے لفظ صوفی حضرت حسن بصری کے لئے استعمال ہوا۔''

اسلام کے ابتدائی ادوار میں تصوف زاہدانہ زندگی، شب بیداری، پبلک لائف سے کنارہ کشی اور قناعت پسندانہ طرز حیات سے عبارت تھا، اس میں عقیدۂ وحدۃ الوجود یا توحید وجودی کے نظریہ کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اس سلسلہ میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''حضرت بایزید اور شیخ جنید سے پہلے تصوف ایک خاص قسم کی زاہدانہ اور قناعت پسندانہ زندگی کا نام تھا، ان دونوں بزرگوں نے وحدۃ الوجود کا نغمہ اس لَے سے چھیڑا کہ در و دیوار گونجنے لگے۔''

حضرت عاشق الرسول کے نزدیک عقیدۂ وحدۃ الوجود کی ابتدا حضرت بایزید اور شیخ جنید سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد تو خلافت راشدہ ہی میں پڑ گئی تھی، آپ فرماتے ہیں:

''سید الطائفہ اور حضرت بایزید نے وحدۃ الوجود کا نغمہ سب سے پہلے نہیں چھیڑا بلکہ سب سے اول سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ لبید بن ربیعہ کے اس مصرع کی مدح فرما کر اس عقیدہ کی توثیق فرمائی ''الا کل شئ ماسوا اللّٰہ باطل'' اس سے زیادہ تو کسی نے کچھ نہیں کہا، جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔''

ان دونوں بزرگوں کے مدتوں بعد تک عقیدۂ وحدۃ الوجود صرف علم سینہ کی حد تک رہا، علم سینہ سے سب سے پہلے کس نے اس کو فلسفیانہ رنگ دیا؟ اس بارے میں پروفیسر صاحب رقم طراز ہیں:

''ان کے (حضرت جنید و بایزید کے) مدتوں بعد شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدۃ الوجود کو، جواب تک ایک وجدانی اور ذوقی چیز سمجھی جاتی تھی، عقلی اور استدلالی جامہ پہنا دیا اور تصوف کو خالص فلسفہ بنادیا۔ ان کی تصانیف آج تک خواص اہل علم میں اس فن کے غوامض و اسرار کی حامل مانی جاتی ہیں۔ خدا رحمت کرے امام غزالی پر انہوں نے اپنی مجتہدانہ تصانیف سے اسلامی عقائد کو ان کی اصل صورت میں پیش کیا اور تصوف کو فلسفہ کی غلامی سے بچالیا۔''

پروفیسر صاحب کی اس رائے پر حضرت عاشق الرسول تنقید فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ابن عربی کو اگر صرف اس لئے فلسفی کہا جائے کہ انہوں نے فلسفہ زدہ گروہ کو عقیدۂ وحدۃ الوجود سے آشنا کرنے کے لئے استدلالی رنگ اختیار کیا تو اور بات ہے ورنہ کہاں فلسفۂ افلاطونی اور کہاں عقیدۂ وحدۃ الوجود۔ البتہ اگر غزالی کی تصانیف پر غائر نظر ڈالی جائے تو ان کو بجائے صوفی کے فلسفی کہنا زیادہ آسان ہے۔''

تصوف کے ابتدائی مصنفین میں پروفیسر صاحب نے مندرجہ ذیل بزرگوں کا ذکر کیا ہے:

''تصوف کے ابتدائی مصنفین میں یحییٰ بن معاذ رازی، سید

الطائفہ جنید بغدادی، شیخ نصر سراج طوسی، امام ابوالقاسم قشیری خراسانی اور شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس سلسلہ میں ابن منصور کا کیوں تذکرہ نہ ہوا، اس کی قربانی اس قدر بے قیمت تو نہ تھی۔"

ابن منصور سے حضرت کی مراد الحسین بن منصور الحلاج البغدادی ہیں۔ آپ کو ذی قعدہ ۳۰۹ھ کو بغداد میں قتل کیا گیا۔ آپ کی صوفیانہ تصانیف میں کتاب الطواسین، بستان المعرفہ، البهجہ، حمل النور و الحیاۃ اور خلق الانسان والبیان مشہور ہیں۔

بقول پروفیسر صاحب امام غزالی نے اپنی مجتہدانہ تصانیف سے تصوف کو فلسفہ کی غلامی سے بچایا مگر اس کے بعد کیا ہوا خود انہیں کی زبانی سنیے:

"تاہم فارسی شعرا مثلاً سنائی، عطار، رومی، عراقی، احدی، شبستری، خسرو، حافظ اور جامی نے اپنے اپنے دور میں تصوف کی مئے مردافگن، جس میں وحدۃ الوجود کی چاشنی شامل تھی، اس ذوق وشوق سے پی اور پلائی کہ زمین وآسمان سرشار ہو گئے۔"

جواباً حضرت فرماتے ہیں:

"فارسی شعرا نے کون سی اصولی بات لبید سے بڑھ کر کہی ہے، ہاں طرز ادا تو ہر شخص کا جدا ہوتا ہے۔"

تصوف ابن عربی کی "فلسفیانہ تصانیف" امام غزالی کے "مجتہدانہ دفاع" اور فارسی شعرا کی "خمار آلود شاعری" کے درمیان پروان چڑھتا گیا یہاں تک کہ بقول پروفیسر صاحب:

"ہمارے ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی کا ظہور ہوا، جنہوں نے وحدۃ الوجود کے مقابلہ میں وحدۃ الشہود کا عقیدہ ثابت کیا اور اتباع کتاب وسنت پر بہت زور دیا۔"

اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

"حضرت مجدد الف ثانی کے باب میں مجھے کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں، میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ (قدوۃ السالکین حضرت مولانا شاہ عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری بدایونی - اسید) نے حدود مقرر فرمادی ہیں۔ اس کے آگے جانے کی اجازت نہیں، تاہم یہ کہنا ہے کہ حضرت ممدوح بعض وقت تو کنز وہدایہ پر اس قدر توجہ مبذول فرماتے ہیں کہ آئینۂ دل کو شکست تام ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں: "درحدیث قال قال بسیار است مرا قول ابوحنیفہ درکار است" اور فرماتے ہیں: "مرا حدیث چہ کار قول ابوحنیفہ بیار" مگر جب یہ عرض کیا جائے کہ ابوحنیفہ نے تکفیر اہل قبلہ کو منع فرمایا ہے تو حضور والا ابن عربی و امثالہم کی تکفیر کیوں فرماتے ہیں؟ تو جواب ملتا ہے "رگ فاروقیم سکوت نمی کند" حالانکہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توثیق اوپر گزری۔ وہ تو یہ کہیے کہ حضرت مجدد صاحب کے (بقول آپ کے) "ظہور" کے وقت حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی جیسے بزرگ تشریف فرما تھے، ورنہ خدا جانے کیا صورت حال ہوتی۔"

نظریۂ وحدۃ الشہود جس کا ذکر پروفیسر صاحب نے حضرت مجدد صاحب کے حوالے سے کیا تھا اس پر حضرت عاشق الرسول ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں:

"مسئلہ وحدۃ الشہود کے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے۔ شہودی حضرات خود امر غیر واقعہ کے مشاہدے کے قائل ہیں۔ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

پروفیسر صاحب کے بقول تصوف میں عقیدۂ وحدۃ الوجود جنید و بایزید نے شامل کیا پھر مجدد الف ثانی نے وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ اب بیک وقت تصوف میں یہ دونوں قسم کے نظریات جاری ہو گئے۔ ان دونوں نظریات کو آپس میں متضاد سمجھا جاتا رہا۔ پھر کیا ہوا؟ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

"پھر آخر عہد میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی بلند پایہ تصانیف میں دونوں عقیدوں میں تطبیق کی کوشش کی۔"

حضرت عاشق الرسول ارشاد فرماتے ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو علامہ سبکی و اتباعہ کی تحقیقات سے علیحدہ ہو کر دیکھا جائے تو اصل حقیقت ہویدا ہو۔ بہر حال صاحب موصوف وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، ان کے ایک عزیز نے اس بحث میں رسالہ دفع الباطل لکھا ہے جو ایک معتدل اور اچھی کتاب ہے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"ہندوستانی علما کا تذکرہ ہو تو حضرت بحر العلوم عبدالعلی فرنگی محلی

کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ ناتمام رہتا ہے، حضرت کشفی اور استدلالی دونوں طریقوں سے وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔''

پروفیسر صاحب نے تصوف کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ تصوف اعتقادی اور تصوف عملی۔ پھر تصوف عملی کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک اعمال مقصود بالذات، دوسرے غیر مقصود بالذات۔ تصوف اعتقادی میں بنیادی حیثیت مسئلہ وحدۃ الوجود کو حاصل ہے۔ اس لئے سب سے پہلے پروفیسر صاحب نے اسی پر بحث کی ہے۔ وحدۃ الوجود یا بلفظ دیگر توحید وجودی کی تشریح وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس کا ماحصل یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور تمام اشیاء جو نظر آتی ہیں اسی کی تجلیات یا مظاہر ہیں۔ وجود حقیقی اور کائنات میں ذات وصفات کی نسبت ہے اور چونکہ صفات عین ذات ہیں (لہٰذا) کائنات کا بھی حق تعالیٰ سے الگ کوئی وجود نہیں بلکہ سب وہی ہے۔ شیخ ابن عربی کا قول ہے ''سبحان من خلق الأشياء وهو عينها'' ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''الرب حق و العبد حق فما ادری من المکلف'' اسی سے تخلیق عالم کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی وجود بسیط یا ذات بحت (جس کو عبدالکریم جیلی نے 'العمیٰ' کے لقب سے یاد کیا ہے) لاتعین کی شان سے متصف تھی، جب وہ اس کی مقتضی ہوئی کہ خود کو پہچانے تو اس نے تعینات یا تنزلات کی طرف رجوع کیا جن کو عالم کائنات کہا جاتا ہے۔''

توحید وجودی کی مذکورہ تشریح سے حضرت عاشق الرسول مطمئن نہیں ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''عقائد صوفیہ میں توحید وجودی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ وجود حقیقی اور کائنات میں ذات وصفات کی نسبت ہے، یہ عقیدہ نہ ابن عربی کا ہے نہ دیگر محققین صوفیہ کا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ بعض جگہ مبہم مسئلہ کے لئے بصورت تشبیہ یہ کہا گیا ہے، لیکن جب صوفیہ کائنات کا وجود اعتباری مانتے ہیں تو اس اعتبار کو واجب کا نہ عین کہہ سکتے ہیں نہ صفات۔''

مسئلہ وحدۃ الوجود کی تشریح کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے اس کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اسلام تو خدا کی وحدانیت کے ساتھ اس کی خلاقیت، ربوبیت، رزاقیت اور انسان کی مخلوقیت، عبدیت اور مرزوقیت کا بانگ دہل اعلان کر رہا ہے ''هو الذی خلقکم من طین'' وہی خدا ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، وہیٰ رب العلمین اور رزاق ذو القوۃ المتین ہے جس کی شان پاک هو يطعم و لا يطعم ہے، اور ظاہر ہے کہ مطعم اور مطعَم ایک نہیں ہو سکتے۔ تخلیق کی غایت خود قرآن کے الفاظ میں یہ ہے ''وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون'' ''ہم نے جن اور انسان کو محض اس لئے پیدا کیا کہ ہمارے حضور اپنی عبودیت کا اعتراف کریں۔ اگر اس عقیدے کو نہ مانا جائے تو نیک اور بد کا امتیاز، شیخ و برہمن کا فرق، اسلام و کفر کا تفاوت، انبیاء کی بعثت، شرائع کی غایت، انسان کی تکلیف اور مسئولیت سب لغو ٹھہرتی ہے۔''

پروفیسر صاحب کی اس دلیل پر حضرت عاشق الرسول ان الفاظ میں تنقید فرماتے ہیں:

''مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ نے بھی عوام کی طرح اس مغالطہ پر اعتماد فرمایا کہ اگر توحید وجودی ہوگی تو نیک و بد کا امتیاز، شیخ و برہمن کا فرق اور انسان کی مسئولیت و تکلیف سب لغو ٹھہریں گے (معاذ اللہ)۔ یہی وہ منزل ہے جس سے انکار تصوف کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی نقطہ پر افکار مخالفین کی انتہا۔ حالانکہ ابن عربی نے ہزار بار کہا 'العبد عبد و ان ترقی و الرب رب و ان تنزل'' فارسی میں بھی کسی نے کہا اور سچ کہا کہ ۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

صوفی نہ جنت و دوزخ کا انکار کرتا ہے، نہ عذاب وثواب کا، نہ اسلام کا مخالف ہے نہ بعثت وشرائع کا۔ وہ تو تمام کائنات کو اسی ذات حق واجب الوجود کی نسبت کرتے ہوئے اعتباری تصور کرتا ہے اور اصل وجود (مابه الموجودیت) کو ایک ہی تسلیم کرتا ہے وبس۔''

اس سلسلے میں غلط فہمی پیدا ہونے کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت فرماتے ہیں:

''آخر نصوص میں صدہا ایسے ہیں جیسے لن يصيبنا الا ما كتب الله لنا اور جف القلم بما هو كائن قرآن کریم و احادیث میں اس کی تائید بتاکید آئی ہے، مگر صدہا نصوص سے لیس

للانسان الا ماسعیٰ کی توثیق ہوتی ہے، تو کیا یہ آپس میں مغائر ہیں؟ (حاشا) بات یہ ہے کہ عامۃ الناس حواس ظاہرہ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر ہمارے حواس (اور عقل انسانی بھی) اکثر و بیشتر شکست کھاتے رہتے ہیں۔ عوام کے حواس دیدہ ودانستہ اس کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں، مگر توحید وجودی کے قائل اس شکست کا اعتراف کرتے ہیں، یہیں سے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلات تو بغیر توجہ شیخ کامل کے حاصل نہیں ہوتیں اور اطمینان قلب بھی اسی وقت ملتا ہے، لیکن استدلالی طور سے متقدمین میں علامہ قونوی اور متاخرین میں حضرت بحرالعلوم فرنگی محلی اور استاذ مطلق مولانا فضل حق خیر آبادی نے اس بحث میں رسائل تصنیف فرمائے ہیں۔ مولانا فضل حق کا رسالہ غالباً علامہ راغب الجیلانی کے پاس ہوگا اس کا مطالعہ کیجئے۔''

حضرت عاشق الرسول کی مذکورہ عبارت میں علامہ قونوی سے صدالدین محمد بن اسحٰق القونوی مراد ہیں، آپ شیخ اکبر ابن عربی کے شاگرد تھے، عمر رضا کحالہ کے مطابق سن ۶۷۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کی صوفیانہ تصانیف میں النصوص فی تحقیق الطور المخصوص ، الفکوک فی مستندات حکم الفصوص ، مفتاح اقفال القلوب لمفاتیح علام الغیوب اور النفحات الالھیہ مشہور ہیں۔ حضرت بحرالعلوم فرنگی محلی کے جس رسالہ کی طرف حضرت عاشق الرسول نے اشارہ فرمایا ہے اس کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ''آثار الاُول'' میں ''رسالہ فی وحدۃ الوجود'' کے نام سے درج کیا ہے۔ جب کہ ''قاموس المشاھیر'' کے مصنف نظامی بدایونی نے اس کو ''رسالہ توحید'' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ فاضل خیر آبادی کے رسالہ کا نام ''الروض المجود فی تحقیق وحدۃ الوجود'' ہے یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توحید وجودی کے سلسلہ میں صوفیہ کے پاس کیا دلیل ہے اور اس عقیدے کے ثبوت میں وہ کیا پیش کرتے ہیں؟ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''صوفیہ اپنی تائید میں تین چیزیں پیش کرتے ہیں۔ نقل، عقل اور کشف۔''

سب سے پہلے پروفیسر صاحب نے صوفیہ کے نقلی دلائل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ نقل سے مراد قرآن و حدیث ہیں۔ پہلے انہوں نے صوفیہ کے قرآنی استدلال پر بحث کی ہے، وہ آیات جو صوفیہ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں ان کے بارے میں پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ ان میں عموماً بغیر کسی صارف قطعی کے تاویل کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ آیات اور ان کی صوفیانہ تفسیر نقل کر کے اس پر نقد کیا ہے، اس میں انہوں نے جو بنیادی نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

''کسی نص قرآنی کا مفہوم متعین کرنے کے لئے بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں، ادبیت و عربیت میں تبحر، لغات عرب اور اشعار جاہلیت پر عبور، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی روایات پر اطلاع، اسباب نزول پر نظر، سیاق و سباق کا خیال اور دوسری نصوص و اردہ کا تتبع، اگر یہ سب چیزیں نہ ہوں تو وہ تفسیر بالرائے اور وہ تاویل تاویل القول بما لا یرضی بہ قائلہ کی مصداق ہوگی۔ ہمیں افسوس ہے کہ حضرات صوفیہ کا استدلال اکثر اسی قبیل سے ہے۔''

اس پر حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

''آیات کے متعلق تو اصولی بات آپ نے فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر بالرائے مناسب نہیں، لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان آیات کے ظواہر سے عدول آخر کس دلیل محکم کی بنیاد پر ہے، آیا استدلالی عقل ان کو متاول سمجھنے پر مجبور کرتی ہے یا حواس ظاہران کے مدلول ظاہر سے ابا کرتے ہیں، یہ بیان محتاج تفصیل ہے۔''

صوفیہ کی طرف سے پیش کی جانے والی احادیث کے بارے میں پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ بیشتر اصول روایت کے اعتبار سے غیر مستند ہیں، اپنے اس دعوے کی دلیل میں انہوں نے چند احادیث نقل کر کے ان پر ائمہ حدیث کا نقد پیش کیا ہے۔ اس پر حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

''احادیث کے متعلق اکثر کو ضعیف اور بعض کو موضوع کہا گیا ہے۔ جرح و تعدیل ایک بڑا فن ہے، کسی شخص کا کسی راوی کو ضعیف یا وضاع کہنا اس کی احادیث کے ضعیف یا موضوع ہونے کے لئے دلیل کافی نہیں ہے۔''

پروفیسر صاحب نے صوفیہ کی مستدل احادیث میں سے ایک حدیث "من عرف نفسه فقد عرف ربه" (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) نقل کر کے اس پر مندرجہ ذیل تنقید کی ہے۔

''ابن تیمیہ نے اس کو موضوع کہا ہے۔ سمعانی کا بیان ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے بلکہ یحییٰ بن معاذ کا قول ہے۔''

حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

''ہر حدیث کی بابت اس وقت کچھ لکھنا نہیں ہے، صرف علامہ ابن تیمیہ کا نام دیکھ کر کچھ لکھنا پڑا، صاحب موصوف سے خادمان مدرسہ قادریہ کو پرانا رابطہ ہے، فرماتے ہیں کہ حدیث "من عرف نفسه فقد عرف ربه" موضوع ہے۔ اچھا صاحب موضوع ہے، لیکن وفی انفسکم افلاتبصرون تو الحاقی نہیں، ظاہر ہے کہ معرفت سے مراد معرفت آیات و تجلیات ہی ہوسکتی ہے کہ معرفت کنہ ذات تو ممتنع بالذات ہے، اس پر تمیع عقلا کا اتفاق ہے۔''

پروفیسر صاحب نے احادیث کے ضعف اور وضع کے سلسلہ میں علامہ ابن جوزی کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اس پر حضرت فرماتے ہیں:

''علامہ ابن جوزی نے بہت سی صحیح حدیثیں موضوعات میں داخل کر دیں، آخر علامہ سیوطی کو تعاقب کرنا پڑا۔''

پروفیسر صاحب نے ایک اور حدیث کان الله ولم یکن شیء معه وهو الان کما کان (اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا) نقل کر کے اس پر ملا علی قاری کی تحقیق پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ملا علی قاری سے کون دریافت کرے کہ آخری جملہ حدیث نہ سہی لیکن اس پر ان کا اعتقاد ہے کہ نہیں؟ آپ ہی فرمائیے کہ آپ "الان کما کان" کے معتقد ہیں یا ذات واجب میں کسی تغیر کے معترف ہیں؟ (معاذ اللہ)۔''

حضرت عاشق الرسول کی تنقید بہت معنی خیز ہے، ایسی تنقید وہی کرسکتا ہے جو صاحب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل بھی ہو، مگر بہرحال ملا علی قاری کے دفاع میں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ کسی بھی چیز کا نفس الامری حقیقت ہونا الگ بات ہے اور اس کا حدیث رسول ہونا الگ بات ہے، ملا علی قاری کی تحقیق دوسرے باب سے متعلق ہے۔

پروفیسر صاحب کی پیش کردہ باقی احادیث کے بارے میں حضرت نے صرف اتنا فرمایا کہ:

''ہر حدیث کے متعلق لکھنے کو دل چاہتا ہے، مگر وقت نہیں اس لئے مجبوری ہے۔''

صوفیہ کے نقلی دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر صاحب مزید فرماتے ہیں:

''اسی طرح جناب امیر کا حضرت حسن بصری کو خرقۂ تصوف پہنانا بھی بے اصل ہے، بلکہ ائمہ حدیث نے ان کا جناب مرتضوی سے سماع حدیث بھی تسلیم نہیں کیا، تلقین جو صوفیہ میں متعارف ہے اور نسبت مصافحہ بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصلاً ثابت نہیں۔''

اس پر حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

'لقاء حسن بصری بحضور مرتضوی قطعاً ثابت ہے۔ 'رسالہ فخر الحسن' اور اس کی شرح 'القول المستحسن' میں اس کو وضاحت سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں۔ حدیث مصافحہ کا تسلسل دیکھنا ہو تو رسالہ المناصحة فی تحقیق المصافحة ملاحظہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ بھی مولانا راغب کے پاس ہوگا۔ یہ حضرت تاج الفحول کی تصنیف ہے۔''

حضرت نے جس 'رسالہ فخر الحسن' کا تذکرہ فرمایا ہے وہ فخر سلسلہ چشتیہ نظامیہ حضرت مولانا فخر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۱۲۶ھ، وفات ۱۱۹۹ھ) کی تصنیف ہے اور اس کی شرح القول المستحسن مولانا عزیز الزماں کی تصنیف ہے۔ صوفیہ کے منقولی استدلال کے بعد اب پروفیسر صاحب صوفیہ کے عقلی دلائل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اب رہا عقلی استدلال، اس میں شک نہیں کہ متاخرین صوفیہ نے عقلی دلائل کا طوفان بپا کر دیا ہے، بلکہ اسلامی توحید کے سیدھے سادھے مسئلہ کو خالص فلسفہ بنا دیا۔''

پھر صوفیہ کی جانب سے مسئلہ وحدۃ الوجود پر پروفیسر صاحب نے ایک عقلی دلیل نقل کی ہے اور اس کو عقلی دلیل سے رد کر کے فرماتے ہیں:

''عقائد کے بارے میں نصوص کے ہوتے ہوئے عقل کو مدار

قرار دینا درست نہیں، عقل شرع کی حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔''

حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

''عقلی دلائل کے سلسلہ میں آپ نے بہت اختصار سے کام لیا اور یہ لکھنے کے باوجود کہ صوفیہ نے عقلی دلائل کا طوفان بپا کر دیا ہے کوئی مکمل دلیل نہیں لکھی۔''

پھر حضرت اپنی جانب سے مسئلہ توحید وجودی پر ایک عقلی استدلال پیش کرتے ہیں:

''میں عرض کروں اگر وجود کی حقیقت پر ہی غور کر لیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ تکثر کو قبول نہیں کرتا، وجود کے چند فراد ہوں تو ما بہ الاشتراک کے ساتھ ما بہ الامتیاز کی بھی ضرورت ہوگی۔ گویا ما بہ الموجودیت اپنے وجود میں مزید کسی چیز کا محتاج ہے، یہ اس قدر صاف اور مختصر بات ہے جس کا جواب نہیں، مگر کیا کیجئے کہ حواس ظاہر معقولات کو بلا دلیل رد کر دیتے ہیں، اس ورطہ سے نکلنے کے لئے توفیق الٰہی درکار ہے، آپ نے یہ درست فرمایا کہ نصوص کے ہوتے ہوئے عقل کو مدار قرار دینا درست نہیں بس آمنت باللہ الذی ھو الاول و الآخر والظاھر و الباطن ، الا انہ لکل شیٔ محیط ، صدق اللہ ،صدق اللہ، صدق اللہ .''

نقل وعقل پر بحث کے بعد اب پروفیسر صاحب صوفیہ کی تیسری اور آخری دلیل کشف کی طرف آتے ہیں مگر اس سلسلہ میں تفصیل میں نہ جا کر بہت اختصار کے ساتھ فرماتے ہیں:

''آخر میں کشف کا نمبر آتا ہے، مگر اس خصوص میں راقم السطور کو لب کشائی کا کوئی موقع نہیں، البتہ یہاں حضرت مجدد کا ارشاد نقل کرنا کافی ہے۔''

اس کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے ایک فارسی اقتباس نقل فرمایا ہے، جس کا مختصراً خلاصہ یہ ہے کہ تمام کشفیات ظاہر شریعت کے مطابق ہوتے ہیں اور سر مو ظاہر شریعت سے مخالفت نہیں رکھتے اور اگر بعض صوفیہ نے ظاہر شریعت سے مخالف اپنا کشف بیان کیا ہے تو وہ یا تو ان کا سہو ہے، یا سکر باطن۔ حضرت مجدد صاحب کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''اس سے قطع نظر کشف ادلہ شرعیہ میں بھی محسوب نہیں ہے۔''

اس پر حضرت عاشق الرسول کی تنقید ملاحظہ فرمائیں۔ آپ رقم طراز ہیں:

''اس کے بعد آپ نے کشف پر بحث کی ہے اور سب سے پہلے حضرت مجدد صاحب کے اقوال لکھے ہیں۔ حضرت کے ارشادات کی ماہیت سمجھنے کے لئے شیخ محقق مولانا عبدالحق کے رسائل کو دیکھنا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ کشف ادلۂ شرعیہ میں نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے لئے وہ حجت نہیں ہے مگر صاحب کشف حقیقت منکشفہ سے کیوں کر انکار کرے؟ اس مقام پر امام ابوحنیفہ کے قول سے حجت حاصل کی جاتی ہے کہ رائے مبتلا بہ پر فتویٰ ہے۔''

صوفیہ کے تینوں قسم کے دلائل پر نقد سے فارغ ہو کر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''تصوف بذات خود ایک محمود عقیدہ ہے اور تصحیح خیال و تہذیب اعمال کے لئے اس سے زیادہ مؤثر ذریعہ کوئی نہیں لیکن ہر تحریک کی طرح آخر اس میں بھی غلو سے کام لیا گیا جس کی وجہ سے متعدد علمی اور عملی قباحتیں پیدا ہو گئیں۔''

حضرت عاشق الرسول ارشاد فرماتے ہیں:

''اس کے بعد تصوف کو ایک محمود عقیدہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی چند خرابیاں بیان کی ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس عقیدے کے سینہ سے صفحہ قرطاس پر آنے کے بعد ایک فتنہ برپا ہو گیا۔ ایک طرف تو عوام بغیر سوچے سمجھے اس دقیق مسئلہ پر بحث کرنے لگے اور ایسے ایسے اقوال معرض تحریر میں آ گئے جو اصل مسئلہ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض وقت تو اس مسئلہ کے بالکل مخالف عقائد بیان ہونے لگے۔ دوسری جانب منکرین تصوف نے اپنی ناقص فہم کے مطابق اکابر کے مطالب کو غیر شعوری طور پر ان کے مقصد کے بالکل خلاف سمجھ لیا، اس پر طوفان مخالفت بہت تیز ہو گیا۔''

پروفیسر صاحب نے تصوف میں غلو کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی قباحتوں کا ذکر کرتے ہوئے سولہ (۱۶) قباحتیں شمار کی ہیں۔ ان کی نظر میں پہلی قباحت یہ ہے کہ:

''صوفیہ وجود یہ کے نقطۂ خیال سے عامۃ المسلمین موحدین جو حق تعالیٰ اور کائنات کی عینیت کے منکر ہیں یا مشرک ٹھہرتے ہیں یا

ایمان باللہ سے محروم اور یہ محض ہمارا منطقی استدلال نہیں بلکہ صراحتاً بعض مشائخ کی تحریرات سے ثابت ہے۔"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پروفیسر صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی صاحب کی مشہور کتاب "کلمۃ الحق" سے ایک عبارت پیش کی ہے۔ ان کی بیان کردہ اس پہلی قباحت کا جائزہ لیتے ہوئے حضرت عاشق الرسول فرماتے ہیں:

"یہ صحیح نہیں کہ محققین صوفیہ عامۃ المسلمین کو مشرک یا کافر سمجھتے ہیں جو نیک نفس گروہ فرعون پر فتویٰ کفر لگانے میں احتیاط کرے اس پر یہ الزام شدید ہے۔ شاہ عبدالرحمٰن صاحب یا بعض دیگر صاحبان نے اس سلسلہ میں کچھ شوخیاں فرمائی ہیں۔ اس کی اصل وجہ متکلمین کی وہ جرأتیں ہیں جو مسئلہ ذات وصفات میں کی گئی ہیں۔ بہرحال افراط وتفریط سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہئے۔"

ایمان فرعون کا قول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس موقف کی تائید میں ملا جلال الدین محقق دوانی نے ایک مستقل رسالہ "ایمان فرعون" کے نام سے تصنیف فرمایا ہے۔ ملا جلال دوانی کے اس رسالہ کا رد ملا علی قاری نے "فر العون من مدعی ایمان فرعون" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ دونوں رسالہ المطبعۃ المصریہ قاہرہ سے علامہ ابن الخطیب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئے تھے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ ایمان فرعون کا نظریہ شیخ اکبر کا نہیں ہے، بلکہ یہ ان کی کتب میں تحریف وتلفیق کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ہیچ مداں راقم سطور اپنے ذاتی مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں بہت کچھ لکھ سکتا ہے لیکن سر دست طوالت کے خوف سے میں دور حاضر کے عظیم محقق مخدوم گرامی ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں، موصوف نے اس موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر فرمایا تھا جو غالباً ۱۹۹۶ء میں ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اہل ذوق وہاں اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے دوسری قباحت یہ بیان فرمائی ہے کہ:

"جب عینیت امر حق ہے تو مشرک بھی موحد ہوئے۔ "وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ" کی تفسیر او پر گزری کہ خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ظاہر ہے کہ کوئی خدا کے فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔ لہٰذا بت پرست بھی، دراصل اسی کی عبادت کرتے ہیں (الرسائل الالٰھیہ لابن عربی)۔ اس پر ابن تیمیہ نے بجا ایراد کیا ہے کہ قضاء دینی اور قضاء تکوینی دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کو مخلوط کرنا درست نہیں۔"

حضرت عاشق الرسول جواباً ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ اکابر صفت شان رحمت میں غلو رکھتے تھے اور تمام کائنات کو مسلمان ثابت کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اسلوب بیان اپنا اپنا جدا ہے۔ غزالی نے التفرقۃ بین الاسلام و الزندقۃ میں تمام دنیا کو بے گناہوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ابن عربی نے بھی بعض وقت یہ کوشش کی، پھر اپنی بعض تصانیف میں اس بحث کی علت غائی بھی بیان فرما دی ہے۔ ابن عربی کے رسائل الٰہیات جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ میں نے نہیں دیکھے اور نہ ابن تیمیہ کی تنقید دیکھی ہے، مگر اصولی طور سے یہ کہنا ہے کہ صرف قضاء تکوینی کی تسلیم سے مسئلہ ختم نہیں ہوتا، اشاعرہ اور معتزلہ کی شدید جنگ متعلق خلق افعال عباد کا یہی تصفیہ ہوتا ہے ورنہ وہ کہتے ہیں کہ ذمہ داری مشترک ہے۔"

پروفیسر صاحب کی بیان کردہ تیسری خرابی کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر توحید وجودی مانی جائے تو اسلام و کفر، نیکی و بدی، حق و باطن اور جنتی و دوزخی میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔"

اس پر حضرت فرماتے ہیں:

"صوفی اسلام و کفر کو ایک نہیں سمجھتا اور نہ جنت و دوزخ کو ایک مانتا ہے۔ ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد۔"

پروفیسر صاحب کے نزدیک تصوف کی چوتھی قباحت یہ ہے کہ:

"حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امور دین خصوصاً توحید کی تبلیغ اس اہتمام، اعلان اور وسعت سے فرمائی کہ مثال نہیں ملتی، ہر ہر مسئلہ کی تکرار کے ساتھ ارشاد ہوتا تھا اللھم ھل بلغت اللھم فاشھد، عقل نہیں چاہتی کہ ایسے اہم مسئلہ کے بارے میں جوامع الاصول، رأس الایمان اور مناط نجات ہو سکوت و اہمال برتا ہو جب کہ غسل و طہارت کے معمولی مسائل کے جزئیات تک صحابہ کو تعلیم فرمائے۔"

حضرت عاشق الرسول اس پر قدرے تفصیلی نقد فرماتے ہوئے

رقم طراز ہیں:

''میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ عقیدۂ وحدت باوجود حق ہونے کے بہت مشکل ہے اور عامۃ الناس اس کو سمجھنے کے مکلف نہیں، اس لئے کہ کلام قدر عقول کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ دو طرح کے علوم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے، ایک سب کو سکھاتا ہوں، دوسرا اگر بیان کردوں تو تم لوگ مجھے قتل کردو۔ شریعت سہلہ سمحا کا اقتضا بھی ہے کہ عام فہم ہو، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے جو مسئلہ سب کی سمجھ میں آئے۔ عوام کے لئے نہ متکلمین کے لاعین و لاغیر کی چیستاں کی ضرورت ہے اور نہ (باوجود حق ہونے کے) مسئلہ وحدت الوجود کی۔ اس لئے سرکار رسالت روحی لہ فدا صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کے پاک السنہ سے اس کی عام اشاعت نہ فرمائی گئی، یہی دین سمحا کا تقاضا تھا، جس قدر اشارات فرمائے گئے کافی سے زیادہ ہیں۔ پھر سرکار ختمیت مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم (جو خود مصداق **ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن** اور **وھو بکل شی علیم** ہیں) یا خلفاء راشدین کے تمام معاملات مناظر مجادل کے لئے نہیں بلکہ ناظر منصف کے لئے دلائل قوی ہیں اور برہان ساطع۔ توحید وجودی کے عقیدے کے بغیر وہ اخلاق عام اور وہ مراعات تام ہو ہی نہیں سکتی۔ عرصہ ہوا جو ایک تحریر اپنے ایک سلجوقی دوست کے لئے لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''عقیدہ کا معاشرہ پر اثر''۔ اس کا مسودہ مل گیا تو ارسال کروں گا۔ بیک وقت دوست و دشمن پر یکساں حکمرانی اور بیک نگاہ اپنے پرائے پر یکساں التفات۔ حضور آل احمد اچھے میاں مارہروی قدس سرہٗ نے اپنے خلیفہ حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید بدایونی قدس سرہٗ کے لئے لکھا ہے ''ظاہرا و مثل ابوحنیفہ باطن او مثل منصور''۔ سچے صوفی کا یہی حال ہے۔ ''در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق'' خلفائے راشدین کی سی حکومت وہی کرسکتا ہے جو توحید وجودی کا عملاً قائل ہو۔ اس اجمال کی تفصیل تو فتوحات مکیہ کا وعظ ہوجائے گی۔ بایں ہمہ میں اس سے متفق ہوں کہ اس مسئلہ کو بازیچۂ اطفال نہ بنایا جائے۔ اگر مسئلہ تقدیر پر بحث سے عوام کو روکا گیا ہے تو اس مسئلہ پر بحث کی خواص کو بھی اجازت نہ ہو۔ اس کے لئے اخص الخواص کی ضرورت ہے۔''

پروفیسر صاحب نے پانچویں قباحت یہ بیان فرمائی ہے:

''بلکہ لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ خود سید الموحدین علیہ السلام اور آپ کے آل و اصحاب اس خاص قسم کے عقیدے سے بے خبر تھے کیونکہ آپ کے اقوال و افعال میں اس کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔''

اس پر حضرت نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ:

''اس سلسلہ کا نمبر پانچ بہت تکلیف دہ ہے، اس قدر کہ اس پر تنقید نہ کروں گا۔''

چھٹی قباحت پروفیسر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

''اس طور سے مذہب میں تاویلات کا دروازہ کھل گیا، ظاہر ہے کہ صارف قطعی کے بغیر نصوص ظواہر میں تاویل کرنا جائز نہیں، ورنہ شرع سے امان اٹھ جائے گا۔''

حضرت فرماتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ صارف قطعی کے بغیر نصوص ظواہر میں تاویل جائز نہیں، مگر ذرا اس 'قطعیت' کی بھی تعریف کردی جائے، کہیں وہ عقل متکلمانہ یا اقتضا حواس ظواہر مدرکہ تو نہیں ہے؟ جب حقیقت واقعہ قلب عارف پر منکشف ہوجائے تو اس کی قطعیت کیسے ٹالی جائے؟''

ساتویں قباحت یہ لازم آئی کہ:

''نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام جو ملت سمحاء اور طریقۂ بیضاء کا مصداق ہے، فلسفیانہ موشگافیوں کا مجموعہ بن گیا۔''

اس پر حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ جاہل صوفیوں (اور پڑھے لکھے متکلمین) کی وجہ سے ملت بیضاء فلسفیانہ موشگافیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ **وکان امر اللہ قدرا مقدورا**''

اس کے بعد پروفیسر صاحب کی بیان کردہ باقی قباحتوں پر حضرت نے کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کی بیان کردہ قباحتیں پچھلی قباحتوں پر ہی متفرع ہیں، جب اصل پر ہی کلام کردیا گیا تو اب فرع پر کلام کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

حضرت صرف اتنا فرماتے ہیں:

''اب لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں، ہاتھ میں درد ہے، آنکھوں میں

سرخی، اس لئے اس نا تمام خط کو نا تمام ہی چھوڑتا ہوں۔

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے"

خط ختم کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب کی بیان کردہ سولہویں اور آخری قباحت پر بڑے دل نشیں پیرائے میں نقد فرماتے ہیں: پروفیسر صاحب نے سولہویں قباحت یہ بیان کی تھی کہ:

"غلو فی الدین اور تجاوز عن الحد نے ہماری قوم میں سینکڑوں بدعات پیدا کردیں، عبادت کے نئے نئے طریقے، مجاہدے کی نئی نئی صورتیں اور قبور و مزارات پر طرح طرح کی بے اعتدالیاں ایسی نہیں جن کی مضرت اہل فہم پر مخفی ہو۔"

حضرت فرماتے ہیں:

"ختم سے پہلے یہ لکھ دوں کہ تجاوز عن الحد کی صورتوں میں قبور و مزارات کی بے اعتدالیوں کا ذکر بھی آ گیا ہے، جو صحیح بھی ہو تو تصویر کا ایک رخ ہے، آئندہ اشاعت میں یا تو اس کو حذف کر دیجئے یا پھر فیوض و برکات کا جملہ معترضہ بھی لکھ دیجئے۔"

مقالہ کے آخر میں پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے تصوف کے سلسلہ میں اپنی صفائی بھی دی ہے، جس کو نقل نہ کرنا علمی امانت داری کے خلاف ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں:

"اوپر کے بیانات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم خدانخواستہ سرے سے صوفیہ کے منکر اور تصوف کے مخالف ہیں۔ ہمارے نزدیک ہر چیز کے جانچنے اور پرکھنے کا معیار کلام اللہ اور سنت رسول ہونا چاہئے، جو چیز اس کے مطابق ہو اخذ کر لی جائے جو مخالف ہو ترک کر دی جائے۔ درحقیقت جو سچے صوفیہ کرام گزرے ہیں وہ مقتدائے ملت اور پیشوائے امت تھے اور ان کا تصوف مغز اسلام اور روح ایمان تھا۔ اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی چیز بھی مروی ہے جو ظاہر شریعت کے مخالف ہے تو بر تقدیر صحت روایت ظنوا المؤمنین خیراً کے بموجب اس کی مناسب تاویل ضروری ہے۔ البتہ اصل معیار وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ امام مالک نے کیا خوب فرمایا کہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص سے اس کے قول کا مؤاخذہ کیا جائے گا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ تصوف، شریعت، طریقت، کلام ہر چیز کو رسول معصوم کے ارشاد کی کسوٹی پر پرکھیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و سر طرۂ یارے گیرند

حضرت عاشق الرسول خط کے اختتام پر فرماتے ہیں:

"یہ طویل خط قال اقول کے لئے نہیں لکھا، نہ اس وقت میرے پاس کتب کا ذخیرہ ہے جو ہر بات پر تفصیل سے کچھ لکھتا۔ بہت سے امور تو لکھے ہی نہیں بعض لکھے تو اجمال کے ساتھ۔ مقصد صرف یہ ہے کہ میرا عقیدہ آپ کو معلوم ہو جائے میں دعا بھی کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ آپ کے قلب پر منکشف ہو جائے۔ آپ کو شاید علم ہے کہ علوم عربیہ میں مجھے طبیعات سے ذوق تھا، اس کے لئے ٹونک اور رامپور کے سفر کئے، ظاہر ہے کہ طبیعات کا طالب علم مسئلہ وحدت کو کیا مانتا، میں شدت سے مخالف تھا، بزم عرس میں بھائی ولی الدین مرحوم نے وحدت کے اشعار پڑھے تو میں بگڑ گیا، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تک بات پہنچی۔ حضرت کی عادت کریمانہ سے سب واقف تھے، حضرت کسی سے کچھ نہیں فرماتے تھے، عادتاً نہ مجھ سے کچھ فرمایا نہ بھائی ولی الدین سے مگر اسی روز مجھے درود غوثیہ کی اجازت دے دی۔ صبح ہونے سے قبل میں اس مسئلہ کا اسی یقین سے قائل تھا جس شدت سے مخالف 'ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء' اگر طرز تخاطب میں کچھ سخن ہو تو معاف فرمائیں۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وماتوفیقی الا باللہ۔ فقیر محمد عبد القدیر قادری۔"

مضمون کے اختتام پر ایک اہم بات کی طرف اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو اگرچہ موضوع سے زیادہ متعلق تو نہیں ہے مگر بے محل بھی نہیں کہی جا سکتی۔ وہ یہ کہ حضرت عاشق الرسول کے شیخ طریقت قدوۃ السالکین حضرت مولانا شاہ عبد المقتدر مطیع الرسول قادری بدایونی کی بہت سی کرامات اور خوارق عادت کا تذکرہ ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے، مگر میرے خیال میں حضرت عاشق الرسول کا بیان کردہ مذکورہ واقعہ بھی ان کے شیخ کی کرامت میں شمار ہونا چاہیے۔ کیونکہ "طبیعات قدیم کے طالب علم" اور "وحدت الوجود کے شدید مخالف" کو صرف ایک رات میں ادنیٰ توجہ سے وحدۃ الوجود کا اسی شدت سے قائل و حامی بنا دینا کسی کرامت سے کم نہیں۔ ورنہ برسہا برس کے مجاہدوں کے بعد لوگ اس مقام تک پہنچتے ہیں۔

❁❁❁

شیخ العالم نورالدین ریشی کا تصورِ دین

پروفیسر محمد اسحاق خان ...... چیئر مین شیخ العالم چیئر کشمیر یونیورسٹی

وادیٔ کشمیر کے بلند پایہ ولی اللہ حضرت شیخ نور الدین سلسلہ ریشیان کے بانی ہیں۔ آپ ناخواندہ تھے، مگر اس ظاہری حقیقت کے باوجود آپ نے کشمیر میں ایسی روحانی اور سماجی تحریک کو جنم دیا جس کی گہری چھاپ وادی کے طول وعرض میں آج بھی دکھائی دیتی ہے۔ نور الدین کی مقبولیت کا راز ان کے نفس کشی یا کرامات میں مضمر نہیں تھا، بلکہ ان کے روحانی مشن میں، جس کی بنیادیں قرآن وسنت کے آفاقی پیغام میں پیوستہ تھیں۔ اپنے روحانی مشن کے فروغ کے لئے نورالدین نے شاعری کو بحیثیت ایک Tool استعمال کیا۔ تاریخی لحاظ سے نور الدین نہ صرف پہلے برگزیدہ کشمیری ولی تصور کیے جاتے ہیں، بلکہ کشمیری صوفی شاعری کے موجد بھی مانے جاتے ہیں۔

سماجی اور روحانی، دونوں طور پر علما کی بے حسی اور جمود کو زیرِ نظر رکھ کر نورالدین کے اشعار کو اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے اہم وسیلہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے وادی کشمیر کے اکثر علاقوں کا سفر کیا۔ بہت سے دیہات، ایک یا دوسری شکل میں، ان کی آمد یا مختصر قیام کی روایت اب بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ جو ان کے تبلیغی رول کی توثیق کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عام آدمی کے لئے شریعت کی سچی روح یعنی فرمانبرداری، خدا پر انحصار، اطاعت، غور و فکر، توبہ، جدو جہد، قربانی، ایثار اور اپنے ہم جنسوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل، صوفی مبلغین کی عالمانہ تصانیف سے زیادہ نورالدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقبول عام اشعار کے ذریعہ سمجھنا زیادہ آسان تھا۔ لگتا ہے کہ نورالدین علیہ الرحمہ اور ان کے سلسلہ کے متعدد مریدوں کے فقر اور انکسار اور خاص کر ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی، جو علما کے خالی علم یہاں تک کہ اہل علم صوفیا سے بھی کہیں زیادہ اہم تھی۔ نور الدین کا مشن بنیادی طور پر ناخواندہ عوام کو جو زیادہ تر زراعت پیشہ تھے، اسلام سمجھانا تھا۔ نتیجہ کے طور پر کشمیر کے دیہاتی معاشرہ نے جو پہلے ہی اسلامی تہذیب کے دائرہ میں آگیا تھا، اپنے آپ کو نورالدین کی تعلیمات کے ذریعہ اسلام کی اعلیٰ ثقافت کے ساتھ جوڑ دیا۔

ایک مرشد کی حیثیت سے نورالدین کی حکمت، ان کا جذباتی توازن اور ان کے اشعار میں موجود حساسیت کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ اپنے اکثر اشعار میں وہ 'عالم' اور 'معلوم' کے درمیان حقیقی فرق پر زور دیتے ہیں۔ یہ کہ وہ ہر چیز کے لئے اپنا ایک مناسب حصہ مقرر کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں خدا کی طرف ان کی روح کا سفر توحید کے تجربہ پر معراج کو پہنچتا ہے:

"میں نے کلمہ کو اپنایا
اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں
اور اس آگ میں اپنے آپ کو جلا ڈالا جو آگ، یہ کلمہ پیدا کرتا ہے، وجودی اتحاد کے فریب کو محسوس کرتے ہوئے
میں نے ازلی وابدی ذات کو پالیا۔ اس لئے میں مکان (کی حدود) سے ماورا ہوگیا۔"

شیخ یقیناً اسلام پر ایمان لانے کے لئے محض کلمہ پڑھنے پر ہی مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل طاقت توحید اور اس کی شرائط کے شعوری طور پر قبول کرنے اور عملی زندگی میں اس کے ساتھ مکمل موافقت میں مضمر ہے!

"کلمہ کے معنی تمام علم کا منبع ہیں!
اعمال صالحہ اس کی روح کے مطابق ضبط نفس سے پھوٹ پڑتے ہیں، لامکان کا منبع، صرف
اس (اللہ) کو معلوم ہے۔
اس کی لامحدودیت کی کوئی حد نہیں"

توحید کے اصل معنی اس وقت عیاں ہوتے ہیں جب ایک انسان مکمل طور پر محسوس کرتا ہے کہ ساری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ذات

لائق عبادت نہیں۔ وہ بامقصد زندگی کے لئے اللہ کی ذات کی وحدانیت پر پُرخلوص ایمان کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ شیخ عوام میں اسلام کی اشاعت کے لئے بار بار'پُن' اور'پاپ' کے تصور کو کام میں لاتے ہیں:

''اور جب مالک دوزخ کی آگ بھڑکائے گا،
اس دن تمہارے نیک کام (پُن) تولے جائیں گے۔
جیسے تم کلمہ کے معنی سمجھو گے
ویسے ہی تم یہاں اور آخرت میں نجات حاصل کرو گے''

شیخ نے یہ بات عوام کے ذہن نشین کرائی کہ جتنا وہ کلمہ کے گہرے معنی کے بارے میں جان لیں گے، اتنا ہی وہ بہت سے معبودوں کی عبادت کرنے کے گناہ سے آگاہ ہو جائیں گے۔ اسی پس منظر میں اسلامی ثقافت (Acculturation) کے عمل سے گزر رہے اپنے ہم وطنوں کے مظاہر پرستانہ (Animistic) عقائد پر نکتہ چینی کرتے ہوئے شیخ نے کہا:

''اے پنڈت میرے بھائی! اے پنڈ تو!
کب تک تم پتھروں اور چشموں کی عبادت کے ساتھ بندھے رہو گے تمہاری بے سوچی سمجھی تلاش کوئی پھل نہیں لائی
اپنے آپ کو اللہ اور اس کے پیغمبر کے تابع کردو، کیا تم روحانی اور دنیاوی کامرانی کے خواہاں نہیں ہو''

کلمہ کا ورد کرنا، آنحضور کی ختم نبوت پر مضبوط ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔ شیخ کی نظر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کسی خاص قوم، ملک یا وقت کے ساتھ محدود نہیں بلکہ آپ کا پیغام آفاقی ہے اور آپ نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے اپنے پیش رو انبیا کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

اپنے اکثر اشعار میں وہ اس قدیم دلیل کا احترام کرتے ہیں کہ آفاقی نوعیت کے دنیاوی (Mundane) معاملات پر مشفقانہ (Humane) رویے کے سبب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے رحمت ہیں۔ اس لئے ان کی رائے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی پیروی ہی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا آسان طریقہ ہے۔

قرآن کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ صرف لکھی ہوئی کتاب تھی بلکہ وہ صاحب حکمت بھی تھے، جس کے ذریعہ روز مرہ کی زندگی کے واقعات اور تفصیلات پر حتمی اصولوں کا انطباق کیا جاسکتا ہے۔ نتیجے کے طور پر پیغمبر برحق کے اقوال (احادیث) اور اعمال (سنت) سے جو وحی الہٰی کے بالکل موافق ہیں، شریعت کی تشکیل ہوتی ہے۔ رسمی قوانین کے بجائے شریعت خالق اور اس کی مخلوقات کے ساتھ انسان کی ذمہ داریوں کے ہم معنی ہے، اس لئے نورالدین نے لوگوں سے ان حدود کے اندر کام کرنے کی تلقین کی جنہیں انہوں نے 'شریعت محمدؐ' کا نام دیا۔

''جو نیک کام کرتا ہے وہ بہت کم تھک جائے گا
جو ہر قدم پر مذہبی احکام بجالاتا ہے
اپنی دولت و جائیداد کے باوجود فروتن ہی رہتا ہے
اور زندگی کے دوڑ میں بہت آہستہ خرام ہوتا ہے''

ناخواندہ عوام کو شریعت پر مبنی سماجی رشتہ کو سمجھانے کی کوشش میں نورالدین نے اسلام کی ابتدائی کامیابی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چار نامور صحابہ کے لامحدود ایمان اور دلیرانہ جذبہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ نہ صرف زندہ مذہب کے اعلیٰ ترین نمونے تھے، بلکہ ان کے اشعار میں وہ سچے اور فعال شخصیات کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے انسانی اوصاف کے لئے نورالدین کی مدح حاصل کرتا ہے۔ ابوبکر کی پیاری فطرت اور دوستی کے لئے تعریف کی جاتی ہے۔ عمر کی اس لئے مدح کی جاتی ہے کہ انہوں نے تالیف (؟) قرآن کر کے لوگوں کو صحیح اور غلط کے درمیان فرق کے قابل بنایا۔ عثمان کی اس لئے ستائش کی جاتی ہے کہ انہوں نے نفس کی چالوں کو مغلوب کرنے کے لئے حوصلہ مند جذبے سے کام لیا اور علی کی سخاوت اور فاقہ مستوں کو اپنا مہمان بنانے کے جذبہ پر توصیف کی جاتی ہے۔

اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شیخ بار بار لوگوں کو خلفائے راشدین کے اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک جگہ وہ خلفائے راشدین کے ساتھ پل صراط عبور کرنے کی تمنا بھی کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ ان کی توصیف یوں کی جاتی ہے:

''چار ساتھیوں کو سلام ہو/ جو آپ کے سامنے جھک گئے/ وہ چار عالموں کے ستون ہیں/ مجھے احسان مندی کے ساتھ یاد ہے کہ آپ

کتنے مہربان ہیں۔''

نورالدین کا مشن وحی الٰہی کے روحانی اور سماجی دونوں معانی کو سمولیتا تھا۔ اہم سلاسل کے صوفیا کی طرح وہ توحید، شریعت اور حقیقت میں توازن برقرار رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے معاصرین اور اپنے بعد آنے والی نسلوں......دونوں میں ایک صوفی اور ایک سماجی شخصیت کی حیثیت سے ممتاز بنا دیا۔ بلا شبہ ان کا رول اپنے روحانی استغراق کے علاوہ سماج کے ساتھ ان کے لگاؤ کی وجہ سے اکثر صوفیا سے ممتاز تھا۔ اصل میں انسان کے سماجی رول کے بارے میں ان کا سارا تصور شریعت پر مبنی تھا۔ ان کے نزدیک شریعت عالم انسانیت کو منظم کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی ہے اور جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان کی اطاعت کی تاکید کرتی ہے۔ انسان خدا کی مخلوقات کی خدمت کر کے ہی خدا سے مل سکتا ہے۔ شریعت انسانیت کی خدمت کے لئے وجود میں آئی ہے۔ شیخ کا یہ راسخ اعتقاد ہے کہ شریعت کی سخت پیروی اور اس پر غیر متزلزل یقین ہی حقیقت کے تجربہ کی طرف اگوائی کر سکتے ہیں اور تینوں دنیا کی بنیاد اور اس کے وجود کی تشکیل کرتے ہیں، انسان کے عدم وجود (Nothingness) سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود انسان کو اللہ کے کاز (Cause) کے لئے اپنے آپ کو وقف کر کے عدم ہستی (Non being) کے عنصر کو نکال دینے پر زور دیتے ہیں۔ لہٰذا صفات الٰہیہ کے ساتھ اتحاد اسلامی بصیرت کے خطوط پر ممکن ہے:

''تم عرش پر اپنے اعمال صالحہ سے پہنچ جاؤ گے اس
طرح قادر مطلق کا فضل آپ کو آغوش میں لے گا''

شیخ کے لاتعداد اشعار کی جانچ کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ اللہ کی احدیت کے سب سے بڑے کشمیری ترجمان تھے۔ وہ جب بھی توحید کے بارے میں بات کرتے ہیں ان کے حوالہ کا سانچہ قرآن ہے۔ اس بنیادی سوال کے متعلق قیاسات کی بے کاری کا احساس کرتے ہوئے وہ بار بار نماز پنج گانہ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا لازمی عمل ہے جس کے ذریعہ حقیقت کا آرزو مند اپنی خواہش کو اللہ کی مرضی کے ساتھ مکمل مطابقت میں تبدیل ہوتے ہوئے پاتا ہے۔ جتنا زیادہ انسان اللہ پر تفکر کرتا ہے، اتنا ہی وہ آقا سے اطاعت شعاری کی صفات کے بارے میں جاننے کے اہل ہو جاتا ہے اور اتنا تنہائی کے لمحات میں اللہ کے سمندر میں کھو جانے کے بجائے ایک طالب اس کے ساتھ اپنے تعلقات کی صحیح ماہیت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ صوفیانہ وجد (Ecstasy) کے لمحات کے دوران بھی شیخ نور الدین رحمۃ اللہ علیہ نمازوں میں پڑھے جانے والے الحمد شریف اور التحیات کے روحانی اور سماجی، دونوں معنی پر زور دیتے ہیں۔ ان کی نظروں میں ایسا طالب اللہ کی مرضی کے مطابق دنیا کو سدھارنے کے لئے نقشبندی صوفیا کی طرح ایک بدلے ہوئے انسان کی حیثیت سے دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے:

''وہ منزل مقصود پالے گا
جس نے حفظ کیا ہے
الحمد، قل ھواللہ اور التحیات
اے میری روح! اپنے جوہر کو پہچان''

اس بات کی وافر شہادت موجود ہے کہ نور الدین رحمۃ اللہ علیہ کا دل موحدانہ انسان دوستی اور آفاقیت کے نظریہ سے دھڑکتا ہے۔ اس کی توضیح نہ صرف اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ ان کے اشعار میں قرآنی معنی نہ صرف سماجی گرد و پیش سے لی گئی تشبیہات کے پردہ میں پیش کیے گئے ہیں، بلکہ پھولوں اور پتوں، پہاڑوں اور بری منظر، پرندوں اور حیوانوں، مچھلی اور چڑیا، موسموں اور آب و ہوا، دریاؤں اور چشموں سے لی گئی تشبیہات اور استعارات میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں وہ مقصد تخلیق کو سمجھنے کے لئے مناظر فطرت کا مشاہدہ ضروری سمجھتے ہیں، گو فطرت مادہ سے بنی ہے مگر یہ انسان یا خدا کے لئے نہ بری ہے اور نہ مخالف، ایک طرح سے ان کے نزدیک فطری اور مادی اشیا خدا کی تخلیقات ہیں۔ مگر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ان کے نزدیک فطرت غور و فکر کرنے کے لائق ہے نہ کہ عبادت کے لائق۔ اس نقطہ نگاہ کی بنیاد قرآن میں موجود ہے جو انسانوں سے تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے حواس کا پوری

طرح استعمال کریں اور فطرت میں پنہاں توانائیوں کو
اپنے فائدے کے لئے استعمال میں لائیں۔ مناظر
فطرت کے مشاہدہ سے خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کریں،
کیونکہ مناظر فطرت اللہ کی نشانیاں یا 'عجوبے' ہیں۔

اس لئے نورالدین کے نزدیک دنیا کی ہر تفصیل معنی سے بھرپور ہے۔ انہوں نے دنیا کو ایک متن اور علامتوں کے ایک نظام کی حیثیت سے دیکھا جو ہر انسان پر کھلتا رہتا ہے۔ اس کتاب کی تفسیر بجائے خود ایک طریقۂ عبادت ہے مگر ان کے نزدیک حقیقت کی ماہیت مابعد الطبعیات اور علم کائنات (Metaphysic and Cosmology) پر عمیق تفکر بھی قرآنی وعظ ونصیحت تک رسائی کا ایک خاص طریقہ ہے اور خاص طور پر اس میں اتصال (Unity) کی 'لذت' ہے۔ اس قسم کے علم نے انہیں ماورائے ادراک (Transcendent) ہستی تک رسائی کے قابل بنایا جو عقل کی حدود سے بالاتر ہے۔ کائنات اور فرد کے درمیان ذاتی اتحاد اور ہم آہنگی کے قرآنی تصور کے عین مطابق وہ قرآنی آیات کی واضح تشریح اور زندگی میں یا وسیع تر معنی میں اخلاقیات میں ان کی اہمیت بتا دینے کے اہل بن گئے۔ چنانچہ اپنے مریدوں کو سورۂ اخلاص کے معنی سمجھنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کی تلقین کرتے ہوئے انہوں نے اصل میں قرآن کی روح کے مطابق اپنی ذاتی زندگی کو ڈھالنے کی ہدایت کی۔ ان کی پیش کردہ مذہبی اخلاقیات کی زبان میں اخلاص کے معنی محض یہ نہیں ہیں کہ ایک مسلمان ہر نماز میں اس کی تلاوت کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے، بلکہ اس کا مقصد اللہ کی مخلوقات کو سہارا دینے کے نصب العین کو دوسرے تمام خیالات پر اولیت دینے کی مسلسل کوشش کرنا ہے۔ اخلاص قول وفعل میں بے نفسی کا تقاضا کرتا ہے، اس دنیا یا دوسری دنیا میں خدائی معاوضہ حاصل کرنے کا خیال ذہن سے نکال دینا اخلاص کی معراج ہے۔

نورالدین کی تعلیمات کی جڑیں بلاشبہ انسان دوستی اور باہمی محبت کی قرآنی اخلاقیات میں پیوست ہیں۔ عدم تشدد کی جس اخلاقیات کی وہ وکالت کر رہے ہیں وہ مستعدانہ (Activistic) اور مثبت نوعیت کی ہے۔ اس کا مقصد مصیبت کی گھڑی میں بنی نوع انسان کی مثبت نوعیت کی خدمت بجا لانا ہے۔ ہندو سنیاسیوں کے برعکس انہوں نے عدم تشدد کا اصول زاہدانہ نفی ذات (Self-denial) کے ساتھ نہیں جوڑ دیا۔ چونکہ وہ قرآن کی محبوب صفت اعتدال (Moderation) سے متاثر تھے، اس لئے انہوں نے اپنے زہد کو اس انتہا تک نہیں لیا جیسا کہ ہم جین دھرم، بدھ دھرم اور ہندومت میں پاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جانوروں کو ایذا نہ دینے کی تاکید کرنے میں ان کے خیالات ہندو اور بودھ زاہدانہ فلسفے (Ascetic philosophy) سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں، مگر اس بات کا ذکر کرنا برمحل ہوگا کہ اگرچہ قرآن میں آفاقی محبت (Universal Love) کے خلق کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ حکم تمام جانداروں کو نہ مارنے یا مجروح نہ کرنے کے اخلاق میں پروان نہ چڑھ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کا رخ سیاسی اور سماجیاتی، دونوں سطحوں پر زیادہ تر فطرت کی غیر کائناتی محبت (Non cosmic love) اور مرکوز بالبشر (Anthropocentric) اخلاقیات کی طرف رہا۔ تاہم نورالدین کی رائے میں فطرت کی کائناتی محبت ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جو قرآنی آفاقیت کی اخلاقیات کے سمجھنے کے لئے فیصلہ کن ہے۔

بظاہر نورالدین کے نزدیک محبت، صرف خدا کے ساتھ صوفیانہ اتحاد (Mystical Union) کا نام نہیں، بلکہ یہ تمام جاندار مخلوقات کے ساتھ عملی اور ہمدردانہ رویہ کا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بھی عقیدۂ برگزیدگی (Ethnocentrism) کی کسی نہ کسی شکل سے مستثنیٰ نہیں تھے، مگر اسلام کا ایک مذہب محبت ہونے کے طور پر قرآنی تاکید کو زیر نظر رکھ کر ان کی تخصیص پسندی کا نظریہ (Particularism) کسی تفریق پسندی یا فرقہ پرستی کی اجازت نہیں دیتا۔ خدائی سلطنت کی تمام مخلوقات کے درمیان مساوات پر ان کا ایمان اصل میں قرآن میں موجود قرآنی اخلاقیات کو واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔ قرآن کے سیاق میں غریب اور ضرورت مند کی مدد کرنے، ہر ایک پر رحم اور مہربانی کرنے کی تلقین اور لہو ولعب، غرور (اہنکار) اور غصہ (کرودھ) کی ان کی مذمت کو زیر نظر رکھ کر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ نورالدین کی فکر میں عدم تشدد کا جو نظام اقدار (Value System) موجود ہے، وہ نہ صرف ترس کھانے کی قرآنی ہدایت پر ان کی عمل آوری کو دکھاتا ہے بلکہ یہ عدم

تشدد کی روایات میں ریشیوں کے تمول (Richness) اور ان پر ان کی مثبت پابندی (Commitment) بھی دکھاتا ہے۔ نورالدین نے وہ تمام اوصاف تفصیلاً بیان کیے ہیں جو اللہ کے ایک سچے معتقد کے لئے متعین کیے گئے ہیں۔ جن میں اہم ترین صفت اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نیکی اور محبت کا برتاؤ کرنا ہے۔

ان کے نزدیک عفو و درگزر، مہربانی، برداشت، رحم، سخاوت، رافت، صبر، انکساری اوسب سے بڑھ کر دیانت داری سے حلال کی روٹی روزی کمانے کی سنجیدہ تمنا ایک مسلمان کے لئے مہر تصدیق ثبت کرنے والی صفات ہیں۔ وہ غصہ، حسد، تعصب اور انتقام گیری جیسے انسانی برتاؤ کے منفی طریقوں کی مذمت کرتے ہیں اگر چہ انصاف کی مکافاتی شکل (Retribution form) کی قرآن میں اجازت دی گئی ہے، مگر نورالدین اس کی وکالت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ وسیع قرآنی سیاق پر زور دیتے ہیں، جو مسلمان کو حق قصاص سے دست بردار ہونے کی تلقین کرتا ہے کیونکہ ایسا کرکے انسان اور خدا، دونوں کی نظروں میں اس کا مقام بلند ہوگا۔ یہ کہ وہ قرآن کے اخلاقی نظام میں بالاتری کی جگہ، رحم اور مہربانی کو دیتے ہیں، ایک ایسی حقیقت ہے جو محتاج بیان نہیں۔

ہم دیکھیں گے کہ ذاتی منفعت کے لئے اپنے ہم جنسوں پر ظلم و جبر اور تشدد کرنا نورالدین ناپسند کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ سماجی نظام میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج (Gap) کو وہ خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں، مگر یہ کہنا زیادتی نہیں ہوگی کہ نورالدین کی فکر میں مستحکم سماجی نظام کے لئے انصاف کا تصور ایک لازمی شرط ہے۔ ان کے نزدیک ذاتی سطح پر مہربانی عدم تشدد ہی کی ایک شکل ہے اور سماجی سطح پر انصاف اسی عدم تشدد کا اظہار ہے۔ لہٰذا ہندو روایت کی زاہدانہ اقدار کے برعکس نورالدین نے عدم تشدد کے تصور کو ایک انسان دوستانہ اور حیات بخش مواد فراہم کیا۔ ان کی ایک طویل نظم جس میں وہ ایک سچے مسلم کے اوصاف کی ستائش کرتے ہیں، عوام تک اپنی زبان میں اسلام پہنچانے کی ان کی مخلصانہ آرزو کی عکاسی کرتی ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کہ نورالدین نے ناخواندہ عوام میں ایک وسیلہ بننے کی صلاحیت کا کس طرح مظاہرہ کیا، ان کی نظم کے چند بند نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

''جو اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں سے کوتاہی نہیں برتتا
جو اپنے خون پسینہ کی کمائی پر زندہ رہنا چاہتا ہے
جو اپنے دماغ کے حیوانی غصہ کو قابو میں رکھتا ہے
جو اشتعال کے وقت تحمل دکھاتا ہے،
وہی ایک سچا مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہے
وہ جنتیوں میں سے ہوگا
جو بھوکوں میں اپنا کھانا بانٹتا ہے
جو بھوک مٹانے کے خیال سے مغلوب ہے
جو پورے خلوص اور انکسار کے ساتھ (نمازوں میں) سربسجود ہوتا ہے۔ جو غصہ، لالچ، دھوکہ، مکر اور خود فریبی سے نفرت کرتا ہے، وہی ایک سچا مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ جو دوسروں کے سامنے حسین انداز میں حقیقت کو واضح کرتا ہے۔
''جو اپنے باطن سے حقیقت کی تصدیق کرتا ہے
جو دوسرے کی جائیداد پر نہیں للچاتا
جس کی روح دولت دیکھتے ہی بے قابو نہیں ہو جاتی
جو شریعت کے مطابق راہ راست پر ثابت قدم رہتا ہے
وہ ایک سچا مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہے
جو تجربہ سے سیکھنے کے لئے گردوپیش میں سفر کرتا رہتا ہے
حقیقت کی تلاش میں زندگی وقف کرتا ہے
صبر (کے اوصاف) سیکھنے کے لئے پیٹ کستا ہے
اپنی انا کو ترک کر دیتا ہے
تنہائی میں اللہ کی ذات میں مستغرق رہتا ہے
وہی ایک سچا مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہے''

اب ہم ان سماجی اور اقتصادی اداروں کی طرف توجہ کریں گے جن کا قرآنی احکامات کے پس منظر میں نورالدین نے جائزہ لیا ہے۔ پجاریت کا ادارہ (Institution of Priesthood) نورالدین کے لئے سب سے زیادہ تشویش کا باعث تھا۔ اس ادارہ نے خاص طور پر برہمن پروہتوں اور عام لوگوں کے درمیان زیادہ تر ذات کی بنیاد پر خلیج پیدا کی۔ ذات پات کے نظریہ نے انسانی برابری کی جڑیں کاٹ

کے رکھ دیں اور مختلف قسم کے مظالم اور جبر کے لئے یہ نظریہ ذمہ دار تھا۔ مگر نورالدین نے اس نظریہ پر غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور اپنے بہت سے اشعار میں انسانی عظمت (Dignity) کے قرآنی تصور کی تشریح کر کے ہر ایک کے لئے روحانی ترقی کے دروازے وا کر دیے۔ انسان کے شجرۂ نسب (Pedigree) کی تعظیم نہیں کی جانی چاہیے کیونکہ یہ ایک ایسا غرور پیدا کرتا ہے، جو ایک سچے بندۂ خدا کے شایان شان نہیں۔ عالی نسبی دل و دماغ کی نجابت (Nobilty) کی ضامن نہیں۔ اس کے برعکس یہ ایک پاجی یہاں تک کہ بے وقوفوں تک کو مہمیز لگاتی ہے کہ وہ اپنے حسن سیرت کے بجائے اپنے آبا و اجداد کے اوصاف و کمالات کے بل پہ عزت کی تمنا کریں۔ ایک ذات زدہ (Cast-ridden) سماج میں عظمت آدم کے تصور کے ارتقا میں نور الدین کی خدمات کو ان قرآنی آیات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ تمام انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں۔

عام آدمی کے ساتھ برہمن کے توہین آمیز سلوک نے نورالدین کی حساس روح کو تڑپا دیا ہوگا۔ ان کے غرور کی درندگی کو سدھارنے کے لئے انہوں نے موحدانہ انسان دوستی اور آفاقیت سے برہمن کی نسلی پاکیزگی کے تصور کو للکارا۔ نورالدین کے نزدیک ایک مسلمان کے عملی اخلاق برہمن کی غیر اخلاقی انانیت (Egocentrism) کے مقابلے میں قابل قدر تھے:

''وہ جو غرور سے اپنی ذات کا راگ الاپتا ہے
وہ عقل ودانائی سے محروم ہے
یہاں صرف اچھائی شریف الاصل ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے
آخرت میں 'ذات' معدوم ہوگی
اگر تم اسلام کے جوہر کو (اپنے اندر) جذب کرلوگے
تب تم سے زیادہ پاک وصاف کوئی نہیں ہوگا''

مزید برآں اعمال میں عمدگی یا اعمال کے ذریعہ کامیابی جیسے الفاظ جن میں قرآن مجموعی طور پر مقصد تخلیق بیان کرتا ہے، نورالدین کے درج ذیل اشعار میں ان کی ایک طاقت ور صدائے بازگشت (Echo) سنائی دیتی ہے:

''اعلیٰ نسب لوگوں میں جوہر، شرافت پیدا کرے گا، نہ لوگوں کو متحد کرے گا۔
جنم کی نجابت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ (خبردار!) ایسا نہ ہو کہ اعلیٰ نسبی کا خیال تم کو بے وقوف بنا دے۔ نیکی کے خوگر بنو، اعلیٰ نسب ایک فریب ہے۔''

الغرض نورالدین کی دعوت اور پیغام عقل سے مخاطب تھے اور وہ لوگوں کو جنم پر اعمال کی فوقیت پر مطمئن کرنا چاہتے تھے اور ان کا پیغام کسی طرح ناخواندہ عوام کی سمجھ سے بالاتر نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کا تصورِ مرگ بھی قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے پیدا ہوا تھا۔ ان کے جن اشعار کا انسانی زندگی کے خاتمہ سے تعلق ہے، ان کو موت کے خوف کا ایک جذباتی اظہار نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ لگتا ہے کہ ان اشعار میں تشبیہ و استعارہ کا ہنرمندانہ استعمال کر کے عدم مساوات، ناانصافی اور ظلم و جبر پر طنز کے ایک مؤثر ذریعہ اور سماجی تفسیر کے طور پر کام لیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار لائق اقتباس ہیں:

''دنیا میں ذات کی نمائش کرنے سے
تم کیا (فائدہ) حاصل کروگے؟
ہڈیاں گرد وغبار میں تبدیل ہوجائیں گی
جب زمین جسم کو ڈھانپ لے گی
اس شخص کی انتہائی تحقیر ہوگی جو اپنے آپ کو فراموش کر کے دوسروں کی ہنسی اڑاتا ہے''

نورالدین کا معاصر سماج میں موجود سماجی نابرابریوں کا تذکرہ سماجی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ ذات پات کے نظام پر تنقید کے علاوہ صاحب ثروت لوگوں پر ان کی گرفت بھی قرآن کی سماجی اخلاقیات میں پیوست ہے۔ ان کے اشعار نہ صرف امیر گھرانوں میں اناج کی ذخیرہ اندوزی کی تفصیلاً تصویر کشی کرتے ہیں، بلکہ ان میں ان چھوٹے بچوں کی حالتِ زار کی بھی عکاسی کی گئی ہے، جو مستقلاً بھوک سے نڈھال ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھوک سب سے زیادہ رسوا کن حقیقت ہے۔ غربا کی غذائی ضروریات کو پورا کرنا ہی ان کی نگاہ میں اصلی تقدس ہے۔ ان کے اشعار میں طاقت وروں کے ہاتھوں زیر دستوں کے استحصال (Exploitation) اور ان کے مصائب کی شہادت ملتی ہے۔ وہ ان امرا کا حوالہ دیتے ہیں جو بڑے مکانات، لعل و

جواہر، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے مالک تھے۔ جہاں یہ لوگ اپنے گھروں میں موسیقی کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہاں ان کے دروازوں پر بعض مفلس افراد کے ساتھ بے دردانہ سلوک دیکھ کر شیخ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔

اگرچہ اس بات کے حق میں کوئی شہادت دستیاب نہیں کہ نور الدین چاہتے تھے کہ مفلس امیر لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہو جائیں۔ مفلس کی انا کی تعریف اس سماجی کشاکش (Social tension) کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے ایک صوفی تک کی زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اس سبکی اور ذلالت سے باخبر تھے جس کا سامنا لوگوں کو نامساعد حالات میں کسی بنا پر کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے ان کی مایوسی کو استقلال میں بدل دینے کی کوشش کی۔ بے شک اُس سماجی نظام میں ایک صوفی کے لئے بہترین طریقہ کار یہی تھا کہ وہ فقر کو ان کے مقابلہ میں ایک قابل احترام شے کے طور پر پیش کریں جو ایک سرمایہ دار کے لئے نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں بھی منتظر تھا۔

مگر گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ نور الدین نے مفلس اور ناخوش لوگوں کو اپنی تقدیر پر مطمئن رہنے کی تعلیم دی۔ اصل میں ان کی تمنا یہ تھی کہ وہ باعزت، صالح اور سب سے بڑھ کر روحانی طور پر انبیا کے فقر کی گہرائی میں زندگی بسر کریں:

''فقر جہنم سے بچنے کے لئے ایک ڈھال ہے
فقر پیغمبروں کی صفت ہے
فقر دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے
فقر شیریں اور میٹھا ہے
جو کوئی راہ فقر میں ثابت قدم رہے گا
اس کی دنیا اور آخرت میں عزت افزائی کی جائے گی''

خلاصہ یہ ہے کہ نور الدین شان و شوکت کی زندگی پسند نہیں کرتے تھے، اسی لئے انہوں نے اپنے پیروکاروں کو دنیوی لذتوں سے مکمل طور پر پرہیز کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے امیرانہ پس منظر رکھنے والے مریدوں کو تعلیم دی کہ فقر یا اختیاری غربت، تنگ دستی اور دکھ ایک انسان کی قوت برداشت کی اعلیٰ ترین صفات کی غمازی کرتے ہیں:

''وہ اپنے باطن کو بیدار محسوس کرے گا
جو غصہ، کینہ اور دشمنی کو کچل ڈالے گا
لوگوں میں اس کی تعظیم کی جائے گی
جو پیغمبر صاحب کی سادگی کو (اپنے اندر) جذب کرے گا''

یہ بات باعث تعجب نہیں کہ ریشیوں کے حلقے میں انسان کے سفلہ نفس (Baser Self) کے خلاف جہاد کو باطن کی ایک مسلسل تحریک سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ ایک ایسی اعلیٰ ترین جدوجہد کا نام ہے جس کا بظاہر اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اپنے جوہر کے لحاظ سے اس کا رخ آنے والی دنیا کی طرف ہے۔ نور الدین کے نزدیک حیات انسانی کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ یہ انبیا کی سچی پیروی میں ایک پُر فکر اور بامقصد زندگی گزارنے کا نام ہے۔ یہ ایک آزمائشی دور کی مشکلات کے خلاف ایک تحریک، ایک سرگرمی اور ایک جدوجہد کا نام ہے لہٰذا روحانی صفت براہ راست ایک سماجی صفت ہے اور بے شک معمولی اور پھٹا پرانا لباس پہن کر انہوں نے دنیا کے لئے تحقیر کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ضرورت مندوں کی ضروریات کے مطابق اپنے باطنی رویے کا باضابطہ اعلان کیا۔ ان کا انکسار اپنی ذات کو مٹا دینے میں نہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ کہ اس عظمت کی تائید میں موجود ہے، جو محنت کش عوام کی سخت کوشش میں مضمر ہے۔ اس لئے یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ مسلم ریشیوں کے یہاں ہاتھ کی کمائی کو دی جانے والی اہمیت بے مثال کیوں ہے؟ جب کہ ہندوستانیوں کے نزدیک یہ ممنوع تھا۔ جہاں اول الذکر کے لئے زہد مقصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے وہاں مؤخر الذکر کے لئے زہد بجائے خود ایک مقصد ہے۔

جسمانی محنت کرنے والے پیشہ وروں کی تعریف میں نور الدین کے اشعار کا مطالعہ اس برہمنی روایت کے پس منظر میں کیا جانا چاہیے جو خالص عقل سے تعلق رکھنے والے کاموں یا پیشوں کے مقابلے میں ہاتھ کی محنت کی تمام شکلوں (Forms) کو غلامی قرار دے کر نفرت کرتی ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ کشمیری دستکاروں میں محنت کی عظمت کے متعلق بنیادی اسلامی ہدایات کا فروغ انہی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ ان کے بعض اشعار میں یہ نصائح ان تشبیہات اور استعارات کے آپسی تقابل کے ذریعہ زیادہ مؤثر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں محنت کا اپنا ایک مقام ہے۔ انہوں نے اپنا پیشہ سنجیدگی

سے لینے پر اصرار کیا، انہوں نے خود اپنے کام کو جاری رکھا۔ اس لئے ان کے پیروکاروں کے لئے ان کی مثال واضح تھی، یعنی ایک مسلمان کی مناسب مالی حالت کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ایک مثبت اہمیت ہے۔ تاہم ان کے نزدیک محنت فضول عمل ہے، اگر یہ سماج میں صرف جسمانی وجود کو سہارا دینے کے لئے کی جائے۔ ذریعہ معاش اور جسمانی فلاح و بہبود کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک لحاظ سے انہوں نے ان کو انسانی کوشش کے لئے ضروری منزلیں قرار دیا ہے، کیوں کہ ان کے بغیر مقصد تخلیق پورا نہیں ہوگا۔ پھر بھی ضروری ہونے کے باوجود بھی وہ انسان کے لئے کمترین منزلیں ہیں۔ اس طرح انہوں نے انسان اور حیوان، دونوں کی جہدِ حیات کے درمیان واضح فرق کر دیا ہے۔ انسان کی امتیازی عظمت اپنی اور ساری کائنات کی بھلائی کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت میں مضمر ہے۔

یہ معنی خیز بات ہے کہ نورالدین رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ کی کمائی کی عظمت کو علم کے تقدس کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ ان کے نزدیک کسانوں کے ہاتھ کی محنت اس دنیا میں ان کے لئے خدا کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اپنے اشعار میں انہوں نے زمین اور ذہن دونوں کو سنوارنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ زمین پر کام کرنے کی روحانی اہمیت کے مخصوص سوال پر انہوں نے شہری تہذیب کی بناوٹ اور بگاڑ (Artificiality and corruption) کے مقابلے میں دیہاتی زندگی کی سادہ اور فرحت بخش خصوصیات کی تعریفیں کیں۔ اپنی ایک مقبول نظم 'گونگل نامہ' میں وہ زمین میں کام کرنے والے محنت کشوں کو اللہ کے 'منتخب' قرار دینے کے قریب آتے ہیں، کیوں کہ ان کے خیال میں محنت کشوں کی سرگرمیاں نہ صرف مستحکم سماجی نظام کے لئے ضروری ہیں بلکہ ان میں ایک صاحب فکر کے لئے بعض روحانی حقائق بھی موجود ہیں۔ کسان کے لئے ان کے وعظ و نصیحت میں بنیادی نقطہ یہ ابھر رہا ہے کہ اس کی زندگی دیانت دارانہ طرزِ زندگی کی واحد علامت ہے، جہاں پر وہ پرہیز گارانہ محنت پر خدا کی طرف سے انعام کے طور پر زمین میں بوئے ہوئے بیجوں کے پھل کاٹتا ہے۔ کسان کی معصوم زندگی کو آلودہ کرنے کے لئے گناہ مشکل سے وقت پاسکتا ہے کیونکہ امانت، خوفِ خدا، انکسار، صبر، محنت اور خود انحصاری (Self Reliance) کی صفات، جو اس کے ذہن میں محنت کی محبت اور امید کے ذریعے پروان چڑھتی ہیں، خدا کو مستقلاً اس کی نظر کے سامنے لاتی ہیں۔ اس طرح اس کے دل و دماغ کو عظیم ترین طاقت کے اعلیٰ ترین خیالات اور خدائی کرم فرمائی کے سب سے پیارے نظارے توانائی پہنچاتے رہتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ 'گونگل نامہ' میں موجود صوفیانہ اشعار کے ذریعے ہی ناخواندہ عوام نے مسلم عبادات کی مبادیات سیکھ لیں۔ درج ذیل اشعار میں کسانوں کی زندگی سے لی گئی تصویریں اس انداز سے پیش کی گئی ہیں کہ زمین جوتنے کے دوران ان کے کام کے مختلف پہلوؤں کو روحانی سرگرمیوں کی علامتوں کے طور پر رفعت دی جاتی ہے۔

''ہل جوتنا تمہارا غسل اور وضو ہے، ان کو اچھی طرح انجام دو، جُوا (Yoke) تمہارا ضمیر ہے، خاندان (گھر) اور قبیلہ کے خیالات کو ترک کرو، زمین کھودنا، تلاوتِ قرآن (کے برابر ہے) اس کی صحیح طریقہ سے تلاوت کرو، جو 'گونگل' کرے گا وہی 'گراؤ' کرے گا، یعنی (جو کام کا آغاز وقت پر کرے گا) وہی پھل پائے گا۔''

قرآن میں بہت جگہوں پر غرور اور انکساری کی مختلف قدر سنجی (Evaluation) کی گئی ہے۔ وقت مقررہ پر نماز کی ادائیگی پر نہ صرف اس کے مذہبی کردار کی بنا پر زور دیا جاتا ہے بلکہ اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کی اخلاقی قدر و اہمیت کے لحاظ سے بھی اس کی تاکید کی جاتی ہے۔ انسان کی سماجی سرگرمی اس کو اکثر اس سماج کے افراد سے متصادم کراتی ہے، جس کا وہ خود ایک حصہ ہوتا ہے۔ مشکل سے ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جس کی انا کو کسی جارحانہ عمل سے ٹھیس نہ پہنچی ہو۔ زخمی انا اکثر سماجی برتاؤ کی منفی شکلوں جیسے غصہ، انتقام، بغض و عداوت، غرور اور تصادم کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا انسان غرور، بد دماغی، تکبر اور لالچ کی عمیق ترین گہرائیوں میں غرق ہونے پہ مائل ہو جاتا ہے اور وجوہ کے علاوہ انسان میں انہی جذبات کو کچل ڈالنے کے لئے قرآن میں کم از کم پانچ دفعہ دن میں اللہ کے سامنے سجدہ ریزی کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا دیہی عوام سے خطاب کرتے ہوئے نورالدین رحمۃ اللہ علیہ نماز اور دوسرے ارکانِ اسلام کی اخلاقی اہمیت درج ذیل اشعار میں دہراتے ہیں:

''نماز میں پورے انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو جھکالو

کھیت (ذہن) سے گھاس پھوس نکال کر دور پھینک دو
روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کو اچھی طرح ادا کرو
جو 'گونگل' کرے گا وہی 'کراو' کرے گا"
یعنی (جو وقت پر کام کا آغاز کرے گا وہی پھل پائے گا)
صبر و تحمل اور قناعت کی صفات کو ذہن نشین کرانے کے لئے روزوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے نورالدین کہتے ہیں:
"اپنی انا کے بیل کو ہل کے جوے (Yoke) میں باندھ لو۔
اس کو روزوں کی بید سے مہمیز لگاؤ
تب ہی وہ ہل کو جوتنے لگے گا
جو 'گونگل' کرے گا وہی 'کراو' کرے گا"
یعنی (جو وقت پر کام کا آغاز کرے گا وہی پھل پائے گا)

یہاں یہ بات لائق توجہ ہے کہ عوام اور صوفیا کے معمولات کے درمیان نورالدین کے اشعار نے ایک رابطہ فراہم کیا۔ معنی خیز بات یہ ہے کہ انہوں نے 'مخفی چہار ضرب' اور 'حبس دم' جیسے انتہائی اہم صوفیانہ اعمال کو مقبول بنانے کے لئے مقامی استعارے اور موضوع استعمال کیے۔

"پاک آیات حفظ کرنا اور اللہ پر تفکر کرنا دانہ دار...... ہے
بے ریا عبادت مخفی چہار ضرب ہے
سنو! بہترین چیز ذہن پر قابو پانا ہے
جو 'گونگل' کرے گا وہی 'کراو' کرے گا
یعنی (جو وقت پر کام کا آغاز کرتا ہے وہی پھل پائے گا)۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نورالدین کے کہے گئے لوک اشعار یقیناً محنت کش عوام گاتے تھے اور اگر ان کی زبانی ان کی ترسیل (Transmission) نہ ہوئی ہوتی تو چرار شریف کے ریشی نامے اور شیخ کے اشعار کے دوسرے بے شمار مجموعے ممکن نہیں ہوئے ہوتے۔ 'گونگل نامہ' نے اس لئے مقبولیت حاصل کی ہوگی کیوں کہ اس نے خصوصاً دیہاتی مرد و زن کو اپنی طرف کھینچ لیا جو صدیوں سے زمین کھودنے، ہل جوتنے، بیج بونے اور فصل کاٹنے کا کام کر رہے ہیں۔ عوام کے لئے اس میں کشش نہ صرف اس وجہ سے تھی کہ اس نے کسانوں کی سرگرمیوں کی ستائش کی، بلکہ اس کے مواد میں ایسی تشبیہات موجود تھیں جو خاص طور پر ان کی حساس روحوں کے لئے با معنی تھیں۔ اس نظم کا نمایاں موضوع یہ ہے کہ موسم بہار انسان کی عادات بنانے، امیدوں اور اعتقادات کو مستحکم کرنے کا موسم ہے۔ مگر کسانوں کی طاقت اور تحفظ نہ صرف امید اور یقین پر مبنی ہے، بلکہ الوالعزمی اور توانائی پر بھی مشتمل ہے۔ موسم بہار بے شک شیخ کے لئے سرشاری کا ایک دائمی منبع ہے۔ وہ اکثر اپنے شباب کے غمناک نظارہ کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے موسم بہار کو جنگلوں اور غاروں میں ضائع کر دیا۔ موسم بہار کی ان کی تشبیہ کا مقصد اسلامی تصورات کی اخلاقی ایجابیت (Affirmativeness) سے کسانوں میں ایک جوش و ولولہ پیدا کرنا ہے۔

"اے اولادِ آدم! اپنی جہالت سے باہر نکل آؤ
جو کچھ بھی تم نے یہاں بویا ہے، اس کا پھل آخرت میں نکلے گا
وہاں تمہارے گناہ اور ثواب (اعمال صالح) تولے جائیں گے
(اس لئے) جو وقت پر اس بات کا احساس کرتا ہے وہ (یقیناً، اللہ کی راہ میں) جدو جہد کرے گا۔

غرض کہ حضرت شیخ نورالدین رحمۃ اللہ علیہ جن کی وفات 1442ء میں ہوئی، واقعی شیخ العالم اور علم دار کشمیر جیسے القاب کے مستحق ہیں، جن سے وہ آج بھی اپنی آفاقی اور روح پرور تعلیمات کی بنا پر وادیٔ کشمیر کے طول و عرض میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی روحانی اور سماجی تحریک کے مثبت اور گہرے نقوش کی عکاسی سترہویں صدی عیسوی کے ایک مشہور کشمیری صوفی حضرت بابا نصیب الدین غازی علیہ الرحمہ کے ان اشعار میں عیاں ہے۔

روشنائی شمع دین از ریشیان است
راہ نمائی رہ یقین از ریشیان است
دلنوازی مردم اہل نیاز
از صفائی باطنی دل از ریشیان است
خوش سرائی خلد این کشمیر را
گوشئہ ہر آستان ریشیان است
نور افشان چون ارم از ہر طرف
خوش رواج از دولت ایں از ریشیان است

❁❁❁

خواجہ باقی باللہ اور وحدۃ الوجود

حافظ شبیب انور علوی کاکوروی .... خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری شریف

تیموری خاندان کے سلاطین و امرا کا ابتدا سے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ سے گہرا ربط رہا۔ حضرت خواجہ ناصرالدین عبیداللہ احرار [1] (806ھ/1434ء-895ھ/1490ء) اس سلسلہ میں خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان امرا و سلاطین کی کی احراریوں کے ہمراہ روحانی رشتوں کے علاوہ شادی بیاہ سے شمالی ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ کو بڑا فروغ ہوا۔ حضرت خواجہ احرار کے بعد حضرت خواجہ ابوالموید رضی الدین عبدالباقی معروف بہ باقی باللہ اس سلسلہ کی دوسری بڑی مشہور ہستی ہیں۔ وہ 5 ذی الحجہ 971ھ/1564ء کو کابل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت عبدالسلام اویسی سمرقندی نقش بندی سے حاصل کی۔ علاوہ ازیں خواجہ عبید کابلی سے بھی اکتساب کیا۔ ان کے جد امجد نے خواجہ محمد زکریا نبیرۂ خواجہ احرار سے باطنی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ باقی باللہ نے مولانا محمد صادق حلوائی سمرقندی سے بھی اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ استاد جب کابل سے سمرقند و بخارا کی جانب عازم سفر ہوئے تو شاگرد بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ایک روز دوران درس ایک مجذوب نے انھیں مخاطب ہو کر کہا ؎

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدارا
آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(کنز الدقائق اور ہدایہ میں خدا کو نہیں دیکھا جا سکتا دل کے آئینہ کو دیکھو جس سے اچھی کوئی کتاب ہی نہیں)

عارف کی زبان سے نکلی ہوئی بات دل میں اُتر گئی، علم ظاہر سے طبیعت اُچاٹ ہوگئی اور طلب حق کی آگ دل میں بھڑک اُٹھی۔ مختلف بزرگوں سے رجوع کیا مگر کشود کار نہ ہوا پھر حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند (718ھ/1328ء-791ھ/1389ء) کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے۔ شیخ بابا ولی کبروی (1011ھ/1603ء) سے بھی استفاضہ کیا۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی روح مبارک نے بشارت دی کہ حضرت خواجہ املنکی جوان کے سلسلہ کے اس طرح باحیات بزرگ تھے کہ حضرت خواجہ املنکی (م1008ھ/1599ء) مرید و خلیفہ خواجہ محمد درویش (م985ھ/1577ء) مرید و خلیفہ خواجہ محمد زاہد (966ھ/1588ء) مرید و خلیفہ خواجہ عبیداللہ احرار (895ھ/1490ء) [2] کے پاس جاؤ، ان ہی سے تمھاری مطلب برآری ہوگی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلسلہ عالیہ نقش بندیہ میں بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت پائی۔ مرشد برحق نے وہاں سے یہ فرما کر رخصت کیا کہ ہندوستان جاؤ وہاں تمہاری ضرورت ہے۔ 1007ھ میں بہ عمر 36 سال ہندوستان واپس آئے اور تقریباً ایک سال لاہور رہے۔ اسی اثنا میں شیخ کا وصال ہوگیا۔ وہاں سے دہلی تشریف لائے اور فیروزی قلعہ کے قریب اکبر کے ایک وزیر شیخ فرید بخاری معروف بہ میر مرتضیٰ خاں کی بنا کردہ خانقاہ میں مخلوق کی رشد و ہدایت کے لئے مقیم ہوگئے۔ دہلی میں قیام کی اس 3-4 سالہ مختصر مدت میں بھی مخلوق کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے کسب فیض کیا اور جو مقبولیت و مرجعیت حاصل ہوئی وہ کم بزرگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری صاحب التحفۃ المرسلۃ (م1029ھ/1621ء) فرماتے تھے: انہ کان معدوم النظیر فی قوۃ الارشاد فانہ ارشد ثلاث سنین او اربع و فی تلک المدۃ القلیلۃ انار الآفاق بلوامع افاداتہ۔ (رشد و ہدایت میں بے مثال تھے کیونکہ انھوں نے 3 یا 4 سال کی مختصر مدّت میں اپنے افادات و افاضات سے ایک عالم منور فرما دیا)

شفقت و مکرمت، انکساری و عاجزی، اخفائے حال، ستر احوال و مقامات، تہذیب اخلاق، کم گوئی، اور ایسی عجیب غریب کیفیت والے تھے کہ جس پر نگاہ ڈالتے اس کے دل کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن میں اپنی مثال آپ تھے کئی کئی دن کچھ نوش

نہ کرتے اور جو کچھ آتا اسے دوسروں کو عطا فرما دیتے۔ جب لاہور سے دہلی آرہے تھے تو راستے میں ایک کمزور و عاجز کو پیدل دیکھا فوراً گھوڑے سے اُتر گئے اُسے گھوڑے پر سوار کرلیا اور خود پیدل ہو گئے۔ جب منزل قریب آ گئی تو اس سے اُتر جانے کو کہا کہ کسی کو اس حسن عمل کی اطلاع نہ ہو۔ آپ کے اصحاب میں سے کسی سے بھی اگر کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو فرماتے یہ ہماری غلطی ہے جو بطور انعکاس تم سے ظاہر ہوئی۔ انسان تو کیا جانوروں پر بھی آپ کی شفقت و مکرمت کا یہ حال تھا کہ شدید سردی میں ایک رات بستر سے اُٹھے جب واپس تشریف لائے دیکھا کہ لحاف میں بلّی سو رہی ہے تو اس کو جگانا یا تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا بلکہ خود بدولت نے پوری شب اُسی سردی میں الگ بیٹھے بیٹھے گزار دی۔

شیخ مجدد الف ثانی سرہندی، شیخ تاج الدین بن سلطان الدین عثمانی سنبھلی، خواجہ حسام الدین بن نظام الدین بدخشی و شیخ الہ داد دہلوی قدس سرہم وغیرہ آپ کے خلفا میں ہوئے۔ راقم الحروف کے جد امجد حضرت ملا عبدالکریم علوی کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ (م1039ھ/1631ء) نے بھی آپ سے استفادہ و استفاضہ کیا تھا۔

حضرت خواجہ قدس سرہٗ کے دو آئینۂ کمال صاحب زادے، خواجہ کلاں و خواجۂ خرد تھے۔ آپ نے 25 رجمادی الثانی روز شنبہ 1012ھ/1604ء کو تقریباً 40 سال کی عمر پا کر دہلی میں وفات پائی اور صدر بازار میں مغرب سمت عید گاہ روڈ پر مزار مبارک بنا۔

مصدر فیض خواجۂ باقی
قبلۂ دین و کعبۂ ارشاد
داشت خلوت در انجمن دائم
باخدا و ز ماسوٰی آزاد
چوں برفتہ زعالم فانی
گشت از رفتنش جہاں برباد
صد ہزاراں بہ ہر زماں ہر دم
رحمت حق بہ روحِ پاکش باد
سال وصلش عمر چناں گفتہ
جنت عدن را بگرد آباد
1012ھ

حضرت خواجہ کی جن تصانیف کا پتہ چلتا ہے ان میں:

(1) **سلسلۃ الاحرار**، رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کی شرح شیخ مجدد الف ثانی نے لکھی ہے۔ مطبوعہ ہے۔

(2) **کلیات**، ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کی ایک مثنوی بھی شامل ہے۔ زبدۃ المقامات میں اسے جزوی طور پر نقل کیا گیا ہے۔ مثنوی کا سن تصنیف 1010ھ ہے۔

تاریخ شناس تیز بیں مرد
بشگفت بہار در خط آورد
1010ھ

یہ مثنوی مولوی احمد حسین خاں قادری نقش بندی نے 1328ھ میں حیدر آباد سے طبع کرائی تھی۔ کلیات کا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں بھی محفوظ ہے۔

کلیات باقی باللہ، جس میں آپ کا کلام، مکتوبات و ملفوظات وغیرہ ہیں، 1967ء میں پاکستان سے شائع ہو چکی ہے۔

(3) **مکتوبات کا ایک مجموعہ** 1923ھ میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

(4) علاوہ ازیں تصوف میں ایک رسالہ، جس میں عرفان و عارف وغیرہ کی تعریف ہے، 1903ء میں مطبع احمدی دہلی سے طبع ہوا ہے۔

(5) رسالہ **"دراصل"** ذخیرۂ حبیب گنج مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اس میں توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت، ذکر، توجہ، صبر، مراقبہ، رضا کی ایک ایک سطر میں جامع تعریف ہے۔

توبہ: گناہوں سے باہر نکل آنا ہے چونکہ جو کچھ حجاب ہے وہ گناہ ہے تو کمال توبہ حجاب کو اکھاڑ پھینکنا ہے۔

زہد: رغبت سے نکل آنا ہے رغبت دنیاوی مال و متاع سے مفید نہیں ہے۔ کمال زہد نامرادی میں ہے کیونکہ وہ مراد سے متصل ہے۔

توکل: اللہ (مسبب) پر بھروسہ کرتے ہوئے اسباب سے باہر آ جانا ہے۔

قناعت: فضول خرچی سے باہر نکلنا، بقدر ضرورت اکتفا کرنا، کھانے پینے، پہننے اور رہنے میں اسراف سے پرہیز کرنا ہے۔ نیز کمال قناعت ہستیِ حق پر اکتفا کرنا اور صرف اس کی محبت سے آرام پانا ہے۔

عزلت: (گوشہ نشینی) اللہ کے سوا ہر ایک کو بھلا دینا اور کمال یہ ہے کہ اپنے آپ سے بھی باہر آ جانا اور ماسوا کو بھول کر صرف حق کی سمت ہو جانا ہے۔

توجہ: تمام دواعی سے باہر آنا اور ہمہ تن حق کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔

ہر کس بہ در تو حاجت می خواہد
من آمدہ ام ہمیں ترا می خواہم

(ہر کوئی تمھارے دروازہ پر کسی ضرورت سے آیا ہے مگر میں صرف تم ہی کو چاہنے آیا ہوں)

صبر: تمام نفسانی خواہشات سے باہر آنا، حق کی اُلفتوں ومحبتوں سے کوشش، رنج وتکلیف، اور شدت کے ساتھ کھڑا رہنا ہے۔

مراقبہ: اپنے اختیارات سے باہر آنا، ان کو اپنے سے الگ دیکھنا۔

رضا: اپنے نفس کی رضا سے باہر آنا اور رضائے الٰہی میں آ جانا ہے۔

(6) **رسالہ حقیقۃ الحقائق** : سر سلیمان کلکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ف 153-55 میں محفوظ ہے۔ یہ رسالہ بہت اہم ہے۔ احقر کی نظر سے اب تک اس کے کسی دوسرے نسخہ کی صراحت نہیں گزری، بہر حال اگر ہوگا بھی تو اُردو ترجمہ کی سعادت اس احقر کے حصہ میں ہی آئی۔ عم محترم ڈاکٹر مسعود انور علوی صاحب مدظلہٗ شعبہ عربی علی گڑھ نے اس کی ایک نقل یہ کہتے ہوئے عنایت کی کہ اس کا ترجمہ کر کے ایک مختصر رسالہ کی شکل دے دو تا کہ آج کل کا اُردو داں طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔

رسالہ وحدت الوجود سے متعلق ہے۔ رموز ونکات اور وحدت الوجود کی باریکیوں کا بیان ہے۔ حضرت خواجہ کی رباعیات ومثنوی سے ہی آپ کے اس نظریہ کا پتہ چلتا ہے، مگر زیرِ نظر رسالہ سے اس کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ حضرات نقش بندیہ ہمیشہ سے وحدت الشہود کے کار بند ہیں۔ وحدت الشہود، وحدت الوجود سے بالکل الگ ایک چیز ہے وغیرہ مگر اس رسالہ سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے یہاں بھی ہمیں وحدت الوجود ہی ملتا ہے۔ **لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار** (سورۂ مومن، رکوع 1، پارہ 24) (آج حکومت کس کی ہے صرف اللہ کی جو بڑا زبردست ہے۔) کے سلسلہ میں فرمایا ہے: ہو سکتا ہے کہ ملک سے مراد سالک کا دل ہو یعنی جب اللہ تعالیٰ قہر احدیت سے کسی دل پر تجلّی فرماتا ہے تو اس میں اپنے غیر وغیریت کا کوئی نشان واثر نہیں چھوڑتا پھر اس دل میں **لمن الملک الیوم** کی صدا داخل فرماتا ہے اور جب اس میں اپنے علاوہ کسی اور کو نہیں پاتا تو فرماتا ہے **للہ الواحد القھار، سبحانی ما اعظم شانی، اناالحق اور ھل فی الدارین غیری** وغیرہ کی صدا بھی اسی مقام سے ہے۔3

حضرت مجدد الف ثانی دفتر اوّل کے 31 ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

میرے مخدوم ومکرم! فقیر کا اعتقاد لڑکپن سے اہل توحید کا مشرب تھا اور فقیر کے والد بزرگوار قدس سرہٗ بظاہر اسی مشرب پر ہوئے ہیں اور باطن میں پوری پوری نگرانی حاصل ہونے کے باوجود جو مرتبہ بے کیفی کی جانب رکھتے تھے ان کا اشتغال ہمیشہ اسی طریق پر رہا اور اس مضمون کے موافق کہ فقیہ کا بیٹا آدھا فقیہ ہوتا ہے فقیر کو اس مشرب سے از روئے علم کے بہت فائدہ اور بڑی لذّت حاصل تھی یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ارشاد وہدایت کی پناہ والے حقائق ومعارف کو جاننے والے، پسندیدہ دین کی تائید کرنے والے ہمارے شیخ اور مولا وقبلہ حضرت خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ کی خدمت وصحبت نصیب کی اور انھوں نے فقیر کو طریقہ علیہ نقشبندیہ تعلیم فرمایا اور مسکین کے حال زار پر بڑی توجہ فرمائی۔ اس طریقہ علیہ کی مشق کے بعد تھوڑی مدت میں توحید وجودی منکشف ہوگئی۔ اس کشف میں حد سے بڑھ کر زیادتی پیدا ہوئی اور اس مقام کے علوم ومعارف بہت ظاہر ہوئے اور اس مرتبہ کے دقائق سے شاید ہی کوئی دقیقہ ہو جس کو اس فقیر پر منکشف نہ کر دیا گیا ہو۔ الخ 4

ترجمہ: رسالہ حقیقۃ الحقائق

بسم اللہ الرحمٰن الرحمن

الحمد للہ کہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہے اور کثرت کے آئینہ میں وحدت کا جمال ہر وقت نظر میں ہے۔ اے سیّد! (اس سے مراد صاحب رسالہ قدس سرہٗ کے کوئی مرید یا طالب ہیں) یہ رسالہ

تمھاری حقیقت کے بارے میں تمھاری ہی سمت ہے۔ اگر تم ہمت کی نظر سے اس کا مطالعہ کرو تو میں سمجھتا ہوں کہ صورت سے حقیقت کی طرف پہنچ جاؤ گے اور یہ بُعدِ موہوم درمیان سے اُٹھ جائے گا۔

اوّل تو یہ رسالہ بُعد (دوری) کے بارے میں بتاتا ہے جس کی کوئی وجہ ہوتی ہے اور دوسرے قرب سے نشان مند کرتا ہے اس کا بھی سبب ہوتا ہے۔ تمھاری حقیقت جو اس رسالہ کی زبان سے تم سے گفتگو کر رہی ہے وہ وحدت پر اطلاع دیتی ہے کہ اس مقام پر نہ تو بُعد ہے، نہ قرب۔ جب آفتاب وحدت طلوع فرماتا ہے تو بُعد و قرب عین وحدت ہو جاتے ہیں۔5

اے سیّد! ہر فرقہ ایک دوسرے سے جھگڑے میں ہے مگر اہلِ وحدت سب کے ساتھ ایک ہیں اگرچہ کوئی بھی ان کے ساتھ ایک نہیں ہے۔ وہ مختلف مذہبوں اور مشربوں کے برعکس و برخلاف ایک لطیف ولذیذ تنزل رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک خاص مذہب اور مخصوص مشرب ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے متکلم ایسا کہتا ہے، حکیم ایسا اور صوفی ایسا۔

اے سیّد! وحدتِ باطن کثرت اور کثرتِ ظاہر وحدت ہے۔ حقیقت دونوں میں ایک ہی ہے جو بصورتِ کثرت موہوم ہوتی ہے۔ تم کو وحدت سے کثرت کی طرف اور یگانگی سے دوئی کی طرف لاتے ہیں۔ اس حکمت کی وجہ سے جس کا وہ پاک ذات ہی علم رکھتی ہے۔ اس کے خاص بندے بھی اس علم کو جانتے ہیں۔ تم کو ایسا بنایا ہے کہ تم وحدت سابقہ سے بے خبر ہو۔ اس حالت میں بھی تم میں ایک اثر پیدا کیا بعد ازاں اپنے کچھ بندوں کو بے واسطہ خود سے آشنا کر کے کثرت کی طرف بھیجتے ہیں چنانچہ وہ کثرت سے وحدت کو دیکھتے ہیں۔ جس نے بھی اس راہ پر عمل کیا اور اس جماعت کی پیروی کی وہ کثرت سے وحدت میں ملا اور دوئی سے یگانگی تک جا پہنچا۔ یہ جماعت بزرگوار انبیا علیہم السلام ہیں اور راہِ شریعت وطریقت کا وصول ہے۔

اے سیّد! شریعت سے مطلب چند وہ کام ہیں جن کو فقہ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ طریقت سے مراد تہذیب اخلاق ہے یعنی برے اعمال و افعال کو اچھے افعال میں تبدیل کرنا جس کو وطن میں سفر کرنا کہتے ہیں نیز سلوک سے بھی تعبیر کرتے ہیں جو مشائخ کی کتابوں و رسالوں خصوصاً حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہے اور بعض وہ اشغال و آداب، جن کو مشائخ نے وضع کیا ہے، طریقت میں داخل ہیں۔

اے سیّد! شرعی احکام جن کا منشا دوئی ہے وہ خصوصاً وحدت سے ملانے والے ہیں ان کا بھید خدا جانتا ہے یا خاصانِ خدا۔ ایصالِ اعمال میں جو کثرت سے مربوط ہیں وحدت کی سمت اشارہ ہے اس وجہ سے سمجھ لو کہ کثرت دراصل عینِ وحدت ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اسی جیسے جو احکام موصل بہ وحدت ہیں وہی خصوصاً وحدت سے ملانے والے ہیں، کیونکہ وہ خالصۃً للہ ادا کیے جاتے ہیں جیسا اس بارے میں شرط ہے اس کے معنوں میں پورا ایک باب ہو جائے گا اور ہر ایک کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیا معنی ہیں۔

طالبِ وحدت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تصور کرے کہ میں نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے لئے نیت کرتا ہوں مثلاً اپنی حقیقت اور اس کے وجود کے لئے یعنی اس کو پانے کے لئے کہ میں نے اُسے گم کر دیا ہے اور چاہتا ہوں کہ اس عبادت کے ذریعے سے وحدت، جو عین اللہ ہے، ظہور فرمائے۔

اے سیّد! عابد بھی وہی ہے اور معبود بھی وہی۔ عابد تعبد کے مرتبے میں اور معبود اطلاق و تنزیہہ کے مرتبے ہیں۔ اس کے مراتب کا بھید امورِ عقلیہ پر ہے۔ جان لو کہ اس ایک حقیقت کے جو ہستی صرف ہے کسی چیز کا وجود ہی نہیں، جب تم اچھی طرح دیکھو تو اخلاق ذمیمہ جن کا رفع کرنا طریقت میں ضروری ہے وہ سب دوئی پر مبنی و مشعر ہیں اور اخلاق حمیدہ جن کی تحصیل لازم ہے وہ سب آشنائی و یگانگی کے مخبر و معلّم ہیں۔ تو وحدت کے طالب کے لئے شریعت و طریقت دونوں کے بغیر چارہ نہیں۔

اگرچہ اوّل الذکر میں ایک کو ایصال معلوم نہیں ہوتا لیکن آخر الذکر میں اگر غور کرے تو غالباً بشرط مناسب سمجھ جائے۔ چنانچہ ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں:

اے سیّد! یہ تمام اشغال و اذکار، مراقبات و توجہات اور طریق سلوک جن کو مشائخ نے اختیار کیا ہے انانیت موہومہ دور کرنے کے لئے ہیں۔ تو جان لو کہ وحدت (جو حق ہے) اور کثرت (جو خلق ہے)

کے درمیان سوا وہم و خیال کے کوئی چیز فاصلہ پیدا کرنے والی نہیں ہے۔ حقیقتاً وہی وحدت ہے جو کثرت کی صورت میں جلوہ گر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ذات ہے جو بہت میں نظر آتی ہے جیسے ایک کے حال کو دو دیکھتے ہیں۔ مثلاً نقطۂ جوالہ (اگر کسی مشعل کو گردش دی جائے تو وہ دائرہ کی شکل میں نظر آتی ہے اور جب گردش بند کر دی جائے تو ایک شعلہ دکھائی دیتا ہے) جو دائرہ کی صورت میں دیکھا جاتا ہے اور بارش کا گرنے والا قطرہ جو ایک لکیر کی طرح نظر آتا ہے۔ ایک بلند مرتبہ عارف نے فرمایا ہے کہ درویشی تصحیح خیالی ہے۔ (**التصوف کلہ تصحیح الخیال**) سچ یہ ہے کہ خوب ہی فرمایا ہے۔

اے سیّد! جب حجاب صرف خیال ہی ہے تو اس کے حجاب کو خیال ہی سے دُور کرنا چاہیے۔ رات دن وحدت کے خیال میں رہنا چاہیے۔ اگر سرداری چاہتے ہو تو ایک ہو جاؤ اور ایک رہو۔ ایک ہو جانا یہ ہے کہ دوئی کے وہم و خیال سے باہر آ جاؤ اور ایک رہنا یہ ہے کہ ہمیشہ وحدت میں رہو۔ تفرقۂ خاطر، غم و اندوہ سب دوئی سے ہیں جب دوئی نظر سے ہٹ جائے گی تو آرام و قرار میسر ہوگا۔ چنانچہ ابد تک کسی غم میں مبتلا نہ ہو گے اور دونوں جہان میں آسودہ رہو گے، کیونکہ آسودگی عدم میں ہے۔

جب تم توحید کی حقیقت کو پہنچو گے اور وحدت تمھاری صفت ہو جائے گی تو جان لو گے کہ حق سے تمھاری نسبت سلوک کے بعد بڑھی نہیں۔ (یعنی معیت حق تو پہلے بھی تھی **ونحن اقرب الیہ من حبل الورید**، ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں مگر ہماری کثافت کی وجہ سے ظاہر نہ تھی۔ اب جب سلوک سے وہ باطنی کثافت ختم ہو گئی تو ہمیں اپنی نسبت کا ادراک ہوا۔ ہماری نسبت پیش از وجود اور بعد از وجود ایک ہی ہے) بلکہ وہی نسبت ہے جو سلوک سے پہلے تھی بلکہ تمہاری نسبت وجود سے پہلے اور اس کے بعد ایک ہی ہے مگر تم نے عقل و سمجھ پیدا کی اور یقین حاصل کیا جو کسی آب و آتش سے زائل نہ ہوگا۔ ازل سے ابد تک حق موجود ہے اور بس۔ ہرگز کوئی دوسرا موجود نہ ہوا۔ یہ باطل خیال اعتبار نہیں رکھتا۔ مثلاً زید کو بیماری ہوئی کہ اس نے خود کو عمرو سمجھ لیا اور لوگوں سے زید کے اوصاف سن کر اس کی تلاش میں ہوا پھر جب بہت علاج کے بعد اس کی بیماری، دور ہوئی تو عمرو کہیں نہ تھا صرف زید تھا۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی صفات کی بنا پر خود کو جانتا ہے۔ یہاں غیر کہاں ہے اور غیر کب موجود تھا ؎

کجا غیر کو غیر کو نقش غیر
سوی اللہ واللہ ما فی الوجود 6

اس طرح جب تم نے حقیقت کار جان لی تو تم کو معلوم ہو گیا کہ قرب و بعد اور مسافت سب تو ہم سے ہیں دوری ہی کب تھی جو نزدیکی حاصل ہوتی، جدائی ہی کب تھی جو وصال ہوتا۔ اگر ہزار سال عالم کے بارے میں سوچو تو سوا حقیقت مطلقہ کے جو عین وحدت ہے کچھ خبر نہ پا سکو گے۔ کوئی ذات، کوئی صفت، کوئی حیثیت، کوئی جہت، کیا خارجی، کیا ذہنی اور کیا وہمی معلوم نہ ہوگی جو اس کے سوا ہو۔ ہمہ اوست و او ہمہ است (سب کچھ وہی ہے اور وہی سب کچھ ہے) ؎

اے ہمہ و باہمہ و بے ہمہ
باہمہ تنہا و بہ تنہا ہمہ

(اے سب کے ساتھ اور سب سے الگ، سب کے ساتھ تنہا اور تنہا کے ساتھ سب)۔

جو کچھ ادراک میں آتا ہے وہی ہے اور جو نہیں آتا وہ بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ جس کو وجود کہتے ہیں اسی کا ظہور ہے اور جس کو عدم کہتے ہیں اسی کا بطون ہے، اول وہی ہے آخر وہی ہے، ظاہر وہی ہے باطن وہی ہے، مطلق وہی ہے مقید وہی ہے، کلی وہی ہے جزوی وہی ہے، منزہ وہی ہے مشبہ وہی ہے۔ 7

اے سیّد! باوجود یکہ سب کچھ وہی ہے وہ اس سب کچھ سے پاک ہے۔ اس سب کچھ میں بھی وہ ایک ہی ہے۔ یہ اطلاق اس کی دوسری نسبت ہے اس کے علاوہ کہ وہ عین ہمہ ہے اس میں کوئی عقل و فہم نہیں پہنچتی ہے۔

یُحذّر کم اللہ نفسہ (اللہ تعالیٰ تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے۔ سورۃ آل عمران، آیۃ 28)۔ اسی مقام کے بارے میں ہے کہ شہود و آگاہی ظہور کے مراتب میں ہے اور کبھی مراتب سے باہر یہ شہود **کالبرق الخاطف** (کوندنے والی بجلی کی طرح) ہوگا۔ اس میں ٹھہرنا ناممکن ہے اس کا حصول اور عدم دوام جامعیت انسانیت کا مقتضی ہے جو مظہر اتم ہے۔

عارف کے لئے اس سے بلند مقام کوئی نہیں۔ اس مقام میں فنائے کلی اور انعدام صرف ہے۔ یہ کلیہ فنا کے اقسام سے ہے۔ یہ معارف اس جگہ بتقریب لکھے گئے ہیں۔ سالک کے لئے جو کچھ ضروری ہے وہ یہی خیال وحدت ہے جس کو ہم نے اوپر لکھا ہے۔ رات دن اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ کثرت موہومہ جو بعنوان غریب نظر میں آتی ہے نظر سے ساقط ہو کر وحدت کا آئینہ ہو جائے اور سالک ایک کے سوا نہ دیکھے نہ جانے اور نہ پڑھے ؎

دو مبیں و دو مداں و دو مخواں
خواجہ را در بندۂ خود محو داں

(نہ دو دیکھو، نہ جانو نہ پڑھو بلکہ آقا کو اس کے غلام میں محو جانو)

اے سیّد! ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ 'لاالــہ' یعنی یہ سب چیزیں جو ظاہر ہیں موجود نہیں ہیں ان معانی کے ساتھ جو وحدت ذات میں گم اور مستہلک ہیں۔ (مستہلک اُسے کہتے ہیں جو ذات احدیت میں مکمل طور پر فنا ہو گیا ہو) 'الا اللّٰـہ' یعنی وحدت ان چیزوں کی صورت کے ساتھ ظاہر اور نظروں میں مشہود ہے تو اشیا اس میں پوشیدہ ہیں اور وہ اشیا میں ظاہر ہے۔ وہ ظاہر اشیا بھی ہیں اور باطن اشیا بھی۔ اشیا میں سوا ظاہر و باطن کے کوئی چیز نہیں۔ تو اشیا اشیا نہ ہوں گی بلکہ حق ہوں گی۔ اشیا کا نام اشیا پر اعتبار کیا جاتا ہے جو عین حق ہے۔ مراقبہ کا طریقہ مختلف وجوہات سے (ان ہی باتوں سے) سمجھا جا سکتا ہے۔ مراقبہ وحدانیت کے معنی کے ملاحظہ کی طرف جس طرح بھی ہو سکے اشارہ ہے۔ اگر الفاظ ملاحظہ کرے اور ان کے معانی سمجھتے ہوئے خیال کرے تو اسے ذکر کہتے ہیں۔ الفاظ چاہے جو بھی ہوں خواہ لاالہ الا اللّٰہ، خواہ صرف لفظ اللّٰـہ ہو، اگر بغیر الفاظ کے تخیل کے معنی سمجھیں تو اسے مراقبہ کہیں گے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں جیسا بزرگوں کی کتابوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہی مقصود ہے کہ وحدت کے معنی دل میں بیٹھ جائیں۔ لفظ اللہ کا ذکر ایسے ہوتا ہے کہ حقیقت قلبیہ سے قلب کے تصور کے ذریعے اس جہت و طریقہ سے متوجہ ہو کر کہ حقیقت مظہری ہے لفظ اللہ کا خیال کرتے ہیں اور اسی پر اطلاق کرتے ہیں اور اگر خود سے متوجہ ہو تو اس توجہ کو درست کر کے کام بآسانی ہو سکتا ہے۔

اے سیّد! تمہارا جسم، تمہاری صورت اور روح کا مظہر ہے، اس کے سوا نہیں ہے۔ تمہاری روح صورت حق کا مظہر ہے حالانکہ اس سے الگ ہے۔ یہ دونوں صورت جسمی و روحی موہوم و خیالی ہیں۔ جب اپنے خیال میں اللہ کہو اور اس حقیقت کے ساتھ کہ یہ دونوں موہوم ظاہر ہیں تو متوجہ ہو کر یہی سمجھو کہ میں ہی ہوں۔ امید ہے کہ اس طرح کثرت میں وحدت کا شہود میسر ہوگا۔ تمھاری نگاہ میں جو جم جائے سمجھو کہ وہ ایک صورت، روح اور حقیقت رکھتا ہے۔ اس کی صورت عالم ناسوت، روح عالم ملکوت اور حقیقت جبروت و لاہوت ہے، کیونکہ اس سے مراد ذات وصفات حق ہیں یعنی اس شئی کی خاص وجہ جو حقیقت مطلقہ کی عین ہے۔

اے سیّد! جبروت 8 صفات ہے اور لاہوت 9 ذات اور صفات غیر ذات نہیں مگر حصول تجلیات ذاتیہ وصفاتیہ کے مقام میں کشف و شہود بھی غیر ہو جاتے ہیں ؎

برو اے عقل نامحرم کہ امشب باخیال او
چناں خوش خلوتے دارم کہ من ہم نیستم محرم 10

اے نامحرم عقل! دور ہو جا کہ آج کی رات میں اس کے خیال میں ایسا خوش خلوت ہوں کہ خود اپنا بھی محرم نہیں۔

اے سیّد! عالم علم حق ہے کہ تجلی ذات نے، کہ الف اس کی طرف اشارہ ہے، ظہور فرمایا۔ علم عین ذات ہے۔ حقیقت مطلقہ بے انتہا ظہورات رکھتی ہے لیکن اس کی کلیات پانچ ہیں۔ ظہور اول علم اجمالی، ظہور دوم علم تفصیلی، ظہور سوم روحانی صورتوں کا ظہور، چہارم مثالی صورتوں کا ظہور اور پنجم جسمانی صورتوں کا ظہور ہیں۔ اگر ظہور انسانی کو الگ سمجھا جائے تو ظہورات کلیہ چھ ہوں گے جن کو تنزلات خمسہ یا تنزلات ستہ یا حضرات ستہ کہتے ہیں۔ 11

انسان ان ظہورات کا جامع ہے۔ اس جامعیت کا بیان بہت سی وجوہات سے ہے تم کو جان لینا چاہیے کہ حقیقت انسانی سب مراتب میں مناسب طریقہ پر اس مرتبہ کا ظہور رکھتی ہے۔ یہ حقیقت اپنے مرتبہ میں تمام حقائق پر اگرچہ وہ ظہور پایاں میں سب سے کم ہو مقدم ہے۔ تمھارے سمجھنے کے لئے سب سے ضروری وحدت کے معنی ہیں اور ان میں ہمیشہ ڈوبے رہنا ہے۔ ان معارف کی تفصیل کے ساتھ اول امر میں پہنچنا تمہارے لئے اس وقت تک ضروری نہیں جب تک عنایت الٰہی سے وحدت کے معنی اچھی طرح ذہن نشین نہ

ہو جائیں اور دوئی کا خیال نہ اُٹھ جائے۔ پھر تم کو ایسی صفائی روح حاصل ہوگی کہ تمام علوم وحقائق ظاہر ہو جائیں گے۔ جب تک کثرت کا خیال نظر سے دور نہ ہو اور دوئی کا خیال ذہن سے نہ جائے علوم و حقائق مکشوف ہونا مشکل ہے۔

اے سیّد! کچھ روز ریاضت ومجاہدہ کرنا چاہیے اور اپنے انفاس کو اس اندیشہ میں مصروف رکھنا چاہیے تا کہ خیال باطل دل سے نکل جائے اور خیال حق دل میں جم جائے جب تک یہ خیال دل میں نہ آئے اور جم نہ جائے، ظاہر و باطن تم کو چھوڑ نہ دیں کسی طرف متوجہ نہ ہو پاؤ گے اور جب یہ خیال جم گیا اور دوئی کا تفرقہ الگ ہو گیا تو کوئی چیز رکاوٹ نہ ہوگی، کیونکہ موہوم باطل موہوم حق کا مزاحم نہیں ہوسکتا۔

اے سیّد! حق کی نسبت عالم کے ساتھ اسی طرح ہے جیسے پانی کی نسبت برف کے ساتھ، بلکہ اس سے بھی نزدیک تر سمجھنا چاہیے یا جیسے سونے کی نسبت زیورات کے ساتھ اسی کو صاف کر کے بناتے ہیں یا جیسے مٹی کی نسبت ان برتنوں کے ساتھ جو اس سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ سب ایک ہیں۔

حق اور عالم کے درمیان رابطہ کلمۂ 'مِن' بھی ہے کیونکہ عالم اسی کی ذات سے نشوونما پانے والا اور ظاہر ہے اور کلمۂ 'الیٰ' بھی ہے کیونکہ عالم اسی کی طرف راجع ہے۔ یہ صدور و رجوع ازل و ابد میں بھی ہے اور زمانے کی تمام آفات میں بھی۔ کیونکہ عالم دریا کی موج کی طرح ہر وقت ایک حقیقت کی طرف جاتا ہے اور ایک دوسری حقیقت سے نکلتا ہے اور کلمۂ 'فی' بھی، کیونکہ عالم میں حق ہے اور حق عالم میں، ایک وجہ سے وہ مظہر ہے اور ایک وجہ سے یہ مظہر ہے۔ کلمۂ 'مـــع' بھی کیونکہ معیت ذاتی، وصفاتی وفعلی بلاشبہ متحقق ہے اور کلمۂ 'ھـو' بھی کیونکہ عالم عین حق اور حق عین عالم۔ 12

نیز کلمۂ 'لیــس' بھی، کیونکہ ایک وجہ سے عالم عالم ہے اور حق حق، نہ عالم حق ہے نہ حق عالم۔

کبھی حق کو عالم سے دیکھیں منزہ
کبھی عالم و حق بہم دیکھتے ہیں

اے سیّد! ایک وجہ سے حق تمام روابط سے منزہ ہے اور عالم اور حق کے درمیان کوئی رابطہ نہیں اس اعتبار کو لاتعین کہتے ہیں۔ جو حق کو ایک وجہ سے نہ پہچانے تو دوسری وجہ سے پہچان سکے گا۔ سالک 13 کو اسم ظاہر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ تمام صورتوں اور معانی کے ساتھ وہی ظاہر ہے اور کوئی صورت اور معنی ایسے نہیں ہیں جو اس کے سوا ہوں۔ حالانکہ ہم نے مکرر لکھ دیا ہے مگر تاکید کی بنا پر پھر لکھتے ہیں: مقصود یہی ہے کہ وحدت 14 کا تفکر خود پر لازم رکھنا چاہیے یہاں تک کہ توحید حال ہو جائے اور خود کو اس تفکر میں گم کر دینا چاہیے۔ جب اس میں استغراق حاصل ہو جائے گا تو 'اسم باطن' سے بھی فائدہ پائے گا۔

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

اے سیّد! تم اگر سالہا سال عبادت گزاری وفرماں برداری اور اذکار واشغال میں مشغول رہو اور وحدت سے غافل رہو تو وصل سے محروم رہو گے، اگرچہ عجیب وغریب کیفیات واحوال ظاہر ہوں اور واقعات کے انوار جلوہ گر ہوں۔ ایسا حال جس کو تم وصل خیال کرو اور اس کا ثمرہ علم وحدت نہ ہو وہ حقیقتاً وصل نہیں ہے، بلکہ مراتب ظہور سے جو کچھ ظاہر ہو وہ مرتبۂ ادب ہے نہ مقصود حقیقی جو مطلق ہے، سب میں ظاہر اور سب کا عین ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسی چیز ظاہر ہوتی جو ایک وجہ سے اشیا میں شئی سے مغایرت رکھتی ہے وہی منزل مقصود ہے۔

جس وقت معاملہ کی حقیقت ایسی ہو جائے تو سب سے پہلے مراقبۂ مطلق 15 (یعنی دل کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر رکھنا اور حضوری حق میں ایسا رکھنا کہ دوئی اور خودی کے خطرات تک نہ آنے پائیں اگر آئیں تو دفع کرے) ضروری ہے تا کہ مسافت باقی نہ رہے۔ تفرقہ اور جدائی اُسی وقت تک ہے جب تک سب چیزوں کو ایک نہ دیکھو اور ایک نہ جانو جب سب کو ایک دیکھو اور ایک جانو گے تو تفرقہ وجدائی سے چھٹکارا پا کر وصل عریاں میسر آئے گا۔ جب سب کو ایک دیکھو گے تو سب نہ رہیں گے بلکہ صرف ایک ہی رہے گا اور بس۔

اے سیّد! تمھارے اور تمھارے مقصود کے درمیان صرف ایک رکاوٹ یہی ہے کہ تم اس کو اپنے سے الگ سمجھتے ہو۔ اگر یہ سمجھ لو کہ تم ہی تم ہو اور بس، تو کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔ جمعیت دل، اس کی آرزو، معرفت حق، معرفت نفس، فنا، وصل، اور مکمل قرب اسی جگہ

حاصل ہوتے ہیں اور کام پورا ہوجاتا ہے۔ تم جب اس مقام پر پہنچو گے تو خود کو نہ دیکھو گے اور بس اُسی کو دیکھو گے تو آسودہ ہو گے اور دُنیا و آخرت تمھارے حق میں یکساں ہوجائیں گی۔ فنا و بقا، بھلائی و برائی، کفر و اسلام، موت و زندگی، اطاعت و معصیت سب پیچھے چھوٹ جائیں گے اور زمان و مکان کی بساط نوردیدہ ہوجائے گی۔ جب تم باقی نہ رہو گے تو کچھ باقی نہ رہے گا۔ سب کچھ تمھاری ذات اور اندیشوں سے وابستہ ہے۔ سمجھ لو کہ جو چیزیں تم میں ہیں وہ تم سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی ہیں۔ جب تم نے اپنے آپ کو ان سب چیزوں سے خالی کر دیا تو کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔

اے سیّد! حق کی ذات کے سوا تمھارا کسی چیز میں کوئی وجود نہیں۔ تم میں تمام چیزیں موجود ہیں۔ جب تم خود حق کی طرف لے جاؤ گے اور اس دریائے ذات بے کراں میں ڈال دو گے تو اس صفت سے آگاہ ہو گے تمھارے ساتھ تمام چیزیں اس دریائے بے کراں میں گم ہوجائیں گی۔ اس سلسلہ میں اگر اچھی طرح غور کرو تو سمجھ جاؤ گے کہ اس کی انانیت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ ایک ہی ذات ہے کہ تمام عالم اس کی صفت ہے اور اس کی ذات سے قائم ہے وہ ذات اس صفت سے ظاہر اور پیدا ہے۔ وہی ذات ہے جو بہت سی ذاتیں بن گئی۔ وہی ذات اپنی قدرت اور سب کی قدرت ہے، اپنا ارادہ اور سب کا ارادہ ہے، اپنی سماعت سب کی سماعت، اپنی بصارت سب کی بصارت، اپنی حیات سب کی حیات، اپنا فعل سب کا فعل اور اپنا کلام سب کا کلام ہے۔ اسی پر قیاس کرو۔

اے سیّد! جو کچھ عالم کے ساتھ ظہور میں آیا وہ سب ذات میں پوشیدہ تھا۔ بعد ازاں جو کچھ پوشیدہ تھا ذات نے اس کی صورت کے ساتھ اپنے عین میں دوبارہ جلوہ فرمایا۔ ذات نے اس کا رنگ پکڑ لیا اور اس نے ذات کا۔ جو کچھ ذات میں پوشیدہ تھا وہ قطع ہو کر عین ذات ہوگیا، کیونکہ اس کے سوا کچھ نہ تھا (اشیا میں اشیا کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے) تو اس ذات نے خود بخود معاملت کی اور عاشقی اختیار کی اور بندگی و خدائی نے اس کے درمیان کارخانۂ ازلی و ابدی برپا کیا۔

دہر جُز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اے سیّد! تم خود کو اس مقام پر خیال کرو جس پر ازل میں تھے تاکہ آزاد ہوجاؤ اور دوبارہ کبھی تفرقۂ غم اور بلا کا منہ نہ دیکھو۔ تمھاری روح وہی ہے، اسی سے تم زندہ ہو، تمھارا دل وہی ہے اسی سے عقل مند ہو، بینائی وہی ہے اسی سے بینا ہو، سماعت وہی ہے اسی سے سامع ہو، ہاتھ وہی ہے اسی سے کام کرتے ہو، پیر وہی ہے اسی سے تم چلتے ہو۔

اے سیّد! تمھارے (اعضائے ظاہر و باطن کے اجزاء میں سے) ہر عضو کے جزو میں وہی ہے، کیونکہ تمھارے عضو کے جزو کا کام تم سے ظہور میں آتا ہے۔ تمھارے تمام اجزا و اعضا وہی ہے کیونکہ تم اس کے ساتھ تم ہی ہو۔ اے سیّد اوئی، توئی اور منی اس کی تین صفات ہیں اور کوئی دوسرا درمیان میں نہیں۔ توحید صفت واحد ہے نہ کہ من و تو۔ جو کچھ من و تو میں باقی ہے وہ اشتراک ہے نہ کہ توحید۔ جب تم چلے گئے تو فنا ہے اور وہ درمیان میں آگیا تو بقا ہے۔

سلوک، دوئی کو دور کرنے میں تمھاری کوشش اور وحدت کی سمت لے جانے میں تمھارا جذبہ ہے۔ سلوک و جذبہ، فنا و بقا ایک ولایت محققہ کا نام ہے۔ تمام اشیا کے ساتھ نیازمندی کرو، کیونکہ وہ سب تمھارا عین مطلوب ہیں۔ دشمن کے ساتھ بھی دوستی اختیار کرو، کیونکہ وہ بھی تمھارا مقصود ہے اور اپنی طرف محبت کی نظر سے نگراں رہو کیونکہ تم عین محبوب ہو۔ سلوک میں یہ سب ضروری ہے۔

نیک و بد سب ہیں تراب اس کے ظہور اسما
مجھ کو یک رنگ نظر چاہیے ہر فرد کے ساتھ

اے سیّد! نیک و بد سب کو دریائے وحدت میں ڈال دو تاکہ آشنائے حقیقت ہوجاؤ۔ اگر میں وحدت کے بارے میں بہت کہوں تو بھی تھوڑا ہے۔ حالانکہ اگر تھوڑا کہوں تو وہی بہت ہے، کیونکہ معرفت کی ابتدا انتہا میں مندرج [16] اور انتہا ابتدا میں مندمج (کسی چیز کی ماہیت میں یا کسی چیز میں محو ہونا اور ایک ہوجانا) ہے، نہ تو اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، کہاں تک کہوں اور کہاں تک لکھوں، نہ تو کہہ سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں، حقیقت تو خود بول رہی ہے۔

جب تم نیند میں ہو تو نیت کرو کہ عالم بطون [17] کو جاتا ہوں اور اپنی حقیقت کی سمت رجوع کرتا ہوں اور جب بیدار ہو تو جان لو کہ عالم ظہور میں آگیا ہوں اور عالم بطون سے ظہور کی طرف تنزل کرتا ہوں۔

جب اُٹھوا استغفار کرو اور کہواے میری حقیقت! مجھ کو میری ذات سے مت کھینچ، مجھ کو مجھ سے چھپالے اور دوئی سے نکال دے۔

اے سیّد! سالک پر سب آداب طریقت ضروری ہیں۔ ان آداب کی تفصیل کی اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں مگر جو کچھ لکھا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ سونا کم کرے۔ جب ضروری ہو جائے اور نیند غالب آجائے تو اسی خیال کے ساتھ جو میں نے لکھا ہے سو جائے۔ کھانا پینا مختصر ہی ہونا چاہیے۔ بلکہ رات دن میں ایک بار ہو اور اگر روزہ ہو تو بہتر ہے۔ حرام لقمہ سے پوری طرح بچے، کیونکہ وہ دوئی اور بیگانگی کے اسباب سے ہے اور وہم باطل ہے جو کچھ منع ہے اور طریقت میں ہے وہ یہی ہے کہ اس فائدہ کو ہمیشہ یاد رکھو جو ضروری ہے۔ خلوت میں رہنا چاہیے، بات چیت کم کرے۔ ویرانہ میں تنہا مراقبہ کرے اور وحدت کو ملاحظہ کرے۔ بات کرنا دل کو حرکت میں لاتا اور تفرقہ پیدا کرتا ہے اور تم کو وحدت و یگانگی حاصل کرنے سے غافل کرتا ہے۔ سوائے اذکار و اشغال کے کچھ نہ کرو۔ مختصر بات کرو اور اندیشہ کی وجہ سے وحدت کو ایک پل بھی جدا نہ کرو۔ جب مجالس میں بیٹھو تو زیادہ تر مقید رہو ایسا نہ ہو کہ غفلت ہو جائے۔

حضوری گر ہمی خواہی از و غائب مشو حافظ
متی ماتلق من تھوی دع الدنیا و اھملھا
یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشم
ترسم کہ نگاہے کند آگاہ نباشم

(حافظ! اگر تم حضوری چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو، جب محبوب سے تمھاری ملاقات ہو تو دنیا کو چھوڑ دو اور اس سے بے پروا ہو جاؤ۔ میں تو ایک پلک جھپکانے کے وقفہ میں بھی اس سے غافل نہیں رہتا، مگر پھر بھی ڈرتا رہتا ہوں کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ وہ میری طرف نگاہ اُٹھائے اور مجھے پتہ نہ چلے)

کوشش کرو تاکہ وہ کثرت وحدت کے آئینہ کو جلا دے اور پختہ کردے۔

اے سیّد! ابتدا میں اپنے اندیشہ کے اخفا میں حتی الامکان کوشش کرنے والا ہونا چاہیے اور سوا مخصوص لوگوں کے کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا چاہیے لونڈی، غلام، آشنا، بیگانے، دوست اور دشمن کے ساتھ وحدت سے آشنائی کرنا چاہیے اور ان سب کو اخلاص کی نظر اور حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

اے سیّد! نزاع وجدال مطلق درمیان سے اُٹھادو اور انکار کو بالکل درمیان سے برطرف کردو تاکہ وحدت ظہور کرے اور بہت کوشش کرو کہ غصہ ظاہر نہ ہو، لاتیں مارنا پیٹنا کیا معنی، گھر میں اور گھر سے باہر اپنے لڑکوں، رشتہ داروں اور بیگانوں کے ساتھ آدابِ حیات ہونا چاہیے۔ جس سے تم کو کوئی تکلیف پہنچے ہرگز اس سے بددل نہ ہو اور نہ اس تکلیف سے رنجیدہ ہو ؎

گر گزندت رسد زخلق مرنج
کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

(اگر مخلوق سے تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو رنج مت کرو اس لئے کہ مخلوق سے نہ آرام پہنچتا ہے نہ تکلیف)

بلکہ اس کو اپنے سے راضی کر لینا چاہیے اور بدی کے بدلے نیکی کرنا چاہیے۔ یہی طریقت میں اصل کلی ہے۔ تنہا رہنا اور تنہا بیٹھنا جمعیت میں پورا دخل رکھتا ہے۔ طالب کا حال ان دو وجوہات سے خالی نہیں ہوتا یا تو وہ ظاہری تعلقات رکھتا ہے یا نہیں، نہیں رکھتا ہے تو اس کی معاملت آسان ہے۔ وہ سب سے قطع نظر کر کے خلوت یا صحرا میں بیٹھ جائے اور حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے یہاں تک کہ حقیقت منجلی ہو اور دوئی بھی درمیان سے اُٹھ جائے۔ اس وقت جس راستہ پر گنجائش ہو چلے۔ اور اگر تعلقات ظاہری ہوں اور حقوق شرعی کی طرف متوجہ ہو تو ضرورت کے مطابق اس کے ساتھ معاملت کرے، لیکن پوری احتیاط کرنا چاہیے کہ شریعت وطریقت کے خلاف واقع نہ ہو اور وحدت کے ملاحظہ سے جو حقیقت ہے بالکل بھی غفلت نہ ہو بلکہ راتوں کو بھی وحدت کے مراقبہ میں رہے اور روزانہ اس کے لئے کچھ وقت مقرر کرے اور روز بروز بڑھاتا رہے یہاں تک کہ یہ معنی دل میں غلبہ کریں اور سب چیزوں سے چھٹکارا دلا دیں۔ جس وقت وحدت کے معنی غالب آئیں اور لطف الٰہی ظہور فرمائے تم سے تمام حقوق ادا کرائے جائیں گے یہاں تک کہ تم کو کسی شخص سے کوئی کام باقی نہ رہے گا وہی تمہارا وکیل ہو جائے گا اور بجائے تمھارے وہی ہو گا تم درمیان میں نہ رہو گے۔

اے سیّد! دنیا کی محبت سلوک میں بہت مضر ہے، لیکن ایسا شخص

جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہے اور اس کو نہیں چھوڑ سکتا اسے چاہیے کہ بقدر ضرورت احتیاط کرے کہ کوئی چیز بھی ایسی واقع نہ ہو جو شریعت و طریقت اور حقیقت کے خلاف اور گناہ کے قریب ہو۔ رجوع کرے اور اس کا تدارک کرے۔

لباس میں تکلف نہیں کرنا چاہیے اور فقرا کے لباس میں سے کچھ اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ ہمیشہ حاضر حال رہو۔ گذشتہ و آئندہ میں سے کچھ نہ یاد رکھو اور وحدت کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دو۔

تم کو جان لینا چاہیے کہ وحدت سے غافل ہونے سے بدتر کوئی موت نہیں اور نہ اپنی حقیقت کی دوری سے زیادہ سخت تر کوئی عذاب ہے تو اس موت اور عذاب سے ڈر کر وحدت کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور یقین رکھو کہ سب ایک ہیں ایک کے سوا موجود ہی نہیں۔ یہ خیال جتنا غالب ہوگا اتنی اس میں سعادت ہے۔ جب دوئی کے وہم سے نکل آؤ گے تو گویا قیامت تم پر واقع ہو جائے گی اور ابدالابدین تک جنت شہود میں آسودہ ہو گے۔ ایسی دولت دنیا میں ہر وقت میسر ہو سکتی ہے مگر جب تم کوشش کرو اور سمجھ سے کام لو۔ قیامت ہر شخص اور ہر چیز پر آنے والی ہے اور قیامت سے مراد وحدت کی طرف رجوع ہے لیکن اس کے بعد جب ظہور کلی واقع ہوتا ہے (اگرچہ سب چیزیں اپنی اصل سے نکلی ہیں) تو ایک ایسی لذت حاصل ہوتی ہے جو سب کے لئے نہیں بلکہ صرف ایسے شخص کے لئے ہے جس پر یہیں قیامت گزر چکی ہو (یعنی وہ لذت اسی کے لئے ہے جو اس جگہ قیامت سے گزر چکا ہو) ہر ایک کے لئے نہیں، من کان فی ھذہٖ اعمی فھو فی الآخرۃ اعمی، جو اس عالم میں نابینا، کور چشم ہے وہ آخرت میں بھی ہوگا۔

امروز نہ دیدی گو اگر روئے صنم را
فردا بہ قیامت رُخ جاناں چہ شناسی

لہٰذا تم کو چاہیے کہ تم کوشش کرو کہ یہ معنی جو موعود ہیں تمہارے لئے اس مقام پر ظہور کریں تا کہ مکمل آسودگی اور وہی لذت حاصل ہو۔

اے سیّد! مقصود یہی ہے کہ دوئی کا وہم اُٹھ جائے تم باقی نہ رہو، وہی وہ رہے۔ تمام انبیا و اولیاء اللہ نے اسی پر اتفاق کیا ہے۔ آسمانی کتابوں، احادیث نبویہ اور اولیاء اللہ کے ارشادات میں اس سلسلہ میں بہت دلائل ہیں۔ ہر فرقہ کے علما، وحدت کے قائل ہیں اور سبھی اس سلسلہ میں ایک زبان ہیں کہ حق کے سوا موجود نہیں۔ عالم اس کی صورت اور ظہور ہے۔ میرے دل میں یہ خیال ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ سبحانہ اس مطلوب مطلب کے تمام شواہد کو ایک الگ کتاب میں لکھا جائے اور عقل سلیم کے ساتھ ان دلائل کی تشریح کی جائے۔

اب جبکہ آخر زمانہ ہے اور قریب ہے کہ حقیقت کا آفتاب اس مقام پر مشرق سے طلوع ہو اور (جیسے کہ آفتاب کے طلوع کے وقت انوار و آثار ظاہر ہوتے ہیں) اسرار توحید بااختیار، بے اختیار فہمیدہ و نافہمیدہ خاص و عام کی زبان سے پھوٹیں طالب کو چاہیے کہ خود کو جمع کر کے خود سے چھپا لے تا کہ وحدت کی حقیقت جیسی ہونی چاہیے اس پر جلوہ گر ہو جائے اور زبانی گفتگو سے اکتفا ہو۔ اللہ بس باقی ہوس۔

حواشی وحوالے

1۔ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے تفصیلی حالات وواردات سے متعلق حضرت والدی واستاذی مولانا حافظ شاہ تقی انور صاحب علوی مدظلہٗ العالی کی تصنیف ''حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندی'' ملاحظہ ہو۔

2۔ ان حضرات کے حالات کے لئے الانتصاح عن ذکر اھل الصلاح مؤلفہ حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی قدس سرہٗ مترجمہ مولانا شاہ عین الحمید صاحب علوی مدظلہٗ ملاحظہ ہو۔

3۔ تذکرۂ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار، ص:155

4۔ جذب وفکر، ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، 32-120

5۔ مولانا جامی (898ھ) فرماتے ہیں:

جامی مکن اندیشۂ نزدیکی و دوری
لا قرب ولا وصل ولا بُعد ولا بین

(جامی! نزدیکی و دوری کا اندیشہ ہی مت کرو، اس لئے کہ وہاں نہ قرب ہے نہ دوری ہے نہ وصال ہے نہ فراق)

6۔ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''سیمرغ بتلاش سیمرغ رفتند چوں بانجام کار رسیدند خود را سیمرغ دیدند۔ سیمرغ سیمرغ کی تلاش میں روانہ ہوئے انجام کار جب پہنچ گئے تو اپنے کو ہی سیمرغ دیکھا۔ یقین گھٹتا بڑھتا نہیں ہے مگر افعال وصفات سے چونکہ افعال وصفات ذات سے ہیں لہٰذا لامحالہ وہ ذات میں مندرج ہوں گے (محو ہو جائیں گے) یہی صفات ذات کے حجاب

ہیں۔ لہٰذا جب یہ ذات میں مندمج ہو گئے تو ذات رہ گئی جو گھٹتی بڑھتی نہیں ہے۔ یقین کے لئے کوئی نئی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ جب سالک توحید الٰہی میں آئے گا تو ہر یقین میں حق ہی حق دیکھے گا۔ یقین میں بہت طاقت ہے سالک خود متصرف ہو جاتا ہے اور جو کرتا ہے وہ ہوتا ہے یہ صدق و یقین موسوی ہی تھا جس نے عصا کو اژدہا کر دیا اور دریا کو پھاڑ کر راستہ نکالا۔ اسی طرح یقین کے تاثیرات و خواص کی انتہا ہی نہیں ہے۔

7۔ راقم احقر کے جدامجد حضرت عارف باللہ صاحب سرشاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ الاطہر (1806ء) فرماتے ہیں:

وجود و عدم دونوں شانیں ہیں اس کی
جدا دونوں شانوں سے ہم دیکھتے ہیں
کھلا جس پہ جلوہ صفات خدا کا
وہ اس دیر کو بھی حرم دیکھتے ہیں
کبھی حق کو عالم سے دیکھیں منزہ
کبھی عالم وحق بہم دیکھتے ہیں

ھو الاول والآخر والظاھر والباطن (سورہ الحدید آیت:۳)

8۔ **جبروت:** اسما وصفات الٰہی کی عظمت اور مرتبہ واحدیت کو کہتے ہیں کیونکہ یہاں پر بے شمار عیان کا مشاہدہ ہوتا ہے جس سے سالک کے قلب میں عظمت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔

9۔ **لاہوت:** گنج مخفی، مقام محویت اور عالم ذات الٰہی کو کہتے ہیں جس میں سالک کو فنافی اللہ کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک اس زندگی کو کہتے ہیں جو اشیائے ناسوت میں ساری وطاری ہے جس کا مقام روح ہے)

روح شمع و شعاع اوست حیات
خانہ روشن ازو واز ذات

10۔ حدیث شریف ہے کہ **لی مع اللّٰہ وقت لایسعنی فیہ ملک مقرب ولانبی مرسل.** اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا ایسا وقت بھی ہوتا ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتہ کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ نبی مرسل کی۔

کتب احادیث وصوفیہ کے یہاں ایک اور واقعہ اسی حدیث شریف سے متعلق ہے کہ سرکار دو عالم اورا حنافداہ صلی اللہ علیہ وسلم خلوت خاص میں تھے۔ حضرت عائشہ نے اذن باریابی چاہی، فرمایا کون؟ عرض کیا عائشہ، فرمایا کون عائشہ؟ عرض کیا عائشہ بنت ابی بکر۔ فرمایا، کون ابوبکر؟ عرض کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست ورفیق۔ تو فرمایا کون محمد؟ حضرت عائشہ صدیقہ سمجھ گئیں کہ یہ وہی وقت خاص ہے چنانچہ پھر کچھ نہ عرض کیا۔

11۔ **تنزلات خمسہ یا ستہ:** حضرات صوفیہ کی اصطلاح میں تنزل حق کے چھ مرتبے مقرر ہیں، پہلا احدیت جس میں صرف اعتبار ذات ہے۔ احدیت کو عالم غیب بھی کہتے ہیں بعض پہلے مرتبہ کو وحدت کہتے ہیں جو یقین اول اور برزخ کبریٰ ہے۔ دوسرا مرتبہ واحدیت ہے جس میں ذات کے ساتھ تفصیلاً اسما کا بھی اعتبار ہے۔ تیسرا مرتبہ ارواح مجردہ جس میں عقول عالیہ اور ارواح انسانیہ ہیں۔ چوتھا ملکوت ہے، جس میں نفوس سماویہ وانسانیہ ہیں، اس کو عالم مثال بھی کہتے ہیں۔ پانچواں عالم ملک و عالم اجسام ہے جسے عالم شہادت بھی کہتے ہیں۔ چھٹا مرتبہ عالم انسان کامل ہے جو تمام مراتب کا جامع ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں پہلا احدیت دوسرا وحدت، تیسرا واحدیت، چوتھا عالم ارواح، پانچواں عالم مثال اور چھٹا عالم شہادت ہیں۔

12۔ راقم احقر کے جدامجد اور فارسی واُردو اور بھاشا کے نغز گو صوفی شاعر حضرت غوث ملت لسان الحق شاہ تراب علی قلندر فرماتے ہیں:

جیسے موجیں عین دریا ہیں حقیقت میں تراب
ویسے عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں۔

13۔ **سالک:** اُسے کہتے ہیں جو قلب سے حق کی جانب متوجہ ہو اور اس کی طرف سیر کرے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سالک ہالک دوسرا واصل۔ سالک ہالک اسے کہتے ہیں جو شروع سے مجاز میں مقید ہو جائے اور حقیقت سے بالکل بے خبر ہو۔ اپنا مقصود و مطلوب اسی مجاز کو جانے۔ اور سالک واصل اُسے کہتے ہیں جو آغاز سلوک سے محکوم حقیقت ہو اور تقید سے نکل کر مرتبہ اطلاق پر فائز ہو، عدم سے شہود میں آئے اور توحید مطلق میں بالکل گم ہو)۔

تو مباش اصلا کمال اینست وبس

تو دروگم شو وصال اینست و بس

14۔ **وحدت:** ذات معدن علم اجمالی، حب ذاتی حقیقت محمدی اور برزخ کبریٰ کو کہتے ہیں۔ وحدت پانچ قسم کی ہے۔ وحدت شخصی جیسے صہیب، زید، ثاقب وغیرہ۔ دوسری انسان بہ نسبت صہیب، زید، ثاقب۔ تیسری وحدت جنسی جیسے جو ہر بہ نسبت انواع موجودات کے۔ چوتھی وحدت ارادی جیسے مومن، حق کو انبیا کے تبلیغ احکام پر واحد جانتا ہے۔ پانچویں وحدت حقیقت جو تعین اول ہے۔

15۔ **مراقبہ:** حضرات صوفیائے کرام کے نزدیک چار اصول ہیں: اول، مراقبہ جمع کہ سالک ذات حق کو ہر شئی میں جانے اور بغیر اس کے کسی شئی کو نہ دیکھے کیونکہ نفس الامر میں بھی ایسا ہی ہے۔ دوئم، مراقبہ صوری کہ سالک یہ سمجھے کہ میں اللہ سے جانتا ہوں، اسی سے سنتا ہوں اسی سے کلام کرتا ہوں۔ سوئم، مراقبہ ناظرہ کہ وہ یہ سمجھے کہ اللہ میری صورت پر ظاہر ہے۔ چہارم، مراقبہ جمع الجمع کہ سالک یہ جانے کہ جو میں کہتا ہوں اللہ سے کہتا ہوں۔ اسی جگہ سے ایک بزرگ کا ارشاد ہے۔

حقیقت کز تعین شد معین
تو او را در عبارت گفتہ من

16۔ **اندراج:** ایک چیز کا دوسری چیز میں بغیر حلول و اتحاد کے داخل ہونے کو اندراج کہتے ہیں۔ یعنی حقیقت میں دونوں ایک شئی ہوں اور صورت میں دو، ان میں سے ایک دوسرے میں داخل ہوئے

17۔ **عالم بطون:** اس سے اشارہ خاص احدیت ذات حق کی طرف ہے۔ بعض لوگ عالم مثال سے ذات تک کو بطون کہتے ہیں یعنی بہ نسبت عالم شہادت کے عالم مثال باطن اور عالم مثال سے عالم ارواح باطن اور عالم ارواح سے اعیان باطن اور اعیان سے ذات بحت باطن ہے۔

اقبال اور تصوف

قاضی عبید الرحمن ہاشمی .... سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تصوف اتفاق سے ایک ایسا مستحکم فکری نظام ہے اور روحانی کسب وکمال کا وسیلہ رہا ہے جو اقبال سے قبل سینکڑوں برس کی فارسی و اردو کی شعری و ادبی روایت کا ناگزیر جزو رہا ہے۔ فکر اقبال پر نہ صرف یہ کہ اس روایت کا قوی اثر ہے بلکہ وہ ذاتی طور پر بھی اس کے مخلص ترجمان اور امین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے متصوفانہ خیالات وافکار پر موافقت اور مخالفت میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس موضوع سے متعلق کوئی نئی بات کہنا خاصا مشکل کام ہے۔ تصوف سے اقبال کی گہری دلچسپی ابتدا ہی سے تھی اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ ان کی تمام تر نثری وشعری تحریریں اس مسلک سے ان کے والہانہ شغف کی بہترین مثالیں ہیں۔

مثنویاں اسرار ورموز (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۱۸ء) میں تصوف سے متعلق ان کے خیالات بہت وضاحت اور تفصیل سے سامنے آئے ہیں۔ ان کے ماسوا ان کے بیشتر فارسی اور اردو کلام میں ان خیالات وافکار کی واضح بازگشت موجود ہے۔ تصوف کی طرف اقبال کا میلان فطری بھی تھا اور آبائی بھی اور یہ داعیہ نہ صرف یہ کہ کبھی ختم نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ افزوں تر ہوتا چلا گیا جو ان کے منجملہ شاعرانہ اور فلسفیانہ افکار میں سب سے زیادہ موثر، پرقوت اور حیات بخش تصور کے طور پر ہمیشہ ماہرین اقبالیات اور دانشوروں کی توجہ کا محور رہا ہے۔ اقبال جو فی نفسہ ایک درویشانہ اور قلندرانہ مزاج رکھتے تھے نہ صرف یہ کہ تصوف کے کبھی خلاف نہ تھے بلکہ جادۂ تصوف اور معرفت وطریقت پر گامزن بوریہ نشینوں سے ایسی غیر معمولی عقیدت اور محبت رکھتے تھے جس کی دوسری مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اقبال کے بعض نکتہ چینوں نے تو ان پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ اکثر اوقات وہ شاعرانہ محویت، وجدانی کیفیت اور سرشاری کے عالم میں ان مقامات پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لئے بشری اور خدائی صفات یعنی برگزیدہ نفوس اور خدائے لم یزل کے مابین ناگزیر فرق مراتب کو ملحوظ رکھ پانا مشکل ہوجاتا ہے اور اس طرح نادانستہ طور پر وہ شرک کی سرحدوں میں قدم رکھ دیتے ہیں جس کی مثالیں ان کے کلام میں جابہ جا بکھری پڑی ہیں۔

اقبال کے تعلق سے اس دعوے کے بعد یہ سوال ذہن میں فوراً ابھرتا ہے کہ جب وہ بادۂ تصوف سے اس قدر سرشار اور دریائے معرفت کے شناور تھے تو اہل تصوف اور خانقاہی سلسلے سے وابستہ حلقوں میں ان کے بارے میں شکوک وشبہات کیوں پیدا ہوئے اور ان کے خلاف آوازیں کیوں بلند ہوئیں؟ ظاہر ہے اس کے کچھ اسباب تو ہوں گے۔

غور کرنے سے اس سلسلے میں جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال شاعر ہونے کے ماسوا اپنے زمانے کے ایک اعلیٰ پائے کے سماجی مصلح، دردمند مفکر بلکہ مجتہد بھی تھے جنھیں اپنے عہد کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی، زوال اقدار اور سیاسی وسماجی پسپائی کا نہایت قلق اور غم تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب استعماری قوتوں کے شر وفساد اور ظلم وجبر پر مبنی حکومت وسیاست کی تیز آندھیاں پورے ایشیا میں انسانیت کی طنابیں اکھاڑ دینا چاہتی ہیں۔ اللہ کی مقدس سرزمین طاغوت کے ناپاک ڈرامے کی آماجگاہ بن چکی ہے، ان حالات میں اقبال کی روح حیران اور نوحہ کناں ہے کہ اہل تقویٰ اور وہ تمام اہل طریقت وشریعت جنھیں خدا نے مظلوم دنیائے انسانیت کی خدمت، اعلائے کلمۃ الحق اور احیائے دین مبین کے لئے مبعوث کیا تھا ان میں سے اکثر لوگوں نے اس نہایت اہم اور بنیادی دینی فریضے کی ادائیگی اس طرح کی کہ یا تو علائق دنیا سے بالکل بے رغبتی اور سبک دوشی اختیار کر لی یا بہ صورت دیگر مسند سیاست ودولت پر فائز وقت کے فرعونوں کی خوشامد اور اطاعت کو اپنا شعار بنالیا۔ مزید برآں یہ کہ ان نام نہاد خرقہ پوشوں نے اس صریح اسلامی اخلاقیات سے متصادم روش کی اس حکمت اور ہوشیاری سے تاویل اور مدافعت کی کہ نوگرفتہ اور نادان

نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر ان کی حلقہ بگوش بن گئی۔ قوم کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا رہا، جہالت، توہم، ریاکاری اور فسق و فجور پروان چڑھتا رہا، غرض کہ سیاسی پسپائی، روحانی پسپائی اور نامرادی کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اقبالؔ کی مشکل یہ تھی کہ وہ کاروبارِ دنیا سے اہلِ دین و ایمان کی دست کشی کا تصور تک نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ شریعت و طریقت میں کسی دوئی، فاصلے یا کشمکش کے تصور سے بھی قاصر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا ہی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس قابل ہے کہ اعلیٰ انسانی صفات اور بلند روحانی مراتب پر فائز افراد و اشخاص یک جان ہو کر اسی رزم گاہ پر انسانیت کی بلندی، سرخ روئی اور نجات کی سعی کریں۔ اس لئے کہ یہ وہ عمل ہے جو خدا کے نزدیک ہر عمل سے زیادہ پسندیدہ عظیم اور ارفع ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں کوتاہی کے مرتکب صرف اہلِ طریقت ہی کو اقبالؔ ہدفِ ملامت نہیں بناتے، بلکہ ان تمام نام نہاد مصلحت اندیش علما اور اربابِ شریعت کو بھی نشانہ بناتے ہیں جو ادنیٰ مادّی ترغیبات اور ذاتی فوائد کے لئے اس درجہ بے قرار رہتے ہیں کہ کسی اجتماعی، قومی، انسانی اور جمہوری مفاد کے لئے درکار اتحادِ عمل اور مستحکم جدوجہد کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

اقبالؔ کی آنکھیں نمناک تھیں کہ یہ مذہبی اور روحانی ادارے اور اشخاص بالعموم روحِ مذہب سے خالی محض التباس پیدا کرنے کی حد تک اپنے روحانی وجود کا احساس دلاتے ہیں چنانچہ اقبالؔ کی تخلیقی حسیت کا شعلہ جب جب بلند ہوتا ہے تو اس کے زمانی و مکانی حوالے اس طرح بدلے نظر آتے ہیں کہ ہم خود کو بیشتر قرونِ اولیٰ کے دل نواز تہذیبی اور تاریخی محور پر مجلس آرا پاتے ہیں جہاں نہ صرف یہ کہ ہمیں ابدی، روحانی اور اخلاقی اقدار میں ایک گہرے ربط و اتصال کا سراغ ملتا ہے بلکہ پوری کائنات اپنے تمام تر آثار کے ساتھ ایک رشتۂ وحدت میں پروئی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تاہم صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی سفر، انقلابِ دہر اور تہذیبی پیچیدگی کے مراحل کو عبور کرتے ہوئے انسانی قافلے کے ہمراہ جب مذکورہ اقدار اقبالؔ کے عہد تک پہنچتی ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ ثابت و سالم نہیں ہوتیں بلکہ زمانے کی گردان کی صورتوں کو اس درجہ مسخ کر چکی ہوتی ہے کہ ان کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ پایانِ کار اس ذہنی کاہلی، انفعالی طرزِ فکر اور سرد مہری کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ غلامی اور محکومی پوری قوم کا مقدر بن گئی۔

لیکن اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ اقبالؔ تصوف کے ایجابی پہلوؤں کے بھی منکر ہیں۔ توکل علی اللہ، عبادات میں گرمیِ خلوص، ریاکاری کی ہر صورت سے اجتناب، کائناتِ آب و گل سے تعلق اور بے تعلقی کے حدود کا تعین کیا جانا وہ مستحسن اور پسندیدہ اقدار و اعمال ہیں جن کے بغیر کوئی بھی انسانی معاشرہ مہذب کہلائے جانے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ کے متصوفانہ افکار و خیالات کے حوالے سے مزید ایک پہلو کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ جس حد تک اقبال کے خیالات ان کی نثری تحریروں، تقریروں، خطوط اور خطبات کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں وہ قطعاً واضح اور صاف ہیں جن کا لب لباب سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ اقبالؔ شاعر بھی تھے اور ایک عظیم شاعر تھے جن کی تمام تر عظمت اور شوکت کا مدار ان کے فکر و فلسفے سے زیادہ ان کی شاعری پر ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے جسے بے شک ان کے فکری تضاد سے بھی تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شاعرانہ مسلک اور جمالیاتی افکار کی جداگانہ رسمیات کی حد تک وہ صراطِ مستقیم پر چلنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہاں کی دنیا بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ کائنات ہے جو یقیناً ہماری مادی کائنات سے کہیں زیادہ دل کش، منور اور پائیدار ہے۔ یہاں کے شب و روز مختلف، یہاں کے مہ و پروین اور ستاروں کی تابندگی بھی اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ یہاں اقبالؔ کبھی خود سے، کبھی خدا اور کبھی کائنات سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس پراسرار کائنات اور عالمِ سوز و ساز میں اقبالؔ کے بعض خیالات پر اگر سوئے ظن کا بھی گمان ہو تو وہ سوئے ظن نہیں ہے بلکہ محض شاعرانہ صداقت ہے۔ جب کی حدود میں کسی عدالت کا فیصلہ وارد نہیں ہوتا، جہاں کسی بھی فرمان کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس تخلیقی صحیفے کی زبان کی منطق جدا ہے، اس کی تعبیر و تشریح کا سلسلہ لامتناہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تصوف، طریقت اور معرفت کے باب میں بھی اقبالؔ کا مواخذہ شاعری کے حوالے سے کرنے کے بجائے ان کے نثری شہ پاروں کے توسط سے ہی کیا جائے تو زیادہ بہتر نتائج کی امید کی جا سکتی ہے۔

❁❁❁

خواجہ میر درد اور تصوف

پروفیسر قاضی جمال حسین (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

طریقۂ محمدیہ کی تعلیمات اور اس کے بنیادی تصورات، درد کے صوفیانہ نظام کی اساس ہیں۔ ان کے نزدیک طریقۂ محمدیہ کی پیروی ہی نجات کا راستہ تھا۔ اول المحمدیین ہونے کو وہ اپنے لیے سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ ''علم الکتاب'' اور ''نالۂ عندلیب'' کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ تصانیف راہ سلوک کی تمام دشواریوں کا حل پیش کرتی ہیں۔ تصوف کے مختلف مقامات اور کیفیات کا بیان جس طور پر ان کتابوں میں ملتا ہے دوسری تصانیف میں نہیں ملتا۔ ''قبلۂ کونین'' کی تصنیف نالۂ عندلیب درد کے نزدیک معرفت کا ایسا سمندر تھی جو دیگر تمام کتابوں سے سالک کو بے نیاز کر دیتی ہے۔ اپنی کتاب علم الکتاب کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس بے بضاعت کی تصنیف سیر و سلوک کی بے شمار مشکلوں کو حل کر دیتی ہے اور ایسے تازہ اور نئے نکات پر مشتمل ہے کہ پھر کسی دوسری تصنیف کے مطالعہ کی حاجت نہیں۔

درد کے بنیادی تصورات اور طریقۂ محمدیہ کی تعلیمات ان کے رسائل، اشعار اور تصانیف میں بکھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح دو جلدوں پر مشتمل ان کے والد کی کتاب ''نالۂ عندلیب'' سے بھی طریقۂ محمدیہ کے مخصوص تصورات پر کافی روشنی پڑتی ہے لیکن اس طریقۂ محمدیہ کے امتیازات اور اس کی تعلیمات یکجا طور پر بیان ہونے کے بجائے منتشر صورت میں نظر آتی ہیں۔ بلکہ اکثر تو کسی ایک تصور کی پیہم تکرار ملتی ہے۔ میر درد کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور ان کی خواہش تھی کہ اس مشرب کی بنیادی خصوصیات کسی ایک رسالہ میں یکجا کر دی جائیں او رجو باتیں علم الکتاب اور نالۂ عندلیب میں متفرق اور منتشر ہیں، انھیں مرتب صورت میں اکٹھا کر دیا جائے۔ تاکہ طریقۂ محمدیہ کی خصوصیات بآسانی معلوم ہو سکیں اور سمجھنے میں سہولت ہو، لیکن شاید زندگی نے وفا نہ کی اور ان کی یہ خواہش تشنۂ تکمیل ہی رہی۔ (نالہ نمبر ۳۳)

درد کے نظام افکار کی بنیاد شریعت محمدی کے اتباع اور قرآن و سنت کی پیروی پر استوار ہے۔ انہوں نے بار بار اپنی تعلیمات میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ روحانی ترقیات کا واحد راستہ دل سے شریعت کے احکامات کی پیروی ہے۔ طریقۂ محمدیہ، سلوک کی کوئی نئی تعبیر ہونے کے بجائے، اسلاف کے طریقہ کی تجدید ہے، شریعت مصطفوی ہی اصل شریعت ہے اور طریق محمدی ہی سچا راستہ۔ باقی تمام طریقے خیال خام ہیں اور ان کی حیثیت باطل اوہام سے زیادہ نہیں۔ (نالہ نمبر ۲۲)

سالک کے لئے بندگی اور عبودیت، اس کی سب سے بڑی صفت ہے۔ عبودیت ہی الوہیت سے قریب ہونے کا وسیلہ ہے۔ جمال الوہیت فقط عبودیت کے آئینہ ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ بندگی سے روگردانی، نارسائی اور محرومی کا سبب ہے۔ تمام سیر و سلوک کا حاصل بس یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے آزاد ہو جائے اور معشوق حقیقی کے حضور وشہود سے آباد ہو۔ اس طور پر کہ احکامات شریعت بلا کلفت ادا ہو سکیں، اور نواہی سے احتراز میں کسی قسم کا بوجھ محسوس نہ ہو۔ موت وزندگی سالک کی نظر میں یکساں ہو جائیں۔ اس کے بعد اگر خدا کی عنایت اور اس کے مخصوص فضل سے حصول رزق، دنیوی اسباب کے بغیر میسر آجائے اور اس سلسلہ میں کسی انسان کی احتیاج باقی نہ رہے تو پھر یہ ایسی دولت ہے جس سے بڑھ کر کوئی دوسری دولت نہیں، لیکن یہ وہ نعمت ہے جو کوشش اور زور بازو سے حاصل نہیں ہوا کرتی۔ جب تک قبولیت خداوندی کی ہوا بندہ کی طرف از خود نہ چلے، کوئی شخص روحانی ترقیات کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ درویش صورت گدا ہونا اور بات ہے اور سچا تارک دنیا ہونا اور۔

طریقۂ نقش بندیہ مجددیہ قادریہ کو، درد ملت ابراہیمیہ کے بمنزلہ سمجھتے تھے اور انہوں نے نہایت صراحت سے یہ بات کہی کہ محمدیان خالص کسی نئے طریقے کے بجائے اسی طریقہ کی اتباع کرتے ہیں۔ طریقۂ محمدیہ کے تمام باطنی اذکار و اشغال اور ظاہری اعمال، انہیں

اکابرین سلسلہ کے معمول کے مطابق ہیں۔ سچا محمدی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو مجتہد اعظم سمجھتا ہے اور تمام اعمال انہیں کے اجتہاد کے مطابق کرتا ہے۔ (نالہ نمبر ۱۸)

درد کے نزدیک باطنی ترقیات کا انحصار اس بات پر ہے کہ بندہ پہلے اپنے دل کو اسباب دنیا کی گرفتاری سے آزاد کرے اور دل کی کدورتوں کو دور کرے، تاکہ تجلیات الٰہی دل کے آئینہ میں منعکس ہوسکیں۔ جب تک سالک دنیا اور علائق دنیا سے اپنے دل کو آزاد نہیں کرتا، دل کا چراغ روشن نہیں ہوتا۔ یہ بات درویشی کی حُرمت کے خلاف ہے کہ درویش اغنیاء کے گھر جائے۔ اسباب دنیا جمع کرنا دل کو پراگندہ کرتا ہے اور جگہ جگہ دوڑنا ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں۔ جس قدر ممکن ہو درویش کو چاہیے کہ دینوی علائق کو کم سے کم تر کرے اور مال ومتاع کے بوجھ کو اپنے سر سے اُتارے۔ تن پروری، نفس اور طبیعت کے شجرۂ خبیثہ کی پرورش ہے، جو روحانی ترقیات کے شجرۂ طیبہ کو جڑ سے اُکھاڑ دیتی ہے۔ نفس کشی گرچہ بظاہر اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے لیکن درحقیقت یہیں سے باطنی مدارج کے بالاخانہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ "**عادِ نفسک وتعالی**" (اپنے نفس سے دشمنی کرو اور میرے قریب آجاؤ) پس جس قدر ممکن ہوسکے دل کی رقت سے باطنی عروج کے نخل کی آبیاری کرو۔ حتی الوسع گریۂ شوق کی نہر کو جاری رکھو تاکہ بہار جاودانی ظہور میں آسکے۔ دل کی رقت خدا کی رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

فنافی الشیخ:

درد کے صوفیانہ تصورات میں شیخ یا مرشد کامل، مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس کی رہنمائی کے بغیر وصول الی اللہ کے مشکل مقامات سے محفوظ گزر جانا سالک کے لئے ممکن نہیں۔ سالک جب تک اپنے ارادے، خواہش، اپنی پسند، ناپسند سبھی سے دست بردار ہوکر خود کو شیخ کے حوالے نہیں کردیتا بلکہ اپنی ہستی کو مرشد کی ذات میں فنا نہیں کردیتا، روحانی تجلیات کے باب اس پر وا نہیں ہوتے۔ اس راہ کی کامیابی کا راز سپردگی اور حوالگی میں مضمر ہے۔ شیخ کے متعلق درد کے خیالات ان کی تحریروں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ اور الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ فنافی الشیخ کے تصور پر منتج ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں درد کی تعلیم یہ تھی کہ ملائی اور زاہدی سے کچھ ہاتھ نہیں آتا، خدا کے مقبول بندوں کے دل میں جگہ بنانا چاہیے۔ مدرسہ یا مسجد کی راہ سے خدا تک رسائی دشوار ہے۔ مرشد کے آستانے کی خاک ہو، دل کا راستہ دل ہی سے کھلتا ہے اور آگاہی اور معرفت آگاہوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنا سر نیاز اولیاء اللہ کے قدموں میں رکھ دو اور ان محبوبانِ الٰہی کے ناز اٹھاؤ، جاؤ اور شب وروز کسی مرشد کامل کی تلاش کرو، خدا تک پہنچنے کا بس یہی راستہ ہے۔

خواہم سر نیازے، سایم بہ پائے نازے
تامدّتے درازے دیدم نماز کردن

(ترجمہ: میں چاہتا ہوں کہ اپنا سر نیاز کسی نازمجسم کے قدموں میں رکھ دوں کیونکہ نماز پڑھ کر ایک مدت تک ہم نے دیکھ لیا۔ اس سے گوہر مقصود حاصل نہیں ہوتا) (آہ نمبر ۲۹۳)

فنافی الشیخ کے مسئلہ پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے نالۂ درد میں وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

"قدم حق پرستی کی راہوں پر ڈال دو اور زندگی کی تھوڑی بہت جو مہلت میسر ہے اُسے ضائع نہ کرو، کیونکہ پیر پرستی کی دولت بس اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے خدا رسی کا باب پیر کے دروازوں سے کھلتا ہے۔" (نالہ نمبر ۲۹۳)

فنافی الشیخ دراصل فنافی الرسول کا ذریعہ ہے جو بالآخر سالک کو فنا فی اللہ کے بلند مقام تک لے جاتا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"میں ایک کمترین محمدی ہوں، پیر پرستی اور نسبتِ ایماں کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ پس جو شخص بھی پیر پرست اور باایمان ہے وہ میری جان بلکہ عزیز تراز جان ہے۔" (نالہ نمبر ۱۱۷)

اس سلسلہ میں درد کا موقف یہ تھا کہ پیر سے استفادہ کا سلسلہ اس کی عدم موجودگی بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کے انتقال کے بعد بھی جاری رہتا ہے ان کا نظریہ تھا کہ باطنی ترقیات کے جملہ کاروبار کا مدار اگرچہ پیر کی صحبت ہے اور رُشد وہدایت کے کارخانہ کی بنیاد پیر کی خدمت پر ہے لیکن مجبوریوں کے سبب اگر خدمت میں حاضری ناممکن ہو تو مرید کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں "نسبتِ رابطہ" اپنا کام کرتی ہے۔ اور روحانی فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ طالب کی استعداد اور کسب فیض کی قوت اگر مضبوط ہے تو وصال

کے بعد بھی وہ پیر کی روح سے فیض حاصل کرسکتا ہے۔ اس کو صوفیا کی اصطلاح میں ''نسبتِ اولیہ'' کہتے ہیں۔ مرشد اگر صاحب تصنیف ہے تو پھر کسب فیض کی صورت مزید آسان ہوجاتی ہے۔ اس کی تحریروں کو نہایت اعتقاد اور غور سے پڑھنا چاہیے۔ ان شاء اللہ ہادیِ حقیقی مرشد کی تحریروں کی برکت سے ہدایت کا دروازہ کھول دے گا۔ (نالہ نمبر ۲۹۱)

تصورِ عشق:

فنافی الشیخ کے مذکورہ بالا تصور کی روشنی میں دردؔ کا مخصوص ''تصورِ عشق'' ان کی تحریروں میں مرکزِ توجہ بنتا ہے۔ ''علم الکتاب'' اور ''رسائل اربعہ'' کے علاوہ دردؔ نے اپنے اشعار میں بھی اپنے اس تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ سے والہانہ محبت اور اسی کی ذات میں اپنی ہستی کو گم کردینے کی تعلیم، دردؔ کا پسندیدہ موضوع ہے۔

''رقتِ قلب'' اور ''دل کا گداز'' جو سیر و سلوک کا بنیادی پتھر ہے، عشق کے بغیر ممکن نہیں، عشق مطلق فی نفسہ اگرچہ مجازی اور حقیقی کے علاحدہ خانوں میں تقسیم ہوکر دو الگ الگ ناموں سے جانا جاتا ہے۔ کہیں اپنی ماہیت کے اعتبار سے عشق مطلق کے مظاہر دونوں جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ عشق خواہ حقیقی ہو یا مجازی، نسبتِ عشقیہ کی تجلی یکساں طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ شاہد حقیقی تعالیٰ شانہ، اپنی قدرت کے کیا کیا عجائبات اپنے عاشقوں کو دکھاتا ہے اور اپنی صوری اور نوری تجلیات کے عجیب و غریب دفتر ان پر کھول دیتا ہے۔ ہجر و وصال کے کاروبار کا کون سا دروازہ ہے جسے وہ وا نہیں کرتا۔ ہر نوع کے عتاب و خطاب سے اپنے دوستوں کو آزماتا ہے اور رنگا رنگ جلوہ پردازی سے ان کی دلربائی کرتا ہے اور ہر لمحہ تازہ تجلّیوں کے لباس میں خود آرا ہوتا ہے۔'' (آہ نمبر ۲۶۸)

عشق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دل کے خلوت کدے کو محبوب کے لئے جملہ ماسویٰ سے پاک کردیتا ہے اور تمام آرزوؤں کو ایک نقطہ پر مرکوز کردیتا ہے۔ البتہ عشق مجازی کا تصور، دردؔ کے نزدیک قدرے مختلف ہے۔ وہ عشق مجازی جو عشقِ حقیقی کی راہیں ہموار کرتا ہے اور سالک کو دردِ دل کی نعمت سے نوازتا ہے، دراصل پیر کا عشق ہے نہ کہ بدکیش، غفلت شعار عام انسانوں کا عشق۔ عشق مجازی کی یہ صورت دردِ دل کے بجائے دردِ سر ہے اور یکسوئی اور طمانیت کے بجائے دل کو پراگندہ رکھتی ہے۔ ایسے مجاز کو ''قنطرۃ الحقیقۃ'' نہیں کہتے بلکہ مجازی عشق جو عشقِ حقیقی تک رسائی کا پل ہے وہ پیر کی محبت سے عبارت ہے۔'' (نالہ نمبر ۲۳۴)

شیخ سے محبت کے علاوہ عالم مجاز کے تمام عشق بیماری ہیں جس کا علاج دردؔ نے یہ تجویز کیا ہے ''مابہ المرض'' یعنی محبوب سے پرہیز کیا جائے، جس قدر ممکن ہو اس کی ملاقات سے بچا جائے، اس قسم کے عشق کے مصائب اور برائیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے، فراغت کی راحت اور اس کی وساوس کے ترک کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا جائے۔ تسلّی کی خاطر محبوب سے ملاقات اور اس کا دیدار مرض میں اور بھی شدّت پیدا کردیتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ اہل معاملہ کو میری یہ باتیں نہایت گراں گزریں گی حالانکہ میں یہ باتیں خوب دیکھ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ مشہور ہے کہ طبیب کے پاس کیا جاتے ہو؟ کسی تجربہ کار سے ملو''۔

دردؔ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عشق اپنی ماہیت میں ''گداز قلب'' کا سبب ہے اور عاشق کو صاحب دل بناتا ہے دردِ دل کی لذّت کو انسان اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک خود کسی معشوق کے غلبہ شوق میں در آشنا نہیں ہوتا۔ لیکن عشق مجازی کی وہ صورت جو عشقِ حقیقی کی بے نہایت وسعتوں سے سالک کو آشنا کرتی اور روحانی ترقیات کے بلند مقام تک لے جاتی ہے، وہ پیر کا عشق ہے ایسی بُت پرستی جو خدا کی مخلصانہ عبادت کا وسیلہ ہے، کسی روشن ضمیر مُرشد کے سنگِ آستان پر پیشانی رگڑنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی وجہ سے اگر جنونِ ارادت کے دیوانے، غایت عقیدت سے اپنے مُرشد کے بیت المعمور کو خانۂ خدا سمجھنے لگیں اور اُسے اپنا قبلہ و کعبہ تصور کریں تو کفر لازم نہیں آتا اور شراب محبت کی بے خودی میں یہ لوگ اپنے مرشد کے سنگِ آستاں کو نشۂ الفت کے غلبہ میں بُت سے تعبیر کریں اور اسے اپنا شاہد و معشوق قرار دیں تو بے ادبی کے مرتکب نہیں ہوں گے، عشق کی اصطلاحات بسیار ہیں اور عاشق بیچارہ معذور و بے اختیار! (آہ نمبر ۸۱)

ان بیانات کے علاوہ خود دردؔ کی زندگی بھی ان تعلیمات کا عملی نمونہ ہے۔ انہیں اپنے مُرشد اور والد (جنہیں وہ قبلۂ کونین سمجھتے تھے)

سے کس درجہ عقیدت اور محبت تھی اس کا اندازہ آسان نہیں۔ خواجہ ناصر عندلیب سے اس رشتۂ محبت کو درد اپنی زندگی کا اصل سرمایہ تصور کرتے تھے اور اپنے اعمال یا روحانی مرتبے کے بجائے شیخ سے اس نسبت کو وہ اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے ''یک در گیرو محکم گیر'' کے اصول پر پوری زندگی سختی سے عمل کیا۔ یہاں تک کہ دوسرے بزرگوں کی جانب التفات بھی شیخ سے رشتۂ الفت کے منافی تھا۔ ایک جگہ تو انہوں نے یہاں تک لکھا کہ شاہ زبیر اور شیخ سعد اللہ گلشن سے ان کی عقیدت بھی قبلۂ کونین ہی کے سبب ہے کہ خواجہ ناصر عندلیب کو ان حضرات سے ارادت اور نسبت تھی۔ ورنہ تو بندہ محض اپنے حضرت کے آستانے کا غلام ہے۔ (آہ نمبر ۲۵۶)

بقاباللہ:

درد کے فکری نظام میں ''بقاباللہ'' کا تصور بھی خاصا اہم ہے۔ راہِ سلوک کا یہ وہ مقام ہے، جہاں سالک دوام و ہمیشگی کی صفت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ معشوق حقیقی کی محبت کا غلبہ عاشق کو خود اپنی ہستی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنی خواہش اور ارادے تک سے دست بردار ہو کر، اپنی ذات کو راہِ محبت میں قربان کر دیتا ہے۔ نہ اس کی اپنی کوئی ہستی باقی رہتی ہے نہ اپنی کوئی خواہش۔ گویا وہ اپنی خودی کو خدا کی محبت میں فنا کر دیتا اور بقاباللہ کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ معرفت کی بنیاد اس امر پر ہے کہ سالک اپنی خودی کو مشاہدۂ حق کے جلوے میں گم کر دے، خدا کی تجلیات کا جلوہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔

میر درد نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے شمع محفل میں لکھا ہے کہ:

''نہالِ باطن کی ترقی حالِ ظاہر کے تنزل کے بغیر ممکن نہیں، پندارِ خودی کے زنگ کو آئینۂ دل سے صاف کیے بغیر خدا کا جلوہ دشوار ہے۔ یعنی نفسانیت کے زنگ کی شکست، عروج الی اللہ کے پر پرواز کو درست کرتا ہے اور فنافی اللہ کی کیفیت سے، بقاباللہ کی دولت میسر آتی ہے۔

چوں خاطرِ من ترقیِ باطن جست پندارِ خودی، زدل بروں کرد نخست
یعنی زشکستِ خویش ایں جاے درد! چوں رنگ نمودم، پر پرواز درست

(نور نمبر: ۱۰۱)

(ترجمہ: جب میرے دل کو باطنی ترقیات کی تلاش ہوئی تو پہلے خودی کا پندار اُس نے دل سے باہر کیا۔ یعنی اے درد! شکست ذات کے ذریعہ میں نے رنگ کے مانند پر پرواز کو درست کیا۔)

توجہ الی اللہ کے دوام سے، سالک کو غنا حاصل ہوتا ہے۔

درد از خویش می رود اکنوں مگر آئی و رفتنش نہ دہی

(ترجمہ: درد اب اپنے آپ سے رخصت ہوتا ہے۔ شاید اب تو آئے اور پھر اُسے واپس نہ جانے دے)

نفس اور دل کی باہمی آویزش میں ''فنافی اللہ'' اور ''بقاباللہ'' کا راز مضمر ہے۔ نفس کے مرنے سے دل زندہ ہوتا ہے۔ ایک کی موت ہی دوسرے کی حیات ہے، اس لئے جہاں تک ہو سکے ہوائے نفسانی کو مارنا چاہیے تا کہ احیائے قلب کی دولت ہاتھ آئے۔ پورے طور پر فنافی اللہ ہونا، بقاباللہ کا زینہ ہے۔ سالک کے فنائے حقیقی کے متعلق درد نے لکھا ہے کہ: اللہ کی صفات سلبیہ کو معشوقِ حقیقی کے کمر و دہن کے مانند سمجھنا چاہیے، سالک جب ان صفات کے مرتبے میں باطنی سیر کرتا ہے تو اُسے حقیقی فنا حاصل ہوتی ہے۔ اس منزل میں خود اس کی ذات زائل ہو جاتی ہے اور ''لاغیر'' کا اثر شروع ہو جاتا ہے۔

ازیاد آں کمر خودیم درمیاں نہ ماند باب عدم کشادہ بہ دل آں دہن مرا

(آہ نمبر ۲۲)

(ترجمہ: اس کمر کی یاد کے سبب ہماری ہستی درمیاں میں باقی نہ رہی اور اس دہن نے میرے دل میں باب عدم کھول دیا)

البتہ بقاباللہ کے اس بلند مرتبے تک رسائی چنداں آسان نہیں، اس کی دشواریوں کا کسی قدر اندازہ درد کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ:

''ہائے افسوس! فنائے نفس کے باوجود میں ہوائے نفس سے مکمل طور پر پاک نہ ہو سکا، بشریت کے علائق اب بھی ساتھ ہیں۔ دنیوی افکار سے دل گو خالی ہو چکا ہے لیکن اپنی طرف سے دل اب بھی آزاد نہیں۔ اب بھی خاتمہ بالخیر کی آرزو میں گرفتار ہوں۔ اپنی خودی سے آزاد ہو چکا ہوں، لیکن دل کی آرزوئیں اب بھی زندہ ہیں۔

ہم چونی خالیم از خویش ہنوز خلش نالہ کشیدن باقیست

(نالہ نمبر ۲۱۷)

(ترجمہ: میں اپنے آپ سے دست بردار ہو چکا ہوں لیکن اب بھی نالہ کشی کی خلش باقی ہے)

توحید مطلق:

درد کا ایک بڑا فکری کارنامہ، توحید مطلق کا تصور ہے خالق کی ذات اور مخلوق سے اس کے تعلق کی نوعیت پر اکابر صوفیا کے درمیان خاصا اختلاف رہا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کا تصور وحدت الوجود (توحید وجودی) اور حضرت مجدد الف ثانی کا نظریہ وحدت الشہود (توحید شہودی) عرصہ تک صوفیا کی بحث و تمحیص کا موضوع رہا۔ اور یہ خیال عام ہوا کہ واجب الوجود کے متعلق یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان میں سے ایک یقیناً ضلالت و گمراہی ہے۔ درد نے علما کے درمیان اس عام غلط فہمی کا ازالہ کیا اور ان دونوں تصورات میں تطبیق کی صورت نکال کر، باہمی انتشار و اختلاف کی فضا کو ختم کرنے کی مستحسن کوشش کی۔

مذکورہ دونوں عقائد، میر درد کے عہد تک، معاصر صوفیا اور علما کے درمیان، ایمان کا بنیادی مسئلہ بن چکے تھے اور ایمان ان دونوں عقائد میں کسی ایک کے ترک و اختیار سے متعلق سمجھا جانے لگا تھا۔

محی الدین ابن عربی نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''فتوحات مکیہ'' میں اپنے نظریۂ وحدت الوجود پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وجودِ حقیقی جس نے اشیا (ممکنات) کو پیدا کیا ان اشیا کا اصل جوہر بھی ہے۔ اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان ''جوہر'' کا اتحاد ہے۔ اور اپنی آخری بنیادوں میں واجب اور ممکن، خالق و مخلوق، ایک دوسرے کے ''عین'' ہیں۔ ان میں غیریت یا دوئی نہیں۔ حق اور خلق میں عینیت کی نسبت ہے۔ محی الدین ابن عربی کے اس نظریہ کی بنیاد گرچہ صوفیانہ وجدان اور کشف والہام پر تھی، لیکن خالق و مخلوق کے درمیان ''عینیت'' کی دلیل یہ تھی کہ اشیا درحقیقت صفاتِ خداوندی کی تجلیات ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات میں چونکہ عینیت کی نسبت ہے، اس لئے اشیا بھی عین ذات ہیں۔ اس سے علاحدہ نہیں!

شیخ اکبر کا یہ نظریہ آگے چل کر متعدد فروعی مباحث اور باہمی اختلاف کا سبب ہوا۔ اور بہت سے کم سواد اور نام نہاد صوفیا نے وحدت الوجود کے نام پر احکام شرعیہ کی پابندی سے خود کو آزاد کر لیا۔ اور اپنی پوری توجہ لاحاصل جزوی مباحث پر مرکوز کر دی۔ بے عملی اور اسلامی احکامات سے اس بے پروائی کے پیش نظر وحدت الوجود کے فلسفہ کی مخالفت شروع ہوئی اور شیخ مجدد الف ثانی نے خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی اس نوعیت کو باقاعدہ طور پر نہ تنقید کا ہدف بنایا بلکہ اس کے بالمقابل ایک دوسرا نظریہ ''وحدت الشہود'' کا پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ ان کا نظریہ اسلامی تصوف اور شریعت کے عین مطابق ہے۔ جبکہ وحدت الوجود کا فلسفہ، اسلام سے دور کرنے والا، شریعت کے منافی اور مسلمانوں میں بے عملی کا سبب ہے۔

شیخ مجدد کا یہ خیال تھا کہ وحدت الوجود کا تصور راہِ سلوک کا ابتدائی مقام ہے انتہائی منزل نہیں، ان کا موقف تھا کہ وجود کا شہودی نظریہ اصل حقیقت کے عرفان کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سالک گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جن میں ایک یہ بھی ہے کہ سالک کو واجب الوجود اور ممکنات میں یعنی خالق و مخلوقات میں عینیت کی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ جب سالک راہ سلوک میں اس مقام پر بس کرتا ہے تو خود فراموشی کے عالم میں اسی مقام کو اصل منزل تصور کر لیتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے عبد و معبود کے عینیت کے دھوکے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

شیخ مجدد نے صوفیانہ وجدان سے اپنے نظریہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ نظریہ وحدت الشہود کے تین مدارج ہیں۔

ابتدائی درجے میں سالک پر وحدت الوجود کی کیفیت کا انکشاف ہوتا ہے جہاں اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اشیا اور ان کے خالق کے درمیان عینیت کی نسبت ہے یہ ''وجودیت'' کا مرتبہ ہے۔

دوسرے درجہ میں حق اور خلق کے علیحدہ وجود کا انکشاف ہوتا ہے اس طور پر کہ عالم حق کا عکس، پرتو یا سایہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس منزل میں حق و خلق کی دوئی کا یقین تو نہیں ہوتا، یہاں غیریت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اسے ''مرتبۂ ظلیت'' کہتے ہیں۔

اس راہ کی تیسری اور آخری منزل، ''مقام عبدیت'' ہے، جہاں یہ احساس، یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سالک کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو جاتی ہے کہ خدا معبود ہے اور انسان اُس کا عبد۔ حق اور خلق میں عینیت کا امکان بھی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے غیر ہیں۔

وحدت الشہود کے نظریہ کی بنیاد اس بات پر تھی کہ خدا کی صفات عین ذات نہیں بلکہ ذات کا غیر ہیں۔ خدا اپنی ذات کے لئے صفات کا

محتاج نہیں۔ نیز یہ کہ عالم صفات کی تجلیات نہیں بلکہ صفات کا سایہ اور اس کا عکس ہیں۔ جب کہ وحدت الوجود کا تصور ذات اور صفات کی غیبت کے تصور سے وابستہ ہے۔

اس طرح شیخ مجدد نے وحدت الوجود کو اصل حقیقت تک رسائی کی ابتدائی منزل قرار دے کر اپنے نظریہ وحدت الشہود کی تعلیم عام کی۔ اور مسلمانوں کو تصوف کے نام پر بے عملی، تعطل اور شریعت کے اوامر و نواہی سے بے نیازی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی کوشش کی۔

خواجہ میر درد نے ''توحید محمدی'' یا ''توحید مطلق'' کا نظریہ پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کے فروعی مسائل، ملت میں باہمی انتشار و اختلاف کا سبب ہیں۔ اور اس کے زوال کا پیش خیمہ۔

درد نے توحید محمدی کے تصور میں اس بات پر زور دیا کہ اگر بہ نظر تحقیق دیکھا جائے تو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات ایک ہی حقیقت تک لے جاتے ہیں۔ یعنی قلب کو ماسوی اللہ سے آزاد کرنا۔ یہی تمام سیر و سلوک کا حاصل ہے۔ اور یہی حقیقی تصوف ہے۔

درد نے توحیدی محمدی کا تصور پیش کر کے ان دونوں نظریات کے ماننے والوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ توحید محمدی، قرآنی آیات اور احادیث پر تکیہ کرتی ہے۔ وجود و شہود کی فروعی، اختلافی بحثوں سے صرف نظر کرتی ہے جب انسان کو توحید محمدی کی دولت حاصل ہوتی ہے تو وجود شہود کے مسائل بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ درد کا تصور توحید ان دونوں نظریات کا جامع ہے۔

درد کا خیال تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں توحید کا تصور وجود و شہود کی قیدوں سے آزاد تھا۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں نہ تھیں۔ یہ بحثیں بعد کی اختراعات ہیں۔ توحید محمدی ان جزئیات کا اعتبار نہیں کرتی اور نہ ہی انہیں بحث کا موضوع بناتی ہے۔ انتشار و اختلاف کے دور میں، درد کا تصور توحید، باہمی اتحاد کا ایک ایسا جامع نظام پیش کرتا ہے جہاں قرآن و سنت کی تعلیمات پر زور دیا جاتا ہے اور احکام شریعت کی پابندی کو نجات کا واحد وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ درد اور ان کے والد و مرشد خواجہ ناصر عندلیب نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ طریقۂ محمدیہ قرآن و سنت کی مکمل پیروی کے سوا کچھ اور نہیں، خوب و ناخوب کا معیار اسلامی اوامر و نواہی ہیں۔

خدا کی ذات اور وجود مطلق کے ادراک کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درد نے جا بجا لکھا ہے کہ موجودات عالم کے تمام پھولوں میں دراصل وجود مطلق کی بہار جلوہ گر ہے اور ''ما و من'' کے گلشن میں اُسی ذات کی تجلی کار فرما ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ اس معنی بے رنگ کو جو اپنی ذات میں تمام نسبتوں اور اعتبارات سے پاک و بے نیاز ہے، نسبتوں سے علاحدہ کر کے، ذات محض کے درجے میں بھلا کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے؟ اس بے کیف ذات تک، اسماء و صفات کے وسیلوں کے بغیر بھلا کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے؟ وحدت و کثرت کی نیرنگی کا طلسم دراصل اس کی ذات سے ہے۔ اور عالم غیب و شہادت کا وجود بھی اسی سے ہے۔

گو جلوہ فروش جا بجائی ۔۔۔ ایں عقدۂ دلی نمی کشائی
خود را تو بہ من نمائی ۔۔۔ ہر جا کہ منم تو در نیائی
جائے کہ توئی مرا گزر نیست

(نور نمبر ۳۴۷)

(ترجمہ: اگر چہ تو ہر جگہ جلوہ فروش ہے لیکن میرے دل کی اس گرہ کو تو نہیں کھولتا کہ خود کو مجھے تو بھلا کیسے دکھائے گا اور تیرا دیدار مجھے کیوں کر حاصل ہوگا کیونکہ جہاں کہیں ''میں'' موجود ہوں اور درمیان میں حائل ہوں وہاں تو نہیں آتا اور جہاں تو موجود ہے وہاں میرا گزر نہیں!)

درد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وحدتِ وجود کا اقرار کرنا ایک نوع کی بے ادبی ہے اور وحدت شہود کا اظہار ایک ناقابل قبول تقریر۔ سب سے پسندیدہ اور قابل قبول بیان '' لا الہ الا اللّٰہ '' ہے اور یہی سچا راستہ ہے۔ درد کا تصور توحید یعنی توحید محمدی، سالک کے لئے نسبتِ حضور کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور اس نسبت کو اس درجہ قوی تر کرنے پر اصرار کرتا ہے کہ سالک اس نسبت سے خود کو مشاہدۂ حق میں گم کر دے۔ حق کے شہود و حضور میں خود کو اس درجہ مستغرق کر دے کہ اسے اپنی آگاہی کا ادراک بھی باقی نہ رہے۔ مشاہدہ حق میں اس کا قلب یہاں تک فنا ہو جائے کہ تمام ماسوئی اس کے دل سے محو ہو جائیں حتیٰ کہ اسے خود اپنی خبر بھی نہ ہو۔ اس منزل پر فنائے کامل کا عجب باب کھل جاتا ہے کہ اس کے باطن میں نہ کسی خطرہ کا خار کھٹکتا

ہے اور نہ ہی وہ اپنی ہستی سے باخبر ہوتا ہے۔

وطن درسفر:

سلسلۂ نقش بندیہ میں بھی سلوک کی بعض مخصوص اصطلاحات مروّج ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لئے بعض افکار و اعمال کی پابندی سالک کے لئے ضروری ہے۔ جیسے ''ہوش دردم'' اور ''نظر برقدم'' وغیرہ۔ ''سفر درِ وطن'' کی بھی سلسلۂ نقشبندیہ کی ایک معروف اصطلاح ہے لیکن درد نے ''سفر در وطن'' کی معروف اصطلاح کے مقابلہ میں ''وطن درسفر'' کی نئی اصطلاح ایجاد کی اور اسے طریقۂ محمدیہ کی خصوصیات میں شمار کیا ہے ''سفر در وطن'' کا تصور یہ ہے کہ سالک بشری خصائل اور مذموم انسانی صفات کو ترک کر کے اطاعت و فرمابرداری کی محمود ملکوتی صفات حاصل کرتا ہے۔ اس کا یہ سفر چونکہ خود اپنے باطن میں ہوتا ہے اس لئے وطن میں سفر کی کیفیت کے مشابہ ہے اس میں سالک وجود کے حجابات سے گزرتا ہوا بالآخر خدا تک پہنچتا ہے۔ گویا یہ روحانی سیر الی اللہ ہے۔

لیکن ''وطن درسفر'' جسے درد طریقۂ محمدیہ کا اختصاص کہتے ہیں'' سفر در وطن'' کی عام اصطلاح کے بعد کی منزل ہے، اس مخصوص اصطلاح کی تشریح خود درد کی الفاظ میں یہ ہے کہ:

''سفر در وطن'' جو سالک کے ''سیر انفسی'' سے عبارت ہے اور جو سیر الی اللہ کی صورت میں پیش آتا ہے یہ سلسلۂ نقش بندیہ کے خواجگان کی قدیم اصطلاح ہے اور ''وطن درسفر'' ایسے مقام کا اشارہ ہے جو انفس و آفاق سے ''ورا'' ہے اور ''سیر من اللہ'' سے ''سیر فی اللہ'' کے مرتبے میں پیش آتا ہے۔ یہ ایک جدید اصطلاح ہے جو اس فقیر سے مختص ہے اور اصحاب طریقۂ محمدیہ کا راستہ ہے۔

صوفیاں در وطن سفر بکنند ۔۔۔ درد اندر سفر، مرا وطن ست

(درد نمبر ۵۹)

(ترجمہ: صوفیا سفر در وطن کرتے ہیں، اے درد! میرے لئے سفر میں وطن ہے یعنی ''وطن درسفر'' میری خصوصیت ہے)

''سفر در وطن''، یعنی سیر الی اللہ کے مرتبے کا حصول بے نفسی اور فروتنی کے بغیر ممکن نہیں۔ ''سفر در وطن'' کی دولت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ عاجزی اور انکساری کا میدان سر کر لیتا ہے، اس کے لئے فقیرانہ زندگی، افتادگی اور خاک نشینی اختیار کرنا چاہیے۔

در وادیٔ افتادگی و خاک نشینی ۔۔۔ جز سایۂ ما کیست کہ ہمراہ بگیریم

(ترجمہ: افتادگی و خاک نشینی کی وادی میں، میرے سایہ کے سوا دوسرا اور کون ہے جسے میں اپنا ہم سفر بناؤں)

وطن اور سفر کی یہ اصطلاحات درد نے اپنے فارسی، اردو اشعار میں کثرت سے استعمال کی ہیں۔ اور بیشتر ان الفاظ کے لغوی معنی کے بجائے ان کی صوفیانہ تعبیروں سے کام لیا ہے۔

ہستی ہے سفر عدم وطن ہے ۔۔۔ دل خلوت و چشم انجمن ہے
آپ سے ہم گزر گئے کب کے ۔۔۔ کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
مانند فلک دل متوطن ہے سفر کا ۔۔۔ معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا
از گردش زمانہ نیا سودہ ام کہ ہست ۔۔۔ مثل فلک مدام سفر در وطن مرا

(ترجمہ: زمانہ کی گردش سے میں آسودہ نہ ہو سکا کیونکہ آسماں کی مانند مجھے ہمیشہ ''سفر در وطن'' کی کیفیت درپیش ہے)۔

خلوت درانجمن:

''وطن درسفر'' اور ''سفر در وطن'' کی کیفیات سے کسی قدر قریب تر کیفیت ''خلوت در انجمن'' کی ہے یہ بھی طریقۂ نقش بندیہ کی خاص اصطلاح ہے۔ درد نے ان دونوں کیفیات کا ذکر اکثر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ دل کو محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ بنانا اور ماسویٰ سے اُسے آزاد کر لینا، سیر وسلوک کی شرط اولین ہے۔ سالک معشوق حقیقی کے حضور و شہود میں خود کو اس درجہ فنا کر لیتا ہے کہ بہ ظاہر انجمن میں ہونے یعنی غیر اللہ کے درمیان موجود ہونے کے باوجود، دل کو ان میں مشغول نہیں کرتا بلکہ اس کا دل انجمن سے اس درجہ فارغ ہوتا ہے کہ اسے خلوت کی لذتیں میسر ہوتی ہیں جو وصال محبوب کی بنیادی شرط ہے۔ یہ بھی فنا فی اللہ کی ایک صورت ہے۔ اس کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے ''نالۂ درد'' میں لکھتے ہیں:

''خلوت درانجمن''، ہمارے نقش بندیہ طریقہ کی ایک کیفیت ہے اور ''سفر در وطن'' بھی اسی سلسلہ کے لوگوں کی ایک واردات ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگوں کو یہ دولت میسر ہوتی ہے کہ کثرت کی عین انجمن میں وہ وحدت کے خلوت خانہ میں باریاب ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ حضرات گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالتے لیکن فنا فی اللہ کا سفر ہر لحظہ طے کرتے رہتے ہیں۔ انجمن عالم ایسے ہی روشن ضمیروں سے روشن ہے

اور ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں کے جسم کا فانوس، اس انجمن ہستی کی رونق کا اصل سبب ہے"۔

(نالہ نمبر ۸۹)

"خلوت درانجمن" اور "سفر در وطن" کی کیفیات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"عارف باللہ جو مردِ آگاہ ہے سیر و سلوک کی تمام منزلیں اپنی ہستی میں طے کرتا ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ کی تمام تجلیات اپنے باطن میں دیکھتا ہے کیونکہ خود اس کی حقیقت، تمام پوشیدہ حقیقتوں پر حاوی ہے اور جامع شخصیت مجمع کمالات ہوتی ہے چونکہ وہ سر سے پیر تک توحید کے سمندر میں غرق ہوتا ہے اس لئے آئینہ کے مانند وہ ہمہ تن چشم بینا بن جاتا ہے۔ "خلوت درانجمن" کا معاملہ، اس کے ظاہر و باطن سے ظاہر ہوتا ہے اور "سفر در وطن" کا مسلک اس کے طریقے سے نمایاں ہوتا ہے"۔

(نالہ نمبر ۲۴۵)

دردؔ نے اپنے اشعار میں "خلوت درانجمن" کی اس صوفیانہ کیفیت اور اس کی لذتوں کو شعری روایت سے ہم آہنگ کرکے نہایت فنکاری سے بیان کیا ہے۔

عین کثرت میں دید وحدت ہے — قید میں درد، بافراغ ہوں میں
فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی — خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے
عالم آب میں جو آئینہ ڈوبا ہی رہا — تو بھی دامن نہ کیا دردؔ نے تر پانی میں
خلق میں ہیں پر جدا سب خلق سے رہتے ہیں ہم
تال کی گنتی سے باہر جس طرح رو بیک میں سم

عقل محض:

درد کے صوفیانہ نظام میں عقل کا انکار تو نہیں، لیکن اس امر پر اصرار ضرور ہے کہ حقیقت کا عرفان، عقل و شعور کے بجائے عشق اور وجدان کے ذریعہ ممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے عشق کے مقابلہ میں زاہدی دملاّئی کو ہمیشہ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ عقل محض دردؔ کے نزدیک عیاری کا دوسرا نام ہے۔ فراغ دل اور تسکین قلب کے لئے یک گونہ توازن اور اعتدال ضروری ہے۔ زیادہ دور اندیشی انسانوں کو دیوانگی سے قریب تر کر دیتی ہے۔ جس طرح عقل کی کوتاہی اسے خوابوں اور آرزوؤں کا اسیر بناتی ہے۔ کور باطنی علم غیب کے عجائبات کا پردہ ہے۔

حقیقت کا ادراک دل کی بینائی سے ممکن ہے، درد کا موقف یہ تھا کہ شعور کی آنکھوں میں جب تک کسی قدر الٰہی کا سرمہ نہ ہوگا، نور ایمانی کا جمال پورے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ جس طرح حماقت کی زیادتی دل پر پردہ ڈال دیتی ہے اسی طرح شعور کی زیادتی بھی چشم باطن کو خیرہ کر دیتی ہے۔ نور و ظلمت دونوں کی زیادتی حقیقت کا حجاب ہے۔ خدا نور اور ظلمت کے ستر ہزار پردوں میں پنہاں ہے۔ انسان کو نہ تو اس قدر احمق ہونا چاہیے کہ جانوروں کی مانند محض امور محسوسہ کا ادراک کرے اور نہ ایسا عاقل محض کہ خود ساختہ نظریات کا اسیر ہو کر رہ جائے۔ دانائی، شعور اور عقل کے ساتھ ساتھ، نادانی، اتباع اور نقل کو بھی ہم آمیز کرنا چاہیے۔ آئینہ کے لئے محض شیشہ کی صفائی کافی نہیں، بلکہ اس شیشہ کی پشت پر کدورت کی قلعی بھی ناگزیر ہے۔

تا الٰہی امدادِ شعورت نہ کنند — از دیدۂ دل حجاب دورت نہ کنند
آئینہ دوچار با تجلی نہ شود — پشتی صفا اگر کدورت نہ کنند

(نور نمبر ۱۴۵)

(ترجمہ: الٰہی اگر شعور کی مدد نہ کرے تو تیرے دل کا حجاب دور نہ ہوگا۔ آئینہ اس وقت تک تجلی سے دوچار نہیں ہوتا جب تک شیشہ کی پشت پر کدورت کی قلعی نہ ہو۔)

حقائق اشیا کے ادراک میں، عقل و دانش کے بجائے دردؔ صوفیانہ وجدان اور جذبۂ عشق پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں اور کائنات کو انہی حوالوں سے دیکھتے ہیں۔

اے عقل بے حقیقت او یکھا شعور تیرا — باہر نہ آ سکی تو قید خودی سے اپنی
دوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جا سکے — یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے — بند احکام عقل میں رہنا
خیر تجھے جو چاہیے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑ
ہم نے جہاں کی سیر کی روزن خلق ہوش ہے

دردؔ کا خیال تھا کہ حتی الوسع، نہایت احمق شخص کی ہم نشینی سے بچنا چاہیے لیکن ساتھ ہی عاقل عیار کی صحبت سے بھی پرہیز لازم ہے، وہ نافہم کسی چیز کے حسن و قبح کو نہیں دیکھتا، اور یہ پُر وہم محض شکوک و شبہات کے خزف ریزے چنتا رہتا ہے۔

❁❁❁

باب دوم
اقدار تصوف

صوفیہ اور انسانی اقدار

اسرار اکبر آبادی .... اشوک پارک، شہید نگر، آگرہ

بے پایاں کائنات میں سب سے اعلیٰ اور اہم "حیات انسانی" ہے۔ مخلوق نور سے خالق مطلق نے عالم جبروت، عالم ارواح، عالم مثال، عالم اجسام اور عالم انسان تخلیق فرمائے ہیں۔ ان تمام عالموں کے جزو اعلیٰ "حیات انسانی" میں شامل ہیں۔ اسی خوبی کے سبب حیات انسانی کی عظمت و افادیت دیگر مخلوقات سے زیادہ اور اہم ہے۔ اسی سبب خالق مطلق نے فرشتوں تک کو "حیات انسانی" کی عظمت و افادیت کے اقرار اور اظہار کے لئے اسے سجدے کا حکم دیا تھا۔ اگر حیات انسانی کی وسعت، پائیداری اور حقیقت پر غور وفکر کریں تو معلوم ہوگا کہ ساری کائنات، حیات انسانی سے قائم ہے اور حیات انسانی اللہ سے قائم ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے علی کرم اللہ وجہہ کا قول پیش کیا جاتا ہے۔ ترجمہ (از۔ نہج البلاغہ)

........."اللہ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے، لیکن وہ کسی چیز میں نہیں ہے۔ نیز کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ کسی چیز کے اندر نہیں ہے۔ لیکن کوئی چیز اس سے خالی بھی نہیں ہے۔ وہ ہر قسم کی کیفیت و حالت اور ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل سے پاک اور منزہ ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں ایک محدود، مخصوص اور صاحب ماہیت وجود کے اوصاف ہیں۔ وہ (اللہ) ہر چیز کے ساتھ ہے، لیکن بطور ہمسر نہیں ہے۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے، لیکن اُس سے کنارا کشی نہیں ہے......... وہ (اللہ) مخلوق میں حلول نہیں کر گیا ہے۔ کیونکہ حلول ہونا حلول کرنے والے کی محدودیت اور اس کی گنجائش پا جانے کا باعث ہے اس کے باوجود وہ کسی چیز سے باہر بھی نہیں ہے کیونکہ باہر ہونا بھی بذات خود ایک قسم کی محدودیت ہے۔ وہ سب چیزوں سے اس لئے علیحدہ ہے کہ وہ سب چیزوں پر چھایا ہوا ہے اور ان پر اقتدار رکھتا ہے، اور تمام چیزیں اس لئے اس سے جدا ہیں کہ وہ اس کے سامنے "جھکی ہوئی" ہیں۔ چیزوں سے خدا کی مغایرت اور جدائی اس لئے ہے، کیونکہ وہ اُن پر قادر و قاہر اور مسلط ہے اور ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی قاہر خود مقہور ہو، کوئی قادر ہو خود مقدور اور کوئی مسلط خود مسخر ہو، نیز چیزوں کی اس سے مغایرت اور جدائی اس لحاظ سے ہے کہ اشیا اس کی کبریائی کے آگے مطیع اور سر تسلیم خم کی ہوئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز خود مطیع و مسخر (یعنی جو اطاعت و تسلیم کا پیکر ہو) وہ ہرگز اُس ذات کے ساتھ ایک نہیں ہو سکتی جو بذات خود بے نیاز ہو۔

خالق مطلق "بے نیاز" ہے اور کائنات جس میں حیاتِ انسانی بھی ہے، وہ "نیاز مند" ہے...... "**اللہ جمیل و یحب الجمال**"۔ یعنی اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے اس کی مخلوق، جس میں حیات انسانی بھی ہے، حسین ہے اور حسن کو پسند کرتی ہے۔ حُسن میں اخلاق حمیدہ و جمیلہ اور صحیح عقائد و نظریات بھی شامل ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات انسانی میں کبھی کم اور کبھی زیادہ لوگ شر پسند، بد اخلاق اور تخریب کرنے والے کیوں ہو جاتے ہیں؟ مختصر جواب ہے کہ اپنے خالق کا حکم نہیں ماننے کی وجہ سے وہ بد ہو جاتے ہیں۔ حکم وہ زمین پر "صاحبِ اختیار" ہونے کی وجہ سے نہیں مانتے ہیں۔ کلام پاک میں ہے کہ خالق نے اپنے بندوں کو زمین پر صاحب اختیار بنایا ہے۔ حیات انسانی میں بد لوگوں کے اختیار کا رشتہ "اپنے آپ کو نہیں جاننے اور سمجھنے" کی وجہ سے خالق مطلق سے منقطع ہو جاتا ہے وہ اپنے محدود اور بے جا نفس کی بے جا خواہشات کی تکمیل میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ خالق کو بھول جاتے ہیں۔ کچھ لوگ یاد رکھتے ہیں۔ تو خالق کے احکام بھول جاتے ہیں اور اس سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہیں۔ صاحب حاجت ہیں، نیاز مند ہیں، فانی ہیں، بعد فنا بقا ہے۔ پر سکون اور بد سکون بقا کا انحصار ان کی دنیاوی زندگی کے اچھے اور برے اعمال پر ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے اطراف کی فضا میں گرم ہوا سے بنی اور نظر نہیں آنے والی مخلوق میں نا فرمانی کرنے والا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اُن کا رشتہ خالق مطلق سے کمزور کرتا رہتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ

بھول جاتے ہیں کہ وہ جتنی اپنی حقیقت یا اپنے موضوع سے ہٹیں گے، اتنی ان کی اور دنیا کی بربادی، تباہی اور تخریب ہوگی۔ دنیا پر ہلاکت چھا جائے گی۔ دوسرے جاندار اُن پر لعنت بھیجیں گے۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ بے جا محدود نفس اور گرم ہوا سے بنی مخلوق کا نافرمان گروہ (شیاطین) کے بد اثرات سے ان کی اچھی اور نیک صفات جب معدوم ہوجاتی ہیں تو ہلاکت کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم ہے کہ وہ دو نسبتوں کا مجموعہ ہیں۔ ایک نسبت تمام مادے سے تعلق رکھتی ہے، جو جسم سے متعلق ہے۔ دوسری نسبت، روح سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر کوئی صرف جسم کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہوجائے تو روح، جسم کے تابع ہوجاتی ہے۔ جسم کے تقاضے، روح سے پورے ہوسکتے ہیں، لیکن روح کے تقاضے، جسم سے پورے نہیں ہوسکتے ہیں۔ روح کے تقاضے، خالق مطلق کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے پورے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث صوفیائے کرام کی تربیت سے پورے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث علمائے عظام کے علم سے پورے ہوتے ہیں۔

صوفیائے کرام کی شخصیت میں ''عالم لامکاں'' کا جز زیادہ ہوتا ہے۔ اسی سبب صوفیائے کرام کا رجحان ''روحانیت'' اور ''نورانیت'' کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام عبادت، ریاضت، مجاہدہ، غور وفکر، ورد، وظائف، کشف وغیرہ کے ذریعہ پہلے ''زمین کی روحانیت'' تک پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد ان پر آسمانوں کی ''روحانیت'' اور ''نورانیت'' کھلتی ہے، کیونکہ خدا نور ہے اور ''خالق نور مخلوق'' ہے۔ جب یہ مشاہدہ صوفیائے کرام کو ہوجاتا ہے تو اس کو وہ ''آخری حقیقت'' یا ''وجود مطلق'' یا ''کل'' قرار دیتے ہیں۔ ''کل'' میں خدا، کائنات اور حیات انسانی سب شامل ہیں۔

صوفیائے کرام کی شخصیت میں جس طرح ''عالم لامکاں'' کا جزو زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح علمائے عظام کی شخصیت میں ''عالم ظاہر'' یا ''عالم آشکار'' کا جز وزیادہ ہوتا ہے۔ علما ''آخری حقیقت'' یا ''کل'' تک عقلی دلائل کے ذریعہ پہنچتے ہیں۔ دونوں یعنی صوفیا اور علما کی رہنمائی قرآن پاک اور احادیث سے ہوتی ہے۔ اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا ہے کہ ''ایک مجلس میں مشہور عالم اور فلسفی بوعلی سینا اور صاحب کشف معروف صوفی ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے۔ بوعلی سینا نے زندگی کے بعض حقائق اپنی عقل سے اور عقلی دلائل سے ثابت کیے۔ انہیں سن کر شیخ ابوسعید ابوالخیر نے فرمایا کہ...... ''بوعلی سینا جو حقائق اپنی عقل سے ثابت کررہے ہیں، میں ان کو 'اپنی آنکھوں' سے دیکھ رہا ہوں''...... اسی لئے قول صادق ہے کہ ''صوفی کا عالم ہونا ضروری ہے، لیکن عالم کا صوفی ہونا ضروری نہیں ہے۔'' اس کی روشن اور خاص مثال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ہے۔

صوفیائے کرام کی تین نشانیاں خاص ہیں۔ اول، صوفیا کا خیال ہمیشہ خدا کے حضور میں ہوتا ہے۔ دوم، صوفیا کا رہن سہن خدا کے ساتھ یعنی خدا کے حکم اور مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ سوم، صوفیا کا کاروبار بھی خدا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ خدا سے عشق ہے تو خدا کی مخلوق سے بھی عشق ہے۔ مخلوق سے عشق ہے تو خدا سے عشق ہے، کیونکہ مخلوق خدا ہی کا وصفی اور صفاتی جلوہ ہے۔ انسانیت نوازی، خدمتِ انسانیت، انسانیت کو حسین ترین اور پُر امن بنانا اور انسانیت کو زیادہ سے زیادہ قرب الٰہی حاصل کرانا صوفیائے کرام کا خاص مشن ہے۔ صوفیائے کرام حیاتِ انسانی کے درمیان پھیلی غیریت، نفرت، تباہی و بربادی، استحصال وغیرہ کو یہ بتا کر اور دکھا کر دور کرتے ہیں کہ جس طرح کائنات کا نور ایک ہے، اسی طرح حیاتِ انسانی کا نور بھی ایک ہے اور یہی نور آدم اور حوا کا وجود ہے۔ اسی لئے ہم سب ایک ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ حیاتِ انسانی کا چشمہ ابھی مسلسل جاری ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ .... ''اے بنی نوع انسان! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل دی ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کی نگاہ میں تم میں سے معزز ترین وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اللہ علیم وخبیر ہے۔'' (قرآن پاک)

صوفیائے کرام کا خاص وصف ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں آئے فرق اور غیریت کو اپنی تربیت سے ختم فرماتے ہیں۔ وہ لوگوں کی فکر اور اخلاق کے معیار کو بلند ترین کرتے ہیں۔ (یہاں بات اصل صوفیا کی ہورہی ہے) وہ انسان کو انسان کے سامنے پست اور کم تر ہونے سے روکتے ہیں۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ لوگوں کو تہذیب وشرافت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لوگوں کے اعمال کا تعلق اگر خالق

مطلق سے ہے تو اُن کا چھوٹے سے چھوٹا عمل آگ، پانی اور ہوا کی مخلوقات پر بھاری ہوتا ہے۔ خدا کا چنا اخلاق بندوں کا ہو، ان کی اپنی مرضی کی جگہ خدا کی مرضی ہو، اگر اپنے ارادوں کی جگہ خدا کا ارادہ سامنے ہو تو وہ ''خلافت'' کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور انجیل کی یہ دعا مستجاب ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ......... اے خدا! تیری حکومت زمین پر بھی ہو، جس طرح آسمانوں میں ہے۔''

آج کل'' حیاتِ انسانی'' کو تقریباً اسّی فیصد لوگ نہیں جانتے ہیں کہ موت کے بعد ان کی زندگی کے ساتھ جسمانی اور روحانی کیا معاملات پیش آنے والے ہیں؟ عالم برزخ میں ابدی آرام وسکون کیا ہوتا ہے؟ داخلۂ قبر سے قیامت تک زندگی کن مراحل اور منزلوں سے گزرتی ہے؟ بہت سے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ بعض ماہرین علم حیات انسانی نے ثابت کیا ہے کہ'' موت تمام جسم پر واقع نہیں ہوتی ہے۔ دماغ اور جسم کے بعض تہہ خانے اور حُجرے (Chambers) ایسے بھی ہیں، جن پر موت اپنا اثر نہیں رکھتی ہے۔'' اس انکشاف سے بھی ظاہر ہے کہ اہلِ قبور سلام کا جواب دیتے ہیں، لیکن زندہ لوگ سن نہیں سکتے ہیں۔ اس سے اہل قبور کو ثواب وعذاب کا احساس ہونا بھی ثابت ہے۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ'' جنگ کے بعد بدر کے کنوؤں میں سے قریش کے کافروں کی چوبیس لاشوں کو ایک گندے کنوئیں میں ڈلوانے کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن چوبیسوں کے نام لے کر مخاطب کیا اور عذاب کے بارے میں سوال کیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ایسی لاشوں سے بات کرتے ہیں، جن میں جان نہیں ہے'' یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' قسم اس کی، جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، میں جو باتیں کرتا ہوں، تم اُن باتوں کو ان سے (یعنی مردوں سے) زیادہ نہیں سنتے ہو۔ (یعنی مردوں کے برابر سنتے ہو) (بخاری شریف۔ جلد دوم)

قرآن پاک پارہ ۲۲۔ سورت ۳۵۔ آیت کا ترجمہ ہے کہ ......اللہ جس کو چاہتا ہے، سنوا دیتا ہے اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے ہیں جو قبروں میں (مدفون) ہیں''...... اس حالت سے صوفیائے کرام زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ جب غیر مسلم انتقال شدہ سن لیتے ہیں تو مسلم انتقال شدہ بھی سن لیتے ہیں، لیکن یہ سب اللہ کی مرضی اور حکمت پر منحصر ہے۔ ان تمام باتوں اور موت کے بعد زندگی کن مراحل، منزلوں اور حالتوں سے گزرتی ہے، ان سے صوفیائے کرام لوگوں کو، اپنے خاص انداز اور طریقے سے واقف کراتے ہیں۔ صوفیا کی یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ ایک گراں قدر درس ہے۔

صوفیائے کرام'' تزکیۂ نفس'' اور'' جہاد بالنفس'' کے ذریعہ لوگوں کی غفلت، قباحت، فسادکاریوں، انکارِ خدا اور مخالفتِ خدا کو ختم فرماتے ہیں۔ وہ ہوائے نفسانیہ اور اغراض شخصیہ کے زہر کو قلوب میں سے نکالتے ہیں۔ وہ روح حیوانی، روح طبعی اور روح نفسانی کو پاک صاف اور قوی بناتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے صوفیا کا ایک مکتب'' وجد'' کو ذریعہ بناتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری کا قول ہے کہ'' خدا کی معرفت ''وجد'' سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ بندہ جو خدا کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہی اس کی یاد میں سب سے زیادہ گم ہے۔ سماع ایسی چیز ہے، جس سے اللہ تعالیٰ دلوں کو برانگیختہ کرتا ہے۔ (یعنی پر جوش اور لطیف ترین بناتا ہے) اور اپنی طلب پیدا کرتا ہے۔ جو بندہ سماع کو تصور خدا کے ساتھ سنتا ہے، اس پر خدا کی راہیں کھلتی ہیں اور جو نفس کے ساتھ سنتا ہے، وہ زندیق ہو جاتا ہے۔'' حرام سماع اور حرام عیش وہی جو اللہ سے غافل کرتے ہیں۔ اعضا اور قوت کو سست و کاہل اور ناکارہ کرتے ہیں۔ فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے بے پرواہ کرتے ہیں اور اخلاق حسنہ کو ختم کر کے بد اخلاقی پیدا کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام دلوں میں'' عشق حقیقی'' کے سوکھے چشموں کو جاری کرتے ہیں۔'' عشق حقیقی'' کے اثر سے لوگوں کی طبیعتوں میں نرمی اور سوز وگداز پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں محبت، اخوت اور مساوات سے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔'' عشق حقیقی'' کا اثر رذائل سوز اور فضائل آموز بھی ہے۔

صوفیائے کرام کی خاص توجہ، اصلاح اور محنت چار طرح کے بدکردار لوگوں پر ہوتی ہے۔ اول، وہ غافل لوگ جو حق و باطل اور قبیح وجمیل کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے ہیں اور نفس بے جا کی اتباع اور پیروی کرتے ہوئے شہوت کے شدید اور آتشیں دریا میں کود پڑتے ہیں۔ دوم، وہ لوگ جو قبیح کام کی قباحت اور برائی کو جانتے ہوں، لیکن صالح اعمال کی طرف نہیں آتے ہوں۔ سوم، وہ جو برائی اور بد اخلاقی کو اچھا اور مستحسن سمجھتے ہوں۔

بقیہ صفحہ: ۱۰۵ پر

حضرت نظام الدین اولیاء اور شب و روز کے معمولات

حافظ نسیم اختر .... علی گڑھ

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایونی ثم دہلوی کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے نظام الاوقات یعنی آپ کی خانقاہ میں چاہے آپ تشریف رکھتے ہوں یا اپنی خانقاہ سے دور ہوں ہر چیز اپنے متعینہ وقت پر انجام پذیر ہوتی، پورا عملہ مقرر تھا جو اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے مامور ہوتا، معاصر تاریخ یا تذکروں کے مطالعہ میں کہیں آپ کو یہ پڑھنے میں نہیں ملے گا کہ سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین کے درست اور وقت کے تعین نہ ہونے کی وجہ سے فلاں امور میں خلل واقع ہوا، یہ چیز اس لئے بیان کی جارہی ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر عمل اور شب و روز کی ساری مشغولیات کا ذکر مصنفوں، مؤرخوں اور جامع ملفوظات نے کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ کے نظام الاوقات میں بھی جو چیز سب سے اہم ہے وہ وقت کی پابندی جس کا پیمانہ نہ کوئی آلہ تھا اور نہ گھڑی بلکہ سب کام نماز کے حساب سے انجام دیے جاتے اور نماز کے وقت کو ہی اہمیت دی جاتی۔ اس سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی خانقاہ میں نماز کا پورا اہتمام کیا جاتا اور اپنے متعینہ وقت پر ہی ادا کی جاتی جیسا کہ مولانا ماجد دریا آبادی آپ کے ملفوظات 'فوائد الفواد' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''جامع ملفوظات نے کتاب کے شروع میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ہر مجلس میں جب جب (امیر حسن سجزی) نے اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے تو وقت حاضری بھی بتاتے گئے ہیں لیکن وقت کے تعین کے بجائے گھڑی اور پل کے نماز کے حساب سے کرتے گئے ہیں یعنی قبل نماز یا بعد نماز۔ گویا نظام الدین اولیاء کے نظام اوقات کا محور یا مرکز جو کچھ تھا نماز ہی تھی۔ بعد کی مجلسوں میں اس تصریح کا التزام غالباً غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، لیکن ساری مجلسوں میں اتفاق سے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ بار بار اور کثرت سے جن چیزوں کا ذکر ملتا ہے وہ نماز اور روزہ ہیں اور نوافل وسنن اور قرآن اور تراویح اور پھر احترام شریعت واتباع سنت کی تاکیدیں۔''[1]

آپ کے اسی عمل کو، جن کا تعلق شریعت کے بنیادی امور سے ہے، انجام دینے کے لئے جو وقت مقرر کیا تھا اسی کو اس مضمون میں شامل کر کے واضح کیا جارہا ہے کہ کون سا عمل اور کس وقت انجام دیتے تھے اور کس کثرت سے انجام دیتے تھے۔

شیخ نظام الدین اولیاء کو والدہ کے سایہ عاطفت میں جو تربیت ملی تھی اس میں فاقہ کشی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ کیونکہ والد کے انتقال کے بعد ان کی حالت خستہ ہوگئی تھی۔ چوں کہ ان کی والدہ ایک نیک اور ولیہ صفت خاتون ثابت ہوئیں لہٰذا انہوں نے مالی بحران کو حصول بلندی درجات میں کبھی حائل ہونے نہ دیا اور نہ کبھی یہ ظاہر ہونے دیا کہ میری حالت اتنی کمزور ہے۔ اگر گھر میں کبھی کچھ کھانے کو نہ ہوتا تو والدہ سیدھے لفظوں میں اپنے کم عمر بچہ کو نہ کہتیں کہ بیٹا غربت کی وجہ سے آج گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے بچے کے ذہن پر غلط اثر پڑ سکتا تھا بلکہ بڑے حکیمانہ انداز میں کہتیں کہ بیٹا آج ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم لوگوں نے روزہ رکھ لیا ہے۔ یہ جملہ جو آپ نے چھوٹی عمر میں پہلی بار سنا اور پھر یہی چیز عمر کے دوسرے حصے میں بار بار سننے کو ملی اور پھر روزہ کی عادت جو عمر کے اس حصے میں پڑی وہ زندگی بھر کے لئے آپ کا معمول بن گیا۔ عید کے دن کو چھوڑ کر پورے سال روزہ رکھتے، ویسے بھی سفر روحانی میں روزے کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو ان کے مرشد نے ذہن نشین کرائی تھی۔ افطار کے وقت شیخ جماعت خانہ میں تشریف لے آتے۔ کوئی نرم اور زود ہضم غذا تناول فرماتے اگر روٹی ہوتی تو آدھی یا ایک روٹی ترکاری کے ساتھ جو اکثر کریلے کی ہوتی کھاتے، کبھی چاول بھی تناول فرماتے۔ اس وقت بھی آپ کا

معمول یہ تھا کہ افطار کے لئے دسترخوان پر جو مہمان ہوتے ان کی خاطر و تواضع کی جاتی اوران کے لئے افطار کا بہتر نظام ہوتا۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ مہمانوں کی ضیافت میں آپ اپنے معمول سے بھی بہت کم ہی افطار میں کھا پاتے تھے۔ یہاں تک کہ کھانا ختم ہو جاتا اور دسترخوان اٹھالیا جاتا۔ جیسا کہ امیر خورد مولانا شمس الدین یحییٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''میں ایک مرتبہ سلطان المشائخ کے دسترخوان پر حاضر تھا، افطار کے وقت میں نے سلطان المشائخ کو دیکھا کہ آپ نے لقمہ کے لئے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا، آپ کا ہاتھ اس وقت تک پیالے ہی میں رہا یہاں تک کہ دسترخوان بڑھانے کا وقت ہو گیا۔ لیکن ہاتھ پیالے سے اٹھ کر منہ تک نہ جا سکا'' ۲

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دن آپ افطار کے وقت دسترخوان پر تشریف رکھتے تھے، اس پر ارنبیل کے خشک ٹکڑے رکھے تھے، ایک درویش نے یہ سمجھا کہ شیخ نے افطار فرمالیا ہے۔ یہ ٹکڑے دسترخوان پر باقی رہ گئے ہیں، سب کو بٹور لیا اور لے کر چلتا بنا۔ اس پر شیخ نے مسکرا کر اس کے حق میں محبت آمیز کلمات کہے۔ ۳

پھر نماز کے لئے جاتے، بعد نماز اپنے بالاخانے کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے، گرمیوں میں کھلی چھت پر تشریف رکھتے اور احباب وعوام اور مریدین جو شہر اور اطراف سے آئے ہوئے ہوتے سب کو بالاخانے پر بلالیا جاتا۔ تھوڑی دیر وہ آپ کی ہم نشینی اور ملاقات کا شرف حاصل کرتے۔ اس موقع پر خشک وتر میوے عمدہ قسم کے شربت اور لذیذ چیزیں پیش کی جاتیں۔ اب لوگ تناول کرتے اور شیخ سب کی خاطر و مدارات فرماتے، احوال پوچھتے، کھانا اوپر ہی کھلایا جاتا۔ پھر جماعت خانہ میں تشریف لاتے اور نماز عشاء ادا فرماتے۔

بعد نماز عشا بالائی خانہ کے کمرے میں تشریف لے جاتے، کچھ دیر اوراد میں مشغول رہتے، جب آرام کے لئے چارپائی پر بیٹھتے اس وقت خدام تسبیح لاکر ہاتھ میں دے دیتے، اس وقت سوائے حضرت امیر خسرو کے کسی کو اندر جانے کی مجال نہ ہوتی۔ وہ سامنے باادب بیٹھ کر اور دن بھر کی خبریں سناتے۔ شیخ ان کی دل داری کے لئے سرہلاتے رہتے۔ کبھی کبھی خود بھی پوچھتے کہ ترک آج کیا خبریں ہیں۔ اس پر امیر خسرو بقول امیر خورد:

''امیر خسرو اس بات کو سن کر اپنے لئے گفتگو کا میدان وسیع پاتے مثلاً اگر آپ ایک نکتہ پوچھتے تو یہ فصل کی فصل پیش کر دیتے۔'' ۴

اس موقع پر بعض چھوٹے عزیز اور بعض مولیٰ زادے حاضر ہوتے اوران پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے۔ جب یہ لوگ سعادت سے سرفراز ہو جاتے تو ان کو باہر جانے کی اجازت ہو جاتی۔ اس وقت اقبال خادم، سلطان المشائخ کے لئے وضو کا پانی لے کر آتے، اسے رکھ کر واپس چلے جاتے۔ اس کے بعد شیخ اپنے کمرہ کا کنڈہ خود لگاتے پھر کمرہ میں شیخ ہوتے اوران کا خدا۔ کسی کو خبر نہ ہوتی کہ شیخ کیا کر رہے ہیں۔

ساری رات سرگوشی میں گزر جاتی، یہاں تک کہ سحری کا وقت ہو جاتا، خادم خواجہ عبدالرحیم آتے اور دروازہ کھٹکھٹاتے، شیخ دروازہ کھول دیتے، وہ سحری لگاتے اور آپ اس میں سے بہت تھوڑا تناول فرماتے، بقیہ سب کچھ لوٹا دیتے اور حکم دیتے کہ بچوں اور بھوکوں کو کھلایا جائے۔ خواجہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ:

''اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ سلطان المشائخ سحری بالکل تناول نہ فرماتے۔ میں عرض کرتا کہ مخدوم! آپ افطار ہی میں بہت کم کھاتے ہیں۔ اگر سحر میں کچھ نہ کھائیں گے تو ضعف زیادہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر آپ رونے لگتے اور فرماتے کتنے مسکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں میں بھوکے اور فاقے سے سو رہے ہیں، یہ کھانا میرے حلق میں کیسے اتر سکتا ہے۔ چنانچہ کھانا اسی طرح اٹھالیا جاتا۔'' ۵

پھر فجر کی نماز سے فراغت کے بعد اوپر کمرے میں تشریف لے جاتے۔ تلاوت قرآن سے قلب و ذہن کو سرشار کرتے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتے، یہاں تک کہ اشراق اور چاشت کی نمازوں سے فارغ ہو کر نیچے جماعت خانہ میں تشریف لاتے۔ اس وقت بھی کمزوری آپ کے وجود مبارک میں ظاہر نہ ہوتی تھی اور شکل وصورت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ آپ چار سو پانچ سو نفلیں اور اسی قدر تسبیح پڑھتے ہیں۔ مگر آپ کی ساری عمر عزیز باطنی مشاغل میں اور شکستہ دلوں کے حالات دریافت کرنے میں گزرتی۔ اب زائرین اور مساکین کا ہجوم ہوتا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی آنے والا بغیر حاضری کے

واپس چلا جائے۔ ۶ چنانچہ سیرالاولیاء کے حوالے سے اس مجلس کی منظر کشی کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''دن میں تمام روز اپنے مشائخ کے سجادہ پر قبلہ رو باطنی طور پر مشغول "متوجها الی اللہ تعالیٰ کانه ینظر الیه" (اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا وہ روبرو ہے) بیٹھ کر گزار دیتے۔ آنے والوں میں مختلف طبقوں کے لوگ ہوتے، علما ومشائخ، صدور واکابر، وضیع و شریف ہر ایک کے علم ومرتبہ کے مطابق جس کا جو فن ہوتا اسی میں اس سے گفتگو کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے ظاہری طور پر ان میں مشغول ہو تے اور باطن میں پورے طور پر مشغول بحق۔'' ۷

یہاں تک کہ دن چڑھے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد مہمانوں کے کھانے کا نظم کیا جاتا اور انہیں تحفے تحائف سے نوازا جاتا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے بعد شیخ قیلولہ فرماتے۔ اس کے بعد نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنے حجرہ میں تشریف رکھتے۔ وہ عزیز، جو قدم بوسی کے لئے آئے ہوتے، کو شیخ کے پاس بلایا جاتا، وہ اپنے پاس بٹھاتے اور ان کی دلداری فرماتے اور عبادت وسلوک میں محبت حق تعالیٰ کی رہنمائی فرماتے۔ اتنی کھلی اجازت، شفقت و مروت اور دلداری طبع کے باوجود اکابر علما وصلحا کی (جو اس مجلس میں حاضر ہوتے) ہمت نہ ہوتی کہ سر اٹھا کر چہرۂ مبارک کو دیکھتے، ایسا رعب اور منجانب اللہ عظمت تھی کہ آپ کے چہرہ پر نظر کرنا مشکل تھا۔ ۸

اسی عملی گفتگو اور دلداری طبع میں آپ کا وقت گزر جاتا اور نماز عصر کا وقت ہونے کے بعد چھت کے بالائی حصے پر تشریف لے جاتے اور نماز مغرب تک اوپر ہی ٹہلتے رہتے۔ کبھی کبھی جمنا کے کنارے بھی چہل قدمی کے لئے تشریف لے جاتے۔ ایک بار دیکھا کہ جمنا کے کنارے ایک عورت کنویں سے پانی بھر رہی ہے۔ اس پر شیخ نے کنویں سے پانی کھینچنے کا سبب پوچھا۔ اس پر بوڑھی نے کہا کہ میرا شوہر فقیر ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، جمنا کا پانی پیتی ہوں (جو زود ہضم ہے) تو بھوک لگ جاتی ہے۔ اسی لئے کنواں سے پانی نکالتی ہو ں تاکہ اس کو پیوں تو بھوک کم لگے۔ اس پر شیخ کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہاں تک کہ اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۹

جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھنے کے لئے جمعرات کی شب یا جمعہ کی صبح اپنے ایک پرانے اور چھوٹے مکان میں چلے جاتے کیوں کہ وہاں سے جامع مسجد قریب تھی۔ وہیں سے جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتے۔

بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینے کا معمول تھا اور بکثرت قطب صاحب اپنی والدہ اور بی بی فاطمہ کے مزارات پر حاضری دیتے اور ان کے لئے فاتحہ خوانی اور دعا کرتے۔ مزارات پر جانے والے راستہ پر طائفوں کا مکان پڑتا تھا، آپ پہلے ہی خادم بھیج کر انہیں روپیہ دلوادیتے اور ان کو راستہ سے ہٹ جانے کی ہدایت کرتے تاکہ سامنا نہ ہو۔ ۱۰

شیخ نظام الدین اولیاء کا یہ معمول رہا ہے کہ جب تک ان کی والدہ زندہ تھیں ہر ماہ نو کو پابندی سے والدہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قدم بوسی کر کے شرف یاب ہوتے۔ چنانچہ شیخ نے جمادی الآخر کی چاند رات کو ماہ نو کی مبارک باد عرض کی۔ اس وقت والدہ نے فرمایا، نظام آئندہ ماہ کی پہلی تاریخ کو کس کے پاؤں پر سر رکھو گے اور کس کو مبارک باد دو گے۔ ان کی یہ باتیں سن کر حیران ہوئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب والدہ محتر مہ کی محبت وشفقت کے چھوٹنے کا وقت آگیا ہے۔ شیخ نے روتے ہوئے والدہ سے پوچھا کہ آپ مجھے کس کے سپرد کرتی ہیں تو والدہ نے فرمایا کہ اس کا جواب کل دوں گی۔ اس وقت تم شیخ نجیب الدین کے گھر جا کر سو جاؤ۔ والدہ کے حکم کے مطابق شیخ کے گھر سونے کے لئے چلے گئے۔ ساری رات کشمکش میں مبتلا رہے۔ نیند نہیں آئی یہاں تک کہ صبح ہو گئی کہ خادمہ دوڑتی ہوئی آئیں اور کہا کہ آپ کی والدہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ شیخ جلدی سے والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ والدہ نے کہا رات تم نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب اب دیتی ہوں۔ غور سے سنو پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا اے خدا اس کو میں تیرے سپرد کرتی ہوں۔ اس کے بعد شیخ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ شیخ کا بیان ہے کہ:

''اس سپردگی پر اپنے اوپر خدا کا شکر واجب سمجھا اور اپنے دل میں کہا اگر میری والدہ زر وجواہر سے بھر اہوا پورا گھر بھی میراث میں چھوڑ تیں میں اتنا خوش کبھی نہ ہوتا جو کلمے آخر وقت میں انہوں نے میرے لئے فرمائے تھے۔'' ۱۱

شیخ نظام الدین اولیا کے معمولات میں تلاوت قرآن بھی بڑی

اہمیت رکھتی ہے، گوکہ آپ نے شیخ فریدالدین کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد یعنی ۳۰،۳۵ سال کی عمر میں قرآن مجید کو حفظ کیا۔ پھر یہ آپ کی زبان پر اور آپ کے دل پر اتنا اثر انداز ہوا کہ بیش تر وقت آپ قرآن کی تلاوت کرتے رہتے۔ رات میں بھی اٹھ کر نوافل وتہجد ادا کرنے کے ساتھ کچھ دیر تلاوت کلام اللہ سے قلب وذہن کو سرشار کرتے۔ پھر بعد نماز فجر تو تلاوت کلام اللہ کے بعد ہی معمولات کے مطابق مجالس میں حاضر ہوتے۔ اپنے مریدین اور خلفائے خاص کو تاکید فرماتے کہ کثرت سے کلام اللہ کو پڑھتے رہو۔ امیر حسن سجزی کا بیان ہے کہ شیخ نے مجھے بار بار فرمایا کہ اتنی کثرت سے قرآن پڑھو کہ شاعری پر غالب آجائے۔ امیر خسرو تو رات کو نوافل میں سات پارے قرآن کے پڑھ ڈالتے تھے۔ یہی معمول آپ کے کبار صوفیا کا بھی تھا۔ چنانچہ مولانا مناظراحسن گیلانی لکھتے ہیں کہ:

''خواجہ بزرگ معین الدین چشتی سے لے کر حضرت نظام الدین تک کے سب کے یہاں قرآن مجید کا خصوصی ذوق اور شغف ملتا ہے اور ہر ایک نے اپنے خلفاء خاص اور مریدین اختصاص کو حفظ قرآن اور اشتغال بالقرآن کی تاکید کی ہے۔'' [۱۲]

ماخذومراجع

۱۔ تصوف اور اسلام۔ مولانا ماجددریا آبادی، ص:۱۴۶، نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۲۔ سیر الاولیاء، امیر خورد (مترجم اردو اعجاز الحق قدوسی) ص:۲۳۸، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۸۰ء

۳۔ بزم صوفیاء۔ سید صلاح الدین عبد الرحمٰن، ص:۲۵۵، مطبع معارف اعظم گڑھ۔

۴۔ سیر الاولیاء، ص:۲۳۹، امیر خسرو، سید غلام سمنانی، ص:۵۲۔۵۳، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۹۵ء

۵۔ سیر الاولیاء، ص:۲۴۲

۶۔ سیر الاولیاء، ص:۲۴۴

۷۔ تاریخ دعوت وعزیمت: ابوالحسن علی ندوی، ص:۹۷، ج:۳۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۰ء

۸۔ سیر الاولیاء، ص:۲۴۵۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۹۷۔

۹۔ شیخ نظام الدین اولیاء، خلیق احمد نظامی، ص:۷۳۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۹۸ء۔

۱۰۔ شیخ نظام الدین اولیاء، ص:۷۴

۱۱۔ سیر الاولیاء، ص:۲۷۳،۲۷۴،۲۷۴

۱۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، مولانا مناظراحسن گیلانی، ص:۱۲۰، ج:۲، ندوۃ المصنفین دہلی۔

بقیہ صفحہ:۱۰۱ کا

چہارم، وہ لوگ جن کی تربیت اور پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے، جہاں فسادکاریاں زیادہ ہوتی ہیں اور انسانی نفوس برائیوں، ہلاکتوں اور تخریب کاریوں کے دل دل میں پھنس چکے ہوتے ہیں۔ مختصراً ان کو بالترتیب جاہل، گمراہ اور جاہل، ضال وفاسق وجاہل شدید، بد، گمراہ، فاسق، جاہل کہتے ہیں۔ صوفیائے کرام جہاد بالنفس سے ان کی اصلاح فرماتے ہیں۔ وہ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی راہوں سے لوگوں کو خدا شناسی یا عرفان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور اعلیٰ اخلاق حسنہ کا حامل بناتے ہیں۔ انہیں راہوں سے انسان کو بقائے دوام (Eternity) کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ اسی دوامی زندگی کو جنت والی زندگی کہتے ہیں۔ اسی سے حیات انسانی، دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوتی ہے اور اسے دوامی لذت سکون حاصل ہوتی ہے۔ یہی حیات انسانی کی معراج بھی ہے۔

موجودہ دور میں صوفیائے کرام کے فرائض اور ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ کیوں کہ موجودہ دور میں روز بروز نئی ضرورتیں بنتی جارہی ہیں۔ مادہ پرستی، کثافت، جلد بازی، مسابقت، بے حد دنیاوی انہماک ومصروفیت، غیریت، فرقہ پرستی، نفرت، استحصال، جنگ وجدال، مذہب بیزاری، آلودگی، بے راہ روی، سرمایہ پرستی، عیاشی، بداعمالی، رذالت آج کے دور کے مزاج کے عناصر ہیں۔ ان کی اصلاح صوفیائے کرام اور علمائے عظام کو اپنے اپنے طور وطریقہ سے کرنا ناگزیر ہے۔ پہلے انہیں خود اپنے اوصاف اور قوتوں کو پُر اثر بنانا ضروری ہے۔ تبھی لوگوں کی روحانی اور جسمانی خوبیوں میں نکھار اور اضافہ ہوگا۔ تبھی گلوبلائزیشن کے فلاحی اور خوبصورت خواب کی تعبیر ممکن ہوگی۔ اور اسی وقت ہی حیات انسانی اپنے خالق مطلق کی طرح حسین وجمیل ہوگی۔ اُسی وقت ہی اسے دوامی امن وسکون اور دوامی لقائے الٰہ یعنی اللہ کے دیدار کی دوامی لذت اور آنند حاصل ہوگا۔ آمین۔ ❁❁❁

باب سوم
خدمات تصوف

بہار کے صوفیائے کرام

ایک اجمالی جائزہ

سید شاہ شکیل عظیمی .... خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ بہار

بہار میں مسلمانوں کی باضابطہ تاریخ کی ابتدا خانقاہ اور صوفیہ کی تاریخ سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ اسے جدا کرنا مشکل ہے۔ جب کبھی بہار میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کے وجود وارتقا کا ذکر چھیڑے گا تو لامحالہ خانقاہ اور صوفیائے کرام کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ سیاسی اعتبار سے بختیار خلجی کی آمد ہی کو بہار میں مسلمانوں کا داخلہ مانا جاتا ہے، لیکن یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بختیار خلجی کے حملے سے قبل مسلمانوں کی آبادیاں یہاں قائم ہو چکی تھیں اور صوفیا کی سرگرمی کے کئی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ دہلی سے پٹنہ کو جوڑنے والی شاہراہ پر مضافات پٹنہ کا مشہور و معروف قصبہ منیر شریف اس سلسلے میں خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ یہ وہ متبرک بستی ہے جہاں مسلمانوں کا نقش اولیں باضابطہ ثبت ہوا تھا۔ منیر شریف سے جڑی ہوئی اطلاعات میں حضرت سالار مسعود غازی بہرائچی اور فاتحین بلگرام (یوپی) کے پس منظر میں مشرقی ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ میں کچھ چونکانے والے انکشافات عین ممکن ہیں۔

کہتے ہیں کہ 576ھ میں امام محمد تاج فقیہ نے منیر کو فتح کیا اور ایک ایسی خانقاہ کی بنیاد ڈالی جو شاید مشرقی ہندوستان میں ایسی پہلی خانقاہ تھی جو نہ صرف روحانی قیادت کا مرکز تھی بلکہ بختیار خلجی کے حملے تک سیاسی زمام اقتدار بھی سنبھالے رہی۔ ان کے بیٹوں اور رفقا نے پورے بہار میں جنگی سطح پر روحانی مشن کو پھیلانے کا کام کیا، چنانچہ بہار کو میمنہ، میسرہ اور قلب میں تقسیم کرتے ہوئے بڑے بیٹے شیخ اسرائیل نے قلب یعنی منیر شریف میں رہتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی شیخ اسماعیل کو میسرہ یعنی گنگا پار علاقہ ترہت میں تبلیغ و دعوت کی ذمہ داریاں سونپیں، جب کہ چھوٹے بھائی عبدالعزیز نے بطور میمنہ جنوبی بہار کی کمان سنبھالی۔

بڑے بھائی شیخ اسرائیل کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدین یحییٰ منیری، شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے۔ معاصر مشائخ و علما سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اسی تعلق و مودت کی وجہ کر علامہ اشرف الدین ابوتوامہ عہد بلبن کے جید علامہ سونار گاؤں (بنگلہ دیش) جاتے ہوئے منیر ٹھہرے تھے شیخ کمال الدین یحییٰ کے بلند اقبال صاحبزادے شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری انہیں کی معیت میں سنار گاؤں گئے تھے۔ شیخ کمال الدین یحییٰ کے بڑے صاحبزادے شیخ جلیل الدین ان کے بعد منیر میں سجادہ پر رونق افروز ہوئے۔ شیخ جلیل کے صاحبزادگان بھی حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے مرید و مستفیض ہوئے اور تب سے منیر کی قدیم ترین سہروردی خانقاہ بھی فردوسی رنگ میں رنگ گئی۔ منیر شریف کے سجادہ نشینان میں حضرت مخدوم شاہ دولت منیری عہد اکبر و جہانگیر کے ممتاز شیخ زمانہ گزرے ہیں۔ ان کے مزار مبارک پر ابراہیم خاں گورنر گجرات کا بنوایا ہوا مقبرہ مغلیہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں انہیں کا مرید تھا۔ منیر شیرف کی خانقاہ ہنوز آباد ہے اور سلسلۂ سجادگی قائم ہے۔ حضرت سید شاہ نورالدین احمد فردوسی موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

موجودہ نالندہ ضلع کا بہار شریف سب ڈویژن جو کبھی بودھ وہاروں کی کثرت کی وجہ سے خود 'وہار' کہلانے لگا تھا، مخدوم کی زندگی میں بکثرت صوفیائے کرام کی خانقاہوں، چلہ گاہوں، جماعت خانوں اور درویشوں کے تکیوں سے بھرا پورے عالم میں انتخاب ہو گیا۔

بہار شریف میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری (م782ھ) کے قیام نے پوری اسلامی دنیا کے نقشے پر بہار شریف کو مرکز نگاہ بنا دیا۔ تقریباً نصف صدی کی مدت قیام میں مکتوبات و ملفوظات درس و تدریس کی وہ صحبتیں اور مجلسیں سجیں، جنہوں نے دنیائے تصوف کو بے شمار گہر آبدار بخش دیا۔ خانقاہوں سے لے کر شاہی گلیاروں تک بہار شریف کی اس خانقاہ معظم کی گرمی مجاہدات کی تپش

محسوس کی جانے لگی۔ اُچ (قدیم ضلع ملتان موجودہ ضلع بہاولپور پاکستان) میں جلوہ فرما حضرت مخدوم سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت سے لے کر بنگالہ کے مختلف دور دراز ضلعوں میں پھیلے ہوئے علما و مشائخ تک حضرت مخدوم جہاں کے مکاتیب پہنچنے لگے اور ان کے مطالعہ واستفادے کا ذوق ووجدان اس قدر بڑھا کہ سلطان محمد بن تغلق نے اپنے ایک مکتوب میں حضرت مخدوم جہاں سے ملتجیانہ درخواست کی کہ حضور مجھے بھی مکتوب الیہ بنانے کا شرف وکرم بخشیں۔ حضرت مخدوم جہاں کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی اور چشت کے قدیم ترین صوفی خانوادے کے بلند حوصلہ جوانان خانقاہ معظم کی تازہ گرمئ تاثیر سے لبریز جام کو پینے کے لئے بہار شریف کا رخت سفر باندھنے لگے۔

اس خانقاہ معظم میں مخدوم کے بعد مولانا مظفر بلخی جو خود ایک عالم متبحر و عارف اور شارح حدیث تھے، سجادہ پر رونق افروز ہوئے۔ اس دور میں خود مخدوم جہاں کے کئی خلفا کی خانقاہیں مصروف رشد ہدایت تھیں جن میں شیخ پورہ میں مخدوم شعیب بن جلال منیری، چرواواں میں حضرت مولانا آموں، پھلواری شریف میں حضرت منہاج الدین راستی، چوسہ میں قاضی شمس الدین اور اطراف گیا میں حضرت علیم الدین گیسو دراز نیشاپوری کی خانقاہیں ہر لحاظ سے کامیاب اور قابل احترام تھیں۔ خود حضرت مخدوم جہاں کی خانقاہ معظم میں مولانا مظفر بلخی کے بعد حضرت مخدوم حسین بن معز نوشہ توحید بلخی (م 844ھ) جب سجادہ نشیں ہوئے تو مولانا مظفر بلخی کے مقابلے میں ان کی مستقل اقامت نے مخدوم جہاں کی خانقاہ میں پھر وہی شب و روز کی روحانی تروتازگی اور آبادی کو ایک بار پھر لوٹا دیا جو بلاشبہ مخدوم جہاں کی یاد تازہ کرانے لگی۔

بہار شریف کی خانقاہ معظم ہر دور میں مقامی و بیرونی زائرین و طالبین کے لئے توجہ کا مرکز بنی رہی۔ بلخی سجادہ نشینان کے بعد جب خود مخدوم جہاں کی اولاد میں سجادہ نشینی کا سلسلہ منتقل ہوا تب بھی شاہ و گدا، درویش و دنیادار سبھی اس خانقاہ سے مستفیض ہوتے رہے۔ سکندر لودھی، شیر شاہ، سلیمان کرارانی، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب، شاہ عالم ثانی میں سے بعض تو ذاتی طور پر حاضر ہو کر گل عقیدت نچھاور کر گئے اور بعضوں نے فرامین کے ذریعہ تعمیری یادگاریں چھوڑیں یا جائیدادیں نذر کیں۔ خانقاہ معظم ہنوز آباد و شاداب ہے۔ حضرت جناب حضور سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی اپنے آبا و اجداد کے بعد موجودہ 27ویں سجادہ نشین ہیں۔

حضرت مخدوم جہاں کی زندگی میں دوسرے مشائخ اور دوسرے سلاسل کی خانقاہیں بھی باوجود فرق مزاج و آہنگ بڑی خوبی کے ساتھ بہار شریف اور اس کے اطراف میں آباد و شاداب تھیں، جن میں حضرت مخدوم جہاں کے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوش سہروردی کی بہار شریف کے محلہ انبیر میں واقع خانقاہ کا ذکر ناگزیر ہے۔ فیروز شاہ تغلق حضرت مخدوم جہاں کی خانقاہ کے علاوہ اس خانقاہ میں بھی خود حاضری کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ بلخ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے مولانا مظفر بلخی کے والد مولانا شمس الدین بلخی مع اہل و عیال حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے ہی مرید و معتقد ہو چکے تھے۔

حضرت شاہ شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی (م 725ھ) کے ایک خلیفہ حضرت لطیف الدین حضرت مخدوم جہاں سے استفادے کی غرض سے حاضر ہوئے اور پھر یہیں اپنی خانقاہ بنائی۔ بہار شریف کے موڑا تالاب میں آپ کی خانقاہ ایک عرصے تک بڑی ممتاز رہی۔ عہد لودھی میں اس خانقاہ کو حضرت بڈھ طیب دانش مند جیسا سجادہ نشیں ملا جن کی شہرت عہد شیر شاہی میں اس پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ علم نحو میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م 848ھ) کے مشہور رسالہ 'ارشاد' کی شرح تالیف فرمائی جو عرصے تک مدارس میں شامل نصاب رہی۔ شیر شاہ اس خانقاہ کا اس حد تک معتقد تھا کہ خود اپنے ہاتھوں شیخ کی جوتیاں سیدھی کرتا۔ شیر شاہ کے جانشین سلیم شاہ نے شیخ علائی مہدوی کے مسئلہ میں سارے ہندوستان کے علما کے فتاوے کے باوجود شیخ بڈھ طیب دانشمند بہاری کی رائے جاننا ضروری سمجھا۔

حضرت مخدوم جلال بخاری المعروف بہ جہانیان جہاں گشت بھی مخدوم جہاں سے رشتہ اخوت و محبت رکھتے تھے اور آپ کے مکتوبات کے مداح تھے۔ ان کے خلفا میں بھی ایک بزرگ حضرت داؤد قریشی بہار شریف آئے اور اپنے سلسلے کی ترویج و اشاعت کے لئے کاشی تکیہ بہار شریف میں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ عرصے تک یہ خانقاہ تبلیغ و

دعوت کا کام کرتی رہی، اب صرف مقبرہ محفوظ ہے۔

اس سے قبل کہ حضرت مخدوم جہاں کے مابعد کی خانقاہوں کا ذکر چھیڑے ان سے پہلے کی چند خانقاہوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ جن میں اولین خود حضرت مخدوم جہاں کے نانا مخدوم سید شہاب الدین پیر جگ جوت سہروردی کی خانقاہ ہے، جو شہر پٹنہ کے جنوبی مضافات میں کچی درگاہ کے نام سے آج بھی مرجع خلائق ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اس درگاہ میں باضابطہ خانقاہی نظام قائم تھا، لیکن اب صرف درگاہ مسجد قائم ہے۔ یہ بزرگ بہار کے قدیم ترین بزرگوں میں سے ایک ہیں اور تبلیغ و دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کی ٹھوس خدمات کے شواہد صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کی چاروں بیٹیاں اسلامی تاریخ کی خوش قسمت ماؤں میں گزری ہیں۔ انہوں نے ایسے سپوت بہار و بنگال کو عطا فرمائے جو سب کے سب حیرت انگیز طور پر علمی و روحانی اعتبار سے ممتاز و منفرد ہوئے۔ مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مخدوم احمد چرم پوش، مخدوم تیم اللہ سفید باز، مخدوم حسین دھکڑ پوش بھی آپ کے سگے نواسے تھے اور سب کے سب چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہوئے۔ آپ کی ایک صاحب زادی بی بی کمال نے تو جہان آباد ضلع کے کاکو میں تبلیغ و دعوت اسلامی کی ذمہ داریوں کو مردانہ وار نبھایا۔ بہار شریف کے کاغذی محلے میں حضرت مخدوم احمد سیستانی کی خانقاہ بھی مخدوم جہاں سے پہلے کی خانقاہوں میں بے حد محترم تھی۔ حضرت مخدوم احمد سیستانی باعتبار سلسلہ سہروردی تھے یا چشتی، ہنوز تشنہ تحقیق ہے، لیکن آپ کی روحانی عظمت اور خدمت ہر طرح مسلم ہے۔ خود حضرت مخدوم جہاں کا آپ کے مزار مبارک پر حاضری کے معمول کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ کا آستانہ آج بھی عظمت و رفعت کا زندہ گواہ ہے۔

نویں اور دسویں صدی ہجری میں کچھ ایسی خانقاہوں کی بنیاد بہار میں پڑی جو عرصے تک یکتائے روزگار رہ کر تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئیں۔ اب صرف مزارات باقی ہیں یا شکستہ عمارتیں۔ ان میں حضرت عطاء اللہ بغدادی اور حضرت فرید الدین طویلہ بخش چشتی کی خانقاہیں سر فہرست ہیں۔ یہ دونوں بزرگ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے فیض یافتہ تھے، جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی سے جاملتا ہے۔ حضرت فرید الدین طویلہ بخش چشتی کی خانقاہ کے آثار چاند پورہ بہار شریف میں ہنوز باقی ہیں۔ اسی خانقاہ کے متوسلین میں مشہور زمانہ مسلم الثبوت اور سلم العلوم کے مصنف حضرت ملا محب اللہ بہاری (م 1119ھ) بھی تھے، ان کا مزار بھی اسی خانقاہ سے ملحق درگاہ شریف کے جنوب مغربی گوشے میں واقع ہے۔

حضرت عطاء اللہ بغدادی قادری ثم چشتی کا مزار بہار شریف کے سکونت محلے میں واقع ہے۔ حضرت عطاء اللہ اور حضرت فرید الدین طویلہ بخش کے اخلاف میں کئی شخصیتیں ایسی پیدا ہوتی رہیں جن سے زمانہ فیضیاب ہوا۔ اب بھی متعدد سادات و شیوخ کے خانوادے ان بزرگوں کی نسبی جزئیت کا شرف رکھتے ہیں اور بعض خانوادوں میں ان بزرگوں کے سلسلہ طریقت کی اجازت بھی موجود ہے، لیکن سجادہ نشینی کا باوقار تسلسل اب مفقود ہے۔ اس دور کی مشہور خانقاہوں میں حضرت سید فضل اللہ عرف سید گسائیں کی خانقاہ بھی بہار شریف کے محلہ دائرہ میں کئی پشتوں تک بے انتہا مقبول و محترم رہی، اب صرف مزارات باقی ہیں۔

بہار شریف کے محلہ بھینسا سور اور بخاری محلے کے درمیان محلہ چشتیانہ میں حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر چشتی کی اولاد کی ایک محترم خانقاہ بھی اسی دور میں قائم ہوئی تھی جس کے بانی حضرت شاہ امان اللہ چشتی تھے، جن کا سلسلہ نسب تین یا چار پشتوں کے فصل سے حضرت بابا فرید سے جاملتا تھا۔ حضرت شاہ امان اللہ کے ایک صاحب زادے شیخ فیض اللہ چشتی بہار شریف سے ہجرت کر کے پٹنہ چلے آئے اور یہاں سید پور دیگھا میں سکونت اختیار کر لی اور سید پور دیگھا کی خانقاہ میں بھی بڑے باکمال فریدی النسب سجادہ نشینوں کا پتہ چلتا ہے، جس میں شیخ عنایت اللہ وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔ بارہویں صدی ہجری میں اس خانقاہ میں منعمی ابوالعلائی رنگ غالب آ گیا، چنانچہ اسی خاندان کے مشہور و معروف بزرگ حضرت شاہ قطب الدین عرف بساون کور جوی، حضرت مخدوم منعم پاک کے مقتدر خلفا میں گزرے ہیں۔ اب صرف ان بزرگوں کے مزارات محفوظ ہیں۔

جہان آباد ضلع میں اردل جہان آباد شاہراہ پر موضع کندوئی میں حضرت خواجہ خواجگان غریب نواز اجمیری کی اولاد کی ایک مشہور خانقاہ عرصے تک مصروف ہدایت رہ چکی ہے، جس کے بانی خواجہ داؤد چشتی کا

مزار مبارک اب تک اس موضع میں محل برکت ہے، لیکن اب خانقاہ یا افراد خاندان کا کوئی نشان نہیں۔

سلسلۂ چشتیہ کے پیران شجرہ میں سے ایک مشہور و معروف ولی کامل حضرت خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی کی نسل بھی صوبہ بہار تشریف لائی اور اب تک یہ آباد ہے۔ نوادہ ضلع کے شیخ پورہ خرد نرہٹ میں ان بزرگوں کی درگاہیں اور خانقاہ آج بھی مصروف رشد و ہدایت ہے۔ اس خاندان میں حضرت خواجہ سید تاج محمود حقانی بڑے بزرگ سجادہ نشین گزرے ہیں۔ اب مولانا سید شاہ عین الدین چشتی موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

بہار میں جونپور کے معروف ولی اللہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری (م 911ھ) کے کئی خلفا کی باضابطہ خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے۔ پٹنہ سے ملے جنوب باڑھ میں آسودہ حضرت شاہ شمس الحق الملقب بشاہ بڈھ حقانی آپ ہی کے خلیفہ تھے، جن کی خانقاہ علم و فضل کے اعتبار سے بڑی محترم رہی، اب محض ویرانی ہے۔ حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری چشتی کے سگے چھوٹے بھائی حضرت شیخ احمد عیسیٰ تاج جونپوری بذات خود بہار شریف تشریف لائے اور محلہ کاشی تکیہ میں اپنی خانقاہ قائم کی، اب صرف درگاہ محفوظ ہے۔

حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری کے ایک اور مشہور خلیفہ حضرت سید زین العابدین المعروف سید زاہد بڈھ چشتی کی خانقاہ ضلع سارن میں مشہور و معروف رہی۔ آپ ہی کے خویش حضرت شاہ فیض اللہ المعروف بشاہ قاضن علا شطاری تھے جن کی خانقاہ ویشالی ضلع میں شہرت کی بلندیوں کو چھورہی تھی۔ حضرت شاہ قاضن علا شطاری صوبہ بہار کے قدیم ترین بزرگ حضرت امام تاج فقیہ کے دوسرے صاحبزادے حضرت شیخ اسمٰعیل کی سیدھی اولاد میں ہیں اور جامع السلاسل بزرگ گزرے ہیں۔

حضرت قاضن علا شطاری، حضرت شیخ عبداللہ شطار (بانی سلسلہ شطاریہ) کے نامور خلیفہ ہیں اور ان کی تصنیف معدن الاسرار سلسلہ شطاریہ کا سب سے معتبر ترجمان ہے۔ آج سلسلہ شطاریہ کی ۹۹ فی صد خانقاہیں۔ حضرت قاضن علا شطاری کے فیضان سے مالا مال ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست بھی سلسلہ شطاریہ کے مقبول شیخ گزرے ہیں۔ ان کی خانقاہ حاجی پور ضلع ویشالی کے تنگول میں مقبول و معروف تھی۔ حضرت حاجی حمید حضور آپ ہی کے خلیفہ تھے جن کی خانقاہ بہار کے سارن میں رتن سرائے مقام مشہور و معروف تھی۔ عظیم شطاری بزرگ حضرت غوث گوالیاری صاحب جواہر خمسہ آپ ہی کے مرید مجاز اور خلیفہ تھے۔ حضرت غوث گوالیاری کے مقتدر خلفا میں حضرت شیخ وجیہہ الدین علوی کا نام سرفہرست ہے۔

حضرت شیخ وجیہہ الدین علوی شطاری گجراتی کے ایک خلیفہ حضرت میر سید یاسین گجراتی محدث دانشمند بہار شریف تشریف لائے اور محلہ خندق میں اپنی خانقاہ قائم کی جو عرصے تک مرکز علم و عرفان رہی۔ اب صرف مزار مبارک باقی ہے لیکن آپ کے مشہور و معروف خلیفہ حضرت مولانا شہباز محمد بھاگلپوری نور اللہ مرقدہ کی باعظمت خانقاہ اب تک بھاگلپور میں تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں انجام دے رہی ہے۔ بھاگلپور کی خانقاہ شہبازیہ بہار کی عظیم الشان خانقاہوں میں سے ایک ہے۔ حضرت مولانا سید شاہ اشتیاق عالم شہبازی موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

حضرت مخدوم شاہ ابوالفتح ہدیہ اللہ سرمست شطاری کے خلیفہ اور برادرزادے حضرت مخدوم شاہ علی شطاری نے حاجی پور ضلع ویشالی سے قریب موضع جنداہا میں اپنی خانقاہ قائم کی اور خوب خوب رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ مغلیہ سلطنت کا جب تک عروج رہا یہ خانقاہ بھی عروج پر رہی اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ خانقاہ بھی زوال پذیر ہوتی گئی۔ سلسلہ سجادگی ہنوز قائم ہے۔ پیر امام الدین شطاری صاحب مناہج الشطار اسی خانقاہ کے بزرگ سجادہ نشیں حضرت شیخ رکن الدین شطاری کے مرید و خلیفہ تھے اور ان سے اس سلسلہ کی ایک خانقاہ راج گیر متصل بہار شریف میں قائم ہوئی۔ راج گیر کی اس خانقاہ کے معتقدوں میں مغل بادشاہ فرخ سیر بھی تھا۔ جنداہا کی خانقاہ شطاریہ کے موجود سجادہ نشیں جناب سید علی شطاری ہیں۔ راج گیر میں مزار موجود ہے اور فرخ سیر کی تعمیر کردہ مسجد بھی موجود ہے لیکن محض ویرانی ہی ویرانی ہے۔

گیا ضلع کے بیتھو شریف میں بھی ایک محترم خانقاہ ہنوز موجود ہے جس کے بانی حضرت مخدوم شاہ درویش اشرف چشتی ہیں۔ جن کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شاہ اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی قدس سرہ

کے بھانجے حضرت سید شاہ عبد الرزاق نور العین سے جاملتا ہے۔ پروفیسر شاہ شاہد اشرفی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

ضلع پٹنہ کے خسرو پور میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو خانقاہیں بڑی ہی تاریخی گزری ہیں۔ یہ دونوں خانقاہیں نوآباد کلاں اور نوآباد خرد میں آباد تھیں۔ اول الذکر کے بانی حضرت مخدوم شاہ احمد نوآبادی تھے جن کا سلسلہ نسب جہان آباد کا کو کی مشہور ولیہ حضرت بی بی کمال سے جا ملتا ہے آپ ہی کے صاحبزادے مخدوم شاہ اخوند چشتی نے نوآبادہ کلاں سے ہجرت فرما کر کچھ ہی فاصلے پر ہرداس بیگھہ ریلوے اسٹیشن سے قریب اپنی خانقاہ قائم کی۔ یہ مقام اب چھوٹا نوادہ کہلاتا ہے۔ عہد عالمگیری میں یہ خانقاہ اپنے عروج پر تھی اب محض ویرانی ہے۔ اس خانقاہ کے سلسلے کی اجازت وخلافت اور نسبتی جزئیت بعض خاندانوں میں محفوظ ہے۔

نویں اور دسویں صدی ہجری میں ضلع گیا سے قریب انجھر شریف میں قادریہ سلسلہ کی ایک محترم خانقاہ قائم ہوئی جس کے بانی حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی کی اولاد میں حضرت مخدوم شاہ محمد القادری قدس سرہ تھے۔ یہ خانقاہ ہنوز مصروف خدمت ہے اور سلسلہ سجادگی کی ساتھ ساتھ یہ محترم خاندان اب تک سرسبز و شاداب ہے۔

بارہویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم شاہ محمد منعم پاک قدس سرہ کی پٹنہ آمد سے ایک نئی روحانی بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کے خلفا کے ذریعے اور ان کے خلفا کے ذریعے اس برصغیر میں بے شمار خانقاہوں کا قیام عمل میں آیا اور نظام خانقاہی اور اس کے ذریعہ تبلیغ و دعوت، رشد وہدایت کے طریقہ کار کا گویا احیا ہوگیا۔ حضرت مخدوم شاہ منعم پاک کی عظیم الشان خانقاہ پٹنہ کے محلہ میتن گھاٹ میں ہنوز آباد و شاداب ہے اور حضرت پروفیسر سید شمیم احمد منعمی صاحب موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ حضرت مخدوم منعم پاک کے خلفا میں حضرت خواجہ شاہ رکن الدین عشق ابو العلائی کی خانقاہ بخشی گھاٹ سے متصل بارگاہ عشق کے نام سے مشہور اور آباد ہے۔ موجودہ سجادہ نشیں بانی خانقاہ کے ہم نام ہیں۔ حضرت مخدوم منعم پاک کے خلیفہ حضرت مخدوم شاہ حسن علی منعمی کی خانقاہ خواجہ کلاں سے متصل نیم گھاٹ میں آج بھی موجود ہے اور آباد ہے۔

شیر شاہی سلطنت کے زوال کے فوراً بعد افغان سردار سلیمان کرارانی نے حاجی پور میں خودمختاری کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں باقری سادات کے ایک محترم خاندان کا ایک حصہ کالپی سے ہجرت کر کے حاجی پور میں آباد ہوا اور یہیں موضع چیچر میں اپنی خانقاہ قائم کی جس کے بانی حضرت سید تقی الدین عرف سید بوڑھے چشتی تھے۔ کرارانی خاندان نے آپ کی بڑی قدر و منزلت کی اور ایک بڑی اراضی آپ کی نذر کی۔ چنانچہ حضرت سید تقی الدین کے صاحبزادے سید قطب الدین کے نام سے موسوم ہو کر قطب پور چیچر مشہور ہوا۔ کرارانی خاندان کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ خاندان بھی پٹنہ کی کچوری گلی میں ہجرت کر کے آباد ہو گیا۔ اب صرف مزارات باقی ہیں۔

سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت حسام الدین مانک پوری کے اولاد میں ایک بزرگ حضرت شاہ کریم الدین چشتی بھی بہار کے چھپرہ میں تشریف لائے۔ آج بھی چھپرہ میں محل کریم چک ان کی یادگار ہے۔ ایک عرصے تک ان کی خانقاہ رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ اس خانوادے کے مشہور بزرگوں میں حضرت حکیم شاہ فرحت اللہ، حکیم شاہ مہدی حسن وغیرہ منعمی سلسلۂ فیضان سے مالا مال تھے۔ اب صرف درگاہ باقی ہے، سلسلۂ سجادگی مندرس ہوگیا۔

بارہویں صدی ہجری میں پٹنہ کے پھلواری شریف میں حضرت پیر شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی کی خانقاہ بھی بڑی ممتاز و مقبول رہی۔ خود بانی خانقاہ حضرت شاہ مجیب اللہ قادری جامع السلاسل صوفی صافی تھے اور اپنے اچھے جانشینوں کی وجہ سے ہنوز یہ خانقاہ بابرکت ہے۔ حضرت مولانا شاہ ابو الحسن فرد پھلواروی، حضرت مولانا شاہ بدر الدین قادری مجیبی حضرت مولانا شاہ محی الدین قادری مجیبی اور حضرت مولانا شاہ محمد امان اللہ قادری اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشینوں میں گزرے ہیں۔ امارت شرعیہ بہار اڑیسہ کے امیر شریعت بھی عرصے تک اسی خانقاہ کے سجادہ نشینان رہے۔ حضرت شاہ آیت اللہ قادری موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک خانقاہ منگل تالاب میں خانقاہ عمادیہ کے نام سے معروف ہے۔ حضرت پیر مجیب اللہ قادری کے بڑے صاحبزادے کی اولاد اس خانقاہ میں نسلاً بعد نسل سجادہ نشیں ہوتی آرہی ہے۔ حضرت مولانا مصباح الحق عمادی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

پیران پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے اولاد میں

ایک صحیح النسب قادری خانوادہ بھی ملتان اور دہلی سے ہجرت کرتا ہوا یہاں پٹنہ پہنچا اور محلہ مغل پورہ میں آباد ہوا۔ اس خانوادے کے ایک جاں نثار ہندو معتقد نے حضرت شاہ عبد المنان قادری کے لئے مغل پورہ پٹنہ سٹی میں ایک خانقاہ بنوائی اور یہ محلہ شاہ منان کی گڑھی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خانقاہ میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے مستند ترین تبرکات بھی نسل در نسل محفوظ چلے آئے تھے جن میں خرقہ و نعلین اور کمند وحدت ہنوز شاہ ٹولی داناپور میں محفوظ ہے۔ اس خانقاہ کی سجادہ نشینی اعلیٰ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین منعمی داناپوری ثم عظیم آبادی کی اولاد میں ہنوز باقی ہے اور خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ میں اس خانقاہ کا انضمام ہو چکا ہے۔

باڑھ میں ایک عظیم الشان خانقاہ حضرت دیوان ابوسعید جعفر محمد قاری کی تھی جو بلند پایہ شیخ وقت ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی زبان و ادب کے علاوہ اسلامی علوم پر بھی قدرت رکھتے تھے اور کئی بہترین تصانیف کے مصنف تھے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت دیوان خلیل الدین قادری زیب سجادہ ہوئے اور مسلم الثبوت اولیائے کاملین میں شمار کیے گئے۔ آپ ہی سے معروف صوفی بزرگ حضرت مخدوم منعم پاک نے اکتساب فیض فرمایا اور مرید و خلیفہ ہوئے۔ عرصہ تک یہ خانقاہ مصروف رشد و ہدایت رہی۔ مابعد حضرت پیر دمڑیا پٹنہ کی خانقاہ اور اس خانقاہ کے سجادہ ایک ہی ہونے لگے ہنوز سلسلہ سجادگی زندہ ہے۔ جسٹس سید شاہ نیر حسین صاحب پٹنہ ہائی کورٹ ان دونوں خانقاہوں کے موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

ضلع جہان آباد کے استھواشریف میں بھی ایک مہتم بالشان علمی و روحانی خانقاہ کے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ اس خانوادے میں مولانا شاہ احمد حسین، مولانا شاہ ظہور الحسن استھوی (م ۱۳۳۰ھ) اور مولانا شاہ خلیل اللہ مشہور و معروف علمی ہستیاں گزری ہیں۔ اس خانوادے میں عربی زبان و ادب کے شعراء بھی تھے۔ اس خانقاہ میں علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے ایک مدرسہ بھی تھا اب یہ سب قصہ پارینہ ہے۔

ضلع مونگیر کے سورج گڈھا میں حضرت شاہ غلام مولی کی خانقاہ اب تک موجود ہے اور وہ مقام بھی مولی نگر کہلاتا ہے۔ مونگیر میں حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ایک مرید اور خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری کی خانقاہ بھی مشہور ہے۔ جناب شاہ ولی رحمانی موجودہ خانقاہ رحمانیہ کے سجادہ نشیں ہیں۔ بہار کے سہسرام میں بھی کئی قدیم خانقاہیں عرصہ تک فیض پہنچاتی رہیں جن میں ایک خانقاہ فریدیہ ہے جو آج بھی بافیض ہے۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشینوں کو حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر چشتی کی نسبی جزئیت بھی حاصل ہے۔

بہار میں متاخرین بزرگوں میں حضرت شاہ قیام اصدق چشتی کی ذات بھی بڑی باکمال گزری ہے۔ آپ کی خانقاہ آج بھی ایکنگر سرائے کے قریب بیر بیگھہ میں مشہور و معروف ہے۔ اس خانقاہ کی کئی شاخیں پھیلیں۔ خواجہ اعتبار سرائے بہار شریف، بڑوسر اور سہسرام میں اصدقیہ سلسلہ کی خانقاہیں آج بھی مصروف خیر ہیں۔

بہار کی خانقاہوں میں دربھنگہ میں واقع خانقاہ سمرقندیہ کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ یہ خانقاہ بھی بافیض ہے اور فیضان جاری ہے۔ خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشیں حضرت سید شاہ نور علی صاحب قبلہ اور ولی عہد حضرت مولانا شمس اللہ جان مصباحی صاحب ہیں۔ مظفر پور میں واقع خانقاہ تیغیہ بھی اپنے فیضان کے اعتبار سے کافی ممتاز رہی ہے۔ حضرت شاہ تیغ علی مظفر پوری متاخرین بزرگوں میں ایک معروف شخصیت کے مالک تھے اور آپ کی نسبت کافی قوی تھی۔ اس سلسلہ تیغیہ کی بھی کئی خانقاہیں مختلف مقامات پر مصروف رشد و ہدایت ہیں۔

نالندہ ضلع کے اسلام پور میں بھی کئی قدیم خانقاہیں تھیں جن میں سے ایک خانقاہ قادریہ آج بھی موجود ہے۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشینوں کو حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی ذریت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس خانقاہ کے بانی حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوری منعمی اپنے وقت کے مقتدر ولیوں میں شمار کیے گئے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے والد آپ ہی سے بیعت تھے۔ اس خانقاہ میں منعمی سلسلہ کا فیضان اب بھی جاری ہے۔ اسی سلسلے کی شاخیں ٹیا گڑھ بنگال اور بہار کے کانٹی میں بھی سرگرم ہیں۔

بہار کے ضلع بھاگلپور میں ایک اور قدیم خانقاہ حضرت مخدوم حسین پیر دمڑیا کی یادگار ہے۔ پیر دمڑیا کے نام سے حضرت مخدوم سید حسن دانشمند کے صاحبزادگان مشہور ہوئے۔ حضرت مخدوم سید حسن دانشمند خود حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی نسبی جزئیت رکھتے تھے

اوران کی خانقاہ بہار کے سیوان میں معروف تھی، وہ علاقہ بھی ان کے نام نامی سے منسوب ہوکر حسن پورہ کہلاتا ہے۔ آپ ہی کے چھوٹے صاحبزادے بھاگلپور آئے اور ان کی اولاد یہاں آج بھی عزت و شرافت کے ساتھ پھل پھول رہی ہے۔ خلیفہ باغ بھاگلپور میں حضرت پیر دمڑیا کی خانقاہ آباد ہے اور مولانا شاہ حسن مانی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ ایک بڑا کتب خانہ نادر قلمی کتابوں سے مالا مال اس خانقاہ میں ہنوز استفادے کے لئے موجود ہے۔ حضرت سید حسن دانشمند کے پوتے سید محمد پیر دمڑیا کی خانقاہ پٹنہ کے میر سلامی سے متصل دمڑیا گھاٹ میں اپنی عظمت کی ہنوز شہادت دے رہی ہے۔ حضرت محمد پیر دمڑیا کے علاوہ عہد جہانگیر و شاہ جہاں کی پٹنہ میں ایک اور مقبول خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی کی ہے۔ آج بھی اس خانقاہ کی عظیم شکستہ عمارت، عیدگاہ، درگاہیں، امام باڑہ، جامع مسجد اپنے شان دار ماضی کی گواہیاں دے رہی ہیں۔ حضرت شاہ شجاول، حضرت شاہ بسنت، حضرت شاہ غلام نجف، حضرت شاہ حامد حسین اس خانقاہ کے معروف سجادہ نشینوں میں گزرے ہیں۔ اس خانقاہ کے متوسلین ارزاں شاہی نسبت سے موسوم ہوتے ہیں۔ سید شاہ انظار حسین موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

پٹنہ کے علاقہ فتوحہ میں رائے پورہ کی خانقاہ بلخیہ بھی معروف و مقبول خانقاہوں میں سے ایک ہے۔ حضرت مخدوم جہاں کے بلخی سجادہ نشینوں نے جب اپنی ذمہ داری حضرت مخدوم جہاں کی اولاد کے حوالے کردی تو دھیرے دھیرے ان کی اولاد بھی بہار شریف سے ہجرت کر کے مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ اسی خانوادۂ بلخیہ کی ایک معروف نمائندہ بنیادی شاخ ہجرت کرتے ہوئے رشتہ مصاہرت کی وجہ کر رائے پورہ فتوحہ میں آباد ہوئی اور خانقاہ بلخیہ فردوسیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس خانقاہ میں حضرت مخدوم جہاں کی مستند روحانی نسبت کے ساتھ ساتھ تصنیفات و تالیفات کا بھی گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔ مغتنم المشائخ حضرت مولانا حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

عظیم آباد پٹنہ میں اعلیٰ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین منعمی اور ان کی خانقاہ کا ذکر بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اعلیٰ حضرت موصوف نصف تیرہویں صدی ہجری تک بہار کے مقبول ترین صوفی کی حیثیت سے مصروف رشد و ہدایت رہے۔ متعدد پیرزادگان و تشنگان راہ سلوک نے آپ سے اپنی پیاس بجھائی اور دو درجن سے زیادہ باکمال خلفا آپ نے چھوڑے، اس برصغیر میں آپ کے سلسلے کی پچاسوں خانقاہیں مصروف خدمت ہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم آبادی کی تالیف جواہر الانوار عملی تصوف کا شاہکار ہے اور آپ کے ملفوظات انوار قمریہ اور اسرار قمریہ کے نام سے راہ فقر و درویشی کا عظیم سرمایہ ہیں۔ آپ کے صاحبزادے اور جانشیں حضرت سید شاہ مبارک حسین بیک وقت اپنے والد وجد کے علاوہ حضرت مخدوم منعم پاک کے متبرک سجادے پر بھی رونق افروز ہوئے اور خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ پٹنہ سٹی کے سجادہ نشینان انہیں بزرگوں کے اخلاف ہیں۔ پٹنہ، داناپور کے محلہ شاہ ٹولی میں خانقاہ سجادیہ کے اکابر حضرت شاہ محمد قاسم داناپوری اور حضرت سید شاہ سجادہ داناپوری اعلیٰ حضرت عظیم آبادی کے ہی تعلیم یافتہ و خلیفہ تھے۔ داناپور کی اس باعظمت خانقاہ کے مریدوں میں مولوی غلام امام شہید، اکبر الٰہ آبادی، شاد اکبر آبادی معروف ہیں۔ حضرت شاہ اکبر ابوالعلائی داناپوری اسی خانقاہ کے معروف ترین سجادہ نشیں تھے۔ ہنوز خانقاہ آباد ہے اور جناب سید شاہ سیف اللہ ابوالعلائی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ اسی خانقاہ کی ایک مقبول شاخ الٰہ آباد کے چک نیا حجرہ میں خانقاہ حلیمیہ ہے اور مولانا سید شمیم گوہر ابوالعلائی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

بہار کے ضلع گیا میں حضرت سید شاہ عطا حسین فانی داناپوری ثم گیاوی کی خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ مقبول ترین خانقاہ ہے۔ بانی خانقاہ بھی اعلیٰ حضرت عظیم آبادی کے مستند ترین خلفا میں ہیں۔ حضرت فانی کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں، کیفیت العارفین، کنز الانساب، دید مغرب وغیرہ ان کی مقبول ترین تالیفات ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ علاقہ عرب میں بھی ان کے مریدین و خلفا پھیلے ہوئے تھے۔ ہنوز آپ کی خانقاہ آباد و شاداب ہے۔ حضرت سید شاہ غلام مصطفیٰ احمد منعمی موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ شہر گیا میں خانقاہ مظاہریہ منعمیہ، خانقاہ منعمیہ رام ساگر گیا کی ایک معروف شاخ ہے اور آباد ہے۔ شہر گیا میں ایک اور مقبول خانقاہ مان پور میں خانقاہ قادریہ ہے جس کے موجودہ سجادہ نشیں حضرت شاہ ایاز احمد صاحب قادری ہیں۔

پٹنہ کے محلہ سملی میں حضرت سید شاہ غلام حسین ابوالفیاض قمری ابوالعلائی کی خانقاہ فیاضیہ گراں قدر اہمیت کی حامل ہے۔ آپ بھی اعلیٰ

حضرت سید شاہ قمر الدین عظیم آبادی کے خلیفہ خاص ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت سید شاہ علی حسین باقی اور پوتے حضرت سید شاہ فدا حسین فیاضی منعمی المعروف بہ سرکار پٹنہ کے ذریعہ سلسلہ منعمیہ قمریہ فیاضیہ کی شاخیں ہندوستان کے علاوہ بنگلہ دیش اور میانمار (برما) میں بھی قائم ہوئیں اور ہنوز آباد و شاداب ہیں۔ خانقاہ فیاضیہ سملی پٹنہ سٹی کے موجودہ سجادہ نشیں جناب سید شاہ منور حسین صاحب فیاضی ہیں۔ اسی خانقاہ کی ایک شاخ خانقاہ شاکریہ منعمیہ پنڈ ضلع شیخ پورہ بہار میں مصروف ہدایت ہے۔ پنڈ شریف کی خانقاہ کے ایک سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ قمر الہدیٰ منعمی مقبول مصنف، عالم اور صوفی گزرے ہیں۔ جناب سید شاہ رضوان الہدیٰ منعمی شاکری موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ خانقاہ پنڈ کی ایک ثمردار شاخ کیراپ رفیع گنج بہار میں سرسبز ہے۔ خانقاہ منعمیہ کراپ کے بانی مولانا شاہ عبد الرب منعمی مشہور اور مقبول ترین علما و شعرا و صوفیا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جناب سید شاہ ضیاء الرب موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

بہار کے بھاگلپور میں حضرت شاہ امداد علی منعمی مہدوی ابوالعلائی کی خانقاہ بھی بڑی مغتنم تھی۔ انہیں کریم چک چھپرہ کے منعمی شیخ وقت حضرت حکیم شاہ مہدی حسن کریم چکی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ مرزا خیل چاٹگام کے تشنہ کام حضرت شاہ مخلص الرحمٰن چاٹگامی اسی خانقاہ میں سیراب ہوئے اور کامیاب ہوکر چاٹگام میں ایک باعظمت خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ حضرت مولانا شاہ عبد الحیٔ چاٹگامی آپ ہی کے صاحبزادے اور لائق جانشیں تھے جن کی تصانیف و فتاوے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ مرزا کھیل چاٹگام بنگلہ دیش میں یہ خانقاہ اپنی خدمات میں آج بھی مستعد ہے۔ حضرت مولانا عارف الحیٔ المعروف بہ کمال میاں موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔ اس خانقاہ کی ایک شاخ حضرت نبی رضا شاہ صاحب المعروف دادا میاں کے ذریعہ لکھنؤ میں قائم ہوئی اور پھر ایک شمع سے ہزاروں شمعیں جل اٹھیں۔ آج اس پورے برصغیر میں حضرت نبی رضا شاہ صاحب کا سلسلہ ان کے سلسلے کے ایک بافیض خلیفہ اور قطب وقت حضرت صوفی محمد حسن شاہ صاحب قدس سرہ کے ذریعہ خوب خوب پھیل چکا ہے اور بھیسوڑی شریف اس سلسلہ کا ایک مضبوط فعال اور مقبول مرکز ہے۔ لکھنؤ میں حضرت صباحت شاہ جہانگیری موجودہ سجادہ نشیں ہیں اور بھیسوڑی شریف میں حضرت منے میاں صاحب کے بڑے بیٹے صوفی جاوید حسن شاہ صاحب موجودہ زیب سجادہ ہیں۔ لکھنؤ اور بھیسوڑی شریف کے ذریعہ اس برصغیر میں پچاسوں خانقاہیں قائم ہوئی ہیں اور یہ سب کی سب بڑی مقبولیت کے ساتھ فریضۂ دعوت و تبلیغ ادا کرنے اور سلسلہ منعمیہ جہانگیریہ تقسیم کرنے میں خوب خوب مصروف ہیں۔

بہار میں کشمیر کے راستے آنے والے اندرابیہ اور آبادانیہ سلسلے کی خانقاہیں بھی آباد ہیں۔ پٹنہ کے چوک شکار پور کی خانقاہ اندرابیہ نیپالی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی خانقاہ کے ایک ہونہار خلیفہ اور فرد خاندان غوث بنگالہ حضرت شاہ شمس الدین کی ذات بابرکت ہے جن کا آستانہ رانی گنج بنگال میں معروف ہے۔

آرہ ضلع بھوجپور بہار میں خانقاہ فریدیہ سلسلہ آبادانیہ مجددیہ کی مرکزی خانقاہ ہے۔ حضرت شاہ فرید الدین آروی کی یہ خانقاہ بہار کی مقبول اور بافیض خانقاہوں میں سے ایک ہے۔ اسی خانقاہ کا سلسلہ خانقاہ تیغیہ مظفر پور اور اس کی شاخوں سے خوب خوب پھیل رہا ہے۔

دانا پور پٹنہ کے شاہ ٹولی میں قطب وقت حضرت مخدوم سید شاہ یٰسین دانا پوری کی خانقاہ بھی بارہویں صدی ہجری میں ایک مقبول خانقاہ تھی۔ حضرت شاہ یٰسین دانا پوری کے والد ماجد حضرت سید شاہ محمد باصر کالپی سے ہجرت کر کے حاجی پور اور پھر پٹنہ کے کچوری گلی میں آباد ہونے والے باقری سادات کے خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ حضرت یٰسین دانا پوری کے نانا حضرت سید شاہ محامد رضوی اپنے والد حضرت سید شاہ جہانگیر رضوی دانا پوری کے مرید و مجاز اور جانشیں تھے۔ جب کہ ان کے والد اپنے نانا حضرت شاہ عبد المجید چشتی نوآبادی کے مرید و مجاز تھے۔ حضرت شاہ یٰسین دانا پوری کے پوتے حضرت سید شاہ غلام حسین دانا پوری کمال اعتقاد کے بعد حضرت مخدوم شاہ محمد منعم پاک کے مرید و مجاز ہوئے اور خرقۂ خلافت سے نوازے گئے اور تب سے اس خانقاہ میں منعمی فیضان جاری ہوا۔ حضرت سید شاہ غلام حسین دانا پوری کا سلسلہ ان کے پوتے حضرت سید شاہ عطا حسین فانی دانا پوری ثم گیاوی کے ذریعہ خوب خوب پھیلا۔ حضرت سید شاہ غلام حسین دانا پوری کے خلفا میں مولانا شاہ ظہور الحق عمادی سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب

پٹنہ سٹی بھی تھے۔ شاہ ٹولی کی اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشیں سید شاہ عمران احمد منعمی ہیں۔

بلیا ضلع بیگوسرائے بہار میں سلسلہ شطاریہ کی ایک خانقاہ ہنوز قائم ہے جس کے بانی مشہور بزرگ حضرت شاہ علاؤ الدین شطاری تھے۔ مظفر پور بہار کے رہوا میں حضرت سید علی ابدال قادری کی خانقاہ بھی علاقہ ترہت کی قدیم خانقاہوں میں سے ایک تھی۔ مظفر پور بہار میں حضرت شاہ قاضن علا شطاری کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ عبد الرحمٰن شطاری کی خانقاہ بھی سریا گنج میں قدیم اور مقبول خانقاہ تھی۔

پھلواری شریف پٹنہ میں خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف اور خانقاہ فریدیہ کی خدمات بھی قیمتی رہی ہیں۔ کاکو ضلع جہان آباد میں خانقاہ فریدیہ اور خانقاہ جلیلیہ بھی اس علاقے کی مشہور خانقاہیں رہی ہیں۔ پٹنہ میں حضرت شاہ باقر، حضرت شاہ حمزہ علی رند، حضرت شاہ غلام یحییٰ، حضرت مولانا شاہ سعید حسرت عظیم آبادی، حضرت شاہ دانش علی، حضرت شاہ جلال الدین کساروی، حضرت شاہ مہدی چشتی، حضرت شاہ معروف قادری، حضرت شاہ منصور اور حضرت شاہ نوزر اور حضرت شاہ مراد صفوی کی خانقاہیں بھی اپنے اپنے دور میں معروف رہی ہیں لیکن اب خاموش ہیں۔

پٹنہ کے شریعت آباد اور پٹنہ سٹی کے دولی گھاٹ شیش محل میں سلسلہ رشیدیہ کی خانقاہیں آباد ہوئیں۔ حضرت مولانا شاہ جعفر پٹوی اور حضرت شاہ علی ابراہیم رشیدی المعروف بہ پیر جی ان خانقاہوں کے بانی تھے۔ درگاہیں باقی ہیں۔ اوقاف بھی کسی قدر باقی ہیں لیکن خانقاہ کی عمارت اور باضابطہ خانقاہ داری باقی نہیں ہے۔ سلسلہ سجادگی قائم ہے اور حضرت سید شاہ زاہد سجاد جعفری موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

❁❁❁

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کی علمی وروحانی خدمات

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی ...... صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

گذشتہ تین صدیوں میں برصغیر کی جو بستیاں علم پروری، ادب نوازی، سخن سنجی، روحانیت وعرفان اور مردم خیزی میں بامِ عروج پر پہنچیں ان میں کاکوری ضلع لکھنؤ کا نام بہت سی جہتوں سے بہت نمایاں اور روشن ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں کی علمی وادبی اور روحانی فضا کی پرورش ونگہداشت اوراس کی شہرت اور قدر ومنزلت کی افزونی میں خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے بزرگوں کا کردار بہت اہم اور ناقابل فراموش رہا ہے۔ یہاں کے مسند نشینوں، ان کے مسترشدین اور وابستگان نے ہر دور میں وقت کی نبض پہچان کر اپنی گراں قدر تصنیفات وتالیفات سے اس کے دامن کو مزین کیا۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے حضرات نے اپنی شمیمِ اخلاق سے روحانیت کی ذہنی تشکیل کی۔ گردوپیش کے معاشرہ کی اصلاح کی اور اودھ کی جنتِ ارضی میں سازِ عشرت سے گونجنے والی صدائیں زمزمۂ حق میں بدل گئیں۔ انھوں نے فیضِ باطنی سے حیاتِ انسانی پر ایسا صیقل کیا کہ وہ صفاتِ الٰہی کا مظہر بن گئی۔ خانقاہ کاظمیہ کے سجادہ نشینوں نے اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کی مسند کو بھی زینت بخشی اور متوکل علی اللہ بن کر اپنے متعلقین، مریدین اور حاشیہ نشینوں کی ذہنی وروحانی تربیت کی۔ ان کے باوصف یہ تمام حضرات شریعت وطریقت اور علوم ظاہری وباطنی کا حسین امتزاج بھی رہے۔ سجادہ کاظمیہ کا یہ امتیاز بحمد اللہ آج تک قائم ہے کہ اس پر کسی غیر عالم کے قدم نہیں پڑے۔

انہوں نے دل بیار ودست بکار بن کر تصوف کے عملی ونظری دونوں پہلوؤں پر زور دیا اور کاکوری اوراس کے قرب وجوار کی فضا کو صرف عرفان وآگہی اور روحانیت سے ہی مالا مال نہ کیا بلکہ علمی وادبی اور تحقیقی میدان میں اپنے مریدین ومسترشدین کی ایسی باعمل اور مخلص جماعت ہر دور میں تیار کی جنھوں نے علم وادب، تاریخ وتصوف، ظرافت وصحافت، اور زبان وبیان کے نہ معلوم کتنے دریچوں کو وا کیا، ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ حسان الہند علامہ محسن کاکوروی کا نام اُردو نعت گوئی میں ایک اہم باب کا اضافہ ہے جن کا مشہور لامیہ قصیدہ

"سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل"

اپنی ندرتوں اور جدت طرازیوں کی بنا پر خاص وعام میں مقبول ہے۔ ان کے نامور فرزند مولوی نور الحسن نیر صاحب "نور اللغات" کی کاوشوں سے اُردو لغت مالا مال ہے۔ شیخ غلام مینا ساحر، فارسی نثر ونظم کی ایک بلند قامت شخصیت اور مرزا قتیل کے بقول مصحفی کے شاگرد نہیں بلکہ استاد۔ خانقاہ کاظمیہ سے فیض یافتہ ادبا وشعرا کی ایک کہکشاں ہے جس میں نواب امیر حسن خاں بسمل، رضا حسن خاں علوی، عبد المجید سحر، عبد الوحید نیرنگ، منشی سجاد حسین (اودھ پنچ)، جعفر علی شیون، اظہر علی آزاد، حافظ علی عسکری بیدل، معراج الدین خسرو، میر نذر علی درد، ڈپٹی امیر احمد علوی، مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی، نور الدین کیفی، مقصود احمد نطق، رضی علی اخگر، محب علی نیر، عبد الوالی حیدری، محمد عاصم قیس، محمد عالم قیصری، غلام مرتضی کیف، محمد ذکی خالدی وفا، اجتبی علی برق، اصطفی علی اصطفا، محمد رضا صابر، مومن علی خاں مفتون، ارتضا علی شرر، منشی احد علی صاحب شباب لکھنؤ، واحد علی بسمل صاحب خواب کلکتہ، معین الدین حسن علوی، ڈاکٹر ذکی کاکوروی، جوش ملیح آبادی وغیرہ ہیں۔ انگریزی ادب، تاریخ اور صحافت میں بھی بہت سے نام ہیں جن میں رفیق الدین علوی، قیصر تمکین، ڈاکٹر محمد تقی احمد، ڈاکٹر صفی احمد، شمیم طارق، سہیل کاکوروی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

خانقاہ کاظمیہ کے بزرگوں کی تعلیم وتربیت کا یہ وصف بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے مریدین ومسترشدین نے دنیاداری کے لباس میں دین داری کی اوراپنی پُراثر صحبت سے نہ جانے کتنے گم گشتگانِ راہ کو

ہدایت پر گامزن کیا اور غیروں کے لئے نمونۂ عمل بنے۔ منشی وہاج الدین قلندر، دنیا والوں کی نگاہ میں ایک بااصول اور قابل ڈپٹی کلکٹر اور اہل اللہ کی نظر میں ایک عارف، واصل باللہ، خان بہادر مولوی نظام الدین حیدر عباسی، ڈائریکٹر اگریکلچر مولوی ضیاء الدین حیدر نائب ناظم زراعت، غازی الدین احمد علوی، سشن جج منشی عبدالباقی علوی صوبہ وارد کن، امجد علی علوی ڈپٹی کلکٹر، نواب اکرام اللہ خاں نواب یار جنگ کمشنر، ڈاکٹر محمد ظہیر صدیقی (آئی اے ایس)، مظہر عزیز (کمشنر)، حسن مثنی کمشنر منشی تاج الدین جذب (جج)، منشی خلیل الدین خاں، سفیر شاہ اودھ، امیر عاشق علی خاں سفیر شاہ اودھ، حاجی مسیح الدین خاں سفیر شاہ اودھ، تقی یار جنگ تقی حسن علوی، جیسے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔

یہاں ان با کمال مریدین کی بھی کمی نہ رہی جنھوں نے خلق خدا کی فیض رسانی، رفاہی امور میں سبقت جیسے امور کو زندگی کا جزو بنایا ان میں منشی امتیاز علی علوی وزیر بھوپال، خان بہادر منشی اطہر علی علوی (ندوۃ العلما کے بانیوں میں ایک اہم مخیر شخصیت) معراج الدین خسرو وغیرہ اہم ہیں۔ فیض تعلیم وتربیت سے وابستہ محدثین وفقہا بھی ہیں جن میں مولوی فریدالدین خاں محدث، مفتی حکیم الدین خاں، مقصود احمد نطق، جیسے بہت سے نام ہیں۔

بانی خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندری علوی:

بانی خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندری علوی (1158ھ۔1745ء/ 1221ھ۔1806ء) مخدوم زادگان کاکوری کے ایک معزز صاحب علم خانوادہ کے فرد تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ حضرت مخدوم قاری نظام الدین قادری عرف شاہ بھکاری قدس سرہٗ عہد اکبری کے ایک ممتاز عالم، صاحب تصرف بزرگ تھے جن کی خدمت میں دو مرتبہ جلال الدین محمد اکبر، اولاد کی تمنا میں حاضر ہوا اور آپ کے اس ارشاد پر کہ تمہاری قسمت میں اولاد شیخ سلیم چشتی کی دعا اور تصرف پر منحصر ہے، اس نے فتح پور سیکری کا رُخ کیا۔ اس کے داماد سلطان یعقوب اور دائی ماہم انگہ (ماہی ماتکہ) کے قبور بھی آپ کے مزار کے پائیں ہیں جن پر اس کا بنوایا ہوا عالی شان مقبرہ موجود ہے۔ حضرت مخدوم شیخ بھکاری قدس سرہٗ شمالی ہندوستان میں پھیلے ہوئے ایک عظیم قادری سلسلہ عالیہ برکاتیہ، جس کی ایک شاخ بریلی وبدایوں میں ہے، کے جدِ طریقت ہیں۔

حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر بن حضرت شاہ محمد کاشف چشتی نے ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں بخشی ابوالبرکات خاں عباسی ناظم گورکھپور کے حکم پر ان کے ہمراہ شجاع الدولہ والی اودھ کی فوج میں ملازمت کی۔ طلب حق میں رات دن سرگرداں رہنے والی ذات، شمشیر وسناں کا کب تک ساتھ دیتی۔ 1764ء کی بکسر کی جنگ سے قبل ہی وہاں سے رخصت لے کر پاپیادہ سلسلہ قادریہ قلندریہ کی مشہور ہستی حضرت سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ حضرت نے طلب صادق اور جوہر قابل ملاحظہ فرما کر اگلے روز بیعت فرمایا اور وطن میں قیام کا حکم دیا نیز دس سال کی ریاضت شاقہ اور مجاہدات کے بعد خلافتِ کبریٰ سے سرفراز فرما کر دستِ خاص سے جو اجازت نامہ تحریر کیا اس میں وضاحت فرمادی کہ:

''میرے بھائی شاہ محمد کاظم قلندر اس مرتبہ پر پہنچ چکے
ہیں جس سے بلند اولیاء اللہ کے لئے دوسرا مقام نہیں۔
ان کا مقبول میرا مقبول اور ان کا مردود میرا مردود ہے۔''

پیرومرشد کے ارشاد کے مطابق مستقلاً وطن میں قیام کیا۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں برکات کاظمی سے بقدر ظرف سیراب ہوسکیں۔

آپ کے اخلاص عمل، للّٰہیت، خودشناسی وخداشناسی کی تعلیم کے اثر سے دلوں کی دنیا بدل گئی۔ عوام وخواص ہندو مسلمان سبھی فیض یاب ہونے لگے۔

زیمن اُوشود عالم نمازی
ہمہ اطفال بگذارند بازی

کاکوری اور اس کے قرب وجوار کے لوگ اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے کہ اٹھارہویں صدی کے پُرآشوب و پرفتن دور میں علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ رکھنے والا، صفائی باطن، تزکیۂ نفس وتجلیۂ روح کے سامان بہم کرنے والا، اتباع سنت پر سختی سے گامزن، ظاہر وباطن کے تضاد سے کوسوں دُور، خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار، مخلوقِ خدا کی فلاح وبہبود کے لئے ہر لمحہ بے قرار، شقاوتِ ازلی کو سعادتِ ازلی میں تبدیل کرنے والے نسخوں کی تیاری میں

منہمک ایک مرد قلندر اٹھتا ہے اور اپنے عزم پیہم، نصرت خداوندی اور جہدِ مسلسل سے دلوں کی دنیا بدل ڈالتا ہے اور لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کردیتا ہے۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی

خانقاہ کاظمیہ کے گل سرسبد حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی، شارح ''سانت رس'' تحریر فرماتے ہیں:

''عین اس عالم یاس وقنوطیت میں، اس جمود وانحطاط کے دور میں اودھ کے قصبہ کاکوری میں وہ شمعِ روحانیت فروزاں ہوئی جس کے فیضِ نظر نے ہزارہا ذرّہ ہائے خاک کو اپنی اکسیر نظر سے کیمیا بنا دیا، جس کے سینۂ سوزاں کی تپش نے ہزاروں کے دل محبت سے زندہ کردیے، جس کے سوزِ قلبی نے دلوں میں سازِ آرزو چھیڑ کر حق سے ملادیا۔ یہ تھے عارف باللہ صاحب السر شاہ محمد کاظم قلندر رحمۃ اللہ علیہ بزمِ عرفان کے صدر نشین اور گلشنِ معرفت کے گلِ سرسبد۔''

حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ کی قلمی یادگاروں میں چار چیزیں محفوظ ہیں:

(1) رسالہ معمور داشتن اوقات: جس میں مختلف اوقات کی نمازوں، عبادتوں اور اوراد و وظائف کا بیان ہے، نیز انسان کی تخلیق کا مقصد بھی بیان فرمایا ہے۔ ''بداں کہ آدمی برائے بازی نیا فریدہ بلکہ برائے عبادت خود ماخلقتُ الجنّ والانس الالیعبدون۔ پس چارہ نیست کہ اوقات خود صرف عبادت حق کند و ساعات شبانہ روز بطوری کہ فرمودہ اند بگزارند۔''

(2) مجمع الفوائد: 183 صفحات اور ستاون فوائد پر مشتمل قلمی شکل میں موجود ہے جس میں مختلف آیات و دعاؤں کے فضائل وخواص، زیارتِ قبور، آدابِ سفر، تصوف کے مختلف مباحث، سلوک کی سات وادیوں کا بیان وغیرہ ہے۔ فرماتے ہیں: ''بداں کہ اوّل چیز یکہ مخلوق شد عقل بود۔ و از اسہ معرفت پیدا شد۔ یکی معرفتے خود، دویم معرفت حق، سویم معرفت احتیاج بحق۔''

(3) نغمات الاسرار معروف بہ سانت رس:
حضرت عارف باللہ قدس سرہٗ کے ہندی کلام (اودھی و برج زبان) پانچ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار اشعار مع ترجمہ وشرح طبع ہوچکے ہیں۔ اس کا مکمل مطبوعہ نسخہ موجود ہے جس میں آپ نے ہندی کے پریم رس کو بڑے سلیقہ اور اثر انگیزی کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔

مکتوبات:

حضرت عارف باللہ کے ان مکتوبات کی تعداد دوسو سے متجاوز ہے جو مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہیں جن کی زبان بڑی سلیس و سادہ، تصنع وتکلف سے پاک ہے۔ ان میں سے بعض مکتوبات مطبوعہ ہیں جو مکتوباتی ادب میں ایک بڑا اضافہ ہے۔

حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر کے وصال کے بعد آپ کے دو قابلِ ذکر صاحبزادوں نے آپ کے پیغام عمل وخیر کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کے سجادہ پر آپ کے بڑے صاحبزادہ غوث ملت شاہ تراب علی قلندر (1181ھ-1768ء/1275ھ-1858ء) فروکش ہوئے اور والد گرامی کے نام میں چار چاند لگائے۔ انھوں نے اپنے مخصوص اور منفرد طریقۂ تربیت واصلاح سے بکثرت لوگوں کو دولتِ باقی سے ہم کنار فرمایا اور مقصد حیات سے انجان اور نابلدوں کو عرفان ذات بخشا۔ تذکرہ وتاریخ تصوف اور اخلاق وکردار کو سنوارنے و سجانے کے واسطے ایک طرف بڑی قابلِ قدر تصانیف فرمائیں اور دوسری طرف اپنی فارسی، اُردو اور ہندی شاعری کے ذریعہ ایک انقلابی روح پھونکی۔ انھوں نے اپنے دور کے اکابر وجید علما سے اور اپنے والد ماجد سے تعلیم وتربیت کا حصول واخذ فیض کیا اور ان کے آئینۂ کمال بنے۔

تصانیف:

(1) مقالات الصوفیہ: یہ فارسی تصنیف مطبوعہ ہے جس میں حضرت امام جعفر صادق، حضرت حسن بصری، حضرت مالک بن دینار، حبیب عجمی، رابعہ بصریہ، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، حسین بن منصور حلاج، امام غزالی، سلطان ابوسعید ابوالخیر، مولانا جامی، بہاؤ الدین نقشبند قدس سرہم وغیرہ کے موثر ودل نشیں اقوال درج ہیں جو راہِ سلوک میں قدم رکھنے والوں کے لئے لابدّی ہیں۔ شاہ صاحب قدس

سرہ' کی زبان بڑی سلیس ورواں ہے۔

(2)**فتح الکنوز**: اخلاق وتصوف میں یہ اہم فارسی تصنیف بھی مطبوعہ ہے، اس میں بیس فصلوں کے تحت بڑے اہم نکات درج کیے گئے ہیں مثلاً:

(1) دربیان شامت معاصی (2) دراحوال معراج شریف (3) درآداب وشرائط ذکر (4) دراحوال قلم ولوح محفوظ (5) دربیان تجلیات و اقسام آں (6) دربیان نسبت حق بعالم (7) درنعت ونشانہائے جواں مرداں (8) دربیان وقائع غیبی وبیان فرق درمیان واقعہ وخواب وغیرہ۔

(3)**اصول المقصود**: یہ مفید فارسی تصنیف اصلاً حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے حالات وواقعات اور ملفوظات پر مشتمل ہے۔ مختصراً سرگروہ قلندراں حضرت شیخ عبدالعزیز مکی قلندر سے حضرت شاہ محمد کاظم قلندر تک بزرگوں کا ذکر ہے۔ کتاب کے آخر میں حضرت شاہ کاظم قلندر کے فیض یافتگان کا بھی اجمالی ذکر ہے۔ 1312ھ میں 536 صفحات و متوسط تقطیع پر لکھنؤ سے طبع ہوچکی ہے۔

(4)**کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری**: اپنے جداعلیٰ مذکورالصدر کے مفصل حالات وکوائف میں ایک دیباچہ اور سترہ فصلوں پر مشتمل، 204 صفحات پر محیط یہ کتاب 1254ھ میں تالیف فرمائی۔ 1318ھ/ 1900ء میں لکھنؤ سے طبع ہوچکی ہے۔ حضرت مولف نے آخر میں اپنا بھی مختصر حال درج فرمایا ہے۔

(5)**شرائط الوسائط**: تصوف وسلوک، آداب طریقت، شرائط درویشی، پیرو مرید کے باہم رشتے، شیخ کا مرتبہ، مریدین کے فرائض وغیرہ کے ضمن میں 132 صفحات پر مشتمل یہ مفید عام تصنیف بھی 1293ھ/ 1876ء میں طبع ہوچکی ہے۔

(6)**مطالب رشیدی**: فن اخلاق وتصوف، معاشرت، معاملات، اورادووظائف، ادعیۂ ماثورہ دیگر مسائل اور پیدائش کے قبل سے موت کے بعد تک کے بیشتر امور پر حاوی یہ مفید کتاب حضرت مصنف نے ۷۵ برس کی عمر میں اپنے شاگرد رشید مرید مولوی رشید الدین خاں علوی بن مفتی خلیل الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ کی تعلیم و تربیت کی غرض سے تصنیف فرمائی جو ایک مقدمہ، ساٹھ مطالب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ 1280ھ میں 377 صفحات پر مشتمل لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(7)**مجاهدات الاولیاء**: اس کتاب میں حضرات صوفیہ کے مجاہدات وریاضات کا بیان ہے۔ 312 صفحات پر مشتمل یہ تصنیف 1268ھ میں مرتب ہوئی۔ اس کا اصل ماخذ طبقات صوفیہ، تذکرۃ الاولیا، نفحات الانس، اخبارالاخیار اور بعض حضرات چشتیہ وقلندریہ کے ملفوظات ہیں۔ یہ بھی مطبوعہ ہے۔

(8)**اسناد المشیخت**: اس میں حقیقتِ بیعت، اس کے فوائد، اس کے اثبات میں علماوصوفیہ سے منقول اقوال ودلائل، بیعت و اجازت وخلافت کے آداب اور دوسرے متعلقہ امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ 151 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ وجہ تالیف کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> ''بداں کہ دریں زمانہ اکثریت از مقلدین درویشاں و ملبس بہ لباس ایشاں خودرا بصورت صوفیاں آراستہ و سیرت جاہلاں پیراستہ دست بیعت می دہد و بے تکلف مرید کنند حالانکہ نہ خود بکسے ارادت دارند نہ ازعلم بیعت واقف کارند مگر طریقہ مریدی را پیراستہ ورسم پیری را دست فردی انداشتہ اندالخ۔''

(9)**تعلیم الاسماء**: اورادووظائف واعمال سے متعلق 366 صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ بخط مؤلف موجود ہے۔ اس میں عملیات کے خواص وفوائد کے ساتھ، ادعیہ واوراد وسور قرآنی، وظائف واوراد کی زکوۃ، نصاب اور دیگر امور کی تحقیقات رقم فرمائیں۔ یہ 61 فصلوں پر مشتمل ہے۔

(10)**مکتوبات حضرت سیّد شاہ مجتبیٰ عرف مجا قلندر لاهرپوری**: حضرت شاہ مجا قلندر کے 46 خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے مختلف طالبین ومریدین کی تعلیم کے واسطے تحریر فرمائے۔ 72 صفحات پر مشتمل یہ مکاتیب 1315ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔

(11)**شجرات طیبات سلاسل عالیه ثمانیه**: 8 سلاسل تصوف قادریہ، قلندریہ، چشتیہ، طیفوریہ، سہروردیہ،

فردوسیہ، مداریہ اور نقشبندیہ پر مشتمل یہ مختصر منظوم رسالہ 1280ھ/ 1263ء میں طبع ہو چکا ہے۔

(12) **کلیات فارسی**: آپ کا فارسی کلیات، جس میں ترجیع بند، مخمس کریما، مثنوی اصل المعارف بھی دیوان کے ساتھ شامل ہے، تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا کلام آپ کے مشرب اور مسلک وموقف کا آئینہ دار ہے۔ اس میں دو سو گیارہ مختصر وطویل غزلیں ہیں۔

(13) **کلیات اُردو**: آپ کا اُردو کلیات بھی متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس میں چھ ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ ایک مثنوی ''عاشق وصنم'' بھی تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ کا اُردو کلام مقصود بالذات نہیں بلکہ اس میں عمل وخیر کا ایک مؤثر پیغام ہے۔ بعض غزلیں سہل ممتنع کا بہترین مرقع ہیں۔ مثنوی ''عاشق وصنم'' سلاست و روانی اور برجستگی میں اپنی مثال آپ ہے اور سوائے میر حسن کے دوسری کوئی مثنوی اس کے مقابل نہیں۔ فارسی و اُردو اور ہندی کلام پر تبصرہ بجائے خود ایک رسالہ کا متقاضی ہے۔

(14) **امرت رس**: آپ نے اپنے والد ماجد کی طرح ہندی کلام بھی اپنی یادگار چھوڑا جو اپنی اثر آفرینی کی بنا پر آپ کی حیات میں ہی مقبول خاص وعام ہو چکا تھا ۔

نیکی لگت موہے اپنے پیا کی
آنکھ رسیلی لاج بھری رے
کاہے تراب ڈرے کا ہوسے
پریت کری کا چوری کری رے
(1185ھ-1769ء/9224ھ)

حضرت شاہ حمایت علی قلندر: 1811ء حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ والد ماجد سے تحصیل علم کے بعد حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ سے تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد درس وتدریس کی مسند کو زینت بخشی اور 40 سال کی قلیل عمر میں بکثرت لوگوں کو فیض یاب فرمایا۔ مندرجہ ذیل 4 کتابیں آپ کی یادگار ہیں:

(1) **رکاز الاصول شرح فصول اکبری**: سیّد علی اکبر فیض آبادی نے فصول اکبری میں عربی صرف کے قواعد بیان کیے ہیں۔ رکاز الاصول اس کی ایک بہترین فارسی شرح ہے۔ 277 صفحات پر بڑی تقطیع میں یہ مفید کتاب متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(2) **نور لاریب فی ترجمۂ فتوح الغیب**: فتوح الغیب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ یہ اس کا بہترین فارسی ترجمہ ہے۔ جس میں نہ نفسِ مضمون خبط ہوا اور نہ ترجمہ کی روح مجروح ہوئی۔ 1323ھ/1905ء میں لکھنؤ سے طبع ہو چکا ہے۔

(3) **ملہم الصواب فی انحاء طریقۂ اولی الالباب**: اس کتاب میں مولف کو جن 8 سلاسل طریقت کے سلوک وتعلیمات کا درس ان کے والد ماجد نے دیا تھا ان کا باتفصیل تذکرہ ہے۔ 1226ھ کا یہ اہم مخطوطہ بخط مؤلف 328 صفحات پر مشتمل موجود ہے۔ اس میں طریقت کے بہت سے مسائل اور سلوک سے متعلق فوائد کا بیان ہے۔ ایک مقدمہ، دس مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

(4) **معدن علوی**: تعویذات ونقوش سے متعلق 266 صفحات پر مشتمل یہ قلمی تصنیف اپنی اہمیت کے لحاظ سے خاص ہے۔ اس کا سن تالیف 1206ھ ہے۔

حضرت شاہ تقی علی قلندر (1213ھ-1798ء/ 1290ھ- 1875ء): حضرت شاہ تراب علی قلندر کے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے عم مکرم شاہ حمایت علی قلندر سے اور پھر برادر معظم شاہ حیدر علی قلندر (1284ھ/1868ء) اور ملا محمد مستعان کا کوروی (1237ھ/ 1823ء) سے حاصل کی۔ ان کے فضل وکمال، علمی تبحر اور تفقہ فی الدین نیز علوم عقلیہ ونقلیہ میں مکمل دست گاہ کی گواہی ان کے معاصرین علما نے دی ہے۔

(1) **روض الازھر فی مآثر القندر**: یہ ضخیم ومفید فارسی تصنیف دراصل تصوف کا دائرۃ المعارف ہے۔ حضرت شاہ تراب علی قلندر کے ملفوظ کی حیثیت سے مرتب کی گئی یہ تصنیف سیکڑوں کتابوں کے مآخذ پر مشتمل ہے۔ دورانِ تصنیف اکثر فرماتے کہ مضامین کا میرے قلب پر اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ اگر نہ لکھوں تو شاید قلب شق ہو جائے۔ ایک مبسوط مقدمہ اور 9 لطائف پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں علم وعلما کی فضیلت، تقسیم سالکان اور اہلِ سلوک کی تعریف کا بیان ہے۔ لطیفہ اوّل میں دو وصل ہیں۔ پہلا وصل تین فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات اور آپ کے والدین ماجدین کے ایمان پر مدلل بحث ہے وغیرہ۔

حضرت مولانا شاہ علی اکبر قلندر (1249ھ/1833ء۔ 1314ھ.....) حضرت شاہ حیدر علی قلندر (1284ھ/1868ء) کے صاحبزادہ اور حضرت شاہ تراب علی قلندر (1275ھ/1858ء) کے آئینہ کمال نبیرۂ اجل تھے، والد ماجد کے وصال کے بعد مسند کاظمی پر رونق افروز ہوئے اور اس کی شہرت و ناموری میں اضافہ فرمایا۔ جملہ علوم درسیہ کی تکمیل اپنے عم محترم مولانا شاہ تقی علی حیدر (1290ھ/1875ء) سے کی اور تصوف کی تعلیم والد ماجد، جدامجد اور عم مکرم سے پائی۔

(1) **اصل الاصول فی بیان السلوک والوصول**: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مقدمہ، چار اصل اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے جس میں ولایت کا بیان، ولی کی علامت، ارباب ولایت کے اوصاف، مرید کے پیر کے روبرو آداب، ولایتِ عامہ وولایتِ خاصہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ یہ رسالہ مطبوعہ ہے۔

(2) **ھدیۃ المتکلمین**: 30 صفحات پر مشتمل یہ مختصر و جامع رسالہ میلاد شریف نبوی میں قیام کے اثبات کے ضمن میں ہے۔ 1290ھ/1875ء میں لکھنؤ سے طبع ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر (1269ھ۔1852ء/ 1324ھ۔1905ء): حضرت شاہ علی اکبر قلندر کے نام ور اور فخر اسلاف صاحبزادہ اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد سجادہ کاظمیہ پر فروکش ہوئے۔ ان کا دس سالہ دور سجادگی بہت سی خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ خانقاہ کاظمیہ کی نشاۃ ثانیہ، غیر معمولی علمی وادبی سرگرمیاں، مریدین ومسترشدین کی ظاہری و باطنی تربیت، آداب خانقاہی پر زور وغیرہ کے لئے بہت اہم ہے۔ حضرت شاہ علی انور قلندر کی تعلیم وتربیت میں ان کے والد ماجد، جدین امجدین اور حضرت شاہ تراب علی قلندر (پردادا) کے کردار لائق ذکر ہیں۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں ان کی بالغ نظری، ژرف نگاہی، غیر معمولی تبحر، حزم و احتیاط، تحقیقی مزاج میں دُور دُور تک ان کا ثانی نہیں۔ ان کی گراں قدر علمی کاوشیں ارباب علم ودانش کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں:

(1) **تحریر الانور فی تفسیر القلندر**: (فارسی) 46 صفحات پر مشتمل یہ فارسی رسالہ آپ نے محض ایک جلسہ میں لکھ کر اپنے استاد محترم اور جدامجد مولانا شاہ تقی علی قلندر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس میں لفظ قلندر کے معنی اور تعریف کو تفصیل سے بیان فرمایا اور مقام قلندریت پر فائز بزرگوں کا اجمالی تذکرہ بھی کیا۔ پہلی مرتبہ 1290ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے اور دوبارہ 1313ھ میں مفید حواشی کے ساتھ مطبع سرکاری ریاست رامپور سے شائع ہوا۔

(2) **حوض الکوثر تکملہ روض الازھر فی مآثر القلندر**: (فارسی) حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر قدس سرہٗ نے روض الازھر فی مآثر القلندر کے نام سے اپنے والد محترم مولانا شاہ تراب علی قلندر کے ملفوظات میں ایک ضخیم کتاب لکھنی شروع کی تھی جو ایک مقدمہ اور 10 لطیفوں اور خاتمہ پر مشتمل ہونا تھی کہ مصنف نے سفر آخرت فرمایا۔ چنانچہ حضرت حافظ صاحب نے لطیفہ دہم دربیان عشق ومحبت کی ماہیت اور اقسام بڑی شرح وبسط سے تحریر فرمائے اور حضرت شاہ حیدر علی قلندر اور حضرت شاہ تقی علی قلندر کے حالات وملفوظات بڑی تقطیع میں 325 صفحات پر مشتمل درج کیے۔ یہ ضخیم تصنیف 1336ھ میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(3) **زواھر الافکار شرح جواھر الاسرار**: (فارسی) شیخ محمد مقیم ہروی نے جواہر الاسرار کے نام سے قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے متعلق اشکال اور تصوف سے متعلق کچھ سوالات لکھے تھے۔ شارح قدس سرہٗ نے نہ صرف ان سوالات کے مدلل اور محقق جوابات دیے بلکہ مزید 9 سوالات کے جواب لکھے۔ یہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے منجھلے صاحبزادے مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کے اُردو ترجمہ کے ساتھ متوسط تقطیع پر 116 صفحات میں اصح المطابع لکھنؤ سے 1341ھ/1922ء میں شائع ہوئی۔

(4) **قول المختار فی مسئلۃ الجبر والاختیار**: (فارسی) جبر واختیار کے مسئلہ پر ایک مقدمہ، 6 اصول اور پانچ تمہیدوں پر مشتمل یہ رسالہ اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ 68 صفحات پر یہ رسالہ مع اردو ترجمہ از مولانا شاہ تقی حیدر قلندر 1342ھ/1923ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(5) **فاتح الابصار** : (فارسی) یہ رسالہ سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ کے گیارہ سوالات کے ان شافی اور اطمینان بخش جوابات پر مشتمل ہے جو آپ نے دیے تھے۔ مثلاً رویت باری تعالیٰ قیامت میں کس طرح ہوگی؟ خدا کون ہے؟ جبرئیل کہاں ہیں؟ اگر وحدت وجود کا مسئلہ سچ ہے تو عذاب وثواب کیا ہے؟ یہ بھی آپ کے خلف اوسط مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کے اُردو ترجمہ کے ساتھ 1340ھ میں مطبع سرکاری ریاست رامپور سے شائع ہوا۔

(6) **القول الموجہ فی تحقیق من عرف نفسہ فقد عرف ربہ** : (فارسی) 256 صفحات پر مشتمل یہ تصنیف بھی آنجناب کے ابتدائی دور کی ہے۔ اس میں اس مشہور ارشاد ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا'' کی تحقیق اور اس کے معانی ومطالب کی بڑی دلنشین اور مؤثر پیرایہ میں تشریح فرمائی ہے۔ نفس انسانی کی حقیقت خداشناسی وخودشناسی، خطرات وہوا جس، وسوسے، الہام کی اقسام، تعریف، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کے باہمی فرق وغیرہ کا بڑا جامع بیان ہے۔ 1329ھ میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(7) **الانتصاح عن ذکر اھل الصلاح** : (فارسی) صوفیہ ومشائخ کے تذکرہ پر مشتمل یہ تصنیف 1294ھ/ 1877ء میں 163 صفحات پر مشتمل شائع ہوئی تھی۔ دیباچہ اور سبب تالیف کے بعد سلاسل قلندریہ، قادریہ، رضویہ، چشتیہ، سہروردیہ، طیفوریہ، مداریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے حالات اور کچھ مسائل طریقت نیز ضمیمہ میں چار پیر وچودہ خانوادوں کا اجمالی تعارف، بیعت صغیر وکبیر، قبر میں شجرہ رکھنے اور مشائخ کی خلافت کی اقسام وغیرہ کا نہایت تحقیق وجامعیت سے بیان ہے۔ مقامات اور ناموں کی بڑی تحقیق ہے۔

(8) **الدرّ الیتیم فی ایمان آباء النبی الکریم** : (عربی) جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین ماجدین کے ایمان کے سلسلہ میں ہے۔ جن لوگوں نے ان کے ایمان کے سلسلہ میں اعتراض وانکار کیا ان کے مدلل وخاموش کن جوابات دیے اور علمی واستدلالی طریقہ سے محاکمہ فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں مولوی وکیل احمد سکندر پوری کے دو سوالات کے تفصیلی جوابات دیے۔ یہ رسالہ 1341ھ/ 1921ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے 64 صفحات پر مشتمل شائع ہوا۔

(9) **کشف الدقائق عن رموز الحقائق** : (فارسی) سلوک وتصوف کے مسائل پر مشتمل یہ رسالہ ان 19 سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو مختلف حضرات نے وقتاً فوقتاً آپ سے کیے اور آپ نے ان کے اطمینان بخش جوابات دیے مثلاً مرتبہ ذات کیا ہے؟ مشاہدہ ومکاشفہ اور تجلی کے درمیان کیا فرق ہے؟ توحید کیا ہے؟ دل کیا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام کی حقیقت کیا ہے؟ نبوت افضل ہے یا ولایت؟ جس وقت حضرت جبرئیل، حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں متشکل ہوتے تو دحیہ کلبی کی اصلی صورت کہاں جاتی اور جبرئیل کی یہ نوعی صورت کہاں ہوتی تھی وغیرہ۔ یہ رسالہ 1341ھ/ 1922ء میں 104 صفحات پر مشتمل مطبع سرکاری ریاست رامپور میں چھپا۔

(10) **تصفیہ شرح التسویۃ** : (فارسی) التسویۃ بین الافادۃ والقبول حقائق ومعارف پر مشتمل شیخ کبیر شاہ محب اللہ الہ آبادی (1058ھ/ 1648ء) کا ایک مشکل ترین رسالہ ہے۔ شارح علیہ الرحمۃ نے شرح کا حق ادا کردیا۔ انھوں نے یہ شرح اپنے جدامجد حضرت شاہ حیدر علی قلندر قدس سرہٗ کے مرید خاص آغا محمد صادق حسین صفی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ آخر میں حضرت شاہ محب اللہ کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ متوسط تقطیع کے 21 سطری 160 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ 1343ھ/ 1924ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(11) **نخبۃ الصوارف فی شرح خطبۃ العوارف** : (فارسی) اس رسالہ میں شارح قدس سرہٗ نے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی (632ھ/ 1234ء) کی مشہور ومقبول تصنیف ''عوارف المعارف'' کے خطبہ کی جامع شرح کی ہے۔ 84 صفحات پر مشتمل اصح المطابع سے 1342ھ/ 1922ء میں شائع ہوا۔

(12) **تنویر الافق فی شرح تبیین الطرق** : (فارسی) شیخ علی بن حسام الدین متقی جونپوری برہان پوری (م975ھ/ 1567ء) کا عربی میں تصوف وسلوک پر ایک الہامی رسالہ تبیین الطرق ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے 1299ھ/ 1881ء میں اس کی فارسی شرح لکھی۔ فارسی شرح 160 صفحات پر

مشتمل 1343ھ/ 1924ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(13) **الدرّ الملتقه فی شرح تحفة المرسله** :(فارسی) شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (1029ھ/ 1620ء) کا عربی زبان میں تصوف کے کچھ حقائق ومعارف پر مشتمل رسالہ تحفة المرسله ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس کی ایک عمدہ اور بصیرت افروز فارسی شرح لکھی جو آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر قدس سرہٗ کے اُردو ترجمہ کے ساتھ 230 صفحات پر مشتمل 1343ھ/ 1924ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے طبع ہوئی۔

(14) **الفیض التقی فی حل مشکلات ابن العربی** :شیخ اکبر محی الدین ابن عربی پر علمائے ظاہر کی جانب سے کیے گئے بعض اعتراضات کے فارسی میں مدلل ومسکت جوابات اور ان کی تصانیف کے بعض اشکالات کے تشفی بخش حل پر مبنی یہ محققانہ تصنیف 1290ء میں مکمل ہوئی۔ مطبوعہ ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

(15) علاوہ ازیں تفسیر سورۂ یوسف (ناتمام)، (16) حواشی میر زاہد ملا جلال، (17) رشحات انوری شرح لمعات عراقی، (18) گلدستہ نثر پروین، وغیرہ آپ کی ادبیت، فارسی نثاری اور عبقریت کی شاہد اور گواہ ہیں۔ (19) آپ کی مکتوبات موسومہ بہ جواہر المعارف بھی ارباب تصوف وسلوک کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں۔ فارسی تصانیف کے علاوہ آپ نے اُردو میں بھی وقت اور ضرورت کے لحاظ سے نہایت گراں قدر، وقیع اور مستند تصنیفات تحریر فرمائیں جن سے آپ کی ہمہ جہت شخصیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے۔

(20) **الدرة البیضاء فی تحقیق صداق فاطمة الزهرا** :(اُردو) اس کتاب میں حضرت سیّدہ فاطمہ زہرا اور ازواجِ مطہرات ودیگر بنات طاہرات کے مہر، دیگر مسائل وفوائد نکاح کی حدیث وفقہ کی روشنی میں مدلل تحقیق کی۔ یہ کتاب 204 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1340ھ/ 1921ء میں مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(21) **احسن الافادة لارباب الارادة**: المعروف بہ رسالہ بیعت زوجہ بازوج۔ یہ مختصر رسالہ بھی چھپ چکا ہے۔ شاہ صاحب نے عقلی ونقلی دلائل سے اس مسئلہ کی وضاحت وتشریح فرمائی ہے۔

(22) **نفح الطیب فی ذکر مولد الحبیب** :(اُردو) 86 صفحات پر مشتمل میلاد شریف کا یہ رسالہ محرم 1305ھ/ 1887ء میں مطبع احمدی کانپور سے شائع ہوا۔

(23) **تسلیة الفواد عن ذکر خیرالعباد** :(اُردو) اس رسالہ میں بیانِ ولادت شریف کے علاوہ شمائل نبوی کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ 40 صفحات، متوسط تقطیع پر صفر 1305ھ/ 1887ء میں مطبع احمدی کانپور سے طبع ہوا۔

(24) **شمامة العنبر فی میلاد خیرالبشر** :(اُردو) یہ رسالہ 66 صفحات پر مشتمل ہے۔

(25) **زاد الغریب فی منزل الحبیب** :(اُردو) یہ رسالہ بھی متوسط تقطیع کے 96 صفحات پر مشتمل مطبع سرکاری ریاست رامپور سے 1908ء میں طبع ہوا۔

میلاد شریف کا موضوع اگر چہ چاروں رسائل میں مشترک ہے۔ مگر پھر بھی ہر رسالہ اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ جو شاہ صاحب کی علمیت اور ندرت تحریر کی ایک روشن دلیل ہے۔

(26) **شهادة الکونین فی شهادة الحسنین** :المعروف بہ شہادت نامہ کلاں (اُردو): ساڑھے تیرہ سو سال میں اہلِ بیت اطہار کے سیر وسوانح اور کربلا کے الم ناک وروح فرسا سانحہ پر ہر دور میں بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی لوگ افراط وتفریط کے گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض کتابوں میں ایسے مبالغہ آمیز واقعات وروایات ہیں جن سے اصل واقعات پر پردہ پڑ گیا۔ اور بعض نے قساوت قلبی اور تشدد کی انتہا کی بناء پر ان مصائب اور آلام کا سرے سے انکار کیا۔ حضرت مصنّف قدس سرہٗ نے اس شہادت نامہ میں نہایت تحقیق وجستجو اور تفحص کے بعد صرف ان ہی مستند روایتوں کو جمع کیا ہے جو معتبر مورخین وارباب تحقیق کے معیار اور کسوٹی پر بالکل کھری اُتری ہیں۔ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر اس کو ہر طبقہ کے علما اور عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی یہی مقبولیت اس کی متعدد اشاعتوں کا ثبوت ہے۔ اس شہادت نامہ میں حضرت مولف کے جا بجا صدہا اشعار موجود ہیں۔ یہ آخری مرتبہ بڑی تقطیع کے ڈھائی سو

صفحات پر 1328ھ/ 1910ء میں مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے طبع ہوا۔

(27) الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم : (اُردو) حضرت غوث الاعظم سیّدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی معروف بہ بڑے پیر صاحب کے حالات وسوانح سے متعلق عربی وفارسی اور اُردو میں بے شمار کتب ورسائل لکھے گئے ہیں۔ مگر شاہ صاحب کی یہ ضخیم تصنیف اپنی جامعیت وافادیت کے لحاظ سے بالکل منفرد اور جدا ہے اور عربی وفارسی واُردو میں کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں۔ اس کا طرز بیان، طریقہ استدلال، ان کی عبقریت، ملکۂ تحقیق و تدقیق، وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور فضل وکمال کے گواہ ہیں۔

بڑی تقطیع میں دوجلدوں اور ایک ہزار سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا یہ علم وتحقیق کا سمندر اپنے میں ایسے بے بہا موتی لئے ہوئے ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ حضرت غوث الاعظم کے نسب و خاندانی حالات، مرشدین کرام، معاصرین، اساتذہ، تلامذہ وخلفا، تصنیفات و تالیفات، کشف وکرامات، محیر العقول واقعات، تصوف وسلوک سے متعلق ضروری امور، استمداد وتوسل، فاتحہ اور اس کے جواز جیسی بحثوں کے لئے دائرۃ المعارف ہے۔ اس کا سن تصنیف 1310ھ ہے۔ پہلی جلد 432 صفحات اور دوسری جلد 606 صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ کے خلف اکبر حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ کی تصحیح و ترتیب کے بعد 45-1344ھ/ 26-1925ء میں اصح المطابع لکھنؤ سے چھپی۔

اس جامع ومفید خاص وعام کتاب کا دوسرا عکسی ایڈیشن 2004ء میں برادر مکرم عبدالرب عرفان علوی زید لطفہ مقیم حال فرنگی محل لکھنؤ نے اپنے صرفہ سے طبع فرمایا ہے جس پر حضرت مصنف کے حالات وعلمی کمالات سے متعلق راقم سطور احقر کا ایک مقدمہ بھی ہے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ پر اللہ تعالیٰ کی عنایات کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا۔ ان کے جیسے مریدین و باخدا مسترشدین قرن اوّل کے حضرات کی یاد دلاتے تھے۔ ان کے تینوں قابلِ فخر اسلاف صاحبزادگان مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر، مولانا شاہ تقی حیدر قلندر ومولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر قدس سرہم آیۃ من آیات اللہ اور اپنے والد ماجد کے آئینۂ کمال وحقیقی جانشین ہوئے۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کی علمی وادبی اور روحانی سرگرمیوں کے لئے ان کے ادوار خصوصی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔

حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر

(1299ھ-1882ء/ 1354ھ-1935ء): نے جملہ درسیات کی تکمیل کی اور تمام علوم متعارفہ واوراد واوضاع سلاسل طریقت وخاندانی کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی۔ والد ماجد کے وصال کے بعد تقریباً 30 سال تک مسندِ کاظمی پر فروکش رہے اور اپنے معاصرین مشائخ پر علم و فضل وکمال میں تفوق حاصل کیا۔ اور بکثرت حضرات جن میں آپ کے دونوں فخرِ اسلاف چھوٹے بھائی مولانا شاہ تقی حیدر قلندر ومولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر قدس سرہما بھی ہیں، کی ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت فرمائی۔ مسند درس وارشاد وتلقین پر فائز رہنے کے بعد آپ نے مندرجہ ذیل تصانیف تحریر فرمائیں:

(1) شجرات المشائخ مناهج الطريقة فی ذکر سلاسل المعرفة : (اُردو فارسی) اُردو فارسی زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی مفید وضخیم تصنیف ہے جس میں آپ نے نو ہزار تین سو اڑ میں بزرگان طریقت کے سلاسل کو نہایت تحقیق وتلاش سے سو سے زیادہ مطبوعہ ومخطوطہ کتابوں اور مختلف قلمی بیاضوں کی مدد سے مرتب کیا۔ مضامین و اشاریہ پر مشتمل اس کتاب کا حجم ہزار صفحات ہے۔ ایک مقدمہ جس میں فقر ودرویشی کی جامع تعریف ہے، چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ نیز چار ابواب ہیں:

(1) خانوادہ عالیہ قلندریہ علویہ
(2) خانوادہ عالیہ جنیدیہ
(3) خانوادہ عالیہ چشتیہ
(4) خانوادہ عالیہ اویسیہ

خاتمۂ کتاب میں ان امور کا بیان ہے جن کی پابندی اہلِ فقر پر لازمی ہوتی ہے۔ اس مفید واہم کتاب کا مخطوطہ مولانا شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ کے دستِ خاص کا لکھا ہوا، کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب آپ نے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی قدس سرہٗ کی فرمائش اور اصرار پر مرتب فرمائی۔

(2) تنویر الهیا کل بذکر اسناد الاوراد

والسلاسل :(عربی) عربی زبان میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں ان اوراد و وظائف اور اذ کار کا بھی ذکر ہے جن کی اجازت آپ نے اپنے شیوخ سے پائی۔ اس کا مخطوطہ بھی محفوظ ہے۔

(3) **الکلمۃ الباقیہ فی الاسانید والمسلسلات العالیہ** :عربی زبان میں 60 صفحات اور متوسط تقطیع پر مشتمل یہ مخطوطہ بھی خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے جس میں آپ نے ان تمام علوم کی اسناد کو تحریر فرمایا ہے جو آپ کو مختلف شیوخ و اساتذہ سے حاصل ہوئیں۔

(4) **ملفوضات**: حضرت شاہ محمد کاظم قلندر (1221ھ) اور حضرت شاہ تراب علی قلندر (1275ھ) کے مکاتیب کو مرتب فرما کر 1329ھ/1911ء میں مطبع سرکاری رامپور سے شائع فرمایا۔

(5) **فیوض مسعودیہ مقدمہ فصول مسعودیہ** :حضرت شاہ مسعود علی قلندر بن حضرت سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی قدس سرہما کی تصنیف کو 1321ھ میں مرتب فرما کر اس میں پانچ فیوض اور ایک خاتمہ پر مشتمل مقدمہ لکھا۔ 1330ھ میں یہ کتاب اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(6) **مکاتیب حسنیہ** :سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے دوست، ان کے عرس کو قائم کرنے والے اور حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کے پیر خرقہ کے وہ 45 مکاتیب، جو تصوف کی تعلیم پر مبنی ہیں، ان کو کتابی شکل میں یکجا کیا اور حضرت شاہ مسعود علی قلندر کے چند مکتوبات بنام حضرت شاہ تراب علی قلندر کے علاوہ حضرت شاہ علی اکبر قلندر الہ آبادی کو شاہ عبداللہ قلندر لاہرپوری، شاہ نجات اللہ کرسوی، و شاہ فقیر احمد ردولوی کے بعض مکاتیب کو بھی شامل کتاب فرمایا۔

(7) **مواہب القلندر لمن یطالع روض الازھر فی مآثر القلندر** :حضرت شاہ تقی علی قلندر کی اہم تصنیف روض الازہر فی مآثر القلندر کی تہذیب و ترتیب نہایت محنت و عرق ریزی سے کی نیز عربی عبارات کے ترجمے، اصطلاحات تصوف و حدیث نبوی کی تشریح وغیرہ کے بعد بڑی تقطیع کے سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب مع روض الازہر کے 1337ھ میں مطبع سرکاری رامپور سے شائع ہوئی۔

(8) **الایضاح فی تتمۃ الانتصاح عن ذکر اھل الصلاح** :حضرت شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ کی الانتصاح عن ذکر اہل الصلاح (فارسی) مطبوعہ 1295ھ کے آغاز میں ایک مقدمہ لکھا جس میں حضرت مصنف قدس سرہٗ کے حالات کے علاوہ ایک جدول کا اضافہ کیا جس میں پیران سلاسل ثمانیہ کی تواریخ ولادت، وفات، مدت عمر و مدفن وغیرہ مندرج فرما کر 1327ھ میں مطبع اصح المطابع سے شائع کیا۔

(9) **فتاویٰ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی** :مفتی محمد نعیم فرنگی محلی کے فتاویٰ کی ایک جلد کی آپ نے تہذیب و ترتیب کی جس میں مختلف مسائل پر فتاویٰ ہیں جن میں نکاح و وراثت سے متعلق فتاویٰ کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے دو فتوؤں کی تصحیح بھی فرمائی جس میں صاحب فتاویٰ نے عدم جواز پر فتویٰ دیا تھا۔ کتاب 487 صفحات پر مشتمل ہے جس کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی ہے۔

(10) **نسب نامہ حضرت سیّد العرفا شاہ مجا قلندر لاھر پوری**: حضرت شاہ محمد افضل لاہرپوری کی تالیف نسب نامہ سیّد العرفا کی تصحیح و ترتیب فرمائی جس میں مذکورہ بزرگوں کے سنین ولادت و وفات، مدت عمر و مقام وفات و مدفن سے متعلق معلومات بھی درج کیں۔

(11) **انشائے حیدری** :(فارسی) یہ آپ کے ان فارسی مکاتیب کا مجموعہ ہے جو زمانۂ طالب علمی میں آپ نے تحریر فرما کر حضرت والد محترم سے اصلاح لی تھی۔ اس کا مخطوطہ بھی خانقاہ کاظمیہ میں محفوظ ہے۔

(12) **ارمغان آزادیہ** :(اردو) اس رسالہ میں ایک مقدمہ، چھ فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ جس میں شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت اور عارف کی تعریف، فقر، مراتب و مقامات، اقسام خلافت مشائخ، حقیقت حلق و قصر، اقسام خرقہ و کلاہ، حضرات قلندریہ کے لباس، آزادوں کو اجازت طرق، طریقہ بیعت وغیرہ کا شرح و بسط سے بیان ہے۔ حضرت شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ کے دست خاص سے

1329ھ کا لکھا ہوا یہ مخطوطہ بھی خانقاہ شریفہ میں محفوظ ہے۔

(13) **الشرف المبین فی معراج سید المرسلین**: (اردو) اس اُردو رسالہ میں آپ نے معتبر روایات، صحیح احادیث اور سیر و سوانح کی مستند کتابوں سے مضامین مرتب فرما کر معراج شریف کے واقعات درج کیے ہیں۔ نیر پریس لکھنؤ سے یہ طبع ہو چکا ہے۔

(14) **تسکین الفواد بذکر عیدالمیلاد**: اس اُردو رسالہ میں آپ نے شمائل نبوی کو نہایت جامع و پراثر انداز میں درج فرمایا جو 1343ھ میں حسن پرنٹنگ پریس لکھنؤ سے طبع ہوا تھا۔

ان تصانیف کے علاوہ آپ کے سیکڑوں سے زائد مکتوبات بھی ہیں جن میں تصوف کے رموز و نکات، اصولِ طریقت و مسائل کا تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں اپنے والد ماجد کی مولفات کی ترتیب وتہذیب اور الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم، الدرۃ البیھاء فی تحقیق صداق فاطمۃ الزہراء وغیرہ کی طباعت واشاعت بھی فرمائی۔

(15) **حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہ**: (26رشوال 1308ھ۔ 1891ء/ 19رربیع الاول 1359ھ/ 28راپریل 1940ء): کی ذات خانقاہ کاظمیہ کے حضرات کے درمیان ماہ کامل کی ہے جو اپنے متقدمین و متاخرین کے لئے باعثِ فخر و لائق رشک ہے۔ ان کا علمی تبحر، دقیقہ رسی، فضل و کمال، عرفان اور ژرف نگاری کی مثال نہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیم اپنے والد ماجد قدس سرہٗ سے حاصل کرنے کے بعد جملہ علوم درسیہ، تصوف وطریقت کی تمام تعلیم اپنے برادر معظم مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ (1354ھ/ 1935ء) سے حاصل کی اور اپنے علم و فضل اور تحقیق و تدقیق سے بکثرت طالبین کو فیض یاب فرمایا۔ باوجود خرابی صحت، عوارض جسمانی اور آنکھوں کی کمزوری کے ان کی تحریری کاوشیں ہزاروں سے زائد صفحات پر پھیلی ہیں۔ مستقل علمی و تحقیقی تصانیف کے علاوہ خانقاہ کاظمیہ میں بکثرت مخطوطات ان کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں کے ذریعہ ظاہر بین نظروں میں بھی خانقاہ قلندریہ کو امتیاز و اعتبار حاصل ہوا۔ تصوف اور طریقت میں ان کی بعض تصانیف اوّلیت کے درجہ میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ انھوں نے اپنی وقیع علمی و ادبی یادگاروں کے علاوہ سلسلۃ الذہب کے اجرا اور برکات کاظمی سے فیض یاب ہونے کے لئے دو فخرِ اسلاف صاحبزادگان حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہٗ (1924ء۔ 2003ء) اور حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی بھی اپنی یادگار چھوڑے۔

تصانیف:

(1) **الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوّل**: (عربی) شیخ عبدالکریم جیلی آٹھویں نویں صدی ہجری کے مشہور صاحبِ تصانیف صوفی بزرگ ہیں۔ الانسان الکامل ان کی حقائق و معارف میں ایک مشہور عربی تصنیف دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں 41 ابواب اور دوسرے میں 22 ابواب ہیں۔ شاہ صاحب موصوف نے ان دونوں جلدوں کا نہایت آسان و عام فہم اُردو ترجمہ کیا۔ حاشیہ پر آیات قرآنی، احادیث نبوی اور عربی اقوال کا ترجمہ بھی دیا۔ 262 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مخطوطہ بخط مترجم نہایت صاف و خوشخط، کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے۔ آخر میں یہ عبارت ہے۔

''الحمدللہ کہ ترجمہ ہر دو جلد،''انسان کامل'' کی صفائی سے مترجم کتاب بندہ احقر تقی حیدر کو 12 ماہ جمادی الآخر روز پنج شنبہ 1346ھ فراغت ملی۔ اس کی جلد اوّل کا ترجمہ 18 صفر المظفر روز پنج شنبہ 1342ھ کو ختم ہوا اور دوسری جلد کا ترجمہ ایک ماہ میں 17رر جب روز سہ شنبہ 1342ھ میں تمام ہوا۔ والحمدللہ تعالیٰ اوّلاً و آخراً۔''

(2) **ترجمہ اُردو الکھف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**: حضرت شیخ عبدالکریم جیلی قدس سرہٗ نے اس کتاب میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بڑی عارفانہ شرح کی ہے جو بہت دقیق ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس کا بامحاورہ سلیس اُردو ترجمہ کیا۔ بعد ازاں خانقاہ کاظمیہ کے ایک ساختہ پرداختہ مسترشد شاہ محمد وہاج الدین قلندر (ڈپٹی کلکٹر) نے اس کی ایک عمدہ شرح لکھی۔ 216 صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ و شرح 1333ھ میں لکھنؤ سے طبع ہوئے۔

(3) **تنویر الظلمات فی تفسیر المقطعات**: (عربی) حروفِ مقطعات قرآنیہ کی تشریح و تفسیر میں یہ عربی تصنیف

مصنف کی دقت نظر، عربی نثر نگاری کی صلاحیت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مخطوطہ بھی بخط مصنف کتب خانہ انوریہ میں محفوظ ہے۔ کتاب کا سن تصنیف 1345ھ ہے۔

(4)**انشائے نظامی**: یہ زمانہ طالب علمی کے ان فارسی خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف بزرگوں اور چھوٹوں کے نام مع القاب و آداب ہیں۔ خطوط سے فارسی دانی، انشا پردازی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی کتب خانہ انوریہ میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں مولوی محمد عالم صاحب قیصری کاکوروی کے نام 17,16 برس کی عمر کے مکتوبات ان کی نکتہ سنجی، حقائق و معارف سے واقفیت، اور ادبیت کے شاہکار ہیں۔

(5)**ترجمہ مجاهدات الاولیا**: حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی (1275ھ۔ 1858ء) خلف اکبر عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر بانی خانقاہ کاظمیہ (1158ھ/ 1765ء- 1221ھ/ 1806ء) اپنے عہد کے ایک عارف باللہ اور فارسی و اردو اور ہندی کے نغز گو شاعر ہی نہیں بلکہ متعدد گراں قدر تصنیفات کے مصنف بھی تھے۔ انہوں نے تصوف میں 312 صفحات پر مشتمل ایک فارسی کتاب 1268ھ میں تصنیف فرمائی تھی جس میں اولیائے متقدمین و متاخرین کے ریاضت و مجاہدات، تذکرۃ الاولیاء، نفحات الانس، اخبار الاخیار اور حضرات مشائخ چشتیہ کے ملفوظات اور سلسلۂ قلندریہ کے بزرگوں کے مجاہدات سے نقل کر کے یکجا کیے تھے۔ شاہ صاحب موصوف نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ 1345ھ میں فرمایا۔ اس کا مخطوطہ بھی کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں بخط مترجم موجود ہے۔

(6)**مناظر الشهود فی مراتب الوجود**: مراتب وجود سے متعلق یہ 56 صفحات پر مشتمل رسالہ جہاں حضرت مصنف کے عرفان و مشاہدہ اور حقائق و معارف سے آگہی پر دلالت کرتا ہے وہیں اُردو زبان میں ان کی مہارت اور تصوف کے دقیق رموز و نکات کو دل نشین پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کی قدرت کی بھی شہادت دیتا ہے۔ مقدمہ میں وجود مطلق کے بہ لحاظ شہود نزول و عروج کے ان چالیس مراتب کا ذکر ہے جن کو حضرت شیخ عبدالکریم جیلی نے 'الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' میں بیان فرمایا ہے۔ یہ رسالہ بھی حضرت شاہ صاحب کے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جو 1332ھ میں مطبع خورشید عالم ریاست رام پور میں چھپا۔ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''قربان اس شاہد بے پرواو لا اُبالی کے جس نے اپنی کمال بے نیازی میں جمال و جلال سے آراستہ ہو کر جمال کے جلال کا نام عشق اور جلال کے جمال کا نام حسن رکھ کر اپنے مصرملاحت میں مستانہ وار اللہ جمیل و یحب الجمال فرمایا اور ہنگامہ آرائے شہود خود نمائی و خود بینی ہوا۔''

رسالہ کے مقدمہ میں دیگر حقائق و معارف کے بیان کے بعد حضرات خمسہ، عروج کے مراتب ستہ، ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، ہاہوت، یاہوت کا بیان بھی ہے۔

(7)**هدیة الشرف فی ترجمة من عرف**

ترجمہ: مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ کی فارسی زبان میں 256 صفحات پر مشتمل یہ تصنیف ان کے ابتدائی عہد کی ہے جس میں انھوں نے اس مشہور مقولہ کی بابت مدلل بحث کی ہے 'من عرف نفسہ فقد عرف ربہ' جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ مصنف نے اس کی تحقیق اور معانی و مطالب کی تشریح و وضاحت بڑے مؤثر اور دل نشیں انداز میں کی ہے۔ نفس انسانی اور اس کی حقیقت نیز خود شناسی میں خدا شناسی اور خدا شناسی میں خود شناسی کو ظاہر کیا ہے، خطرات و وساوس اور ہوا جس والہام کے اقسام، نفس امارہ، لوامہ اور مطمئنہ کی تعریف ان کے باہمی فرق کو بیان کیا اور ان پر بحث کی ہے۔

مترجم موصوف نے اس کا سلیس و بامحاورہ اُردو ترجمہ کیا اور افادۂ عام کی خاطر دقیق فارسی اشعار کے بجائے اپنے والد محترم مولانا شاہ تراب علی قلندر کے اُردو اشعار تشریح و تفہیم کی خاطر درج کیے۔ مزید برآں قرآنی آیات، عربی فقروں اور تصوف کی اصطلاحات کی مفصل شرح بھی حاشیہ پر کردی ہے۔ 1333ھ/ 1915ء میں یہ ترجمہ اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ اٹھارہ وصلوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں 3 سوالات اور ان کے جوابات ہیں:

(1) فقر کیا ہے؟ (2) کشف و کرامت کیا ہے؟ (3) بعد ترک دنیا کے آیا دنیا سے کچھ ضرر بھی پہنچتا ہے؟

(8)**فاتح الابصار (ترجمہ)**: مولانا شاہ علی انور قلندر

قدس سرہٗ سے سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ نے گیارہ سوالات کیے تھے جن کے مفصل و مدلل جوابات آنجناب نے دیے تھے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں تھا۔ مترجم موصوف نے اس کا اُردو ترجمہ کیا جو 1340ھ میں مطبع سرکاری ریاست رام پور سے مع اصل متن شائع ہوا۔ سوالات دلچسپ تھے مثلاً خدا کون ہے؟ قیامت میں خدا کا دیدار و ملاقات کیوں کر ہوگی؟ اگر مسئلہ وحدت وجود حق ہے تو عذاب و ثواب کیا ہے؟ اشیا کی معرفت کیوں کر حاصل ہوتی ہے؟ جبرئیل کہاں سے ہیں وغیرہ۔

حضرت مترجم نے جوابات کے ضمن میں جو اصطلاحات صوفیہ آئی ہیں، حواشی پر ان کی شرح بھی کر دی ہے۔

(9) **کشف الدقائق عن رموز الحقائق (ترجمہ)**: اس رسالہ کے مصنف بھی حضرت مترجم کے والد بزرگوار ہیں۔ جنھوں نے حقائق و معارف سے متعلق 19 سوالوں کے جواب میں یہ تصنیف فرمائی مثلاً مرتبۂ ذات کیا ہے، مشاہدہ و مکاشفہ اور تجلی میں کیا فرق ہے؟ دل کیا ہے؟ توحید کیا ہے؟ نبوت افضل ہے یا ولایت؟ بعضوں نے جو یہ کہا کہ ولایت افضل ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ جس وقت جبرئیل حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں آتے تھے تو دحیہ کی اصل صورت کہاں جاتی تھی اور جبرئیل کی یہ نوعی صورت کیا ہوتی تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تمام امتیوں کے باپ ہیں تو آپ کا نکاح ازواج مطہرات سے جو آپ کی بیٹیاں ہوتی تھیں کیسے درست ہوا؟ وغیرہ۔

(10) **الدر الیتیم فی بیان ایمان آباء النبی الکریم (ترجمۃ)**: مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ نے اس عربی رسالہ میں دراصل ان لوگوں کو مسکت جواب دیا ہے جنھوں نے خواہ مخواہ اس مبحث کو چھیڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ماجدین کے ایمان کا انکار کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں منکرین کے اقوال درج کرنے کے بعد آخر میں محاکمہ فرمایا اور کفِ لسان پر زور دیا ہے۔ رسالہ کے آخر میں مولانا وکیل احمد سکندر پوری کے مندرجہ ذیل دو سوالوں کے تفصیلی جواب بھی ہیں۔ رسالہ ایک مقدمہ، چار فصول اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

(1) یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط کہ نور محمدی نورالٰہی سے پیدا ہوا ہے اور کل چیزیں نور محمدی سے موجود ہوئی ہیں اور لفظ کل اور نور کی تشریح اور کیفیتِ پیدائش نور مطلوب ہے۔

(2) اگر بحق فلاں نبی یا ولی کہہ کر دُعا مانگے تو جائز ہے کہ نہیں؟

شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ نے اس مفید رسالہ کا بھی اُردو ترجمہ کیا اور 1341ھ میں اصح المطابع لکھنؤ سے مع عربی متن طبع ہوا۔

(11) **زواھر الافکار شرح جواھر الاسرار**: شیخ محمد مقیم ہروی نے جواہرالاسرار نامی رسالہ میں اکتیس سوالات لکھے۔ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر نے ان تمام سوالوں کے شرح و بسط سے جوابات دیے۔ حکما و صوفیہ کے اقوال اور اشعار بھی جا بجا ہیں۔ مترجم موصوف نے مصنف کے مافی الضمیر کو خوب ادا کیا اور شستہ اُردو میں اس کا ترجمہ کر کے 1341ھ میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع فرمایا۔

چند سوالات اس طرح ہیں: شیطان نے حضرت آدم کو سجدہ کیوں نہ کیا؟ جب ایجادِ خلق سے اظہار فضل مقصود ہے تو دوزخ و عذاب کس لئے ہے؟ گناہ کیوں ہوتے ہیں؟ جب خدا کریم و جواد ہے تو کیوں بعض لوگ محتاج ہیں؟ موت کیا ہے؟ خدا کو جب ہر نیک و بد کا علم ہے تو میزان قائم کرنے کی کیا ضرورت؟ وغیرہ۔

(12) **تصفیة شرح تسویة**: التوسیہ بین الافادہ و القبول شاہ محب اللہ آبادی قدس سرہ (997ھ/1587ء-1058ھ/1648ء) کا تصوف و سلوک میں ایسا مشکل عربی رسالہ ہے کہ بقول شارحِ رسالہ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہ: ''واقعی مزلۃ الاقدام عرفاست واز اینجاست کہ بسیارے درپے انکار آں رفتہ و از بدعت بر شیخ تہمتہا بستہ...'' علمائے ظاہر کے اختلاف اور شورش کے باوجود ہندوستان میں اس کی متعدد شروح لکھی گئیں۔ مذکورہ بالا شرح بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مترجم نے اس رسالہ کا اُردو ترجمہ کیا جو مع اصل متن و شرح کے 1343ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(13) **قول المختار فی مسئلة الجبر والاختیار (ترجمہ)**: جبر و اختیار کے مسئلہ پر ایک اہم رسالہ ہے جس میں مولف مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ نے ایک مقدمہ، چھ اصول، پانچ تمہیدوں اور چار نکات میں اس مسئلہ کو بڑی شرح و بسط سے بیان کر دیا۔ اصل اول، حقیقت انسانی کی شرافت و جامعیت سے

متعلق۔ اصل دوم فضائل انسانی۔ اصل سوم چاروں عناصر کے بیان۔ اصل چہارم نفس کے بیان۔ اصل پنجم نفس کی طاقت کے بیان اور اصل ششم جانداروں کی اقسام کے بیان سے متعلق ہے۔ تمہیدات میں قوت فعل اختیاری، حکمت خیر وشر، بندہ کے افعال اختیاری وغیرہ کا بیان ہے اور خلق وکسب وقضاوقدر کے متعلق چار نکات درج کیے ہیں۔

حضرت مترجم قدس سرہٗ نے اس کا اُردو ترجمہ فرما کر 1343ھ میں اصح المطابع لکھنؤ سے شائع کیا۔

(14) **تنویر الافق فی شرح تبیین الطرق (ترجمہ)**: رسالہ تبیین الطرق شیخ علی بن حسام الدین متقی چشتی جونپوری کا تصوف وسلوک میں ایک عربی رسالہ ہے۔ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر نے تنویر الافق کے نام سے اس کی فارسی میں 1298ھ میں شرح کی تھی۔ مترجم نے اس شرح کا اُردو ترجمہ فرمایا۔ یہ بھی 1343ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

(15) **نخبة الصوارف فی شرح خطبة العوارف (ترجمہ)**: اس فارسی رسالہ میں حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ نے شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے خطبۂ عوارف کے ہر ہر لفظ کی مفصل شرح اور ہر فقرہ کی بڑی عمدہ توضیح کی ہے۔ مترجم موصوف نے اس فارسی رسالہ کا سلیس اُردو ترجمہ فرمایا جو 1342ھ میں لکھنؤ سے طبع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔

(16) **مجموعۂ ہفت رسائل قلندریہ (ترجمہ)**: اس مجموعہ میں سلسلہ قلندریہ کے چار بزرگوں کے سات رسائل تصوف وسلوک سے متعلق ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے:

(1) رسالہ بیعت رضوان: مصنفہ سیّد شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی (م1196ھ)۔

(2) رسالہ مصقلة الاولیاء شرح مرآة القلندریہ: مصنفہ شاہ عبدالرحمٰن قلندر ثانی لاہرپوری (م1199ھ)

(3) رسالہ شہود المقربین۔ شاہ عبدالرحمٰن قلندر ثانی (1199ھ)

(4) رسالہ مراقبۃ الوجود، سیّد فضل علی ہرگامی

(5) رسالہ یقظۃ النائمین، سیّد محمد حامد ہرگامی (م1241ھ)

(6) رسالہ تصوف، سیّد محمد حامد ہرگامی

(7) رسالہ دیگر سیّد محمد حامد ہرگامی

مترجم موصوف نے ان ساتوں رسائل کا سلیس وشستہ زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ حواشی میں عربی عبارتوں کے اُردو تراجم بھی درج فرمادیے۔ جس سے ان کی افادیت زیادہ ہوگئی۔

ہر رسالہ حقائق ومعارف اور اسرار کی بنا پر الگ الگ حیثیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعہ پر اگر چہ سنِ طباعت نہیں مگر قیاس یہ ہے کہ 1355ھ کے بعد کا ہے۔

(17) **جواهر المعارف**: یہ حقائق ومعارف اور اخلاق و تصوف وغیرہ سے متعلق مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر کے ان 121 مکاتیب کا مجموعہ ہے جو آنجناب نے مختلف اوقات میں اپنے مریدین و مسترشدین کے خطوط کے جواب میں تحریر فرمائے۔ اس میں تصوف کے رموز ونکات بھی ہیں اور مریدین کے اشکالات کے شافی وکافی جوابات بھی۔ 105 مکتوبات اُردو زبان میں اور 16 مکتوبات فارسی میں ہیں۔ مرتب مکاتیب مولانا شاہ تقی حیدر قلندر نے جواہر المعارف پر ایک مقدمہ تحریر کیا اور ان مکاتیب کو ترتیب دے کر ہر مکتوب کے بارے میں ایک ایک سطر کا جامع سرنامہ (خلاصہ) تحریر کردیا۔

(18) **تحفۂ نظامیه**: بانی خانقاہ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے جداعلیٰ حضرت مخدوم شیخ نظام الدین علوی عرف شیخ بھکاری (890ھ/ 1485ء - 981ھ/ 1574ء) نے تین سوالات؟ (1) جب مرید مرشد کی مدد سے معرفت کے مقام پر پہنچتا ہے تو اپنی ذات سے باہر کوئی چیز دیکھتا ہے یا سب اپنی ہی ذات میں؟ (2) لفظ تمثل جس کا تذکرہ بعض سلوک کی کتابوں میں ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ (3) عاشق کو جب معشوق سے وصل ہوتا ہے تو وہ مرد کی صورت میں یا عورت کی صورت میں؟ شاہ تقی حیدر قلندر نے حضرت مخدوم صاحب کے اس رسالہ کا تحفہ نظامیہ کے نام سے موسوم کرکے اُردو ترجمہ فرمایا اور 1920ء میں اصل متن کے ساتھ شائع کیا۔

(19) **واقعات رشیدی**: مولوی رشید الدین خاں بن مفتی خلیل الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ نے مولانا شاہ علی اکبر قلندر والد ماجد مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہما کے اصرار وفرمائش پر 1297ھ میں اپنے بعض باطنی واقعات اور عالم مثال کے مشاہدات کو

فارسی میں قلم بند کیا تھا۔ مولانا شاہ تقی حیدر قلندر نے اس کا اُردو ترجمہ فرمایا جو اصل فارسی متن کے ساتھ 1923ء میں شائع ہوا۔

(20) **تعلیمات قلندریہ**: مشائخ قلندریہ کے تصوف و اخلاق کی تعلیم سے متعلق ایک سو چوالیس فارسی مکتوبات کا مجموعہ اسرار و رموز کا گنجینہ ہے۔ شاہ صاحب نے 1350ھ میں اس کو مرتب کر کے تعلیماتِ قلندریہ کے تاریخی نام سے ایک جامع مقدمہ لکھ کر شائع فرمایا۔

حضرت شاہ مجتبیٰ معروف بہ شاہ مجا قلندر لاہر پوری، شاہ ابونجیب قلندر شاہ محمد تقی قلندر، شاہ ابو یوسف قلندر، شاہ علی مظہر قلندر، شاہ محمد کاظم قلندر، شاہ تراب علی قلندر، شاہ تقی علی قلندر، شاہ علی اکبر قلندر، شاہ علی نور قلندر اور دوسرے نو بزرگانِ قلندریہ کے مکاتیب اس مجموعہ کی زینت ہیں۔

(21) **فیوض العارفین**: یہ حضرات مشائخ قلندریہ کے 75 مکتوبات کا مجموعہ ہے جس کو مرتب نے فیوض العارفین (1338ھ) تاریخی نام سے موسوم کر کے الناظر پریس لکھنؤ سے شائع فرمایا۔

(22) **کشف الآثار فی ردکاشف الاسرار**: حضرت مولف کے پیر و مرشد اور برادر معظم مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ کے ایک عزیز نے جن کو حضرت کی مرجعیت و محبوبیت کی بنا پر بلاوجہ عناد پیدا ہو گیا تھا، طریقت سے ناواقفیت کی بنا پر حضرت شاہ صاحب و بعض پیرانِ سلسلہ پر الزام تراشی کی ناروا سعی کاشف الاسرار نامی رسالہ سے کی۔ شاہ تقی حیدر قلندر سے یہ گستاخی بھلا کیسے برداشت ہوتی۔ چنانچہ اُردو میں 104 صفحات پر ایک رسالہ اس کے رد میں تحریر فرمایا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہی الگ نہیں فرمایا بلکہ طریقت کے ایسے مسائل واصول اور رموز اور تربیت واصلاح کے ایسے طریقے قلم بند فرمادیے کہ خانقاہی نظام کے لئے بھی ایک اہم دستاویز ہوگئی۔ اس میں صاحب رسالہ کی شوخیٔ تحریر بھی جابجا نظر آجاتی ہے۔

(23) **مکتوبات حضرت وارث الانبیا**: حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ کے تمام مکاتیب جو طالبین و صادقین اور مریدین و مسترشدین کی تعلیم و تربیت کے واسطے آنجناب قدس سرہٗ نے تحریر فرمادیے تھے، ان کو بڑی تلاش و جستجو سے جمع کر کے مرتب کیا تھا۔ یہ مکاتیب 176 ہیں۔ مکاتیب کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی کہ 19 ربیع الاول 1359ھ 28 اپریل 1940ء کو انتقال فرمایا۔ بعد میں مرتب کے برادر خرد مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر قدس سرہٗ نے ''تذکرۂ حبیبی'' جلد دوم میں انھیں شامل کرلیا۔

(24) **نفحات العنبریۃ من انفاس القلندریۃ**: سلسلہ عالیہ قلندریہ کے مشائخ و بزرگوں کے حالات وارشادات اور تعلیمات کے سلسلہ میں سب سے پہلے جامع و مستند تذکرہ ہے جسے حضرت نے بڑی دیدہ ریزی، تحقیق و جستجو اور محنت سے مرتب فرمایا اور ''اتحاف الاخبار'' تاریخی نام رکھا۔ اس تذکرہ میں ایک مقدمہ، سولہ نفحات اور ایک خاتمہ تھے۔ 1339ھ میں یہ تقریباً 700 صفحات پر مشتمل شائع ہو کر طبقہ صوفیہ میں بہت مقبول ہوا۔ اس موضوع پر سب سے اوّلین مبسوط اور جامع تذکرہ ہے۔

(25) **اذکار الابرار**: (نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ) نفحات العنبریہ کا پہلا ایڈیشن 1339ھ میں منظرِ عام پر آیا اور بہت جلد اپنی افادیت و مقبولیت کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ چنانچہ حضرت مصنف نے ازسرِ نو اس کتاب پر نظر ثانی کی اور بقول خود:

''تب میں نے 1345ھ سے اس کو دوبارہ بغرض درستی عبارت و حذف بعض مضامین و اضافہ اکثر و بیشتر حالات دیکھنا شروع کیا، چار پانچ سال تک دیکھتا رہا اور مضامین وقتاً فوقتاً بڑھاتا رہا، اس قدر مضامین بڑھے کہ کتاب پہلے سے زائد بڑھ گئی جس کا اندازہ قدیم وجدید نسخوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ 1351ھ میں میری آنکھوں میں نزول الماء کی شکایت پیدا ہوگئی، لکھنے پڑھنے سے معذوری ہوگئی، تب میں نے اس مسودہ کو طاق نسیاں پر رکھ دیا اور منتظر تائید غیبی رہا۔ 1354ھ میں داہنی آنکھ قدح ہوئی جس سے وہ معذوری کچھ رفع ہوئی مگر آنکھ کھلتے ہی عالم، نظر میں تیرہ و تار ہو گیا یعنی دو ماہ کے بعد ہی حضرت خداوند نعمت (مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ) نے وصال فرمایا جس کے صدمہ و رنج نے بینائی پر بہت اثر ڈالا۔ بہر حال رضینا بقضاء اللہ اپنی زبوں حالی و پریشاں خاطری پر اشکِ حسرت بہاتا اور وقت گذاری کے تدابیر سوچتا رہا، وسط 1356ھ میں دفعۃً کتاب درست کر ڈالنے اور مسودہ صاف کرنے کی خواہش نیز حضرت خداوند نعمت قدس سرہٗ کے حالات اس میں بڑھانے کی فرمائش ہوئی، میں نے

ہمت کی اور اس امر اہم کی انجام دہی پر متوکلا علی اللہ مستعد ہو گیا اور تقریباً چھ ماہ کی مدت میں اس کام کو ختم کر ڈالا۔"

یہ ضخیم تصنیف "اذکار الابرار" تاریخی نام سے 1350ھ میں شائع ہوئی۔ اس میں چالیس کتابوں اور مستند ماٰ خذ سے مدد لی گئی۔ ایک مقدمہ، سترہ نفحات اور ایک خاتمہ ہے۔ مقدمہ میں لفظ قلندر کی مکمل ومفصل تشریح قلم بند تھی اس میں حضرت کے اسماو غیرہ کا تذکرہ ہے۔ پہلا نفحہ حضرت شیخ عبدالعزیز مکی معروف بہ عبداللہ علم بردار قدس سرہٗ سے متعلق ہے جس میں آپ کا اصحاب صفہ میں شمول، آپ کا نام اسماء الرجال میں نہ ہونے کی وجہ، درازی عمر و تمثیل دیگر معمرین، جو سلسلہ ان سے جاری ہوا اس کی اقسام، سلسلہ مصافحہ، ان کے خلفا و مریدین وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

آخری نفحہ حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ سے متعلق تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، جس میں جامعیت سے ان کی پوری حیات، مسترشدین، تعلیمات، تصانیف، سیرت سبھی کچھ تحریر کر دیے گئے ہیں۔

خاتمۂ کتاب میں ایک تفصیلی جدول ہے جس میں ان تمام حضرات کا، جن کا تذکرہ کتاب میں آیا ہے، سن و تاریخ و ماہ ولادت، وفات، مدتِ عمر، مدفن اور اگر کسی میں اختلاف ہے تو وہ بھی درج ہے، نفحات العنبر یہ کے خاتمہ میں ان اصحاب کرام و اولیائے عظام و علما و صالحین کے اسما بھی درج ہیں، جن کے اسما کتاب میں ضمنی طور پر آگئے ہیں اور سب کی تاریخ و ماہ سن ولادت، وفات، مدت عمر، مدفن وغیرہ کی تحقیق بھی ہے، علاوہ ازیں سلاطین و امرا اور وسا کے اسما کے ساتھ بھی اسی طرح تحقیق کی گئی ہے۔

چونکہ راقم الحروف کی نظر میں نفحات العنبریہ، اتحاف الاخیار اور اذکار الابرار دو الگ الگ محققانہ تصانیف کی صورت میں منظر عام پر آئی ہیں۔ اسی لئے اس نے ان کو دو تصانیف شمار کیا ہے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر:

(یکم شعبان 1311ھ/ 1894ء۔ 17 رمضان 1366ھ/ 5 راگست 1947ء) آپ حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ کے چھوٹے صاحبزادہ اور ان کے آئینہ کمالات تھے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کرنے کے بعد تمام ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت کی تحصیل و تکمیل اپنے برادر معظم مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ سے کی اور ارشاد و تلقین، رشد و ہدایت اور درس و تدریس کے ساتھ اپنے محبوب مشغلہ خاندانی یعنی تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ کے وصال (1940ء) کے بعد خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے متمکن ہوئے۔

علمی کارنامے:

تحصیل علم سے فراغت کے بعد اپنے خاندانی مشغلہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی طرف کلی طور پر مشغول ہو کر بڑی محققانہ و علمی تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا۔

(1) **مصباح التعرف لارباب التصوف**: اُردو زبان میں یہ محققانہ تالیف، اصطلاحات تصوف کی ایک جامع لغت ہے جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے اصطلاحات کی بڑی دل نشیں تشریح کی گئی ہے۔ اُردو زبان میں اس نوعیت کی غالباً سب سے پہلی اور بہترین کوشش ہے جس کی وجہ سے تصوف کی کتابوں کے شائقین اصطلاحات سے ناواقفیت کی بنا پر مطالب سمجھنے میں غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہوتے۔ 1339ھ/ 1920ء میں مطبع سرکاری ریاست رامپور سے طبع ہوئی تھی۔ اب ناپید ہے۔

(2) **تفریح الاحباب**: حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی ولادت شریف، مناقب و محامد اور فضائل کے بیان میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ آپ نے 13 رجب المرجب کو ولادت شریف کے موقع پر تحریر فرمایا تھا جو 1350ھ/ 1930ء میں لکھنؤ کے سرفراز قومی پریس سے شائع ہوا تھا۔

(3) **ترجمة الدر الملتقه فی شرح تحفة المرسله**: شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری کے رسالہ تحفۃ المرسلہ، جو حقائق و معارف میں ایک اہم رسالہ ہے، کی ایک بہترین فارسی شرح حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ نے لکھی تھی اس کا سلیس اُردو ترجمہ کر کے آپ نے اصل عربی متن و فارسی شرح اور اُردو ترجمہ کے ساتھ 1924ء میں لکھنؤ سے شائع کرایا۔

(4) **مرآة الاعلام مآثر الکرام معروف بہ**

تذکرۂ مشاہیر کاکوری: یہ کتاب اپنی گوناگوں خوبیوں، مؤلف کی دقت نظر، عرق ریزی، شبانہ روز کی محنت شاقہ اور تحقیق وسند کی بنا پر اہل علم و دانش کے لئے سرمۂ بصیرت ہے۔ میرے علم میں ہندوستان کے کسی قصبہ اور بستی کی ایسی مستند و جامع تاریخ اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ آنے والی نسلوں پر ان کا یہ احسان قیامت تک رہے گا۔ ورنہ اس مردم خیز خطہ کے نامور بزرگوں، علما و مشائخ، ارباب کمال اور صاحبانِ قلم و مالکانِ سیف کے روشن کارنامے حرف غلط کی طرح مٹ چکے ہوتے اور کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا۔ پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ مفید تحقیقی کتاب پہلی مرتبہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے 1927ء میں شائع ہوئی اور دوبارہ ابھی حال میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے اس کی مقبولیت اور افادیت کے پیشِ نظر شائع کیا ہے۔

(5)**الفکر الغریب بذکر الحبیب معروف بہ تذکرۂ حبیبی**: اگرچہ ملفوظات کے ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے، مگر یہ ملفوظ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ اس کا لفظ لفظ آپ کی اس باعثِ رشک نسبت حبیبی کا آئینہ دار ہے جو آپ کو اپنے برادر معظم، استاد و مربی و مرشد برحق مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ سے حاصل تھی۔ برادر معظم قدس سرہٗ کے وصال 1935ء کے بعد آپ کو داہنی سمت فالج کا حملہ ہوا جس سے بہت کمزور و نحیف ہو گئے مگر دل میں آنجناب کی محبت کا جو گہرا نقش تھا وہ ظاہری مفارقت سے اور گہرا ہو گیا اور ہر وقت آپ اسی استغراق میں رہتے۔ چنانچہ ذکر حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے، کی بنا پر آپ نے آنجناب قدس سرہٗ کا مکمل و جامع اور مفصل ملفوظ ایسے والہانہ اور وارفتگانہ انداز سے لکھنا شروع کیا جس کی نظیر ملفوظاتی ادب میں کہیں نظر نہیں آتی ہے۔ ہر ہر حرف سے عشق مرشدی ٹپکتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس ملفوظ میں آپ نے حضرت قدس سرہٗ کی حیات مبارکہ کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا۔ اُردو زبان میں یہ ضخیم ملفوظ 1941ء میں حسن پرنٹنگ پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(6)**رسالہ در تشریح حروف ابجد**: حروف ابجد کی تشریح و توضیح میں یہ عربی رسالہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

(7)**احسن الانتخاب فی ذکر معیشۃ سیدنا ابی تراب**: جیسا کہ تمہیدی سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ کو حضرات اہل بیت اطہار خصوصاً مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے عشق تھا اور آپ متعدد مرتبہ زیارت سے بھی مشرف ہوتے رہے۔ آپ نے اُردو زبان میں حضرت مولائے کائنات کی مکمل سیرت کے لئے چھ جلدوں کا خاکہ تیار کیا تھا جس میں سے ابتدائی تین جلدیں احسن الانتخاب فی ذکر معیشۃ سیدنا ابی تراب، نفائس المنن فی فضائل سیدنا ابی الحسن، مناقب المرتضیٰ من مواہب المصطفیٰ بالترتیب 1932ء، 1934ء اور 1935ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

اس کتاب کے پہلے حصہ میں آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی مفصل و مکمل سوانح حیات، تاریخ و تذکرہ کی مستند کتابوں کی مدد سے مرتب کی۔ یہ تصنیف اپنی نوعیت و انفرادی حیثیت کی وجہ سے متاخرین علمائے دین کے دور میں اولیت کے درجہ کی حامل ہے۔ تاریخی حیثیت سے حضرت علی مرتضیٰ کے عہد خلافت میں باہمی اختلافات و محاربات کے جتنے واقعات ہوئے وہ بھی آپ نے نہایت جرح و تعدیل اور دقتِ نظر و ژرف نگاہی سے تحریر فرمائے۔ ویسے بھی ایک دیانت دار مورخ کے لئے ان سے صرف نظر قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔ پوری کتاب میں حتی الوسع تحقیق و استناد کا دامن کہیں نہیں چھوٹا۔ اس کتاب سے حضرت مولف کی وسعت مطالعہ، باریک بینی اور تحقیق کا صحیح استنباط، مثبت فکر اور علمی و تحقیقی رویہ کا پتہ چلتا ہے۔ راقم سطور کی نظر سے عربی و فارسی اور اُردو زبان میں اس موضوع پر اس نوعیت کی ایسی جامع کتاب نہیں گزری۔

تاریخی حیثیت سے آپ نے تمام واقعات ایک دیانت دار اہلِ قلم کی طرح لکھ دیے مگر روز مرہ کی گفتگو، ارباب علم و صاحبان نظر اور عوام و خواص کی محافل تک میں کبھی حضرات اہلِ بیت کے کسی مخالف (بنوامیہ) کو بُرا کہتے نہ سنا گیا۔ بعض حضرات، اگر بنوامیہ کے سلسلہ میں لب کشائی کرتے بھی تو آپ ان کی توجہ ہٹا کر فرماتے کہ حضرات صوفیہ کا اور بالخصوص ہمارے بزرگوں کا یہ مسلک ہرگز نہیں رہا کہ مخالفین کے معائب اور ان کی غلطیوں کو بیان کر کے اپنی زبان آلودہ کریں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہی وقت حضرات اہلِ بیت کے محامد

ومناقب بیان کرنے میں صرف کیا جائے:

ہم تو بدخواہ نہیں اپنے مخالف کے ترابؔ
جو بدی ہم سے کرے اس کی خدا خیر کرے

یہ محققانہ تصنیف تین مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔ آخری بار 2000ء میں راقم سطور کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

(8) **نفائس المنن فی ذکر فضائل سیّدنا ابی الحسن**: اس دوسرے حصے میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے حضرت علی مرتضیٰ کے علمی و عملی اور وہبی و اکتسابی فضائل ومحامد نیز آپ کے زہد وتقویٰ، عبادات وریاضت اور مجاہدات کی تفصیل ہے۔ مقدمہ میں فضیلت اور اس کے اقسام پر بہت جامع بحث اور اس بات پر علمی دلائل ہیں کہ فضیلت قطعی ہے یا ظنی۔ 34 انبیائے مرسلین علیہم السلام سے تمثیل کا بھی بیان ہے۔ بعد ازاں محبوبیت حق، محبوبیت رسول، خصائص و اولیات، اخبار عن الغیب اور کرامات وغیرہ پر بڑے تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ تصنیف 1352ھ۔1933ء میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔

(9) **مناقب المرتضیٰ من مواہب المصطفیٰ**: 400 صفحات سے زائد ضخیم اس حصہ میں 3 عنوانات اور ان کے ذیل میں متعدد عنوانات ہیں۔

(1) ھانزل من اللّٰہ فی حق علی: حضرت علی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کیا کیا نازل ہوا؟

(2) ماورد من لسان رسولہ فی حق علی: اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے حضرت علی کی شان میں کیا کیا وارد ہوا؟

(3) مانطق بہ اصحاب رسول اللّٰہ فی حق علی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام نے حضرت علی کے سلسلہ میں کیا کیا فرمایا؟ حضرت مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ کے مناقب ومحامد دو طرح پر وارد ہیں۔ عمومی میں صحابۂ کرام مہاجرین وانصار بھی شامل ہیں اور خصوصی میں آپ ہی مخصوص ہیں۔ مذکورہ کتاب میں صرف ان مناقب کا بیان ہے جو خصوصی طور پر آپ ہی کی ذات گرامی سے متعلق ہیں اور ان میں کوئی آپ کا شریک وسہیم نہیں۔

یہ کتاب 1354ھ/1935ء میں حسن پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی۔

(10) **المقصد الجلی فی مسند العلی**: اس میں حضرت علی سے مروی احادیث کو جمع فرمانا شروع کیا تھا۔ اور 303 صفحات پر مشتمل 372 مرویات کو یکجا بھی کر دیا تھا مگر مکمل ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ مناقب المرتضیٰ کی طباعت کے دوران ہی آپ کے برادر اور معظم مربی، استاد و مرشد برحق حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ نے مقام قدس کو آرام گاہ ابدی بنایا۔ یہ حادثہ ایسا تھا کہ بقول آنجناب کے ''میرے ہوش وحواس وہاتھ و پیر سب معطل ہوگئے۔'' اور پھر انتظامی مصروفیات اور دیگر امور وعوارض جسمانی کی بنا پر اس کی تکمیل کی نوبت ہی نہ آسکی۔ بلکہ جس قدر وقت مل سکا وہ آپ نے مرشدِ برحق قدس سرہٗ کے ضخیم ومفید عام ملفوظ ''تذکرہ حبیبی'' میں صرف فرمایا۔

شعروسخن:

قسّام ازل نے آپ کو اس میں بھی بڑا حصہ عطا فرمایا تھا۔ مگر تصنیف وتالیف میں انہماک کی وجہ سے آپ نے اس طرف بہت زیادہ توجہ نہ فرمائی۔ ''تذکرۂ مشاہیر کاکوری'' میں آپ کے عربی وفارسی کلام کا نمونہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں اہلِ بیت اطہار کی شان میں آپ کے سلام، منقبتیں، مدحیہ قصائد و مراثی موجود ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ آنجناب کے عربی وفارسی اور اُردو کلام پر الگ سے سیر حاصل تبصرہ وتعارف ہو۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے آپ کی تحریر کردہ بیاض سے نمونۂ چند اشعار درج ہیں۔ جس میں روانی وسلاست، برجستگی نیز صفائی بیان اور بندش کی چستی صاف نمایاں ہیں۔ اپنی بیاض میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ ''خیالات پریشاں کہ در 1332ھ تا 1334ھ سرگرفتہ بودند وتاہنوز از 1347ھ تا ایں دم قائم اندرواز تقاضائے خود جلوہ فرما گشتہ درنظر آمدند خواستہ بودم کہ ایں ہمہ را مشل سینۂ عاشقاں چاک کنم وزیر زمیں پوشیدہ نمایم کہ اخفا از اظہار در ہر حال اولیٰ است۔ روزے دریں خیال بودم واز قوت بفعل آوردن خواستم۔ برادر صاحب قبلہ مولوی تقی حیدر صاحب مدظلہٗ مانع آمدہ ارشاد فرمودند کہ ایں ہمہ را صاف کردہ محفوظ باید داشت۔

(وہ واردات 1332ھ سے 1334ھ تک ہوئے تھے اور اب

بھی اس وقت تک جب کہ 1347ھ ہے علی حالہ موجود ہیں اور بہ تقاضائے خود جلوہ نما ہو کر نظر افروز ہوئے۔ میں نے چاہا تھا کہ ان سب کو سینۂ عاشقاں کی طرح چاک کر کے زیر زمیں پوشیدہ کردوں کہ اخفا ہر حال میں سب سے بہتر ہے۔ ایک روز اسی خیال میں تھا اور قوت سے فعل میں لانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اخوی صاحب قبلہ مولوی تقی حیدر صاحب مدظلہٗ مانع ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ نہیں اس سب کو صاف کر کے محفوظ کر لینا چاہیے۔)

احسن الانتخاب اور مناقب المرتضیٰ میں چند قصائد شائع ہوئے ہیں:

غفران کہ نتیجہ گشت حبِّ حیدر
عنوان صحیفہ گشت حبِّ حیدر
ذاتے ست عجب کہ نیست مثلش ممکن
ایمان و وظیفہ گشت حبِّ حیدر

حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہٗ :(1342ھ۔1923ء/ 1424ھ۔2003ء) خلف اکبر مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کی ابتدائی تعلیم حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرہٗ سے، متوسطات کی اپنے والد ماجد سے، اور بعد ازاں تمام علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اپنے عم محترم مولانا حافظ شاہ علی حیدر قدس سرہٗ (1947ء) سے کی۔ مولانا ظفر الحسن جونپوری، مولانا عبدالحق پیلی بھیتی وغیرہ سے بھی اکتساب علم کیا۔ اپنے عم محترم کے وصال کے بعد مسند نشینِ خانقاہ کاظمیہ ہوئے۔ ان کا دور سجادگی بہت سے پہلوؤں سے بڑا ممتاز و اہم رہا ہے۔ ان کی ہمہ صفت شخصیت بکثرت لوگوں کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی۔ معمولات خانقاہی، اوضاع خاندانی اور اپنے بزرگوں کی روش پر قائم رہنے اور سرِمو انحراف نہ کرنے کی ایسی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ اپنے والد ماجد سے بیعت ہوئے اور ان کے اور اپنے عم محترم کے خلیفہ و جانشین ہوئے، اور اپنے اخلاف اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک لائحۂ عمل چھوڑا۔ تمام عمر، دل بیار و دست بکار، پر عمل کیا اور اپنے مریدین ووابستگان کو اسی کی تعلیم دی۔ ان کی بردباری، تحمل و برداشت باوجود علالت اور گھٹنوں کی شدید تکلیف کے محافل سماع کی صدارت میں چار چار پانچ پانچ گھنٹوں تک نشستِ قلندریہ (چوزانو بیٹھنا اور جنبش نہ کرنا) نہ صرف محیر العقول بلکہ ان کے غیر معمولی صبر و ثبات کا ثبوت ہے۔ انھوں نے صحابۂ کرام کے مبارک طریقہ پر عمل کر کے حصول معاش کی خاطر راتوں کو باغوں و کھیتوں میں مزدوروں کی طرح کام کیا اور دن کو مسند رشد و ہدایت کو بھی زینت بخشی۔ انہوں نے اہل خاندان اور مریدین کی ذہنی اور ظاہری عصری تعلیم کی جانب بھی توجہ دی اور بہت سے نوجوانوں کی دنیاوی زندگی سنوارنے وسجانے میں بڑا اہم کردار ادا فرمایا۔ ان کے دامنِ فیض سے وابستگان کی ایک طویل فہرست ہے۔ جن میں ڈاکٹر عبدالعلیم خاں، شمیم طارق، قیصر تمکین، سہیل کاکوروی، ڈاکٹر صفی احمد جیسے بے شمار نام ہیں۔

تصانیف:

(1) **مطالب رشیدی (ترجمہ)**: حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کی مشہور زمانہ مفید تصنیف، "مطالب رشیدی" کا سلیس اُردو ترجمہ فرمایا۔ جو اخلاقی تعلیمات کے فروغ اور حیات انسانی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کے لئے نسخۂ کیمیا ہے۔ یہ کتاب دو مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ دوسری مرتبہ 1975ء میں کتابت کی دشواریوں کے پیش نظر آپ کے حقیقی خلیفہ و داماد اور بزرگان کی عنایات و توجہات کے مورد، فخر اسلاف گرامی مولانا مولوی حافظ شاہ تقی انور صاحب مدظلہ نے اپنی علالت اور مصروفیات کے باوجود چار سو صفحات سے زائد ضخیم کتاب کی کتابت فرمائی جو بذات خود ایک بڑا کام ہے۔

(2) **ہمارے نبی**: میلاد شریف کے موضوع پر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنی ہمشیرہ عزیزہ کے واسطے ایک مختصر و جامع رسالہ ترتیب دیا جو مطبوعہ ہے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی: خلف اصغر حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ اپنے برادر معظم مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہٗ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں۔ لیکن اتحاد و یک رنگی اور ادب کی ایسی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے برادر معظم کی طرح تمام علوم رسمیہ، عقلیہ و نقلیہ اور تصوف کی تعلیم و تکمیل اپنے تینوں بزرگوں سے کی۔ ان کی جیسی ہمہ گیر و ہمہ جہت جامع شخصیت دوسری کوئی نظر نہیں آتی۔ وہ

اپنے برادر معظم کے لئے ہر دنیاوی امر میں سینہ سپر رہے۔ وہ ہر دنیاوی و دینی معاملہ میں برادر معظم کے ہمہ وقت شریک رہے، حصول معاش کے لئے اپنی قوت بازو کو بروئے کار لائے، اکثر و بیشتر تو یہ بھی ہوتا رہا کہ صاحبزادگان کو فقہ و حدیث و تصوف کا درس کھیتوں کی مینڈوں اور باغات میں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر دیا اور یہ باور کرایا کہ الکاسب حبیب اللہ۔ ان کی دیانت، امانت، اصابت رائے، فراست، تعمق فکر، حسن انتظام، دینی و دنیوی امور میں حزم و احتیاط، تجر علمی، قوت حافظہ، عواقب پر گہری نظر، اصول و امور طریقت کا سختی سے التزام، ہمہ وقت خانقاہ کاظمیہ کے علمی وادبی وقار اور ترقی کے لئے فکری و علمی طور پر سرگرداں، اور اصول وضوابط پر ثابت قدمی جیسی خصوصیات کی نظیر محال ہے۔ ان کی اصابت رائے کی بنا پر ان کے جد امجد کے مخصوص مریدین و مسترشدین بھی اپنے ظاہری و باطنی معاملات و امور میں ان سے رجوع کرتے رہے۔

باوجود ان فضائل وخصوصیات کے اپنے برادر معظم کی بارگاہ میں تہذیب وشائستگی اور ادب واحتیاط کی ایسی مثال قائم کی کہ آج کے دور میں باپ بیٹے کے درمیان بھی ممکن نہیں، انھوں نے ہمہ وقت انتظام و انصرام خانقاہ کاظمیہ، آیندوروند کی فکر، درس وتدریس، خانقاہ کاظمیہ پر موصول ہونے والے علمی خطوط کے جواب، مریدین کی تادیب وتربیت وتعلیم، اذکار و اشغال سلسلہ اور افعال و اعمال پر گہری نظر وغیرہ میں انہاک کے باوجود خانقاہ کاظمیہ کے علمی وادبی کارناموں میں قابلِ قدر اضافے فرمائے۔ وہ اگر کوئی علمی وادبی تخلیق اپنے سے منصۂ شہود پر نہ لاتے تو بھی ان کی مساعی جمیلہ اور صدقات جاریہ علمیہ ان کے نام اور کام کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات پر ثبت کرنے کے لئے کافی تھے۔

(1) سانت رس - (مقدمہ و شرح): حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ کے ہندی کلام سانت رس پر ایک جامع مقدمہ، اس کے نصف حصہ یعنی تقریباً ڈھائی ہزار اشعار کا اُردو ترجمہ، صوفیانہ شرح اور اصطلاحات تصوف کی جامع تشریح کے ساتھ شائع کیا جس کی علمی وصوفیانہ حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی کہ پونے دوسو سال قبل حضرت عارف باللہ نے جو علمی کام انجام دیا، اس کی تشریح اور تعمیم وتکمیل آنجناب مدظلہٗ کے قلم سے ہوئی۔

(2) امرت رس: حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کے ہندی کلام کو یکجا کر کے اس پر ایک جامع صوفیانہ مقدمہ تحریر فرما کر اُردو و ہندی رسم الخط میں شائع فرمایا۔

یہ دونوں مولفات حضرت موصوف الصدر کے ابتدائی دور کی قلمی کاوشیں ہیں۔

(3) النیرین: حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ و حضرت مولانا شاہ علی قلندر قدس سرہٗ کے حالات و واردات اور علمی و روحانی کمالات اور بعض مسترشدین کے بیانات پر مشتمل یہ اہم تصنیف غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

(4) آثارات تکیہ شریف: خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کی عمارات، مختلف سجادہ نشینوں کے عہد میں اس میں اضافے اور بعض دوسرے امور سے متعلق یہ محققانہ رسالہ مطبوعہ ہے۔ اس کی ابتدا میں حضرت مولف مدظلہٗ کے قلم سے ایک صوفیانہ طرز تحریر کا مقدمہ بھی شامل ہے جو آپ کے طرز نگارش کا آئینہ دار ہے۔ خانقاہ کاظمیہ کی موجودہ دور میں تمام اہم تعمیرات، زیبائش اور درستگی آپ ہی کی رہینِ منت ہیں۔

(5) شرائط الوسائط (ترجمہ اُردو): حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ نے اصول طریقت، شرائط شیخی و مریدی وغیرہ سے متعلق ایک رسالہ مرتب فرمایا تھا۔ حضرت مترجم مدظلہٗ نے اس کی افادیت اور موجودہ دور میں اہمیت کے پیشِ نظر سلیس اُردو زبان میں ترجمہ فرمایا۔ یہ بھی ہنوز تشنۂ طباعت ہے۔ سترہ سال کی عمر تک فارسی میں بڑی پرمغز عارفانہ شاعری فرمائی مگر پھر ترک فرمادی۔

مولانا شاہ عین الحیدر قلندر (ولادت 1949ء): حضرت شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہٗ کے بڑے صاحبزادہ اور سجادہ نشین حال خانقاہ کاظمیہ قلندریہ نے تمام تر علوم درسیہ کی تحصیل اور اکتسابات اپنے عم محترم مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی سے کیے۔ حضرت مدظلہ العالی نے عصری ضرورت کے تحت عربی، فارسی و اُردو کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی خانقاہ کاظمیہ میں رہ کر انگریزی زبان وادب کے رمز شناس ڈاکٹر تقی احمد صاحب منشی اصطفیٰ علی صاحب علوی کاظمی ایم اے ایل ٹی سابق پرنسپل حلیم انٹر کالج

کانپور و معین الدین حسن علوی کاظمی اسلامیہ کالج لکھنؤ اور مقصود علی خان فاروقی وغیرہ سے حاصل کی۔ اپنے والد ماجد سے بیعت ہوئے اور آنجناب اور عم محترم مدظلہٗ سے اجازت و خلافت عطا ہوئی۔ 23/اکتوبر 2003ء کو عم محترم مدظلہٗ نے والد ماجد قدس سرہٗ کے سیوم کے روز خانقاہ کاظمیہ کے سجادہ پر لباس پہنا کر متمکن فرمایا۔ ان کے دو صاحبزادہ زین الحید رعرف جنید و ذوالنورین حیدر عرف سعد ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہیں۔

(1) الخطب الضیائیہ: ان کے استاد عربی مولانا شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر کے حکم پر جمعہ، عیدین و نکاح کے خطبات لکھے جو ان کی عربی شاری کے گواہ ہیں۔ صوفیانہ طرز پر لکھے گئے ان خطبات کے ساتھ جمعہ، عیدین وغیرہ کے مسائل بھی شامل کتاب ہیں۔ 1986ء میں یہ خطبات، فخر اسلاف گرامی مولانا حافظ شاہ تقی انور قلندر خلف اکبر مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہما العالی کے خوشخط قلم سے طبع ہو کر منصۂ مشہود پر آئے۔

(2) المقصد الجلی فی مسند العلی: حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر قدس سرہٗ نے حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی سیرت مبارکہ کا جو خاکہ مرتب فرمایا تھا، اس کی تین جلدیں طبع ہو چکی تھیں، چوتھی کی شروعات کی ہی تھی کہ آنجناب قدس سرہٗ نے سفر آخرت فرمایا۔ آپ مدظلہٗ نے بڑی محنت و دیدہ ریزی سے اس کو مرتب فرمایا۔ احادیث مرویہ کی عناوین کے تحت فہرست تیار کی اور تمام احادیث کا مع متن اُردو ترجمہ فرما کر شائع کیا۔

(3) الانتصاح عن ذکر اھل الصلاح (ترجمہ): مولانا حافظ علی انور قلندر کی محققانہ تصنیف فارسی میں طبع ہوئی تھی۔ آپ نے اس کا سلیس اُردو ترجمہ فرمایا اور حضرات خمسہ یعنی (1) مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر (2) مولانا شاہ تقی حیدر قلندر (3) مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر (4) مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر (5) مولانا حافظ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی کے حالات کا اضافہ اور ایک مقدمہ تحریر فرما کر شائع کیا۔

(4) مولود کعبہ: حضرت علی مرتضیٰ کی سیرت طیبہ پر یہ مختصر لیکن جامع اُردو رسالہ دو مرتبہ زیور طباعت سے مزین ہو چکا ہے۔

(5) مناقب مرتضوی: مولانا شیخ محمد صالح کشفی کی مشہور کتاب مناقب مرتضوی، کا سلیس اُردو ترجمہ زیر ترتیب ہے۔

(6) سرّ الشہادتین (اردو ترجمہ): حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م1239ھ) نے حضرات امامین کریمین رضی اللہ عنہما کی شہادت کے سلسلہ میں فارسی میں ایک محققانہ تالیف فرمائی۔ موصوف نے اس کا سلیس اُردو ترجمہ مع مفید حواشی تحریر فرمایا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ان کے علاوہ کربلا کی فریاد، ذکر حسین و یزید، مقالات تحریر فرمائے ہیں۔

مولانا حافظ شاہ تقی انور قلندر (1950ء): حضرت مولانا شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی کے صاحبزادہ اور ان کے اور اپنے عم محترم مرشد برحق مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہ کے آئینہ کمالات ہیں۔ جس طرح خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کا کوئی تذکرہ حضرت شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اسی طرح ان کے صاحبزادہ مولانا حافظ شاہ تقی انور قلندر مدظلہٗ العالی کے تذکرہ سے بھی کوئی سوانح نگار صرف نظر نہیں کر سکتا۔ انہوں نے تمام علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل والد ماجد مدظلہ العالی سے کی اور اوراد و اذکار و اشغال خاندانی سیکھے، اسلاف کرام کا نقش حقیقی اور ان کے طریقوں پر شدت سے گامزن ہیں۔ انھیں اپنے عم مکرم کی بارگاہ میں جو مقبولیت و محبوبیت حاصل رہی اس میں ان کے جذبۂ خدمت گزاری، اطاعت شعاری اور مرشدین گرامی کی ذات میں فنائیت تامہ کو بڑا دخل ہے۔ خدمت و اطاعت گزاری سے ان کا شغف ناقابل تقلید ہے۔ وہ ہر وقت اپنی اس نسبت کے مخفی رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ انھیں عم مکرم قدس سرہٗ سے بیعت و اجازت، خلافتِ جملہ سلاسل حاصل ہے۔ ان کے بہت سے کمالات میں خود اکتسابی کی شرکت غالب ہے۔ عربی و فارسی نسخ و نستعلیق اور اُردو ہندی نثاری و خوشخطی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور یہ سب کچھ ان کا وہبی ہے۔ اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شوق آبائی ہے۔

(1) القول الجلی فی ذکر آثار الولی (ترجمہ): حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1176ھ) کا نادر و مستند، جامع، دقیق ملفوظ کا سلیس اُردو ترجمہ مع حضرت شاہ صاحب کی

دقیق اصطلاحات تصوف کی تشریح وتوضیح کے مرتب فرمایا۔ 800 سے زائد یہ ملفوظ تین بار اشاعت پذیر ہوکر علمی و ادبی حلقوں میں خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے بزرگ عالم حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری قدس سرہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں حضرت مترجم کی تعریف وتوصیف کے بعد ان کو ''بحرالحقائق'' سے تعبیر فرمایا۔ محقق عصر مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی کا یہ ارشاد کہ'' القول الجلی کی توجیہ وشرح کے بعد اگر اب کوئی دوسری تصنیف نہ بھی فرمائیں تو آئندہ آنے والی نسلوں پر آپ کا یہ احسان اور صدقہٗ جاریہ علمیہ باقی رہے گا۔''

(2)تذکرہ حضرت خواجہ عبید اللّٰہ احرار نقشبندی :(اُردو) سلسلہ نقش بندیہ کے قافلہ سالار حضرت خواجہ احرار کے حالات، ملفوظات اور افادات پر مشتمل یہ مفید تصنیف 1985ء میں طباعت سے آراستہ ہوئی۔

(3)تذکرۂ گلشن کرم :خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے بانی حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ سے حضرت مولانا شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی تک تمام بزرگوں کا مختصر و جامع چار سو صفحات پر مشتمل تذکرہ، ان کے سریع القلم ہونے اور ان کی ادبیت پر دلالت کرتا ہے۔ 1975ء میں طبع ہوا۔

(4)بحرالمعانی (ترجمہ) :حضرت شیخ ابوجعفر حسینی مکی خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا عرفان وتصوف اور حقائق و معارف میں بڑا بلند مقام تھا۔ بحرالمعانی ان کے 38 دقیق مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ حضرت مترجم مدظلہٗ العالی نے ان مکتوبات کا شگفتہ ورواں اُردو ترجمہ کیا اور دقیق فقروں واصطلاحات کی تشریح وتوضیح بھی فرمائی۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

(5)تنویر الظلمات فی تفسیر المقطعات (ترجمہ) :حضرت شاہ تقی حیدر قلندر قدس سرہٗ کی یہ اہم تصنیف عربی زبان میں تھی۔ آپ مدظلہٗ العالی نے اس کا اُردو ترجمہ فرمایا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ خانقاہ کاظمیہ کے بعض مخصوص و باکمال مریدین کے نام آپ کے مکاتیب، مکتوب نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ کرتے ہیں اور تصوف وعرفان کے بہت سے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی بھی۔ فارسی و اُردو زبان میں بڑی پر مغز شاعری بھی 1976ء تک فرمائی مگر چونکہ تمام تر حال کی شاعری تھی لہٰذا حتی الوسع دستیاب شدہ ہزارہا اشعار کا گنج گراں مایہ نذر آتش کر دیا۔

مولانا شاہ تقی انور قلندر کے دو صاحبزادے ہیں۔ (1) مولوی شبیہ انور علوی صہیب (2) مولوی حافظ شبیب انور علوی عمیر۔

مولوی شبیہ انور علوی: (مارچ 1981ء) نے جملہ درسیات کی تکمیل والد ماجد اور جد امجد مدظلہٗ العالی سے کی۔ عربی و فارسی اور اُردو کی تمام مکمل کتابوں کا درس ان ہی سے لیا جن میں گلستاں، بوستاں، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی، مثنوی شریف، گلشن راز، فتوح الغیب، ہمعات، لمعات، الطاف القدس، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، صحیح بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، شرح وقایہ وغیرہ اہم ہیں۔ علاوہ ازیں عصری تعلیم کی خاطر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے وایم اے (فارسی) کی اسناد امتیازی نمبروں سے حاصل کیں۔

عربی و اُردو حسن خط میں وہ اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔ اپنے نانا صاحب معظم مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر قدس سرہٗ کی خاص تربیت کے پروردہ اور خدمت گزاری واطاعت کے سبب شفقت وعنایات وتوجہات کے مورد ہیں۔ ان سے ہی بیعت ہیں۔ اپنے جد امجد مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی سے بھی اجازت وخلافتِ سلاسل طریقت حاصل ہے۔

(1)فتح الکنوز (ترجمہ):اخلاق وتصوف میں حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ (1275ھ) کی یہ تصنیف فارسی زبان میں طبع ہو چکی تھی۔ اس کا اُردو ترجمہ ودیباچہ مترجم موصوف کے قلم کے رہینِ منت ہیں جو طبع ہو چکے ہیں۔

(2)حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، احوال و آثار:

مولوی حافظ شبیب انور علوی (دسمبر 1982ء): خلف اصغر حافظ شاہ تقی انور صاحب نے اپنے جد امجد اور والد محترم مدظلہما العالی سے تفسیر، حدیث فقہ وتصوف وغیرہ کی مکمل تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر معظم کی طرح تمام مذکورہ کتابوں کا درس لیا۔

جدامجد مدظلہ العالی سے کلام مجید حفظ کیا اور کم سنی سے خانقاہِ کاظمیہ کی مسجد میں اپنے جدامجد اور والد ماجد مدظلہما کے ہمراہ رمضان مبارک میں کلام مجید سناتے رہے ہیں۔

وہ بھی اپنے نانا صاحب قدس سرہٗ سے بیعت و مجاز اور دادا صاحب مدظلہٗ سے جملہ سلاسل کے اجازت یافتہ ہیں۔ عصری ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے بھی خانقاہ کاظمیہ کے نصاب درس کے ساتھ ساتھ بی اے وایم اے کی اسناد اعلیٰ نمبروں سے حاصل کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ذات سے خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے فروغ میں اضافہ اور علمی و ادبی وقار کو مزید اعتبار بخشے۔

(1) **حقیقۃ الحقائق (ترجمہ)**: سلسلہ نقشبندیہ کی اہم علمی وروحانی شخصیت حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی کے تصوف اور وحدت الوجود کے اثبات میں فارسی رسالہ کا اُردو زبان میں سلیس وعام فہم ترجمہ اور اس پر ایک مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔

(2) **مقالات صوفیہ**: حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کی اس فارسی مفید عام تصنیف کا سلیس اُردو زبان میں ترجمہ کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھ کر اُسے شائع کیا۔ اس کے علاوہ دو تصانیف اور زیر ترتیب ہیں۔

(3) **اصطلاحات تصوف**: تصوف کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف کے بیانات کو بعض کم سواد، نافہم اور نکتہ چیں حضرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حضرات صوفیہ صافیہ نے اپنے منظوم و منثور کلام کے لئے اصطلاحات وضع فرمائیں۔ اس مفید عام اور تصوف کے شائقین کے لئے ایک بے بہا نعمت کی صورت میں بکثرت اصطلاحات کو یکجا کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے۔

❁❁❁

ملفوظات شیخ اخی جمشید راج گیری: ایک نادر سہروردی مخطوطہ

ڈاکٹر مقصود احمد خاں .... سینئر ریسرچ اسسٹنٹ، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری، اے ایم یو علی گڑھ

سہروردی سلسلے کے ایک اہم بزرگ شیخ اخی جمشید راج گیری اُچ کے سید جلال الدین بخاری[1]، جو مخدوم جہانیان جہاں گشت کے نام سے معروف ہیں، کے خلفا میں تھے۔ ان کا اصل نام جمشید تھا اور زہرہ مئو کے رہنے والے تھے لیکن ان کے پیر شفقت سے انہیں اخی کہہ کر بلاتے تھے اور وہ اسی نام سے ہر خاص و عام میں مشہور ہوئے۔ بچپن میں ہی روحانیت کی تلاش میں گھر بار چھوڑ دیا، اپنا تمام مال و متاع غریبوں اور ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کر کے انہوں نے مخدوم جہانیان کی صحبت اختیار کی اور ان کی خدمت میں ایک طویل مدت گزاری، ان سے روحانی تربیت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ان کے زیر نگرانی زہد و تقویٰ کے اسباق ازبر کیے۔ مخدوم جہانیان نے اپنے عزیز مرید شیخ اخی جمشید کو خلافت نامہ عطا کیا اور قنوج کی ولایت بخشی۔ نہایت مختصر مدت میں ان کی روحانیت اور کرامات نے ہزاروں لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر لیا اور وہ خاص و عام کے درمیان مقبول ہو گئے۔

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ہولی کے موقع پر نہایت رنگین کپڑے اور زیورات زیب تن کیے غیر مسلم جوانوں کا ایک گروہ رقص کرتے اور نغمے گاتے اُن کے گھر کے پاس سے گزرا۔ شیخ اس گروہ کے نغموں کو سن کر جذب کی حالت میں آ گئے اور ان کے ساتھ ہو لیے اور اسی حالت میں تین دن تک محو رہے اور قنوج کی گلیوں اور کوچوں میں بھٹکتے رہے۔ عوام بھی خود کو اس پُر کیف مستی کا شکار ہونے سے نہ روک سکے اور ان کے ساتھ بھٹکتے پھرے۔ ظاہر پرست علما شیخ کے خلاف فتویٰ صادر کرنے کی تیاری کرنے لگے کہ انہوں نے شریعت کی خلاف ورزی کی ہے اور ان کو اس کی سخت سزا دی جائے۔ اس سلسلے میں انہیں قنوج کے سب سے بڑے عالم میر سید احمد منجھالے کی منظوری درکار تھی[2] جو شیخ کی روحانی قوتوں سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اُس دستاویز پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جو شیخ کے خلاف تیار کیا گیا۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف عبدالرحمٰن چشتی میر سید منجھالے اور ان کے وارثین کی مالی خوشحالی کو شیخ اخی راج گیری کی دعاؤں کا ثمرہ بتاتے ہیں۔

اس کے بعد اُن علما نے خواجہ جہاں سلطان الشرق (متوفی ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء) کا رخ کیا اور ان کو اس بات پر رضامند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ شیخ کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کریں۔ شیخ اخی راج گیری نے اپنا موقف واضح کرنے کے لئے سلطان کو ایک خط تحریر کیا کہ ''میں نے زمین پر رقص کیا ہے اور اب میں حضور والا کے تعاون سے دانستہ ہوا میں رقص کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔'' انہوں نے خط میں یہ بھی واضح کیا کہ ''الوہی محبت کی راہ میں موت کا حصول سب سے پسندیدہ مقصد ہے۔'' جب سلطان نے اس خط کو پڑھا تو اس نے شیخ کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

قنوج میں ان کے قیام کے دوران ہی ہندوستان میں مداریہ سلسلہ کے بانی اور رہنما شیخ بدیع الدین شاہ مدار ایک دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے[3]۔ شیخ نے نہایت احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور بڑی پر تکلف مہمان نوازی کی۔ شیخ اخی قنوج میں بہت دنوں تک قیام نہ کر سکے کیونکہ لوگوں کا ازدحام ان کے استغراق اور خلوت میں رخنہ پیدا کرنے لگا تھا۔ انہوں نے بہتر ماحول کی خواہش میں بالآخر قنوج کو خیرباد کہہ کر راج گیر کے ایک چھوٹے اور قدرے ویران گاؤں[4] میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیخ اخی راج گیری نے خلوت نشیں زندگی کی طلب میں کچھ مدت فیروز آباد کے لکڑی بازار کے ایک گوشے میں قیام کیا اور اس دوران انہوں نے کسی کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔ سوائے کچھ مخصوص اصحاب کے جن میں ملک عبداللہ بھی شامل تھے جو خود بھی ایک تارک الدنیا تھے اور جنہوں نے روحانی طور سے خود کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے وابستہ کر رکھا تھا۔ شیخ نے تجرد کی زندگی اختیار کی، وہ عوامی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اور

انہوں نے اپنا قیمتی وقت اور ساری قوت عوامی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ یہ سلسلہ راج گیر میں ان کی وفات تک جاری رہا۔۵ روحانی اور دنیاوی فیوض کے حصول کے لئے لوگ ان کے پاس آتے رہے۔ انہوں نے اپنی ہمشیرہ کے لڑکے شیخ قیام الدین کو تربیت دی اور اپنا سجادہ نشین مقرر کیا، جس کا دعویٰ شیخ فتح اللہ راج گیری بھی کرتے تھے۔

شیخ کی حیات اور کارناموں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ حال ہی میں خاکسار نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری سے شیخ اخی جمشید راج گیری کے ملفوظات کی ایک جلد دریافت کی۶، جس میں تصوف اور اس کے اسرار و رموز کے نکات مختلف ابواب میں ذکر کیے ہیں۔ نیز ملفوظات میں ان کے صوفیانہ تفکرات اور خیالات کے بارے میں نہایت اہم معلومات موجود ہیں۔

شیخ کا خیال تھا کہ صوفی وہ ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں سے خود کو پاک کر لیتا ہے اور جو دنیاوی مال و متاع کی حرص سے اپنے دل کو اس طرح پھیر لیتا ہے کہ اس کی نظر میں پتھر اور سونے کی قدر یکساں ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقی صوفی نہایت کم یاب ہیں۔

شریعت پر وہ بہت زور دیتے ہیں اور سچا صوفی اس کو مانتے ہیں جو شریعت کے ذریعے بتائے گئے مذہبی فرائض کی مکمل ادائیگی کرتا ہے۔ ان کے مطابق ''شریعت ایک کشتی کی طرح، طریقت ایک دریا کی طرح اور حقیقت ایک دُرِّ نایاب کی طرح ہے۔ اگر کوئی اس دُرِّ نایاب کا خواہش مند ہو تو ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک کشتی کا انتظام کرے، پھر دریا میں ڈال دے، اس کے بعد ہی وہ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے۔'' شیخ کے ذریعے بتائی گئی دوسری مثال یہ ہے کہ ''شریعت ایک صحن کی طرح، طریقت ایک نردبان (زینہ) کی طرح اور حقیقت ایک بام کی طرح ہے۔ اگر کوئی شخص بام پر پہنچتا ہے تو ضرورت ہے کہ وہ پہلے صحن میں داخل ہو، پھر زینہ طے کرے، اس کے بعد ہی وہ بام پر پہنچ سکتا ہے۔''

شیخ کے مطابق کسی نو آزمودہ شخص کے لئے جو اللہ کی رفاقت کا خواہش مند ہو، ایک لائق و فائق اور تجربہ کار پیر کی صحبت ناگزیر ہے۔ ان کے نزدیک انسان دو مختلف جوہروں سے مل کر تخلیق ہوا ہے، ایک جوہر الوہی اور دوسرا جوہر سفلی اور دونوں جواہر، امراض سے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ سفلی وجود کو لاحق ہونے والے امراض کے علاج کے لئے حکیم موجود ہیں جو علاج کے ذریعے انسان کو بیمار سے صحت مند میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو غارت ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کے لئے بھی حکیم ہوتے ہیں جو اپنی معالجاتی تدبیروں سے بیماریوں کی وجوہات دریافت کرتے ہیں اور امراض کی تشخیص کرتے ہیں اور ایک بیمار شخص کو قعرِ مذلت سے نکال کر نجات کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ سفلی امراض کے ڈاکٹر حکما ہوتے ہیں جب کہ ہر قسم کے روحانی امراض سے نجات دلانے والے اولاً پیغمبر حضرات تھے اور ان کے بعد شیوخ یعنی پیر ہوتے ہیں۔ ''شیوخ اپنی بارگاہ ارادت میں پیغمبروں کی طرح ہیں۔'' وہ مزید فرماتے ہیں کہ جس طرح کسی سفلی (جسمانی) مرض میں مبتلا شخص ایک لائق ڈاکٹر کے علاج کے بغیر اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے، اسی طرح روحانی امراض میں مبتلا شخص بھی کسی پیغمبر یا تجربہ کار شیخ کی دستگیری کے بغیر تباہی کے خطرات کی زد میں ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی قوموں میں سے علما اصل میں پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں۔ ایک حکیم بیماری کی وجہ جاننے کے لئے مریض کی نبض دیکھتا ہے اور اس کے لئے اس کی جسمانی استعداد کے مطابق دوا تجویز کرتا ہے، وہ مختلف وزن میں کئی دوائیں ملا کر مریض کے لئے معجون بھی تیار کرتا ہے اور کوئی چیز، جو ایک مریض کے لئے تجویز کرتا ہے، دوسرے کی صحت برداری کے لئے وہی چیز اسے منع کر دیتا ہے۔ اسی طرح پیغمبر حضرات بھی روحانی مریض کی داخلی تکلیفوں کو سمجھتے ہوئے مریض کے درک و استعداد کے مطابق کسی خاص اصول پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے تھے، کبھی کسی کو دو اور کبھی تین اور کچھ مخصوص حالات میں چار اصولوں کی پیروی کی تلقین فرماتے تھے، کسی بات کو جائز قرار دیتے تھے او رکسی چیز کے لئے منع فرما دیتے تھے۔ یہ ساری تدبیریں اس لئے اختیار کی جاتی تھیں تاکہ امراض کی صحیح تشخیص ہو سکے اور مریض کو جلد سے جلد قوانین کی متوازن پیروی کے ذریعے صحیح علاج بہم پہنچایا جا سکے، اس طرح وہ تباہی سے بچ جاتا تھا۔ اگر جسمانی امراض میں مبتلا کوئی شخص اپنے معالج کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے احکام کے برخلاف عمل کرتا ہے تو لاحق مرض یقیناً دن بہ دن اس شخص کو مزید بیمار کرتا جائے گا اور

بالآخرایک دن اسے تباہ کردے گا۔

شیخ مریدوں کے خلوت نشینی اختیار کرنے کے خلاف تھے ۔ اس سلسلے میں وہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی مثال دیتے ہیں، جنہوں نے ایک دفعہ اپنے بھانجے شیخ زین الدین کو حکم دیا کہ وہ ان درویشوں کے سامنے جلوت فرمائیں جو خلوت نشینی کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ شیخ نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ پہلے وہ سچے مسلمان بنیں اور یہ کہ خلوت نشینی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دل اللہ کے سوا دنیا کی ہر چیز سے پھر چکے ہیں۔

دل کو لاحق تمام امراض کی اصل وجہ دنیاوی چیزوں سے لگاؤ ہے۔ خود پسندی، عہدوں کا لالچ، حسد، غرور، غیبت، حد سے متجاوز خواہشات، گناہ کو معمولی سمجھنا، مظلوم لوگوں پر رحم نہ کھانا، انسانی خدمت سے گریز اور ان کے علاوہ کھانے، سونے اور گفتگو میں حد سے تجاوز کرنا ایسی ہی بیماریاں ہیں۔ شیخ کے مطابق ان بیماریوں کا علاج ترک دنیا میں پوشیدہ ہے اور اس کا حصول صرف قلب کی صفائی سے ہی ممکن ہے۔قلب کی صفائی کے لئے شیخ نے درج ذیل مشورے دیے ہیں۔

۱- عبادت: جس کی دو قسمیں ہیں، عبادت ظاہری اور عبادت باطنی۔ ابتدا میں مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے عبادت ظاہری مثلاً نماز، روزہ، کم کھانا، کم سونا اور کم بات کرنا اور اللہ کے ذکر میں خود کو مصروف کرے۔

۲- ذکر الٰہی: یہ دو طرح کا ہوتا ہے، ذکر جلی اور ذکر خفی۔ شیخ کے مطابق ابتدا میں مرید کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو چوبیس گھنٹے ذکر الٰہی میں مصروف رکھے کیونکہ یقینی طور پر اس کا یہی مشغلہ ذکر خفی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

۳- فاقہ کشی: شیخ نے فاقے کے فوائد کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مرید کے لئے اس کی خوبیوں اور کمیوں کو دس نکات میں بیان کیا ہے:

(ا) فاقہ انسان کے قلب کی صفائی کرتا ہے اور اسے دانش عطا کرتا ہے، جب کہ شکم سیری انسان کو سست اور کاہل بنا دیتی ہے۔

(ب) زیادہ کھانا انسان کو شقی القلب بنا دیتا ہے جب کہ فاقہ اسے رقیق القلب بناتا ہے اور اللہ کے ذکر و مناجات کا مزہ وہ آسانی سے لے سکتا ہے۔

(ج) جس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے وہ اللہ کے ذکر اور عبادت سے لاپرواہی برتنے لگتا ہے جو اسے جہنم میں لے جاتی ہے لیکن مالی پریشانی، غربت اور خاکساری انسان کو جنت میں لے جاتی ہے۔

(د) ایسا شخص جو شکم سیر ہو وہ بھوکوں اور غریبوں کو نظر انداز کرنے لگتا ہے۔

(ہ) انسان کو اپنے نفس کا غلام نہیں بننا چاہیے جس کو فاقے سے مسخر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے انسان غیر ضروری جنسی ہوس سے نجات پا لیتا ہے۔

(و) کم کھانے سے انسان زیادہ سونے سے بچتا ہے اور وہ اس وقت کو اللہ کی یاد اور ذکر میں استعمال کر سکتا ہے جب کہ زیادہ کھانا انسان کو قلب مطمئنہ بخشتا ہے اور وہ خوش باشیوں اور تفریحات جیسے لہو ولعب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اپنا قیمتی وقت اور قوت ضائع کرتا ہے۔

(ز) معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی کم کھانا بہت سودمند ہے۔ اس سے انسان روزانہ بہت سی کھانے پینے کی چیز خریدنے کی زحمت سے بچتا ہے اور خرچ پر قابو رکھ پاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنا قیمتی وقت بھی بچا سکتا ہے جو وہ کھانا بنانے میں صرف کرتا ہے۔

(ح) کم کھانے سے انسان صحت مند رہتا ہے، اس طرح وہ بیماریوں، ذہنی پریشانیوں، حکیموں کی صلاح اور بالآخر ڈھیر ساری دوا کھانے سے بچ جاتا ہے۔

(ط) خوب ذائقے دار کھانے کے لئے انسان کو خوب پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ کئی طرح کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی افعال کا مرتکب ہو سکتا ہے، لیکن کم کھانے سے اس کا خرچ از خود محدود ہو جاتا ہے۔

(ی) غیر ضروری کھانے پر خرچ ہونے والی رقم کو بچا کر انسان غریبوں اور ضرورت مندوں کے درمیان صدقہ کر سکتا ہے، جو اس دنیا میں بھی باعث خیر ہے اور آخرت میں بھی۔

ان باتوں کی تلقین کے بعد شیخ نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ کم کھانا کھا کر ڈائٹنگ شروع کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ

ایک دم سے ایسا نہ کریں بلکہ کم خوراکی کا نظام مرحلے وار اپنائیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص دوپہر کے کھانے میں روٹی کے تین ٹکڑے کھاتا ہے تو وہ پہلے دن ایک ٹکڑا کم کرے، پھر دوسرے دن مزید ایک ٹکڑا اور اسی طرح اپنا معمول بنائے۔

ان ہدایات کے علاوہ شیخ نے نفس پر قابو رکھنے کی پُر زور تاکید کی ہے۔ ان کے مطابق ایک شخص جس نے اپنے نفس پر قابو پالیا اس نے اللہ کو پالیا۔

شیخ کا عقیدہ تھا کہ لفظ عشق اللہ کی نسبت سے متعلق ہے۔ اپنے نظریے کی تائید میں انہوں نے اس امر پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ وہ سماع، وجد، رقص وغیرہ کے بھی حامی تھے۔ اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے اور سماع کے موضوع پر موجود اہم ماخذ مثلاً 'کتاب سماع'، 'تاج السماع'، 'عوارف المعارف' وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔

حضرت اخی جمشید کے حکمراں طبقے سے قریبی روابط تھے۔ سلطان الشرق ملک سرور نے جون پور کی بادشاہت کے حصول کے لئے شیخ سے خصوصی دعا کرائی تھی اور اس نے کئی مرتبہ شیخ کے آستانے پر حاضری بھی دی تھی۔ شیخ نے اس کے دوستوں میں سے ایک سید علیم الدین (مخدوم جہانیان کے خلیفہ) کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ سلطان ابراہیم شرقی کی خدمت میں جون پور جائیں۔ شیخ نے پلائن (یو پی کے ہردوئی ضلع) کی جاگیر دے کر ان کی عزت افزائی بھی فرمائی ۸۔

ملفوظات میں ایک واقعہ درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک کوتوال نے شیخ کے دربار میں حاضری دی، شیخ نے اسے اس کے فرائض کی یاد دہانی کرتے ہوئے اسے اپنی ذمہ داریاں دن رات خوب محنت سے پوری کرنے اور چوری اور فریب پر کڑی نظر رکھنے کی تلقین کی۔ شیخ نے فرمایا کہ چور صرف کسی کی دولت اور دنیاوی مال ومتاع کو چرا سکتا ہے اور اس طرح وہ ان دُزدانِ دین سے کم خطرناک نہیں جن کے دل میں اللہ کی ذرا بھی محبت نہیں ہوتی اور وہ دنیاوی فائدوں کے لئے آخرت کو فروخت کردیتے ہیں اور اپنے دل میں الوہی محبت کی فصل کاری کے لئے ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔ دن میں وہ روحانیت کا پردہ اوڑھ کر چوری کرتے ہیں اور رات میں شیطانی عملیات میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اپنے نفس کی تسکین کے لئے کام کرتے ہیں۔ اس حاشیے کو نقل کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ شیخ اپنی محفلوں میں حاضری دینے والے سرکاری عہدے داروں کو عوامی فلاح و بہبود کے لئے نصیحت فرماتے رہتے تھے۔

ملفوظات میں سہروردی، چشتی، فردوسی اور دوسرے صوفیا کی تعلیمات، کرامات وغیرہ کا ذکر بھی موجود ہے جن میں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ رکن الدین ابوالفتح اور سید جلال الدین بخاری، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ شرف الدین پانی پتی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بڑے عالم تھے، جنہوں نے تفسیر عمدہ، تفسیر کشاف، کتاب سماع، قوت القلوب، عوارف المعارف، گنج اسرار وغیرہ جیسی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات و مکتوبات کا بغور مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ ان کی تعلیمات سے کافی متاثر بھی تھے۔ شیخ سہل پسندی کے قائل تھے اور فلسفیانہ گفتگو سے احتراز فرماتے تھے۔ کبھی کبھی وہ گفتگو میں قرآن پاک اور احادیث، معروف صوفیائے کرام اور خانقاہی زندگی کی مثالوں کے علاوہ صوفیانہ ادب سے ماخوذات بھی نقل فرماتے تھے۔

اکثر وہ اپنی گفتگو میں ہندی کے دوہے نقل فرماتے اور اپنی بات مقامی عوام کو سمجھانے کے لئے ان کا استعمال کرتے تھے۔ آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شیخ اخی جمشید کے ملفوظات کی اہمیت اس بات سے واضح ہے کہ یہ سہروردی صوفیائے کرام کے کمیاب ملفوظات میں سے ایک ہے۔

حواشی

۱- سید جلال الدین بخاری (متوفی ۷۸۵ھ) پیدائش اُچ، شیخ بہاء الدین زکریا کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح کے مرید تھے۔ یہ ان کی ہی شخصیت اور کوشش کا کمال تھا کہ اُچ کے سہروردی مرکز کو شہرت حاصل ہوئی۔ دیکھیے درویش جمالی، سیر العارفین، روٹوگراف ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص-۲۹ تا ۳۳، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، دہلی، ص-۱۴۱ تا ۱۴۳، شیخ عبدالصمد، افضال محمد، اخبار الاصفیاء، ایم ایس، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، فرنگی محل کا کلکشن (فارسیہ تذکرہ)، کال نمبر

۸۵/۳، عبدالرحمٰن چشتی، مرأۃ الاسرار، ایم ایس مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عبدالسلام کلکشن، کال نمبر ۹۳۴/۲۹، ایف ۳۱۶بی۔

۲- یہ میر سید کمال ترمذی کے وارثوں میں سے تھے جو سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں ہلاکو خاں کے ظلم وستم سے تنگ آکر ہندوستان ہجرت کر آئے تھے اور کیتھل میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ میر سید احمد منجھالے کیتھل سے ہجرت کر کے قنوج آگئے۔ دیکھئے مرأۃ الاسرار۔

۳- بتایا جاتا ہے کہ شاہ مدار نے شیخ اخی سے ان کی کالپی سے واپسی کے سفر میں ملاقات کی۔ دیکھئے مرأۃ مداری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حبیب گنج کلکشن، کال نمبر ۱۷ایف،۲-۱/۱۲۹/۳۲۔ بایو گرافیکل اسکیچز کے لئے دیکھئے اخبار الاخیار، اخبار الآصفیہ، کلیۃ الصادقین، بحر ذخار، ایم ایس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۴- یہ گاؤں اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد میں قنوج سے تین میل جنوب مشرق میں واقع کالی ندی کے کنارے آباد ہے۔ دیکھئے E.R.Neave,A District Gazetteer of the United Provinces of Agara and A. Fuhere,223

۵- وفات کے سلسلے میں کوئی مستند جانکاری موجود نہیں ہے۔ عبدالرحمان چشتی مانتے ہیں کہ شیخ اخی، سلطان ابراہیم شرقی کے دور اقتدار کے آخری زمانے تک بقید حیات تھے، جس نے ۸۴۴ ہجری مطابق ۱۴۴۰ء تک حکومت کی (Mi. Asf.318B) غلام سرور نے ان کی وفات کی تاریخ ۸۰۱ ہجری، مطابق ۱۳۹۸ء رکھی ہے۔ (خزینۃ الآصفیہ ایضاً، جلد-۲،) ای آرینو کے مطابق شیخ کا مقبرہ ۸۴۲ ہجری مطابق ۱۴۳۸ء میں تعمیر ہوا اور اورنگ زیب کے ذریعے اس کی مرمت کرائی گئی۔ دیکھیے Oudh,Farrukhabad A District Gazetteer of the UP Agara ص-۲۲۳۔ اے فیوہرر کے مطابق ''راجگیر میں کالی ندی کے کنارے قدیم اینٹوں کا کھنڈر نما ڈھانچہ مخدوم اخی جمشید کا مقبرہ ہے۔'' دیکھئے Oudh, the Monumental Antiquities 1969. Varanasi Inscription in the North Western Provinces جلد-۱، ص-۸۱

۶- اس کے مرتب شیخ یحییٰ ولد علی اصغر ولد عثمان حسینی جو خطہ قنوج میں راج گیر کے مقامی باشندہ تھے۔ سید جلال الدین بخاری، اُچ کے مخدوم جہانیان جہاں گشت کے مریدوں میں سے تھے اور تقریباً چودہ سال تک ان کی صحبت میں رہے۔ اپنے روحانی پیر کی وفات کے بعد انہوں نے شیخ اخی جمشید کی صحبت اختیار کی اور ۷۹۳ھ مطابق ۱۳۹۱ء میں ان کے ملفوظات مرتب کیے (ملفوظات شیخ اخی، ایف ۲بی) ملفوظات میں ۱۱۴ فولیو اور ۱۱۲ اسمبلیاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے یہ ملفوظات صرف دو ماہ کی مدت میں یعنی ۱۴/ جمادی ۷۹۳ھ سے شروع کر کے ۲۲/ جمادی، ۸/۱۱/ اپریل سے ۱۶/ مئی ۱۳۹۱ عیسوی کے دوران نقل کیے ہیں۔ یہ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ (فارسیہ مذہب وتصوف) کال نمبر ۶۶/۳)

۷- اگر چہ شیخ نے اپنے ملفوظات میں خلوت پسندی کی تنقید کی ہے لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں خود اسی روایت کو اختیار کیا، ملفوظات اخی، مرأۃ الاسرار۔

۸- سید علیم الدین پلائن میں قیام پذیر ہوئے۔ ایک موقع پر جب مقامی ہندوؤں نے انہیں بہت ستایا تو وہ شیخ اخی کی مدد کے خواستگار ہوئے۔ شیخ اخی پلائن تشریف لے گئے اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا اور ان کو اور ان کے مریدوں کو دعا دے کر رخصت ہوئے۔ خ-۱، جلد-۱، ص-۶۴۵۔

کتابیات

۱- اخبار الاخیار

۲- نزہۃ الخواطر، ابوالحیٔ، حیدرآباد

۳- مرأۃ الاسرار: Op.Cit.، ای ف ۳۱۵ بی، غلام سرور

۴- خزینۃ الاصفیہ

۵- اخبار الاصفیہ، ایف ۱۴۷، اے-بی

۶- ملفوظات شیخ اخی، ایف ۱۴۱ اے۔

۷- عبدالرحمان جامی، تحفۃ الانس

❁❁❁

صوفیہ اور خدمات دینیہ

وارث ریاضی ...... کاشانۂ ادب (دیوراج)، بسوریا، مغربی چمپارن، بہار

اصل موضوع پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب ہے کہ لفظ ''تصوف'' اور ''صوفی'' کے مفہوم و معنی کی کسی قدر وضاحت کر دی جائے۔ صوفیا کا ایک گروہ تصوف کو (صوف بمعنی اون) سے ماخوذ قرار دیتا ہے، چونکہ کچھ صوفیا اونی لباس استعمال کرتے تھے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ارباب تصوف، اصحاب صفہ سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کو صوفی کہا جاتا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''تصوف'' یونانی لفظ ''صوفیا'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی حکمت کے آتے ہیں۔[1] لیکن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز (۴۷۱ھ۔۵۶۱ھ) کے نزدیک تصوف کا ماخذ صفا (بمعنی صفائی، نکھار، اخلاص) ہے۔ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

" التصوف مشتق من الصفا، لا من لبس الصوف، الصوفی الصادق فی تصوفه یصفو قلبه عما سوی مولاه عزوجل، وهذا شئ لایجئ بتغیر الخرق وتصغیر الوجوه ولقلقلة اللسان بحکایات الصالحین و تحریک الاصابع بالتسبیح و التهلیل، و انمایجئ بالصدق فی طلب الحق عزوجل والزهد فی الدنیا و اخراج الخلق من القلب و تجرده عماسوی مولاه عزوجل."[2]

تصوف، صفا سے نکلا ہے، صوف (بمعنی اونی لباس پہننے) سے نہیں۔ تصوف میں صوفی صادق وہ پاکیزہ صفت انسان ہے، جو اپنے دل کو غیر اللہ کی محبت سے پاک و صاف رکھے، یہ چیز صوفی کے اندر کپڑوں کے بدلنے، چہروں سے تذلل اور خاکساری ظاہر کرنے، زبان سے صالحین کی حکایات بیان کرنے اور انگلیوں سے تسبیح کے دانے شمار کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ صوفی میں یہ وصف، صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طلب، دنیا سے قطع تعلق، دل سے مخلوق کی محبت نکالنے اور صرف اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنے سے پیدا ہوتا ہے)

تصوف کے سلسلے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے نقطۂ نظر کی تائید ایک عربی شاعر کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے۔

تنازع الناس فی الصوفی و اختلفوا
وظنه بعض مشتقا من الصوف
ولست امنح هذا الاسم غیر فتی
صافی فصوفی حتی سمی الصوفی [3]

(لوگوں کا لفظ صوفی کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ صوف (بمعنی اون) سے نکلا ہے، لیکن میں یہ لفظ صرف اس آدمی کے لئے استعمال کرتا ہوں جو اپنے نفس کو کدورتوں اور برائیوں سے صاف رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اسے صوفی کہا جاتا ہے)

حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کے پیش نظر، تصوف عبارت ہے تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور سلوک واحسان سے، چنانچہ ابو عبدالرحمن محمد بن الحسین السلمی (۳۲۵ھ۔۴۱۲ھ) کی طبقات الصوفیہ، ابوالقاسم قشیری (۳۷۶ھ۔۴۶۵ھ) کی رسالۂ قشیریہ، شیخ ابوالحسن ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (۴۰۰ھ۔۴۶۵ھ) کی کشف المحجوب اور سراج الدین ابوحفص عمر بن علی الشبیر بابن الملقن (۷۲۳ھ۔۸۰۴ھ) کی طبقات الاولیاء وغیرہ میں علم التصوف یا علم تزکیہ کی حقیقت و ماہیت کے سلسلے میں ائمہ عظام اور صوفیائے کرام کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ تصوف نام ہے تزکیہ باطن او تصفیۂ قلب کا۔

قرآن وسنت میں تزکیۂ نفس، تصفیہ قلب اور احسان کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم ایاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة. (جمعہ:۲)

(وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اٹھایا ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول انہیں میں کا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو حکمت اور دانائی کی باتیں سکھاتا ہے)

''تزکیہ نفس'' کے معنی ہیں، نفس کو گندگی سے پاک رکھنا، عیوب و نقائص سے نفس کو اوپر اٹھانا اور نفس کو ایسی پاکیزہ چیزوں سے وابستہ رکھنا جس سے اس کا رتبہ بلند ہو، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور مخلوق کے درمیان اس کے وقار میں اضافہ ہو۔[۴] چنانچہ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں تزکیہ نفس کی ترغیب دلائی گئی ہے اور اس پر فلاح و کامرانی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

قد افلح من تزکی (الاعلیٰ:۱۴) (جس نے تزکیہ نفس کر لیا وہ کام یاب ہو گیا)

سورہ جمعہ کی مذکورہ آیت میں نبی کا اپنی امت کے درمیان قرآن حکیم کی تلاوت کرنا، امت کو ظاہری و باطنی گندگی سے پاک کر کے ان کو اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرنا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا، نبی کے فرائض منصبی میں شمار کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں جس کو تزکیہ نفس کہا گیا ہے، حدیث میں اس کی تعبیر احسان سے کی گئی ہے۔ حدیث جبرئیل میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ، فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔[۵] (اس توجہ سے اللہ کی عبادت کرنا گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ تم اگر چہ اس کو نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے)

مولانا بدر عالم میرٹھی حدیث جبرئیل کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حافظ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ تم سے اتنا قریب ہے، گویا تمھارے سامنے ہے اور تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ تصور دشوار ہو تو پھر اس کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اس ایمان کا تصور جماؤ کہ وہ تمھاری تمام حرکات و سکنات دیکھتا ہے۔ یہ ایمان تو ہر شخص کو حاصل ہے، جب اس حقیقت پر بار بار غور کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی قرب و معیت کا تصور تم پر اتنا غالب آجائے گا کہ پھر وہ ہر وقت تمھیں اپنے سامنے نظر آئے گا۔''[۶]

مولانا بدر عالم میرٹھی (وفات ۱۳۸۵ھ) حدیث جبرئیل پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں:

''حافظ ابن رجب حنبلی کی یہ تعبیر بہت صاف ہے اور علما و صوفیا دونوں کے مذاق کے قریب ہے، شریعت کا اصل مقصد توحید و رسالت کا صرف علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ان تمام علوم کو حالات اور حالات سے مقامات کی حد تک پہنچانا ہے۔ علوم جب تک حالات و جدانیات کی شکل اختیار نہیں کرتے اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبۂ عمل پیدا ہو سکتا ہے اور نہ عمل میں کوئی ذوق نصیب ہو سکتا ہے۔ انسانی دماغ ان کو صرف ایک علمی تحقیق کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ تمام علوم در حقیقت، عالم غائبات کے وہ عظیم الشان حقائق ہیں جو خارج میں عالم مشاہدہ سے زیادہ مستحکم طور پر موجود ہیں۔ اسے حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے مسائل، تقدیر و برزخ، جنت اور دوزخ کے تمام غیبی حقائق، صرف خیالی نظر آتے رہتے ہیں، لیکن منازل یقین طے کرتے کرتے جب وہ منزل احسان تک پہنچ جاتا ہے تو پھر جن کو پہلے وہ اوہام سمجھا کرتا تھا اب وہی حقائق ثابتہ نظر آنے لگتے ہیں اور جنھیں حقائق سمجھا کرتا تھا وہ اوہام سے زیادہ ناپائیدار اور بے حقیقت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے باطن میں جب یہ انقلاب رونما ہو جاتا ہے تو شریعت اس کو 'احسان' سے تعبیر کرتی ہے۔''[۷]

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تزکیہ نفس، ظاہری و باطنی گندگی سے قلب کی تطہیر، عقائد و اعمال کی درستگی اور منزل احسان تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی شیخ کامل کی صحبت و ہم نشینی اختیار نہ کی جائے۔ اس لئے قران حکیم میں حکم دیا گیا ہے:

یاایھاالذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین. (توبہ:۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد تقویٰ ضروری ہے اور پھر صادقین اور صالحین کی معیت یعنی صحبت بھی ضروری ہے، کیوں کہ اتقوا اللہ کے ساتھ وکونوا مع الصادقین کا حکم دیا جو وجوب اور لزوم کے

لئے ہے۔کوئی کمال بدون کامل کی صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتا،محض مطالعہ کتب کافی نہیں جب تک کسی عالم کی صحبت اور خدمت میں رہ کر علم حاصل نہ کیا جائے۔صحابیت کی حقیقت ہی شرف صحبت ہے۔ روافض اس سے منکر ہوئے،خوافض ہوگئے۔۸

حضرت ابوالقاسم قشیری (۳۷۶ھ/۴۶۵ھ) رسالہ قشیریہ میں رقم طراز ہیں:

''حضرت عبدالوہاب ثقفی (وفات ۳۳۸ھ) فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اگر چہ تمام علوم جمع کرلے اور مختلف طبقات کے لوگوں کی صحبت میں رہے،مگر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے درجہ کو اس کے بغیر نہیں پہنچ سکتا کہ کسی شیخ کامل یا مصلح مشفق کی تربیت میں رہ کر مجاہدہ کرے۔اور جو شخص کسی ایسے استاد کی خدمت میں رہ کر ادب (وتعلیم) حاصل نہ کرے جو اس کے اعمال کے عیوب اور نفس کی رعونت،اس کو محسوس کرادے،تصحیح معاملات کے لئے اس کی اقتدا جائز نہیں۔''۹

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ (۱۲۰۷ء-۱۲۷۳ء) نے اس حقیقت کا اظہار یوں کیا ہے:

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا | اونشیند در حضور اولیاء

(جو شخص اللہ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے،اس کو چاہیے کہ وہ اولیا کی ہم نشینی اختیار کرے)

چوں شوی دور از حضور اولیاء | درحقیقت گشتۂ دور از خدا

(اگر تم اولیا کی صحبت سے دور رہے تو حقیقت میں تم اللہ سے دور ہوگئے)

اس مضمون کو اکبرالہ بادی (۱۸۴۶ء/۱۹۲۱ء) نے اس طرح ادا کیا ہے:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

سطور بالا میں جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی شیخ کامل کی صحبت کے بغیر اتباع شریعت کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی وہاں یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ ''علم شریعت'' تصوف کی پہلی منزل ہے اور تصوف یا حقیقت وطریقت نام ہے علم شریعت اور اخلاص عمل کے مجموعے کا۔

حضرت مالک بن انس (۹۵ھ/۱۷۹ھ) کا ارشاد ہے:

من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهمافقد تحقق.

حضرت مولانا سید محمد جیلانی اشرف کچھوچھوی مدظلہ نے سیدنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''جس نے شریعت کا علم،طریقت کے بغیر حاصل کیا وہ گم راہ ہے اور جس نے طریقت کا علم،شریعت کے بغیر حاصل کیا وہ زندیق ہے،مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شاہ راہ،شریعت وطریقت دونوں سے مربوط ہے''۱۰

حضرت مولانا جیلانی کچھوچھوی مدظلہ نے بجا فرمایا ہے کہ:

''تصوف ''اخلاق محمدی'' کا نام ہے،اخلاق محمدی کو قال وقول تک رکھا تو یہ شریعت ہے اور عمل ومعمول کے دائرے میں لایا گیا تو یہ طریقت ہے۔مختصر یہ کہ شریعت پر کامل وفاداری ومحبت فراوانی کے ساتھ عمل کرنے کا نام طریقت ہے۔''۱۱

ائمہ مجتہدین اور علمائے ربانین،ماہرین شریعت بھی تھے اور سالکین طریقت بھی۔علامہ ابن عابدین (ت ۱۲۵۵) حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم اور زہد وتقدس کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"هو فارس هذا الميدان فان مبنى علم الحقيقة على العلم و العمل و تصفية النفس وقدو صفه بذالك عامة السلف، فقال احمدبن حنبل فى حقه انه كان من العلم والورع والزهد وايثار الاخرة بمحل لا يدركه احد ، لقد ضرب بالسياط ليلى القضاء فلم يقبل۔"۱۲

(امام ابوحنیفہ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) میدان طریقت کے شہسوار بھی تھے،کیوں کہ علم حقیقت کا مدار علم وعمل اور تصفیۂ نفس پر ہے اور یہ وصف ائمۂ سلف میں پایا جاتا تھا۔چنانچہ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴ھ-۲۴۱ھ) نے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ علم،تقویٰ،زہد اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے معاملے میں اس مقام پر فائز تھے،جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا،عہدۂ قضا کے قبول نہ کرنے پر ان پر کوڑے برسائے گئے پھر بھی انہوں نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا)

علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے کہ ابوالقاسم قشیری نے اپنے رسالہ قشیریہ میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ سے

یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے علم طریقت کی تحصیل ابوالقاسم نصر باذی سے کی اور انہوں نے شبلی سے اور انہوں نے سری سقطی سے اور انہوں نے معروف کرخی سے اور انہوں نے داؤد طائی سے اور داؤد طائی نے شریعت اور طریقت کا درس امام ابوحنیفہ سے لیا۔ ۱۳

علامہ شبلی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) نے لکھا ہے:

''خدا نے (داؤد طائی کو) عجب حسن قبول دیا تھا، صوفیا ان کو بہت بڑا مرشد کامل مانتے ہیں۔ تذکرہ الاولیا میں ان کے مقامات عالیہ مذکور ہیں۔ (داؤد طائی) ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں...... تدوین فقہ میں بھی امام صاحب کے شریک تھے'' ۱۴

داؤد طائی جیسے ممتاز عالم اور سالک طریقت کا امام ابوحنیفہ سے درس طریقت لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ امام صاحب علیہ الرحمہ امام مجتہد ہی نہیں شیخ طریقت بھی تھے۔

ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی نے اپنی تالیف ''الشیخ عبدالقادر جیلانی'' میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۰ھ/۲۰۴ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کو دنیا کی تین چیزیں بہت پسند تھیں:

(۱) ترک تکلف (۲) مخلوق کے ساتھ محبت و نرمی سے پیش آنا۔ (۳) اہل تصوف کے طریقے کی اقتدا۔ ۱۵

ڈاکٹر جیلانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مشہور صوفی شیبان راعی کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی باتیں پوری توجہ کے ساتھ سنتے تھے۔ ۱۶

ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ۔۲۴۱ھ) شیبان راعی اور ابوحمزہ بغدادی کی خدمات میں حاضر ہو کر ان کی باتیں غور سے سنتے تھے اور ابوحمزہ بغدادی سے تصوف کے دقیق مسائل معلوم کرتے تھے، اور انہوں نے اپنے صاحبزادۂ محترم کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ صوفیا کی مجلس میں حاضر ہوا کریں کیوں کہ ان کی صحبت اختیار کرنے سے علم، انابت الی اللہ، خوف خدا زہد و اتقا اور علوِ ہمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابوحمزہ بغدادی کے فیضان صحبت کا نتیجہ تھا کہ امام احمد ابن حنبل نے ایک صوفی و زاہد کی زندگی گزاری، اپنی زندگی، اپنے ہاتھ کی کمائی اور اپنی زمین کی پیداوار سے بسر کی۔ انہوں نے بادشاہوں کے انعامات و ہدایا کو قبول نہیں کیا اور نہ ان کے یہاں طعام تناول فرمایا۔ ۱۷

عزالدین بن عبدالسلام (وفات ۶۶۰ھ) سے روایت ہے کہ انہوں نے بغداد میں شہاب الدین سہروردی سے اور مصر میں ابوالحسن شاذلی سے طریقت کا درس لیا۔ عزالدین عبدالسلام فرمایا کرتے تھے:

''ماعرفتُ الاسلام الکامل الابعد اجتماعی به، یعنی بابی الحسن الشاذلی'' ۱۸

(میں نے ابوالحسن شاذلی کے فیضان صحبت سے اسلام کو مکمل طور پر پہچانا)

صاحب اعتصام امام شاطبی (وفات ۵۹۰ھ) نے فرمایا ہے:

''حضرات تابعین کے تبعین کے بعد جب مسلمانوں میں خلاف شرع رسمیں ظاہر ہونے لگیں اور ہر فریق اپنے آپ کو پابند شریعت اور عبادت گزار تصور کرنے لگا تو اہل سنت کے مخصوص افراد نے اپنے آپ کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھا اور اپنے دلوں کو احکام شریعت سے غافل نہ ہونے دیا۔ انہیں حضرات کو اہل تصوف کے نام سے موسوم کیا گیا۔'' ۱۹

ابن تیمیہ (وفات ۷۲۸ھ) کے نزدیک صوفیا کے تین طبقات ہیں: پہلا وہ گروہ جس نے دوسرے اہل طاعت کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بے انتہا ریاضت و مجاہدہ کیا، یہ وہ گروہ ہے جسے عبادت و ریاضت میں اولیت اور تقرب الی اللہ کا درجہ حاصل ہے۔ دوسرا وہ گروہ جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کی، تیسرا وہ گروہ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ابن تیمیہ کے نزدیک اول الذکر دو گروہ راہ صواب پر ہیں۔

ابن تیمیہ اکابر صوفیا میں جنید بغدادی، ابراہیم بن ادھم، ابو سلیمان دارانی، معروف کرخی، سہیل بن عبداللہ تستری، شیخ عبدالقادر جیلانی اور عدی بن مسافر کی بڑی تعریف کرتے تھے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے تھے۔ ۲۰

ابن خلدون (وفات ۸۰۸ھ) نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے:

''دوسری صدی ہجری اور اس کے بعد جب مسلمانوں کا اقبال عروج پر پہنچ گیا تو لوگ دنیاداری کی طرف مائل ہو گئے، ایسے حالات میں جن مردان خدا نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف اپنی پوری توجہ

مبذول کردی انہیں مردان خدا کو صوفی کہا جاتا ہے۔''

علامہ ابن خلدون کے نزدیک تصوف دائرہ اسلام سے خارج نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے:

''ان التصوف طریقة من طرائق الوصول الی معرفة الشریعة۔''

(تصوف، شریعت کی معرفت تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے) ۲۱

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۶۴ء-۱۶۲۴ء) نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

''شریعت کے تین جز ہیں: علم، عمل، اخلاص، جب یہ تین چیزیں نہ ہوں شریعت نہیں۔ جب شریعت ثابت ہوگئی، رضائے مولی حاصل ہوگئی، جو دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے بالاتر ہے۔

......طریقت اور حقیقت صوفیا کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں شریعت کے جزء سوم یعنی اخلاص کی تکمیل کے لئے خادم ہیں۔ لہذا طریقت اور حقیقت حاصل کرنے سے صرف شریعت کی تکمیل مقصود ہے۔'' ۲۲

ابو حامد الغزالی (وفات ۵۰۵ھ) نے تحریر فرمایا ہے:

''صوفیا کی تمام حرکات وسکنات، ظاہری ہوں یا باطنی، نبوت کی روشنی سے حاصل ہیں اور روئے زمین پر نور نبوت کے سوا کوئی ایسا نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جاسکے۔'' ۲۳

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۷۳ء-۱۶۲۳ء) نے مرج البحرین میں لکھا ہے:

''ہرگز یہ گمان مت کرنا کہ ''تصوف'' اہل سنت وجماعت کے مذہب کے خلاف ہے، یا صوفیا ایک خاص فرقہ ہے اور فرقہ ناجیہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا ہے، اس ملت اور اقوام کا خلاصہ محققین صوفیا ہی ہیں جنہوں نے انوار سنت سے اقتباس کیا ہے اور سر حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ سلوک وطریقت میں اتباع عمل اور حال کے لحاظ سے اختیار عزیمت، ظاہر وباطن میں صدق کے معنیٰ کی تحقیق، نفس کے فریب اور روح کے دقائق کی معرفت اور تہذیب اخلاق وتصفیہ باطن میں، ان سے برابر کوئی دوسرا نہیں۔ انہیں اعمال واخلاق اور احوال ومقامات، ذوق وشوق اور اسرار ورموز اور سارے کمالات جو حاصل ہوئے ہیں وہ کسی دوسرے فرقہ کو حاصل نہیں ہوسکے۔'' ۲۴

تصوف سے متعلق اوپر جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ ''طریقت'' شریعت کا جزء لازم ہے اور ائمہ مجتہدین اور علمائے ربانیین رسوخ فی العلم کے ساتھ سالکین طریقت بھی تھے، اس لئے تصوف کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے مخالف تصور کرنا درست نہیں ہے۔

جب ''خلافت اسلامیہ'' ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور دوسری صدی ہجری کے بعد خلفائے اسلام میں، خلافت کی روح نہیں رہی، نبوت کی امانت کو انہوں نے ضائع کردیا، جاہ واقتدار کی ہوس، مال وزر اور سامان تعیش کی فراوانیوں نے انہیں خوف خدا اور فکر آخرت سے یکسر غافل کردیا۔ جس کے نتیجے میں عوام الناس بھی ''دین'' سے غافل ہوکر دنیاداری کی طرف مائل ہوگئے۔ ایسے حالات میں وہ علمائے ربانیین اور صوفیائے کرام ہی کا طبقہ تھا، جس نے ایمان ویقین، خوف خدا، فکر آخرت اور خدا شناسی کی شمع فروزاں کو بجھنے نہیں دیا۔ یہ صوفیا ہی کا طبقہ تھا جو بلا امتیاز عرب وعجم، منہاج نبوت کے مطابق اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ تن مصروف عمل رہا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''دنیاداری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد، دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز ان حضرات کی ذات اور ان کے مقامات تھے، جنہوں نے غفلت اور مادیت کے سمندر میں انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم کر رکھے تھے، جہاں وہ لوگوں کو مادیت کے بھنور سے نکال کر ان کی دینی تربیت کرتے تھے اور ان میں طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے تھے، بعد کی صدیوں میں ان کو صوفیا ومشائخ کے نام سے یاد کیا گیا۔'' ۲۵

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت وتبلیغ سے متاثر ہوکر پانچ ہزار کفار مشرف بہ اسلام ہوئے اور ایک لاکھ سے زیادہ گناہ گاروں کو شیخ کے دست حق پر توبہ کی توفیق ہوئی۔

ایک خدارسیدہ بزرگ وصوفی احمد بدوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مریدوں نے ۱۲۴۹ء میں مصر پر فرانس کی صلیبی جنگ کی مدافعت میں بڑی بہادری اور جاں بازی کا ثبوت پیش کیا۔ ۲۶

مرابطین جن کا تعلق قبیلہ لمتونہ سے تھا، اس قبیلے کے ایک مرد صالح جن کا نام یحییٰ بن عمر تھا، وہ عبداللہ بن یاسین جزولی کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے بیعت کر کے عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ عبداللہ بن یاسین جزولی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں کے ساتھ ایک ٹیلے پر قیام پذیر تھے جس کا نام انہوں نے "رباط" رکھ لیا تھا، شیخ جزولی کے مریدوں کی تعداد آہستہ آہستہ ایک ہزار سے زیادہ ہوگئی۔ یہ سب ہمہ تن عبادت الٰہی، حصول علم، اصلاح باطن اور تزکیۂ اخلاق میں مشغول ہوگئے، جب دس سال گزر گئے تو شیخ جزولی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اپنی قلت وضعف کی پرواہ کیے بغیر یحییٰ بن عمر کی قیادت میں افریقہ پر حملہ کردیں۔ شیخ کے مریدین نے شیخ کے حکم کی تعمیل کی اور افریقہ پر حملہ کر کے دولت مرابطین کی بنیاد رکھی۔ یحییٰ بن عمر کی وفات کے بعد انہوں نے یوسف بن تاشقین کو اپنا امیر منتخب کیا، جس کو ۴۵۴ھ میں "مراکش" کا شہر بسانے کا شرف حاصل ہوا۔

وہ صوفیائے مرابطین ہی کی جماعت تھی جس نے یوسف بن تاشقین (وفات ۵۰۰ھ) کی قیادت میں بیس ہزار فوج کے ذریعہ ۴۷۹ھ میں اندلس کے میدان زلاقہ میں الفونسو کی پچاس ہزار سے زائد افواج کو شکست فاش دے کر پرچم اسلام کو بلند کیا۔ اس جنگ میں الفونسو کی اکثر فوج کام آگئی۔ صرف پانچ سو فوج بچ سکی۔ ۲۷

مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (۱۸۷۶ء۔۱۹۳۸ء) نے لکھا ہے:

"......... مرابطین کی حکومت میں بہت جلد اندلس، مراکش، ٹیونس، الجیریا، طرابلس شامل ہوگئے۔ بحری طاقت کی طرف اس خاندان نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ ۵۵۱ھ تک مرابطین کی حکومت قائم رہی۔ اپنے بہادرانہ کارناموں سے ایک سو سال تک انہوں نے عیسائی طاقتوں کا ناطقہ بند رکھا" ۲۸

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حافظ ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی مجلس وعظ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حافظ ابن جوزی نے خود ایک موقع پر تخمینہ لکھا ہے کہ ایک لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی، پانچویں صدی کے ایک محدث شیخ اسماعیل لاہوری کے متعلق مورخ کے الفاظ ہیں" ہزار ہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف بہ اسلام شدند" ابن بطوطہ نے متعدد ہندوستانی واعظین کی تاثیر کے ایسے ہی واقعات لکھے ہیں" ۲۹

تاتاریوں نے مسلمان سلاطین کی عاقبت نا اندیشی اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر عالم اسلام کو بہ زور شمشیر فتح کر کے اسلام اور مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچایا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، لیکن اس خوں ریز اور سفاک قوم کا حلقہ بہ گوش اسلام ہوجانا دنیا کی تاریخ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔ تاتاریوں کو اسلام سے قریب لانے اور ان کو مشرف بہ اسلام کرنے کا سہرا علمائے ربانیین اور حضرات صوفیا ہی کے سر جاتا ہے۔

چنگیز خاں (۵۴۹ھ/۶۲۴ھ) کو اپنی سات سال کی خوں ریزی اور اسلامی ممالک کو تاراج کرنے کے دوران میں یہ محسوس ہوگیا تھا کہ مسلمان اگرچہ اس وقت کم زور اور پسپا ہیں، لیکن دراصل اسلام کوئی معمولی مذہب نہیں کہ اسے نظر انداز کردیا جائے بلکہ یہ ایک اعلیٰ وارفع نصب العین اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس کے دربار میں چند جید علمائے اسلام پیش کیے جائیں۔ چنگیز کے حکم کی تعمیل میں اس کے دربار میں قاضی اشرف اور ایک دوسرے عالم دین کو پیش کیا گیا۔ چنگیز کے دریافت کرنے پر ان علما نے پہلے توحید ورسالت کے عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ چنگیز نے کہا کہ میں عقیدہ توحید ورسالت کی معقولیت کو دل سے تسلیم کرتا ہوں، پھر ان علما نے نماز اور روزے کی فرضیت اور ان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی تو چنگیز خاں نے کہا اوقات متعینہ پر خدا کی عبادت کرنا اور گیارہ مہینے کے بعد روزہ رکھنا بھی معقول بات ہے۔ لیکن جب ان علما نے حج کی فرضیت اور اہمیت کی تفصیل بیان کی تو چنگیز خاں نے اس کی ضرورت کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن اسلام کے تئیں اس کا رویہ نرم ہوگیا۔ چنانچہ جب وہ بخارا گیا تو مسلمانوں کے ساتھ اس نے اچھا سلوک کیا۔ ۳۰

چنگیز خاں کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا اوکتائی خاں، اس کا جانشیں ہوا۔ اوکتائی خاں کو مسلمانوں سے بڑی انسیت اور محبت تھی، مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ پوشیدہ طور پر مسلمان ہو چکا تھا، اوکتائی خاں کو اسلام کی صداقت پر پختہ یقین تھا۔ ۳۱

بہر طور چنگیز خاں کے انتقال کے بعد اس کے خاندان کے

سلاطین اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مسٹر آرنلڈ کی کتاب دعوت اسلام (Preaching of Islam) کے حوالے سے لکھا ہے:

''لیکن اسلام اپنی گزشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا اور واعظین اسلام نے انہیں وحشی مغلوں کو جنہوں نے...... مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کرلیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں، کیوں کہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کے لئے بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنہوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا، اپنا مطیع بنالیں''۔ ۳۲

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ چنگیز خاں کے خاندان کا پہلا بادشاہ جس کو اسلام لانے کی سعادت نصیب ہوئی وہ براق خاں تھا، جس نے اپنی تخت نشینی کے دو سال کے بعد اسلام لاکر اپنا نام غیاث الدین رکھ لیا۔ لیکن اسلام کی ترقی اس وقت ممکن ہوئی جب سلطان کاشغر مشرف بہ اسلام ہوا جس کا نام تغلق تیمور خاں تھا۔ تغلق تیمور بخارا سے آئے ہوئے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کے توسط سے شیخ کے صاحبزادے شیخ رشید الدین کی جدوجہد سے کلمہ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔ تغلق تیمور نے اسلام لانے کے بعد اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی۔ چنانچہ اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا جن پر چنگیزی سلاطین کا تسلط تھا، ۳۳ علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) نے اس شعر میں:

ہے عیاں آج بھی تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جزائر میں فرانسیسیوں کے استعمار کے خلاف، اسلام کی جس عظیم شخصیت نے علم جہاد بلند کیا اور پندرہ سالوں تک فرانسیسیوں کو چین کی نیند نہیں لینے دیا وہ عبدالقادر جزائری کی ذات گرامی تھی۔ امیر شکیب ارسلاں نے ان کو شیخ طریقت میں شمار کیا۔ تصوف میں شیخ جزائری کی ایک کتاب بھی ہے جس کا نام ''المواقف'' ہے۔ ۳۴ محمد غازی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ شامل جنہوں نے ۳۵ برسوں تک روس سے مقابلہ کیا اور مختلف معرکوں میں ان پر فتح حاصل کی، ان کا تعلق صوفیا کی جماعت نقش بندیہ سے تھا۔ ۳۵

سنوسی تحریک کے قائدین جنہوں نے اطالیہ کے خلاف اور مہدی تحریک کے رہنما جنہوں نے سوڈان میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ان کا تعلق بھی جماعت صوفیا ہی سے تھا۔ ۳۶

جہاں تک ہندوستان کی بات ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں باہر سے آنے والے مسلم تاجروں اور مسلمان سلاطین کے ذریعہ بھی اسلام کو تقویت پہنچی، لیکن اشاعت اسلام کے سلسلے میں حضرات صوفیا کا کارنامہ ہندوستان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام سے زیادہ اسلام کے اصول مساوات، باہمی اخوت وہم دردی، صلح وآشتی اور حسن سلوک کے پیغام حیات آفریں کو ہندوستانی عوام تک پہنچا کر، انسانی دلوں کے جوڑنے کا کام انجام دیا، جس سے متاثر ہوکر غیر مسلم حضرات اسلام کی طرف راغب ہونے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی جماعت کثیر اسلام میں داخل ہونے لگی۔ شیخ محمد اکرام صوفیائے کرام کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

پاک وہند میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام نے پھیلایا، لیکن ان کا مطمح نظر اور طریق کار دور حاضر کے مشنریوں اور مبلغوں سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو فقط غیر مسلموں کے لئے وقف نہ رکھا تھا بلکہ تبدیلی مذہب تو (سوائے بعض اسماعیلیوں اور سہروردیوں کے) شاید ان کا مقصد اولین ہی نہ تھا۔ ان کے دروازے ہر ایک کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، کھلے تھے، اور ان کا کام ہر ایک میں بلاتفریق کے ارشاد وہدایت تھا۔ ایک ہندو کے قبول اسلام سے انھیں جتنی خوشی تھی شاید اس سے زیادہ ایک مسلمان کے ترک گناہ سے ہوتی۔ صوفیا کے اس جامع نقطۂ نظر کو سلسلۃ الذہب کے مصنف نے ایک مشہور سہروردی بزرگ (شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی) کا ذکر کرتے ہوئے خوب واضح کیا ہے اور ان کی نسبت لکھا ہے:

''لوگوں کی ارشاد وہدایت میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ

سے عبادت کی طرف ، نفسانیت سے روحانیت کی طرف ، ان کا بڑا مرتبہ تھا۔''

مشائخ کبار کے سامنے یہی مطمح نظر تھا جو سلسلہ الذہب کے بیان کے مطابق ، شیخ بہاء الدین کا تھا ، وہ ہر ایک کو خواہ ہندو ہو یا مسلمان ، ایک بلندتر روحانی زندگی کا پیام دیتے اور اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار ، اسلام کی طرف راغب ہوئے اور عام مسلمان ایک پاک اور بے عیب زندگی کی طرف! ۳۷

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ صوفیائے کرام نے اسلام کی اشاعت سے زیادہ توسیع اسلام کی طرف توجہ دی اور اس کے لئے رواداری کی پالیسی اختیار کی۔صوفیا نے دوسرے مذہب کے بانیوں کی تنقیص کرنے اور ان کو برا بھلا کہنے کی بہ جائے ، مذہب اسلام کے اخلاقی محاسن کو ہندوستانی عوام کے سامنے پیش کیا ، چنانچہ صوفیا کے حسن سلوک کے باعث ایک طرف ہندو ، اسلام کی طرف مائل ہونے لگے تو دوسری طرف مسلمان گناہوں سے تائب ہو کر صوفیا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے ۔سفینۃ الاولیا کے مصنف نے شیخ ابو اسحاق گازرونی کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''چوبیس ہزار غیر مسلم شیخ کے دست حق پر اسلام لائے اور تقریباً ایک لاکھ مسلمان تائب ہو کر شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے'' ۳۸

صوفیا نے جب ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔اس وقت ہندوستان میں ذات پات اور اونچ نیچ کا نظام پورے عروج پر تھا۔مذہب پر ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کی اجارہ داری تھی۔ نیچ ذات کے ہندوؤں کو مذہب کی تعلیم حاصل کرنے پر پابندی عائد تھی ، اگر کوئی شودر مقدس وید کا منتر سن لیتا تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ مندروں میں شودروں کو داخل ہو کر عبادت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے حالات میں صوفیا کے ''رواداری'' کے طریق کار سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت میں کوئی بڑی رکاوٹ پیش نہیں آئی اور نیچ ذات کے ہندو اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ۳۹

اس ناچیز کے لئے اس مضمون میں ہندو پاک کے صوفیائے کرام کی اشاعت اسلام کے کارناموں کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے ، اس لئے یہاں چند مشہور صوفیائے کرام کے کارناموں کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز (۵۳۷ھ/۶۳۳ھ) اور ان کے سلسلہ کے اکابر صوفیا کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن اشاعت وتبلیغ پر پڑی تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہ کی کوششوں اور روحانیت کی رہین منت ہے ، ان میں ایک بڑی تعداد حضرت خواجہ کی روحانی قوت ، اشراقی کمال اور عنداللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی ۔ اس وقت تک ہندوستان ، جوگ و اشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر وسنیاسی اشراقی و قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے ، ریاضت شاقہ اور مختلف مشقوں سے انہوں نے کشف وتصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی ، ان میں بہت سے لوگ اس نووارد مسلمان فقیر کے امتحان اور اس کو زک دینے کے لئے اس کے پاس آئے ، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ غریب الوطن ان سے قلبی قوت اور اشراقیت میں بہت بڑھا ہوا ہے اور ساحرین فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے۔اسی کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی ، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی ، ایمان ویقین کی قوت ، خلق خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلاتفریق مذہب وملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد اور دشمن بھی دوست ہو گئے۔تذکرہ و تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ مقابلہ اور حضرت خواجہ کی اشراقی قوت و کشف و تصرفات کے جو واقعات کثرت کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں ، اگر چہ ان کو تاریخی سند سے اور قدیم تر معاصر مآخذ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل ہے ، لیکن ہندوستان کے اس وقت کے ذوق ورجحان اور اجمیر کی دینی وروحانی مرکزیت کو

دیکھتے ہوئے یہ واقعات خلاف قیاس نہیں ، دراصل جس چیز نے حضرت خواجہ کا گرویدہ اور اسلام کا حلقہ بہ گوش بنایا، وہ تنہا ان کی قلبی قوت نہ تھی بلکہ ان کی روحانیت، اخلاص واخلاق اور ان کا وہ طرز زندگی تھا، جس کا ہندوستان کے اہل فن عوام نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔'' [۴۰]

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے جانشین شیخ کبیر بابا فرید الدین گنج شکر (۵۶۹ھ۔۶۶۴ھ) کے رشد وہدایت اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبد الرحمٰن (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۷ء) تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت بابا صاحب کے رشد وہدایت سے نہ صرف مسلمان، مسلمان بنے بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی مشرف بہ اسلام ہوئی ، اجودھن کے قیام کے ابتدائی زمانے میں ایک جوگی مسمی سمھو ناتھ خدمت اقدس میں حاضر ہوا، جو جادو منتر اور استدراج میں مشہور تھا، بابا صاحب کو دیکھتے ہی اس پر ان کی ہیبت اس قدر غالب ہوئی کہ زبان سے کچھ بول نہ سکا، پھر حضرت بابا صاحب کے کشف وکرامت سے ایسا متاثر ہوا کہ قدموں پر گر پڑا، اور اپنے چیلوں کے ساتھ بابا صاحب کے ہاتھ پر ایمان لایا، کہا جاتا ہے کہ پاک پٹن کے اطراف میں زیادہ تر جو نو مسلم قومیں ہیں، وہ حضرت بابا صاحب ہی کی برکت سے مسلمان ہوئی ہیں ۔ جو اہر فریدی میں ہے کہ پنجاب میں مرہنگوالیان، بہلیان، ادہکان، جکروالیان، بکان، ہکان، سیان، کھوکھران، سیال وغیرہ حضرت بابا ہی کی برکت سے مسلمان ہوئیں۔'' [۴۱]

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ (بابا فرید الدین) کو ہوئی حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو شاید ہی ہوئی ۔ مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ، مثلاً سیال، راجپوت وٹو وغیرہ'' [۴۲]

بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سب سے بااثر شخصیت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (۶۳۴ھ۔۷۲۵ھ) کی ذات اقدس تھی، آپ کو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت سے بڑی دلچسپی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''.........پچاس برس کے عرصہ میں جس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسند ہدایت وارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کے لئے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی خوش اعتقادی کی بناء پر حضرت خواجہ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے ، میوات کا علاقہ ، جو حضرت خواجہ کے مرکز غیاث پور سے جانب جنوب میں متصلاً واقع ہے، اور جہاں کے رہنے والوں کی رہ زنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سر شام ہی بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی ،حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات اور ان کی تعلیم وتربیت کے اثرات سے ضرور مستفید ہوا ہوگا، اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انھیں کے زمانے میں مسلمان ہوئے ہوں'' [۴۳]

حضرت نظام الدین اولیا دین کی تبلیغ و دعوت اور اشاعت اسلام کے لئے ہمیشہ فکر مند رہے ، چنانچہ انہوں نے اپنے خلفا کو ہندوستان کے مختلف خطوں میں بھیجا، جہاں انہوں نے اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق تبلیغ واشاعت اسلام کا فریضہ انجام دیا، دہلی، اودھ، پنجاب اور گجرات میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی (۶۷۷ھ/۷۵۷ھ) کو بھیجا جہاں انہوں نے تبلیغ دین کی خدمت انجام دی ۔ بہار، بنگال اور آسام کے اطراف میں شیخ اخی سراج الدین (وفات ۷۴۳ھ) کو روانہ کیا جہاں انہوں نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت وتبلیغ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اور خواجہ برہان الدین غریب (۶۵۴ھ۔۷۳۸ھ) نے دکن کو اپنے فیوض و برکات سے مستفید کیا۔ اور بہ قول خواجہ حسن نظامی، حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ سالار مہین کو اسلام کی دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کے لئے چین روانہ کیا جہاں انہوں نے سلسلہ نظامیہ قائم کر کے دین کی تبلیغ واشاعت کی۔ [۴۴]

سلسلہ چشتیہ کے صوفیائے کرام جہاں بھی رہے اپنے حلقہ اثر اور

آس پاس کی بستیوں میں جا کر روحانیت، مساوات واخوت اور حسن سلوک کا ماحول پیدا کر کے بہت سے غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

حضرت شیخ بوعلی قلندر (۶۰۵ھ/۷۲۴ھ) کو حضرت محبوب الٰہی سے شرف خلافت حاصل تھا، حضرت بختیار کاکی (وفات ۶۳۲ھ) سے، اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا[۴۵] لیکن ان کے ایک جید عالم دین اور ولی کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت بوعلی قلندر کے رشد وہدایت سے بہت سے غیر مسلم داخل اسلام ہوئے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

"پانی پت کے علاقے میں جو مسلمان راجپوت ہیں وہ حضرت بوعلی قلندر ہی کے رشد وہدایت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک ممتاز راجپوت امیر سنگھ ان کے ہاتھوں پر ایمان لایا۔ اسی خاندان سے مسلمان راجپوت پھیل کر اسلام کی قوت وبازو بنے"[۴۶]

معقولات ومنقولات کے متبحر عالم، امام السالکین وبرہان العاشقین حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ (۷۰۹ھ۔۸۲۹ھ) کا تعلق آل سمنان سے تھا، سات سال کی عمر میں تجوید کے ساتھ قرآن مجید کا حفظ کیا اور ۱۴رسال کی عمر میں معقولات ومنقولات کی تعلیم سے فارغ ہو کر پورے عراق میں مشہور ہو گئے۔ آپ کا تعلق سمنان کے شاہی خاندان سے تھا۔ آپ کے والد بزرگوار محمد ابرہیم سمنان کے سلطان تھے۔ چنانچہ والد محترم کے انتقال کے بعد زمام اقتدار آپ کے ہاتھوں میں آئی۔ آپ شروع ہی سے پابند شرع اور عبادت گزار تھے۔ ایک روز خواب میں ان سے حضرت خضر نے فرمایا کہ خدا کی سلطنت چاہتے ہو تو دنیا کی سلطنت چھوڑ دو اور ہندوستان چلے جاؤ۔ والدہ محترمہ سے خواب سنایا اور ان سے اجازت لے کر عازم ہندوستان ہوئے۔ مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے بنگال پہنچے اور حضرت شیخ علاء الدین علاء الحق (وفات ۱۳۹۸ء) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ شیخ علاء الدین، حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ شیخ سراج الدین اخی عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ چنانچہ حضرت سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ بھی سلسلہ چشتیہ سے ملتا ہے۔ اپنے مرشد کے فیوض روحانی سے فیض یاب ہو کر مرشد کی اجازت سے جون پور، اعظم گڑھ، کرمنی اور بھڈ وہوتے ہوئے کچھوچھا شریف پہنچے اور ہمہ تن رشد وہدایت میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے کچھوچھا شریف سے نہ صرف ہندوستان کے مختلف خطوں کا سفر کیا بلکہ بیرون ہند مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور جہاں بھی تشریف لے گئے رشد وہدایت کی دولت لٹائی۔ آپ کے حلقہ ارادت میں بڑے بڑے علما اور مشائخ شامل تھے۔[۴۷]

حضرت سمنانی کو اسلام کی روحانی واخلاقی تعلیمات کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ اسلام کی اشاعت سے بھی کافی دلچسپی تھی۔

سید صباح الدین عبدالرحمان نے تحریر فرمایا ہے:

"بھنڈو (؟) آئے جہاں ملک الامرا محمود نے پر جوش خیر مقدم کیا، اسی مقام پر ایک ہندو جوگی سے اشرف جہاں گیر کا مقابلہ ہوا، جوگی کو ہوا میں اڑنے کا دعویٰ تھا، لیکن وہ حضرت اشرف جہاں گیر کی روحانیت سے ایسا مرعوب ومغلوب ہوا کہ اپنے تمام باطل دعووں سے باز آیا اور ساری مذہبی کتابوں کو جلا کر پانچ ہزار چیلوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اسلام لانے کے بعد جوگی نے بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جوگی سے مقابلہ کچھوچھا میں ہوا اور اس کی مڑئی میں خانقاہ بنوائی گئی، لیکن لطائف اشرفی میں کچھوچھا کا نام نہیں آتا۔"[۴۸]

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی روحانی تربیت اور تبلیغ و اشاعت میں سلسلہ چشتیہ کے صوفیائے کرام کی خدمات مسلم ہیں اور سلسلۂ چشتیہ کی طرح، سلسلہ سہروردیہ بھی بہت پرانا ہے، لیکن ٹھوس تبلیغی کاموں میں، سلسلہ چشتیہ سے سلسلۂ سہروردیہ کا پلہ بھاری ہے۔ سہروردی صوفیا چوں کہ ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی مراکز سے دور رہے، علاوہ ازیں سلسلۂ چشتیہ کی طرح سلسلۂ سہروردیہ میں وہ اہل قلم بھی نہیں جو سہروردیوں کے کارناموں کو اجاگر کرتے، اس لئے سہروردی سلسلے کو وہ شہرت نصیب نہیں ہو سکی جو سلسلہ چشتیہ کو نصیب ہوئی۔ تاہم مغربی پنجاب، سندھ، بنگال، گجرات اور کشمیر وغیرہ، میں سہروردی صوفیا میں شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی (۱۱۷۲ء۔۱۲۶۲ء)، شیخ رکن الدین ابو الفتح (وفات ۱۳۳۴ء)، حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۷۰۷ھ۔۷۸۵ھ) اور ان کے بھائی سید صدرالدین راجو قتال (وفات ۸۲۷ھ)، شیخ جلال الدین تبریزی

(وفات ۱۲۶۴ء)، مخدوم لال شہباز (وفات ۱۲۷۴ء)، شیخ جلال مجرد سلہٹی (وفات ۱۳۴۰ء) اور امیر کبیر سید ہمدانی (۱۳۱۴ء۔۱۳۸۴ء) اور ان کے رفقا وغیرھم نے دین کی تبلیغ و اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔۴۹؎

شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی جن کا روحانی مرکز توجہ زیادہ تر ملتان، سندھ اور بلوچستان کا علاقہ رہا، ان کی اشاعت اسلام کی جد وجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''انور غوثیہ میں لکھا ہے کہ حضرت کے وعظ سن کر ملک سندھ، علاقہ ملتان اور لاہور کے اہل ہنود میں سے بے شمار خلقت نے جس میں بہت متمول تاجر اور بعض والیان ملک بھی تھے دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے۔'' ۵۰؎

''غیر مسلم خصوصاً ہندو خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے۔ ایک عورت مسلمان ہو کر ولیہ ہوگئی۔ تمام رات بیدار رہ کر عبادت کرتی اور اکثر مکہ معظمہ جا کر خانہ کعبہ کے طواف میں روحانی لذت حاصل کرتی۔ حضرت مخدوم جہانیاں اچہ سے تشریف لاتے تو راستے میں بہت سے غیر مسلم ان کے دست مبارک پر اسلام لاتے۔'' ۵۱؎

شیخ محمد اکرام نے در منظوم کے حوالے سے لکھا ہے کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ہاتھ پر بیعت سے غیر مسلم اسلام لائے۔ مسٹر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم نے گجرات میں اشاعت اسلام کا کام کیا۔ بہاولپور سرکاری گزیٹر میں ہے کہ مغربی پنجاب کے جن آٹھ قبائل کے ہندوؤں نے حضرت مخدوم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان میں کھرل کے راجپوتوں کا ایک مشہور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔۵۲؎

حضرت مخدوم کی وفات کے بعد آپ کے بھائی راجو قتال نے اچہ اور گجرات میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی۔۵۳؎

سندھ میں اشاعت اسلام کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں شیخ بہاء الدین زکریا اور مخدوم لال شہباز قلندر (وفات ۱۲۷۴ء) اور پیر منگو کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔۵۴؎

بنگال میں اسلام کی توسیع و اشاعت کے لئے کوشش کرنے والوں میں شیخ جلال الدین تبریزی کے کارناموں کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ جب بنگال پہنچے تو ایک طرف جہاں بے شمار بندگان خدا آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تو دوسری طرف بہت سے ہندوؤں نے آپ کے دست حق پر اسلام قبول کیا۔ بنگال میں ایک جگہ ''بندر دیومحل'' کے نام سے مشہور ہے، وہاں ایک بڑے تالاب کے پاس ایک ہندو راجہ نے مندر تعمیر کیا تھا، شیخ جلال الدین نے وہیں قیام کیا اور بہت سے ہندوؤں کو داخل اسلام کیا۔ شیخ جلال الدین جب آسام کے کامروپ پہاڑی علاقے میں پہنچے تو وہاں کے غیر مسلم باشندوں نے آپ کے فیوض و برکات سے مذہب اسلام کو قبول کرلیا۔

بنگال میں شیخ سراج، شیخ علاء الدین علاء الحق، حضرت نور قطب عالم (وفات ۱۴۱۵ء)، شیخ جلال الدین مجرد سلہٹی (وفات ۱۳۴۰ء)، بنگال کے غازی اولیاء اور شیخ جلال الدین گجراتی (وفات ۱۴۷۶ء) کی جدوجہد سے بھی اسلام کی اشاعت میں کافی تقویت پہنچی۔۵۵؎

گجرات میں اسلام کی اشاعت پر توجہ مبذول کرنے والوں میں مخدوم جہانیاں اور ان کے بھائی راجو قتال کے علاوہ، سید موسیٰ وراق، مخدوم سید حسین خنک سوار، شیخ حسام الدین، شیخ جمال الدین اچی، حضرت چراغ دہلوی اور ان کے مرید شیخ سراج الدین کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔۵۶؎

دکن میں طبل عالم سید مظہر ولی (وفات ۱۲۲۵ء)، بابا فخر الدین سہروردی، حضرت سید عبدالقادر ناگوری، خواجہ علاء الدین، خواجہ شمس الدین بلخی (وفات ۱۵۵۵ء)، حضرت حیات قلندر عرف بابا بڈھن، شیخ منتخب الدین، حضرت سید بندہ نواز گیسودراز (۱۳۲۱ء۔۱۴۲۲ء) کے فیضان توجہ سے اسلام کی توسیع و اشاعت ہوئی۔۵۷؎

کشمیر میں اسلام چودھویں صدی کے آغاز میں پہنچا، یہاں اسلام حضرت بلبل شاہ کے ذریعہ پھیلا۔ بلبل شاہ کے فیض سے کشمیر کا راجہ رنجن دیو کے اہل خانہ اور اس کے امرا داخل اسلام ہوئے۔ بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام لانے والے غیر مسلم کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت کرنے والی دوسری اہم شخصیت امیر کبیر سید ہمدانی (۱۳۱۴ء۔۱۳۸۴ء) کی ذات گرامی ہے۔ آپ کے ذریعہ ۳۷ ہزار کشمیری دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ امیر کبیر کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی نے کشمیر میں اشاعت

اسلام کو وسعت بخشی۔۵۸؎

بہار میں بڑے پیمانے پر رشد وہدایت اور اشاعت اسلام کا کام حضرت شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱ھ۔۷۸۲ھ) اور ان کے خلفا کے ذریعہ ہوا۔

اشاعت اسلام کے سلسلے میں ہندو پاک کے صوفیائے کرام کی داستان اس وقت تک ناتمام رہے گی جب تک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴۔۱۶۲۴ء) کی دعوت وتبلیغ، وعظ و تذکیر، ان کی اصلاحی کوششوں، روحانی تعلیمات اور تجدیدی کارناموں، ان کے صاحبزادۂ محترم خواجہ محمد معصوم (م۱۶۶۸ء) (جن کے ہاتھوں پر ۹ لاکھ لوگوں نے توبہ کر کے اسلام سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور سات ہزار آدمی خلافت سے سرفراز و ہوئے) کی رشد وہدایت کی مخلصانہ جدوجہد اور فکر اسلامی کی اشاعت میں حضرت مجدد، ان کے صاحبزادگان اور خلفا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۶۲ء) اور ان کے خاندان کی دینی وعلمی اور روحانی مساعی جمیلہ کی تفصیلات نہ بیان کی جائیں، لیکن ان علمائے ربانین کے تجدیدی کارناموں، اور ان کی دینی وعلمی، اصلاحی وروحانی خدمات پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اس مضمون میں ان پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تصوف پر بے عملی اور تعطلی کا الزام عائد کرنا بے بنیاد ہے۔ خلفائے راشدین اور حضرات تابعین کے بعد، اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں، ائمہ مجتہدین، علمائے ربانیین اور صوفیائے کرام کا نمایاں رول اسلامی تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خلفائے راشدین اور حضرات تابعین کے عہد زریں کے بعد جب اسلام میں خارجی اثرات نفوذ کرنے لگے تو تصوف میں بھی غیر اسلامی رجحانات پیدا ہوئے۔ چنانچہ تصوف میں غیر اسلامی چیزیں شامل کرنے والے صوفیا پر محققین صوفیائے کرام نے نہ صرف تنقید کی بلکہ ان پر زندیق ہونے کا فتویٰ بھی صادر کردیا۔ لہٰذا بعض صوفیا کے غیر اسلامی رجحانات کے پیش نظر اس خالص تصوف پر بھی اعتراض کرنا (جس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے) اور اسے غیر اسلامی قرار دینا صحت مند انداز فکر نہیں ہے۔

مراجع

(۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تزکیہ واحسان یا سلوک وتصوف، ص:۱۴۰

(۲) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی۔ الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص:۱۴۲

(۳) حوالہ سابق، ص:۱۵۴

(۴) عفیف عبدالفتاح طبارہ۔ روح الدین الاسلامی، ص:۲۰۱

(۵) محمد خطیب تبریزی۔ مشکوٰۃ شریف جلد اول، ص:۱۱

(۶) مولانا بدر عالم میرٹھی: ترجمان السنۃ جلد اول، ص:۵۷۶۔۵۷۷

(۷) حوالہ سابق، ص۵۷۸۔۵۷۹

(۸) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن جلد سوم، ص:۵۳۴

(۹) مولانا اشرف علی تھانوی۔ امثال الاقوال والاحوال، ص:۶ بہ حوالہ رسالہ قشیریہ

(۱۰) مولانا سید محمد جیلانی، پراسپکٹس الجامعۃ الصوفیہ، ص:۷

(۱۱) حوالہ سابق، ص:۷

(۱۲) علامہ ابن عابدین، شامی جلد اول، ص:۴۱۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی ص:۱۵۱۔۱۵۲

(۱۳) حوالہ سابق، ص:۴۱

(۱۴) علامہ شبلی نعمانی، سیرت النعمان، ص:۱۸۹

(۱۵) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص: ۱۴۸ بحوالہ کشف الخفا للعجلونی ج:۱، ص:۳۴۱

(۱۶) حوالہ سابق، ص:۱۴۸ بہ حوالہ الطبقات الکبریٰ للشعرانی

(۱۷) حوالہ سابق، ص:۱۴۸۔۱۴۹ بحوالہ تنویر القلوب، الشیخ امین الکردی ص:۴۰۵

(۱۸) حوالہ سابق، ص۱۴۹ بحوالہ لطائف المنن والاخلاق للشعرانی، ص:۵۰

(۱۹) حوالہ سابق، ص۱۵۰

(۲۰) حوالہ سابق، ص۱۵۰۔۱۵۱

(۲۱) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص: ۱۵۱ بحوالہ مقدمہ ابن خلدون، ص:۳۲۹

(۲۲) مولانا سید محمد میاں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی۔ حصہ اول، ص:۱۱۹۔ بحوالہ مکتوب مجدد الف ثانی، ص:۳۵ جلد اول، ص:۵۰

(۲۳) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص:۱۴۷ بحوالہ

المنقذ من الضلال للغزالی، ص:۱۳۱

(۲۴) سید اقبال احمد جون پوری۔ توحید و معرفت، ص:۳۱۴ بحوالہ مرج البحرین، ص:۲۰

(۲۵) مولانا ابوالحسن علی ندوی، اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص:۳۲۵

(۲۶) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص:۱۵۸

(۲۷) حوالہ سابق، ص:۱۵۸۔۱۵۹

(۲۸) مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، تاریخ اسلام جلد دوم، ص:۲۶۱

(۲۹) مولانا ابوالحسن علی ندوی، اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص:۱۸۰

(۳۰) مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، تاریخ اسلام جلد سوم، ص:۳۷۰

(۳۱) حوالہ سابق، ص:۳۷۵۔۳۷۶

(۳۲) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تزکیہ واحسان، ص:۶۶۔۶۷ بحوالہ دعوت اسلام از مسٹر آرنلڈ، ص:۳۴۰۔۳۴۱

(۳۳) حوالہ سابق، ص:۶۹، ۷۰، ۷۱، بحوالہ دعوت اسلام، ص:۲۵۶

(۳۴) ڈاکٹر عبدالرزاق جیلانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص:۵۹ بحوالہ ربانیۃ لارھبانیۃ از مولانا علی میاں ندوی، ص:۱۲۶

(۳۵) حوالہ سابق، ص:۱۶۰

(۳۶) حوالہ سابق، ص:۱۶۰

(۳۷) شیخ محمد اکرام۔ آب کوثر، ص:۱۹۰۔۱۹۱

(۳۸) حوالہ سابق، ص:۱۹۲

(۳۹) حوالہ سابق، ص:۱۹۲

(۴۰) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت حصہ سوم، ص:۱۶۶۔۱۶۷

(۴۱) سید صباح الدین عبدالرحمان، بزم صوفیہ، ص:۱۷۶

(۴۲) شیخ اکرام۔ آب کوثر، ص:۲۲۲

(۴۳) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت عزیمت حصہ سوم، ص:۱۶۸۔۱۶۹

(۴۴) سید صباح الدین عبدالرحمان، بزم صوفیہ، ص:۲۷۷

(۴۵) حوالہ سابق، ص: بزم صوفیہ، ص:۲۷۹

(۴۶) حوالہ سابق، ص:۲۹۴

(۴۷) حوالہ سابق، ص:۵۱۶ تا ۵۲۴

(۴۸) حوالہ سابق، ص:۵۲۸۔۵۲۹

(۴۹) شیخ محمد اکرام۔ آب کوثر، ص:۲۹۲ تا ۳۱۴

(۵۰) حوالہ سابق، ص:۲۵۶

(۵۱) سید صباح الدین عبدالرحمان، بزم صوفیہ، ص:۵۰۶

(۵۲) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص:۲۸۳۔۲۸۴

(۵۳) حوالہ سابق، ص:۲۸۶

(۵۴) حوالہ سابق، ص:۲۹۳ تا ۲۹۵

(۵۵) حوالہ سابق، ص:۲۹۷ تا ۳۲۴

(۵۶) حوالہ سابق، ص:۳۲۶ تا ۳۳۱

(۵۷) حوالہ سابق، ص:۳۵۷ تا ۳۷۴

(۵۸) حوالہ سابق، ص:۱۳۷۴ تا ۳۸۲

❁❁❁

صوفیہ اور حقوق انسانی

ڈاکٹر عبد السلام جیلانی .... شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

خالق کائنات کا انسان کو ایک ہی جوہر (آب و آتش و خاک و باد) سے پیدا کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان آپس میں برابر ہیں جس کی تشریح پوری طرح اس حدیث پاک سے ہوتی ہے "الناس سو اسیہ کاسنان المشط" انسان کنگھی کے دانتوں کی طرح برابر ہیں۔ اس بات کی تصدیق کہ انسان تخلیقی اعتبار سے یکساں اور برابر ہیں۔ آج سائنس کے ذریعہ بھی ہو چکی ہے۔ جدید سرجری کے ذریعہ عضو کی پیوند کاری گردہ قلب اور خون کی منتقلی کرتے وقت مذہب، ذات پات اور نسل وقبیلہ کا خیال نہیں کیا جاتا بلکہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے کہ طبی اعتبار سے یہ اعضا صحت مند ہیں۔ صحت مند ہونے کی صورت میں بلا امتیاز مذہب وملت اور بغیر تفریق نسل وقوم بوقت ضرورت یہ اعضا کسی بھی فرد بشر کے جسم میں منتقل کیے جا سکتے ہیں، جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے انسان ایک ہی جوہر سے مرکب ہے تو اس رشتہ سے اس کا ایک دوسرے کے لئے معاون و مددگار ہونا بھی فطری ہے۔

سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ اور فارسی ادب کے مشہور اہل قلم شیخ سعدی شیرازی حیاتِ انسانی کا تصور پیش کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو ایک جسم کی مانند قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں:

بنی آدم اعضای یکدیگرند — کہ در آفرینش زیک جوہرند
عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوہارا نماند قرار

یعنی جس طرح جسم کے کسی ایک حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضا کو سکون نہیں ملتا ہے اسی طرح جب ایک انسان کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرے انسان کو اس کا احساس ہو اور اسے دور کرنے کے لئے وہ کوشاں ہو۔ یہ بات بھی انسان کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اس کی تخلیق و ترکیب کی خصوصیت (Properties) کا ظہور بھی ہونا چاہیے۔ یعنی اسے زمین (خاک) کی طرح عاجز و منکسر سورج (آتش) کی طرح شفیق، دریا (آب) کی طرح سخی اور ہوا (باد) کی طرح لطیف اور مفید ہونا چاہیے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ نظریہ محبوب و پسندیدہ رہا ہے اور اسے انہوں نے تقرب الٰہی کا باعث بتایا ہے چنانچہ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص اس بات کا خواہاں ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اپنا دوست اور محبوب بنالے تو وہ اپنے اندر یہ تین باتیں (۱) دریا کی سی سخاوت (۲) زمین کی سی تواضع وانکساری (۳) اور سورج کی سی شفقت پیدا کرے" اللہ اس کو اپنا دوست بنالے گا۔

جب انسان کی فکر اور اس کا عمل اس مقام پر پہنچ جائے اور وہ اس بات کا خوگر ہو جائے تو یقیناً اس سے بغض، حسد، نفرت، غیبت اور مردم آزاری وغیرہ جیسے غیر انسانی افعال سرزد ہی نہیں ہوں گے۔ گویا ان افعال بد سے اجتناب اور اس کا ترک کرنا تکریم انسانیت ہے۔ حسن اخلاق، اخلاص، اخوت، محبت، سخاوت، احسان، عفو، درگزر، سادگی، تواضع اور تحمل کا خوگر ہونا تکمیلِ انسانیت ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو ان باتوں کی تلقین بھی کرتا ہے اور ان سے ان باتوں کی تکمیل کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام نے اسلام کے ان مطالبات کو پورا کر کے امن وآشتی اور اخوت و بھائی چارگی کی جو اعلیٰ فضا دنیا کے سامنے پیش کی ہے اس کی نظیر تاریخ تہذیب انسانی میں نہیں ملتی۔ صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین

ان مطالبات کو پورا کرتے رہے اور انسانیت فروغ پاتی رہی۔ ان کے بعد رفتہ رفتہ اس طرف توجہ کم ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اور انسانیت پر زوال آنا شروع ہوا۔ انسانی قدریں پامال ہونے لگیں، ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہونے لگا تو سنت اللہ کے مطابق اس پرفتن ماحول میں پھر ایک ایسا گروہ وجود میں لایا گیا جس نے دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام کیا، جس کے نتیجہ میں امن وآشتی کی فضا قائم ہوئی، انسانیت کا پیغام عام ہوا۔ وہ گروہ تھا صوفیائے کرام کا، جن کی زندگی کا پورا فلسفہ اور مقصد انہیں افکار وخیالات کے اظہار اور خود اپنے عمل سے اس کی تشہیر وتبلیغ تھا۔

تصوف کی حقیقت یہی ہے کہ مذہب پر پوری سچائی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے بلا تفریق مذہب وملت انسان اور انسانیت کی خدمت اور بھلائی کرنے کو اپنا شعار زندگی بنایا جائے۔ حقیقتاً صوفیائے کرام کی پوری زندگی اتباع شریعت، اخوت، مساوات، اخلاق اور اخلاص سے سرشار ہوتی ہے، ان کا یہ عمل اور پیغام (انسان دوستی، اخوت و بھائی چارگی) کسی مخصوص ملک، ملت، قوم اور قبیلہ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ پورے عالم انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔

آج عالمی سطح پر بھائی چارے (Brotherhood) کی بات کی جارہی ہے، اس کی ترویج کے لئے قوانین وضوابط بنائے جارہے ہیں اور ادارے قائم کیے جارہے ہیں، مگر نتیجہ خاطر خواہ نہیں مل رہا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وضع کردہ قوانین وضوابط جرم کے روک تھام میں معاون تو ہوسکتے ہیں مگر اولاً یہ قوانین پورے طور پر نافذ العمل ہی نہیں ہوپاتے، ثانیاً یہ قوانین گنہگار کو سزا تو دلا سکتے ہیں مگر انہیں گناہ سے نفرت نہیں دلا سکتے۔ اور نہ ہی اس کے ترک کرنے پر دل کو آمادہ کرسکتے ہیں، اس کے لئے کوئی عمل (action) کارگر ہوسکتا ہے تو وہ ہے تطہیر قلب وتزکیہ نفس۔ جس انسان کا نفس طیب وطاہر ہوگا تو اسے خود ہی برے افعال سے نفرت اور اچھے اعمال کی طرف رغبت ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ صفائے قلب اور تزکیہ نفس کیسے اور کہاں حاصل ہو؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صفات عالیہ صرف اور صرف صوفیائے کرام کی بارگاہ، ان کی محبت، قربت اور ان کے بتائے ہوئے طرز زندگی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ان کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، ان میں سے ایک انوکھا پہلو "گناہ سے بے زاری اور گناہ گار سے ہمدردی ہے" یہ عجیب فلسفہ اور تصور حیات انسانی ہے جو ماہرین قانون کی نگاہ اور دستور ساز ادارے میں قابل قبول نہیں۔ یہاں تو جرم کے مطابق سزا دینا ہی قابل قبول ہے، اس لئے اس کے تحت مجرم کو سزا ملتی ہے۔ مملکت کے ذریعہ وضع کردہ قوانین کے تحت مجرم کو سزا دینا یقیناً روا ہے اور اس کی بہتری کا باعث ہے مگر بسا اوقات متعین کردہ سزائیں اپنی حدوں کو پار کرکے انسانیت کو مجروح کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس لئے اہل دنیا نے قیدیوں اور مجرموں کے ساتھ ہونے والے ظلم وزیادتی کے پیش نظر اقوام متحدہ نامی ایک ادارہ قائم کرکے انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھنے کی، بات کی جس کے وضع کردہ قوانین میں کہا گیا ہے کہ قیدیوں اور مجرموں کے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہ کیا جائے جس سے انسانیت مجروح ہو مگر ابوغریب کے قیدیوں کے ساتھ جو گھناؤنا اور وحشیانہ سلوک کیا گیا اس سے ادارہ کے وجود اور اس کے مقاصد پر حرف ضرور آجاتا ہے۔ دوسری طرف صوفیائے کرام کا طرز عمل گناہ سے بیزاری اور گنہگار سے ہمدردی کتنا مفید اور خیر خواہی پر مبنی ہے کہ جس کے ذریعہ گنہگار گناہ سے تائب ہوکر گناہ بھی ترک کردیتا ہے اور انسان وانسانیت قائم بھی رہ جاتی ہے۔

ایک بار حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے عبادت خانہ میں ایک شخص چاقو رکھے ہوئے پہنچ گیا، آپ کے معتقدین میں سے کسی کی نگاہ اس شخص پر پڑ گئی۔ اس نے شور مچایا لوگ جمع ہوگئے اور اس شخص (مجرم) کو زدوکوب کرنے لگے، جب اس بات کی اطلاع حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی تو آپ نے لوگوں کو اسے زدوکوب کرنے سے منع فرمایا، اس کے بعد اس شخص کو اپنے قریب بلایا، اسے اطمینان دلایا اور جب وہ پوری طرح مطمئن ہوگیا تو

آپ نے اس سے فرمایا کہ اگر تم ایسا کرنا چھوڑ دو گے تو ہم بھی تمہیں چھوڑ دیں گے یعنی تمہیں کوئی اذیت اور تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اس شخص پر آپ کی بات اثر کرگئی اور وہ اس انسان کش عمل سے باز آ گیا۔

چنانچہ تاریخ و تذکرہ میں حضرات صوفیا میں حضرت جنید بغدادی سے لے کر حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمہم اللہ اجمعین تک کے ایسے ہزاروں واقعات مذکور ہیں جن کے وعظ و نصیحت سے چور نے چوری، شرابی نے شراب اور بادشاہوں نے عوام پر ظلم و زیادتی سے ہاتھ اٹھالیا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں رقم طراز ہیں "سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین اولیاء اور شیخ اسلام رکن الدین سے آراستہ تھا۔ ایک دنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی، ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور ان کی مدد سے گنہگاروں نے توبہ کی، ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا۔" نیز صاحب تاریخ فیروز شاہی آگے فرماتے ہیں، "عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگتے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سودخوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے۔ بازاروں میں جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔"

گویا گرتے ہوئے کو تھامنا، بیکسوں کی فریاد رسی کرنا محتاجوں کی حاجت روائی کرنا صوفیائے کرام کی زندگی کا اولین مقصد تھا اور ان کے نزدیک یہ باتیں عبادت کا درجہ رکھتی تھیں، جیسا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ بہترین عبادت کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "درماندگان را فریاد رسیدن حاجت بےچارگان را روا کردن و گرسنگان را سیر گردانیدن۔"

یعنی بے سہاروں کو سہارا دینا، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا۔" (بہترین عبادت ہیں)۔

صوفیائے کرام کے اس تصور نے انسانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا جس نے انسانی فکر و عمل میں ایک نیا حوصلہ اور نئی لہر پیدا کردی۔

عام لوگوں میں یہ دستور پایا جاتا ہے کہ وہ برائی کا بدلہ برائی اور بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں مگر صوفیہ کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے۔ وہ نیک و بد دونوں کے ساتھ نیکی سے ہی پیش آتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا یہ دستور اور یہ طرز عمل انسان دوستی اور امن و آشتی کو عام کرنے میں بڑا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس کی پوری عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔" جب کوئی شخص کسی کی راہ میں کانٹا بچھائے تو اس کے جواب میں کانٹا نہیں بچھایا جاسکتا ورنہ اس طرح کے عمل اور اس کے ردعمل سے پوری دنیا میں کانٹے ہی کانٹے نظر آئیں گے۔

جب ہم اپنی چشم بینا سے دیکھتے ہیں تو ہمیں صوفیا کی بارگاہ اور ان کی خانقاہیں عشق و محبت کا سرچشمہ نظر آتی ہیں۔ یہاں مردم آزاری ہی نہیں بلکہ دل آزاری بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔

بقول مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی "خانقاہیں عشق کی دکانیں تھیں، جہاں انسان راحت دل کی تلاش میں جمع ہوتے تھے۔" اسی سلسلہ میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ گچھ نہیں ہوگی جتنی دلداری اور دل خوش کرنے کی۔"

حقیقت میں دلداری اور دلجوئی ایک بیش بہا سودا ہے، جس کی قیمت اور اس کا فائدہ دنیا میں ترقی درجات اور محبوبیت خلائق کی شکل میں ملتا ہے اور آخرت میں اس کے بدلہ میں اجر عظیم کی خوش خبری دی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے قولوا للناس حسنا (سورہ البقر) لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اسی لئے صوفیائے کرام لوگوں کی دل جوئی کرنے اور ان کے ساتھ خوش دلی سے پیش آنے کو عبادت سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ اس بات پر خود بھی عمل پیرا ہوتے اور دوسروں کو اسی کی تلقین

کرتے نظر آتے ہیں۔

اہل دل کے یہاں لوگوں کو زک دینا، ان کو نقصان پہنچانا یا اس کے بارے میں سوچنا تو غیر انسانی عمل ہے ہی۔ دوسروں کے نقصان اور اس کی محتاجی پر خوشی کا اظہار کرنا بھی ناپسندیدہ عمل سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس طرز عمل سے لوگوں کے دلوں کو ٹھیس لگتی ہے جو نفرت کا باعث ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام ان باتوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار بغداد کے بازار میں آگ لگ گئی جس میں بیشتر دکانیں جل کر برباد ہوگئیں جو دکانیں بچ گئیں ان میں ایک دکان حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی، جس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ لوگوں نے آکر آپ کو اس بات کی اطلاع دی۔ اس وقت آپ کی زبان سے بے ساختہ ''الحمد للہ'' نکل گیا جو ایک فطری امر بھی ہے، مگر بعد میں جب دوسروں کے نقصانات کا احساس ہوا تو آپ کو اس عمل پر بڑی ندامت ہوئی، اس لئے کہ یہ بات ان کو انسانیت اور مردی کے خلاف لگی۔ چنانچہ آپ تیس سال اس کے لئے استغفار کرتے رہے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ جس بات سے لوگ مصیبت میں مبتلا تھے، اس میں میں نے اپنے نفس کے لئے بھلائی چاہی، اس لئے میں استغفار کر رہا ہوں۔

جس انسان کو ایک دوسرے انسان کے احساسات و جذبات کا اس حد تک خیال ہوگا تو پھر اس سے نہ صرف حقیقی آدمیت، اور بشر دوستی کا تصور فروغ پائے گا بلکہ احترام انسانیت کا جذبہ عام ہوگا کہ آدمیت احترام آدمی است۔

اپنے مذہب پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ کر دوسروں کے احساسات و جذبات اور مطالبات کا پاس و لحاظ رکھنا ہر مذہب اور تہذیب میں رہا ہے۔ اس کے برخلاف کسی قوم یا قبیلہ کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچانا مذہبی اعتبار سے بھی ناروا ہے اور انسانیت کے خلاف بھی۔ اس لئے کہ اس طرح کے طرز عمل سے ایک دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر صوفیائے کرام کی بارگاہ ایک ایسی بارگاہ ہے جہاں دل آزاری اور دل شکنی کی جگہ دل جوڑنے کا کام کیا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے جذبات سے کھیلا نہیں جاتا ہے بلکہ ان کے جذبات کا احترام کیا جاتا ہے۔ حضرت صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل اور ان کی یہ وصیت اس سلسلہ کی بہترین مثال ہے۔ حضرت صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ نے قیام ناگور کے دوران پوری زندگی گوشت نہیں کھایا۔ نیز اپنے وصال کے وقت آپ نے یہ وصیت فرمائی کہ میری روح پر گوشت کی فاتحہ نہ دی جائے۔ مریدین نے عرض کیا، حضور اگر بازار سے لاکر ایسا کریں تو؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بھی اسی زمرے میں ہے۔

جو لوگ اسلام اور اس کے پیروکاروں پر دہشت گردی، قتل و غارت گری کا الزام لگاتے ہیں، انہیں ایک صوفی کے اس طرز عمل سے سبق لینا چاہیے کہ جب ایک صوفی اپنے لئے کسی جانور کو بے جان کرنا جائز نہیں سمجھتا ہے تو بھلا وہ کسی انسان کے قتل کرنے کو کیسے روا رکھ سکتا ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک فرد یا ذات کی نہیں بلکہ انسانیت کی قدر و اہمیت ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ نظریہ جس میں انہوں نے فرد واحد کو انسان صغیر اور انسانیت کو انسان کبیر سے تعبیر کیا ہے تصور حیات انسانی کا بہترین ترجمان ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی خاص موقع جشن یا تہوار پر والدین اپنے بچوں کو اچھے لباس میں ملبوس کر کے کوئی اپنے کاندھے پر، کوئی کسی سواری پر اس جشن یا تہوار میں لے جاتے ہیں اور بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں مگر ایسے حالات میں کسی کو کسی یتیم بچے کا خیال بھی نہیں آتا۔ ذرا جا کر کوئی اس وقت کسی یتیم بچے سے پوچھے کہ اس پر کیا گزری۔ اسی لئے صوفیائے کرام ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ کسی کے جذبات و احساسات کو ٹھیس نہ پہنچے اور کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اس لئے اس سے صرف دل مجروح نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے انسانیت مجروح ہوتی ہے اور شیخ سعدی شیرازی ایسے وقت کے لئے نصیحت کرتے ہیں۔

چون بنی یتیمی سرافگندہ پیش　　　　مدہ بوسہ بر روی فرزند خویش

ترجمہ: جب تو کسی یتیم پریشان حال کو دیکھو تو اپنے بچے کو بوسہ

مت دو۔ تصور حیات انسانی کے لئے یہ بہترین پیغام ہے۔

اسلام اور اس کے پیروکاروں نے حیاتِ انسانی کا نہ صرف تصور دیا ہے بلکہ حیات انسانی کی بقا اور اس کے تحفظ کے لئے بیش بہا خدمات بھی انجام دی ہیں۔ جس کے لئے انسانیت ہمیشہ اسلامی افکار کے مرہون منت رہے گی۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کے اندر درندگی پھیلی ہوئی تھی، آدمی آدمی کا دشمن تھا، انسانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ نسل انسانی کی افزائش کے مصدر (لڑکیوں) کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا تھا، انہیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، سماج میں عورتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس انسان کش عمل سے منع فرمایا۔ عورتوں کو مرد کے سکون قلبی کا ذریعہ اور انہیں اجر عظیم کی خوشخبری فرمائی جس کی وجہ سے نہ صرف عورتوں کی جان، عصمت اور آبرو محفوظ ہوئی بلکہ نسل انسانی کو بھی تحفظ ملا۔ اگر اسلام نے عورت کو تحفظ عطا نہ کیا ہوتا تو جس طرح اس کا خاتمہ کیا جا رہا تھا اس سے نہ صرف نسل انسانی کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا بلکہ نظام عالم میں خلل پڑ جاتا۔

تصوف کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے اور اس کی جڑیں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال و اعمال سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کی حیات مبارکہ اور ان کی خدمات کا مطالعہ کرنا ہوگا کہ انہوں نے تصور و تحفظ انسانی کے لئے کون سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مصر کی فتح کے بعد فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے اہل مصر نے کہا ہماری کاشتکاری کا دارو مدار دریائے نیل کے پانی پر ہے۔ ہماری کھیتیاں اسی سے سیراب ہوتی ہے مگر دریائے نیل کا یہ دستور ہے کہ ہر سال جب تک اس کے اندر کوئی خوبصورت ترین لڑکی نہ ڈالی جائے تو اس وقت تک اس کے اندر طغیانی آتی ہے اور نہ پانی دریا سے اوپر اٹھتا ہے، جس کی وجہ سے فصلیں تباہ ہوتی ہیں اور قحط پڑنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرو بن عاص حیرانی و پریشانی میں پڑ گئے اور پورا واقعہ لکھ کر امیر المومنین حضرت عمر کے پاس روانہ فرما دیا اور اس سلسلہ میں آپ کی رائے طلب فرمائی۔ پڑھتے ہی حضرت عمر کا ایمانی جوش بھڑک اٹھا فرمایا خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسلام ایسی وحشیانہ رسموں کی اجازت نہیں دیتا۔ فوراً آپ نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پورے غیض و غضب کے ساتھ دریائے نیل کے نام پر خط لکھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

''اے دریائے نیل! اگر تو اپنے اختیار اور خواہش سے بہتا ہے تو پھر ہم کو تجھ سے کوئی سروکار نہیں، اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو اللہ کے حکم سے جاری رہنا، جیسے ہی دریائے نیل میں یہ خط ڈالا گیا دریا موجیں مارنے لگا اور اس کے اندر ایسی طغیانی آئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی، اس کے بعد پھر کبھی وہ خشک بھی نہیں ہوا۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ نامۂ گرامی جو دریائے نیل کے نام تھا وہ صرف دریا کے اندر طغیانی لانے کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ اس بری رسم کو ختم کر کے تحفظ انسانی کے لئے بھی تھا۔

ہندوستان کے سماجی حالات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور صوفیائے کرام کی آمد سے پہلے یہاں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا تھا۔ سماج کی وہ حقیر ترین مخلوق تصور کی جاتی تھی، اس کی قدر و قیمت صرف اتنی تھی کہ وہ مردوں کی خواہشات کی تکمیل کا سامان تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اسے بھی اپنے خاوند کے ساتھ بستر آگ پر ہمیشہ کے لئے سونا پڑتا تھا، مگر یہ صوفیائے کرام کی ہی جماعت تھی جنہوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہندوستان کی سرزمین کو سرفراز فرمایا اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے قول و عمل سے انسان کو اس کے حقیقی معنی اور اس کی تخلیق کے مقصد سے روشناس فرمایا، احترام آدمیت کا درس دیا، جس کی وجہ سے لوگ اپنے وجود اور مقصد وجود سے آشنا ہوئے اور تکریم انسانیت کا جذبہ عام ہوا۔ آج ہندوستان کی سرزمین پر اسلام کی اشاعت اور انسانیت نے جو کچھ بھی فروغ پایا وہ انہیں حضرات صوفیہ اور مشائخ کی رہین منت ہے۔ اس سلسلہ کا ایک

واقعہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ہے، آپ موجودہ گجرات کے علاقہ جھکر میں قیام پذیر تھے، وہاں ایک وحشیانہ رسم مروج تھی کہ شام کے وقت قرب و جوار کی عورتیں ایک خاص مقام پر جمع ہوتی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اپنا اپنا نام لکھ کر ایک گھڑے میں ڈال دیتیں، اس کے بعد ایک ایک مرد آتا اور اس میں سے ایک پرچہ نکالتا اس میں عورت کا نام ہوتا وہ اس کے ساتھ رقص و سرود کرتا ہوا مباشرت کرتا۔

یہ ایسی بری رسم تھی جس میں رشتوں کا بھی پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔ چاہے وہ عورت ماں کی شکل میں ہو یا بیٹی، بہن کی شکل میں۔ چونکہ ان لوگوں کا ماننا تھا کہ ایسا کرنے سے ان کے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کو جب اس بری رسم کی اطلاع ہوئی تو آپ نے وہاں کے راجہ جو ہندو تھا اسے اس بری اور وحشیانہ رسم کو ختم کرنے کے لئے کہا۔ راجہ کو اس رسم کو ختم کرنے میں تامل بھی ہوا چونکہ اس سے اسے دو طرح کی ناراضگیوں کا سامنا تھا، ایک تو عوام، دوسرے ہندو عقیدے کے مطابق دیوتا کی ناراضگی۔ مگر راجہ کے دل پر آپ کی بات اثر کر گئی اور اس نے ان باتوں کی پرواہ کیے بغیر اس رسم کو ختم کر دیا اور اس طرح یہ وحشیانہ رسم جو برسوں سے چلی آرہی تھی، ختم ہوگئی۔ یہ بات صداقت پر مبنی ہے کہ ایسے موقع پر کوئی قانون اور کوئی دستور لوگوں کو ان باتوں سے نہیں روک سکتا۔ یہ صرف صوفیائے کرام کی ایمانی طاقت اور بلند ہمتی ہوتی ہے جو ظالم بادشاہ کو ظلم کرنے اور عوام کو اپنے دل پذیر اقوال و اعمال سے برے افعال کے کرنے سے روک دیتے ہیں۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ کوئی بھی مہذب سماج اور مذہب ایسے غیر انسانی رسوم نہ تو روا سمجھتا اور نہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ یہ صرف کسی غیر انسانی فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

آج انسان بڑھتے جاتے ہیں اور انسانیت گھٹتی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہم موجودہ زمانہ میں قوموں، جماعتوں اور اداروں کے اجتماعی حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں عموماً اس قوم، ادارے اور جماعت کے اندر تنگ گلی، تنگ نظری، تعصب، جذبہ انتقام اور خود نگری جیسے فاسد اور مہلک عناصر نظر آتے ہیں۔ جن کے زہریلے اثرات انسانی زندگی اور رشتوں پر پڑنے یقینی ہیں۔

ان فاسد اور مہلک عناصر کے سد باب کے لئے ہمیں اسی قدیم صوفیانہ روش کو اختیار کرنا اور اسے فروغ دینا ہوگا تا کہ اسلام کی اشاعت اور انسانیت کو فروغ مل سکے۔ اس لئے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صوفیائے کرام نے اسلام کی اشاعت اور فروغ انسانیت کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ کسی بھی ادارے، جماعت اور تنظیم سے بدر جہا بہترین ہیں لیکن ساتھ ہی اہل تصوف کے بعض اخلاف کی بے توجہی یا اہمیت نہ دینے کی وجہ سے بعض صوفیا کے یہاں جو باتیں اور رواج غیر شرعی ہیں یا نظر آتی ہیں ان کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اصل تصوف کا احیا بھی ہو جائے اور اچھے معاشرے کی تشکیل ہو کر انسان اور انسانیت کا فروغ ہو سکے۔

حوالے

تاریخ فیروز شاہی	:	ضیاء الدین برنی
سیر الاولیاء	:	سید محمد مبارک امیر خورد کرمانی
بزم صوفیہ	:	صباح الدین عبدالرحمٰن
لطائف اشرفی	:	ملفوظات سید اشرف جہانگیر اردو ترجمہ مولانا عبدالستار
مونس الارواح۔ (فارسی)	:	جہاں آرا بیگم
رسالہ قشیریہ	:	ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری۔ اردو ترجمہ۔ ڈاکٹر پیر محمد حسن
سرور الصدور قلمی	:	صوفی حمید الدین ناگوری

❁❁❁

صوفیہ اور اردو ادب

ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان .... جامعۃ البرکات علی گڑھ

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور امرا و سلاطین کی ایک طویل فہرست ہے وہیں پر ہمارے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی بھی ایک بڑی تعداد اس میں کارفرما نظر آتی ہے۔

یوں تو اردو زبان کوئی قدیم یا تاریخ کے اعتبار سے بہت پرانی زبان نہیں جیسا کہ دنیا کی اور دیگر زبانوں کی ایک تاریخ ہے اور ان زبانوں سے متعلق کوئی ملک، خطۂ ارض یا علاقہ نسبت رکھتا ہے۔ اردو زبان کا وجود قدیم ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قائم ہوا اور عربی، فارسی، سنسکرت و دیگر علاقائی زبانیں آپس میں ملیں اور ایک نئی زبان تشکیل پائی جسے اردو کا نام دیا گیا یعنی یہ ایک لشکری زبان معرض وجود میں آئی۔

دراصل یہی وہ زبان ہے جس میں اس کے ساتھ دیگر زبانوں اور علاقائی بولیوں کے وہ الفاظ جو اس میں بآسانی شامل ہو سکتے تھے وہ شامل ہوگئے۔ لہٰذا اس زبان میں جس طرح دیگر زبانوں کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں اسی طرح اس کے اندر مختلف قوموں، علاقوں اور تہذیبوں کا اثر بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

زیر بحث اور زیر نظر عنوان 'صوفیا اور اردو ادب' پر اگر عمیق نظر ڈالی جائے تو تاریخ و تہذیب اسلامی کے اوراق جگمگانے لگتے ہیں اور ایوان اردو میں تصوف و معرفت کی کرنیں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تبلیغ اسلام کا سلسلہ پیغمبر آخر الزماں حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہونے کے بعد تا قیامت جاری رہنے والا ایک ایسا سلسلہ ہے جو دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں کبھی نہ کبھی جاری رہا اور جاری رہے گا۔

اب اس ایک لفظ 'اسلام' پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ مذہب جو امن و امان اور سلامتی والا ہے یہی دراصل دنیائے انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے اللہ رب العالمین کے نزدیک پسندیدہ دین کی شکل میں آیا اور اسی کے قوانین و احکام پوری عالمی برادری کے لئے نافذ ہوئے تا کہ اسلام کا کلمہ حق پڑھ کر لوگ امن و امان اور سلامتی کی منزل پا سکیں۔ یہی وہ سلامتی کی منزل ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں پائی جاتی ہے اور اسی منزل کی جستجو تمام اہل حق کو رہی اور راہ سلوک و معرفت پر گامزن رہنے والے یقیناً اس منزل تک پہنچتے ہیں اور اپنی ہدایت کے ذریعہ عوام و خواص کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کا کام عموماً کبھی خطاب کے ذریعہ اور کبھی کتاب کے ذریعہ یعنی تقریر و تحریر دونوں ہی طریقوں سے انجام پایا ہے اور دونوں کے لئے عمل کی شرط لازمی قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ سلسلہ صحابہ کرام کے ذریعہ آگے بڑھا اور پھر علما اور ائمہ کرام اور فقہا و محدثین عظام کی ایک بڑی جماعت اس فریضہ کو ادا کرتی رہی۔ انہیں میں ایک اہم جماعت اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی بھی قائم ہوئی جن کے ذریعہ نہ صرف عوام و خواص کے دلوں کو فتح کیا گیا بلکہ لوگوں کے قلوب و دماغ ایمان کی روشنی سے ایسے منور ہوئے کہ ان کی کرنیں دور دور تک پھیل گئیں اور دنیا میں صوفیا کی یہ جماعت اسلام کا لاثانی اور لافانی پیغام عام سے عام تر کرتی گئی۔ کسی نے اپنے عمل کے ذریعہ، کسی نے اپنے خطاب کے ذریعہ اور کسی نے اپنی کتاب کے ذریعہ قرآن و سنت کو عام کیا اور سچے واقعات، داستان اور اسلام کی اہم و برگزیدہ شخصیات کے تذکروں کے ذریعہ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ ان میں بعض صوفیائے کرام نے بڑے مؤثر، معتبر اور مدبرانہ کلام بھی کہے اور اپنی واردات قلبی کو شعر کے قالب میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کیا اور اس کے ذریعہ پیغام حق انسانوں تک پہنچایا۔ ملک کے مختلف گوشوں میں صوفیا کی یہ جماعت نسل در نسل پھیلتی گئی اور وہاں کی علاقائی زبانوں کو استعمال کر کے اسے اردو سے ہم

آہنگ کیا اور پھر نثر و نظم دونوں ہی میدان میں اپنے اپنے کمالات و خیالات کے جوہر دکھائے جو رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں میں اپنا تاثر قائم کرتے رہیں گے۔

یوں تو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سینکڑوں صوفیائے کرام کے نام نامی پائے جاتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے حلقوں اور علاقوں میں رہ کر درس ہدایت دیا اور تحریری شکل میں کچھ نہ کچھ اپنی یادگار بھی چھوڑی۔ اگر چہ ان بزرگوں کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کے اس عمل سے یا ان کی تحریر و تقریر سے کوئی زبان پروان چڑھ رہی ہے، مالا مال ہورہی ہے اور اپنے دامن کو ہیرے و جواہرات سے پر کر رہی ہے، بلکہ ان کا مقصد صرف عوام کی ہدایت اور انہیں حق کا پیغام دینا تھا۔ مگر ان کے اس عمل سے نہ صرف زبان و ادب کا فروغ ہوا بلکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور کئی شاخیں بھی وجود میں آئیں۔ ان میں قدیم زبانوں مثلاً عربی و فارسی میں اسلام کا تمام سرمایہ اور علوم وفنون کا اثاثہ بھی ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے تراجم و تفاسیر کے ذریعہ بھی زبان و ادب کو ترقی اور وسعت حاصل ہوئی۔

قدیم ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہی یہاں پر علاقائی زبانیں عربی و فارسی سے متاثر ہونا شروع ہوگئی تھیں اور مغلیہ سلطنت کے آخر تک ہندوستان کی قومی زبان فارسی رہی پھر ہندوستانی زبانوں کے تال میل سے اردو یا ہندوی زبان نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔ چنانچہ دکنی اردو، شمالی اردو اور مغربی اردو کا اثر ان اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے ملفوظات و کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں روحانی اعتبار سے دو بڑے سلاسل کے بزرگ اور صوفیا رشد و ہدایت کے لئے دیگر ممالک سے تشریف لائے اور یہاں آکر آباد ہوگئے۔ ان میں ایک 'سلسلہ قادریہ' کے بزرگ قابل ذکر ہیں جن کا تعلق حضرت سید عبد القادر جیلانی غوث اعظم محی الدین سبحانی بغدادی علیہ الرحمہ سے ہے اور دوسرے 'سلسلہ چشتیہ' کے بزرگان دین ہیں جن کا تعلق خواجہ خواجگاں حضرت سید معین الدین حسن چشتی خواجہ غریب نواز سنجری علیہ الرحمہ سے ہے۔ جن کے خلفا اور مریدین ہندوستان میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان جلیل القدر اولیائے کرام کے خلفا، معتقدین و مریدین کے ذریعہ قدیم اردو زبان رشد و ہدایت اور وعظ و نصیحت کا مؤثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر و فن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔ اردو نثر کے فقرے اور جملے باقاعدہ نثری کتابوں سے پہلے صوفیائے کرام کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔

اسی طرح سے سلسلہ قادریہ کے بزرگ اور علما و محدثین نے بھی قدیم علم تصوف اور فلسفہ اسلام کی کتابوں کے تراجم و تفاسیر کو پیش کر کے زبان و ادب کو فروغ دیا۔ اگر چہ ادب میں ان حضرات کا ذکر کم ملتا ہے مگر چند خانقاہیں آج بھی ایسی ہیں جن کے ذریعہ نسل در نسل اردو زبان و ادب کو فروغ ملا ہے۔ ان میں حضرت سیدنا میر عبد الواحد علیہ الرحمہ بلگرامی کی مشہور زمانہ تصنیف 'سبع سنابل' آج بھی صوفیا کی مستند اور معتبر کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح خانقاہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مقدسہ کے بزرگان دین کے بھی کارنامے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں حضرت سید شاہ حقانی علیہ الرحمہ کا اردو ترجمہ وتفسیر قرآن اور حضرت سید ابو الحسین احمد نوری علیہ الرحمہ کا رسالہ سراج العوارف نہایت بلند پایہ تصانیف ہیں۔ خانقاہ برکاتیہ اور سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ کے بانی حضرت سید شاہ برکت اللہ عشقی پیمی علیہ الرحمہ کی نثری کتاب 'چہار انواع' بھی نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ جو اسی سلسلہ کی اہم کڑی مانی جاتی ہے۔ حضرت اپنے دور کے بڑے عالم و فاضل اور تصوف کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ تمام بندگان خدا کی رشد و ہدایت اور صلاح و فلاح کے لئے آپ نے نہ صرف بذات خود بلکہ اپنے خاندان اور دیگر خلفا و مریدین کو بھی ہدایت و تبلیغ دین کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس خاندان کے چشم و چراغ اپنی روایت کی پاسداری ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں مخلوق خدا کو فیض یاب فرما رہے ہیں۔ حضرت صاحب البرکات علیہ الرحمہ اپنے دور کے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ کا تخلص فارسی میں عشقی اور ہندی یا سنسکرت میں پیمی تھا۔ آپ کے عارفانہ کلام کا مجموعہ 'پیم پرکاش' اس وقت کے ادب اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح سلسلہ برکاتیہ کے ایک اور بزرگ حضور آل احمد اچھے میاں قدس سرہ کی، آداب السالکین، بھی ایک گراں قدر تصنیف ہے۔

تصوف اور اردو زبان و ادب کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا،

کیونکہ ہندوستان کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا اثر اردو زبان وادب پر اس قدر گہرا ہے کہ نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں جب ہم مزید قدم آگے بڑھاتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سلسلہ قلندریہ کے دو مشہور و معروف صوفی شعرا حضرت شاہ محمد کاظم قلندر اور آپ کے خلیفہ وخلف اکبر لسان الحق شاہ تراب علی قلندر علیہ الرحمہ کے کلام میں جملہ لسانی وشعری محاسن بھی پائے جاتے ہیں اور یہ شعرا بلند پایہ مشائخ اور اصحاب شریعت وطریقت بھی ہیں۔ جنہوں نے حقائق و معارف کے ادق مسائل اور تزکیۂ نفس کے بلند وارفع مضامین عوام کی زبان میں بیان کیے ہیں۔ رشد وہدایت کے ان مسند نشینوں کی شاعری محض شاعری نہیں، بلکہ ایک مکمل پیغام حیات ہے۔

سلسلہ چشتیہ کے روح رواں معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمہ متوفی 1235ء نے اجمیر میں تبلیغ اسلام کا ایک مستقل نظام قائم کیا اور دہلی میں آپ کے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ رشد وہدایت میں مصروف رہے۔ اسی طرح وسطی ہند میں ناگور میں آپ کے مشہور خلیفہ حضرت خواجہ حمید الدین ناگوری منصب رشد وہدایت پر فائز تھے۔ اس وقت غیر منقسم ہندوستان کے لاہور شہر میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر مخلوق خدا کی ہدایت فرمارہے تھے۔ اگر چہ حضرت خواجہ غریب نواز کی کوئی ایسی کتاب یا آپ کے ملفوظات اردو یا ہندی میں نہیں پائے جاتے مگر چوں کہ آپ ایک عرصہ تک ہندوستان میں بقید حیات رہے لہٰذا آپ کی تبلیغ اور آپ کے عمل سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آپ اس وقت کی ہندوستانی تہذیب وتمدن اور بولیوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی مروجہ زبان سے ضرور واقف ہو گئے ہوں گے کیونکہ آپ کے مریدین اگر چہ مسلم ہی ہیں مگر معتقدین کی ایک کثیر تعداد غیر مسلموں کی بھی پائی جاتی ہے۔ آپ کے دست حق پرست پر ہزاروں نہیں، لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا اور آپ کے نقش قدم پر چلنے لگے۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر متوفی 1265ء خواجہ غریب نواز ہندالولی کے جانشین اور خلیفہ اکبر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ تھے اور آپ ایک بلند پایہ شاعر صوفی اور اپنے زمانے کے بڑے عالم دین تھے۔ آپ کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب میں بھی درج ہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری متوفی 1274ء کا تعلق بخارا کے شاہی خاندان سے تھا۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے استاد، ایک جید عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ خواجہ غریب نواز کے ہمراہ ہندوستان میں داخل ہوئے اور ناگور میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ نے تبلیغ اسلام اور پیغام حق لوگوں میں پہنچایا۔ آپ کے کئی رسالے بطور یادگار پائے جاتے ہیں۔ ان بزرگوں کے گھروں میں بھی عموماً ان دنوں میں ہندوستانی زبان بولی جانے لگی تھی جسے ہندی یا اردو زبان ہی کہا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ کی چودہویں صدی عیسوی کے صوفیا میں حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کا نام نہایت نمایاں اور قابل ذکر ہے۔ آپ کا سن وفات ۱۳۲۴ء ہے۔ آپ ترکی نسل سے تھے اور آپ کے والد امیر سیف الدین محمود بلخ کے امرا میں شمار کیے جاتے تھے، مگر چنگیز خاں کے حملوں سے تنگ آکر آپ ہندوستان آئے۔ امیر خسرو بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ شاعری کا شوق پیدائشی تھا۔ کم عمر ہی میں تمام مروجہ علوم وفنون میں کمال حاصل کر لیا تھا اور فارسی زبان کے ساتھ عربی، ہندی، اردو اور سنسکرت زبانیں بھی سیکھ لیں اور ہندوستانی وایرانی موسیقی میں بھی مہارت پیدا کی۔ چنانچہ ایران اور ہندوستان کے راگوں کے میل سے کئی راگنیاں ایجاد کی تھیں۔ ستار اور قوالی کے موجد بھی امیر خسرو ہیں۔

امیر خسرو حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے محبوب ترین مرید اور خلیفہ تھے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندوستانی زبان، جسے وہ ہندوی کہتے تھے، میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا ہے۔ وہ اس زبان کو جو دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی زبان دہلوی بھی کہتے تھے۔ وہ اس زبان کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ کی پہیلیاں، مکرنیاں اور معمے بڑے مشہور ومقبول ہیں۔ آپ نے گیتوں، لوریوں اور دوہوں وغیرہ کے علاوہ ایسے شعر بھی کہے جنہیں اردو بھی سمجھا جاسکتا ہے اور فارسی بھی۔ اسی طرح آپ کے اکثر دوہوں میں ہندی یا اردو زبان کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ آپ نے ہندی میں بھی بکثرت دوہے اور نظمیں لکھی ہیں۔

''خالق باری'' امیر خسرو کی بہترین تصنیف ہے جو بچوں کے ادب کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے جو عرصہ تک بچوں کے درس وتدریس

میں شامل رہی اور اسی سے اردو میں ادب اطفال کا آغاز ہوا۔

پندرہویں صدی عیسوی کے مذہبی سرمایہ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دو مشہور صوفی بزرگ ایسے گزرے ہیں جن کا ذکر کیے بغیر اردو زبان وادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ ان میں پہلا نام حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے آباو دیگر متعلقین دہلی سے دولت آباد تشریف لے آئے تھے۔ جب سلطان محمد تغلق نے دولت آباد کو ہندوستان کا دارا لسلطنت بنایا تھا۔ اس وقت حضرت محبوب الٰہی کے بہت سے خلفاومریدین دہلی سے دولت آباد آکر رشد وہدایت میں مصروف ہو گئے تھے۔

خواجہ بندہ نواز نے جنوبی ہند میں اشاعت اسلام کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ آپ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر مفسر، محدث، فقیہ، صوفی، بلند پایہ عالم اور عارف کامل تھے۔ آپ گلبرگہ تشریف لائے اور یہیں آپ کا وصال ہوا۔ خواجہ بندہ نواز حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم تصوف میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں، آپ کے مریدوں اور معتقدین کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ جنہیں آپ تصوف، حدیث اور فقہ کے ساتھ سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے نام سے بہت سے رسالے اور کتابیں منسوب ہیں جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور شکارنامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی رسالے دکنی زبان یعنی قدیم اردو میں مثلاً تلاوت الوجود، دارالاسرار، تمثیل نامہ، بہشت مسائل وغیرہ ہیں۔ ان کتابوں کا موضوع تصوف اور سلوک ہے۔ حضرت بندہ نواز ایک بلند پایہ صوفی شاعر بھی تھے اور آپ شہباز، محمد اور بندہ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کی نظم اور کلام وشعر کے مختلف نمونے کئی بیاضوں میں ملتے ہیں۔ بعض بیماریوں کے نسخے بھی آپ کے بیاضوں میں پائے جاتے ہیں۔

حضرت بندہ نواز کے بعد ایک اور اہم نام شاہ میراں جی شمس العشاق کا ہے، آپ نے ۱۴۹۶ء میں اس عالم فانی سے پردہ فرمایا۔ آپ ان اولیائے کرام میں سے ہیں جن کا فیض صدہا مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہوا۔ آپ نے بیجاپور میں نہ صرف قیام فرمایا، بلکہ وہاں آپ نے ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشیں یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے۔ انہوں نے اردو کو اپنی زبان سمجھا اور اسی زبان میں سلوک ومعرفت پر متعدد رسالے اور مثنویاں لکھیں۔ یوں تو آپ کی پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی تھی مگر آپ نے ایک رات خواب میں حضور اکرم کی زیارت فرمائی اور حضور کے حکم سے آپ ہندوستان تشریف لائے اور پھر بیجاپور میں آپ نے قیام فرمایا۔ آپ کی بدولت بیجاپور میں اردو زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور یہاں بڑے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے۔ میراں جی کا انتقال عادل شاہی دور میں ہوا۔ آپ نے اردو میں درس وتدریس کے علاوہ تعلیم وتلقین اور تصنیف وتالیف کا بھی کام انجام دیا ہے۔ آپ کی کتابوں میں خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیقت، نغز مرغوب، شرح مرغوب القلوب مشہور اور اہم ہیں جن میں تصوف اور معرفت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی کے مشہور ومعروف صوفیا اور اولیائے کرام کا ذکر پایا جاتا ہے، جنہوں نے اردو زبان کے ذریعہ نہ صرف تبلیغ دین اور رشد وہدایت کا کام انجام دیا بلکہ آپ حضرات کی تصانیف آج بھی مشعل راہ ہیں۔ ان میں جو قابل ذکر صوفیا ہیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

حضرت شیخ بہاء الدین باجن متوفی ۱۵۰۶ء آپ برہان پور کے اولیاء اللہ میں سے ایک ہیں، آپ کی ایک کتاب 'خزانۂ رحمت' مشہور ہے، جس میں آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت شیخ عزیز اللہ کے ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور باجن تخلص فرماتے تھے، آپ کے کلام کا موضوع تصوف اور معرفت ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۱۵۳۸ء ایک بڑے عالم اور صوفی تھے۔ آپ کی ایک کتاب رشدنامہ بہت مشہور ہے، جس میں تصوف اور وحدت الوجود کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۱۳۹۲ء بھی چودھویں صدی عیسوی کے ایک مشہور بزرگ ہیں، آپ نے دکنی زبان میں کئی مذہبی رسالے لکھے جو اب ناپید ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ جن کی وفات ۱۳۷۰ء میں ہوئی۔ بہار کے قصبہ منیر کے رہنے والے تھے۔ زبردست عالم دین اور ان اولیا

میں سے ہیں جن کا فیض آج بھی جاری ہے اور جن سے مخلوق خدا ہدایت پاتی ہے۔ آپ کے بتائے ہوئے اوراد اور وظائف سانپ، بچھو اور سایہ کے اتارنے اور دفع امراض کے لئے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ پوربی زبان اور ہندی کے شاعر بھی مانے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری سولہویں صدی عیسوی کے بہت بڑے بزرگ اور صوفی تھے۔ ہمایوں بادشاہ آپ کا بڑا معتقد تھا۔ آپ کا مرید اکبر بھی تھا مگر بعد میں منحرف ہوگیا۔ حضرت غوث گوالیاری کے ہندی قول اور ہندی اشعار قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں، 'جواہر خمسہ' آپ کی مشہور کتاب ہے۔ آپ کا انتقال ۱۵۶۳ء میں ہوا۔

حضرت شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجرات کے بلند پایہ عارف وصوفی تھے، اہل گجرات پر آپ کی تعلیم و ہدایت کا بڑا اثر ہوا، آپ کا مجموعہ 'جواہر اسرار اللہ' توحید اور وحدت الوجود سے بھرا پڑا ہے۔ شاہ علی محمد کا کلام خدائے تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہے، وہ اپنے عشق کو کئی طرح سے جتاتے ہیں۔ آپ کا طرز کلام ہندی شعرا کا سا ہے۔ آپ کی زبان سادہ ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس لئے کلام کو آسانی سے سمجھنا مشکل ہے۔

حضرت شیخ وجیہ الدین احمد علوی متوفی ۱۵۸۹ء اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا انتقال احمد آباد میں ہوا ہے۔ آپ نے حضرت غوث گوالیاری سے روحانی فیض حاصل کیا۔ آپ کے مریدوں نے آپ کی باتوں کو ملفوظات کی شکل میں جمع کر کے کتابی شکل دی جس کا نام 'بحر الحقائق' ہے۔

اس صدی کی ایک اور اہم شخصیت شاہ برہان الدین جانم کی ہے۔ آپ نے ۱۵۹۸ء میں انتقال فرمایا۔ آپ حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ بڑے عالم اور صوفی شاعر گزرے ہیں، علوم ظاہری و باطنی میں آپ نے کمال حاصل کیا اور جنوبی ہند میں اپنی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کو عام کیا اور اپنی تصانیف کے ذریعہ فیض پہنچایا۔ تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ آپ نے تصوف کے فلسفہ وجود کو مرتب کر کے اسے ایک باقاعدہ شکل دی اور آب و آتش اور خاک و باد کے تعلق سے وجود کا مطالعہ کر کے اس کے چار مدارج واجب الوجود، ممکن الوجود، ممنوع الوجود اور عارف الوجود مقرر کیے۔ دوسرے یہ کہ تصوف و اخلاق اور شریعت و طریقت کو اپنی نظم و نثر کے ذریعہ پیش کیا۔ جانم نے سادہ اور سلیس زبان میں معرفت و سلوک کی تعلیم دی اور اپنی تصانیف کے ذریعہ نصیحت کی ہے۔ آپ سلسلہ چشتیہ کے ان بزرگوں میں ہیں جن کی تصانیف نے اپنے مریدوں اور معتقدین میں ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ جانم کی کتابوں میں مشہور و معروف یہ ہیں: ارشاد نامہ، وصیت الہادی، سکھ سہیلا، منفعت الایمان، حجت البقاء، بشارت الذکر اور عبرت آدم وغیرہ شعری تصانیف ہیں اور نثر میں معرفت القلوب، ہشت مسائل اور کلمۃ الحقائق قابل ذکر ہیں۔ جانم کی کلمۃ الحقائق کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے قدیم اردو کی اولین نثری کتاب مکمل حالت میں مانی جاتی ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں حضرت شیخ خوب محمد چشتی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کا سن وفات ۱۶۲۲ء ہے۔ آپ احمد آباد گجرات کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ صاحب تصنیف ہی نہیں بلکہ صاحب سخن بھی تھے۔ آپ کی ایک کتاب 'خوب ترنگ' ہے، جو دراصل ایک صوفیانہ مثنوی ہے اور ایک زمانہ تک بڑی مقبول رہی۔ برسوں بعد حضرت مخدوم عبدالحق ساوی نے اس کی شرح مفتاح التوحید کے نام سے لکھی۔

دوسرے بزرگ حضرت میراں جی خدانما ہیں جن کا انتقال ۱۶۶۳ء میں ہوا۔ آپ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سلسلہ کے ایک مشہور شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ آپ حیدر آباد میں پیدا ہوئے بعد میں بیجاپور آئے اور یہیں درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں مصروف ہوگئے۔ آپ اردو کے ان قدیم نثر نگاروں میں ہیں جن کی تصانیف نے اردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار مقرر کیا۔ آپ کی کتابوں میں رسالہ وجودیہ اور رسالہ مرغوب القلوب قابل ذکر ہیں۔ ان میں مسائل تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سلسلہ بہ سلسلہ اور درجہ بہ درجہ مختلف دور میں، مختلف علاقوں میں، مختلف اہل علوم و فنون کے ذریعہ ہوئی۔ اس میں جب ہم اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے ابتدائی نقوش و نمونے مختصر جملوں، فقروں کی شکل میں مختلف صوفیائے کرام کے ملفوظات میں ملتے ہیں، جنھیں اردو

نثر کی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان نثر پاروں میں اردو کی اولین نثر یا کتاب مختلف ادبی مورخین نے جن ناموں سے منسوب کیے ہیں، ان میں ایک نام حضرت سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ کا بھی ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے بڑے عظیم المرتبت صوفی بزرگ ہیں، آپ بڑے صاحب کشف وکرامات وکمالات تھے۔ ۲۳ سال کی عمر میں آپ نے سمنان کی بادشاہت چھوڑی اور ہندوستان آکر مختلف علماوصلحاوفقہا سے علوم ظاہری وباطنی میں اکتساب فیض کیا۔

داستان تاریخ اردو میں پروفیسر حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ نے ۷۰۸ھ میں اردو میں تصوف پر ایک رسالہ لکھا تھا جسے وہ اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیتے ہیں مگر بعد کے محققین نے اس پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ بہر حال حضرت کا یہ رسالہ اولین اردو نثر کا نمونہ ضرور ہے جواب نایاب ہے۔

اردو زبان وادب میں جدید دور کے وہ شعرا جن کا تعلق صوفیا کے سلسلہ سے براہ راست نہ تھا مگر انہیں صوفی شاعر مانا جاتا ہے، ان میں خواجہ میر درد دہلوی کا نام اہم ہے، درد کے والدین سادات سے تھے، والد کا نام خواجہ ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ درد نے والد سے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ اور موسیقی سے بھی آپ کو گہرا لگاؤ تھا۔ آپ نے ۲۹ سال کی عمر میں دنیا کو چھوڑ کر درویشی اختیار کی اور درویشانہ خیالات ہی ہمیں ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ آپ نے اخلاق اور انکساری کا درس دیا۔ آپ خود اس کے پیکر تھے۔

دوسرا اہم نام مرزا مظہر جان جاناں کا ہے۔ ۱۷۸۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ بڑے عالم وصوفی شاعر تھے۔ عربی فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ بڑے بڑے امرا ان کا احترام کرتے تھے۔ آپ کو شاعری کا بڑا اچھا ذوق حاصل تھا۔ صنائع کے حد درجہ استعمال سے گریز کرتے تھے۔ ابہام گوئی سے کلام کو پاک وصاف رکھتے تھے۔ آپ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اردو شاعری کو ابہام گوئی سے پاک کرنے میں مدد کی اور اسے فطری اظہار کا راستہ دکھایا۔ آپ کا کلام پراثر ہے۔

انیسویں صدی کے اہم شعرا میں ڈاکٹر محمد اقبال کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل اور بلند مرتبہ ہے۔ آپ نے اگر چہ صوفیا واولیائے کرام کی تاریخ ان کے ملفوظات اور کرامات وانکشافات سے متاثر ہو کر انہیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور جگہ جگہ معرفت وسلوک کے اسرار ورموز واضح کیے ہیں جس سے صوفیا کا ہی انداز سخن اور ان کا مقصد ومطلب ظاہر ہوتا ہے، مگر آپ کو صوفی شاعر نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ اگر چہ آپ ایک مرد مومن ہی نہیں بلکہ صاحب وجدان بھی ہیں اور صاحب ایمان وایقان بھی۔ معرفت الہی اور عشق محبوب الہی آپ کے دل ودماغ میں رچا بسا ہے۔ کلام نہایت پراثر اور عبرت آمیز ہے۔ جس میں اخلاقیات اور انسانی جذبۂ ہمدردی اور آدمیت اور مرد مومن کی حقیقی شناخت جسے وہ خودی کا نام دیتے ہیں اپنے کلام میں جابجا پیش کیا ہے۔

بہر حال اردو زبان وادب اور صوفیا میں ایک گہرا اور ناقابل فراموش تعلق ہے، جس کے بغیر اردو کی تاریخ نامکمل ہے۔ اسی طرح جدید دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تمام سلاسل کے بڑے اکابر اور بزرگان دین نے بھی اپنی تصانیف مجموعہ ہائے نعت وحمد ومناقب کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کی ہے۔

❁❁❁

''برصغیر ہند وپاک میں تصوف کا موضوع بہت ہی اہمیت کا حامل ہے، مگر مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ علمی حلقوں میں اس کی طرف ابھی تک اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کا یہ مستحق ہے اور اگر کچھ حلقوں میں دی بھی گئی ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ حضرت سید محمد جیلانی اشرف نے تصوف کا چراغ عالمی اور آفاقی سطح پر روشن کرنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم شعوری طور پر دور حاضر میں تصوف کی معنویت کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کریں بلکہ ایک جذبہ کے تحت اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ جو انشاء اللہ صحیح معنوں میں ہماری بقا اور روشن مستقبل کی باعث ہو سکتی ہے۔''

پروفیسر محمد اسحاق خاں

(بحوالہ: صوفی جرنل ۲۰۰۷ء، ص: ۲۷)

باب چہارم
اصحاب تصوف

امام غزالی کی حیات و خدمات

ڈاکٹر محمد شریف .... شعبہ سنی دینیات، اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تا کہ وہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر کے اس کی معرفت حاصل کرے۔لیکن اللہ کی ذات لامحدود ہے اور انسان کی ذات محدود ہے۔انسان اللہ کی پیدا کردہ مخلوق ہے۔اور ایک محدود انسان کی عقل وفہم ایک لامحدود ذات کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہے بلکہ اس لامحدود ذات کو سمجھنا ناممکن ہے۔اللہ نے اس کائنات میں اپنی معرفت کے لئے انبیائے کرام کے سلسلے کو جاری فرمایا۔اس سلسلے کی پہلی کڑی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو نبی بنایا اور پھر اپنا خلیفہ بنا کر اس کائنات میں بھیجا تا کہ وہ اللہ کی وحدانیت کو اس کائنات میں بتائیں۔یہیں سے نبوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور انسانی تخلیق کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب جب قوم گمراہیت کی طرف گئی اللہ تعالیٰ نے انبیا اور رسولوں کو ان مقامات پر مبعوث فرمایا جہاں جہاں قوم کو ہدایت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی یا جہاں جہاں قوم گمراہیت کے دلدل میں پھنس رہی تھی تا کہ نبی یا رسول اللہ کی وحدانیت اور معرفت الٰہی کو اس قوم کو بتائیں جو تاریکی کے دلدل میں پھنس چکی تھی۔

اور یہ نبوت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک چلتا رہا۔لیکن جب کوئی پودا لگایا جاتا ہے تو پہلے وہ بڑھتا ہے پھر اس پر پھل آتا ہے پھر پھل آنے کے بعد وہ پودا اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔اسی طرح سورج مشرق سے نکلتا ہے اور نصف النہار کے وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے اور پھر شام ہوتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔ٹھیک اسی طرح نبوت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہو گیا۔اب نہ ہی کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول جو خدا کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت کے بارے میں بتا کر بھٹکتی ہوئی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔نبوت کا سلسلہ بند ہونے کے بعد سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ ہر صدی میں عام انسانوں میں سے ہی ایک نہ ایک ایسا مومنِ کامل پیدا فرماتا ہے جس کے ذریعہ سے اللہ کو دین کی خدمت لینا مقصود ہوتی ہے۔پھر اس شخص کو اپنے فضلِ خاص سے نواز کر اس کے ذہن کو دین کی طرف راغب کرتا ہے اور اس کی عقل وفہم کو اس قدر کشادہ اور منور کر دیتا ہے کہ وہ شخص مختلف علوم وفنون میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور یکتا نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ اس عبقری شخص سے دین کی خدمت اور اشرف المخلوقات کی رہنمائی کا فریضہ انجام دلواتا ہے۔انہیں چنندہ لوگوں میں سے، جن کو اللہ تعالیٰ صرف دین اسلام کی خدمت کے لئے چن لیتا ہے، ایک ہمہ گیر شخصیت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے۔جن کی حالات زندگی اور خدمات کو یہاں مختصر انداز میں یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مکاتیب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ: حجۃ الاسلام امام محمد بن محمد الغزالی ان عدیم المثال مفکرین عالم میں سے ہیں جو بڑی مدت کے بعد پیدا ہوتے ہیں، جن کی نگاہیں باریک سے باریک حقیقت کو دیکھتی ہیں اور جن کی نظروں میں انسانی زندگی کے تمام انفرادی، اجتماعی نقوش پوری وضاحت وتفصیل کے ساتھ نمایاں رہتے ہیں۔نبض عالم پر ان کی انگلیاں ہوتی ہیں اور چہرۂ دنیا پر ان کی نگاہیں، مزاج صبح وشام ان پر روشن ہوتا ہے اور امراض نفسی کی کوئی صورت ان سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔

امام غزالی اپنی زندگی میں مختلف مدارج سے گزرے، شک و فریب کی شاید کوئی ایسی وادی نہ ہوگی جس سے ان کے فکر کو گزر نہ پڑا ہو، اور بے اطمینانی وانتشار کی کوئی گھاٹی نہ ہوگی جہاں ان کے ذہن نے چکر نہ لگایا ہو، لیکن بالآخر وہ یقین وعلم کے اسی مضبوط چٹان پر جا پہنچے جہاں سے مرغ زار حقیقت دکھائی دیتا ہے اور جہاں پہنچ کر

انسان پر خود انسانیت کے سربستہ راز کھل جاتے ہیں، جہاں علم کا آفتاب اپنی کرن نچھاور کرتا ہے اور جہاں تجربہ کا بادل موتی بکھیرتا ہے۔[۱] (مکاتیب امام غزالی، مترجم عبد الوہاب ظہوری، اشاعت ۱۹۶۰ء ناشر انٹرنیشنل پریس کراچی، ص: ۷۔۶)

نام ونسب اور ولادت:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا پورا نام محمد بن محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہے، کنیت ابو حامد اور لقب ''حجۃ الاسلام'' زین الدین الطوسی ہے۔ والد کا نام بھی محمد تھا۔ آپ فقیہہ بھی تھے، صوفی بھی، فقہاً شافعی تھے اور عقیدۃً اشعری۔[۲]

امام غزالی طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء کو طاہران میں پیدا ہوئے۔[۳]

تعلیم وتدریس:

آپ کے علم وفضل کی شہرت مشرق ومغرب تک پھیلی ہوئی ہے، اللہ نے آپ کو حسن تقریر سے نوازا، آپ کی تحریر میں فصاحت بھی ہے، سہولت بیان بھی، اور حسن اشارات بھی، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف علوم وفنون پر پوری دست رس حاصل تھی، علمی رسوخ میں وہ اپنے معاصرین پر ممتاز تھے، اللہ نے انہیں شرافت نفس، حسن کردار، استقامت، زہد، سادگی اور تواضع جیسی صفات عطا فرمائی تھیں۔[۴]

امام غزالی نے اپنے وطن میں شیخ احمد الرازکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر جرجان میں ابونصر اسماعیل سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جاکر امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقا میں جو ۴۰۰ کی تعداد میں تھے، ممتاز ہوگئے۔ اور اپنے نامور استاذ کے (معید) بن گئے۔[۵]

امام غزالی میں شروع ہی سے ایک متشککانہ رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ صوفیانہ ماحول میں رہنے سہنے اور صوفیانہ ریاضتوں میں حصہ لینے کے باوجود شروع میں ان پر تصوف کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کا رجحان نسبتاً دینی اور فقہی باریکیوں کی چھان بین کی طرف تھا جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی۔[۶]

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ ''امام الحرمین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالی بحر زخار ہے۔''[۷]

امام غزالی امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علما سے زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔[۸]

درس وتدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالی نظام الملک کے دربار میں پہنچے، نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز واکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں یہاں تک کہ تقریبات شادی وغمی کا ایک ضروری عنصر تھے، امام غزالی ان مباحث و مناظرے میں سب پر غالب رہتے تھے۔[۹]

امام غزالی ۴۸۴ھ میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور مدرسہ نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس، حسن تقریر اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبا وعلما نے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلائق بن گئی، تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امرا اور روسا اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر ورسوخ پیدا کرلیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے۔[۱۰]

اور بقول ایک معاصر شیخ عبد الفاخر فارسی کے کہ ان کے جاہ جلال کے سامنے امرا اور وزرا اور خود بارگاہ خلافت کی شان وشوکت ماند پڑ گئی۔[۱۱]

امام غزالی نے طاہران میں ۱۴/جمادی الآخر ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔[۱۲]

ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے ''دوشنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کرکے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا، آقا کا حکم سر آنکھوں پر، یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کرچکی تھی''۔[۱۳]

تعلیمات اور اس کے اثرات:

امام غزالی فلسفہ کو منظر عام پر لائے اور انہوں نے اس طلسم کو توڑ ڈالا جس کی بدولت اس نے ایک پر اسرار حیثیت اختیار کررکھی تھی۔ امام غزالی نے کہا کہ فلسفہ محض غور وفکر کا نام ہے اور فلسفیوں کے نظامات فکری ہر ذی فہم انسان کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔[۱۴]

مختصر یہ کہ فلسفے کے ایجابی پہلو میں امام غزالی نے القشیری کے کام کو جاری رکھا اور اسلام کے عقیدہ صحیحہ میں تصوف کی حیثیت زیادہ مستحکم کردی، اس طرح امام غزالی سے ''اسلامی الٰہیات'' کی نشو و نما کا دوسرا عظیم الشان دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۵

جس طرح کہ اشعری نے عقائد صحیحہ کی حمایت میں منطقی استدلال کو کام میں لاکر ''اسلامی الٰہیات'' کے پہلے دور کا آغاز کیا تھا۔ ۱۶

امام غزالی اس گزرے ہوئے زمانہ کو پر اشتیاق نظر سے دیکھتے ہیں جب مذہب میں سادگی تھی اور یہی چیز تھی جو انہیں اس طرف لے گئی کہ الٰہیات کا مطالعہ قرآن مجید اور حدیث کی بنا پر کریں، عملی طور پر ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بیدار کریں اور روز حساب کے قہر و غضب سے ڈرا کر انہیں پرانے راستوں پر چلنے کی تلقین کریں۔ خود امام غزالی کی تبدیلی خوف اور دہشت کا نتیجہ تھی۔ امام غزالی کا خدا کی محبت پر زور دینا، بظاہر عجیب نظر آتا ہے، مگر یہ خوف محبت کے اسی حسین امتزاج کا ایک حصہ تھا جو اولیاء اللہ کی جذباتی زندگی اور نظام فقہی میں، جس سے وہ واقف تھے، پایا جاتا ہے۔ ۱۷

خلوص نیت:

امام غزالی کے تبدیلی مسلک کے بارے میں اور تو اور خود امام غزالی کے معاصرین بھی ان کی تبدیلی مسلک کو استعجاب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ عام احساس یہ بھی تھا کہ ایک نزاع پسند اور متشکک فقیہ کا ایک ایسے ولی میں تبدیل ہوجانا جو صاحب وجد ہو اور حیثیت الٰہی کے بارے میں پند و وعظ بھی کرتا ہو ایک زبردست انقلاب ہے۔ ۱۸

فیضان محبت عام تو ہے عرفان محبت عام نہیں
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

امام غزالی کے مناقب:

شیخ جمال سنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مہمات'' میں امام غزالی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''وہ اپنے زمانے کے قطب ہیں۔ ان کا وجود ہر ذی وجود کے لئے باعث برکت ہے۔ ان سے صرف وہی لوگ حسد رکھتے ہیں جو زندیق و ملحد ہیں'' ۱۹

ملا علی قاری بیان کرتے ہیں کہ جب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو بخاری ان کے سینے پر رکھی ہوئی تھی، ابن عربی کہتے ہیں کہ لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ وہ محض فلسفی تھے۔ ان کی کتابیں خود اس غلط نظریے کی تردید کرتی ہیں۔ ۲۰

شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب ''مرج البحرین'' میں لکھتے ہیں کہ امام غزالی اوائل عمر میں فقہائے متکلمین کے طریقے پر تھے، لیکن آخر عمر میں پکے صوفی بن گئے تھے اور اس گروہ میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کیا۔ ۲۱

بعض ارباب کشف نے صحبت معنوی کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **ذلک رجل وصل المقصود** ۔ یہ وہ شخص ہے جو مقصود تک پہنچ گیا ہے۔ ۲۲

امام غزالی کے تلامذہ:

امام غزالی کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے، خود امام غزالی نے اپنے ایک خط میں یہ تعداد ایک ہزار بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے بعض تلامذہ نے بڑا نام پایا، جو آسمان علم کا آفتاب و مہتاب تھے۔ ۲۳

ذہنی کشمکش:

امام غزالی معرفت الٰہی کے کسب کے لئے اپنی زندگی میں ایسے ادوار سے گزرے ہیں جن میں رہ کر وہ شک و ریب کے شکار ہوئے جس کو وہ اپنی کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے سب چھوڑ چھاڑ کر بغداد کو الوداع کہا اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے شام آیا اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزلت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کا تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، کبھی مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا اور تمام دن دروازے بند کیے، وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ حجرہ کے اندر چلا جاتا اور تمام دروازے بند کر لیتا۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کے بعد طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا۔ چنانچہ میں حجاز گیا اور حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے

نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وطن میں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث وواقعات، اہل وعیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں۔ اور دل جمعی اور سکون قلب مسلسل نہیں رہتا تھا۔ لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا اور دس برس اسی حالت میں گزر گئے۔ ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا اس کی تفصیل اور اس کا استقصا تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیا ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں۔ ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلا کی عقل، حکما کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت واخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں۔ ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات وسکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں۔ اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔[۲۴]

خلوت سے جلوت کی طرف:

ممکن تھا کہ امام غزالی اسی خلوت وعزلت کی حالت میں رہ جاتے اور بقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون واطمینان میں گزار دیتے لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس وتدریس، تالیف وتصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلائق کو نفع ہو، الحاد وفلسفہ کی تردید اور عقلی وعملی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین ومشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا۔ عالم اسلام میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیا علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے۔[۲۵]

مذکورہ احساسات کو امام غزالی خود بیان کرتے ہیں اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیان تصوف کی گمراہی، بہت سے علما کی بے عملی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمائندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی، اہل شہر کی عادت کی پیروی اور اپنی حفاظت کے لئے، بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیوی نقصانات بتلاتے ہیں۔ اور اگر ان نقصانات سے بچا جا سکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور بہ آسانی اس پر قادر ہوں، میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہیے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت وعزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہیں اور اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی، چنانچہ میں نے چند اہل قلوب اور اہل مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انہوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترک عزلت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحا نے متواتر خواب بھی دیکھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر وبرکت کا باعث ہوگا اور پانچویں صدی کے شروع جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا۔ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ" اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایک ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے۔"[۲۶]

مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مشہور محدث اور فقیہ حافظ ابن عساکر رقم طراز ہیں کہ "پہلی صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں، دوسری صدی کے امام شافعی، تیسری صدی کے امام ابوالحسن اشعری، چوتھی صدی کے ابوبکر باقلانی اور پانچوی صدی کے ابوحامد غزالی ہیں"[۲۷]

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ ۴۹۹ھ کو امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا اور مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس وافادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالی کے درس وتدریس اور صلاح وارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ وارشاد میں فرق تھا۔ پہلے وہ نفس کے تقاضے اور

طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلہ کار سمجھتے تھے، چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں کہ "اگر چہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن در حقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے اور میں اپنے قول وعمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا اور یہی میرا مقصود ونیت تھا، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا لیکن اپنے یقین ومشاہدے کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے اور ہدایت وطاقت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ نے مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام شروع نہیں کیا ہے، اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے، پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس کے فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کر دے، اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔" ۲۸

امام غزالی کا تجدیدی کارنامہ:

"دعوت وعزیمت" کے مصنف حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: امام غزالی نے جو مجددانہ کام انجام دیا اسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔

(۲) زندگی ومعاشرت کا اسلامی واخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید واصلاح۔

فلسفہ پر عمل جراحی:

امام غزالی علیہ الرحمہ کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ الحاد یا باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کہا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی، اس وقت فلسفہ، اسلام پر حملہ آور تھا اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا، اسی وقت تک متکلمین وعلمائے اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، فلسفہ جن "مفروضات" پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی عملی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا، امام غزالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ کا تفصیلی وتنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقے پر منطق، الٰہیات اور طبعیات کا خلاصہ پیش کیا اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ لکھ دیا کہ "ریاضیات میں قیل وقال کی گنجائش نہیں اور دین کا اس سے نفیاً واثباتاً کوئی تعلق نہیں لیکن اصل مذہب کا تصادم الٰہیات سے ہے، منطقیات میں بھی شاذ و نادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبعیات میں ضرور حق و باطل کی امیزش ہے، اس لئے اس کا موضوع بحث دراصل الٰہیات اور کسی قدر طبعیات ہے، منطق محض تمہید واصطلاحات کے لئے" ۲۹

امام غزالی نے اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی، اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس کی خاطر امام غزالی نے "مقاصد الفلاسفہ" لکھی تھی، اس کتاب میں امام غزالی علیہ الرحمہ نے فلسفہ کے الٰہیات وطبعیات پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض واختلاف کو پوری جرأت وقوت کے ساتھ ظاہر کیا۔ ۳۰

اس کتاب میں ان کا لہجہ پر از اعتماد، ان کی زبان طاقتور اور شگفتہ ہے کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرز بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلے میں احساس کمتری کے ہر شائبہ سے پاک، اعتماد و یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل مرعوب نہیں ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی

صف اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے، اور ان سے مساویانہ وحریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تہافت الفلاسفہ'' میں یہی خدمات انجام دی ہیں۔ ۳۱

کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں: '' ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل ودماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام وقیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سقراط و بقراط، افلاطون وارسطو کے پرہیبت نام سنے اور ان کی شان میں ان کے مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیات، منطقیات، طبعیات والٰہیات میں انہوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل وذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے اور ان کے نزدیک ان کے اصول وقواعد فرضی ومصنوعی ہیں، بس انہوں نے بھی تقلیداً انکارِ مذہب کو اپنا شعار بنالیا اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلا وحکما کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکمائے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال ونظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔'' ۳۲

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقۂ تحریر اور شوخ ہوجاتا ہے اور ذات وصفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول وافلاک کا پورا شجرۂ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں کہ: ''تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور تحکمات ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے تو اس کے سوئے مزاج کی دلیل ہوگی۔'' ۳۳

آگے چل کر لکھتے ہیں: '' مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ باتوں پر کیسے قانع ہوسکتا ہے، چہ جائیکہ وہ عقلا جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔'' ۳۴

تہافت الفلاسفہ کے اثرات:

تاریخ دعوت وعزیمت کے مصنف لکھتے ہیں کہ فلسفے پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا، جس کا سہرا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے......

فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلے کا آغاز امام غزالی ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔ ''تہافت الفلاسفہ'' نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی اور اس کی عظمت، ذہنی تقدس کو کافی نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم وغصہ پیدا کردیا، مگر ۱۰۰ برس تک اس کے جواب میں کوئی شایان شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرجوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بدوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے ''تہافت التہافت'' کے نام سے اس کا جواب لکھا، علمائے مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہوجاتا تو فلسفہ غزالی کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو ۱۰۰ برس تک کے لئے پھر زندگی عطا کردی۔ ۳۵

باطنیت پر حملہ:

مولانا ابوالحسن مزید لکھتے ہیں کہ فلسفہ کے علاوہ امام غزالی نے فتنہ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی، انہوں نے قیام بغداد اور مدرسۂ نظامیہ کی تدریس کے زمانے میں باطنیوں کی تردید میں خلیفۂ وقت کے اشارہ سے ''المستظہری'' تالیف کی تھی، جس کا تذکرہ امام غزالی نے اپنی خود نوشت تلاش حق کی کہانی ''المنقذ من الضلال'' میں کیا ہے، اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں ''حجۃ الحق''، ''مفصل الخلاف''، ''قاصم الباطنیہ'' ۳۶

امام غزالی کی تصنیفات کی فہرست میں اسی موضوع پر دو کتابیں ''فضائح الاباحیہ'' اور ''مواہم الباطنیۃ'' اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ وتصوف اور ظاہری علوم اور حقائق ومعارف دونوں کوچوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے ہیں، باطنیہ کا بڑا حربہ فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالی جیسا جامع شخص اور

عقلیات کا مبصران کی تردید کا کام کرسکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انہوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔ ۳۷

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ:

امام غزالی علیہ الرحمہ کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح وتجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف ''احیاء علوم الدین'' ہے۔ احیاء علوم الدین کے مترجم مولانا ندیم الواجدی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ کتاب تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اواسرار شریعت کا حسین مجموعہ اور ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا ہے۔'' تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں ''احیاء علوم الدین'' کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

حافظ زین الدین العراقی صاحب ''الفیہ'' (م ۸۰۶ھ) جنہوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے لکھتے ہیں کہ ''امام غزالی کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات میں سے ہے۔ ۳۸

عبدالغافر فارسی جو امام غزالی کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ ''احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی'' ۳۹

شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا کہ ''اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو میں ''احیاء العلوم'' سے ان کو دوبارہ زندہ کردوں گا۔ ۴۰

حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ ''منہاج القاصدین'' کے نام سے لکھا۔ ۴۱

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انہوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کامیابی پر ختم ہوا ''احیاء العلوم'' اس سفر کی سوغات تھی جو امام غزالی اہل وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔ ۴۲

مولانا شبلی نے ''الغزالی'' میں لکھا ہے کہ:

بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی، آخر تصوف کے طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس تھا۔ امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدراہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت، مناظرات، ومجادلات، اور پھر تزکیۂ نفس شتان بینهما ع

ایں رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑ کر ایک کملی پہن کر بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی، سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن ع

بیاد آر حریفاں بادہ پیمارا

کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، امیر و غریب، عام و خاص، عالم و جاہل اور رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علما جو دلیل راہ بن سکتے تھے طلب جاہ میں مصروف ہیں، امام غزالی یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھالیا ہے اور سعادت اخروی کی راہیں بند ہوگئی ہیں، علما جو دلیل راہ تھے زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ ہے)، وعظ (جس میں عوام کے دلفریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کیے جاتے ہیں)، فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہوگیا ہے اور لوگ ان کو بھول بھلا چکے یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی۔'' ۴۳

تنقید و احتساب:

مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ ''احیاء العلوم'' کے تالیف سے جو

اصلاح وتربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی اس کے لئے آمادگی، شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضہ پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرے میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم وحقائق کس طرح تبدیل ہوگئے ہیں، لوگ حقائق ومقاصد سے ہٹ کر ظواہر واشکال اور سوم میں کس طرح گرفتار ہیں اور مقصد اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی سے کس طرح غافل ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے زمانے کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا اور اس کی بے لاگ تنقید کی اور ہر طبقے کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل وآلات میں فرق کیا، علوم میں، دینوی علوم اور علوم دینی اور پھر علوم محمودہ اور علوم مذموم فرض عین اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیا کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین وحکام پر جرأت کے ساتھ تنقید کی اور ان کے جبر وظلم، خلاف شرع اعمال وقوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالف دین رسوم وبدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل ومدلل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض واسباب اوران کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔ ۴۴

علوم دنیوی کی اہمیت امام غزالی کی نظر میں:

''قرآن سے ستاروں تک'' کے مصنف محمد عبداللہ دہلوی، امام غزالی کی نظر میں علوم دنیوی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک دینی اور دوسری دنیوی۔ اس کے بعد دونوں میں سے کچھ کچھ مقدار فرض کفایہ قرار دی ہے''۔ ۴۵

امام غزالی علم دنیا کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''ہر وہ علم فرض کفایہ میں آتا ہے جس کے بغیر دنیاوی معاملات کی تکمیل میں چارہ نہ ہو۔ جیسے علم طب یا ڈاکٹری، اس لئے کہ بدن انسانی کی بقا کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے اور جیسے حساب کیونکہ دنیوی معالات میں بھی اس کی ضرورت ہے اور خاص طور پر میراث کی تقسیم میں بھی ضروری ہے۔'' ۴۶

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''ہماری اس بات پر کوئی تعجب نہ کرے کہ طب اور حساب کو بھی فرض کفایہ میں شامل کر رہے ہیں۔ کیونکہ صنعت اور دستکاری کے فنون بھی فرض کفایہ ہی ہیں جیسے کاشتکاری، جولاہہ پن، سائیسی، بلکہ سنگی لگانا اور درزی گیری وغیرہ بھی فرض کفایہ ہیں۔'' ۴۷

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''کتنے شہر کے شہر ایسے ہیں جن میں سوائے غیر مسلموں کے کوئی طبیب یا ڈاکٹر نہیں ملتا حالانکہ فقہ کے بہت ان احکام میں جن میں ڈاکٹر کے قول پر اعتماد ہے غیر مسلم کی شہادت معتبر نہیں ہے''۔ ۴۸

یہاں کوئی دو چار خاص علوم کی بحث نہیں ہے بلکہ جس زمانہ میں بھی جن علوم سے دنیا کا نظم ونسق متعلق ہو وہ تمام علوم وفنون ضروری اور فرض کفایہ قرار پائیں گے۔ ۴۹ چنانچہ جنگی اسلحہ اور قوت وطاقت کے متعلق تو قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے کہ:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل

ترجمہ: اور تیار رکھو ان کے لئے جتنی استطاعت رکھتے ہو، قوت وطاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے۔ (سورہ انفال، آیت نمبر: ۶۰)

محمد عبداللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا سامان جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش کرنا وغیرہ وغیرہ سب سامان جہاد ہے'' ۵۰

یہ ساز وسامان ہر ہر نوع کا اتنی وافر مقدار میں ہونا چاہئے کہ:

ترهبون به عدوّ الله و عدوّكم (سورہ انفال، آیت نمبر: ۶۰)

ترجمہ: ''تاکہ تم خوفزدہ کردو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن

کو" (ترجمہ تفسیر ضیاء القرآن۔ صفحہ ۱۶۱۔ جلد۔ ۱)

مذکورہ بحث سے ثابت ہوا کہ ہر وہ علم وفن، صنعت وحرفت جس کی دنیا کے انتظام میں ضرورت ہو خواہ جدید ہو یا قدیم امام غزالی کے فرمان کے مطابق ضروری اور فرض کفایہ ہوگی اور اس کا حاصل کرنا باعث اجر وثواب ہوگا۔ ۵۱

لیکن دو لازمی شرطیں ہمیشہ زندگی کے ہر مرحلہ میں پیش نظر رہیں گی۔

(۱) ہر چیز کا استعمال اور علم وفن میں اشتغال، شریعت کے مقرر کردہ قوانین اور اصول کے مطابق ہوگا اور حدودِ شریعت سے باہر قدم رکھنا جائز نہ ہوگا۔

(۲) دوسرے تمام چیزیں اسباب ووسائل ہیں اور انہیں رسائل ہی کے مقام پر رکھا جائے گا۔ مقاصد کے مقام پر نہیں لایا جائے گا۔ ۵۲

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ:

"ترک اعداء اور اختیار تقوی کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کی طیبات سے مومن مستفید ہوسکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقیات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔" ۵۳

حکام وسلاطین:

امام غزالی نے صرف تحریر وتصنیف پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انہوں نے کلمہ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا سلطان سنجر پورے خراسان کا فرماں روا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ:

"افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑے کی گردنیں طوقہائے زری کے ہارسے" ۔ ۵۴

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوف خدا اور اصلاح ملکی کی طرف متوجہ کیا۔ ۵۵

تصنیفات:

امام غزالی کی تصانیف بھی بے شمار ہیں، اگر چہ انہوں نے ۵۵/۵۴ برس کی عمر پائی، تقریباً بیس برس کی عمر کے بعد تصنیف وتالیف کا آغاز کیا، اس دوران بہت سے ماہ وسال سیاحت میں گزرے، درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رہا، طالبان حق اور سالکان طریقت کی تربیت میں بھی مشغو ل رہے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود اتنی بہت سی تصانیف یادگار چھوڑنا حیرت انگیز ہے، مسلمان مؤرخین نے امام غزالی کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد ننانوے بیان کی ہے۔ اور مغربی مؤرخین نے اٹھہتر۔ ۵۶

مولانا تقدس علی خاں صاحب نے مکاشفۃ القلوب کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ادیب شہیر جناب علامہ شمس بریلوی نے حجۃ الاسلام امام غزالی کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"امام صاحب نے خود اپنے ایک مکتوب میں جو انہوں نے ۴۵ سال کی عمر میں لکھا تھا، اس سلسلہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ: "میں نے علوم دین میں تقریباً ۷۰ کتابیں لکھی ہیں۔" اس حوالہ میں صرف علوم دین پر لکھی جانے والی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، جدل وخلاف اور رد فلاسفہ پر، جو امام صاحب کا پسندیدہ موضوع تھا لکھی جانے والی کتابوں کا امام صاحب نے شمار نہیں کیا ہے۔ امام صاحب کے بعض سوانح نگار حضرات آپ کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۲۰۰ بتاتے ہیں" ۔ ۵۷

لہذا امام غزالی کی چند اہم تصانیف کا یہاں تعارف کرایا جارہا ہے جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام غزالی نے تصانیف کے ذریعہ سے کس قدر اہم خدمات انجام دی ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالی کی تصنیفات کی تعداد مختلف علما نے اپنی اپنی تصنیفات میں جو کچھ بتائی ہے ان میں سے چند اہم کتابوں کو درج کیا جارہا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ نے آپ کی تصنیفات کے متعلق لکھا ہے:

(۱) احیاء علوم الدین: یہ ان کے تمام نظام فلسفہ کے خلاصہ کی حیثیت سے منفرد ہے یہ اور بات ہے کہ فلسفے یا کلام یا تصوف کی آخری تفصیلات اس کتاب میں ہے کہیں زیر بحث نہیں آئیں۔ احیاء دو حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ دو ربعوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ عبادت کے ظواہر اور مذہبی رسوم سے متعلق ہے اور دوسرے میں زندگی کے باطنی پہلو، قلب اور اس کے اعمال خیر وشر سے بحث کی گئی ہے۔ چاروں ربع یہ ہیں: (۱) ربع العبادات (بندے کے اعمال اپنے رب کی جانب)۔ (۲) ربع العادات (عادت واطوار سے متعلق)۔ (۳) ربع المہلکات (زندگی کے تباہ کن امور)۔ (۴) ربع المنجیات (نجات دہندہ امور)۔ ہر ربع میں

دس کتب ہیں، ان چالیس کتب میں سے پہلی کا موضوع علم ہے، دوسری کا کلام اور آخری کا مسائل معاد۔ اس کے علاوہ پوری کتاب امام موصوف کی ذاتی واردات، روایات اور عملی ہدایات پر مشتمل ہے۔

(۲) مقاصد الفلسفہ: اس میں قطعی طور سے ثبوت پر ہر مباحث کے علاوہ ہر بحث پر فلاسفہ کی تعلیمات کا بیان ہے جس کو ایک حکایت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(۳) تہافت الفلاسفہ: اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ فلاسفہ کے پاس اپنے نظام کا کوئی عقلی ثبوت نہیں ہے۔

(۴) المضنون به علی غیر اهله: اس کتاب میں معرفتِ ربوبیت، معرفتِ ملائکہ، حقائق معجزات اور معرفتِ معاد و آخرت پر بحث کی گئی ہے۔

(۵) مشکوٰۃ الانوار: اس میں اللہ بحیثیت نور کا صوفیانہ مفہوم اور نور باطنی کی اللہ تک رہنمائی کی بحث ہے۔ یہ کتاب امام غزالی کے آخری دنوں کی تصنیف ہے۔

(۶) جواہر القرآن: اس کتاب میں علوم القرآن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۷) الحکمة فی مخلوقات الله: اس میں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی آفرینش میں حکمت بتائی گئی ہے۔

(۸) الرسالة اللدنیه: یہ کتاب اس علم کے بیان میں ہے جس کا فیضان براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے۔

(۹) هدایة الهدایه: یہ کتاب اسلامی آداب کا مجموعہ ہے۔

(۱۰) التشجیر فی علم التعبیر: یہ کتاب تعبیر رویاء کے اصولوں سے متعلق ہے۔ [۵۸]

تاریخ دعوت عزیمت کے مصنف نے آپ کی تصنیفات کے متعلق لکھا ہے:

(۱۱) المنقذ من الضلال: یہ امام غزالی کی خود نوشت ہے جس میں تلاش حق کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ [۵۹]

(۱۲) مستظهری: یہ کتاب امام غزالی نے باطنیہ کے رد میں لکھی تھی یہ کتاب خلیفہ مستظہر کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس کتاب کا نام بھی خلیفہ کی نسبت سے رکھا۔ [۶۰]

(۱۳) المستصفیٰ: امام غزالی نے یہ کتاب انتقال سے ایک سال پہلے لکھی تھی جو اصول فقہ کے ارکان ثلثہ میں شمار کی جاتی ہے۔ اور یہ کتاب امام غزالی کی آخری تصنیف ہے۔ [۶۱]

(۱۴) مکاشفة القلوب: یہ کتاب تزکیۂ نفس اور حسن معاشرت پر ایک عظیم اصلاحی شاہکار ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ حضرت علامہ تقدس علی خان نے کیا ہے اور یہ کتاب ہندوستان میں کتب خانہ ''رضوی کتاب گھر'' سے شائع ہو چکی ہے۔

(۱۵) کیمیائے سعادت: یہ کتاب فارسی زبان میں بالکل احیاء العلوم کے ارکان و ابواب و فصول کے عنوانات کی تقسیم و ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یعنی یہ بھی چار ارکان مقدسہ پر منقسم ہے اور ہر رکن دس ابواب پر مشتمل ہے۔ وہ چار ارکان یہ ہیں۔ رکن اول عبادات، رکن دوم معاملات، رکن سوم مہلکات اور رکن چہارم منجیات۔ [۶۲]

(۱۶) الوجیز: فقہ میں عرب ممالک میں یہ کتاب سب سے اہم سمجھی جاتی ہے اور اس کی متعدد علما نے شروحات لکھی ہیں۔ [۶۳]

حوالے

۱۔ مکاتیب امام غزالی، مترجم عبد الوہاب ظہوری، اشاعت ۱۹۶۰ء، ناشر انٹرنیشنل پریس کراچی ص: ۷۔۶

۲۔ احیاء العلوم۔ مترجم مولانا ندیم الواجدی۔ ناشر دار الکتاب دیوبند ص: ۱۶ جلد۔۱

۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ابوالحسن علی ندوی ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۰۔ ج: ۱

۴۔ احیاء العلوم ص: ۱۶ جلد۔۱

۵۔ تاریخ دعوت و عزیمت ص: ۱۳۰ جلد۔۱

۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ دانشگاہ پنجاب لاہور۔ اشاعت ۲۰۰۱ء۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ صفحہ ۴۸۲ جلد ۱۴/۲

۷۔ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ ۱۳۰

۸۔ نفس مصدر صفحہ ۱۳۰

۹۔ نفس مصدر صفحہ ۱۳۰/۱۳۱

۱۰۔ طبقات الشافعیہ الکبریٰ، صفحہ ۱۰۷، جلد ۴ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۱۳۱، جلد۔۱

۱۱۔ نفس مصدر، صفحہ ۱۰۷، جلد۔۴ بحوالہ نفس مصدر، صفحہ ۱۳۱ جلد۔۱

۱۲۔ تاریخ و دعوت و عزیمت، صفحہ ۱۸۹۔ جلد ۱

۱۳۔ اتحاف السادۃ المتقین، ص: ۱۱ تا ۱۲، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت،

ص:۱۹۰، ج:۱

۱۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔صفحہ۴۸۴۔جلد۱۴/۲

۱۵۔ نفس مصدر۔صفحہ۴۸۴۔جلد۱۴/۲

۱۶۔ نفس مصدر۔صفحہ۴۸۴۔جلد۔۱۴/۲

۱۷۔ نفس مصدر۔صفحہ۴۸۵۔جلد۔۱۴/۲

۱۸۔ نفس مصدر صفحہ۴۸۵۔جلد۔۱۴/۲

۱۹۔ احیاء العلوم۔مترجم مولانا ندیم الواجدی، ناشر دارالکتاب دیوبند۔صفحہ ۱۸۔جلد۔۱

۲۰۔ نفس مصدر صفحہ۱۹ جلد۔۱

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ۱۳۶ تا ۱۳۷

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً ص:۱۳۸ تا ۱۳۹، ج:۱

۲۷۔ احیاء العلوم ص:۱۷ تا ۱۸، ج:۱

۲۸۔ المنقذ من الضلال ص:۲۸ تا ۳۰ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت، ص:۱۴۰ تا ۱۴۱، ج:۱

۲۹۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۱ تا ۱۴۲، ج:۱

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً ص:۱۴۲، ج:۱

۳۲۔ تہافت الفلاسفہ۔صفحہ۲ تا ۳۔بحوالہ دعوت وعزیمت صفحہ۱۴۲ تا ۱۴۳

۳۳۔ ایضاً صفحہ۲۹ تا ۳۰ بحوالہ ایضاً صفحہ۱۴۳

(۳۴۔ایضاً صفحہ۳۳ بحوالہ ایضاً صفحہ۱۴۳)

۳۵۔ تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب۔محمد لفطی جمہ، صفحہ۲۷، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ۱۴۵

۳۶۔ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے ''جواہر القرآن'' میں کیا ہے، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۶، جلد۔۱

۳۷۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۵ تا ۱۴۶۔جلد۔۱

۳۸۔ تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء، شیخ عبدالقادر الحسنی۔بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۷۔جلد۔۱

۳۹۔ نفس مصدر، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۷۔جلد۔۱

۴۰۔ نفس مصدر، بحوالہ نفس مصدر، صفحہ۱۴۷۔جلد۔۱

۴۱۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۷۔جلد۱

۴۲۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۷۔جلد۱

۴۳۔ الغزالی مصنف علامہ شبلی نعمانی، اشاعت ۱۹۰۱، ناشر فرید بک ڈپو لمیٹیڈ، صفحہ ۶۳ تا ۶۴

۴۴۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۴۸ تا ۱۴۹۔جلد۔۱

۴۵۔ قرآن سے ستاروں تک۔مصنف محمد عبداللہ دہلوی، اشاعت ۱۹۷۰، صفحہ ۱۹۰۔ناشر مکتبہ نور دہلی

۴۶۔ نفس مصدر، صفحہ۱۹۰

۴۷۔ ماخوذ از ''الغزالی'' مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی، صفحہ ۱۸۵، بحوالہ قرآن سے ستاروں تک، صفحہ۱۹۱

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ قرآن سے ستاروں تک، صفحہ۱۹۱

۵۰۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، صفحہ ۲۳۸۔سورہ انفال۔بحوالہ قرآن سے ستاروں تک، صفحہ۱۹۲

۵۱۔ قرآن سے ستاروں تک، صفحہ۱۹۲

۵۲۔ نفس مصدر، صفحہ۱۹۲ تا ۱۹۳

۵۳۔ حواشی مولانا شبیر احمد عثمانی، صفحہ ۱۰۷۔سورہ مائدہ ۸۸۔بحوالہ قرآن سے ستاروں تک، صفحہ۱۹۳

۵۴۔ مکتوبات امام غزالی، صفحہ۱۹، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ۱۶۰ تا ۱۶۱

۵۵۔ یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے اور ''نصیحت الملوک'' کے نام سے موسوم ہے، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ۱۶۱

۵۶۔ احیاء العلوم، صفحہ۱۹۔جلد۔۱

۵۷۔ مکاشفۃ القلوب: مترجم، حضرت علامہ تقدس علی خاں، اشاعت ۱۹۸۷ء، ناشر رضوی کتاب، ص:۳۵ تا ۳۶

۵۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، صفحہ۴۸۶ تا ۴۸۸ مختصراً جلد ۱۴/۲

۵۹۔ تاریخ دعوت عزیمت، صفحہ۱۳۶، جلد۔۱

۶۰۔ نفس مصدر، صفحہ۱۳۱، جلد۔۱

۶۱۔ نفس مصدر، صفحہ۱۸۹، جلد۔۱

۶۲۔ مکاشفۃ القلوب۔مترجم حضرت علامہ تقدس علی خان (نے جو اردو ترجمہ کیا ہے اس کے مقدمہ میں ادیب شہیر جناب علامہ شمس بریلوی نے جو کیمیائے سعادت کا تعارف کرایا ہے یہ اسی سے ماخوذ ہے)، اشاعت ۱۹۸۷ء، ناشر رضوی کتاب گھر صفحہ۳۷ تا ۳۸

۶۳۔ احیاء العلوم، صفحہ۲۱، جلد۔۱

❁❁❁

سیرت غوث اعظم ایک نظر میں

مولانا شاہ ہلال احمد قادری .... خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ

رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرت
کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانی کی

حضرت پیرانِ پیر کا اسم مبارک عبد القادر، لقب محی الدین، کنیت ابو محمد تھی۔ عوام وخواص میں آپ کی شہرت پیران پیر، غوث اعظم وغوث الثقلین کے القاب سے ہے۔ ولادت گیلان کے ایک گاؤں میں ۴۷۰ھ میں ہوئی۔ والد ماجد حضرت سیدنا ابو صالح موسیٰ اور والدہ ماجدہ حضرت سیدہ فاطمہ ام الخیر کی تربیت میں بچپن گزرا۔ والد ماجد نسباً حسنی تھے تو والدہ مکرمہ حسینی النسب تھیں اور مشہور شیخ وقت حضرت عبد اللہ صومعی کی صاحبزادی تھیں۔ اس طرح حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی ذات میں قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی جہتیں جمع ہوگئی تھیں اور تو جہات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مورد ومرکز تھے۔ آپ کا گھر انوار و برکات کا مرکز تھا اور کیوں نہ ہوتا، والد ماجد بڑے عالم وفاضل اور ولی کامل تھے، زہد وتقویٰ ان کا بے مثل تھا، خوف آخرت اور خشیت الٰہی ہر وقت غالب رہتی، والدۂ ماجدہ اپنے وقت کی رابعہ بصریہ تھیں، عفت وطہارت اور ذوق عبادت میں وہ ایسی بلند مرتبہ خاتون تھیں کہ خواتینِ امت میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ایسے مثالی والدین کی تربیت اور نورانی گھر کے ماحول میں سیدنا غوث اعظم اخلاق نبوی سے مزین اور صلاح وتقویٰ کے پیکرِ جمیل بن گئے۔

سترہ سال کی عمر تک گھر ہی پر اپنے والد گرامی سے علوم ظاہری وباطنی حاصل کرتے رہے، والد کی وفات کے بعد حصول علم کے شوق میں بغداد تشریف لائے اور ان کے بعد ائمہ فن اور یکتائے روزگار علما سے جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی، تعلیم باطنی جو باقی رہ گئی تھی وہ حضرت شیخ حماد باس اور حضرت شیخ ابو سعید مبارک مخزومی قدس سرہما کی صحبت میں رہ کر مکمل فرمائی، لیکن نسبت ارادت آپ کو براہ راست حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اور انوار وفیوض براہ راست نازل ہوتے تھے۔

مؤرخین اور تذکرہ نگار آپ کے علم وفضل اور ولایت ومعرفت کے ذکر میں رطب اللسان ہیں۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ آپ کی ذات گرامی مرجع خلائق تھی۔ علمائے عراق آپ سے علمی استفادہ کرتے، آپ کے تبحر علمی کا عرب وعجم میں غلغلہ تھا، دور دور سے آپ کے پاس فتاوے آتے، آپ سوال ملاحظہ فرماتے اور برجستہ جواب لکھواتے، حافظہ غیر معمولی، مطالعہ وسیع اور نظر عمیق تھی، مسائل ہر وقت مستحضر رہتے، مسائل کا جواب دینے میں کبھی کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی، ہر جواب اتنا مدلل اور مکمل ہوتا کہ علما حیران رہ جاتے، علم وتحقیق میں آپ کو مجتہد کا درجہ حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود سلفِ صالحین کی اتباع وتقلید اختیار فرمائی، زیادہ تر فقہ حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے۔

یہی حال عرفان وولایت میں آپ کے علوِ مرتبت کا تھا، شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل کے بعد اللہ نے آپ کی قطبیت وولایت کو لوگوں پر ظاہر کر دیا اور عوام وخواص کے دلوں میں آپ کی عظمت ڈال دی، عرب وعجم میں آپ کو ایسی مقبولیت ومرجعیت حاصل ہوئی کہ آسمان وزمین آپ کے شہرہ وآوازہ سے گونج اٹھے، سلسلۂ سہروردیہ کے سرخیل شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر وسہروردی، جو حضور غوث الاعظم کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے، فرماتے ہیں کہ شیخ عبد القادر سلطان الطریقہ تھے، تصرفات وخوارق عادات کے اظہار میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا اور آپ متصرف فی الوجود تھے۔ امام عبد اللہ یافعی نے خلاصۃ المفاخر کے نام سے آپ کی کرامات وتصرفات کو جمع کیا ہے۔

جب ہزاروں عارفین وصدیقین کے مجمع میں برسر منبر حضرت

نے اعلان فرمایا کہ قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ، میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے تو تمام عارفین نے اپنے اپنے سروں کو جھکا لیا۔ یہاں تک کہ تذکرہ نگاروں کی روایت کے مطابق جو اولیاء اللہ جس خطے اور جس علاقے میں جہاں پر تھے وہیں اپنا سر جھکا دیا۔ کسی عارف کو آپ کے اس ارشاد کی صداقت میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہوا کیونکہ سب جانتے تھے کہ آپ قطبیت کبریٰ اور ولایتِ عظمٰی کے منصب پر فائز ہیں اور اپنے تمام اقوال وافعال میں حکم الٰہی کے پابند ہیں۔

مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہ سے کرامتوں کا صدور بکثرت ہوا، آپ کی کرامتیں حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ یعنی اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے آپ کی کرامتیں بیان کی ہیں کہ ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، کرامت ولایت کی دلیل نہیں ہے، لیکن حضور غوث الاعظم کی کرامتیں حضرت کی دلیل ہیں، کیونکہ آپ اظہار کرامت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے۔

آپ کی ذاتِ گرامی خلق نبوی کا مکمل نمونہ تھی۔ آپ تمام تر جلالت علمی اور قدر و منزلت کے باوجود ایسے خلیق اور متواضع تھے کہ راہ چلتے ہوئے کوئی بچی بھی آپ کو روکتی تو رک جاتے، اس کی بات سنتے اور اس کا کام کر دیتے۔ غریبوں اور فقیروں کے پاس بیٹھتے، امرا وحکام کے دروازے پر کبھی نہیں گئے، طلبا اور مہمانوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرتے۔ آپ کے سامنے اگر کوئی شخص قسم کھاتا تو اس کے جھوٹ سے واقف ہونے کے باوجود اس کی بات مان لیتے، بڑے خوش گفتار، خوش خلق اور خندہ رو تھے۔ جو آپ کے پاس بیٹھ جاتا آپ کی شیریں بیانی سے خوش اور محظوظ ہو کے اٹھتا۔

ایک معاصر بزرگ کا بیان ہے کہ "میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر سے بڑھ کر کوئی خوش خلق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب، محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ اپنی عظمت و علو مرتبت اور وسعتِ علم کے باوجود چھوٹوں کی رعایت فرماتے، بڑوں کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ تواضع اور انکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی سربرآوردہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازے پر گئے۔

غریبوں اور ناداروں کی آپ کو بڑی فکر رہتی، ان کی مدد کرتے رہتے، فرماتے تھے کہ اگر ساری دنیا کی دولت میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں، سائل کو کبھی واپس نہ کرتے، خواہ جسم کا کپڑا اتار کر کیوں نہ دینا پڑتا۔

عشق الٰہی آپ پر غالب تھا اور اس غلبۂ عشق میں پچیس برس تک صحراء عراق میں سرگرداں رہے، اس عرصے میں کسی انسان کی شکل نہیں دیکھی، آپ خود فرماتے ہیں کہ میرے پاس رجال الغیب اور جنوں کی جماعتیں آتی تھیں اور میں ان کو طریقِ حق کی تعلیم دیتا تھا، وہیں آپ کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی، انہوں نے آپ کو بغداد میں قیام کرنے کی تلقین کی۔ آپ نے ان کے مشوروں پر عمل کیا اور بغداد میں مستقلاً قیام اختیار فرمایا۔

حضور غوث پاک جس وقت گیلان سے بغداد تشریف لائے اس وقت خلافت عباسیہ کا آفتاب لب بام تھا، حکومت سمٹ کر بغداد میں محصور ہو گئی تھی۔ عالم اسلام کا حال یہ تھا کہ وحدت ملّی پارہ پارہ ہو کر چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گئی تھی۔ بغداد میں چند فقرا تھے جو کبھی کبھی مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کوشش کرتے تھے، لیکن مادّیت کا ایسا غلبہ تھا کہ ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی۔ حضرت غوث اعظم نے مادیت کے سیل رواں کو اپنی زبردست روحانی و اخلاقی قوتوں سے روکا، بغداد میں آپ کی قائم کردہ علمی و روحانی درس گاہ سے چالیس سال تک علوم و معارف کا چشمہ جاری رہا۔ گرچہ علومِ دینیہ کی آپ نے خوب اشاعت فرمائی۔ آپ کے تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ حلقۂ درس بہت وسیع تھا لیکن آپ کا اصل کارنامہ نفوس انسانی کی تہذیب و اصلاح اور مردہ دلوں کی مسیحائی تھی۔ رشد وہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ حضرت کے مواعظ تھے۔ آپ کی مجلسِ وعظ میں سامعین کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ آپ کے مواعظ میں بجلی کا اثر تھا، ہر مجلس وعظ میں سینکڑوں فاسق وفاجر تائب ہوتے، کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی بڑی بڑی جماعتیں قبول ایمان سے مشرف ہوتیں، آپ کی زبان مقدس سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ ایسا مؤثر ہوتا کہ اہل دل تاب نہ لاتے، کوئی گریباں چاک کر کے جنگل کی راہ لیتا، کوئی چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا اور کتنے سوختۂ عشقِ الٰہی وہیں پر

جاں بحق ہو جاتے، آپ کی ہدایت کے اثر سے لاکھوں انسان معاصی سے تائب ہو کر اللہ والے بن گئے۔

حضور غوث پاک کی ہدایت کے ہمہ گیر اثرات صرف عراق تک محدود نہ رہے، بلکہ ایک مؤرخ کے بیان کے مطابق آپ کی ہدایت کا اثر بسطام، نیشاپور، تبریز، ہمدان، اصفہان، موصل، شیراز، کرمان، حلب، قیساریہ، انطاکیہ، دمشق اور سکندریہ تک پہنچ گیا تھا۔ آپ کے خطبات 'الفتح الربانی' کے نام سے جمع کیے گئے تھے، آپ کے مواعظ دینی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات کا مجموعہ ہیں، اس میں آپ نے دنیادار علما اور ریاکار صوفیوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔ سلاطین وقت اور طبقۂ امرا کو ان کے ظلم وستم پر سخت زجر وتنبیہ فرمائی ہے۔ بنیادی طور پر آپ کی تعلیمات میں توحید ورسالت، اخلاص وتقویٰ، اتباع سنت اور خوفِ آخرت پر زور ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ساری نیکی دو ہی باتوں میں ہے۔ احکام الٰہی کی تعظیم اور خلق اللہ پر شفقت ومہربانی اور بھلائی کی جز، قول وفعل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔ اہل بغداد کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ اے باشندگان بغداد! تمہارے اندر نفاق زیادہ اور اخلاص کم ہو گیا ہے اور اقوال بلا اعمال بڑھ گئے ہیں۔ عمل کے بغیر قول کسی کام کا نہیں۔

ظلم وزیادتی سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ ظالموں کا سختی سے احتساب فرماتے، شریعت کے ظاہری احکام یعنی فرائض وواجبات اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی سختی سے تاکید فرماتے۔ اسی کے ساتھ تصوف وسلوک اور احسان ومعرفت کی باتیں فرماتے۔ تصوف کے مدعی اور شریعت سے غافل رہنے والے صوفیوں کے بارے میں حضرت کا ارشاد سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں:

"تجھ پر افسوس ہے کہ دعویٰ تو یہ کرتا ہے کہ تو صوفی ہے اور تو سراپا کدورت ہے، صوفی وہ ہے جس کا باطن وظاہر کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تابع داری کی وجہ سے صاف ہو جائے، پس جوں جوں اس کی صفائی بڑھے گی وہ اپنی ہستی کے سمندر سے نکلتا اور صفائی قلب کے سبب اپنے ارادہ واختیار کو چھوڑتا جائے گا۔"

باقی صفحہ: ۱۹۲ پر

نعت پاک

تعین سے پرے ذاتِ خدا ہے
محمد ابتدا ہے، انتہا ہے
محمد وجہِ تخلیقِ مکانی
مگر تا لا مکاں رونق فزا ہے
محمد شرح ما زاغ البصر ہے
ادھر جلوہ اِدھر جلوہ نما ہے
محمد مصطفےٰ قرانِ ناطق
محمد ذاتِ پاکِ حق نما ہے
محمد تاجدار جملہ عالم
محمد سرور کل انبیا ہے
وہی سوزِ دلِ صدیق اکبر
وہی دستِ علی مشکل کشا ہے
جنید و بایزید وشمس تبریز
اسی کا سلسلہ در سلسلہ ہے
سمجھ میں آئے بھی کیا شانِ احمد
کہ سر میم کا پردہ پڑا ہے
گنہ گارم ولے فرخندہ ہاشم
محمد شافعِ روزِ جزا ہے

ڈاکٹر سید امین اشرف
گل سمناں، بدر باغ، علی گڑھ

محبوب الٰہی کا منہج تزکیہ وتربیت

ڈاکٹر سید محمد اسد علی خورشید .... سینئر لکچرر: شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کے فرائض منصبی کی جو فہرست ہمیں قرآن پاک سے ملتی ہے اس میں ایک فریضہ تزکیہ قلوب اور تصفیہ باطن کا بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کما ارسلنا فیکم رسو لا منکم یتلو علیکم آیتنا ویز کیکم ویعلمکم الکتٰب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون (سورہ بقرہ، ۱۵۱)

یعنی جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں کا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جس کا تمہیں علم نہ تھا۔

دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا:

لقد من اللہ علی المو منین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیتہ ویز کیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ (آل عمران:۱۶۴)

یعنی اللہ نے احسان فرمایا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں ایک رسول ان ہی میں کا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب کو حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیات کریمہ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ باری تعالیٰ نے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے مبعوث فرمایا کہ وہ انسانوں کو پڑھائیں، سکھائیں اور پاک باطن بنائیں اور اس بعثت نبوی کو اپنے مؤمنین پر احسان عظیم سے تعبیر فرمایا ہے۔ چونکہ جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب قیامت تک کوئی دوسرا مرسل برحق نہیں آنے والا ہے اس لئے ہدایت انسانی سے وابستہ دو اہم امور ہے **یعلمھم** اور **یز کیھم** میں سے **یعلمھم** کے کار منصبی کے لئے اللہ تعالیٰ نے علمائے برحق کو مسند درس وتدریس پر جلوہ افروز فرمایا اور **یز کیھم** کی خدمت نبوت جلیلہ کے لئے صوفیائے باصفا کو سجادہ ہائے رشد وارشاد پر مامور فرمادیا تاکہ ہدایت خلق کا سلسلہ جاری رہے۔ بالفاظ دیگر **یعلمھم** اور **یز کیھم** کے لئے بالترتیب مدارس اور خانقاہوں کو مامن وماویٰ مقرر فرمادیا۔

تزکیہ، زکیٰ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں پاک کرنا، صالح بنانا، بڑھنا، زائد ہونا، مفسرین کرام نے تزکیہ کو عملاً کامل بنانے، نفسانی آلائشات اور شرک ومعصیت اور ظاہری وباطنی نیز حسی ومعنوی آلودگیوں سے پاک کرنے، دلوں کو مانجھ کر صیقل کرنے، کفر وضلالت اور ارتکاب محرمات ومعاصی اور خصائل ناپسندیدہ وملکات رذیلہ وظلمات نفسانیہ وغیرہ سے پاکیزہ کرکے اخلاق فاضلہ واعمال صالحہ سے مزین کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے، جس کے لئے حضور پرنور شافع النشور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا اور محققہ طور پر یہ مومنین کے اوپر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم قرار پایا۔ پھر **قد افلح من تزکیٰ** (اعلیٰ:۱۴) (تحقیق کہ فلاح پائی اس نے جس نے تزکیہ حاصل کیا)۔ اور **قد افلح من زکھا** (شمس:۹) (تحقیق مراد کو پہنچا جس نے سنوار لیا نفس کو)۔ سے رب لایزال نے ازکیاء کی فلاح وفیروزمندی اور کامیابی وکامرانی کا اعلان فرماتے ہوئے **جنت عدن تجری من تحتھا الانھر خلد ین فیھا وذلک جزاء من تزکی** (طٰہٰ:۷۶) (باغ ہیں بسنے کے، بہتی ہیں ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہا کریں گے ان میں اور یہ بدلہ ہے اس کا جس نے تزکیہ حاصل کیا۔) سے ان پر اپنے انعامات واکرام اور بخششوں کی تفصیل بیان فرمادی ہے۔

خیر القرون کے بعد افراد امت کے تزکیہ نفوس اور تصفیہ باطن کا یہ سلسلہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وساطت سے مختلف سلاسل کے صوفیائے کاملین ومشائخین عظام کو سپرد ہوا جنہوں نے پند وموعظت، نصائح واعمال صالحہ، ذکر واذکار، تسبیح وتہلیل

اور التہاب حب رسول کے ذریعہ تبتل الی اللہ، وصول حق اور فنائے ذات کے مرتبے تک سالکین راہ کو پہنچا کر محسود ملائکہ بنا دیا۔

فرشتہ گرچہ برون از طلسم افلاک است
نگاہ او بہ تماشائے این کف خاک است
حدیث شوق ادا می توان بخلوت دوست
بنالہ ای کہ ز آلایش نفس پاک است

شیخ المشائخ محبوب الٰہی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رضی اللہ عنہ کی ذات والاصفات بھی انہی وارثین اسرار و علوم سینہ میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنی چقماق تزکیہ و تربیت سے رہروان طریقت کے دلوں میں ایسی آگ روشن فرمائی کہ جس کی حرقت نے نہ جانے کتنے مغشوش و ناسرہ کو زرناب بنا دیا اور مریدوں کے حق میں **اللھم وفقہ لمر ضاتک واحفظہ عن المعاصی والمکر وھات وعافہ عن بلاء الدنیا وعذاب الآخرۃ** کی شیخ کی دعاء باب اجابت تک کچھ یوں پہنچی کہ اکثر بیشتر آسمان ولایت واتقاء کے نجوم و کواکب ہوئے۔

محبوب الٰہی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رضی اللہ تعالی عنہ نے متوسطات تک آپ نے تعلیم اپنے وطن مالوف بدایوں میں ہی حاصل کی۔ پھر سولہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں مشاہیر وقت اساتذہ سے استفادہ کیا، بدایوں میں تحصیل علم کے دوران جب کہ محبوب الٰہی کی عمر ۱۲ سال تھی آپ نے ابوبکر خراط یا ابوبکر قوال کی زبانی حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب و مراتب سنے اور اسی وقت حضرت گنج شکر قدس سرہ کی محبت وارادت آپ کے دل میں جاگزیں ہوئی اور رفتہ رفتہ تعشق کی یہ منزل آ پہنچی کہ حضرت شیخ کا نام حرز جاں ہو گیا ہر نماز کے بعد ۱۰ مرتبہ ''شیخ فریدالدین'' اور ۱۰ مرتبہ ''مولانا فریدالدین'' بطور وظیفہ ورد فرمانے لگے۔ دھیرے دھیرے جب دوستوں کو اس شیفتگی کا علم ہوا تو وہ حضرت محبوب الٰہی کو حضرت گنج شکر کی قسمیں دینے لگے، واقعاً بقول مولانا جامی۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

چنانچہ فوائد الفواد میں مرقوم ہے:

''بعد ازاں (ابوبکر خراط) حکایت کرد کہ از آنجاں در اجودھن آمدم شاہی را دیدم چنیں وچنیں! الغرض چون مناقب فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز در گوش من افتاد مرا یک محبتی و ارادتی بصدق دردل متمکن شد تا چناں شد کہ بعد از ھر نمازی دہ بار می گفتم'' شیخ فریدالدین'' ودہ بار گفتم'' مولانا فریدالدین'' پس این محبت بغایتی رسید کہ جملہ یاران مرا ازیں معنی خبر شد تا چنان شد کہ اگر از من سخنی پرسیدندی وخواستندی کہ سوگند دھند گفتندی سو گند شیخ فرید بخور۔''

(فوائد الفواد، جلد ۴ مجلس ۲۲ ص ۲۵۳، حسن سجزی، اردو اکاڈمی دہلی ۱۹۹۰)

جب حضرت محبوب الٰہی دہلی پہنچے تو اتفاق سے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے چھوٹے بھائی اور مرید و خلیفہ شیخ نجیب الدین متوکل قدس سرہ کے جوار میں اقامت اختیار کی۔ اس اتفاق نے حضرت محبوب الٰہی کے اخگر عشق کو خوب خوب بھڑکایا۔ شمائل الاتقیاء کے حوالے سے پروفیسر نثار احمد فاروقی، خواجہ حسن ثانی کی مترجمہ فوائد الفواد کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ'' ۶۶۷ھ میں جب حضرت محبوب الٰہی نے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کے لئے اجودھن کا سفر کیا تو فرط عقیدت اور وفور محبت میں حج کی طرح احرام باندھا اور اس انداز میں دیار شیخ کے لئے روانہ ہوئے کہ کئی کئی دن تک بھوکے پیاسے سفر کرتے ہوئے جب اجودھن پہنچے اور شیخ کا سامنا ہوا تو فرط جذبات اس قدر حاوی تھے کہ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر نے انہیں دیکھتے ہی خوش آمدید کہا اور یہ شعر پڑھا۔

ای آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

کچھ دنوں قیام کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے حضرت بابا فرید قدس سرہ سے بیعت کی درخواست پیش کی۔ آپ نے فوراً منظور فرمالیا اور مرید کر کے اپنا ایک پیرہن خود اپنے دست مبارک سے پہنایا اور پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا،، آج میں نے ایک ایسا درخت لگایا ہے جس کے سائے میں بہت سی خلق خدا آرام پائے گی۔''

اودھن میں چار ماہ قیام کے دوران حضرت محبوب الٰہی نے

بڑے مراتب طے فرمائے اور درسیات کی بعض کتابیں بھی حضرت شیخ سے پڑھیں۔ بعدازاں دہلی لوٹ آئے۔ آپ نے اجودھن کا سفر دس مرتبہ کیا جس میں ۶۶۸ھ اور ۶۶۹ھ میں دوسرا اور تیسرا سفر ہوا۔ تیسرے سفر کے بعد جب آپ دہلی لوٹے تو دو ماہ بعد حضرت بابا فرید قدس سرہ کا وصال ہوگیا اور آپ نے وصال سے قبل اپنے داماد اور مرید وخلیفہ حضرت بدرالحق کو وصیت کی کہ جب نظام الدین دہلی سے آئیں تو میرا مصلی، عصا، تسبیح، خرقہ اور نعلین ان کو دے دینا۔ یہ گویا تفویض خلافت وجانشینی کا واضح اشارہ تھا۔ تفویض خلافت کے بعد آپ نے دہلی میں مسند رشد وارشاد آراستہ فرمائی اور مخلوق کی ایک کثیر تعداد آپ کے فیوض وبرکات سے مستفیض ہوئی اور ہزاروں قلوب کو تزکیہ وتصفیہ کی دولت نصیب ہوئی

حضرت شیخ المشائخ محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ تزکیہ کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ سالک کا کمال چار چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے: **قلۃالطعام ،قلۃالکلام،قلۃالمنام اور قلۃالصحبۃ مع الانام۔** یعنی کم کھانا، کم بولنا، کم سونا اور مخلوق سے کم اختلاط کرنا۔ اگر سالک ان چار چیزوں پر قدرت پالیتا ہے تو اسے تزکیہ کمال حاصل ہوتا ہے۔ طعام، کلام ومنام اور صحبت میں تخفیف مرد سالک کے لئے نفس امارہ کو کچلنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور جب نفس امارہ رام ہوکر نفس مطمئنہ سے مبدل ہوجاتا ہے اور نفس کی سرکشی پامال ہوکر رضائے الٰہی کی راہ اختیار کرلیتی ہے تو ایسے ہی انفاس مبارکہ کے لئے ارشاد ربانی ہوتا ہے: **یاایتھاالنفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی.** (اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہوجا میری بہشت میں۔ الفجر ۳۰۔۲۸)

صوفیائے برحق دنیا کو حصول تزکیہ اور وصول حق کی راہ میں بڑا رخنہ سمجھتے رہے ہیں اور اسی بنا پر سالکین راہ کو ترک دنیا کی ترغیب دلاتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ بھی اپنے مسترشدین کو ترک دنیا کی تعلیم دیتے تھے۔ ترک دنیا سے حضرت محبوب الٰہی کا منشا قطعاً یہ نہ تھا کہ سالک برہنہ تن محض ایک لنگوٹی میں زندگی بسر کردے بلکہ یہ مراد تھی کہ کپڑے بھی پہنے، کھانے بھی کھائے لیکن جو کچھ اس کو ملے اسے جمع نہ کرے بلکہ عباداللہ پر خرچ کرتا رہے اور کسی چیز سے دل نہ لگائے۔ فرماتے ہیں:

"......ترک دنیا آں نیست کہ کسی خود را برہنہ کند مثلاً لنگوتہ بہ بند دو بنشیند، ترک دنیا آنست کہ لباس بپوشد وطعام بخورد، اما آنچہ می رسد روان می دارد وجمع نہ کند وباو میل نکند وخاطر را بچیزی متعلق ندارد۔"

(فوائدالفواد، ج۱مجلس۶، ص:۱۳۔۱۲)

مرد سالک کو چاہئے کہ ہمت بلند رکھے اور آلائشات دنیا اور شہوات نفس میں نہ الجھے۔ حضرت محبوب الٰہی دنیا ولذائذ دنیا کے ترک کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ کون ایسا ہے جس نے دون وارذل شے یعنی دنیا کو ترک کیا اور اعلیٰ واشرف شے یعنی وصول حق اسے نصیب نہ ہوا۔ آپ ترک دنیا کو اصل دانائی تصور فرماتے تھے اور اس ضمن میں یوں ارشاد فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص یہ وصیت کرکے کہ میری موت کے بعد میری میراث کا ایک تہائی حصہ اس شخص کو دیا جائے جو انسانوں میں سب سے بڑا دانشمند اور صاحب عقل ہو تو اس وصیت کو اسی طرح پورا کیا جائے گا کہ وہ مال اس شخص کو دیا جائے گا جو تارک دنیا ہوگا۔ اسی ضمن میں حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ دنیا صرف سیم وزر اور مال واسباب کا نام نہیں بلکہ **بطنک دنیاک** تیرا پیٹ تیری دنیا ہے۔ جتنا تو کم خوراک ہوگا اتنا ہی بڑا تارک دنیا ہوگا، جبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ شیطان یہ کہتا ہے کہ میں شکم سیر نمازی سے معانقہ کرتا ہوں اور بھوکے سونے والے سے گریز کرتا ہوں۔ چنانچہ فوائد الفواد میں مرقوم ہے:

"سخن در ترک دنیا افتاد۔ فرمود کہ اصل دانائی آنست کہ از دنیا پرہیز کنند۔ بر نسبت این معنی فرمود کہ اگر مردی وصیت کند کہ ثلث مال من بعد از من بمردی دہند کہ او اعقل الناس باشد، حکم این چگونہ باشد؟ فرمود کہ حکم این آں باشد کہ آن مال بکسی دہند کہ تارک دنیا باشد...... مناسب این معنی فرمود کہ دنیا نہ ہمین زر وسیم واسباب وغیر آنست۔ از بزرگی روایت فرمود کہ او گفتہ است 'بطنک دنیاک'۔"

شکم تو دنیائے تست، ہر چہ کمتر خوری از تارکان دنیا باشی

وہرچہ سیر خوری نباشی...‘‘

(فوائد الفواد ج ۲ مجلس ۲۴، ص ۱۲۲۔۱۲۱)

اپنی ایک مجلس ارشاد میں ترک دنیا کے ضمن میں حضرت محبوب الٰہی نے ایک حکایت یوں بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم شہنشاہ فقر وتوکل صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک درویش کو اختیار عطا فرمایا کہ دنیا اور جو کچھ کہ اس کے اندر ہے تو اسے اختیار کرلو یا عقبیٰ اور جو کچھ اس میں تمہارے لئے ہے اسے منتخب کرلو۔ اس درویش نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ اے میرے رب! جو کچھ تونے میرے لئے عقبیٰ میں مہیا کر رکھا ہے میں اسے ہی پسند کرتا ہوں۔ اس مجلس رسول میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، یہ سن کر وہ رونے لگے۔ صحابہ نے رونے کا سبب پوچھا تو حضرت صدیق اکبر نے جواب دیا کہ یہ جو جناب رسول صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک درویش کو دنیا وعقبیٰ کے درمیان اختیار دیا گیا تو یہ درویش خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ ہیں ”المخبِر هو المخبَر“

ترک دنیا سے متعلق ایک دوسری حکایت جو حضرت محبوبِ الٰہی اپنے متوسلین کی تربیت وتزکیہ نفس کے لئے بیان فرماتے تھے اور وہ یوں ہے کہ ایک بزرگ ایک مرتبہ پانی پر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھ رہے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ الہ العالمین! خضر سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہے انہیں اس سے توبہ کی توفیق عطا فرما۔ حضرت خضر علیہ السلام اسی وقت تشریف لائے اور اس صاحب دل سے دریافت فرمایا کہ آخر میں نے کون سا ایسا گناہ کبیرہ کیا ہے جس سے میں توبہ کروں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ تم نے صحرا میں ایک درخت لگا تھا، اب خود اس کے سائے میں بیٹھتے ہو، آرام اٹھاتے ہو اور کہتے ہو کہ میں نے یہ اللہ کے لئے کیا ہے۔ یہ سن کر حضرت خضر نے اسی وقت توبہ کی۔ پھر ان بزرگ نے حضرت خضر سے ترک دنیا کے متعلق فرمایا کہ ایسے رہو جیسے میں رہتا ہوں۔ حضرت خضر نے پوچھا آپ کس طرح رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ایسے رہتا ہوں کہ اگر مجھے ساری دنیا عطا کردی جائے اور یہ کہا جائے کہ اس کا حساب وکتاب تم سے نہیں ہوگا۔ اسے قبول کرلو ورنہ تمہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو بھی میں اس دنیا کو قبول نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے دریافت فرمایا وہ کیوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی مبغوض ہے۔ جس چیز کو اللہ دشمن رکھتا ہوا سے میں دوست کیسے بنا سکتا ہوں اس لئے دنیا کے بجائے جہنم قبول کرلینا مجھے گوارہ ہوگا۔

ترک دنیا سے متعلق اسی طرح ایک اور حکایت حضرت محبوب الٰہی سے یوں منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم ایک خوابیدہ شخص کے پاس پہنچے اور اسے آواز دی کہ اٹھو اللہ کی عبادت کرو۔ اس سوئے ہوئے سالک مرتاض نے جواب دیا کہ میں نے اللہ کی وہ عبادت کرلی ہے جو احسن عبادات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم نے کونسی عبادت کی ہے تو اسنے جواب دیا ”ترکت الدنیا لاهلها“ میں نے دنیا والوں کے لئے دنیا چھوڑ دی ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا ”من رضی اللہ تعالیٰ بقلیل من الرزق رضی اللہ عنه بقلیل من العمل“ یعنی جو اللہ سے تھوڑے رزق پر راضی ہوگیا اللہ بھی اس سے تھوڑی عبادت پر راضی ہوگیا اور پھر فرمایا وہ شخص جو دنیا سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اس کے پاس درہم ودینار میں سے کچھ بھی نہ تھا تو جنت میں اس سے زیادہ غنی کوئی نہ ہوگا۔

دنیا کیا چیز ہے اور کیا چیز دنیا نہیں ہے اس کی تصریح کرتے ہوئے حضرت محبوب الٰہی نے دنیا کو چار حصوں میں اس طرح تقسیم فرمایا ہے کہ:

۱۔ ایک وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے بھی دنیا ہے اور باطنی اعتبار سے بھی دنیا ہے۔
۲۔ ایک وہ ہے جو نہ ظاہری اعتبار سے دنیا ہے اور نہ باطنی اعتبار سے۔
۳۔ ایک وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے تو دنیا نہیں لیکن باطنی اعتبار سے دنیا ہے۔
۴۔ ایک وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے تو دنیا ہے لیکن باطنی اعتبار سے دنیا نہیں ہے۔

پہلے زمرے میں ہر وہ چیز آتی ہے جو ضرورت انسانی سے زیادہ ہو یعنی لازمہ حیات کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں وہ سب ظاہری اور باطنی

اعتبار سے دنیا ہیں۔ دوسرے زمرے میں خلوص وصفائے نیت کے ساتھ اطاعت خداوندی ہے کہ جو نہ ظاہری اعتبار سے دنیا ہے اور نہ ہی باطنی اعتبار سے۔ تیسرے زمرے میں تصنع وریا کے ساتھ منفعت دنیاوی کی غرض سے کی جانے والی اطاعت ایزدی ہے جو ظاہری اعتبار سے دنیا تو نہیں لیکن باطنی اعتبار سے بلاشبہ دنیا ہے۔ جب کہ چوتھے زمرے میں اجتناب اتلاف حق کی نیت سے حق زوجیت جو بظاہر تو دنیا ہے لیکن حقیقتاً دنیا نہیں ہے۔ حضرت محبوب الٰہی سالکین راہ کو ترک اختیار کی تعلیم بھی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ سالک کو اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ شخص جو کسی کا محکوم ہوتا ہے حاکم سے بہتر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت محبوب الٰہی سے ایک حکایت یوں منقول ملتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ نماز جمعہ کے لئے خانقاہ سے باہر تشریف لائے اور مریدوں سے پوچھا کہ جامع مسجد کا راستہ کون سا ہے؟ ایک مرید نے بتایا کہ یہ راستہ ہے۔ حاضرین نے ان سے پوچھا کہ آپ تو متعدد مرتبہ نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد جا چکے ہیں، کیا آپ راستہ نہیں پہچانتے؟ حضرت شیخ نے جواب دیا جانتا ہوں لیکن اس لئے پوچھ لیا کہ تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کا محکوم بن جاؤں۔

شیخ المشائخ حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہ سالکین کو طاعت و عبادت کی بہت زیادہ تشویق وترغیب دلاتے تھے اور فرماتے تھے کی سالک کو چاہیے کہ مسلسل طاعت وعبادت اور اوراد واذکار اور تسبیح وتہلیل میں مشغول رہے یا مشائخ کی کتابیں ہی پڑھتا رہے۔ کسی لمحہ بھی اسے بیکار نہیں رہنا چاہئے۔ فرماتے ہیں ہر وجود دو عدم کے درمیان ہوتا ہے یعنی وجود میں آنے سے پہلے معدوم تھا اور پھر وجود کے بعد معدوم ہو جائے گا اس لئے اس وجود کو بھی ٹھیک ویسے ہی معدوم سمجھنا چاہئے جیسے ایام مخصوص میں عورت اگر پہلے روز خون دیکھے اور دوسرے روز طہر پائے پھر تیسرے روز خون ہو تو دوسرے روز کے طہر کا بھی عدم طہر میں اعتبار کیا جائے گا **الوجود بین العدمین کالطہر المتخلل بین الدمین**۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب حیات دنیوی بھی عدم کا ہی حکم رکھتی ہے تو عطلت وغفلت میں بسر کرنے کے بجائے طاعت وعبادت اور مشغولی حق میں بسر کرنا چاہئے کہ اصلاً یہی کام، کام ہے۔

طاعت کی توضیح کرتے ہوئے حضرت محبوبِ الٰہی فرماتے تھے کہ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں: طاعت لازمہ اور طاعت متعدیہ۔ طاعت لازمہ تو طاعت کی وہ قسم ہے جس کا انتفاع محض طاعت کرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج اور اوراد وتسبیحات وغیرہ جب کہ طاعت متعدیہ طاعت کی وہ قسم ہے جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً دوسروں کی ذات پر خرچ کرنا، طعام داری کرنا، شفقت ورافت کا سلوک کرنا اور جہاں تک ممکن ہو سکے دوسروں کے ساتھ لطف ومہربانی کا معاملہ کرنا۔ طاعت متعدیہ کا ثواب بے انتہا ہے۔ طاعت لازمہ کی قبولیت کے لئے خلوص نیت شرط ہے لیکن طاعت متعدیہ ہر حال میں ماجور ومثاب ہے۔ یقیناً طاعت وعبادت شروع میں نفس پر گراں گذرتی ہے لیکن سالک جب صدقِ دل اور اخلاصِ نیت کے ساتھ اس میں منہمک ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ التذاذ وحلاوت اور توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اس کے لئے تیسّر وآسانی کی راہیں استوار ہو جاتی ہیں۔

سالک جب تک راہ سلوک پر ہوتا ہے کمالیت کا طلب گار ہوتا ہے۔ راہ سلوک میں کسی شخص کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: سالک، واقف اور راجع۔ سالک جب تک کمال طاعت اور صفا وخلوص نیت کے ساتھ منازل سلوک طے کرتا رہتا ہے سالک رہتا ہے۔ اگر اس کی طاعت وعبادت کے ذوق میں کوئی سقم یا فتور واقع ہوتا ہے تو سالک کے مرتبہ سے تنزلی پا کر واقف کے مرتبہ پر آ جاتا ہے یعنی حضوری میں توقف سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اگر معاً توبہ وانابت سے اس کی کیفیت توقف پر غالب آ جاتا ہے تو پھر سالک کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے بصورت دیگر اگر اسی حال پر قائم رہے تو مزید تنزلی پا کر راجع کے مرتبے پر آ جاتا ہے جو سفر سلوک میں ایک عظیم اور جانکاہ حادثہ ہے پھر اس لغزش سلوک کے نتیجے میں اسے جن سات کیفیتوں سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے وہ اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی اور عداوت ہیں جنہیں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ محبوب ومحبّ یعنی خدا وبندہ میں اگر بندے سے کوئی ناگوار عمل سرزد ہو جائے تو محبوب یعنی خدا اعراض کرنے لگتا ہے۔ اگر محبّ معذرت کر لیتا ہے تو مودت سابقہ غالب آ جاتی ہے ورنہ محبّ کے اپنی خطا پر مصر ہونے کی صورت میں حجاب کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ اگر محبّ اب بھی معذرت وانابت کر لے تو ٹھیک ورنہ تفاصل یعنی محبوب ومحبّ میں جدائی اور

دوری کا مرحلہ آتا ہے۔ اگر اب بھی محبّ نے اعتذار پیش نہ کیا تو سلب مزید ہو جاتا ہے یعنی اوراد و عبادت وطاعت میں ذوق وشوق، حلاوت و چاشنی اور واردات قلبی کے ازدیاد کی تو جو کیفیت تھی وہ سلب کرلی جاتی ہے۔ اگر پھر بھی بندے نے رجوع نہ کیا تو سلب قدیم کا مرحلہ آجاتا ہے یعنی مزید سے قبل طاعت وعبادت میں جو ابتدائی ذوق وشوق تھا وہ بھی سلب کرلیا جاتا ہے۔ اگر اب بھی بندے نے عمل ناسزاوار کو ترک نہ کیا تو تسلی کا مرحلہ آجاتا ہے جہاں محبوب یعنی ذات حق اس بندے سے تفریق پر خود کو آمادہ کرلیتی ہے۔ اب بھی بندے کے پاس انابت واعتذار کا موقع ہوتا ہے اگر اب بھی اس نے ایسا نہ کیا تو عداوت کا مرحلہ آجاتا ہے۔

صبر ورضا۔ کے سلسلے میں حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہ فرماتے تھے کہ صبر یہ ہے کہ جب بندے کو کوئی ناگوار بات پیش آئے تو وہ اس پر خاموش رہے کوئی شکایت نہ کرے اور رضا یہ ہے کہ کسی ناگوار بات پر اسے کوئی حزن وملال نہ ہو گویا کہ وہ بلا اس پر آئی ہی نہیں۔ جب ایک سپاہی دشمنوں کے حملے میں زخمی ہو جانے کے باوجود اپنے زخموں سے بے پرواہ ہو کر مدافعت میں مشغول رہ سکتا ہے اور جنگ کے خاتمے کے بعد اسے اپنے زخموں کا احساس ہوتا ہے تو پھر ایک سالک ذاتِ حق میں مستغرق رہ کر اس کی طرف سے نازل ہونے والی بلیّات اور مصائب کے گزند کے احساس سے خود کو مستثنیٰ کیوں نہیں رکھ سکتا۔

حضرت محبوب الٰہی شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ توکل کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کے تین درجات ہوتے ہیں۔ پہلا درجۂ توکل تو یہ ہے کہ کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے معاملے میں وکیل مقرر کیا جو عالم ودانا اور مدعی کا ہمدرد ہے۔ اس قسم کے توکل میں شانہ بشانہ سوال بھی ہے کیونکہ مدعی وکیل کی مرضی کے مطابق رہبری حاصل کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا درجہ توکل وہ ہے جو شیر خوار بچے کو ماں پر ہوتا ہے۔ وہ بچہ ماں سے یہ نہیں کہتا کہ مجھے دودھ چاہیے اور فلاں وقت دودھ چاہیے بلکہ صرف گریہ وزاری کرتا ہے اور اسے ماں سے اپنی احتیاج کا یقین ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ توکل وہ ہے جو مردے کو غسال پر ہوتا ہے یعنی متوفی غسال کے سامنے بے حس حرکت اور بے جنبش وسوال پڑا ہوتا ہے اور اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہی تیسرے درجے کا توکل، توکل کا قسم اعلیٰ واولیٰ ہے۔ یعنی اپنے حوائج میں بندے کا ذات حق کو وکیل بنانا ادنیٰ درجہ کا توکل ہے، اپنے حوائج کا سوال تک نہ کرنا اوسط درجے کا توکل ہے اور مرضی حق پر اپنے حوائج کو موقوف کر دینا اعلیٰ درجے کا توکل ہے۔

یہی وہ خطوط ومناہج ہیں جو شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی سیدنا شیخ نظام الدین اولیاء رضی اللہ عنہ نے سلوک کے سفر میں اپنے متوسلین ومتبعین کے لئے مقرر فرمائے تھے بلکہ ان کے منہج تزکیہ وتربیت سے متعلق یہ چند سطور ان کی برحق مرشدانہ حیات میں سے مشتے نمونہ از خروارے کی ہی حیثیت رکھتی ہیں ورنہ ویسے مرشد باکمال اور شیخ اجل کی حیات کا ایک ایک لمحہ سالکین راہ کے لئے مشعل فروزاں سے کم نہیں اور تصوف کی راہ میں حضرت محبوب الٰہی کے متعینہ مناہج وخطوط پر ایقان واتقان کی قندیلوں میں سفر کر کے سالکین بالیقین آج کے جنید وبایزید ہو سکتے ہیں۔

ہرباب ازین کتاب نگارین کہ برکنی
ہمچون بہشت گوئی ازآن باب خوشتراست

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۱۸۶ کا

دنیادار علما کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اے وہ شخص جو علم کا دعویٰ کرتا ہے اور دنیاداروں سے دنیا چاہتا ہے اور ان کے سامنے جھکتا ہے، حق تعالیٰ نے تجھے علم دے کر گمراہ کردیا، تیرے علم کی برکت جاتی رہی، اس کا مغز جاتا رہا اور صرف پوست باقی رہ گیا۔''

الغرض قطبیت وولایت کا یہ آفتاب عالم تاب اپنی ضیا پاش کرنوں سے تاریک دلوں کو منور کرتا رہا اور ۹۱ سال کی عمر میں ۹ ربیع الثانی ۵۶۱ھ کو بغداد کے افق میں غروب ہوگیا۔ آج نو سو سال گزر جانے کے بعد بھی میر بغداد کی یاد تازہ اور ذکر بلند ہے اور کیوں نہ ہو۔ خود فرما گئے تھے:

افلت شموس الاولین و شمسنا ابدا علی افق العلی لا تغرب۔ اگلوں کے سورج چمک کر ڈوب گئے، مگر میرا سورج افق کی بلندی پر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ❁❁❁

اودھ کی عظیم روحانی شخصیت

مخدوم سید علاء الدین سندیلوی

ڈاکٹر اقبال صابر ....شعبہ تاریخ،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

اودھ کے مشہور قصبات میں ''سندیلہ'' ممتاز تاریخی اور ثقافتی اہمیت کا حامل ہے۔ ا سلاطین دہلی کے زمانے سے عہدِ جدید تک یہ قصبہ نہ صرف عوام بلکہ خواص یہاں تک کہ یکتائے روزگار اشخاص کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ دوران قرون وسطیٰ قصبہ سندیلہ ایک مشہور تجارتی منڈی،علوم وفنون کا عالمی شہرت یافتہ مرکز اور روحانی سرگرمیوں کا گہوارہ تھا۔۲ یہاں کی دلچسپ سماجی اور ثقافتی تاریخ فطری طور پر قاری کا ذہن یہاں کی روحانی شخصیتوں یعنی اس قصبہ کے صوفیائے عظام اور اولیائے کرام کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ سندیلہ کے روحانی بزرگوں میں حضرت مخدوم سید علاء الدین سندیلوی قدس سرہٗ کی شخصیت بڑی ہی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ کی درگاہ المعروف بہ 'درگاہ مخدوم صاحب' کو صدیوں سے سندیلہ کی جملہ خانقاہوں اور درگاہوں میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آپ چودھویں صدی عیسوی کے عظیم چشتی بزرگ اور برصغیر کے نام ور روحانی پیشوا حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نوراللہ مرقدہٗ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ پیش نظر مختصر مضمون میں حضرت مخدوم کی حیات کے مختلف پہلوؤں اور ان کے کارناموں کو تحقیق کی روشنی میں یکجا اور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مخدوم صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ والد کی جانب سے حسینی اور والدہ کی طرف سے حسنی۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید محمود مشہور بزرگ حضرت سید ابوالفرح قدس سرہٗ کی اولاد میں تھے، جب کہ والدۂ محترمہ جناب سیدہ صفیہ حضور سیدنا غوث اعظم رئیس الاولیاء شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی قدس سرہٗ کی نسل سے تھیں۔۳ عہد شاہجہانی کے ممتاز صوفی اور تذکرہ نگار شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے اپنی مشہور کتاب 'مرآۃ الاسرار' میں مخدوم علاء الدین سندیلوی کا سن ولادت ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) تحریر کیا ہے۔۴ اسی زمانے کے ایک اور تذکرہ نگار شیخ وجیہ الدین اشرف نے اپنی تصنیف 'بحر ذخار' میں بھی مخدوم صاحب کا یہی سن پیدائش درج کیا ہے۔۵ سندیلہ کی ماضی قریب کی مشہور علمی وادبی شخصیت، صاحب قلم، دانش ور، مؤرخ اور نام ور جاگیردار راجہ درگا پرساد مہر سندیلوی نے بھی اپنی مشہور کتاب 'تاریخ سندیلہ' میں حضرت مخدوم کا یہی سن ولادت لکھا ہے۔۶ بلکہ ان کے بقول لفظ مخدوم سے آپ کا سن ولادت بھی نکلتا ہے۔۷ حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت سید علاء الدین کی ساری زندگی اسی لفظ مخدوم کے مصداق رہی۔

جہاں تک مخدوم صاحب کے وطن اور جائے پیدائش کا سوال ہے اس ضمن میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم مختلف آرا کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ راجہ درگا پرشاد کے مطابق مخدوم صاحب کا وطن جاجنیر ہے، آپ کے بزرگ وہاں سے دہلی آئے۔۸ اس جملے سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی لیکن کسی اور ماخذ یا تذکرے سے راجہ صاحب کے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ جاجنیر کہاں ہے۔ سندیلہ کے ہی ایک اور مشہور ادیب تذکرہ نگار اور مؤرخ چودھری نبی احمد سندیلوی نے اپنی مشہور کتاب 'مشاہیر سندیلہ' میں لکھا ہے کہ مخدوم صاحب کا وطن 'وسط' نامی شہر ہے جو ہندوستان کے مغربی صوبہ راجستھان میں واقع ہے۔۹ لیکن سندیلہ سے وطنی اور خاندانِ حضرت مخدوم سے نسبی تعلق رکھنے والے عہد حاضر کے ایک ادیب اور انساب نگار سید یقین احمد ہاشمی سندیلوی مؤلف 'اخبار وانساب سادات سندیلہ' کی رائے ہے کہ مخدوم صاحب کا وطن ''وسط'' نام کا ہی شہر تھا جو کہ عراق میں بغداد کے قرب واقع ہے۔۱۰

جہاں تک مخدوم سید علاء الدین سندیلوی کی شروع کی زندگی اور ابتدائی حالات کا تعلق ہے اس سلسلے میں زیادہ تر ماخذ خاموش ہیں۔ تاہم سید یقین احمد ہاشمی کے بقول آپ اپنی ابتدائی تعلیم ہندوستان میں مکمل کر کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے بغداد تشریف لے گئے اور بارہ برس تک وہاں قیام کیا۔۱۱ اسی قیام بغداد کے دوران آپ نے وہاں کے مشہور عالم، فقیہ اور محدث حضرت اویس مکی رضوی کی

صاحبزادی بی بی صالحہ سے عقد کیا اور پھر ہندوستان تشریف لائے۔۱۲ مخدوم صاحب کے تین صاحبزادگان مخدوم زادہ سید نصیر الدین، مخدوم زادہ سید خواجہ احمد اور مخدوم زادہ سید مجیر الدین تولد ہوئے۔۱۳ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کو علم باطن کے حصول کا شوق دامن گیر ہوا۔

پندرہویں، سولہویں صدی عیسوی کے ممتاز صوفی اور عالم دین حضرت میر سید عبدالواحد بلگرامی اپنی مشہور کتاب 'سبع سنابل' میں لکھتے ہیں: حضرت چراغ دہلوی کی خدمت میں آنے سے قبل حضرت مخدوم سندیلوی ایک درویش کی خدمت میں تین سال تک رہے تاکہ اس کی صحبت سے علم معرفت حاصل کریں لیکن جب ایک روز اس درویش نے آپ سے کہا کہ ''اے علاء الدین آؤ آج میں تم کو عرش کا دیدار کراؤں'' تو آپ کو خاصی مایوسی ہوئی۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے دل میں تو 'دیدار الٰہی' کی تمنا ہے، میں عرش کا دیدار کر کے کیا کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے اس درویش کا ساتھ چھوڑ دیا اور کسی دوسرے درویش کے پاس مزید نو برس تک رہے لیکن مقصد یہاں بھی حاصل نہ ہو سکا کیونکہ جب ایک دن اس درویش نے پانی پر یعنی سطحِ دریا پر مصلی بچھا کر نماز پڑھنی شروع کی تو مخدوم صاحب نے اس کی صحبت سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔۱۴ چونکہ مخدوم سید علاء الدین معرفت حقیقی کے طالب اور کسی عارف حقیقی کے متلاشی تھے اس لئے انہوں نے کامل رہبر راہ طریقت کی جستجو جاری رکھی اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئے یعنی مشیت الٰہی سے خاندان چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں پہنچے۔ چونکہ مخدوم صاحب میں باطنی خمیر پہلے سے ہی اٹھ چکا تھا اس لئے حضرت چراغ دہلوی کی پرکشش اور جاذب نظر روحانی شخصیت نے فوراً ہی آپ کے باطن کا مشاہدہ کر لیا اور آپ کو اپنے حلقۂ ارادات میں داخل کر کے آپ کی روحانی تربیت شروع کر دی۔ درگاہ پرشاد لکھتے ہیں ''مخدوم صاحب نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں رہ کر تزکیۂ نفس اور تحصیل علوم باطنی فرمائی۔''۱۵ جلد ہی مرشد کامل نے جادۂ طریقت پر مخدوم سید علاء الدین کو پختہ اور ثابت قدم پا کر سلسلۂ چشتیہ میں خلافت و اجازت سے سرفراز فرمایا۔ ۱۶ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سے حصول خلافت و اجازت کے وقت شیخ المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہٗ العزیز باحیات تھے کیونکہ جناب یقین احمد ہاشمی کے مطابق کچھ لوگوں نے اس بات پر اعتراض اٹھایا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی حیات میں حضرت چراغ دہلوی نے سید علاء الدین سندیلوی کو خلافت و اجازت سے کیونکر نوازا۔۱۷

بعد ازاں مخدوم صاحب اپنے مرشد کے حکم سے اس جگہ تشریف لائے جسے اب سندیلہ کہتے ہیں۔ کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس مشہور اور مردم خیز بستی کا نام سندیلہ نہیں بلکہ 'سیتل پروا' تھا جسے آرکھ قوم سے تعلق رکھنے والے اس علاقے کے راجہ (حاکم) نے آباد کیا تھا اور یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ان ہی آرکھوں پر مشتمل تھا۔ ۱۸ یہ زمانہ سلطان فیروز شاہ تغلق کا تھا۔ راجہ درگا پرشاد کے بقول حضرت مخدوم صاحب ''بزمان سلطنت فیروز شاہ تغلق سندیلہ تشریف لائے۔''۱۹ لیکن جناب یقین احمد ہاشمی کی تصنیف اور جناب منظور حسین سلیمانی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید علاء الدین، سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت کے آخری زمانے ۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء میں سیتل پروا (سندیلہ) آئے مگر یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ خود ان دونوں حضرات کی تحریروں سے بھی اس امر کی تردید ہو جاتی ہے۔ ۲۰ عام تذکروں میں یہ بھی درج ہے کہ دہلی سے روانگی کے وقت حضرت مخدوم کو تین سو ساٹھ بیگھے زمین برائے کاشت کا پروانہ بھی عطا ہوا تھا تاکہ ان کی خانقاہ کے اخراجات بخیر و خوبی چل سکیں۔۲۱

الغرض سید مخدوم علاء الدین بحکم مرشد کامل سیتل پروا (سندیلہ) پہنچے اور قصبے سے باہر کسی جگہ قیام پذیر ہوئے۔ یہاں آپ کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت اور چلہ کشی مجاہدات میں بسر ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے آپ کی آمد اور قیام کی اطلاع قصبہ اور اطراف کے باشندوں میں ہوتی گئی۔ عوام الناس اپنی حاجتیں لے کر آپ کے پاس آتے اور آپ سے روحانی فیض حاصل کرتے۔ ۲۲ جلد ہی آپ سارے علاقے میں مقبول ہو گئے۔ چنانچہ اس تیز تر مقبولیت نے اس علاقے کے راجہ یعنی حاکم سیتل پروا کے کان کھڑے کر دیے اور وہ آپ کے درپۓ آزار رہنے لگا۔ اس نے حضرت مخدوم کے پاس پیغام بھجوایا کہ اپنی تبلیغی سرگرمیاں ختم کر کے اس علاقے سے چلے جائیں۔ وہ برابر آپ اور آپ کے ساتھیوں کو پریشان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ

اس نے بزورِ شمشیر مخدوم صاحب کو وہاں سے نکال دینے کا ارادہ کرلیا اور جنگ و جدال پر اتر آیا۔ پہلے تو آپ نے ضبط وتحمل سے کام لیا اور راجہ کو اس کے ارادۂ بد سے باز رکھنے کی پر امن کوشش کی مگر جب وہ فوج کشی پر آمادہ ہوگیا تو پھر حضرت مخدوم اور ان کے ساتھیوں کو بھی جہاد بالسیف کرنا پڑا۔ ۲۳؎ آپ نے سیتل پروا کے راجہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اگر چہ آپ کے ساتھیوں کی تعداد بڑی ہی قلیل تھی مگر فتح بالآخر آپ ہی کی ہوئی۔ راجہ اور اس کی آرکھ قوم کو شکست فاش نصیب ہوئی اور وہ اپنی فوج اور مال و منال کے ساتھ بھاگ کر کاکوری چلا گیا جو سندیلہ سے جانب جنوب۔ مشرق لکھنؤ کے نواح میں ہے اور وہاں سے شورش کرتا رہا۔ لہٰذا حضرت مخدوم نے اپنے بڑے اور منجھلے صاحبزادوں الموسوم سید نصیر الدین اور سید خواجہ احمد کو لشکر کے ہمراہ کاکوری روانہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاکوری کی اس جنگی مہم میں مخدوم صاحب کو ان کے کچھ عقیدت مند شاہی حکام کی مدد بھی حاصل تھی جیسا کہ یقین احمد ہاشمی نے بھی لکھا ہے کہ ''دولت یار خاں جو شاہی فوج کا سردار اور آپ کا پیر بھائی تھا وہ بھی مدد کے لئے تیار ہوا'' ۲۴؎ چنانچہ کاکوری میں ان فرزندان و پیروانِ حضرت مخدوم نے فرار شدہ حاکم سیتل پروا اور اس کی آرکھ قوم کے لوگوں سے جنگ کی اور انہیں پسپا کر کے فتح حاصل کی مگر اس لڑائی میں آپ کے بڑے صاحبزادے مخدوم زادہ سید نصیر الدین مع دولت یار خاں شہید ہوگئے۔ ۲۵؎ آرکھوں نے بھاگ کر لکھنؤ میں پناہ لی۔ حضرت کے ساتھیوں نے آپ کے منجھلے بیٹے حضرت خواجہ سید احمد کی قیادت میں ان آرکھوں کا تعاقب کیا۔ لکھنؤ میں ان سے جنگ کی۔ لکھنؤ کی اس لڑائی میں آرکھ لوگ پوری طرح پسپا اور ختم ہوگئے لیکن یہاں خواجہ سید احمد کو بھی جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ۲۶؎ اندازہ ہے کہ فتح سندیلہ سے جنگ لکھنؤ تک جملہ جنگیں ۱۳۵۰ء اور ۱۳۵۱ء کے آس پاس ہوئیں۔ ۲۷؎

اب اس مکمل فتح اور کامرانی کے بعد حضرت مخدوم سید علاء الدین نے مع اپنے ساتھیوں، اکیلے زندہ بچ رہے بیٹے سید مجیر الدین اور کاکوری و لکھنؤ میں شہادت یافتہ صاحبزادگان کے فرزندوں مخدوم زادہ سید محمود (خلف سید نصیر الدین) و مخدوم زادہ سید مبارک (پسر سید خواجہ احمد) یعنی اپنے پوتوں کے ساتھ سیتل پروا میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ۲۸؎ چونکہ ان ساری جنگی مہموں اور اس میں فتح و نصرت حاصل کرنے میں حضرت مخدوم کا مقصد خوشنودیِ الٰہی، اس کے دین کی اشاعت اور سلسلۂ چشتیہ کی مقبولیت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنی اس عظیم کامیابی کی اطلاع نہ حکومت کو دی اور نہ اس کے کسی اہل کار کو، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے یہ خبر نہایت سرعت کے ساتھ دہلی پہنچی اور ہندوستان کے بادشاہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی انتہائی قلبی خوشی کا باعث ہوئی۔ تذکروں کے مطابق سلطان نے حضرت کو تہنیتی پیغام اور 'سندِ شاہی' روانہ کیے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہی نمائندہ آپ کی خدمت میں پہنچا اور پیغام تہنیت ارسال کرنے کے بعد جب اس نے 'شاہی سند' آپ کو دی تو آپ کی غیرت ایمانی کو جوش آ گیا اور آپ نے فرمایا کہ میں نے جو کیا ہے محض اللہ کے واسطے کیا ہے۔ مجھے بادشاہ کی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے شاہی نمائندے سے پروانۂ سند لے کر یہ کہتے ہوئے پھاڑ کر غرق آب کر دیا کہ ''سنداللہ کافی ست'' ۲۹؎ کہا جاتا ہے کہ یہ بات دور دور تک عوام وخواص میں مشہور ہوگئی اور اسی لمحے سے لوگ اس خطے 'سیتل پروا' کو سند اللہ کہنے لگے۔ پھر یہ لفظ سندالہ مشہور ہوگیا۔ بعد ازاں کثرت استعمال سے دھیرے دھیرے 'سندِ الہٰ' سے 'سندیلہ' کہا جانے لگا جو تا ایں دم مستعمل ہے۔ ۳۰؎ اس طرح حضرت مخدوم سید علاء الدین قدس سرہٗ کو موجودہ قصبہ سندیلہ کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ ۳۱؎ سندیلہ میں جس جگہ آپ رہتے تھے اسے مخدوم گڑھی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اب آپ کی درگاہ واقع ہے۔ ۳۲؎ الغرض آپ سارے خطے میں بے حد مقبول تھے۔ عوام بلاتفریق مذہب وملت آپ سے فیض حاصل کرتے۔ اب حضرت کی عمر بھی ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی، پھر عبادت و ریاضت کی کثرت اور مسلسل شب بیداری کے باعث ضعف بھی بڑھنے لگا تھا۔ چنانچہ ۲ رشوال ۷۶۴ھ مطابق ۱۵ رجولائی ۱۳۶۳ء کو علی الصباح ۷۴ سال کی عمر میں آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کی تدفین آپ کی خانقاہ میں ہی عمل میں آئی۔ ۳۳؎

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، سلطان فیروز شاہ تغلق حضرت مخدوم کے تئیں خاص عقیدت رکھتا تھا۔ سندیلہ میں آپ کی فتح سے وہ خاصا متاثر بھی تھا۔ تب ہی اس نے مخدوم صاحب کے واسطے سند روانہ کی تھی جسے آپ نے پھاڑ کر غرق آب کر دیا تھا لیکن سلطان آپ کے اس عمل سے ناراض ہرگز نہیں ہوا بلکہ آپ کے تئیں اس کی عقیدت میں مزید

اضافے کے شواہد ملتے ہیں۔ اپنی تاج پوشی کے ایک سال بعد غالباً ۱۳۵۲ء میں بنگال جاتے ہوئے سلطان فیروز تغلق دوران راہ، سندیلہ میں رکا اور خدمت حضرت مخدوم میں حاضر ہو کر ان سے کسب فیض کیا۔ ۳۴ حضرت کی رحلت کے بعد آپ کا شاندار مقبرہ اور اس سے ملحق عالی شان مسجد، سلطان فیروز شاہ کے حکم سے ہی تعمیر کرائے گئے۔ ۳۵ یہ دونوں عمارتیں مخدوم صاحب کی وفات کے پانچ سال بعد بن کر مکمل ہوئیں کیونکہ مسجد کی عمارت میں لگے کتبے میں اس کا سن تعمیر ۷۶۹ھ (مطابق ۶۹-۱۳۶۸ء) درج ہے۔ مسجد کی تاریخ ہے ''مسجد اقصیٰ است۔'' ۳۶ راجہ درگا پرشاد کا خیال ہے کہ اس مسجد کی بنیاد ۱۳۵۲ء میں اپنے سفر سندیلہ کے دوران ہی سلطان فیروز شاہ نے اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی۔ ۳۷ ۱۳۷۴ء میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق بہرائچ جا رہا تھا تو وہ دوران راہ دوسری مرتبہ نہایت عقیدت و احترام سے سندیلہ میں حضرت مخدوم قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوا۔ ۳۸ اس کے بعد وہ آخرِ دم تک سندیلہ کی ترقی پر خصوصی توجہ دیتا رہا۔ ۳۹

کسی بھی تذکرہ نگار نے حضرت مخدوم کے مریدین یا خلفا کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوا لیکن بعد کے بعض صاحبانِ سجادہ بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔ ان میں بقول درگا پرشاد، شاہ غیاث اللہ، شاہ روح اللہ، شاہ فضل اللہ، شاہ وصف اللہ، شاہ غلام علاء الدین، شاہ ولی اللہ، مولوی وارث علی اور شاہ وصی علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۴۰ ان میں بھی شاہ غلام علاء الدین اور ان کے بیٹے شاہ ولی اللہ اپنی علمی فضیلت اور تقویٰ کے باعث خصوصی شہرت کے مالک تھے۔ ۴۱ شاہ غلام علاء الدین کے پوتے مولانا سید محمد رضا شاہ صاحب بیسویں صدی کے شروع کے ممتاز صوفیا میں شمار ہوتے تھے اور مولود خوانی میں بے مثل تھے۔ ۴۲ محمد رضا شاہ صاحب کو اودھ کے نامور ولی کامل حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کی پوتی منسوب تھیں۔ ۴۳

درگاہ مخدوم صاحب کے آخری سجادہ نشین حضرت شاہ شمس الحق عرف ننھے میاں تھے۔ آپ فرنگی محل کے فارغ التحصیل گہری علمی نظر کے حامل اور ملک کے صوفیانہ حلقہ میں بڑی مقبولیت کے مالک تھے۔ آپ درگاہ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کے مشہور بزرگ اور سجادہ نشین حضرت عزیز میاں صاحب کے خلیفہ اور ان کے والد حضرت ننھے میاں صاحب کے مرید تھے۔ راقم الحروف نے شاہ شمس الحق صاحب کو اچھی طرح دیکھا ہے، شاہ صاحب کا وصال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ مخدوم صاحب کی اولاد میں ماضی قریب میں کئی نامور شخصیتیں گزری ہیں۔ راقم الحروف کے بچپن کے استاد اور برادر نسبتی مرحوم سید مقصود احمد نقوی بھی مخدوم سید علاء الدین کی اولاد میں تھے۔ مخدوم صاحب قدس سرہٗ کا عرس ہر سال یکم شوال بروز عید الفطر شروع ہو کر دو دن جاری رہتا ہے۔ ۴۴ اطراف و جوانب کے سیکڑوں عقیدت مندان، شریکِ عرس ہو کر فیضان روحانی سے باریاب ہوتے ہیں۔ ۴۵

حواشی وحوالے

۱- ریاست اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ سے تقریباً ۴۸ کلو میٹر کے فاصلے پر شمال مغرب میں یہ قصبہ طول البلد سے ۲۷ ڈگری ۴ پوائنٹ پر بجانب شمال اور عرض البلد سے ۸۰ ڈگری ۳۰ پوائنٹ پر بجانبِ مشرق واقع ہے۔ اس وقت سندیلہ یوپی کے ضلع ہردوئی کی تحصیل ہے۔ جس کے شمال اور شمال مشرق میں دریائے گومتی ہے جو اس کو ضلع سیتاپور سے الگ کرتی ہے۔ جنوب میں ضلع اناؤ اور جنوب مشرق میں لکھنؤ ہے۔ سندیلہ کے مغرب میں ضلع ہردوئی کی دوسری تحصیل بلگرام ہے اور شمال مغرب میں صدر تحصیل یعنی ہردوئی شہر ہے۔ تفصیل کے واسطے ملاحظہ ہو:

Gazetter of the Province of Oudh, Delhi, (Reprint), 1993,pp. 302-4, مزید ملاحظہ ہو۔ H. R. Nevill, I.C.S., ed. HARDOI: A Gazetteer: (Being Volume XLI of the District Gazetteer of the United Provinces of Agra and Oudh), Lucknow, 1922. pp 249-57, مزید ملاحظہ ہو Amar Singh Baghel, I.A.S. ed. Uttar Pradesh District Gazetteer of Hardoi, Lucknow, 1988, pp 277-79.

مزید ملاحظہ کریں: تاریخ سندیلہ، مصنفہ راجہ درگا پرشاد (مطبوعہ کارونیشن پریس) لکھنؤ، ۱۹۱۵ء ص-۲

۲- دیکھئے بطور مثال: گلشن ابراہیمی (المعروف بہ تاریخ فرشتہ)، مصنفہ محمد قاسم فرشتہ، (نول کشور) لکھنؤ غیر مؤرخہ، ص-۱۴۸۔ آئین

اکبری، مصنفہ ابوالفضل علامی، جلد اول۔ انگریزی ترجمہ از بلوک مین (طبع سوم) دہلی ۱۹۷۷ء، ص-۴۱۷

۳- ملاحظہ ہو رسالہ ادیب اردو، جون ۱۹۲۲ء ص-۸

۴- مرآۃ الاسرار، مصنفہ عبدالرحمٰن چشتی (قلمی) عبدالسلام کلکشن نمبر ۲۹/۹۳۴، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ورق ب ۹۸۷

۵- بحر ذخار، مصنفہ وجیہ الدین اشرف (قلمی) فارسیہ اخبار، یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ورق ۸۹۵۔

۶- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۴

۷- ایضاً

۸- ایضاً، ص-۲۳۳

۹- اخبار و انساب سادات سندیلہ، مصنفہ یقین احمد ہاشمی، لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص-۳۵ (بحوالہ 'مشاہیر سندیلہ' مصنفہ چودھری نبی احمد و مرتبہ نور الحسن ہاشمی)

۱۰- اخبار و انساب سادات سندیلہ، ص-۳۵

نوٹ: راقم الحروف کے نزدیک اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کوئی بات کہنا مشکل ہے۔ حضرت مخدوم کے وطن کی تحقیق سے متعلق اس گفتگو کے ضمن میں راقم الحروف اپنی دانست میں محفوظ ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ میرے بچپن کی بات ہے کہ سندیلہ کی ایک روحانی تقریب (عرس مولانا محمد رضا شاہ صاحب، جن کا ذکر درگا پرشاد نے اپنی تاریخ سندیلہ میں صفحہ ۲۳۶ پر کیا ہے۔) کے موقع پر وہاں کے مشہور صوفی بزرگ اور محمد رضا شاہ صاحب کے جانشین حضرت مختار حسین شاہ صاحب نے اکابرین سندیلہ کی موجودگی میں دوران گفتگو بتایا تھا کہ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد رضا شاہ صاحب نے یہ ذکر فرمایا تھا کہ مخدوم صاحب وسط ایشیا کے مشہور شہر سمرقند کے قریب کے رہنے والے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روحانی مجلس میں سندیلہ کے اس وقت کے مقتدر صوفیائے کرام موجود تھے جن میں درگاہ مخدوم صاحب کے اس وقت کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ شمس الحق عرف ننھے میاں صاحب اور سندیلہ کے مشہور عالم دین و قاضی شہر، آزادی ہند سے قبل مسلم لیگ کے ترجمان، روزنامہ 'تنویر' کے ایڈیٹر، مشہور زمانہ صحافی حضرت قاضی محمد رفیع الدین فریدی فاروقی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بھی حضرت مختار شاہ صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مخدوم صاحب کا وطن سمرقند کے قریب میں واقع ہونے کی توثیق کی تھی۔

راقم الحروف کے والد حضرت قاضی غلام صابر قدیری سندیلوی مرحوم بھی کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے استاد اور حقیقی چچا، سندیلہ کے ممتاز ریاضی داں اور مشہور دانش ور مولوی نیاز علی سندیلوی مرحوم، جو کہ متذکرہ بالا تینوں بزرگان سندیلہ کے بھی استاد تھے، سے متعدد مرتبہ سنا تھا کہ حضرت مخدوم سندیلوی کا وطن سمرقند کے قریب میں واقع کوئی قصبہ تھا۔ بہر حال ان تمام آرا و خیالات سے قطع نظر اس ضمن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے اور یہ مسئلہ مزید تحقیق طلب ہے۔

۱۱- اخبار و انساب سادات سندیلہ، ص-۳۴۔ ہاشمی صاحب کے محض اسی بیان سے ان کے سابقہ بیان کہ "مخدوم صاحب کا وطن عراق کا شہر وسط تھا" کی تردید ہو جاتی ہے۔ مصنف کے موجودہ بیان سے تو یہ بات صاف ہو گئی کہ حضرت مخدوم عراق کے رہنے والے نہیں تھے۔ ورنہ عراق سے ہندوستان آنا اور پھر حصول علم کے واسطے دوبارہ وہاں جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

۱۲- ایضاً، ص-۳۴

۱۳- ایضاً: نیز دیکھیں تاریخ سندیلہ (بحوالہ تاریخ الانساب، مصنفہ حافظ امام بخش سندیلوی) ص-۲۳۴

۱۴- سبع سنابل، مصنفہ میر عبدالواحد بلگرامی (اردو ترجمہ) بھیونڈی، مہاراشٹر، غیر مؤرخہ، ص-۵۸-۱۵۷

۱۵- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۳

۱۶- مرآۃ الاسرار (قلمی) ورق-۹۸۷: بحر ذخار (قلمی) ورق-۸۹۵: سبع سنابل (اردو) ص-۱۵۷: تاریخ سندیلہ، ص-۳۲،۳۳

نوٹ: مشائخ چشت کے حالات پر مبنی اولین کتب اور تذکروں میں حضرت چراغ دہلوی کے خلفا میں مخدوم سید علاء الدین کا نام نہیں ملتا ہے۔ البتہ خیر المجالس میں ۶۶ ویں مجلس میں سید علاء الدین نامی حضرت چراغ دہلوی کے ایک متعلق کا ذکر ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ سید علاء الدین مخدوم سید علاء الدین سندیلوی ہی ہیں۔ ملاحظہ ہو خیر المجالس (مجموعۂ ملفوظات حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی) مرتبہ مولانا حمید قلندر، تدوین از پروفیسر خلیق احمد نظامی، مطبوعہ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۵۹ء ص-۲۲۳

۱۷- ملاحظہ ہو، اخبار وانساب سادات سندیلہ، ص-۳۱

نوٹ: اس طرح کا اعتراض درست نہیں ہے کیونکہ سلسلہ چشتیہ اور دیگر روحانی سلاسل کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ تصوف میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جب مشائخ عظام نے اپنے مرشد کی حیات میں ہی اپنے مریدین کو خلافت واجازت سے نوازا ہے۔ خود چشتیہ سلسلہ کی ابتدائی تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ نے اپنے مرشد حضرت خواجۂ خواجگان سیدنا معین الدین چشتی اجمیری قدس اللہ سرہٗ کی حیات میں ہی اپنے محبوب ترین مرید حضرت شیخ فریدالدین مسعودالمعروف بہ بابا فریداجودھنی قدس سرہٗ کو خلاف واجازت عطا کردی تھی۔

۱۸- ملاحظہ ہو ضلع ہردوئی کا گزیٹئر، مرتبہ ایچ آر نیول: ص-۵۶/ ۲۵۵، نیز امرسنگھ بگھیل کا مرتب کردہ ضلع ہردوئی کا گزیٹئر، ص-۲۶۔ درگا پرشاد کی ''تاریخ سندیلہ'' سے بھی بڑی حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کے بقول بندوبست کی رپورٹوں اور افسران بندوبست کی تج کی تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ سلہا اور ملہا نام کے دو حقیقی بھائی قوم آرکھ کے تھے اور راول الذکر نے سندیلہ آباد کیا تھا لیکن سندیلہ کی تاریخی عمارات کے بیان میں درگا پرشاد نے سیتلا دیوی کے مندر اور تالاب کا ذکر بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تاریخ سندیلہ، ص-۳، عین ممکن ہے کہ سیتلا دیوی کے نام پر ہی قصبے کا نام سیتل پروا، رہا ہو۔

۱۹- تاریخ سندیلہ (مصنفہ درگا پرشاد)، ص-۲۳۳

۲۰- اخبار وانساب سادات سندیلہ، ص-۳۲، ادیب اردو جون ۱۹۲۲، ص-۹ دوسرے تمام تذکرہ نگاروں کی طرح ہاشمی صاحب اور مظفرحسین صاحب نے بھی حضرت مخدوم صاحب کا سن ولادت ۶۹۰ھ ہی لکھا ہے اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب نے سیتل پروا (سندیلہ) کے راجہ سے جنگ کرکے اس قصبے کو ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) میں فتح کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت حضرت کی عمر ۲۹ سال تھی۔ اس جنگ میں مخدوم صاحب کے بڑے اور منجھلے صاحبزادگان خواجہ نصیرالدین اور خواجہ سید احمد نے پہلے تو سندیلہ میں ہی شرکت کی، پھر کاکوری میں اور اس کے بعد لکھنؤ میں شہید ہوئے جیسا کہ مضمون میں آگے بیان ہوگا۔ یہاں یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ شہادت کے وقت یہ دونوں مخدوم زادگان شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے جیسا کہ خود ہاشمی صاحب نے بھی لکھا ہے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ مخدوم صاحب نے اعلیٰ تعلیم کے دوران جب بغداد میں عقد کیا تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کے آس پاس رہی ہوگی تو شہادت کے وقت ان کے مذکورہ صاحبزادگان کی عمریں دس اور نو سال کی رہی ہوں گی، اس سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان چھوٹی عمروں میں یہ مخدوم زادگان نہ صرف شادی شدہ ہو چکے تھے بلکہ صاحب اولاد بھی تھے۔ صاف ظاہر ہے اس وقت ان کی عمریں تیس کے آس پاس رہی ہوں گی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مخدوم ۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء میں بعہد سلطان علاء الدین خلجی سندیلہ آئے اور راجہ سندیلہ سے ان کی جنگ ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء میں (جس میں ان کی فتح ہوئی) درست نہیں ہوگا۔ یقیناً وہ عہد فیروز شاہ تغلق میں سندیلہ آئے۔ یہ بات اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ خود حضرت چراغ دہلوی کو حضرت نظام الدین اولیاء نے ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۳ء میں خلافت واجازت سے نوازا اور خرقہ عطا کیا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت چراغ دہلوی نے حضرت مخدوم کو ۷۱۶ھ مطاق ۱۳۱۶ء میں خلافت و اجازت سے نوازا۔ ملاحظہ کریں مقدمۂ خیرالمجالس مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص-۴۷ (بحوالہ سیر العارفین)

۲۱- اس ضمن میں جملہ تذکرہ نگاران یہی کہتے ہیں کہ مخدوم صاحب کو یہ زمین آپ کے مرشد نے عطا کی مگر چشتیہ سلسلہ کے ابتدائی مشائخ کے حالات سے صاف ظاہر ہے کہ ان بزرگان کو زمین جائیداد سے کبھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھلا حضرت چراغ دہلوی یہ کیوں کر کر سکتے تھے جو کہ سختی سے اپنے اسلاف کی پیروی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ یہ ۳۶۰ بیگھہ زمین بادشاہ وقت سلطان فیروز شاہ تغلق کی جانب سے دی گئی ہوگی، جو کہ بزرگان دین کا بڑا زبردست معتقد تھا۔ جیسا کہ مضمون میں بیان کیا گیا کہ سلطان فیروز شاہ تغلق دو بار سندیلہ آیا بھی تھا، ایک بار مخدوم صاحب سے ملنے اور دوسری مرتبہ ان کے مزار پر حاضری دینے۔

۲۲- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۴ (بحوالہ تاریخ حافظ امام بخش سندیلوی) ایسا لگتا ہے کہ حضرت مخدوم کے سندیلہ (سیتل پروا) پہنچنے سے تقریباً سو سال قبل مسلمان وہاں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں حضرت سید میران معزالدین نامی بزرگ کا ذکر بھی ملتا ہے جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ وہ سلطان التتمش کے عہد میں اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کی حیات میں بغداد سے ہندوستان آکر سندیلہ

میں آباد ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا مزار محلہ ثراحوض میں آج بھی موجود ہے۔ تاریخ سندیلہ، ص-۵-۴و۸-۲۲۶

۲۳- یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہمارے کچھ اہل علم حضرات اکثر مواقع پر یہ نکتۂ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے جہاد بالسیف سے گریز کیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی کچھ اسی طرح کا خیال ہے۔ بہرحال تاریخ تصوف کے وسیع مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگزیر حالات میں ہماری دینی تاریخ کی ان برگزیدہ روحانی شخصیتوں نے جہاد بالسیف سے ہرگز ہرگز منہ نہیں موڑا بلکہ ایسے نازک مواقع پر دشمن کا بے باکی سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور یہاں تک کہ منصب شہادت پر فائز ہوئے۔ اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو ہوسکتی ہے مگر یہاں اس کا موقع نہیں ہے اور نہ یہ ہماری موجودہ گفتگو کا موضوع ہے۔

۲۴- اخبارو انساب سادات سندیلہ، ص-۳۲

۲۵- ایضاً ص-۳۵: خواجہ سید نصیرالدین کا مزار کاکوری میں آج بھی تالاب 'ہودہ' کے کنارے واقع ہے۔

۲۶- یقین احمد ہاشمی، ایضاً ۳۵، خواجہ سید احمد کا مزار لکھنؤ میں محلہ معالی خاں کی سرائے میں تالاب اومانداس کے قریب متصل فراش خانہ وامام باڑہ الماس علی خاں واقع ہے۔

۲۷- جیسا کہ اس مضمون میں آگے آئے گا کہ سلطان فیروز شاہ اس فتح سندیلہ سے متاثر اور خوش ہوکر ۱۴۵۲ء میں حضرت مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یقیناً حضرت مخدوم نے سلطان کی سندیلہ آمد سے کچھ ہی قبل فتح حاصل کی ہوگی۔ یقین ہاشمی اور مظفر سلیمانی صاحبان کی یہ رائے کہ یہ جنگ ۷۱۹ھ یعنی ۱۴۱۹ء میں ہوئی صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ حضرت مخدوم کی یہ فتح سلطان کی نظر میں نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۸- اخبارو انساب سادات سندیلہ، ص-۳۲

۲۹- تاریخ سندیلہ، ص-۴، گزیٹیئر ضلع ہردوئی مرتبہ امر سنگھ بکھیل، ص-۲۷

۳۰- راجہ درگا پرشاد کا خیال ہے کہ لفظ سندیلہ کا مخرج 'سانڈل' ہے جو عہد قدیم کے کسی ہندو جوگی یا مذہبی پیشوا کا نام تھا۔ ان کے بقول اسی سانڈل آرکھ نے یہ جگہ خاص اپنی عبادت کے واسطے پسند کی تھی جہاں اب سندیلہ آباد ہے۔ دیکھیں تاریخ سندیلہ، ص-۷-۶

۳۱- راجہ درگا پرشاد حضرت مخدوم صاحب کو بانی سندیلہ ماننے پر تیار نہیں ہیں مگر راقم الحروف کے مطابق اس قصبہ کا نام سندیلہ حضرت مخدوم کی یہاں آمد کے بعد سے ہی پڑا جیسا کہ تفصیل سے اوپر بیان ہوا ہے۔ اس لحاظ سے انہیں بانی سندیلہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا۔

۳۲- اخبارو انساب سادات سندیلہ، ص-۱۳۲ اور تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۳

۳۳- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۴

۳۴- گزیٹئر ضلع ہردوئی، مرتبہ نیول، ص-۲۵۵۔ گزیٹئر ضلع ہردوئی، مرتبہ امر سنگھ بکھیل، ص-۲۷
لیکن کسی معاصر تذکرے یا تاریخ سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔

۳۵- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۴

۳۶- ایضاً

۳۷- ایضاً

۳۸- گزیٹئر ضلع ہردوئی، مرتبہ نیول، ص-۲۵۵۔ گزیٹئر ضلع ہردوئی، مرتبہ امر سنگھ بکھیل، ص-۲۷
یہ بات بھی معاصر تذکروں اور تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔

۳۹- ایضاً

۴۰- تاریخ سندیلہ، ص-۳۶-۲۳۵

۴۱- ایضا، ص-۲۳۶

۴۲- ایضا، ص-۲۳۶

۴۳- ملاحظہ ہو تذکرہ شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی، مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی (الفرقان پریس، لکھنؤ)

نوٹ: محمد رضا شاہ صاحب کے جانشین ان کے ممتاز خلیفہ حضرت شاہ مختار حسن صاحب تھے، جن کا شمار سندیلہ کی نامور روحانی شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ آپ کا وصال ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ آپ راقم الحروف کے دادا مرحوم مولوی اعظم علی صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے۔ راقم الحروف پر حضرت شاہ صاحب کا روحانی فیضان بے حد رہا ہے۔ اس وقت ان کے پوتے شاہ نورالحسن درگاہ سید محمد رضا شاہ صاحب کے سجادہ نشین ہیں۔

۴۴- تاریخ سندیلہ، ص-۲۳۴

۴۵- راقم الحروف کے والد بزرگوار حضرت قاضی غلام صابر قدیری سندیلوی کو حضرت مخدوم سے خصوصی روحانی لگاؤ تھا۔ آپ ہر سال عرس مخدوم میں شریک ہوتے اور ان کو منظوم خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔

❁❁❁

سید مخدوم اشرف سمنانی: حیات و خدمات

ادیب شہیر سید مظہر الدین اشرف .... ایم۔اے علیگ

انبیائے کرام کے حقیقی اور سچے وارث مقربینِ الٰہی ہیں۔ ان کے آستانے اور خانقاہیں حقوق انسانی کی بقا اور تحفظ کی ضامن اور وجہ طمانیت قلب اور زاویۂ اتحاد و اتفاق ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ نے دنیا کے گوشے گوشے اور بعض نے عالم کی سیر و سیاحت فرمائی اور رشد و ہدایت کا پیغام عوام الناس تک پہنچایا۔ صوفیا کے گروہ نے اسلام کے علمی، ادبی، تہذیبی، فکری اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کی۔ یہ لوگ بغیر کسی جبر و اکراہ، اسلام کے سچے سپاہی بن کر نمودار ہوئے، ہر آڑے وقت میں جہاد کا شرف حاصل کیا اور دین حق کی ستھری تصویر پیش کی اور رہنمائی بھی فرمائی۔ تاتاری فرماں روائی کی یورش اور یلغار سے جب بغداد تباہ ہو رہا تھا اور اسلام کی بقا خطرے میں پڑ گئی تھی تو اس وقت کے مشہور صوفی حضرت شیخ رشید الدین بن حضرت شیخ جمال الدین رحمہما اللہ علیہ نے تاتاری بادشاہ تو قلق ابن تیمور کو اپنے نور باطن سے حلقہ بگوش اسلام کیا۔ اس طرح شیخ رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کو ایک بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔ بقول شاعر ؎

ہم کو معلوم ہے تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

انہیں پاک نفوس قدسیہ کے متعلق قرآن ارشاد فرماتا ہے: اصلُھاثابتٌ و فرعُھا فی السماء ؂ ترجمہ: ان کی جڑ زمین میں اور شاخ آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اللہ کے رسول سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کچھ بندے ایسے ہیں جو نبی ہیں اور نہ شہید لیکن بارگاہ ایزدی میں ان کی نشست قرب مع اللہ پر لوگ رشک کریں گے۔ ایک اعرابی نے کہا اے اللہ کے رسول ان کا وصف بیان کیجیے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے محبت کی، پروردگار قیامت کے دن اُن کے لئے نور کے ممبر بچھائے گا۔" ؂

دین کی بات کتنے ہی خوبصورت انداز میں کیوں نہ کی جائے، چہ جائے کہ اس میں شاعری کی نزاکت ہو یا فصاحت و بلاغت سے بھر پور کلام، لیکن اللہ اور اس کے رسول کو احسن الکلام ہی پسند ہے اور اس میں اخلاص کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کے اسرار و رموز سے متاثر ہو کر ہزاروں گم کردہ راہوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا اور ابدی دولت سے مالا مال ہوئے۔

ہند و پاک اور بنگلہ دیش کی دھرتی کو یہ فخر حاصل ہے کہ عرب و عجم اور وسط ایشیا سے صوفیائے کرام کے متعدد قافلوں اور گروہوں نے یہاں سامان سفر کھولا ہے اور رشد و ہدایت کی بساط بچھائی ہے۔ مقربین الٰہی کے گروہ نے احترام آدمیت کا درس عام کیا اور لوگوں کی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلائی۔ اس خطۂ ارض کو صوفیا کی زبان میں ولایت ہند کہا جاتا تھا۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندی یا ہندوی کا ذکر اپنے دیباچہ غرۃ الکمال میں کیا ہے۔

مقربین الٰہی یا نفوس قدسیہ کی جماعت میں شہنشاہ ولایت شہباز بلند پرواز تارک مملکت سمنان حضرت غوث العالم میر سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنی مخلصانہ خدمت اسلام اور مجددانہ مساعی و بلند خیالات کے ساتھ سمنان کی سلطنت کو ترک کر کے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اپنے قدموں سے اس دھرتی کو منور اور سرفراز کیا ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل
عجب چیز ہے لذت آشنائی

میر سید اشرف نے خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کا کی اور اپنے پیش رو صوفیائے چشت کے مقدس مشن کو آگے بڑھایا۔ آپ نے سلسلۂ چشت کو کافی وسعت عطا کی۔ شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے بعد حقیقتاً آپ ہی کے ہاتھوں سلسلۂ چشتیہ کا احیاء ہوا یعنی از سر نو زندہ کیا۔ میر سید اشرف جہانگیر نے اپنے ہم عصر صوفیا میر سید علی ہمدانی

اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے ہمراہ الگ الگ خطوں میں اسلام کی آبیاری کی اور صوفیائے کرام کی تعلیمات کو عام کیا۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کا شمار ان صوفیائے کبار میں ہوتا ہے جو علم و عمل، کشف و کرامات، روحانی اسرار و رموز کے افہام و تفہیم میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کی اس خوبی کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''آپ صاحبِ کرامت و تصرف اور بڑے کامل اولیاء اللہ میں تھے۔...مرید ہونے سے قبل ہی آپ کشف و کرامات کے مقام علیا حاصل کر چکے تھے۔ حقائق اور توحید کے بارے میں بلند باتیں فرماتے تھے۔''[۴]

صاحب مراۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی فرماتے ہیں:

''شانِ رفیع، ہمت بلند، کرامات وافر کے مالک تھے۔ سلطان المشائخ کے بعد مشیخت اور ہدایت کو آپ نے از سرِ نو زندہ کیا۔ آپ کلام الٰہی، احادث نبوی، اقوال مرتضوی اور اصحاب کرام کے ترجمان تھے۔''[۵]

گلزارِ ابرار کے مصنف رقم طراز ہیں:

''کشف و کرامات، منازلِ مقامات کے آپ مالک تھے۔ آپ کے بیان سے عرفان کا آب حیات بہتا تھا۔ آپ کے دل سے شوق و محبت کی آگ کے شعلے اٹھتے تھے۔''[۶]

اکھراوتی اور ''پدومات'' کے مصنف ملک محمد جائسی رقم کرتے ہیں:

''برصد یقین امتِ محمدی صلعم بہ سبب ترک سلطنت برجمیع اولیاء اللہ فضیلت دارند حضرت سلطان العارفین ابراہیم بن ادہم و سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی۔''

سمنان میں ولادت:

تیسری صدی ہجری سے عباسی سلطنت کا زوال اور طوائف الملوکی کے آغاز اور پھر طاہریہ خاندان کا خراسان پر قبضہ، جس کا بانی مامون رشید کا سپہ سالار ُطاہر' تھا۔ صفاریوں نے طاہر کو شکست فاش دی اور خراسان و فارس پر قابض ہوئے۔ صفاریوں نے خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ سید تاج الدین مخدوم اشرف کے جد امجد کو عقیدتاً اور احتراماً شہر سمنان اور اس سے متصل کچھ زرخیز علاقے بطور نذر پیش کیے اور اس علاقے کو صفاری حکومت کے اختیار سے باہر کر دیا۔ سید تاج الدین نے سمنان کو اپنا دارالسلطنت اور مستقر بنایا۔ یہ شہر آج بھی موجودہ ایران میں مشہد ہائی وے پر واقع ہے اور یہاں کے مقابر اور کھنڈرات اور خانقاہیں عہدِ سید تاج الدین اور ان کے خاندان کی یاد دلاتی ہیں:

آج جس جنس کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے
(حالی)

ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں سمنان کی خوبصورتی کا ذکر کیا ہے۔ نور بخشیہ سلطنت میں سلطان ابراہیم (میر سید اشرف جہانگیر کے والد) کا نام بہت مشہور ہے۔ آپ ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر میں سلطنت (سمنان کی سلطنت) پر متمکن ہوئے اور کافی ترقی اور وسعت عطا کی۔ سلطان ابراہیم کے عہد میں علم دین کی بڑی ترقی ہوئی۔ لطائف اشرفی میں مذکور ہے کہ سمنان کی سلطنت کے ایک مدرسہ سے تقریباً ۱۲ہزار طلبا نے علوم و فنون میں کامل دست رس حاصل کی۔ مشہور خانقاہ سکاکیہ آپ ہی نے تعمیر کروائی تھی، جس میں ۱۶سال تک شیخ رکن الدین (ابن عربی کے شاگرد اور وحدۃ الشہود کے بانی) علاء الدولہ سمنانی نے درس کی خدمت انجام دی۔

سلطان ابراہیم کو بہت کم سنی (۱۲سال) میں تخت و تاج نصیب ہوا۔ آپ بہت عابد و زاہد اور شریعت کے پابند تھے۔ آپ کی شادی ۲۴سال کی عمر میں سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ خواجہ احمد یسوی کی صاحبزادی خدیجہ بیگم سے ہوئی۔ یہ خاتون قائم اللیل اور صائم النہار تھیں۔

مخدوم اشرف کی ولادت:

سلطان ابراہیم کو صالح اولاد کی آرزو تھی۔ ایک دن صبح صادق کے وقت اچانک ایک مجذوبِ کامل آپ کے ہم نام، محل میں داخل ہوئے، اس وقت آپ اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ مجذوب کامل نے سلطان کو دو لڑکوں کی بشارت دی پھر کچھ دنوں بعد آپ نے رسول کریم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے بھی دو اولادِ ذکور کی بشارت دی اور فرمایا کہ ایک کا نام اشرف رکھنا اور دوسرے کا اعرف۔ اشرف

روحانیت کے سرتاج ہوں گے اوران سے تمام عالم استفادہ کرے گا۔ چنانچہ سید اشرف ۷۰۹ھ (بہ اختلاف رائے ۷۰۸ھ) میں اس عالمِ آب و گل میں تشریف لائے۔ صاحب نزہۃ الخواطر رقم طراز ہیں:

"السید شریف العلامة العفیف اشرف بن ابراهیم الحسنی و الحسینی المشهور به جهانگیر ولد بمدینة السمنان."

سلسلۂ نسب:

میر سید اشرف کا پدری سلسلۂ نسب ۲۰ واسطوں سے سرکار مدینہ تک پہنچتا ہے اور مادری سلسلۂ نسب امام حسن رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ یعنی آپ حسنی اور حسینی سادات سے تھے۔

تکمیل علوم:

چار سال چار ماہ چار دن کی عمر شریف میں آپ کو سید عماد الدین تبریزی نے بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کرائی۔ ایک سال کی عمر میں سات قرأت کے ساتھ قرآن شریف کا حفظ مکمل کیا۔ ۱۲ سال کی عمر میں جملہ علوم منقول و معقول پر دست رس حاصل کی۔ اسی دوران آپ کے والد محترم کا انتقال ہوگیا اور سلطنت کی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ آپ کے زمانہ حکومت کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور ہوئے، جن کا ذکر لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی کے مرتبین نے مختلف لطائف اور مکتوبات میں کیا ہے۔

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے عدل وانصاف میں حقوق انسانی کے علاوہ جانوروں کے حقوق کا تحفظ بھی شامل تھا۔ مثلاً جب باز کوئی شکار پکڑ کر لاتا تو آپ اس کے پنجے سے پرندے کو آزاد کرا دیتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کسی جانور کو ذبح کرنے کے روادار نہ تھے۔ آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی حیوانِ ناطق یا غیر ناطق کو رنج و تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

تربیت:

میر سید اشرف کی تربیت بڑے بڑے محدثین، علما، مشائخ اور صوفیائے کرام نے فرمائی ہے۔ دوران سلطنت حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کی تربیت خاص کی۔ اذکارِ اویسیہ کی تلقین حضرت اویس قرنی نے روحانیت کے عالم میں کی جس پر آپ ۳۰ سال تک عمل کرتے رہے۔ آپ نے شیخ علاء الدولہ سمنانی سے استفادہ کیا۔ عبدالرزاق کاشی سے شرح فصول الحکم سبقاً سبقاً پڑھی۔ بعدازاں شرح فصوص الحکم کی شرح بھی تصنیف کی۔ شیخ بہاء الدین نقش بندی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، شاہ بدیع الدین مدار اور مرشد برحق شیخ علاء الحق پنڈوی سے باطنی علوم کی تحصیل کی۔ نیز مخدوم العالم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے جنازہ کی نماز پڑھائی اوران سے روحانی فیوض و برکات اور تبرکات حاصل کیے۔

ترک سلطنت:

سلطنت کے پیچیدہ مسائل اور سیاسی داؤ پیچ کے باوجود آپ نے امورِ سلطنت پر شریعت مطہرہ کے مطابق عمل کرکے دکھایا۔ آپ کے پاس ایک دن حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر سلطنت لامتناہی چاہتے ہو تو ہندوستان کا سفر کرو، وہاں بھائی علاء الحق پنڈوی تمہارے منتظر ہیں۔ آپ نے اسی وقت بادشاہت کو ترک کرنے کا عزم مصمم کرلیا اور والدہ محترمہ سے اجازت کے لئے تشریف لے گئے۔ والدہ نے فرمایا کہ بیٹا تمہاری ولادت سے پہلے میرے والد خواجہ احمد یسوی نے فرمایا تھا کہ خدیجہ تمہارے یہاں ایک فرزند پیدا ہوگا جس کے نورِ ولایت سے سارا جہاں منور ہوگا اور دستِ حق پر ہزار ہا لوگ مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ چنانچہ آپ نے سلطنت کی سپردگی اپنے چھوٹے بھائی کو کی اور حق کی راہ میں مردانہ وار عازمِ سفر ہوئے۔ بخارا، سمرقند سے ہوتے ہوئے ملتان (اُوچ شریف) پہنچے جہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت آپ کے منتظر تھے۔ مخدوم جلال الدین بخاری نے آپ کو خلافت اور نعمت غیر مترقبہ سے سرفراز کیا اور چودہ سلاسل اور خانوادوں کی بیعت و خلافت آپ کے سپرد کی گئی۔ تجلیِ بسیط ولطیف اور مقامِ غوثیت کے گر بھی سکھائے۔ جو شخص سلسلۂ اشرفیہ سے بیعت ہے وہ جملہ سلاسل میں مرید ہے۔ اوچ سے سیدھے دہلی اور پھر پنڈوہ پہنچے۔ آپ کے شیخ نے وہاں بڑی گرم جوشی سے آبادی کے باہر آکر آپ کا استقبال کیا اور اپنے مرشد کی پالکی میں سوار کرکے خانقاہ میں لائے، کچھ مدت بعد علاء الحق پنڈوی نور اللہ مرقدہ نے آپ کو ایک رات (شعبان کی پندرہویں شب) جہانگیر کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ آپ نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

مرا از حضرتِ پیر جہاں بخش
خطاب آمد کہ اے اشرف جہانگیر

شیخ علاء الحق پنڈوی:

آپ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے اور حضرت اخی سراج سرکار آئینۂ ہند کے مرید خاص اور خلیفۂ اول تھے۔ خلیق احمد نظامی نے شیخ علاء الحق کے متعلق رقم کیا ہے:

''ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، حضرت اخی سراج کی صحبت سے ایسے متاثر ہوئے کہ فقر کی زندگی اختیار کرلی۔ علاء الحق کے بعد ان کے خلفا نور قطب عالم اور میر سید اشرف جہانگیر نے سلسلہ کو مقبول عالم بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔'' ۷

علاء الحق پنڈوی کے والد کا نام اسد لاہوری تھا۔ مرشد کی اتنی خدمت کی کہ لوگ حیران اور ششدر رہ جاتے۔ اپنے سر پر مرشد کا کھانا گرم رکھنے کے لئے انگیٹھی اٹھائے رکھتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۹۸ء میں ہوئی۔ پنڈوہ شریف (لکھنوتی) مالدہ ضلع، مغربی بنگال میں آپ کا اور آپ کے خاندان اور خلفا کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے اور ہر سال ۲۵ رجب کو عرس کی تقریب منائی جاتی ہے۔

حاجی عبدالرزاق نور العین:

بنگال کے قیام کے دوران مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی ایک دن مرشد کی خدمت میں جانے کے لئے تیاری فرما رہے تھے کہ دفعتاً شیخ پنڈوی کا گزر اس طرف ہوا، فرمایا کہ سید کیا کر رہے ہو؟ آپ نے فرمایا خدمتِ شیخ کے لئے کمر باندھ رہا ہوں۔ مرشد نے فرمایا ذرا مضبوط باندھنا! اس اشارہ سے حضرت مخدوم صاحب نے ایک معنی یہ لیا کہ غالباً مجرد رہنے کا اشارہ مرشد کر رہے ہیں۔ آپ نے اسی وقت شادی نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس خیال کو علاء الحق پنڈوی نے سمجھ لیا اور اپنے کشف باطن سے معلوم کرلیا۔ چنانچہ ایک فرزند معنوی کی بشارت دی۔ جب آپ دوبارہ عراق کے سفر پر تشریف لے گئے تو حسن عبدالغفور جو آپ کے بہنوئی (خالہ زاد بہن کے شوہر) تھے اور خانوادۂ غوث الاعظم سے نسبی تعلق تھا، ایک چھوٹے بچے کو آپ کے پاس لائے اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں مجھ سے فرمایا کہ اپنے اس بیٹے کو اشرف کی فرزندی میں دے دو۔ آپ نے قبول فرمالیا اس سلسلے میں رفعت بلگرامی رقم کرتی ہیں:

''سید عبدالرزاق اس وقت سے مخدوم صاحب کی آغوشِ ولدیت میں پرورش پاتے رہے اور مرتبۂ غوثیت پر فائز ہوئے۔ آپ کا نسبی تعلق شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی سے ہے۔'' ۸

حضرت سید عبدالرزاق نور العین اپنے اسلاف کے ترجمان تھے۔ غوث العالم کے زیر سایہ رہنا ہی علوئے قربت کی دلیل ہے۔

حضرت مخدوم اشرف سمنانی آپ کے متعلق فرماتے ہیں۔

''دوسرے صُلب سے بچہ پیدا کرتے ہیں میں نے عبدالرزاق کو اپنی آنکھوں سے پیدا کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ میں اس سے نسبتیں رکھتا ہوں قرابت داری کی نسبت اور روحانی بھی۔'' ۹

مخدوم الآفاق حضرت نور العین ایک قادر الکلام شاعر اور اچھے نثر نگار تھے۔ ان کا سبک انداز وہی ہے جو اس زمانہ میں رائج تھا۔ آپ کی تصانیف اور فارسی کلام راقم الحروف کے پیش نظر ہیں۔ اس مضمون میں اس کو اجمالاً بھی بیان کرنا طوالت کو دعوت دینا ہے۔ کیونکہ اس مضمون میں گنجائش کم ہے اس لئے آئندہ پر محمول کیا جاتا ہے۔

حضرت نور العین کی زندگی کا اہم وصف یہ ہے کہ آپ نے بیس برس تک غوث العالم محبوب یزدانی کے وضو کا بچا ہوا پانی نوش فرمایا۔ آپ سے ایک بہت بڑا خاندان وجود میں آیا۔ مخدوم صاحب کی نسبت کے سبب اس خاندان کو خاندان اشرفیہ کہا جاتا ہے۔ مخدوم الآفاق حضرت عبدالرزاق نور العین کے پانچ صاحبزادے تھے۔ یہ سب بقول مصنف مرأۃ الاسرار ''صلاح وسعادت و بزرگی کے زیور سے آراستہ تھے۔'' ۱۰

مخدوم صاحب کی پنڈوہ سے روانگی:

حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی ایک مدتِ مدید تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت اقدس میں رہے۔ دورانِ قیامِ پنڈوہ آپ نے خطاطی کے بہتر نمونے شیخ کی خدمت اقدس میں مختلف طغرے کی شکل میں پیش کیے۔ یہ طغرے آج بھی پنڈوہ کی خانقاہ علائی کے مختلف دروازوں پر آویزاں ہیں۔ ایک دن آپ کے مرشد حضرت شیخ علاء الحق پنڈوی نے فرمایا کہ اے فرزندِ اشرف مثل مشہور ہے کہ دو شیر ایک

میدان میں نہیں ٹہلتے اور دو تلوار ایک میان میں نہیں رہتیں، اب مناسب ہے کہ تمہارے لئے جگہ تجویز کردوں، جہاں اہل زمانہ تم سے فیض یاب ہوں، گمراہوں کی ہدایت کے لئے مشعل راہ بنو اور تشنگان حق و معرفت تمہارے سرچشمۂ فیض سے سرفراز ہوں۔ آپ کو مرشد کی جدائی کا بہت رنج ہوا۔ اس رنج کا اظہار اپنی ایک نظم میں کیا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

بدرگاہِ تو اشرف در بود خاک
بہ جامِ جمشیدی و گنجر وائی

مرشد کے حکم سے عید کے دن پنڈوہ سے مخدوم صاحب نے کوچ فرمایا۔ رخصت کے وقت خانقاہ علائی کے ہزاروں لوگ اکٹھا ہوئے۔ ہر ایک کی آنکھیں اشک بار تھیں، آپ کو جونپور کی ولایت دی گئی۔ مرشد نے یہ بھی فرمایا کہ پہلی فتح ظفر آباد میں ہوگی۔ آپ اصحاب کے ہمراہ منازل طے کرتے ہوئے ظفر آباد پہنچے۔ یہاں مسجد ظفر خاں میں فروکش ہوئے اور اپنے جانوروں کو صحن مسجد میں باندھ دیا، یہ دیکھ کر کچھ لوگ چہ می گوئیاں کرنے لگے، لیکن آپ کے نور باطن اور کرامات کے سبب یہ لوگ تائب ہوئے۔ اسی مسجد میں شیخ کبیر عباسی ارادت بیعت سے سرفراز کیے گئے۔ جب لوگوں نے شیخ کبیر کی بیعت کا قصہ شیخ حاجی چراغ جہاں کو سنایا تو انہیں ناگوار گزرا کہ جو شخص اُن سے مرید ہونا چاہتا ہو وہ کیسے مخدوم اشرف سے مرید ہو گیا۔ بددل ہو کر حاجی چراغ جہاں نے بددعا دی کہ شیخ کبیر جوان مرے۔ شیخ کبیر کو اس کا بہت ملال ہوا۔ مخدوم صاحب نے ارشاد فرمایا کہ تم بوڑھے ہو کر دنیا سے کوچ کرو گے۔ تم بھی ان کے حق میں جو کہو گے وہ پورا ہوگا۔ حضرت شیخ کبیر نے عرض کیا کہ حضور میرے سامنے چراغ ہند کی وفات ہو جائے۔ حضرت قدوۃ الکبریٰ نے فرمایا کہ یہ آسان ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی شیخ کبیر جوانی میں بوڑھے ہو گئے اور حاجی چراغ ہند نے ان سے پانچ سال قبل وفات پائی۔ مخدوم صاحب، شیخ کبیر اور چراغ ہند کی پیش گوئیاں پوری ہوئیں۔ قضا و قدر کا تبدل اولیائے کرام کی کرامات کا حصہ ہے۔

جب حضرت قدوۃ الکبریٰ (مخدوم صاحب) کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی تو چراغ ہند کی آتش عصبیت کو مزید جنبش ہوئی۔ اس فکر میں ہوئے کہ اظہار تصرف کریں۔ چنانچہ ایک دن مخدوم صاحب مع اصحاب کے مسجد میں تشریف فرما تھے کہ یکا یک اصحاب کو گرمی محسوس ہونے لگی کچھ دیر تو بیٹھے رہے پھر تاب نہ لا کر باری باری باہر نکلنے لگے اور صرف مخدوم صاحب تنہا رہ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چراغ کی آگ ہے اس کو بجھانا آسان ہے۔ ایک شخص سے فرمایا کہ تھوڑا سا پانی گرا دو کہ چراغ کی آگ فرو ہو جائے۔ پانی گرانا تھا کہ شیخ چراغ ہند مفلوج ہو گئے۔ یہ زحمت ان کی خود کی لی ہوئی تھی، چنانچہ اکابر روحانیہ سے استمداد کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاملہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ آپ نے فرمایا فرزند اشرف مہمان تھے اور کچھ نہ بھی ہوتے تو میرے فرزند خاص تھے، تم کو لحاظ کرنا چاہیے تھا جاؤ، ان سے معذرت طلب کرو۔ جمیع اکابرین اولیا کی روحوں نے بھی آپ سے معذرت طلب کی، جب صلح ہو گئی تو فرمایا کہ ہر ولی کی توجہ اس بات پر ہونی چاہیے کہ وہ خلق کی خبر گیری کرتے رہیں نہ کہ آپس میں ٹکرائیں اور پھر آپ نے یہاں سے کوچ کا حکم دیا۔

جون پور میں قیام:

جون پور پہنچ کر مسجد اٹالہ میں آپ نے قیام فرمایا۔ یہاں ایک نہایت معزز اور محترم عابد و زاہد سرچشمۂ تصوف اور یکتائے علم و فن میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی آپ سے دست بوسی اور قدم بوسی کرنے مسجد میں تشریف لائے۔ قاضی شہاب الدین کے ہمراہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور ان کی اولاد بھی آپ سے ملنے اور فیض حاصل کرنے آئے۔ ایک دن بادشاہ نے چنار کے قلعے کی فتح کے لئے حضرت سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا فرمائی۔ دعا قبول ہوئی اور بادشاہ فتح یاب ہوا۔ فتح چنار کے بعد ابراہیم شاہ شرقی نے اپنی اولاد کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور مرید کر لینے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ ان کی اولاد کو حضرت نے مرید کیا اور سلطان کو دعاؤں سے نوازا۔ جون پور کے قیام میں آپ کی ملاقات ایک ممتاز اور وحید العصر عالم دین مولانا کریم الدین سے ہوئی۔ مولانا نماز میں لذت نہیں محسوس کر پاتے تھے۔ سجدے میں حضوری قلب کے خواستگار تھے۔ آپ نے فرمایا مولانا! میرے شانہ سے شانہ ملا کر اقامت کرو۔ مولانا نے ایسا ہی کیا۔ پہلی رکعت میں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے پاؤں زمین پر نہیں ہیں اور کعبہ ان کے سامنے ہے۔ دوسری رکعت میں اپنے کو عرش معلیٰ پر

پایا۔ اختتام نماز پر مقامِ جبروت پر پہنچ گئے۔ اب مولانا کی حالت غیر ہوگئی۔ مخدوم صاحب نے آپ کو سہارا دیا اور فرمایا: ''مولانا! لذت سفر میں ہے، قیام میں نہیں'' مولانا کریم الدین نے اپنی تصنیف میں سید اشرف کو ایسا دریا کہا ہے کہ جس کا کوئی ساحل نہیں۔

قاضی سید عبدالملک عرف سید اجمل رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے نام ور مشائخ تھے۔ آپ کو سلسلۂ قادریہ چشتیہ سہروردیہ میں بیعت و خلافت مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری سے ملی تھی۔ شیخ قوام الدین دہلوی سے آپ کو خرقۂ خلافت حاصل ہوا۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے آپ کو سلطنت شرقیہ میں صدر جہاں کے عہدے سے سرفراز کیا تھا۔ اس نے آپ کے لئے دریائے گومتی کے کنارے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں رقم طراز ہیں:

''سیدے بود و او راشیخ اجمل می گفتند از اکابر وقت بود''

(ترجمہ: ایک سید تھے جن کو شیخ اجمل کہتے ہیں اپنے وقت کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔)[۱۱]

ایک بار قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور سید اجمل دربار میں آگے پیچھے بیٹھے تھے۔ قاضی شہاب الدین چوں کہ علم و فضل میں سید اجمل سے زیادہ متبحر تھے، اس لئے وہ آگے بیٹھنا چاہتے تھے لیکن سید اجمل کہتے تھے کہ آپ کا علم مشکوک اور مشتبہ ہے اور مجھے آل نبی ہونے کی فضیلت حاصل ہے، اس لئے مجھے آگے بیٹھنا چاہیے۔ لمبی بحث چلی اور ایک رسالہ علم کی فضیلت پر قاضی نے تصنیف کر ڈالا۔ مخدوم اشرف کو جب اس کی اطلاع بہم پہنچی تو انہیں قاضی کی یہ جسارت پسند نہ آئی اور ان کی طرف سے مزاج میں خفگی پیدا ہوگئی، اخبار الاخیار کے مصنف نے اس واقعے کو اجمالاً رقم کیا ہے، لکھتے ہیں:

''استاذ قاضی شہاب الدین را ایں از وے ناخوش آمد مزاج از وے منحرف گشت۔''

ترجمہ: قاضی شہاب الدین کے استاد کو یہ جرأت پسند نہ آئی ان کی طرف سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔''[۱۲]

قاضی شہاب الدین کو جب حضرت مخدوم پاک کی خفگی کا علم ہوا تو انہوں نے استاد کی خفگی کو دور کرنے کے لئے رسالہ فضیلتِ علم کو دریائے گومتی میں ڈال دیا اور سادات کے مناقب، تقدس اور افضلیت میں رسالہ تصنیف کیا۔

''کتابے کے تصنیف کردہ بود بدریا انداخت بجائے آں درمناقب سادات رسالہ تالیف کرد۔'' ترجمہ: قاضی صاحب نے اپنی تصنیف کردہ کتاب کو دریا میں ڈبو کر سادات کی افضلیت اور تقدیس میں رسالہ تصنیف کیا۔[۱۳]

پھر رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ قاضی صاحب کے اس فعل کی نبی کریم نے تعریف کی۔ مخدوم اشرف کے ایماء سے قاضی صاحب کو ملک العلماء کا خطاب ملا۔

کچھوچھہ شریف میں تشریف آوری:

حضرت مخدوم پاک جونپور سے ہوتے ہوئے موضع بھدوڑ میں فروکش ہوئے۔ گاؤں کے باہر ایک باغ تھا وہاں قیام کیا۔ ملک محمود پہلے شخص تھے جو آپ سے باغ میں ملنے آئے تھے۔ ملک محمود اس علاقے کے رئیس تھے۔ آم کے درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے، جب خواب سے بیدار ہوئے تو اصحاب نے دیکھا کہ اس درخت کی شاخ مشرق کی جانب جھک گئی ہے۔ ملک محمود کے ہمراہ آپ اس جانب روانہ ہوئے۔ آپ نے اپنی آخری آرام گاہ کی جانب اشارہ کیا اور کہا کہ میرے پیر و مرشد نے مجھے اسی جگہ کے لئے حکم دیا ہے۔ ملک محمود نے عرض کیا اس جگہ ایک جوگی رہتا ہے، اگر حضور میں ان سے مقابلہ کی قوت ہو تو اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا قل جاء الحق وزھق الباطل، مخدوم صاحب نے جوگی کے پاس ایک خادم کو بھیجا اور کہا کہ اس سے کہہ دو کہ وہ یہاں سے چلا جائے، اس نے کہا کہ میرا نکلنا آسان نہیں ہے۔ میرے پاس پانچ سو جٹا دھاری چیلے ہیں۔ اگر کسی کے اندر ولایت کی طاقت ہوگی تو وہ مجھ کو نکال سکتا ہے۔ حضرت نے اپنے مرید خاص جمال الدین کو اشارہ فرمایا جاؤ اور یہ جوگی جو کچھ طلب کرے پورا کردو۔ جمال الدین کچھ سہمے، آپ نے فرمایا میرے پاس آؤ اس وقت آپ کچھ نوش فرمارہے تھے، ان کے منہ میں ڈال دیا۔ جمال الدین کو قوت محسوس ہوئی اور دلیرانہ قدم بڑھاتے ہوئے جوگی تک پہنچ گئے۔ بالآخر مقابلہ شروع ہوا، جمال الدین نے کہا

نے آپ کو آغوش عاطفت میں لے لیا اور سینہ سے لگا لیا۔

عطائے منصب غوثیت:

حضرت مخدوم پاک ارشاد فرماتے ہیں: اس عہدہ (مرتبہ غوثیت) کی تفویض سے قبل یہ فقیر طبقہ حاجات میں تھا اور میرا نام عبدالملک تھا۔ میری جگہ غوث کے تخت کی جانب یسار (دائیں) تھی، جب اس فقیر کو مسند غوثیت عطا ہوئی تو عبدالرب جو تخت غوث کے جانب یمین تھے، جانب یسار آ گئے اور جانب یمین میں اوتاد میں سے ایک آیا۔ اوتاد میں ایک ابدال میں سے آیا اور ابدال میں ایک اخیار میں سے آیا اور اخیار میں ابرار سے اور ابرار میں ایک نجبا میں سے اور نجبا میں ایک نقبا میں سے اور نقبا میں ایک عامۃ المومنین سے مخصوص کیا گیا۔

حضرت اصیل الدین شہباز نے ایک مرتبہ ایک خطیب کا ذکر چھیڑا تو حضرت قدوۃ الکبریٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے مرشد کی خدمت میں تھا تو حضرت نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو غوثیت کا مقام عطا کرے تو نور قطب عالم کے لئے مرتبۂ قطبیت کی سفارش کیجئے گا۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی لطائف اشرفی میں فرماتے ہیں کہ ''صوفیا درختوں اور پرندوں کی تسبیحات بھی سنتے ہیں اور اگر چہ اس دنیا میں ظاہری آنکھوں سے خدا کا دیدار ممنوع ہے لیکن خواب میں ذات خداوندی کی تجلی کا دیدار نہیں ہوتا ہے اور بیداری میں دل کی آنکھوں سے اس تجلی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مخدوم اشرف سمنانی کے تعلق سے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ ناکافی ہے کیونکہ مخدوم صاحب کا علم و عمل اور تصنیف و تالیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ آپ اپنے وقت کے جید عالم کے ساتھ صوفیائے کبار میں شمار کیے جاتے تھے، آپ کی زندگی کے تمام اوصاف کو رقم کرنا خاکسار کے لئے ایک کوہ گراں سے کم نہیں ہے۔ محض یہ ادنیٰ ساتحفہ قارئین کے لئے رقم کیا گیا ہے تاکہ ہماری بھی اصلاح ہو جائے اور تصوف کا فروغ بھی مخدوم اشرف کے حوالے سے ممکن ہو سکے۔

ماخذ و مصادر

۱- (الف) تاریخ دعوت عزیمت حصہ اول (ب) ''فتنہ تاتار اور اسلام کی آزمائش'' (ج) ''دعوت اسلام'' ڈاکٹر عنایت اللہ

۲- سورۂ ابراہیم نمبر ۲۴-۲۵ صحیح مسلم شریف۔

۳- برصغیر میں علم حدیث- از سید سلیمان ندوی۔

۴- اخبار الاخیار اردو ترجمہ ص-۳۵۸

۵- مرآۃ الاسرار (اردو) عبدالرحمٰن چشتی۔

۶- (الف) اذکار ابرار لاہور- ص-۱۴۵ (ب) سید اشرف سمنانی از سید شمیم اشرف۔

۷- تاریخ مشائخ چشت- خلیق احمد نظامی- آب کوثر- ص-۳۰۶

۸- Some Revenue Grantsto on family of syed Ashraf Jahangir Simnani

۹- لطائف اشرفی (فارسی)

۱۰- مرآۃ الاسرار عبدالرحمٰن چشتی

۱۱- (الف) اخبار الاخیار مولوی عبدالحق محدث دہلوی- ص-۷۳ (ب) سالک السالکین (ج) تجلی نور

۱۲- اخبار الاخیار از مولانا عبدالحق محدث دہلوی

۱۳- خزینۃ الاصفیاء از غلام سرور۔

❁❁❁

بقیہ صفحہ: ۲۲۲ کا

کتابیات

۱- تاریخ کشمیر۔ از سید علی

2- فتوحات کبرویہ۔ از عبدالوہاب نوری

3- ریشی نامہ۔ از بابا نصیب

4- تاریخ حسن۔ از حسن شاہ

5- تاریخ کبیر۔ از محی الدین مسکین

6- ریشی نامہ۔ از بہاؤالدین متو

7- اسرار الابرار۔ از داؤد مشکوتی

8- واقعات کشمیر۔ از محمد اعظم دیدہ مری

9- نورنامہ مرتب۔ از محمد امین کامل

10- کشمیر میں اشاعت اسلام۔ از پروفیسر محمد اسحاق خان

11- Sufism in Kashmir از پروفیسر عبدالقیوم رفیقی

12- زین انامہ۔ از پیرزادہ سمیر شفیع صدیقی

13- ریشی نامہ کلاں۔ از خواجہ غلام مصطفیٰ شاہ

❁❁❁

شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کا کلام: تصوف کے آئینے میں

ڈاکٹر انجم ضمیر .... بیدر کرناٹک

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سیّد نورالدین یزدی ہے۔ آپ شاہ نعمت اللہ ولی کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ شہر حلب میں بروز پنج شنبہ ۲۲؍رجب ۷۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ سادات کا یہ گھرانہ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھا۔ بچپن عراق میں گزرا، جوانی مکہ معظمہ میں سات سال رہ کر گزاری، اس وقت آپ کی عمر شریف ۲۴ برس کی تھی۔ آپ نے شیخ عبداللہ یافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوکر راہِ سلوک طے کی اور ان کے خلیفۂ مجاز بنے پھر سمرقند، ہرات اور یزد میں مقیم رہے اور ہر جگہ مریدوں کی بڑی تعداد حلقۂ ارادت میں داخل ہوتی چلی گئی پھر ماہان میں جو کرمان سے ایک فرسخ پر واقع ہے مستقل سکونت اختیار کرلی اور زندگی کے پچیس سال یہیں رہے۔

شاہ صاحب امیر تیمور کے زمانے کے نام ور سادات اور جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں۔ آپ کی خانقاہ قصبہ ماہان ضلع کرمان میں زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ وغیرہ کی طرح شاہ صاحب نے ایک سلسلہ ''نعمت اللّٰہی'' رائج فرمایا۔ آپ کے مریدین وخلفائے معتقدین اور پسماندگان اپنے نام کے ساتھ ''نعمت اللّٰہی'' لکھتے ہیں:

''تصوف کے معنی ہیں خلق جمیل ۔ یہ علم مبنی ہے ارادے (نیت) پر، وہی اس کی بنیاد ہے۔ اس علم کا قلب سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں قلب سے متعلق رکھتی ہیں۔ اسی لئے اسے علم باطن کہتے ہیں۔ جس طرح علم فقہ، احکام اعضاء وجوارح کی تفاصیل پر مشتمل ہے۔ اسی لئے اس کو علم ظاہر کہتے ہیں''۔ (تاریخ تصوف اسلام)

علامہ فخر الدین رازی نے اباحۃ السماع میں لکھا ہے:

''اہل سنت کے تین گروہ ہیں، فقہا، محدثین، صوفیہ۔ فقہا محدثین کو اہل ظاہر کہتے ہیں کیوں کہ وہ حدیث پر اعتماد کرتے ہیں۔ محدثین فقہا کو اہل الرائے کہتے ہیں کیوں کہ وہ درایت کو ترجیح دیتے ہیں اور تنہا روایت کی مخالفت جائز سمجھتے ہیں اور صوفیہ خدا کی طرف التفات کو حاصل دین سمجھتے ہیں اور کسی معین حدیث کو قبول نہیں کرتے جیسا کہ بعض صوفیوں نے کہا ہے کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں، اس کا یہی مطلب ہے جو بیان کیا گیا۔ صوفی اس پر یہ حدیث دلیل میں لاتے ہیں کہ '' میری امت کا اختلاف دین میں فراخی اور وسعت کا سبب ہے۔''

حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کا صوفیانہ کلام نہایت بلند پایہ ہے۔ آپ علم الکلام، حکمت، بلاغت، فصاحت، ادب، فقہ وتفسیر کے ایک متبحر عالم تھے۔ حضرت کی تصانیف عالیہ کی تعداد تین سو تا پانچ سو بیان کی جاتی ہے جب کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد سوم ص۹۲۲ میں آپ کے تصنیف کردہ رسالہ جات کی تعداد ۵۰۰ بتلائی گئی ہے۔ بہر حال آپ ایک کثیر التصانیف بزرگ اور باکمال اہل قلم تھے۔

آپ کی تصانیف کا خاص موضوع درویشی یا تصوف اور بنیادی موضوع وحدۃ الوجود ہے۔

وحدۃ الوجود کی ابتدا:

قرآن میں یہ بات صراحت سے بیان کی گئی ہے کہ اول، آخر، ظاہر، باطن خدا ہی ہے۔ تم جس طرف منہ کرو ادھر خدا ہی ہے، وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ اس طرح احادیث میں ایسی باتیں بہت ہیں مثلاً میں ہی دہر ہوں، خدا کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ نیز اس طرح کی بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے صوفیوں نے استدلال کیا ہے۔ قیل وقال سے قطع نظر صوفیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام سے سلسلہ بہ سلسلہ ہمیں یہ تعلیمات پہنچی ہیں۔

صوفیوں کی ابتدائی تصانیف میں البتہ کچھ اقوال اور اشارے ہی اس مسئلے پر ملتے ہیں اور صراحت اور تفصیل سے یہ سلسلہ نہیں ملتا۔ مثلاً

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اقوال:

''عارف اور معروف وہی ہے جب تک تو خدا اور بندہ کہتا ہے مشرک ہے بلکہ عارف و معروف ایک ہے حقیقت میں وہی ہے یہاں خدا اور بندہ کہاں ہے اول علم ہے پھر معرفت پہ انکار پھر جود بہ انکار پھر نفی پھر غرق پھر ہلاک اور جب پردہ اٹھتا ہے تو سب خداوند کے حجاب ہیں۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی اہمیت رکھتا ہے جو صریحاً وحدۃ الوجود کا اقرار ہے:

''کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو۔ آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے۔ اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا تو یہ اس آفتاب کے چہرۂ کمال کے لئے داغ ہوتا اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا۔ اور وجود کی یکتائی اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود نہیں ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔''

حضرت شاہ صاحب نے جو متعدد رسالہ جات تحریر فرمائے ہیں، ان میں رموز و اسرار تصوف کی تشریح فرمائی ہے۔ آپ نے عینی مکاشفے سے دیکھا کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے ہر چیز اللہ کے سوا فنا ہے اور یہ فنا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔

حضرت ایک جلیل القدر عارف ربانی، عظیم المرتبت صوفی، فاضل اجل، عالم بے مثل اور ممتاز مصنف تھے۔ اتقا اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر، نانِ جویں یا جنگل کے درختوں کی پتیوں پر بسر کی اور دن رات ذکر و شغل، مجاہدۂ نفس اور تعلیم و تعلم میں مصروف رہے۔ آپ نہ صرف ایک فاضل اجل بلکہ ایک باکمال اور عدیم المثال سخن گو اور فارسی کے ایک مسلم الثبوت اور پُرگو شاعر بھی تھے۔

آپ کے کلام میں تصوف، عرفان، تسلیم و رضا، فنا فی اللہ اور وحدۃ الوجود کے رموز اور ادق سے ادق نکات نہایت سلیس، بامحاورہ او رشستہ زبان میں موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا کلام (نظم و نثر) معرفت کا بحرِ بے کراں ہے۔

م۔ع۔علوی صاحب لکھتے ہیں:

''قدوۃ السالکین حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کا قلمی کلیات جو ۱۴۱۷۰ اشعار پر مشتمل ہے، اس کے اندر مختلف النوع اصناف شاعری میں آپ کا عارفانہ کلام ملتا ہے۔ آپ کے کلام سراپا الہام میں سعدی کی حکمت و بے ساختگی، خسرو کی شیریں بیانی اور غنائیت، تبریز کا کیف و سرور، جامی کا ذوق عرفان، حافظ کا فیضِ وجدان اور مغربی کی وارفتگی ملتی ہے۔''

(مخطوطہ جناب م۔ع۔علوی ۱۲)

حضرت سید شاہ نعمت اللہ کرمانی نے اپنے کلام میں تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے نعت، غزلیات، قصیدہ، رباعی اور قطعات وغیرہ۔ آپ نے متعدد قابل عالم و فاضل علما سے تعلیم حاصل کی، مثلاً مقدماتِ علوم شیخ رکن الدین شیرازی سے، علم کلام و بلاغت شیخ شمس الدین مکی سے، حکمت و تفسیر سید جلال الدین خوارزمی سے، اصول فقہ قاضی عضد الدین سے۔ (احوال و آثار شاہ نعمت اللہ از مرزا ضیاء الدین بیگ، ص:۳۴)

شاہ صاحب نے اپنے دو مطبوعہ دیوانوں کا آغاز نعت شریف سے اس طرح کیا ہے:

خوش رحمتست یاران صلوٰۃ بر محمد
گوئیم از دل و جاں صلوٰۃ بر محمد
در آسماں فرشتہ مہرش بجاں سرشتہ
بر عرش حق نوشتہ صلوٰۃ بر محمد

آپ نے ان نعتیہ اشعار میں حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کی ہے، کہتے ہیں کہ اے میرے خوش باش دوستو! اُن پر صلوٰۃ بھیجو جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور صلوٰۃ بھیجو رسول اللہ پر دل و جان سے، واللہ میں نے دیکھا ہے کہ ہر طرف ان کا نور روشن ہے اور اس کائنات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ میرا دل میری جان میرا تن سب کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیج رہے ہیں۔

تصوف جو کہ دینی و روحانی علم ہے اور قرآن و سنت پر عمل درآمد اور سیرت مطہرہ کی پیروی پر مبنی ہے، وہ بزرگان دین کے احوال، اطوار، مشاہدات اور مکاشفات پر خصوصی طور سے منی ہے اور ان میں سے اکثر چونکہ علم سینہ ہیں، اس لئے ان کے رموز و نکات، اشارات کے ذریعہ واضح کیے گئے ہیں۔

تصوف میں اصطلاحات کی ضرورت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ

معمولات کی زبان محدود اور اپنی لغوی حیثیت سے محدود تر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تصوف میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ بعض مضامین رموز و کنایات ہی میں ادا کیے جائیں تاکہ اغیار و نااہلوں سے پوشیدہ رہیں۔

شاہ صاحب کے کلام میں ان اصطلاحوں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ مثلاً در مستی می گوید، حقیقت انسان، حکمت غنائیہ، رموز عشق، حقیقت عشق و دل وغیرہ اور ان اصطلاحات جو عام شعرا اپنے کلام میں لاتے ہیں جیسے شراب، میخانہ، مئے، محبوب کی محبت وغیرہ۔ لیکن ان اصطلاحوں کے صوفیانہ انداز میں مطالب کچھ الگ لیے جاتے ہیں۔ یہ فارسی کے صوفی شعرا کی اصطلاحات ہیں جو وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دارو ئے عاشقی ہست و دوائے درد دل
نیست بنزدِ عاشقاں خوشتر از ایں دوا

صوفیانہ اصطلاح میں قلب (دل) سے مراد انسان کی حقیقت ہے جو تمام کائنات علوی اور سفلی کو جامع ہے۔ جو کچھ کائنات میں تفصیل کے ساتھ ہے وہ قلب انسانی میں اجمال کے ساتھ موجود ہے۔ قلب کا تعلق جسم انسانی سے ایسا نہیں ہے کہ اسے حلول سے تعبیر کرسکیں۔ انسان میں جو ایک مضغۂ گوشت ہے اور عرف عام میں جسے قلب اور دل کہتے ہیں، اس کو قلب حقیقی کے ساتھ ایسا ربط ہے جو جسم کے کسی اور حصے کو نہیں۔ اس لئے ابتدا میں اس مضغۂ گوشت (دل) کی طرف متوجہ ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

انسان کا دل خدا کا ظہور ہے، لا متناہی شانوں کا آئینہ ہے اور عظمت و کبریائی کا محل ظہور ہے، کسی شے میں بھی خدا کی سمائی نہیں ہے سوائے دل کے۔ (۱۱۰۔ مسائل تصوف، میکش اکبرآبادی)

دل ایک، جو ہر نورانی اور مجرد ہے جو نفس اور روح کے درمیان میں ہے، اسی سے انسانیت کا تحقق ہوتا ہے۔ فلسفی حضرات اسے نفس ناطق کہتے ہیں روح اس کا باطن ہے اور نفس اس کا مرکب اور اس کا ظاہر ہے۔

مذکورہ شعر کے ذریعہ شاہ صاحب اپنے محبوب خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ یہ عشق کیا چیز ہے اور یہ کہ میرے دل میں عشق کا درد ہے، میری دوا تو تو ہی ہے، یہ بیماری تو عشق کی ہے، کسی کے پاس میرے دل کے درد کی دوا ہے تو وہ تو ہے۔ اس محبت سے کائنات کا ایک ذرہ بھی خالی نہیں۔ یہ رحمت نہ ہوتی تو کائنات ظاہر نہ ہوتی اور وہ راز نہاں ہی رہتا۔

کشتۂ تیغ عشق او زندہ و ہست جاوداں
بندہ خویش اگر کشد نیست بخواجہ خوبہا

موجودات کے ہر ذرے میں عشق سرایت کیے ہوئے ہے۔ ازلی محبت کا راز ہر شے میں پوشیدہ ہے اور سرمدی عشق کا پرتو ہر ذرے کے آئینے میں نمودار ہے۔ اس محبت کا پرتو ہے کہ عناصر میں میل طبعی کی صورت میں ظاہر ہے، نباتات میں نشو و نما ہے، حیوانات میں قوت شوقی اور جذب ملائم ہے۔ کامل انسانوں کے نفوس میں عشق روحانی کی صورت میں متجلی ہے۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کی ایک رباعی جس کے ذریعہ انسان کی حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے۔ ذیل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

انسان کامل است کہ مجلائے ذات اوست
مجموعہ کہ جامع ذات و صفات اوست
او چشمۂ حیات وہمہ زندہ اند زو
اوحی جاودان بقائے حیات اوست

صوفیانہ نظریہ جو انسان دوستی کا باعث ہے۔ صوفیوں کے نزدیک یہ ساری کائنات خدائے واحد کی ذات وصفات کا ظہور ہے اور مختلف شانیں اور مختلف صفات ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن انسان وہ کامل ترین آئینہ ہے جس میں وہ آفتاب حقیقت پوری طرح اور کامل شان سے جلوہ گر ہے اور انسان کا دل ایک راز ہے، انسان کا ظہور کامل ترین درجہ ہے۔ جس طرح ایک بیج میں اجمالی حیثیت سے سارا درخت ہوتا ہے اسی طرح ہر انسان میں سارے مقامات اور درجات موجود ہوتے ہیں۔ اسی لئے انسان کو صوفیوں کی اصطلاح میں عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہی انسان کامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی تجلی حاصل کرتا ہے اور اپنی ذات میں تمام صفتوں کو جمع رکھے اور اچھی صفتوں کا حامل بنے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ ان اشعار میں آپ نے حیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جس کے پینے سے آدمی ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

شاہ صاحب کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

مست وخراب وساکنم برسر کوئے مئے فروش
زاہد و کنج صومعہ او بکجا و ما کجا

''مستی''، یعنی عشق جب تمام صفات کے ساتھ حاوی ہوجاتا ہے

تصوف اور حضرت میر سید علی ہمدانی

پروفیسر محمد صدیق نیاز مند .... جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

کتب تواریخ سے ثابت ہے کہ کشمیر میں اسلام کی بنیاد آٹھویں صدی ہجری کی تیسری دہائی میں سرخیل صوفیا حضرت سید عبدالرحمٰن ملقب بہ بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے پڑی کیونکہ اسلام کا سراج منیر سب سے پہلے ان کے ہی چراغ ہدایت سے اس وقت منور ہوا جب انہوں نے کشمیر کے مقامی فرماں روا راجہ رنچن کو جو کہ بدھ مذہب کا پیروکار تھا اس کی دس ہزار افراد پر مشتمل افواج کے ہمراہ نور اسلام سے مشرف فرمایا۔ رنچن کا نام صدرالدین رکھا جو بعد میں تاریخ کشمیر میں سلطان صدرالدین کے نام سے متعارف ہوا۔ اس طرح سے سلطان صدرالدین کشمیری کا پہلا مسلمان حکمراں بنا۔ مؤرخین نے سلطان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی تاریخ حروف ابجد میں "طلوع آفتاب دین محمدی" سے نکالی ہے جو ۷۲۶ ہجری مطابق ۱۳۲۶ عیسوی کے برابر ہے۔[۱] اس طرح سے کشمیر میں اسلام کی بنیاد باضابطہ طور پر ۷۲۶ ہجری میں رکھی گئی۔ سلطان نے شہر سری نگر میں عالی کدل کے نزدیک دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر محلّہ بلدیمر میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد کے قریب اس نے اولین داعی اسلام حضرت بلبل شاہ کے لئے ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی۔ خانقاہ کے متصل غربا اور مساکین کے لئے ایک لنگر خانہ تعمیر کرایا۔ چنانچہ یہ محلّہ آج کل بلبل لنکر کے نام سے مشہور ہے۔ لنکر درحقیقت "لنگر" کی بگڑی صورت ہے۔ سلطان صدرالدین کی بنوائی ہوئی خانقاہ کو کشمیر میں تصوف و عرفان کی پہلی تربیت گاہ ہونے کے ناطے ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس طرح سے کشمیر میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ تصوف و عرفان بھی پروان چڑھا اور اس کے پنپنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوئے۔

حضرت بلبل شاہ کو علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل تھا۔ یہ ان کے روحانی کمال کا ہی فیضان تھا کہ انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں تشنگی طلب قلوب کو عرفان و توحید سے منور کیا۔ انہوں نے خود خرقہ ارشاد بالواسطہ طور پر حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جس طریقہ تصوف کی بنیاد ڈالی وہ سہروردی سلسلہ طریقت ہے۔[۲]

حضرت بلبل شاہ کے انتقال کی وجہ سے کشمیر میں رشد و ارشاد کا سلسلہ کچھ دیر تک کے لئے متوقف رہا۔ چنانچہ ان کے انتقال ۷۲۷ ہجری مطابق ۱۳۲۷ عیسوی کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو پورا کرنے کے لئے وسط ایشیا سے سادات کی ایک بڑی جماعت رشد و ارشاد کی غرض سے وادی کشمیر میں داخل ہوئی۔ ان شخصیات میں حضرت سید جلال الدین بخاری سرفہرست ہیں جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کا قیام وادی میں چند ہفتوں تک ہی محدود رہا۔ لہٰذا تصوف کی ترویج میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی۔ البتہ جس عظیم مفکر، عالم دین اور پیشوائے طریقت کی وجہ سے تصوف کا سورج کشمیر میں پھر ایک بار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا وہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی ملقب بہ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی بابرکت شخصیت ہے۔

شاہ ہمدان صوفیا کے کبروی سلسلہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے اسی سلسلے کے ایک صوفی بزرگ شیخ محمود المزدقانی سے خرقہ ارشاد حاصل کیا تھا۔ آپ طالبان حق اور سالکان معرفت الٰہی کو کبروی سلسلہ کے کسی بزرگ سے تربیت حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ درج ذیل اقتباس میں، جو ان کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے، وہ ایک نوآموز سالک سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں کہ "(ایک سالک کو چاہئے کہ وہ) اہل دل اور اہل کشف و شہود کے واردات قلبی سے بہرہ حاصل کرے۔ اسے چاہیے کہ وہ خرقہ ارشاد کبروی سلسلہ کے کسی درویش سے حاصل کرے۔"[۳] شیخ یعقوب صرفی کشمیری ان

کے طریق تصوف کو راہ سلوک کے دوسرے طریقوں اور صوفی سلسلوں پر فوقیت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

گرچہ دوصد راہ سوئے مطلب است
راہ امام ہمدان اقرب است
وہ چہ نکو راہی و خوش رہبری
رہبر در رہ دین حیدری

(مسلک الاخیار،ص-۱۴)

حضرت شاہ ہمدان آٹھویں صدی ہجری کے سربرآوردہ عارف اور ولی کامل تھے۔ شعر وادب کے شہسوار ہونے کے علاوہ آپ ایک بلند پایہ عالم دین بھی تھے اور فقہ، حکمت، فلسفہ اور سیاسیات پر اچھا خاصہ عبور حاصل تھا۔ چنانچہ آپ کے بعد آنے والے اکثر وبیشتر اولیا نے اپنے آثار میں آپ کے تذکرے ایک پیشوا اور مرشد کی حیثیت سے درج کیے ہیں۔

ایں ہمدانی ہمہ دانی دہد	معرفت سر نہانی دہد
یعنی اگر باشدت این آرزو	از در شاہ ہمدان بجو
مفخر ارباب ولایت ہمواست	رہبر اصحاب ہدایت ہمواست
آن ہمدان مولد وختلان وطن	شیوۂ او طی زمین وزمن ۴

کشمیر میں ترویج اسلام کے سلسلے میں حضرت سید علی ہمدانی نے ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ آپ نے ہدایت طلب لوگوں کو صوفیانہ عقائد وافکار سے بھی آشنا کرایا۔ اس طرح سے آپ اہل کشمیر کے مرشد اور پیر طریقت قرار پائے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں تعظیماً آپ کو قطب ربانی، غوث صمدانی، بانی مسلمانی، علی ثانی، شاہ ہمدان اور امیر کبیر جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فرزندان توحید کی تقدیروں کے اس معمار نے کشمیر کے ثقافتی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی نقشے میں ایک عظیم انقلاب لایا۔ جب انہوں نے اہل کشمیر کو ایرانی اور وسط ایشیائی علوم وادبیات، عرفان وتوحید اور صنعت و حرفت سے مالا مال کیا جس کے نتیجے میں کشمیر کا معاشرہ یہاں کی زبان، آداب ورسوم، طرز زندگی، اشیائے خوردنی غرض زندگی کا کوئی بھی پہلو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور آگے چل کر جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں ایک مخلوط کلچر (Composite Culture) وجود میں آیا۔ کشمیر کے معاشرے کی زرخیز مٹی میں ایران ووسط ایشیا میں پنپے ہوئے اسلامی تصوف کا قلم نصب کیا گیا جو سیکڑوں سالوں کے عرصے میں پھل پھول کر ثمر دار درخت کی صورت اختیار کر گیا اور کشمیر میں اسی پنپی ہوئی تہذیب اور ثقافت کا نام ایران صغیر یعنی کشمیر ہے۔ جس کے معمار حضرت شاہ ہمدان ہیں۔ علامہ اقبال اس کا اعتراف یوں اپنے جاوید نامہ میں کرتے ہیں:

سید السادات سالار عجم	دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت	ذکر وفکر از دودمان او گرفت
مرشد آن کشور مینو نظیر	میر ودرویش وسلاطین رامشیر
خطہ را آن شاہ دریا آستین	داد علم وصنعت وتہذیب ودین
آفرید آن مرد ایران صغیر	باہنری ہای غریب و دلپذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ	خیز وتیرش رابدل راہی بدہ ۵

بنیادی طور پر تصوف کی بنیاد ایک بڑی حد تک مادی اشیا اور قواعد کی قید و بند سے آزادی اور دنیا سے لاتعلقی پر قائم ہے۔ وجود مطلق جو قادر قیوم بھی ہے اور تمام اشیا میں جلوہ گر بھی، اس پر ایمان لانا اور پھر خلوص نیت سے قناعت اور عزلت اختیار کرنا تصوف کے اہم ارکان میں شامل ہیں۔ سالکان راہ حق، عقل وبرہان اور منطق واستدلال کو راہ سلوک کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ وہ جاہ طلبی اور ظاہر داری کو قرب الٰہی کا مانع گردانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے عشق میں سرمست رہ کر اسی کی مہر ومحبت میں تسکین قلب اور روحانی سکون حاصل کرتے ہیں۔ صوفیا راہ سلوک کے تکاملی مراحل طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی اپنی ذات وجود مطلق کی ذات میں مدغم نظر آتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذات کو وجود مطلق کی ذات محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سید علی ہمدانی جو شعر وشاعری میں علائی تخلص کرتے ہیں فرماتے ہیں:

از کنار خویش می یابم دما دم بوئے یار
زان ہمی گیرم بہر دم خویشتن را در کنار
چون کنارم رامیانی نیست زان درحیرتم
کانچنان نازک میانی ہست دایم در کنار ۶

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

عاشقان عکس رخت از ہمہ اشیا بینند
سر سودای تو از سینہ ہویدا بینند
ہرچہ ہست آں ہمہ آئینہ ذاتت دانند
روی مقصود درآن آئینہ پیدا بینند۷

سالکان راہ حق کو نہ جنت کی تمنا ہوتی ہے اور نہ ہی حوران بہشت کی ہوس۔ بلکہ ان کی ہر خواہش اور ہر آرزو کا مدعا و مقصد ان کا محبوب ہوتا ہے۔ محبوب کے حصول کے لئے وہ دنیائے سفلی اور دنیائے اخروی یعنی دونوں دنیاؤں کی نعمتوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی عزیز جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ حضرت سید علی فرماتے ہیں:

چندین ہزار بیدل بربوی آن سعادت
دلہا نثار کردند جانہا بباد دادند
مستان حضرتش را آرامگہ بلاشد
درصد ہزار محنت بریاد دوست شادند۸

ارباب ذوق درغم تو آرمیدہ اند
وزشادی نعیم دو عالم رمیدہ اند۹

سری کز سر معنی باخبر شد
دروگنجایش شادی و غم نیست
جہان از عکس رویش گشت روشن
اگر اکمہ نہ بیند ہیچ غم نیست ۱۰

تصوف سے مراد اخلاق الٰہیہ کے ساتھ متصف ہونا، اپنے دل کو تمام آلائشوں اور کدورتوں سے پاک کرنا، علما تصوف کو ایک ایسا علم تصور کرتے ہیں کہ جس کے ذریعے سے ہدایت نور نبوت، تعلیم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے ذات وصفات، وصول الی اللہ کے طریقے، سلوک کے لوازمات اور طریقت کے اصول وضوابط اور رموز معرفت وحقیقت بیان کیے جاتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تصوف کی غرض وغایت انسان کامل بننے کے علاوہ متخلق باخلاق اللہ اور متصف باوصاف اللہ ہونے کے ہیں۔۱۱

اس طرح اخلاق کی بلندی اور اوصاف پاک اور سیرت وصورت کو نیک رکھنا سالک کا پہلا فریضہ ہے۔ حضرت سید علی ہمدانی ظاہری صورت اور باطنی سیرت میں فرق بیان کرتے ہوئے باطنی سیرت کے لئے علم، حکمت، تقویٰ، سخاوت، شجاعت، حلم، تواضع، عفت اور عدل کو اس کی اساس تصور کرتے ہیں۔

حضرت علی ہمدانی نے اپنی پوری زندگی تصوف کی نشر واشاعت میں بسر کی۔ ایک بلند پایہ فقیہ اور صاحب قلم ہونے کے باوصف، انہوں نے ایک پرہیزگار مرشد طریقت کی حیثیت سے ہزاروں کی تعداد میں تشنگی طلب قلوب کو معرفت الٰہی سے سرشار کیا۔ انہوں نے اپنے اکثر وبیشتر رسائل میں عرفان وتصوف کے اسرار ورموز اور مسائل ومقامات پر بحث کی ہے۔ چنانچہ جن رسائل میں حضرت سید علی ہمدانی نے صرفا تصوف کو موضوع بحث بنایا ہے ان میں خاص طور پر منہاج العارفین، دہ قاعدہ، چہل مقام صوفیہ، منازل السالکین، درویشیہ، حل مشکل، فضل الفقرا و بیان حالات الفقرا، صفۃ الفقراء، تلقینیہ، عقبات، منامیہ، ہمدانیہ، داؤدیہ اور رسالہ فی آداب الشیخ مشہور ہیں۔ یہ تمام رسائل آج کل دنیا کے مختلف کتب خانوں اور گنجینہ ہائے نوادرات میں محفوظ ہیں۔

فارسی ادب کے اکثر شعرا و ادبا نے اپنے زمانے کے حکمرانوں کی مبالغہ آمیز حد تک تعریفیں کی ہیں۔ دنیوی اغراض ومقاصد حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے ممدوحین کی توصف میں حد اغراق وغلو سے بھی گزر چکے ہیں۔ ان بادشاہوں کا درجہ شعرا و ادبا نے بسا اوقات اولیاء اللہ اور مرسلین تک پہنچانے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ برعکس اس کے حضرت سید علی ہمدانی کی دنیا اور دنیوی مال ومتاع کے تئیں بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ وہ حکما، امرا و وزرا کی تعریف میں چرب زبانی سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کی اتنی ہی تعریف کرتے ہیں جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ وہ وقت کے حکمرانوں کو نصیحت کرتے ہیں تا کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوں۔ عدل وانصاف سے کام لے کر رعایا پر ظلم وجبر سے احتراز کریں بلکہ قرآن وسنت کے مطابق حکومت کے امور انجام دیں تا کہ انہیں سعادت ابدی حاصل ہو۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں وہ رقم طراز ہیں کہ ”حاکم کو چاہیے کہ جس نعمت سے اللہ نے

اسے سرفراز کیا ہے اس کا حق بجالائے۔ لوگوں پر عدل واحسان کرنا قرب الٰہی کا ایک وسیلہ تصور کریں، ضعیفوں، زیردستوں اور کمزوروں پر رحم کریں اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں۔ دنیا پر فریفتہ نہ ہوں، تیز رفتاری کے ساتھ گزرنے والی عمر کے گھوڑے پر اعتماد نہ کریں بلکہ روز جزا میں گرفتار ہونے سے بچنے کی تدابیر اپنی زندگی میں کیا کریں۔ مغرور نہ ہوں بلکہ ماضی کے مغروروں کے انجام سے عبرت حاصل کرتے رہیں۔ رعیت پر رحم کریں تا کہ قہر خداوندی کو دعوت نہ دیں۔'' [۱۲] (مکتوبات ص-۱۵)

حضرت سید علی ہمدانی کے مطابق سعادت اخروی حاصل کرنے کے لئے اطاعت لازمی ہے۔ ان کے مطابق اطاعت کے بہت سے طریقے ہیں البتہ سالک کے لئے اطاعت کے راستے دو طرح سے کھلتے ہیں پہلا تعظیم لامراللہ یعنی اللہ کے تمام احکامات کی حرمت و تعظیم کی جائے اور دوسرا شفقۃ علیٰ خلق اللہ یعنی اللہ کی مخلوق کے ساتھ پیار ومحبت سے پیش آجائے۔ (مکتوبات ص-۱۹) اس طرح سے حضرت سید علی ہمدانی اپنی نگارشات کے ذریعے سے راہ سلوک کے متوالوں کے لئے خدائے قادر کے احکام کی بجا آوری کے بعد انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی سے پیش آنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اللہ کی جانب سالکوں کے رجوع ہونے کے لئے حضرت سید علی ہمدانی بالکل نرم رویہ اپناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کی جانب طالبان حق کے رجوع کے لئے راستے اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ خداوند کریم تک جانے کے لئے سالکوں کے لئے اتنے راستے ہیں جتنے کہ لوگوں کے سانسوں کی تعداد۔ چنانچہ ایک حدیث قدسی یوں نقل کرتے ہیں کہ **"الطرق الی اللّٰہ تعالیٰ بعد انفاس الخلائق"** البتہ حضرت سید علی ہمدانی کے مطابق یہ سارے راستے تین طرح سے کھلتے ہیں۔ پہلا طریقہ ارباب معاملات یعنی لین دین وغیرہ میں معروف لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ راستہ سالکوں پر بہت زیادہ روزہ رکھنے، نماز پڑھنے، تلاوت کلام مجید کرنے، حج بیت اللہ انجام دینے وغیرہ جیسے ظاہری اعمال کے انجام دینے سے کھلتا ہے۔ یہی عام مسلمانوں کا راستہ ہے جو ان کے لئے عذاب ابدی سے نجات کا موجب بنتا ہے۔ البتہ حضرت سید علی کے مطابق اس طرح کی عبادت کے انجام دینے سے حقیقت تک رسائی پانا دشوار ہے۔ دوسرا طریقہ ارباب مجاہدہ کا ہے۔ یہ راستہ برے عادات کے بدل ڈالنے، نفس امارہ کی پاکیزگی، تصفیہ قلب اور روح کے سنوارنے اور ان کوششوں سے کھلتا ہے جن سے سالک کا باطن آباد ہو۔ یہ راستہ نیکوکار لوگوں کا ہے۔ اس گروہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے سالک، خدا کے حکم سے چلنے والے تیر ہیں۔ اس گروہ کو میانہ رو یعنی متوسط فرقہ بھی کہتے ہیں۔ وصال حق سے سرشار ہونے والے یہ لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔ تیسرا طریقہ ان طالب حق عرفا کے لئے کھلتا ہے جو...... کے حصول کے لئے لاہوت کی وسیع فضاؤں میں پاک پروردگار کی دائمی عنایات کے جذبے کے پروں سے پرواز کرتے ہیں۔ ایسے سالکوں کو وصال حق دوسرے طالبوں کے مقابلے میں پہلے نصیب ہوتا ہے۔ یہ راستہ جو وصول حق کے حصول کے لئے نزدیک ترین راستہ ہے، ارادی موت پر مبنی ہے (یعنی مرجاؤ اس سے پہلے کہ تجھے موت آئے)۔ اس سعادت کے ظہور پذیر ہونے کے آثار کی بنیاد ان دس قاعدوں پر مشتمل ہے۔ توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت، ذکر، توجہ، صبر، مراقبہ، رضا [۱۳]

حضرت سید علی ہمدانی تصوف اور سلوک کے مختلف راستوں کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں یوں لکھتے ہیں:

> ''حضرت صمدیت تک پہنچنے کے لئے راستے اتنے ہیں جتنے کہ دنیا میں لوگوں کی تعداد۔ ہر شخص اپنے مقدور کے مطابق اور اپنے مناسب حال حضرت صمدیت کا تقرب حاصل کرسکتا ہے۔ البتہ حکام اور بادشاہوں کے لئے تقرب الٰہی کے یہ راستے عدل وانصاف کرنے سے کھلتے ہیں۔ قیامت کے روز حکمرانوں سے پہلا سوال لوگوں کے تئیں ان کے عدل وانصاف اور احسان کے بارے میں ہوگا۔'' [۱۴]

حضرت سید علی ہمدانی کے صوفیانہ عقائد وآراء پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے کہ ان صوفیا اور اولیائے کرام کے صوفیانہ نظریات وافکار کو بھی ملحوظ نظر رکھا جائے جن سے وہ خود متاثر ہیں یا جن کی تصنیفات ان کے زیر نظر رہی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے پیران طریقت کا سلسلہ سب سے اہم ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس سلسلے کے اکثر مشائخ اور اولیائے عظام

کی نگارشات و اوراد و اذکار ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ چنانچہ شیخ نجم الدین احمد کبریٰ، جو کبروی سلسلہ کے موجد بھی رہے تھے، کی تصنیف سے ایک بڑی حد تک انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے پیران طریقت تقی الدین علی دوستی اور شیخ شرف الدین بن عبداللہ المزدقانی الرازی سے بھی متاثر ہیں۔ دراصل یہ انہیں مرشدان طریقت کا فیضان تھا کہ حضرت سید علی ہمدانی تصوف میں ایک ممتاز اور مشہور ولی کامل کی حیثیت سے ابھرے۔

جن دوسرے صوفیا کے نظریات کی چھاپ حضرت سید علی ہمدانی کی نگارشات پر نظر آتی ہے وہ حجۃ الاسلام امام غزالی اور پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری جیسے ایران کے مایہ ناز صوفیوں اور ادبا کی نگارشات کی ہے۔ چنانچہ حضرت سید علی ہمدانی نے امام غزالی کی تصنیف نصیحت الملوک کی پیروی میں ذخیرۃ الملوک اور خواجہ عبداللہ انصاری کی مناجات کی تقلید میں رسالہ مناجات اور مناجات امیر یہ تحریر کیے ہیں۔ وہ ابن عربی کے افکار و خیالات سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصنیفات ابن عربی کی تصنیفات کی صدائے بازگشت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ابن عربی کی تصنیف فصوص الحکم کی شرح بھی لکھی ہے۔ وجود کے بارے میں ابن عربی اور سید علی ہمدانی کا یکساں نظریہ ہے۔ چنانچہ وجود سے متعلق حضرت امیر کا تحریر کیا ہوا رسالہ وجودیہ اس کا بین ثبوت ہے۔

دوسرے مقتدر صوفیا کے نظریات و آراء کی پیروی کرنے کے باوجود بھی حضرت سید علی ہمدانی نے ایک نئے مسلک کی داغ بیل ڈالی جو ان کی جائے پیدائش اور نام کی مناسبت سے ہمدانیہ اور علائیہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت سید علی ہمدانی سے قبل یہ سلسلہ رہبیہ یا سلسلۃ الذہب کہلاتا تھا جو کہ سلسلہ کبروی کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور اس سلسلے کے اکثر مشائخ آٹھویں صدی ہجری کی پہلی نصف صدی تک ابن عربی کے نظریات کے خلاف تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ علاء الدولہ سمنانی نے ابن عربی کے صوفیانہ عقائد و آرا اور اس کی تصنیف میں درج افکار و خیالات کا زوردار الفاظ میں رد کیا ہے۔ البتہ اس کے برعکس حضرت سید علی، ابن عربی کے سب سے بڑے مقلد تھے۔

کبروی سلسلہ کے اکثر و بیشتر صوفیا اور مشائخ مزامیر اور سماع کے قائل ہیں۔ وہ مجلس انس و محبت تشکیل دیتے ہیں۔ ان مجالس میں آلات موسیقی بھی بجائے جاتے ہیں اور صوفیا رقص و سماع میں محو رہتے ہیں اور وجد میں آتے ہیں اور ان پر حال طاری ہو جاتا ہے۔ سماع اور ساز کے قائل یہ مشائخ قرب الٰہی کا طریقہ سماع کو تصور کرتے ہیں۔

حضرت سید علی کی تصنیفات اور خاص طور پر ذخیرۃ الملوک کے مطالعہ کے بعد یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سماع کی مجلس آراستہ کرتے اور خود سماع کرتے تھے۔ منقبت الجواہر کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک بار ایک مرید نے ان سے پوچھا کہ اے سید! مختلف صوفی سلسلوں میں ہم صرف کبروی سلسلے میں سماع کرتے ہیں۔ اگر یہ بدعت ہے تو ہمیں منع کر دیجیے۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ سرمستان وحدت اس کو ایسا درد تصور کرتے ہیں جس کا علاج نہیں۔ یہ ایک ایسا نہ بھرنے والا زخم ہے جو کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔

حضرت سید علی ہمدانی صوفیا اور اولیاء اللہ کے دلوں کو ایک ایسا گلشن یا پھلواری کے ساتھ مشابہ کرتے ہیں جو انوار الٰہی کا مظہر ہیں اور ان کے سینوں کو لامنتہا اسرار الٰہی کا سمندر تصور کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ایسا طائفہ ہے کہ جنہوں نے راہ سلوک میں اپنے نفس امارہ کو ریاضت کے چراغ سے پگھلا دیا ہے اور اپنے جمال روح قدسی کو ہوا و ہوس کی کدورتوں سے پاک و صاف کیا ہے۔ ترک لذات کر کے اپنے قلوب کو زنگ اور آلائشوں سے صاف کیا ہے۔ انہوں نے استغراق کی بدولت محبوب کے جمال کی تجلی کو اپنا منتہائے مقصد بنا لیا ہے اور اپنی پیاری عمر کے سرمائے کو جناب کبریائے کریم کی درگاہ میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔[15]

وحدۃ الوجود کے قائل سید علی ہمدانی کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت ہے جس کا ظہور مختلف صورتوں میں عیاں ہے چونکہ عام لوگ اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔ اس لئے وہ اختلافات کے دلدل میں پھنسے ہیں۔ ان کی نظروں میں وجود اور قدرت یعنی اختیار دونوں اللہ کے اختیار میں ہیں اس کی ذات یگانہ جوہر ہے کیونکہ وہ قائم بالذات ہے:

تو کان گوہر کانی و گوہر تونی
چہ کاف ونون کہ زکاف وزنون بیرونی

محیط گنبد اسرار را توئی مرکز
صفائی صخرۂ اسرار راتو استونی
زدور دائرہ گر سوی مرکز آیی باز
یقین شود کہ زہر وصف ووہم بیرونی
سپہر مطلع انوار و آفتاب جلال
بگرد نقطہ ذات تو کردہ گردونی
ظہور سر کمالات سرمدی از تست
اگرچہ خازن اسرار راتو مخزونی ۱۶

شاہ ہمدان کے مطابق راہ سلوک ایک مشکل اور دشوار گزار راستہ ہے۔ سالک کو قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے اس راستے میں ہر قدم پر رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں وہی سالک کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے، جس کو اس راستے کے مشکلات اور مصائب برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ رنج اور مصائب برداشت کیے بغیر گنج حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہی شخص مزدوری پاتا ہے جو کام کرنے کی زحمت اٹھاتا ہے۔ طریقت میں سالک کا سب سے بڑا دشمن اپنا ہی نفس امارہ ہے۔ یہ ہر انسان کی ذات میں موجود ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے ساتھ جنگ کر کے اسے اپنے قابو میں کرنا اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نفس کو پہچاننا ہی حق تعالیٰ کے پہچاننے کے مترادف ہے۔ البتہ راہ سلوک بغیر مرشد طریقت کی رہنمائی کے طے نہیں ہوسکتا چنانچہ پیر کامل کی رہنمائی سے متعلق حضرت سید علی ہمدانی لکھتے ہیں:

> ''سالک کے لئے لازمی ہے کہ مرشد کامل کی صحبت میں رہے تاکہ وہ اس کی تربیت اور رہنمائی کرے۔ مرشد طریقت کے تصرف میں یوں رہے کہ جیسے مردہ جسم کسی غسال کے اختیار میں رکھا جاتا ہے تاکہ غسال (مرشد) ولایت کے صاف وشفاف پانی سے اس کے مردہ نفس امارہ کو غیریت کے گناہ سے دھوئے اور اس کے دل کے آئینے سے غیر اللہ کے زنگ کو صاف کرے۔'' ۱۷

شاہ ہمدان کی نگارشات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تصوف کے اسرار و رموز سے سالکان طریقت اور طالبان حقیقت کو آشنا کرایا جائے اور اس مقصد میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ ایک مصلح کی حیثیت سے انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی تانے بانے میں قابل ذکر حد تک تبدیلی لائی تو دوسری طرف صوفیانہ عقائد کی اشاعت سے حق شناسی، اخوت اور باہمی محبت کا جذبہ لوگوں میں اجاگر کیا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کو تصوف و عرفان میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے اور تصوف میں ان کے رول کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

کتابیات

۱- پیر غلام حسن کھویہامی، تاریخ حسن، جلد-۲، ص-۱۲۶، مطبوعہ محکمۂ ریسرچ و پبلی کیشنز۔

۲- سہروری سلسلہ طریقت کے بانی شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد سہروردی ہیں۔ وہ شہر سہرورد میں متولد ہوئے۔ ان کا انتقال ۶۳۲ ہجری میں ہوا۔ ان کی تصنیفات میں سے اعلام الہدیٰ، عوارف المعارف اور رشف النصائح الایمانیہ مشہور ہیں۔ ایک بڑے روحانی پیشوا تھے۔ دیکھئے دکتر صفا۔ تاریخ ادبیات در ایران جلد-۳، ص-۱۲۶۔ بعض محققین حضرت بلبل شاہ کو شیخ شہاب الدین سہروری کا مرید تصور کرتے ہیں جس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ حضرت بلبل شاہ کی وفات ۷۲۷ ہجری اور حضرت شہاب الدین سہروردی کی وفات ۶۳۲ ہجری کے درمیان کوئی ۹۴ سال کا فرق ہے۔ اس لئے حضرت بلبل شاہ کا حضرت شیخ شہاب الدین کا مرید ہونا ظاہراً بعید از قیاس نظر آتا ہے۔ البتہ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب حضرت بلبل شاہ نے ایک سودس سال سے زائد کی عمر پائی ہو۔
اسی طرح بعض محققین حضرت بلبل شاہ کو شاہ نعمت اللہ کا مرید تصور کرتے ہیں جو کہ سراسر لغو ہے۔ کیونکہ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کی پیدائش ۷۳۰ ہجری اور وفات ۸۳۴ ہجری میں ہوئی ہے۔ (مکتوبات شاہ ہمدان، ص-۳۷)

۳- خرقۂ ارشاد حاصل کرنے اور اپنے سلسلۂ طریقت کے بارے میں حضرت شاہ ہمدان لکھتے ہیں کہ:
''اس ضعیف نے تصوف و عرفان کے اسرار و رموز اپنے مرشد کامل شیخ ابوالمعالی شرف الدین محمود بن عبداللہ المز دقانی الرازی کی صحبت میں مشاہدہ کیے ہیں۔

باقی صفحہ: ۲۲۴ پر

حضرت شیخ زین الدین ریشی

ڈاکٹر منظور احمد بٹ
سینئر لیکچرر شعبہ اسلامیات، کشمیر یونیورسٹی

کشمیر کے علاقہ کشتواڑ میں باندرکوٹ کے مقام پر تقریباً آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں ایک متوسط گھرانے میں نویمن کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا۔ اس کا نام زیا سنگھ رکھا گیا۔ یہ لڑکا بچپن ہی میں اپنے والد کے سایہ سے محروم ہوا۔ لہٰذا پرورش کی ذمہ داری والدہ پر ہی پڑی۔ چند ایک معلومات کو چھوڑ کر اس بچے کے بچپن کے حالات معرضِ اخفا میں ہیں۔ بچپن ہی میں ایک دفعہ زیا سنگھ سخت بیمار ہوا۔ بچے کی یہ حالت دیکھ کر ان کی والدہ گریہ وزاری کرنے لگی۔ اتفاقاً کشمیر کے ایک بزرگ ولی حضرت شیخ نورالدین ریشی کا گزر اس علاقہ سے ہوا۔ زیا سنگھ کی والدہ کو اضطراب میں دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ وہ بچے کی صحت یابی کے لئے دعا کریں گے۔ ساتھ ہی میں دینِ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ زیا سنگھ کی والدہ نے بچے کی صحت یابی کی صورت میں دعوت دین قبول کرنے کا وعدہ کیا۔ جونہی حضرت شیخ کی نظر فیض زیا سنگھ پر پڑی اور حضرت نے شفایابی کی دعا اللہ سے کی۔ دعا رب العزت کی بارگاہ میں مقبول ہوئی اور بچہ فوراً صحت یاب ہوا، لیکن اس کی والدہ نے کشمیر آنے اور اسلام قبول کرنے میں بہت تاخیر کی۔ زیا سنگھ پھر بیمار ہوا۔ والدہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ بچہ کی بیماری کی وجہ اس کی وعدہ شکنی ہے۔ اس لئے کشمیر کی طرف روانہ ہوئی اور دین اسلام قبول کرنے کی متمنی ہوئی۔ حضرت شیخ نورالدین کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں پر اپنے خلیفہ اول بابا بام الدین سے اس واقعہ کی حقیقت بیان فرمائی اور دونوں ماں بیٹے کے آنے کا تذکرہ کیا اور ان کی مہمان نوازی کا حکم دیا۔

حضرت شیخ نورالدین نے بومزوہ کے مقام پر دونوں سے بیعت لے کر انہیں حلقہ بگوش اسلام کیا۔ زیا سنگھ، جس کا نام گرامی حضرت شیخ نور الدین نے اب زین الدین رکھا، نے اپنی والدہ محترمہ کو رخصت کیا اور خود حضرت شیخ نورالدین کی صحبت اختیار کر کے ظاہری اور باطنی علوم سے مستفید ہوتے رہے اور مجاہدہ اور نفس کشی کی ریاضت میں محو ہوئے۔

یقیناً جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے غیر معمولی خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لئے ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو اسے علائق دنیا سے بے نیاز کر کے معبود حقیقی کی جانب راغب کرتا ہے۔ بعینہ حضرت زین الدین ولی کی علالت بھی ان کے مرشد کامل تک پہنچنے اور معبود حقیقی کی جانب راغب ہونے کا سبب بنی۔ رحمت الٰہی بہانہ می جوید۔

حضرت زین الدین نے اپنی پوری زندگی دعوتِ دین حق کے لئے وقف کر دی۔ اسلام کے اعلیٰ اقدار کی پاسداری کی اور عرفان وآگہی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ ان کی اس رفعت شان کی مدح سرائی خود علم دار کشمیر حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ علیہ نے اس گراں قدر شلوک میں کی ہے:

زائنہ میون اوس امرت گورو — تمی تہ آور سمسار کیہو
گوگورس تہ ژاٹھا ژورو — یتھ میہ وردتم دیوو

یعنی میرا زین الدین آب حیات کا سرچشمہ ہے۔ اس نے بہت کم دنیا کی آرزو کی۔ اسی لئے شاگرد اپنے استاد پر سبقت لے گیا۔ اے خدا مجھے بھی ایسا انعام دے۔

جب استاد اور وہ بھی حضرت شیخ العالم جیسی شخصیت اپنے شاگرد کی مدح خوانی کرے تو ایسے شاگرد سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوسکتا ہے۔ حضرت نورالدین ولی جب اپنے شاگرد سے مطمئن ہوئے کہ وہ معرفتِ الٰہی سے سرشار ہو چکے ہیں تو انہیں اپنے خلیفہ اول بابا بام الدین کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس طرح زین الدین نے بابا بام الدین سے بومزوہ کے مقام پر سلوک وعرفان کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں اپنے قیام کے دوران وہ ایک ملحقہ پہاڑ پر مویشیوں کو چرانے کے لئے جاتے تھے اور خود ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر ذکر، مراقبہ اور نماز میں مصروف ہو جاتے تھے۔ چنانچہ وہ پتھر آج بھی بابا بام الدین کی زیارت کے ملحقہ اس پہاڑ پر موجود ہے اور اس پر حضرت زین الدین کے پہلو

اور جبین مبارک کے آثار (نشانات) نمایاں ہیں۔

عشقِ یدِ الٰہی کی تپش ہو جس کے سینے میں
اس کی گرمیٔ شوق سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

بعد ازاں حضرت کچھ مدت تک موضع شیبوہ پرگنہ زینہ گیر میں عبادات، ذکر واذکار، مراقبہ اور ریاضت میں مشغول رہے۔ معرفت کے مدارج طے کرنے کا سفر جاری رکھتے ہوئے حضرت دعوتِ حق و ارشاد کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد حضرت زین الدین ولی نے اپنے مرشد کامل کے حکم کی تعمیل میں عیش مقام واقع ضلع اسلام آباد کا رخ کیا اور وہاں ایک غار میں کچھ عرصہ کے لئے خلوت نشین ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت زین الدین غار میں بہ غرض ریاضت داخل ہوئے تو انہوں نے غار کو بے شمار زہریلے سانپوں کا مسکن پایا۔ ان سے مخاطب ہوتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ''یہ غار اب درویشوں کو دیا گیا ہے تم کسی اور جگہ چلے جاؤ۔'' سانپوں نے ایک رات کی مہلت طلب کی اور اگلے دن ایک وسیع وعریض میدان میں چلے گئے۔ یہ سانپ بہت ہی زہریلے ہوتے ہیں اور کشمیر میں انہیں 'پُہر' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جس میدان میں یہ منتقل ہوئے اسے ان سانپوں کی وجہ سے 'پنورالدین پہر بکن' کہا جاتا ہے۔ حضرت نے ان زہریلے سانپوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کو نہ ڈسیں اور لوگوں کو بھی متنبہ کیا تھا کہ وہ ان کو نہ چھیڑیں۔

ایک دفعہ کشمیر کے سلطان زین العابدین (بڈشاہ، 1420-1470) شاہ کول (نالہ لدر سے نکلنے والی ایک نہر) کی کھدائی کا معائنہ کرنے کے لئے عیش مقام پہنچ گئے۔ دریں اثنا حضرت زین الدین ولی سے ملاقی ہونے کے لئے وہ ان کے غار میں پہنچے۔ حضرت اس وقت وضو کرنے کے لئے باہر تشریف لے گئے تھے اور سلطان بڈشاہ ان کے سجادہ مبارک پر آکر بیٹھ گئے۔ حضرت جب واپس تشریف لائے تو فقیرانہ بے نیازی کے سبب سلطان بڈشاہ کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ سلطان آزردہ ہو کر واپس لوٹے۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ''اس سجادہ کو دھوڈالو کیوں کہ اس سے دنیاوی جاہ وحشمت کی بو آتی ہے''۔ بڈھ شاہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے حضرت کے لئے جلاوطن ہونے کا شاہی فرمان جاری کیا۔ حضرت اپنے ارادت مندوں کے ہمراہ تبت چلے گئے اور اس جلاوطنی کے دوران بھی رشد وہدایت کی قندیلیں روشن کیں۔ تبت میں ان کی تبلیغ کے نتیجے میں جن بہت سے بودھوں نے اسلام قبول کیا ان میں وہاں کے اس وقت کے ایک حاکم کا لڑکا بھی شامل تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حاکم کا لڑکا ایک عارضہ میں مبتلا ہو کر تقریباً دم ہی توڑ بیٹھنے والا تھا کہ حاکم نے کچھ تو اپنی توہم پرستی کی بنا پر اور کچھ مالاؤں کے بہکانے سے یہ سمجھ لیا کہ یہ شامت ان پر حضرت کی وجہ سے آن پڑی۔ حاکم نے حضرت کو بہت دھمکایا۔ حضرت کے ساتھی بھی بہت پریشان ہوئے، کیونکہ یہ اب ان زندگیوں کا ہی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس سے ان تبتی نومسلموں کے ایمان کے متزلزل ہونے کا بھی خطرہ تھا جو حضرت کی سعی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت نے اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر دعا مانگی اور لڑکا آناً فاناً صحت یاب ہوا۔ یقینی طور پر ہر ولی اللہ کی کرامت دراصل انبیا کے معجزات کا ہی پرتو ہوا کرتی ہے۔

مولانا جامی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:

خارقے کہ از ہر ولی مسموع است
معجزات انبیاء را متبوع است

بہر کیف، حضرت ابھی تبت ہی میں دعوت دین کا فریضہ انجام دے رہی تھے کہ کشمیر میں سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ کے پاؤں میں شدید درد واقع ہوا۔ جب طبیب اپنی زور آزمائی میں ناکام ہوئے تو سلطان نے اپنا لڑکا حیدر شاہ حضرت کی خدمت میں روانہ کیا، کیوں کہ اب وہ اپنی تکلیف کو حضرت کی ناراضگی سے ہی تعبیر کرنے لگا۔ حضرت نے واپسی پر عیش مقام کی جگہ پر ہی قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر سے سلطان زین العابدین حاضر خدمت ہوا اور معافی کی درخواست کی۔ حضرت نے عفو و درگزر سے کام لے کر سلطان کے حق میں بارگاہ الٰہی میں صحت یابی کی دعا مانگی۔ بس مانگنے کی دیر تھی سلطان پھر سے صحت یاب ہوا۔

حضرت ذکر وفکر اور دعوت دین میں سرگرم رہے اور جو اخروٹ اپنے تلخ پوست کے ساتھ درختوں سے ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے نیچے گر جاتے تھے وہی ابال کر غذا کے طور پر استعمال کرتے۔ غار کے ارد گرد چوں کہ پانی کا بندوبست نہیں تھا لہٰذا زین الدین رحمۃ اللہ علیہ کا خادم حاجی شمس الدین نیچے جا کر کہیں دور سے پانی لایا کرتا تھا۔

جاڑے میں اس کا ایک پاؤں پھسل گیا اور گھٹنا ٹوٹ گیا اور گھڑا ٹوٹ کر چور چور ہو گیا اور خادم روتا ہوا بابا زین الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے تھوڑی سی مالش کی، گھٹنا ٹھیک ہو گیا۔ پھر آپ نے پانی کے لئے دعا کی۔ غار کے قریب ہی ایک گھڑا کھودا گیا جہاں سے پانی نکل آیا اور اس سے لوگ اب بھی مستفید ہوتے ہیں۔

حضرت زین الدین ولی نے بھی اپنے مرشد حضرت شیخ نور الدین ریشی کے طریقے پر کچھ عرصے تک خلوت نشینی کو اختیار کیا، لیکن اس خلوت کو چنداں بھی رہبانیت سے تعبیر نہ کیا جائے۔ رہبانیت تو وہ عمل ممنوع ہے کہ جس کا عامل تمام کاروبار حیات سے بالکل دست بردار ہو جائے اور مخلوق سے جملہ تعلقات کو منقطع کر دے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رہبانیت سے یہ کہہ کر منع کر دیا۔ **لا رھبانیۃ فی الاسلام** (قرآن: سورۃ الحدید)۔ حضرت زین الدین بالکل قطع تعلق کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ اس خلوت نشینی کے قائل تھے جس کو اسلامی تصوف میں عزلت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن واحادیث اور قرون اولیٰ کی تصانیف میں شواہد ملتے ہیں۔ لیکن یہ ایک عارضی عمل ہے نہ کہ دائمی عمل۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی اس قسم کی خلوت نشینی اور عزلت کا ثبوت ملتا ہے۔ بقول اقبال ؂

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویش تن کس را نہ دید
نقش مارا در دل او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند

اسی مناسبت سے حضرت زین الدین ولی نے خلوت نشینی کے باوجود متعدد علاقوں کا دورہ کیا اور دعوت حق اور شہادت حق کا فریضہ بہ حسن خوبی انجام دیا۔ علاوہ ازیں اکثر اوقات ان کے ساتھ ارادت مندوں کی جماعت بھی رہتی تھی اور یہ سب باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اس عزلت کے قائل تھے جسے ہر دور کے صوفیائے کرام نے مستحسن سمجھا ہے۔ حضرت زین الدین نے جن دیگر مقامات پر دعوت حق کے ساتھ ساتھ عبادت وریاضت کی ان میں سری گفوارا اور پنڈو بل بھی شامل ہیں۔ حضرت کا اپنی عبادات کے مراکز کے متعلق یہ قول بہت مقبول ہے۔

سر چھم سربل، پنڈ چھم پنڈبل، گوف چھم گوفہ بل، تہ عیش چھم عیش مقام

یعنی میری رازداری کی جگہ سربل ہے۔ میرے بیٹھنے کی جگہ پنڈوبل، میری گپھا گوفہ بل (سری گفوارہ) اور میرے عیش کا سامان عیش مقام ہے۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت زین الدین نے اپنی عمر کے آخری 40 دن عیش مقام میں ہی گزارے اور بالآخر 853ھ میں دنیا سے انتقال کر گئے۔ کشمیری جنتری کے حساب سے ان کا یوم وفات 12 وہک ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے جسد مبارک کو غار سے کچھ فاصلے پر ناڈنڈر میں ایک بڑے اور ہموار پتھر پر غسل دیا گیا۔ یہ پتھر آج بھی اسی جگہ موجود ہے اور اس پر چھوٹی سی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ ان کی نماز جنازہ ادا ہوئی اور جب جسد مبارک کو دفن کرنے کے لئے لوگوں نے تابوت کھولا تو اس میں سے جسد مبارک غائب پایا۔ اس کو ایک بڑی کرامت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور خود کو فنا کر کے بقاباللہ کا رتبہ پانے کی یہ ایک زندہ جاوید مثال ہے۔ خواجہ اعظم دیدہ مری اپنی کتاب واقعات کشمیر میں اس کرامت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

فانی از خود باقی بہ دوست
ایں طرفہ است کہ ہستند ونیستند

حضرت زین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جسد مبارک کو تابوت سے غائب پا کر لوگوں میں کافی اضطراب پھیلا اور وہ آہ وبکا کرتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حضرت کے خلفا نے تابوت کو غار میں ان کی نشست گاہ کے پاس رکھا اور خود بارگاہ الٰہی میں عجز وانکساری کے ساتھ دست بہ دعا ہوئے۔ اسی رات حضرت کے ایک خلیفہ نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے تھے "جہاں پر میرا تابوت رکھا ہوا ہے وہیں پر میری قبر بنائی جائے۔" چنانچہ وہاں پر ایک قبر کے سوا کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لئے اس خلیفہ نے عرض کیا کہ ان کی قبریں کہاں پر ہوں گی کیوں کہ وہ حضرت کی قبر کے قریب ہی دفن ہونا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ غار کے بالکل اوپر ان کی اور ایک قبر بنائی جائے جس کے پاس تمام خلفا کی قبروں کے لئے بھی جگہ نکلے گی۔

اگلے روز حضرت کے اسی حکم پر عمل کیا گیا۔ غار میں ان کی نشست گاہ پر جہاں پر اب تابوت رکھا ہوا تھا ان کی قبر بنائی گئی اور غار کے اوپر روضہ بل میں ان کی ایک اور قبر تعمیر کی گئی۔ روضہ بل میں حضرت زین

الدین ولی کی قبر کے پاس ان کے 23 خلفا کی قبریں بھی ہیں۔

روضہ بل عیش مقام میں حضرت زین الدین ولی کے پہلو میں مدفون چند ایک بزرگوں کے اسمائے گرامی مع مختصر تعارف درج ذیل ہیں:

حضرت بابا شمس الدین:

آپ حضرت کے برگزیدہ خلفا میں سے ہیں۔ نہایت ہی تقویٰ شعاری کی زندگی بسر کی۔ مرشد بزرگ وار سے اجازت طلب کر کے حج بیت اللہ کو گئے اور اسی لئے حاجی بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہت عرصہ حضرت کی خدمت میں صرف کیا اور آخر میں حضرت کے پائے مبارک کی جانب روضہ بل میں دفن کیے گئے۔

حضرت بابا وتر ٹھاکور:

بڑے ہی دولت مند اور عیش کوش تھے اور ٹھاکروں کے خاندان سے نسبی تعلق تھا۔ ایک دفعہ ان پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں بابا زین الدین کے پاس پہنچے۔ رشد و ہدایت سے سرفراز ہوئے اور آخر کار حضرت کے مقبرے میں ہی دفن کیے گئے۔

حضرت مبارک ریشی:

بڑے ہی صاحب حال و قال بزرگ گزرے ہیں۔ بہت ہی کثیر الکرامات تھے اور آخر میں اپنے ہی مرشد کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

دیگر حضرات جو حضرت زین الدین ولی کے مقبرے واقع روضہ بل عیش مقام میں مدفون ہیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

حضرت اکھدار ریشی، باکہ ریشی، داؤد ریشی، افضل ریشی، کنڈل ریشی، پتی ریشی، فقیر ریشی، صفی ریشی، درہ ریشی، نوروز ریشی، رنگی ریشی اور روپہ ریشی۔

حضرت زین الدین ولی کے چند دیگر مشہور خلفا، جو باقی علاقوں میں مدفون ہیں، میں یہ حضرات شامل ہیں:

(1) حضرت بابا پیام الدین ریشی

حضرت زین الدین کے چہیتے خلیفہ تھے۔ ابتدا میں حکمرانوں کے قریبی مصاحبوں میں سے تھے۔ اچانک ایک فکری تبدیلی آئی اور حضرت زین الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ان کی تربیت کرنے کے بعد علاقہ کامراج کے ایک گاؤں انبوہ متصل ٹنگمرگ میں مراقبہ کرنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں وہیں پر دفن کیے گئے۔ حضرت پیام الدین کو بابا ریشی کے نام سے اکثر جانا جاتا ہے۔ بہت ہی متقی اور صاحب کرامات ولی اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مؤرخ حسن شاہ نے ان کی تاریخ وفات یوں بیان کی ہے:

ضرو تاریخ سال رحلت او

گفتا ہے "پیام الدین ولی رفت"

(بمطابق 889ھ)

(2) حضرت بابا دریا الدین ریشی جو کہ پرگنہ پھاگ گاؤں رنگل کے ایک پہاڑ پر مدفون ہیں۔

(3) بابا شکور الدین ریشی جو کہ جھیل دولر کے کنارے پر واقع وٹلب کی پہاڑی پر مدفون ہیں۔

(4) بابا حنیف الدین ریشی پرگنہ مانچھہامہ کے ایک پہاڑ پر مدفون ہیں۔

(5) بابا لدہ مل ریشی ہندون پورہ علاقہ حمل میں مدفون ہیں۔

(6) بابا لستہ ریشی گاؤں پکھوہ میں مدفون ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ کشمیر کے مختلف اطراف و اکناف میں حضرت زین الدین کے اور بھی بہت تربیت یافتہ حضرات مدفون ہیں۔

الغرض حضرت زین الدین علیہ الرحمہ ایک تقویٰ شعار ولی، صاحب کشف و کرامت، ایک مبلغ دین، ایک زاہد، ایک عابد ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیر کے ان بزرگان دین کے صف اول میں شامل ہیں جنہوں نے دعوت دین کی فکر میں اپنی پوری زندگی صرف کی اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو کفر و شکر اور بدعات کے اندھیروں سے نکال کر دین اسلام کی طرف مدعو کیا اور ان کی ظاہری اور باطنی تربیت کر کے شریعت محمدی کے تابع کرنے کی بھرپور سعی کی۔ علاوہ ازیں حضرت زین الدین ولی کے ساتھ بہت ساری کرامات منسوب ہیں اور ان میں تابوت سے ان کے جسد مبارک کے غائب ہونے کی کرامت اتنی تواتر کے ساتھ روایت کی جاتی ہے کہ ایک صاحب قلم کے لئے اس کو رد کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ بالکل ناممکن ہے۔ ان کی حیات طیبہ کے مطالعہ سے ایک انسان کے اندر دین اسلام کی سچائی کی تصدیق کرنے کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے شاید ہی دنیا کی کوئی بھی شیطانی قوت اپنے قابو میں لاسکتی ہے۔

باقی صفحہ:۲۰۸ پر

شیخ محمد غوث گوالیاری

پروفیسر کبیر احمد جائسی .... علی گڑھ (یوپی)

شیخ محمد غوث گوالیاری سلسلۂ شطاریہ کے مشہور صوفی ہیں جن کے بارے میں عہد جہانگیری کی ایک کتاب 'اذکار ابرار' کے مصنف کا خیال ہے کہ ''شطاری شیر خوار بچوں کو نوزادگی پستی سے ابھار کر مشائخ کی باطنی پرورش کے ذریعے سے نوجوان کیا، توحید وایمان کے درخت کو تقلید اور استدلال کی خزاں سے بذریعۂ نو بہار تحقیق رہائی دے کر دائمی سرسبزی بخشی۔ تاکہ درخت مذکور افراد انسانی کے باغ میں ازلی توفیق کا پانی پی کر بار آور ہو'' (گلزار ابرار ص: ۲۸۷)

اکبری عہد کے مشہور زمانہ مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی کو شاہ محمد غوث کو دور سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بدایونی نے اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' میں تین جگہوں پر شیخ محمد غوث کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ بدایونی کی تحریر چونکہ ایک معاصر کی تحریر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ بدایونی کی تحریروں کا خلاصہ اپنی زبان میں پیش کر دیا جائے۔ تاکہ شیخ محمد غوث کی زندگی کا ایک مختصر اور مبہم سا خاکہ ہمارے سامنے آجائے۔

اذکار ابرار کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ محمد غوث کا نسبی سلسلہ فارسی کے مشہور صوفی شاعر عطار نیشاپوری پر منتہی ہوتا ہے، لیکن بدایونی نے اس طرح کی کسی بات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ ان کے روحانی سلسلے کے بارے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ وہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بدایوانی اور محمد غوثی شطاری مانڈوی مصنف اذکار ابرار دونوں ہی نے شیخ محمد غوث کی تاریخ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، لیکن دونوں نے یہ ضرور لکھا ہے ۹۷۰ھ میں جب شیخ محمد غوث کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اسی سال کی تھی۔ اس طرح ان کی تاریخ پیدائش تو متعین نہیں ہوتی البتہ سنہ پیدائش ۸۹۰ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بدایونی نے ان کو ۹۶۶ھ میں دیکھا تھا جب کہ ان کی عمر اپنی شام زندگی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس لئے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں خود انہی کے ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

''زمانہ ہوش کی ابتداء ہی تھی کہ مجھ کو خدا طلبی کا درد پیدا ہوا اور میرے دل پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ ریاضت کرنی شروع کی جس کی بدولت کائنات کے جواہر کی شناخت مجھ میں پیدا ہوئی۔ کئی دفعہ عالم خواب میں مجھ کو حکم دیا گیا کہ سلطان الموحدین شیخ ظہور حاجی حمید کی ملازمت سے اپنی کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ انہیں کی تلقین کی کنجی سے مقاصد کے دروازے کھلیں گے۔ اس غیبی خوش خبری پر میں نے بھروسہ کر کے اپنے جان وجسم حاجی حمید کی تلاش میں وقف کر دیے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ حاجی حمید نے اپنا مرید کر کے مجھے کوہستان چنار میں ریاضت ومجاہدہ کی اجازت دی اور میں تیرہ سال چند ماہ تک ریاضت وچلّہ کشی میں مصروف رہا۔''

شیخ محمد غوث کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں خدا طلبی کا جذبہ ابتدائے عمر ہی سے موج زن تھا اور حاجی حمید کے فیض صحبت نے اس جذبہ کی آسودگی کا پورا پورا سامان بہم پہنچا دیا۔ خود انہی کی زبان سے ان کے یہ ابتدائی حالات سننے کے بعد اب ہم پھر بدایونی کی تحریر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ ہمایوں بادشاہ کو ان کے بڑے بھائی شیخ بہلول اور خود ان سے بڑی عقیدت تھی، لیکن جب ہمایوں کو شیر شاہ کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوا تو یہ بزرگ بھی گردش وقت کی زد میں آگئے چونکہ ہمایوں ان کا معتقد تھا اس لئے شیر شاہ ان کو آزار پہنچانے کے درپے ہوا، شیخ محمد غوث نے جب یہ حالت دیکھی تو گجرات کی طرف کوچ کر گئے۔ گجرات پہنچ کر ان کو ایک گونہ راحت ملی اور بہت سے فقرا اور امرا ان کے سلسلے میں داخل ہو گئے۔ بدایونی کا بیان ہے کہ ۹۶۶ھ میں

اس نے شیخ کو آگرہ میں دیکھا تو جب کہ ان کی سواری بڑی دھوم دھام سے نکلی تھی اور سیکڑوں علما، فضلا اور فقرا ان کی سواری کے پیچھے پیچھے ادب واحترام سے چل رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اکبر تخت نشین ہو چکا تھا، لیکن ابھی اس کی عمر میں پختگی نہیں آئی تھی۔ اسی سال اکبر بھی ان کا مرید ہوا، لیکن اکبر کی یہ ارادت بہت دنوں تک باقی نہ رہی، جیسے جیسے بیرم خاں اور شیخ گدائی کی گرفت اکبر پر بڑھتی گئی ویسے ویسے وہ شیخ محمد غوث سے منحرف ہوتا گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیخ بددل ہو کر گوالیار چلے آئے اور گوالیار آ کر اپنے سلسلے کی تبلیغ واشاعت کے کاموں میں لگ گئے۔ ایک کروڑ تنگہ ان کی مدد معاش مقرر تھی اور اسی پر ان کی گذران رہی۔ ۹۷۰ھ میں اسی سال کی عمر میں آگرہ میں انتقال کیا۔ ان کا جسد خاکی آگرہ سے گوالیار لے جایا گیا، جہاں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اپنے سلسلے کی تبلیغ واشاعت کے ساتھ ساتھ شیخ محمد غوث اپنے خیالات کا اظہار تحریری طور پر بھی فرماتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے جو تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ان میں جواہر خمسہ، کلید مخازن، ضمائر، بصائر اور کنز الوحدت تو آپ کی طبع زاد کتابیں ہیں۔ ایک اور فارسی کتاب 'بحر الحیات' بھی آپ کے قلم کی یادگار ہے، لیکن یہ جداگانہ نوعیت کی حامل ہے۔ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں نے جو سنسکرت تحریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ان کا شیخ محمد غوث نے دقت نظر سے جائزہ لے کر ان سے مفید مطلب معانی اخذ کیے اور اسلامی دائرہ فکر میں رہتے ہوئے باطنی اعمال کے سلسلے میں انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے جس کا پورا مواد انہوں نے سنسکرت تحریروں سے اخذ کیا ہے، لیکن اس مواد کی ترتیب انہوں نے اس ڈھنگ سے کی ہے کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج نہ ہونے پائیں۔

"بحر الحیات" کے جائزے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد غوث نے دیگر مذاہب کے علما و مفکرین کی تحریروں اور خیالات سے پورا پورا استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ استفادہ کے اس مرحلے میں اگر ان کو کہیں پر بھی ان کے افکار اور اسلامی فکر میں کوئی مشابہت یا مماثلت نظر آئی ہے، تو اس کو بھی وہ پوری طرح اجاگر کرتے گئے ہیں۔ ان کی اس روش سے گمان ہوتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر یہ رہا ہوگا کہ دانائی وحکمت کی باتیں جہاں بھی ملیں ان کو قبول کر لیا جائے اور انہی کے ذریعے انسان اور انسانی معاشرے کی بہتری وبرتری کا کام انجام دیا جائے۔

❁❁❁

بقیہ صفحہ: ۲۱۸ کا

انہوں نے خود شیخ عارف رکن الدین ابوالمکارم احمد بن محمد البیابانی معروف بہ علاء الدولہ، انہوں نے شیخ عبدالرحمن اسفراینی سے، انہوں نے شیخ احمد جرجانی سے (م ۶۴۴ھ)، انہوں نے شیخ احمد بن عمر الخیوقی سے معروف بہ شیخ نجم الدین کبری (م ۶۱۸ھ)، انہوں نے شیخ عامر یاسر بدلیسی سے، انہوں نے شیخ ابوالنجیب سہروردی سے خود (م ۵۶۳ھ)، انہوں نے شیخ ابوعثمان مغربی سے (م ۳۷۲ھ)، انہوں نے شیخ ابوعلی رودباری سے (م ۳۲۱ھ)، انہوں نے شیخ جنید بغدادی سے (م ۲۹۷ھ)، انہوں نے حضرت داؤد طائی سے، انہوں نے حبیب عجمی سے، انہوں نے شیخ حسن بصری سے، انہوں نے حضرت امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے، انہوں نے سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ (مکتوبات ص-۳۸)

۴- شیخ یعقوب صرفی کشمیری، مسلک الاخیار ص-۱۵، مخطوطہ مملوکہ محکمہ تحقیق واشاعت ولائبریری سری نگر۔
۵- علامہ اقبال۔ کلیات اقبال جاوید نامہ۔ ص-۱۴۶، کتب خانہ نذیریہ۔ دہلی
۶- چہل اسرار از سید علی ہمدانی مطبوعہ شعبہ نشر واشاعت جموں وکشمیر جمعیۃ ہمدانیہ سری نگر۔ ص-۵۱۔
۷- ایضاً صفحہ ۵۲۔
۸- ایضاً صفحہ ۶۲۔
۹- ایضاً صفحہ ۲۸۔
۱۰- ایضاً صفحہ ۲۹۔
۱۱- اصطلاحات صوفیہ، ص-۲۷، باہتمام فرید احمد صدی، مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس۔
۱۲- مکتوبات، صفحہ ۱۵۔
۱۳- رسالہ دہ قاعدہ، صفحہ ۳۰-۳۱
۱۴- مکتوبات سید علی ہمدانی، صفحہ ۲۲
۱۵- مکتوبات، صفحہ ۳۵
۱۶- چہل اسرار، صفحہ ۵۹-۵۸
۱۷- رسالہ دہ قاعدہ، صفحہ ۳۴، مطبوعہ۔

❁❁❁

قطب گجرات سیدنا وجیہ الدین حسینی علوی

علامہ سید محمد تنویر ہاشمی .... بانی وصدر الجامعۃ الہاشمیہ بیجاپور (کرناٹک)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مأۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا. اللہ تعالیٰ ہر سو برس پر ایک مجدد پیدا فرمائے گا جو اس صدی میں دین کی تجدید کرے گا۔ (ابوداؤد شریف)۔ یہ حدیث مبارک شیخ مکہ حضرت سیدنا شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث کے دوران اپنے تلامذہ کو پڑھا رہے تھے کہ دفعتاً کسی طالب علم نے دست بستہ آپ کی خدمت میں سوال کیا کہ حضور اس صدی کا مجدد کون ہے اور یہ سعادت کس بندے کو حاصل ہے۔ حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے میرے عزیز! انشاء اللہ اس کا جواب کل دوں گا۔ درس گاہ سے فراغت پا کر رات میں تہجد کے لئے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتے ہیں۔ نماز تہجد کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے در اقدس کی جانب متوجہ ہو کر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حلقۂ درس حدیث میں میرے ایک عزیز شاگرد نے مجھ سے اس دور کے مجدد سے متعلق سوال کیا ہے کہ اس دور کا مجدد کون ہے۔ سرکار! یہ سوال میرے لئے عظیم سوال ہے، میری دستگیری فرمائیں اور اس امر سے مطلع فرمائیں کہ اس صدی میں مجددیت کا تاج کس مبارک سر پر رکھا گیا ہے۔ وہ کون سعادت مند ہے جسے یہ شرف عظیم عطا کیا گیا ہے۔ اس عرضی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اس صدی کا مجدد وجیہ الدین ابن نصر اللہ ہے۔

قدوۃ الواصلین، زبدۃ الکاملین، حجۃ اللہ علی الارض، برہان الاتقیاء، مجدد المأۃ العاشرہ وجیہ الحق والملۃ والدین سرکار سیدنا و مرشدنا وجیہ الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ محمد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار سرکار سیدنا قاضی سید شاہ نصر اللہ حسینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے صاحب شریعت وطریقت عارف باللہ مرد حق آگاہ ولی اللہ تھے۔ آپ کے جد مکرم حضرت سیدنا بہاء الدین مکی رحمۃ اللہ علیہ خانہ کعبہ میں مراقب تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے شرف یاب ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے میرے عزیز فرزند ملک ہند جاؤ، آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پاتے ہی اپنے فرزند حضرت سیدنا معین الدین حسینی رحمۃ اللہ علیہ اور چند مریدین و خدام کو ساتھ لے کر رخت سفر باندھا اور بڑی سرعت کے ساتھ منازل سفر طے کرتے ہوئے ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا۔ قصبہ پاڑی گجرات میں سکونت پذیر ہوئے۔ الحمد للہ علوی خاندان کے یہ بطل جلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مبارک سے ہندوستان تشریف لائے، شبانہ روز تبلیغ و اشاعت دین متین میں سرگرداں رہے، ہزاروں لاکھوں گم گشتگان راہ کو صراط مستقیم پر گامزن کیا اور لاکھوں تشنگان معرفت کی پیاس بجھائی۔

آپ کا نسب عالی اس طرح ہے۔ سیدنا وجیہ الدین احمد ابن سیدنا نصر اللہ ابن سیدنا قاضی عماد الدین ابن سیدنا قاضی عطاء الدین ابن سیدنا قاضی معین الدین حسینی ابن سیدنا بہاء الدین حسینی ابن سیدنا کبیر الدین حسینی ابن سیدنا قاضی ظہیر الدین حسینی ابن سیدنا قاضی شمس الدین حسینی ابن سیدنا قاضی بدر الدین حسینی ابن سیدنا قاضی سید علیم الدین حسینی ابن سیدنا قاضی بہاء الدین حسینی ابن سیدنا جمال الدین حسینی ابن سیدنا احمد حسینی ابن سیدنا احمد منتخب حسینی ابن سید مرتضی حسینی ابن سید محمد عریض حسینی ابن سیدنا احمد حسینی ابن سیدنا امام محمد الجواد التقی ابن سیدنا امام علی رضا ابن سیدنا امام موسیٰ کاظم ابن سیدنا امام جعفر صادق ابن سیدنا امام محمد باقر ابن سیدنا امام زین العابدین ابن سیدنا امام حسن ابن سیدنا امام امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ یوں آپ کا نسب مبارک ۲۶ واسطوں سے مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے جاملتا ہے۔ چوں کہ آپ کے اجداد عرب سے ہند

تشریف لائے اور محاورہ عرب کے مطابق خود کو علوی مشہور کیے۔ ایک مرتبہ کسی طالب علم نے آپ سے سوال کیا کہ کیا آپ علوی ہیں تو جواباً آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا بھی کوئی ہے جو حسینی ہو اور علوی نہ ہو۔ حاصل جواب یہ تھا کہ ہر حسینی علوی ہے اس لئے آپ کے خاندان کے افراد علوی حسینی دونوں نسبتوں سے خود کو منسوب کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ اہل عرب حسنی و حسینی سادات کو علوی کہتے ہیں جیسا کہ محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مناقب دوازدہ امام میں سیدنا امام باقر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ 'باقر اول علوی بود کہ مادر و پدر ہر دو علوی بودند'

ہندوستان میں علاقۂ گجرات کو نویں اور دسویں صدی ہجری میں خصوصی شرف حاصل رہا ہے۔ احمد آباد علوم وفنون اور معارف میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، خود شاہان گجرات علوم وفنون کے بڑے قدر دان اور علما و فضلا کے خدمت گزار تھے۔ یمن، شیراز اور دیگر اسلامی ممالک سے جید علما، محققین اور محدثین گجرات تشریف لاکر مستقل سکونت پذیر ہوگئے تھے جن کے فیوض و برکات سے پورا علاقہ علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا، تاریخ کے بے شمار کتب شاہد عدل ہیں کہ گجرات علوم عقلیہ ونقلیہ کا شیراز اور فن حدیث میں یمن، شام و بخارا کی مماثلت رکھتا تھا، ایسے سنہرے دور میں سیدنا وجیہ الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ نے علوم وفنون کی تحصیل کا سلسلہ شروع فرمایا، تقریباً ۳۳ سال کی عمر مبارک تک مختلف علما، فضلا، محدثین اور محققین سے علوم متداولہ کا استفادہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سوا سو سے زیادہ علوم و فنون میں آپ کو مہارت تامہ حاصل ہوگئی جیسا کہ محمد امین زبیری نے ثمرات القدس میں شجرات الانس کے مصنف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ عماد طارمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات سے پہلے حضرت شاہ وجیہ الدین حسینی کو سوا سو علوم سکھائے جب کہ خود وہ ڈھائی سو علوم جانتے تھے۔ چنانچہ حضرت علامہ طارمی کے انتقال کے بعد حضرت سیدنا وجیہ الدین حسینی رحمۃ اللہ علیہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں شاید کچھ علوم تحصیل سے رہ گئے۔ خود فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ فرزند مغموم نہ ہو جتنے علوم آپ کے استاد جانتے تھے ہم اس سے زیادہ علوم تمہیں عنایت کرتے ہیں، یہ فرماتے ہوئے ایک کاغذ عطا فرمایا جس پر بے شمار علوم وفنون کے نام درج تھے، آپ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے بعد میں جس علم وفن کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس علم وفن کا امام و ماہر ہوں۔ اسی لئے میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا وجیہ الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام علم وفضل کا تقابل نہ آپ کے دور میں کسی سے درست ہے اور نہ آپ کے بعد۔ لہٰذا کوئی بھی جو اس طرح کی حرکت کرے اس کے لئے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتمان حق اور منصب علم وفضل کے ساتھ ظلم و زیادتی ہے۔

علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے بعد درس کا نورانی سلسلہ شروع کیا اور اپنے مدرسہ کا نام مدرسہ علویہ تجویز فرمایا، قلیل عرصہ میں اس درس گاہ کی شہرت اکناف عالم میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، دور دراز مقامات سے طلبہ آپ کی درس گاہ میں شامل ہونے لگے۔ تشنگان علوم دینیہ فیضیاب ہوکر خدمت دین متین میں مصروف ہوئے اور بے شمار بندگان خدا کے تاریک قلوب واذہان کو منور کرتے رہے تا آنکہ درس و تدریس کا یہ سلسلہ ہند سے لے کر بلاد عرب تک پھیل گیا اور علوی نور پورے عالم کو نورانی کرتا چلا گیا۔ آپ کے طلبا بلاد عرب تشریف لے جاتے تو ان کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی اور آپ کی عطا کردہ سند خصوصی طور پر بلاد عرب میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ آپ کے تلامذہ جہاں کہیں ٹھہر جاتے وہیں علم وعرفان کا دریا جاری ہوجاتا۔ اس طرح آپ کے علوم ومعارف کے فیوض و برکات مختلف علاقوں اور کئی ملکوں تک پہنچ گئے۔ نہایت مختصر میعاد میں آپ کی درس گاہ کو جامعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی اور ملک و بیرون ملک سے علمائے محققین خصوصاً علمائے عرب آپ کی خدمت میں استفتاء روانہ کرتے رہے۔ صاحب گلزار ابرار لکھتے ہیں کہ آپ کامل چونسٹھ سال علوم عقلیہ ونقلیہ پڑھاتے رہے، آخر عمر میں آپ نے سلسلہ درس وتدریس موقوف کرنا چاہا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو بشارت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹا سلسلہ درس وتدریس بند نہ کرو ہم بنفس نفیس آپ کا درس سننے کی خاطر آیا کرتے ہیں اور تمہارے درس سے مسرور ہوتے ہیں۔ اس بشارت عظمیٰ کے بعد آپ نے اس سلسلہ کو

تادم اخیر جاری رکھا اور درس کا نام درس محمدی رکھا۔ مصنف "یادایام" رقم طراز ہیں کہ علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی ان برگزیدہ علما میں سے ہیں جن کے احسان سے اہل ہند کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ استاذ الاساتذہ، استاذ البشر اور استاذ امت محمدیہ جیسے معزز معروف القاب سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے۔ محقق علی الاطلاق شیخ الہند حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی جیسی بلند پایہ شخصیت نے آپ سے علمی وروحانی فیض حاصل کیا ہے۔ جس کا تذکرہ اخبار الاخیار اور گلزار ابرار میں ملتا ہے۔

مسئلہ تکفیر میں فی زمانا بہتیرے علما و مفتیان اصول افتاء کے برخلاف فتویٰ نویسی کرتے ہیں۔ جب کہ تکفیری مسئلہ اس قدر اہم و نازک ہے کہ اکابر علما و محققین اس مسئلہ میں بے پناہ محتاط رہے ہیں اور جب کبھی کفر کا فتویٰ جاری کیا تو کمال تحقیق و تدقیق کے بعد کیا، مگر ہر دور میں ایک بڑا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ لمبی فہرست ایسے مفتیان کی دستیاب ہے جنہوں نے فتویٰ کی تلوار سے اہل ایمان پر کفر وارتداد کا وار کیا ہے۔ قطب گجرات سیدنا وجیہ الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ تکفیری مسئلہ میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے۔ بسا اوقات آپ کی خدمت میں تکفیر کا فتویٰ تصدیق کے لئے پیش کیا جاتا تو اس پر دستخط کرنے سے انکار فرماتے، اپنی پوری زندگی میں آپ نے کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ صادر نہیں فرمایا، چنانچہ آپ کا یہ ارشاد گرامی صبح قیامت تک اہل علم اور اہل فکر ونظر کے لئے منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص میں سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مسلمان سمجھو اور کلمہ گو کو کافر نہ کہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک روایت حضرت سید شاہ پیر علوی رحمۃ اللہ علیہ تذکرۃ الوجیہ میں نقل کرتے ہیں کہ سلطان محمود ثانی کے دور میں گجرات کے بعض علما ہوائے نفس، بغض وعناد کی بنیاد پر حضرت غوث العالم سیدنا محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ تیار کیا۔ سلطان نے علما سے پوچھا کہ اس فتویٰ پر حضرت سیدنا وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کا دستخط کیوں نہیں ہے۔ کسی نے مناسب جواب نہ دیا تو سلطان محمود ثانی نے کہا کہ میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ چنانچہ سلطان حاضر ہوکر مسئلہ تکفیر کی تفصیل عرض کرتا ہے، اس پر قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ پر لگائے گئے الزامات میں مجھے کوئی کفر نظر نہیں آتا ہے۔ بسا اوقات صاحبان حق و عارفان رب حالت استغراق میں ایسی کیفیات سے گزرتے ہیں جو حضرت غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں اس فتویٰ پر مہر تصدیق ثبت نہیں کروں گا۔ سختی سے آپ نے تکفیر کی مخالفت کی اور اس بابت ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا جس میں احادیث اور اقوال فقہا وصوفیہ سے اس مسئلہ کو واضح کیا۔ حضرت سیدنا شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کے تردید وانکار کو دیکھ کر سلطان محمود ثانی نے کفر کے اس فتویٰ کو چاک کیا جس پر گجرات کے بہتیرے علما دستخط کر چکے تھے، جمیع مفتیان کرام کو چاہیے کہ وہ اللہ والوں کے اس انداز کو پیش نظر رکھیں۔ ذوات، شخصیات اور دنیاداری سے بلند ہوکر فتویٰ نویسی کریں، ہاں وہ قول وفعل جس سے کفر صریح وقطعی ثابت ہوتا ہو تو اس کی بنیاد پر ضرور بضرور تکفیر کریں۔

قطب گجرات سیدنا وجیہ الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ جہاں درس گاہ کے سلطان اور یکتائے روزگار مدرس تھے وہیں آپ تصنیف و تالیف کے بھی بہترین شہسوار تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ کی متعدد منتہی کتب پر شرح وحواشی آج بھی موجود ہیں، صرف فن حدیث میں ۲۳ رسالے آپ نے قلم بند کیے۔ حضرت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف مآثر الکرام میں آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۹۷ بیان کی ہے۔ جب کہ خلاصۃ الوجیہ میں آپ کی تصانیف کی تعداد زیادہ بیان کی گئی ہے۔ تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، بیان و معانی، مناظرہ وکلام الغرض کون سا ایسا علم وفن ہے جس میں آپ نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ آج بھی جن احباب کا تعلق درسی کتب سے ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ آپ نے کس قدر لازوال تدریسی، تحقیقی اور تاریخ ساز کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ آپ کی بہت ساری تصانیف، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد، خدابخش لائبریری پٹنہ، آکسفورڈ لائبریری برطانیہ اور بے شمار قلمی نسخہ جات مختلف خانقاہوں میں موجود ہیں۔ آپ کا شہرۂ آفاق عربی رسالہ "حقیقت محمدیہ" جو دنیائے تصوف میں بے حد قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کی شرح شیخ علامہ شریف مرزا محمد دائم ہندی نے لکھی تھی جس کی تحقیق عزیزم مولانا جلال رضا نے بڑی عرق ریزی سے کی ہے۔ اور اسے مصر سے شائع کروایا ہے۔ عزیزم مولانا نظام الدین مصباحی بھڑوچی کی اطلاع کے مطابق آپ

کے ملفوظات بھی شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جمیع وابستگان قطب گجرات آپ کی تصانیف جمع کریں اور اس کا جدید ایڈیشن کم از کم اردو وانگریزی زبانوں میں ترجمہ کے ساتھ شائع کریں کیوں کہ دور حاضر میں یہ کام کسی بڑے کارنامے سے کم نہ ہوگا۔

ابتدائی ایام میں آپ اپنے والد بزرگوار سے سلسلہ چشتیہ ومغربیہ اور اپنے ماموں حضرت بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ سہروردیہ کے طریق کے مطابق اشغال واذکار حاصل کیے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت کبیر الدین مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنے قلبی احوال سنائے تو انہوں نے فرمایا کہ زیادہ مضطرب نہ ہو، عنقریب غوث العالم سرکار سیدنا محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ احمد آباد تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کو تمام تر باطنی نعمت انہیں سے حاصل ہوں گی۔ اس تذکرہ کے ضمن میں حضرت سیدنا غوث العالم کا مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

رئیس الکاملین، سلطان الاولیاء، غوث العالم حضرت سیدنا محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ فرید الدین عطار کی اولاد میں سے ہیں۔ وارث ولایت محمدی، صاحب انوار صمدانی واقف اسرار رحمانی حضرت غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی سخت ریاضت ومجاہدہ کیا تھا خصوصاً دعوت اسماء الہیہ کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ آپ نے سلطان الموحدین پیر جہاں حضرت ظہور الحق والدین رحمۃ اللہ علیہ سے چودہ خانوادوں کی خلافت واجازت حاصل کی۔ آپ کے پیر ومرشد حضرت شاہ ظہور حاجی حضور رحمۃ اللہ علیہ باکمال ولی اللہ تھے۔ ایک سو ساٹھ سال کی عمر پائی۔ عمر کا اکثر وبیشتر حصہ سفر میں گزارا اور اکثر بلاد عرب و ہند کے روحانی مراکز پر چلہ کشی کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور کی چالیس سال جاروب کشی بڑے ذوق وشوق اور عقیدت و محبت سے کرتے آئے۔ حضرت غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ نے تمام تر روحانی فیوض وبرکات حضرت سلطان الموحدین سے پاکر ریاضت و مجاہدہ کی سخت وادیوں سے گزرتے ہوئے مقام غوثیت پر فائز ہوئے۔ آپ کے تفصیلی حالات حضرت مولانا شاہ فضل اللہ شطاری نے مناقب غوثیہ بزبان فارسی میں جمع کیا ہے۔ آپ طریقت میں سلسلہ شطاریہ کے اکابر اولیا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب شیر شاہ سوری حضرت غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ سے بدظن ہوکر اپنے ہم شیر زادہ اختر جنگ کو، جو فوج کا افسر تھا حکم دیا کہ گوالیار جاؤ اور شیخ محمد غوث کا سر اتار لاؤ اور اس کے پورے خاندان کو تباہ وبرباد کردو۔ اس وقت آپ گجرات کے لئے روانہ ہو چکے تھے، راستے میں آپ کو مع اہل وعیال اور آپ کی والدہ ماجدہ کو ظالموں نے قید کرلیا اور مستورات کی بے حجابی اور بے ادبی کرنے لگے تو آپ کی والدہ ماجدہ آپ کی پشت پر دونوں ہاتھوں سے مارتے ہوئے بولیں کہ اب مستورات کی عزت وعصمت خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اے فرزند، تمہاری ولایت وغوثیت کس وقت ظاہر ہوگی۔ اتنا سننا تھا کہ آپ کو جلال آ گیا اور اپنی زبان ولایت وغوثیت سے فرمایا 'مریخ تو کجائی تا کار خود نمائی' مریخ تو کہاں ہے آ اور اپنا کام دکھا۔ آپ کی زبان مبارک سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ مشرق سے مغرب کی طرف ایک تلوار نمودار ہوئی مگر اس کے باوجود بھی آپ نے ایک مرتبہ پھر فوجی افسر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سب واپس چلے جاؤ درویشوں کا شیوہ دشمنوں کے حق میں بھی دعا کرنا ہے اور یہ فقیر بھی اس کا پابند ہے۔ افسر جنگ نے کہا کہ ہم شیر خان کے حکم کے پابند ہیں اور ان کا حکم ہے کہ بلا تاخیر آپ کا سر تن سے جدا کیا جائے۔ جب فوجی افسران اپنی بات پر اٹل رہے اور حضرت کی تفہیم کے باوجود واپسی پر رضا مند نہ ہوئے تو حضرت کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ ''اقتل یا مریخ'' یعنی اے مریخ قتل کر۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی فوجیوں کے سر ان کے تن سے جدا ہونے لگے، یہ عجیب وغریب منظر دیکھ کر اکثر فوجی فرار ہوگئے اور آپ بعافیت گجرات پہنچے، روحانی دنیا سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ ستارہ مریخ حضرت غوث العالم کے تابع تھا اور عاملین خصوصی طور پر اس حوالے سے آپ کی بارگاہ عنایت کے محتاج رہے ہیں۔ حضرت غوث العالم کی تصنیف مبارک جواہر خمسہ پچھلے چار سو برس سے برابر اہل حق کی رہبری ورہنمائی کرتی چلی آ رہی ہے۔ سلسلہ شطاریہ کو آپ کی ذات والا صفات سے بے حد فروغ ملا ہے، ویسے یہ سلسلہ دنیائے تصوف کا نہایت قدیم ومعروف سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کو ابتداءً ترکستان میں بسطامیہ اور وسط ایشیا میں عشقیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا راست تعلق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے اور اس سلسلہ کے اولیا آپ سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کی اشاعت میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ

اللہ علیہ کا بڑا اہم کردار ہے۔ نیشا پور، آذر بائیجان اور ہندوستان میں یہ سلسلہ حضرت عبد اللہ شطاری کے ذریعے پھیلا۔ آپ کے اخلاص و للہیت، ریاضت ومجاہدہ، نفس کشی اور فاقہ کشی کو دیکھ کر آپ کے پیرو مرشد نے آپ کو شطاریہ کہہ کر مخاطب کیا۔ یہی اس سلسلہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ حضرت عبد اللہ شطاری ہی وہ بزرگ ہیں جنہیں سب سے پہلے شطاری کے نام سے یاد کیا گیا۔ حضرت غوث العالم رحمۃ اللہ علیہ اور قطب گجرات کی ایک دوسرے سے ملاقات احمد آباد گجرات میں ہوئی اور حضرت غوث العالم کا قیام احمد آباد میں تقریباً ۱۸ سال رہا۔ بعدہ عہد اکبری میں آپ مع اہل وعیال گوالیار منتقل ہوئے اور یہاں ہی شب جمعہ ۱۴ رمضان المبارک ۹۷۰ھ آپ کا وصال ہوا۔ گوالیار شریف میں آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔ حضرت قطب گجرات کو سلسلہ شطاریہ میں خلافت واجازت حضرت غوث العالم سے ہی حاصل ہوئی۔ بے شمار اسرار ورموز اور تصوف کے دقیق مسائل او. باطنی وروحانی فیوض و برکات یہ سب آپ کو انہی سے حاصل ہوئی۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر غوث العالم کی پابوسی کا مجھے شرف حاصل نہ ہوتا تو اسرار حقیقت سے آشنائی نہ ہوتی۔ حضرت غوث العالم خود بھی حضرت قطب گجرات سے بڑی محبت رکھتے تھے جو آج بھی اس خلافت نامہ کی تحریر سے واضح ہے جو آپ کے لئے تیار کی گئی تھی۔ چنانچہ خلافت نامہ میں حضرت غوث العالم لکھتے ہیں کہ وجیہ الدین شیخ المشائخ، شیخ الاسلام اور حیدر علی ثانی ہیں۔ واضح ہو کہ اولیائے امت محمدیہ میں حیدر علی ثانی کا لقب قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص ہے۔

آپ ہمیشہ اہل دنیا، اہل ثروت اور اہل اقتدار سے کنارہ کش رہے، فقر وفاقہ، صبر وقناعت اور سادگی آپ کا خصوصی شعار تھا، جو نذر و نیاز عقیدت مندوں کی طرف سے پیش ہوتی اسے غربا ومساکین میں تقسیم فرمادیتے، لباس بھی بڑا سادہ پہنتے تھے کہ آپ کے لباس کی سادگی سے شان مصطفیٰ ظاہر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم آپ کے مدرسہ میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ درس دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر متفکر کھڑا رہا۔ بالآخر طلبہ سے دریافت کیا کہ حضرت میاں وجیہ الدین کہاں ہیں؟ اس پر حضرت نے خود اس نووارد سے پوچھا بتاؤ تم کو اس سے کیا کام ہے۔ اس نے کہا میری ایک آرزو ہے جسے میں آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرسکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا وجیہ الدین یہ فقیر ہے اور حضرت میاں وجیہ الدین دوسری جگہ رہتے ہیں۔ اس انداز سے وہ متاثر ہو کر عرض کرنے لگا کہ میرا مطلب آپ کی ذات سے تھا سو حاصل ہوگیا تو اب کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ محض اس گفت وشنید کے بعد آپ کی قدم بوسی کر کے رخصت ہونے لگا تو طلبہ نے اس سے کہا کچھ روز یہاں قیام کرو۔ اس پر اس نے کہا جو طالب ایک دید میں اپنا مطلب پالے پھر وہ کیوں پڑا رہے۔ طلبہ حیرت سے حضرت کی طرف دیکھنے لگے اور دیکھتے ہی رہے تو حضرت نے فرمایا کہ دیا، تیل، آگ تیار تھی تو کیا اس کو روشن نہ کرتا۔ بسا اوقات درس وتدریس سے فراغت پاتے تو حضرت خضر سے آپ کی ملاقات ہوتی اور ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی۔ ایک مرتبہ آپ کو کسی خدا رسیدہ نے ان کے ساتھ گفتگو میں مشغول دیکھا تو آپ سے دریافت کیا کہ کیا باتیں ہوئی ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معرفت کے سوا اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ مستفیض ہوئے یا آپ ان کو فیض یاب فرمائے۔ اس پر آپ نے حکم فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور اوروں سے فیض لیتے نہیں بلکہ دیتے ہیں۔

آپ کے دور مبارک میں حکومت کی زبان فارسی تھی اور وقت ضرورت گجری یعنی اردو زبان۔ چنانچہ آپ بھی گاہے بگاہے اردو زبان میں کلام کرتے تھے، آپ کے بیش قیمت اقوال عربی، فارسی اور گجری زبانوں میں جمع کیے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے وجود پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ہم یہاں افادتاً چند اقوال زریں نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "خدائے قدوس کا ہمیشہ ذکر کرو کہ ذکر سے وسوسے دور ہوجاتے ہیں اور دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ دل کی صفائی کا نشان شوق، ولولہ اور محبت ہے۔ خدا سے غافل کرنے والی عادات سے بچو اور غفلت پیدا کرنے والی چیزوں کو ترک کردو۔ خدا کی مرضی ہے کہ سب اس کو پہچانیں۔ علم وشغل دونوں حاصل کرو کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ شغل کرنا ریاضت سے بہتر ہے اور اس سے زیادہ مفید ہے۔ ایام شغل میں کشف وکرامت کا انتظار نہ کرو۔ روغن زیادہ استعمال کرو گوشت کم کھاؤ، راحت سے سستی ہوتی ہے اور اس سے حلاوت نہیں ملتی۔ دنیا کو ترک کردو خدا مل جائے گا اور دنیا سے دور ہوجاؤ خدا تم سے

قریب ہو جائے گا۔ جوانی کی ریاضت بہت مفید ہے۔ جوانی میں جتنا سلوک اور ریاضت کیا جائے اتنا ہی زیادہ مفید ہے۔ مرشد کی اجازت کے بغیر ریاضت ومجاہدہ کرنا جسم کو ضعیف کرنے کا سبب ہے۔ ریاضت ومجاہدہ سے فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے مگر حجاب نہیں ہٹتا ہے۔ راحت و تکلیف میں نفس کا رجحان معلوم کرو تا کہ آئندہ حال میں سنبھل سکو، نفس خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے، ذکر کرو خطرات دور ہو جائیں گے۔ روحانی اشغال سے کشائش اور باطنی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور سے روحانیت بڑھ جاتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ضعیفوں کی مدد کرنا، غریبوں کی مدد کرنا، غریبوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہاتھ کی عبادت ہے۔ خویش و اقارب سے ملنا علما اور اولیا سے ملنا پاؤں کی عبادت ہے۔ مناظر قدرت دیکھ کر خوف اللہ کا پیدا ہونا اور گریہ وزاری کرنا آنکھ کی عبادت ہے۔ توحید و رسالت کی باتیں سننا اور علما وصلحا کا کلام سننا کان کی عبادت ہے۔ دنیا سے قطع تعلق اور عقبیٰ کی طرف رجوع کرنا یہ دل کی عبادت ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور ماثورہ دعاؤں کا ورد کرنا زبان کی عبادت ہے۔ اللہ سے ملاقات کا شوق پیدا ہونا روح کی عبادت ہے۔ جو چیز حضور حق میں غفلت کا سبب ہو اس سے پرہیز کرو۔ کشائش و ترقی زیادہ روزہ رکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ شغل سے زیادہ ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ساری ترقی مرشد کے فیض وتربیت پر موقف ہے۔ حضوری میں بہت جلد ترقی ہوتی ہے، مرشد کے زیر نظر ہونا بڑی بات ہے، ایک قسم کا اشارہ عالم کے عالم کو ہلا دیتا ہے، مرشد کے ایک اشارہ سے ہزار گمراہ و بدکار کامل اور ولی ہو جاتے ہیں۔ سالک راہ کو من کان اللہ فکان اللہ لہ کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ جب ایسا ہوتا ہے تبھی من ترک الکل و جد الکل کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ سالک راہ کو چاہیے کہ زبان اور قدم کا خیال رکھے۔ خلق سے زیادہ اختلاط نہ رکھے جہاں تک ہو سکے خاموشی اختیار کرے۔ آپ کے ایک عزیز نے عرض کیا کہ دوسرے مشائخ مقامات کی تفصیل بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا ہمارے خانوادے میں تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں ہم پہلے ہی قدم میں ذات احد کو پہنچتے ہیں۔ کسی نے عرض کیا کہ ریاضت کس سلسلہ میں زیادہ ہے اور کس سلسلہ میں کم ہے، فرمایا کہ سلسلہ سہروردیہ میں ریاضت سب سے زیادہ ہے اور سلسلہ شطاریہ میں سب سے کم ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ سلسلہ نقشبندیہ میں فلاں ذکر حبس دم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اجازت ہو تو کروں۔ فرمایا کہ وہی ذکر سلسلہ شطاریہ میں بغیر حبس دم کیا جاتا ہے۔ صوفی فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ کے سوا نوافل کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو بلکہ استغراقیت میں زیادہ کوشاں رہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین، حسنات المقربین سیئات الواصلین، حسنات الواصلین سیئات العاشقین، موتوا قبل ان تموتوا یعنی موت سے پہلے ایسا ہونا چاہیے کہ موت کا شعور باقی نہ رہے۔ ہمہ وقت ذکر خدا میں مشغول رہنا چاہیے یہاں تک کہ دل ذاکر ہو جائے۔ جب دل ذاکر ہو جاتا ہے تو جسم کے ہر ایک حصہ سے ذکر کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خواب میں بھی قلب غافل نہ رہے گا۔ جو شغل کرے دس روز سے کم نہ کرے کیوں کہ فتحیابی دس میں مضمر ہے اور عشرہ میں خاص تاثیر ہے اور جس شغل میں لذت پائے، اس میں ہمیشگی برتے۔ کسی نے وسوسوں کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ اس کی طرف خیال بھی نہ کرو بلکہ اپنے شغل میں مشغول رہو وسوسے خود بخود دور ہو جائیں گے، کسی نے سوال کیا کہ ایک وہ موحد ہے جو غلبہ حال میں کتوں کے ساتھ کھانا کھا لیتا ہے اور دوسرا عالم خشک ہے۔ تو ان دونوں میں بہتر کون ہے۔ تو جواب میں فرمایا کہ جو زاہد جمیع اشیا میں حق کا مشاہدہ کرتا ہو اور کسی چیز کا دل میں خیال نہ رکھتا ہو وہ زاہد خشک عالم سے بہتر ہے۔ ذکر یا شغل جتنا بھی ہو اس پر پابندی کرنا چاہیے کیوں کہ پائنداری کا راز تسلسل میں مضمر ہے۔

المختصر آپ کی پوری زندگی بندگان خدا کی رشد وہدایت، درس و تدریس اور ریاضت و مجاہدہ میں صرف ہوئی۔ آپ کی کل مدت عمر اٹھاسی ۸۸ سال ہے۔ یکشنبہ کی صبح صادق کا وقت محرم الحرام کا مہینہ اور ہجرت کا ۹۹۸ واں سال تھا جب آپ دار فانی سے دار بقا کی جانب سفر کرتے ہوئے اپنے مطلوب ومقصود سے وصال فرما گئے۔

یہ خاکدان گیتی جب تک قائم رہے گی اور علم وعرفان کا جب تک دور رہے گا حضرت قطب گجرات منارۂ نور کی حیثیت سے چمکتے رہیں گے۔ سید واڑہ خانپور احمد آباد میں آپ کا نورانی آستانہ مرجع خلائق ہے۔ فیض بخشی کا یہ در صدیوں سے آباد ہے، جہاں تشنگان معرفت و

حقیقت اور طالبان دین و دنیا سیراب ہو رہے ہیں۔ جس کی طلب جیسی ویسی عطا کا منظر اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حصول برکت کی نیت سے حضرت قطب گجرات کے مختصر حالات میں نے قلمبند کرنے کی سعادت حاصل کی ہے ورنہ کہاں آپ کی ذات ہمہ جہت اور کہاں مجھ جیسا بے بضاعت۔ ہر سال پابندی سے آپ کا عرس مبارک ۲۶ تا ۲۹ محرم الحرام کو بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس وقت حضرت سید شاہ احمد علوی دامت برکاتہ سجادہ نشین ہیں۔ تمام مراسم عرس آپ کی سرپرستی میں انجام پاتے ہیں۔ آپ کے برادر خورد مرد حق آگاہ حضرت سید شاہ مظہر حسینی علوی صاحب قبلہ نہ صرف اس خانوادہ بلکہ خانوادۂ بے جاپور اور سلسلہ عالیہ قادریہ شطاریہ کے تمام ارادت مندوں اور عقیدت مندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ ماشاء اللہ زبان میں بڑی تاثیر ہے اور انداز فقیرانہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ حضرت موصوف اس وقت سرکار وجیہ الدین کے جیتے جاگتے فیضان ہیں۔ عمر مبارک اسی ۸۰ سال سے زائد ہے، ان دنوں خلوت نشینی کی خاطر مقام جھانور ضلع بھروچ میں سکونت پذیر ہیں۔ ایک اور بڑی پیاری شخصیت حضرت سید اقبال حسین علوی حسینی صاحب قبلہ کی ہے جو حضرت عارف باللہ سید شاہ فیض اللہ حسینی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ کے شہزادے ہیں۔

حضرت قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ و درس گاہ کے پروردہ و تعلیم یافتہ نفوس چہار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ علمائے ربانیین کے ساتھ عارفین کی ایک بڑی تعداد ہے جو آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ رہے ہیں اور سلسلہ شطاریہ کے فروغ و اشاعت کے لئے ہمہ وقت مصروف عمل بھی رہے۔ برصغیر ہند و پاک کی بڑی و مشہور خانقاہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت سے اکتساب فیض کرتی رہی ہیں۔ آپ کے وصال ظاہری کے بعد قطب الاقطاب وارث علوم و معارف وجیہی حضرت سید شاہ عبد اللہ حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ درس و تدریس کے ساتھ خانقاہی نظام کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ اس دوران حضرت قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے قطب دکن حضرت سیدنا ہاشم پیر دستگیر رحمۃ اللہ علیہ ابن حضرت سیدنا برہان الدین حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید شاہ عبد اللہ حسینی علوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت عالیہ میں اکتساب علوم و معارف کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ خانقاہ عالیہ میں مقیم رہ کر تزکیہ نفس و تصفیہ قلب و ذکر و شغل وغیرہ میں شبانہ روز کمال درجہ کے انہماک کے ساتھ رضائے مولیٰ میں لگے رہے۔ یہی وہ عارف باللہ ہیں جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں بے جاپور تشریف لا کر اپنی نورانی صورت و مصطفوی سیرت کی تعلیمات سے لاکھوں تاریک قلوب و اذہان کو نور ایمانی سے منور کرتے رہے۔ حضرت سیدنا ہاشم پیر دستگیر رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضری ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم حضرت قطب گجرات رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ حضرت سیدنا ہاشم پیر رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ بے جاپور کرناٹک میں مرجع خلائق ہے۔ ۷/رمضان کو سالانہ عرس مقدس منایا جاتا ہے اور آپ کے اسم گرامی سے منسوب دینی، علمی و روحانی درسگاہ جامعہ ہاشم پیر قائم کی گئی ہے، جو یقیناً صوفیائے کرام کی تعلیمات کی امین ہے۔

❁❁❁

"حدیث شریف میں ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ دنیا کی ساری قومیں ہم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح گدھ مردار پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آج وہی زمانہ ہے حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ نے دریافت کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا مسلمان کم ہو جائیں گے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا نہیں! تو پھر کیا وجہ ہوگی، تو ارشاد مبارک ہوا کہ یہ لوگ موت سے گھبرائیں گے اور دنیا کی محبت میں ڈوب جائیں گے تو موت سے بے خوف کرنا اور دنیا کی محبت کو دلوں سے نکالنا، یہ صوفیہ کا کام ہے، یہ ان کے مرکز کا کام ہے اور انہیں کے ذمہ داروں کا فریضہ ہے۔ آج ہم اپنے اسلاف کے ان کارناموں کی طرف جائیں، ان کے طریقوں کی طرف جائیں اور ان کے بتائے ہوئے اصول کی طرف جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت نہ ہمیں زیر کر سکتی ہے، نہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

علامہ مفتی خلیل احمد حیدر آباد

(بحوالہ صوفی جرنل ۲۰۰۷ء، ص: ۳۵)

حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفی کشمیری

ڈاکٹر غلام رسول خاں .... ریڈر: وسط ایشیائی مطالعاتی مرکز، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

سرزمین کشمیر ابتدا ہی سے بڑی مردم خیز رہی ہے اور یہاں بڑے سر برآوردہ فنکار، عظیم صوفی بزرگ اور دینی رہنما پیدا ہوئے۔ مولانا شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار کشمیر کی ایسی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہیں دنیائے ادب کے علاوہ مذہبی اور روحانی پیشواؤں کی صف میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ آپ یکتائے روزگار تھے اور ایک عہد آفریں شخصیت بھی۔ آپ علم وعمل، زہد وورع، جود وسخا، حلم و انکساری، تواضع وفروتنی، ایثار وخدمت خلق کا عملی نمونہ تھے۔ عزم مصمم، یقین محکم اور استقلال اُن میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ استغنا و بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ امرائے وقت کے درباروں میں بن بلائے نہ گئے اور اگر کبھی جانے کا موقع ملا تو دوسروں کی طرح دست سوال دراز نہ کیا۔ اپنے دیگر معاصرین کے برعکس کسی بھی امیر یا وزیر کی مدح وتوصیف نہ کی۔ یہی بات ان کو دوسرے لوگوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ جامع صورت وسیرت کے یہ پیکر بیک وقت اعلیٰ پایہ کے محدث، مفسر، دینی رہنما، صوفی بزرگ، شاعر وادیب تھے۔ غرض کہ آپ کی ذاتِ والا ستودہ صفات میں وہ تمام محامد ومحاسن موجود تھے جن کی بدولت آپ جامع کمالات صوری ومعنوی کے لقب سے نوازے گئے۔

آپ کا اسم گرامی مسلمہ طور پر یعقوب ہے۔ صرفی شاعرانہ تخلص اور عاصمی وگنائی خاندانی لقب ہے۔ جامی ثانی، بوحنیفہ ثانی، جامع الکمالات، حضرت ایشان اور شیخِ اُمم جیسے القاب سے یاد کیے جاتے ہیں، علم وفضل، تقویٰ وتقدس کے اس روشن ستارے کی ولادت ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں ہوئی۔ ''شیخ حی'' تاریخ ولادت ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے آپ کی جائے پیدائش کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ البتہ آپ کے ایک برگزیدہ خلیفہ وشاگرد خواجہ حبیب اللہ حُبی نے محل تولد کشمیر بتایا ہے۔

مولدش نیز گفتمت کشمیر   صانہا اللہ عزمن تدمیر [1]

مولانا شیخ یعقوب صرفی کے خاندانی بزرگوں میں صرف ان کے جد امجد میر بایزید عاصمی وگنائی اور دادا امیر محمد علی عاصمی وگنائی کا نام تاریخ میں درج ہوا ہے۔ بایزید عاصمی کا تعلق سلطان زین العابدین بڈشاہ کے دربار سے تھا اور کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اُسے امیر القوم کے لقب سے نوازا تھا۔ [2] موصوف کے بعد ان کا بیٹا محمد علی عاصمی وگنائی اور پوتا شیخ حسن برابر شاہی دربار سے وابستہ رہے۔ مولانا شیخ یعقوب کے والد کمال الدین شیخ حسن، شاہی دربار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے رئیس اور جاگیر دار بھی تھے۔ اشغال دنیوی میں منہمک ہونے کے باعث فیض ازلی سے کامیاب تھے۔ انہوں نے کاروبار جہاں کو تصوف وسلوک کے منازل طے کرنے میں حائل نہ ہونے دیا۔ آپ سیرت وصورت میں فضیلت شعار تھے۔ دل خدائی بھیدوں کا خزانہ تھا۔ دنیاوی جاہ وحشمت ہوتے ہوئے بھی آپ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی بدولت معنوی دولت سے سرفراز تھے۔ کسبی علوم کو حاصل کرنے کے علاوہ وہبی کمالات کو پا گئے تھے۔ ظاہری طور پر دنیاوی کاروبار میں مشغول لیکن مخفی طور پر دینی امور کے پابند تھے۔ روحانیت کے میدان میں میر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے بڑی جستجو کی اور مولانا حافظ بغیر (م ۹۴۶ھ) سے تربیت پائی۔

اعلیٰ حسب ونسب، امارت اور گھر کے مذہبی، روحانی اور علمی ماحول کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولانا شیخ یعقوب صرفی کی پرورش ناز ونعم کے ساتھ اور تعلیم وتربیت بہترین طریقے پر ہوئی ہوگی۔ موصوف نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد سے پائی اور بچپن سے ہی خداداد ذہانت اور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور آٹھویں سال میں ہی شعر عجم اُن کی فطری طبیعت پر رواں ہونے لگا۔ اپنے والد

سے ہی، جو خود شاعرانہ ذوق رکھتے تھے، اس فن کی اصلاح لی۔ مشہور ہے کہ مولانا شیخ یعقوب نے مذکورہ سن و سال میں ہی ایک غزل کے چند اشعار اور معما کے چند بیت انشا کیے۔ خواجہ حُبی نے غزل اور معما کے بیت نقل کیے ہیں۔ مولانا عبدالوہاب شائق نے مولانا شیخ یعقوب کا آٹھ سالہ عمر میں ہی نعت پیمبر کے طور پر قصائد کہنے کا یوں واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

چو شد ہشت سالہ قصائد بگفت
بہ نعت پیمبر دُرہا بسفت ۳

مولانا شیخ یعقوب صرفی کشمیری ایک مقتدر خاندان کے فرد تھے۔ آپ ذہین و فطین تھے اور بچپن سے ہی رُشد و ہدایات کے آثار آپ کی جبین سے ہویدا تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور آٹھ سال کی عمر میں اپنی بعض علمی وسعتوں میں اضافہ کرنے کے بعد اُنہیں مونڈنا آنی ہروی جیسے ولی کے سپرد کیا گیا۔ جن کی زیرِ نگرانی علوم وفنون کے دیگر شعبوں میں مہارت حاصل کی۔ کم سنی کے باوجود تصوف میں اپنے استاد کی رہبری حاصل کی، چنانچہ خود کہتے ہیں:

بسن صغیرم نکردہ نظر   مرا در تصوف شد او راہبر ۴

علاوہ ازیں مولانا شیخ یعقوب صرفی نے جن دیگر چشمانِ فیض سے کسب فیض کیا اُن میں مولانا کمال الدین، حافظ بصیر اور مولانا میر رضی الدین قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ان جملہ چشمان فیض کے زیرِ تلمذ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا اور انیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم اپنے دل میں سما کر اعلیٰ تہذیبی معیار اور شائستگی میں نامور ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں جذبۂ باطنی میسر آیا اور سیر و سلوک کے میدان میں عملی اقدام کی خاطر جناب شیخ حسین خوارزمی علیہ الرحمۃ کی رہبری واستادی اختیار کرنے کی غرض سے جانب سمرقند متوجہ ہوئے۔

سمرقند پہنچنے پر مولانا شیخ یعقوب اپنے پیر و مرشد جناب شیخ حسین خوارزمی کے دروازے پر آ کر بیٹھ گئے۔ مرشد نے نہایت نوازش اور عنایت سے کام لے کر موصوف کو اپنے پاس طلب کیا اور نہایت شفقت سے احوال پُرسی کی۔

چو بار ہبر خود مشرف شدم   ہر دم بہ فیضی موظف شدم

مرشد طریقت کے ساتھ برگزیدہ خلیفہ، جو سالکوں کی تربیت کرنے پر مامور تھے، حاضر خدمت ہوئے اور اس بات کے منتظر رہے کہ دیکھیے اس نووارد کی تربیت کس کے سپرد ہوتی ہے۔ مخدوم اعظم جناب شیخ حسین نے فرمایا کہ اس نوجوان کا کام ہی علیحدہ ہے اس کو مجھ پر چھوڑ دو اور اس طرح سے اُن کی تربیت اپنے ذمہ لے لی۔ مولانا شیخ یعقوب کا کہنا ہے کہ:

بار چوں در خدمت او یافتم   روی دل از غیر خدا تافتم
چوں نظرے کرد باین خاکسار   زورقم آمد محیط از کنار ۶

مولانا شیخ یعقوب نے جب مفوضہ خدمات بوجہِ احسن ادا کیں تو مخدوم اعظم نے ان کو اپنی ذاتی توجہ سے تصوف و سلوک کے مطلوبہ منازل و مراحل کو سخت محنت و ریاضت کے ساتھ طے کرایا اور عرفان کے برگزیدہ اور مخصوص درجوں تک پہنچایا۔ پھر مرشد کی مہربانیاں اور نوازشیں بڑھتی ہی گئیں اور انہوں نے موصوف کو خطِ ارشاد جو اپنے ہاتھوں سے رقم کیا اور خرقۂ خلافت کا شرف بخشا۔

مولانا شیخ صرفی کو والدین کی فرقت اور وطن کی یاد ستانے لگی۔ اپنے پیر و مرشد سے وطن واپسی کی اجازت چاہی، اجازت عطا ہوئی تو کشمیر کا رخ کیا۔ خواجہ حبی کا کہنا ہے کہ آخر حضرت، پیر کے حکم سے کشمیر کی جانب روانہ ہوئے اور خود خواجہ حسین نے مکہ مکرمہ کی جانب عزم سفر کیا۔ مولانا شیخ یعقوب نے کچھ منزلوں تک اپنے مرشد کا ساتھ دیا۔ مرشد نے آپ کو الوداع کرتے ہوئے فرمایا "اگر توفیق ہو تو دوبارہ شوق سے آسکتے ہو"۔ جس راستے سے مولانا صرفی سمرقند گئے اُسی راستے سے واپس مراجعت کی۔ کشمیر پہنچ کر موصوف نے ایک خاص مدت تک یہاں قیام فرمایا۔ حیات صرفی کے مصنف کا بیان ہے کہ "مولانا (شیخ یعقوب) نے شیخ سلیمان کشمیری کی بنا کردہ خانقاہ درجن میں توقف فرمایا" ۷ کشمیر میں اپنے قیام کے دوران رشد و ہدایات کی شمع روشن کی اور بہت سارے لوگ کو اُس کے پروانہ بن گئے۔

چو شمع ہدایت برافروختم   بسی راہپر وانگی سوختم ۸

کشمیر میں ایک خاص مدت تک مقیم رہنے اور طالبان راہ حق کو فیض پہنچانے کے بعد مولانا شیخ یعقوب کو اپنے پیر و مرشد شیخ حسین خوارزمی کا شوق دیدار دامن گیر ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی راہ لی۔ گجرات کو اپنا ماویٰ و مسکن بنایا اور یہیں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سمندری

راستے سے کشتی پر سوار ہو کر سفر محمود پر روانہ ہو کر زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوں، لیکن پیر و مرشد نے ایک واقعہ میں انہیں پہلے سرزمین خراسان کی سیر کرنے اور وہاں کے صاحبان علم سے مستفیض ہونے کی بشارت سنائی۔

اپنے پیر و مرشد شیخ حسین سے بشارت ملنے پر مولانا صرفی عازم سفر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اس طویل سیر و سفر کا آغاز ہوتا ہے جس کے بارے میں خود ان کی مثنوی مغازی النبی اور خواجہ جہی کی مقامات مرشد ما، یا سیاحت نامۂ صرفی شاہد ہے۔ موصوف کے دورۂ ایران اور وسط ایشیا کے بعض علاقوں اور برصغیر ہند و پاک کے کئی اہم مراکز کی سیاحت اور وہاں کے صاحبان علم و فن سے مستفید ہونے کا بیان اختصاراً کیا جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے علوم ظاہری و باطنی میں وہ کمالات حاصل کیے جن کی بنا پر ان کے معاصر مشائخ علما و فضلا نے انہیں جامع الکمالات صوری و معنوی کے لقب سے نوازا۔

کثرت سفر اور لوگوں سے شرف ملاقات کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

دلا پیش ازین بعد ازان نیز ہم — بہ سیر و سیاحت نہادم قدم
سیاحت بعالم بسی کردہ ام — ملاقات باہر کسی کردہ ام 9

مولانا شیخ یعقوب صرفی نے ایران اور وسط ایشیا کے جن علاقوں کا سفر کیا، ان میں قندھار، قندز، بدخشاں، کابل، رستاق، کولاب، بلخ، بخارا، مہنہ، تاشقند، اندجان کات، خیوق، خوارزم، مشہد مقدس، جام، ہرات، سبزوار، اسفرائن، قزوین، تبریز وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان علاقوں کی سیاحت کے دوران مولانا موصوف نے نہ صرف وہاں کے علما، فضلا، شعرا، ادبا، مشائخ، روحانی بزرگوں اور مذہبی و دینی شخصیات کی صحبتوں سے کسب فیض کیا بلکہ بعض علاقوں میں موجود وہاں کی خانقاہوں میں چلہ کشی کی اور بعض روضہ ہائے فائض الانوار کی زیارات سے مستفید ہوئے۔ رستاق کے مقام پر میر سید علی ہمدانی کی بنا کردہ خانقاہ میں عبادت کی اور یہیں پر نور الدین جعفر بدخشی کے روضے کی بھی زیارت کی۔ کولاب میں میر سید علی ہمدانی کے روضۂ انور کی زیارت کی۔ خیوق میں شیخ نجم الدین کبریٰ کی بنا کردہ خانقاہ میں چلہ کشی کی اور خوارزم کے مقام پر ان کے روضہ کی زیارت کی۔ مشہد مقدس میں حضرت امام رضا کے روضہ فائض الانوار کی زیارت سے مستفیض ہوئے۔ امام کے روضہ کی زیارت کی انجام دہی میں مولانا ایک عینی کرامت کے شاہد ہیں جو کہ ایک نابینا عورت آفتی کے ساتھ پیش آئی۔ قزوین کے مقام پر شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں رسائی پائی اور یہیں پر عبداللہ شوستری کے ساتھ مذہبی معاملات پر کافی بحث و تمحیص کی۔

مولانا شیخ یعقوب صرفی نے سفر عراق (عجم) میں بہت سارے اہل فضل اور اصحاب دانش سے ملاقات کی جو موصوف کے ہم عقیدہ اور سنت کی راہ پر کاربند تھے۔ عراق (عجم) کا سفر کرنے کے بعد مولانا بغداد تشریف لے گئے اور اس طرح انہوں نے دنیائے عرب میں بغرض سیاحت قدم رکھا اور وہاں پر بہت سارے صاحبان علم و فن، اولیا و مشائخ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کے علمی تبحر سے استفادہ کیا۔ مولانا کا دل، عالی گہر اماموں کے فیض سے سامرہ میں بہرہ مند ہوا۔ خفتگان خاک کربلا کی زیارت سے کافی فیض پایا اور نجف کے مقام پر شاہ نجف کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا شیخ یعقوب صرفی نے ہندوستان کے اپنے سیر و سفر کے دوران بلوچستان میں ابراہیم خاموش، ٹھٹھہ (سندھ) میں سید علی جیسے صاحب نظر، شیخ پورہ میں مشہور زمانہ خوش خط شیخ مرکب، لاہور میں شیخ موسیٰ، شیخ عبدالشکور اور حبیب اللہ جیسے اولیا، لدھیانہ میں سید علی، سرہند شریف میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، انالہ میں شیخ پیر، منشیر تھا میں شیخ جلال حصاری اور شیخ جنید، پانی کے مقام پر شیخ امان اللہ، دہلی میں شیخ عبدالعزیز، آگرہ میں شیخ جلال، جونپور میں شیخ ادھن، میوات میں شیخ عبدالملک اور شیخ کمال، نارنول میں شیخ نظام الدین نارنولی، ناگور میں عارف امام، جودھپور میں شیخ سلیمان صابون گر اور پٹنہ میں شیخ حسام جیسے اولیائے باصفا سے ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ مولانا صوبۂ اکبر آباد کے موضع سیکری میں شیخ الاسلام، شیخ سلیم چشتی سے ملاقات کی اور ان سے سلسلۂ چشتی میں سرفراز ہوئے۔ اجمیر شریف میں مولانا پر، خواجہ معین الدین چشتی کے روضہ مبارک پر انوار عین الیقین کا کشف ہوا۔ احمد آباد (گجرات) میں اپنے قیام کے دوران مولانا شیخ یعقوب نے بہت سارے اہل حضور سے ملاقات کی اور وہاں کے اصحاب علم اور اہل شہود سے علوم و معارف

میں کسب فیض کیا۔ گجرات کے شہر بروچ میں شیخ غیاث جیسے مجرد کی صحبت اختیار کی اور ان سے علم ہیئت وحکمت کی ہر مشکل کو آسان کیا۔ کنائی (گجرات) میں چشتی سلسلہ کے ایک اہل کمال علی جان سے ملاقات کی۔ گجرات میں اپنے قیام کے دوران مولانا شیخ یعقوب کو امام ابوحنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ کا جبہ مبارک ان کی اولاد میں سے ایک زاہدہ وعارفہ سے حاصل ہوا۔

مولانا صرفی کو احمد آباد (گجرات) کے ساتھ خاص انس اور لگاؤ تھا۔ آپ نے اکثر اوقات اس شہر کو اپنا ماویٰ ومسکن بنایا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ:

دلبر من وطن ساختہ در گجرات است
جانب کشور کشمیر عزیمت چون کنم ۱۰

مولانا نے اپنی دو مخصوص غزلوں میں اس شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہاں کے محبوب صفت لوگوں کی ستائش یوں کی۔

احمد آباد است و ہر سو نازنینان فوج فوج
بیدلان افتادہ در دنبال ایشان فوج فوج ۱۱

یہ گجرات ہی تھا جہاں سے مولانا صرفی نے دنیائے عرب میں بغرض سیاحت قدم رکھا اور ملک یمن میں نزول اجلال فرمایا۔ اس کے علاوہ قنفقذہ، کمرن، خضرموت اور زبید نامی علاقوں کے فقہا ومحدثین اور مشائخ کی صحبتوں سے مالا مال ہوئے۔ زبید کو خیر باد کہنے کے بعد احرام حج باندھا اور حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دیا۔ مکہ معظمہ میں اپنے قیام کے دوران مولانا شیخ یعقوب نے جن اہم برگزیدہ ہستیوں سے فیضان پایا ان میں شیخ ابن حجر مکی، شیخ عبدالعزیز، مولوی صادق طارمی اور شیخ حسن شامی قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے ان حضرات کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیے اور صحیحین، مشکوٰۃ شریف، جامع ترمذی اور فصوص الحکم جیسی کتابیں درساً پڑھیں اور ان میں سے تفسیر، فقہ اور حدیث میں باضابطہ سندات حاصل کیں۔ مدینۃ النبی میں قیام کے دوران مولانا نے یہاں کے افاضل، عرفا ومشائخ کی صحبت اختیار کی اور ان سے علوم ومعارف اور روحانی فیوض پائے۔ قبا کے مقام پر شیخ فتح اللہ مکی کے زیر تلمذ میں فتوحات مکیہ کے درپیش اسرار ورموز کی مشکلات حل کیں۔

مولانا شیخ یعقوب نے کشمیر سے باہر اپنے قیام اور بیرون ملک اپنے دور دراز اور طویل سفر کی انجام دہی میں بہت سارا قلمی مواد بھی اکٹھا کیا جن میں حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر اصناف سے متعلق کتابیں وافر مقدار میں شامل تھیں اور کشمیر میں ایک عظیم لائبریری کا قیام عمل میں آیا جو کہ صاحبان علم وتحقیق کے لئے مدد ومعاون ثابت ہوئی۔

مولانا شیخ یعقوب صرفی کا زمانہ اگرچہ سیاسی لحاظ سے افراتفری کا زمانہ تھا، لیکن پھر بھی سرزمین کشمیر کئی بزرگان دین، علما وفضلا، سادات ومشائخ کے علم وعرفان کی فیض رسانی کے نتیجے میں اپنے محور پر اوج وشان کے ساتھ بخوبی رہی۔ مولانا کے احباب کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جن میں نہ صرف کشمیر بلکہ بیرون ریاست کی بعض نامور ہستیاں بھی ہیں، جن میں ابوالفضل علامی، ابوالفیض فیضی اور مولانا عبدالقادر بدایونی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بدایونی کے تو شیخ یعقوب صرفی کے ساتھ قریبی مراسم تھے۔ ان کے درمیان آپس میں باضابطہ خط وکتابت کا سلسلہ رہتا تھا۔ بدایونی نے چند ایک خطوط اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ مولانا کے دیگر احباب ومعاصرین میں شیخ حمزہ مخدوم بابا داؤد خاکی، مولانا مولوی شنگرف گنائی، ہردی بابا ریشی، ملا شمس الدین پال، خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحٰق قاری، شیخ احمد چاگلی، خواجہ میرم نماز وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دسویں صدی ہجری اور اس کے بعد مولانا شیخ یعقوب کے پایہ کا کوئی صوفی، مفسر، عالم، فقیہ، محدث اور سخن ور کشمیر میں پیدا نہ ہوا۔ انہیں خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ چنانچہ اپنے بھائی شیخ محمد حسن کو علوم ظاہری کے حصول کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

بی تکلف بگویمت سخنی — کہ بعالم کجاست ہمچو منی
در حقایق بد ہر مشہورم — بر زبانہا بہ فضل مذکورم ۱۲

مولانا شیخ یعقوب صرفی کی عہد ساز شخصیت ہمہ جہت پہلو کی حامل تھی، ایک روحانی بزرگ کے ناطے آپ کی حیثیت مسلم ہے۔ اپنے وقت کے صوفی شعرا وادبا میں بھی آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ اپنی کثرت تصانیف کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اسی وجہ سے آپ جامی ثانی کے لقب سے مختص ہوئے۔ مولانا موصوف نے آٹھ سال کی عمر میں ایک غزل اور معما کے چند بیت انشا کیے۔ عبدالوہاب شائق کے مطابق

اسی سن وسال میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موصوف نے بعض بلند پایہ اساتذہ کی زیرنگرانی غزل، قصیدے، رباعی اور معما جیسی اصناف شعر میں طبع آزمائی کی اور رفتہ رفتہ اپنی علمی وسعتوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ شعری پختگی، فکری تہہ داری اور تخیل کی بوقلمونی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اپنی شاعرانہ عظمت، فصاحت و بلاغت، شیریں بیانی اور سلاست و روانی کا انہیں احساس تھا۔ مولانا صرفیؔ نے شاعری کے میدان میں جو نام پیدا کیا، ان کے معاصرین کے ساتھ ساتھ دیگر علما وفضلا اور ادبا نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور سبھی ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں۔

مولانا شیخ یعقوب صرفیؔ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے مثنوی کی صنف کو خصوصی طور پر اپنے موضوعات کے لئے برتا۔ آپ کشمیر کے اولین فارسی گو شاعر ہیں جنہوں نے نظامیؔ اور دیگر استادان سخن کی تقلید میں ایک خمسہ اپنی یادگار چھوڑا ہے اور اس طرح کشمیر میں اپنے بعد آنے والے شاعروں کے لئے ایک راہ متعین کی۔

دوسرے شعرا کے برعکس مولانا صرفیؔ کا شعر وسخن میں نہ کوئی سرپرست تھا اور نہ مولی۔ انہوں نے متعدد مشاغل، مصروفیات اور زمانے کی آشفتہ حالی کے باوجود کئی کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ نظامیؔ کی پیروی میں خمسہ بھی لکھا اور یہ سب کچھ اپنی منشا کے مطابق کیا۔ اس میں انہیں کسی قسم کا معاوضہ وصلہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے خمسہ یا اپنی دیگر تصانیف میں کسی امیر، وزیر یا بادشاہ کی مدح سرائی نہیں کی ہے اور نہ ہی اپنی کوئی کتاب کسی حاکم کے نام منسوب یا معنون کی ہے۔

مولانا صرفیؔ نے خمسہ لکھتے وقت اپنے پیش روؤں کو ملحوظ نظر رکھا ہے اور دیگر معروف شعرا کی طرح اپنی مثنویوں کو لکھتے وقت ان کے سبق کی پیروی کی ہے۔ استادان فن کی پیروی میں مولانا نے خمسہ لکھ کر قابل تقلید کام انجام دیا ہے۔ اگر ایران کے لوگ نظامیؔ، خسروؔ، جامیؔ اور مولانا رومی کی مثنویوں پر فخر کرتے ہیں تو کشمیری بھی مولانا کا خمسہ بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے اس پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ مولانا صرفیؔ کے پنج گنج کا پہلا خزینہ مسلک الاخیار کے نام سے مشہور ہے۔ وامق وعذرا، لیلیٰ مجنون، مغازی النبی اور مقامات مرشد، مولانا کے پنج گنج کے باقی خزینے ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی میں دیوان اشعار اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ جس کا واضح ثبوت آپ کی گراں قدر تصانیف سے ملتا ہے جو آپ نے فارسی وعربی میں مختلف موضوعات پر تحریر کیں۔ آپ اپنے زمانے میں علم تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف میں ایک سند تصور کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تصوف میں آپ کی رباعیاں مع شرح کے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اذکار و مراقبہ کے موضوع پر رسالہ ذکر یہ تحریر کیا۔ فن تمیہ (؟) پر متعدد رسالے آپ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ دنیائے اسلام کی بعض گراں قدر کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھ ڈالی۔

ابوالفیض فیضی کا قلمی غرور توڑنے کے لئے ان کی تفسیر سواطع الالہام پر تقریظ لکھی۔ اسلام کے ایک اہم دینی فریضۂ حج اور اس کے فقہی امور سے متعلق مناسک حج نام کی کتاب آپ کی فکر کا ہی گراں بہا ثمرہ ہے۔ بہر حال آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔ چند ایک کا تعارف مندرجہ بالا سطور میں دیا گیا جب کہ بعض کتابیں زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

مختصراً علم وفضل اور تقویٰ وتقدس کا یہ آفتاب جمعرات کے دن نماز عشا کے بعد ۱۲رذی القعدہ ۱۰۰۳ھ/۱۰رجون ۱۵۹۵ء کو ۷۵ سال کی عمر میں غروب ہوا۔ آپ اپنے آبائی شہر سری نگر میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ آپ کی وفات حسرت آیات پر آپ کے برگزیدہ خلیفہ خواجہ حبیب اللہ حبی نے ایک مختصر رسالہ تحریر کیا جو رسالہ تصوف یا وفات نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ اپنے اس موجز رسالے میں موصوف اپنے دلی جذبات، احساسات وکیفیات کا اظہار یوں کرتے ہیں" زہی پیری کبیری دست گیری نظیری کہ مثل او دریں زمانہ مفقود بلکہ قرنہا نخواہد بود آنکہ از جہان فانی سوی عالم جاودانی در تاریخ دوازدہم ذی القعدہ است، روز پنج شنبہ وقت عشا رحلت نمود۔ این کمینہ (حبی) بہ فرط مصیبت از تاریخ رحلت آں حضرت قدس سرہ العزیز چند بیتی مخمس و چند بیتی بطریق دیگر گفتہ و دری چند بہ الماس ابیات سفتہ ۱۳

چوں ازیں عالم فانی شداو — نالہ وگریہ چو دیدم ہمہ سو

بہر تاریخ بدل کردم رد — گفت بگذار سہ و باز بگو

باقی صفحہ: ۲۷۴ پر

صوفی وشاعر حضرت حبّی کشمیری

ڈاکٹر سیدہ رقیہ .... ریڈر شعبۂ فارسی دانش گاہ کشمیر، سری نگر

امام عارف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ طریقت ہی صراطِ مستقیم ہے جو سب راہوں سے زیادہ بڑا اور سب سے زیادہ اعلیٰ ہے، اس لئے کہ راستہ کی شرافت اور دنائت اس کی غایت اور منزل مقصود کے اعتبار سے ہوتی ہے اور جبکہ اس طریق کی غایت حق سبحانہ و تعالیٰ ہے جو اشرف موجودات و اعز معلومات ہے۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس لئے اس کا راستہ بھی سب سے اشرف و افضل ہوا اور جو شخص اس راستہ کا رہبر ہے وہ سب رہبروں اور رہنماؤں سے اکمل و اعلیٰ ہے اور جو راستہ پر چلنے والا ہے وہ سب راستوں کے چلنے والوں سے زیادہ خوش نصیب اور نجات پانے والا ہے۔ اسی لئے عقل مند کے لئے لائق ہے کہ اس راستہ کے سوا کسی راستہ کو اختیار نہ کرے، کیونکہ اس کا تعلق اُس کی ابدی سعادت اور راحت کے ساتھ ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ کے راستے پر چلنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک صادق اور دوسرا صدیق یعنی ایک تابع و خادم دوسرا مخدوم و متبوع۔ تابع کو مرید یا سالک یا شاگرد کہتے ہیں اور مخدوم و متبوع کو شیخ، اُستاد یا معلم کہا جاتا ہے۔

(رُوح تصوف 'شرح اُردو' از مولانا مفتی محمد شفیع، ص:۱۸۱)

کیا خوب تشریح فرمائی ہے امام عارف نے طریقت کے مُرشد اور مرید کی۔ واضح رہے کہ عصر جدید میں بعض لوگ طریقت اور تصوف میں کوئی اعتقاد نہیں رکھتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو شریعت اور طریقت دو علیحدہ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ بالفاظ دیگر طریقت شریعت سے ہی ماخوذ ہے کیونکہ جہاں تک صوفیا کی تصانیف کا تعلق ہے وہاں یہ بات مطالعے میں آجاتی ہے کہ تصوف کا اصلی مفہوم طاعات و عبادات، امر و نہی کی تعمیل، اتباع کتاب و سنت اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ دراصل مسلمانوں میں ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود تھا جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یادِ خدا و ذکر الٰہی کو رکھا اور صدق و صفا، سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد غالباً اُن کے طریقِ عبادت کا نام تصوف پڑ گیا اور وہ خود صوفی کہلائے۔ بہر حال یہاں پر لفظ تصوف کے اشتقاق اور تحقیق لغوی کو بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ کشمیر کے ایک باکمال صوفی بزرگ حبیب اللہ حبّی نوشہری کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے صوفیانہ مسلک، روحانی شخصیت اور علم و فن پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ کشمیر میں آٹھویں صدی ہجری کے آخری حصے میں میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کی (بادیگر سادات کِبار) مبارک تشریف آوری سے آفتاب اسلام پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا، جس کی نورانی شعاعوں سے وادیِ کشمیر کا ذرّہ ذرّہ منوّر ہوا۔ چنانچہ اُسی زمانے سے اسلام کی آمد کے ساتھ ہی یہاں پر تصوف کی آبیاری کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا۔ جس کی چند خاص وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ امیر کارواں حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی خود بھی ایک بلند رتبہ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ باکمال صوفی بزرگ تھے اور آپ کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے، دیگر رفقائے کار بھی صاحبِ کشف و کرامات تھے جن کے دست حق پرست پر بیعت کر کے یہاں کے لوگ نہ صرف دائرۂ اسلام میں آگئے، بلکہ تصوف کے ثمرِ شیریں معرفت الٰہی اور حق شناسی کے اسرار و رموز سے بھی آشنا ہوئے۔ گویا نخلِ تصوف کے بیج تو اُسی زمانے میں بوئے گئے تھے۔ جو آہستہ آہستہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرتا گیا اور اپنی ثمر بار شاخیں ہر دور میں پھیلاتا رہا۔ مطلب یہ کہ ہر دور میں نہ صرف غیر ملکی صوفیائے کرام کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا بلکہ خود مادر کشمیر نے ہر دور میں اعلیٰ پایہ کے اولیائے کبار اور صوفیائے عظام کو جنم دیا جو تصوف کے مختلف سلاسل مثلاً کبرویہ، سہروردیہ، چشتیہ اور قادریہ وغیرہ سے وابستہ ہو کر آسمانِ تصوف کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ چنانچہ اُن ملکی اور غیر ملکی صوفی

بزرگوں میں چند کے اسمائے گرامی یوں ہیں: مولانا حافظ بصیر، مولانا محمد آنی، مُلا فیروز مفتی، ملا الماس گنائی، ملا جوہر گنائی، شمس الدین پال، شیخ حمزہ مخدوم، بابا داؤد خاکی، ملا داؤد طوسی، خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحٰق قاری، بابا علی رینا، مولانا میر افضل، مولانا زین الدین علی دار، ابراہیم کول، خواجہ عثمان کول، میاں نعمت اللہ، مولوی فیروز ثانی، خواجہ میرم بزاز، صوفی الہداد، مولانا صوفی علی، میاں یوسف، میرزا اکمل الدین بدخشی، میاں غریب میاں علی، مولوی جعفر، ملا عبدالحی، شیخ محمد شافی، بابا نصیب الدین غازی، نور محمد گانی، شیخ بابا والی، میر محمد خلیفہ، شاہ قاسم حقانی، شیخ احمد کانہامی، خواجہ مسعود پانپوری، حاجی وتر بابا، شیخ محمد پارسا، خواجہ محمد پارسا، ملا حسین خباز، ملا جوہر ناتت، شیخ محمد سعید، خواجہ محمد صادق، مولانا حسن آفاقی، شیخ داؤد مشکوتی، اخوند ملا شاہ بدخشی، شیخ یعقوب صرفی، حبیب اللہ حبّی نوشہری وغیرہ۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صوفیائے مذکورہ نے ہی یہاں پر اپنے اپنے دور میں جگہ جگہ دینی درسگاہیں اور خانقاہیں قائم کر کے اسلام اور تصوفِ اسلامی کی پیش رفت کے لئے بہت حد تک کوششیں کیں جو کافی بارآور ثابت ہوئیں۔ چنانچہ اُن میں سے بعض نے تو اپنے کلام اور اپنی تصانیف میں صرف توحید و تصوف اور عرفان کے نغمے الاپے جو اس وقت بھی خستہ دلوں کے لئے مژدۂ جان فزا اور مبتدیوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ اُسی زمانے میں بعض صوفی خانقاہوں میں موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں جس کی روایات آج تک برابر چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ حبّی کشمیری بھی ایسے ہی صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں جو محفلِ سماع کے دل دادہ تھے۔ اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کے حالات اور حیات کا تذکرہ کیا جائے۔

ولادت اور روحانی سفر:

آپ کا پورا نام خواجہ حبیب اللہ، تخلص حبّی، جائے ولادت نوشہرہ سری نگر کشمیر، سن ولادت ۹۶۳ھ ہے۔ آپ کا تعلق گنائی خاندان سے تھا جو اپنے زمانے میں علم و فضل میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا۔ آپ کے والد خواجہ شمس الدین گنائی نے اپنی ذاتی نگرانی میں آپ کو دینی تعلیم کے علاوہ مروّجہ علوم سے آراستہ کرانے میں بطریق احسن اپنی تمام ذمہ داریاں نبھائیں۔ جس کے نتیجہ میں آپ نے سات سال کی عمر میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اسی طرح باقی مروجہ علوم خاص طور پر فقہ، حدیث، علم کلام، علم اصول اور فارسی زبان و ادب میں بھی بہت جلد کمال حاصل کر لیا اور آپ کشمیر کے ممتاز علما میں شمار ہونے لگے۔ آپ کا آبائی پیشہ دکان داری تھا۔ مشہور ہے کہ آپ کی دکان میں نمک بیچا جاتا تھا۔ دستور کے مطابق آپ کے والد صاحب نے بھی پہلے پہل آپ کو دکان داری کا کام سونپ دیا اور آپ اس کام سے اگرچہ ایک عرصہ تک وابستہ رہے، لیکن ازل نے آپ کی تقدیر میں ایک اور ہی دکان داری لکھی تھی جس کا سامان آپ کو اپنے مرشد خاص شیخ یعقوب صرفی کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جامی ثانی ملقب بہ ایشان صاحب کی خدمت میں میسر ہوا۔ ظاہری دکان داری سے عدم دلچسپی کی بنا پر آپ کے والد صاحب نے آپ کو عملی مشاغل میں منہمک رہنے کے لئے پہلے ملا حسن آفاقی کی خدمت میں بھیجا۔ ان سے اکتساب فیض کرنے کے بعد آپ میر محمد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میر محمد خلیفہ سماع کے بہت دل دادہ تھے۔ آپ سلوک اور سماع کے اولین مرشد سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ مرشد موصوف خود حضرت صرفی کے تربیت یافتہ تھے۔ لہٰذا آپ نے بھی ان سے ابتدائی نوعیت کی تربیت پانے کے بعد براہِ راست حضرت صرفی کی خدمت میں روحانی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ یہی وہ دربار ہے جہاں پر آپ کو ابدی سعادت نصیب ہوئی اور آپ اس مسند روحانی کی خلافت کے مستحق قرار دیے گئے جس کی آپ کو تمنا تھی۔ خلافت کا خرقہ پہن کر روحانیت کا ایسا چشمہ شیریں بہایا جس سے کشمیر کے اور دیگر بے شمار سالکوں اور طالبوں نے نہ صرف اپنی پیاس بجھائی بلکہ آپ کے بعد آپ کی فروزاں کی ہوئی شمع عرفان کی روشنی قائم رکھی۔ آپ کے خلفا کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے فیض پا کر روحانیت کے نمائندہ شہسوار بننے والے معروف ترین حضرات کے نام یوں ہیں: میر شمس الدین، خواجہ زین الدین علی دار، اخوند مہدی علی، ملک درویش محمد، خواجہ محمد صادق، خواجہ عبدالرزاق، سیّد محمد قندروی، خواجہ حسن، مولانا محمد نور، میر سیّد عوض رومی، ملک جہاں گیر، خواجہ محمد یوسف، خواجہ محمد یعقوب وغیرہ وغیرہ۔

ساز وسماع میں دلچسپی:

حبّی کشمیری نویں اور دسویں صدی ہجری میں کشمیر کے آسمان تصوف پر ایک تابندہ ستارہ بن کر چمکے۔ آپ سلاسل تصوف میں سلسلہ کبرویہ سے وابستہ تھے جیسا کہ آپ کے مرشد حضرت صرفی بھی اسی سلسلہ سے وابستہ تھے لیکن وہ ساز وسماع کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ کے بعض دیگر صوفیوں کے مانند آپ ساز وسماع کے کافی دل دادہ تھے کیونکہ آپ کے نزدیک سماع بھی عشق کا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں حضرت خواجہ بندہ نواز سیّد محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت اہم ہے۔ ''خاندان کبرویہ کے لوگ سماع میں الاالـــلـــہ کی ضربیں لگاتے ہیں یہ سماع، سماع نہیں بلکہ ذکر ہے، اس میں جو کچھ اثر ہوگا ذکر کا اثر ہوگا نہ کہ سماع کا۔ سماع تو درحقیقت عشق بازی ہے۔ اس میں ہر دم معشوق کا خیال اور حضور ہونا چاہیے۔'' آگے لکھتے ہیں۔ ''حضرت داؤد علیہ السلام پر سکینہ نازل ہونے کا ذکر قرآن مجید میں سورہ بقرہ میں مذکور ہے جس وقت آسمان سے سکینہ نازل ہوا تو حضرت داؤد علیہ السلام خوشی کے مارے رقص کرنے لگے تھے۔'' سیّد موصوف آگے بیان کرتے ہیں کہ خواجہ غریب نواز بھی سماع کا ذوق رکھتے تھے اور کثرت سے سماع سنا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی بھی سماع کے دل دادہ تھے۔ حضرت خواجہ ابواسحٰق شامی چشتی بھی سماع بہت سنا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں بڑے بڑے مجتہد، مفتی وملا تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ حضرت کے خلاف زبانِ اعتراض کھول سکے۔ حضرت شیخ دینوری بھی ہر سال اپنے پیروں کا عرس کیا کرتے تھے اور سماع سنا کرتے تھے۔ مصنف مذکور سیّد موصوف کے بقول سماع سُننے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ قوّال سماع شروع کرے اور صوفی آنکھیں بند کر کے نغمہ پر دل لگائے اور مراقبہ میں مشغول ہو جائے۔ شیخ الاسلام حضرت بابا فریدالدین اسی طرح سماع سُنا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وجد ورقص اور گریہ وبکا کے ساتھ سماع سُنے۔ آگے لکھتے ہیں: ''مخدوم العالم حضرت خواجہ نصیر الدین قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ دردمندوں کے واسطے سوائے سماع کے کوئی دوا نہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول شریعت میں اپنے نفس کو ہلاک کرنا جائز نہیں چونکہ سماع دردمند دلوں کی دوا ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق دردمندوں کے واسطے سماع مباح ہے اور جو اہلِ درد نہ ہوں اہل نفس ہوں، اُن کے لئے سماع شریعت اور طریقت دونوں میں حرام ہے۔[۲]''

حبّی کشمیری چونکہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور مولائے حقیقی کے سچے عاشق تھے، سماع اُن کی روحانی غذا تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابتدائی عمر سے ہی سماع کے دل دادہ رہے ہوں گے۔ اور آگے جاکر جب آپ تصوف وعرفان کے اعلیٰ مقام پر پہنچے تو اُس دوران آپ کے ہاں ہمیشہ ساز وسماع کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ حالانکہ آپ اپنے زمانے میں اس فعلِ سماع کو اپنانے کی بنا پر علما وفقہا کی بھری مجلسوں میں کئی بار طلب کیے گئے لیکن ہر بار آپ نے اپنے مدلل جوابات میں یہ بھی فرمایا کہ ہم عشق کے بیماروں کے لئے سماع باعثِ شفا ہے۔[۳] آپ کے مطابق اگر سماع میں عشق حقیقی کا جذبہ موجود ہو تو یہ قطعاً ناجائز نہیں کیونکہ ایسے سماع سے سالک پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ رقص کرنے لگتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص صاحب ذوق ہو تو وہ بے شک سماع کا بھی شوقین ہوگا۔

بلی باشد کسی چون صاحب ذوق
بود سوی سماعش ہم بسی شوق

اس طرح سے آپ نے اپنے اشعار میں اکثر جگہوں پر ساز و سماع کی وضاحت فرمائی ہے۔ ساز وسماع سے آپ نہ صرف اس ظاہری دنیا میں اپنی باطنی مسرت پاتے ہیں بلکہ یہاں سے کوچ کرنے کے بعد دوسری دُنیا میں بھی ایسے ہی آلات کے طلب گار ہوں گے۔

مرا بے حبیب شراب ورباب
قراری نباشد بدار اسلام

ساز وسماع آپ کی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے جسے آپ متصوفانہ زندگی گزارنے کے لئے نہایت عمدہ اور مفید پیشہ سمجھتے تھے۔ آپ کی نظر میں یہی وہ خاص پیشہ ہے جو وصل محبوب کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

وصال ومدفن:

حبّی کشمیری ۱۹رذی الحجہ ۱۰۲۷ھ میں واصل بحق ہوئے۔ اُس وقت آپ کی عمر شریف ۶۳ سال کے قریب تھی۔ آپ کا مقبرہ سری نگر کے محلّہ نوشہرہ میں مرجعِ خاص وعام ہے۔ یہاں پر ہر سال ۱۹رذی الحجہ

کو عرس منایا جاتا ہے جس میں زائرین کا جم غفیر دو دن ذکر و سلام میں مصروف رہ کر فیض یاب ہوتا ہے۔ اس موقع پر آپ کے بہت سے تبرکات اور نوادرات کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے۔

تالیفات و تعلیمات:

خواجہ حبّی کشمیری جہاں روحانیت کے شہسوار تھے وہاں آپ عربی، فارسی اور کشمیری زبان کے بھی عالم و فاضل اور بلند رتبہ شاعر تھے۔ آپ فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کے علاوہ صاحبِ تصانیف صوفی بزرگ تھے۔ آپ کی شاعری میں عرفان و تصوف کا مشترک موضوع ملتا ہے۔ آپ اپنے فارسی اشعار میں حبّی یا حُبیا تخلص کرتے تھے۔ آپ کے کلام اور تصانیف میں موجود صوفیانہ خیالات کا مفصل تذکرہ کرنے کی اس مقالے میں گنجائش نہیں کیونکہ اس کے لئے ایک باب نہیں بلکہ ایک کتاب درکار ہے۔ لہٰذا مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آپ کی دستیاب تصانیف میں مقامات، مراۃ الغیوب، رسالۂ تصوف راحت القلوب، تنبیہ القلوب اور رسالۃ الانصاف بہت مشہور ہیں۔ یہ ساری تصانیف تصوف و عرفان کے مسائل سے بھری پڑی ہیں۔ ذیل میں ہر ایک تصنیف کا مختصر اً تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ مقامات

یہ حبّی کشمیری کی منظوم فارسی تصنیف ہے جس میں آپ نے اپنے مُرشد حضرت صرفی کے احوال و کرامات قلم بند کیے ہیں اور راہِ سلوک میں ایک مرشد کی رہبری اور رہنمائی کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے۔ یہ کتاب عارفانہ سوز و گداز سے لبریز ہے جس میں اشعار کی مجموعی تعداد ۲۲۵۰ ہے۔

۲۔ رسالۂ مراۃ الغیوب

اس رسالے میں فارسی نظم و نثر کی آمیزش ملتی ہے جس میں حبّی نے تصوف سے متعلق مختلف مقامات مثلاً ذکر، وضو، ربطِ قلب، رضا، وحدت، نفی خاطر، ہمت وغیرہ پر مدلل بحث فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جو شخص ان منازل و مقامات کو مرحلہ وار طریقے سے طے کر لے تو اُس شخص اور حق تعالیٰ کے درمیان تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں۔ گویا شیخ اُس مقام پر فنافی الحق ہو جاتا ہے۔ اِن حجابات کی کل تعداد سات بتائی ہے جو سلسلہ کبرویہ کے صوفیوں کے نزدیک بہت ہی مشہور ہیں۔

۳۔ رسالۂ تصوف

یہ خواجہ حبّی کشمیری نوشہری کی مختصر تصنیف ہے۔ اس کے آغاز میں حضرت آدم علیہ السلام کے وجود کا تذکرہ اور اس کی فضیلت و برتری کو تحریر کیا ہے یعنی دراصل آدم کو وجود میں لانے کا مقصد سیّد کائنات سرور دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مقدس تھا۔ جن کا نور تمام کائنات اور آسمانوں میں وجود آدم سے پہلے ہی موجود تھا بلکہ حق تعالیٰ نے اُسی نور سے آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی۔ چنانچہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

گفت آدم کہ ز آدم زادم
در عالم اجسام بُدم نہادم
چون تو بحقیقت نگری میدانی
پیدا شدہ از نور محمد گردم

اس مختصر سے رسالے میں خواجہ حبّی نے تصوف کے ایک اہم اصول یعنی ہر ایک جز اپنے کل کی طرف رجوع کرتا ہے، کی اس حدیث پاک ''کل شی یرجع الی اصلِه'' کے مفہوم میں وضاحت کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اس اصلی مقام کو پانے کے لئے ایک سالک کو اپنے رہبر یا مُرشد کا دامن پکڑنا چاہیے جو اُسے عرفان الٰہی کے تمام مقامات کی سیر کرا کے اُس کا ہاتھ تھام کرا سے راہِ حقیقت یعنی صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے۔ اپنے مرشد حضرت صرفی کے بارے میں لکھتے ہیں ''زہی پیری دستگیری کبیری بی نظیری کہ مثل او درین زمان مفقود بلکہ قرنہا نخواہد بود۔'' (ترجمہ) میرا پیر کیا ہی اچھا رہبر اور پیر ہے جو دستگیر ہے بزرگ و برتر ہے جس کا کوئی ثانی نہیں بلکہ اُس جیسا اس زمانے میں نا پید ہے اور صدیوں تک بھی کوئی ایسا پیدا نہیں ہوگا۔

۴۔ راحت القلوب

یہ تصنیف حبّی کشمیری کی فارسی نظم و نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ دیگر تصانیف کی طرح آپ نے اس تصنیف کا آغاز حمد باری تعالیٰ اور نعت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے۔ اس کے بعد معرفت کے ان آٹھ آداب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے: (۱) صمت (خاموشی) (۲) تقلیل (کم خوردن) (۳) وضو (۴) نفیِ خاطر (۵) ربط (۶) قیام لیل (شب بیداری) (۷) خلوت (تنہائی) (۸) ذکر۔

ذکر، جو سلوک و معرفت کا آٹھواں اور آخری مقام ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ذکرِ حق (لا الٰہ الا اللہ) سالک اور شیخ کے لئے باعث نجات ہے اور اس ذکر سے بندے کو کبھی بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے بلکہ ہر وقت ہر لحہ اسی میں محو رہنا چاہیے۔ آگے نماز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''نماز معراجِ مومن است، نماز تجلیٔ مومن است، نماز روشنائی چشم مومن است، نماز کاظم چشم مومن است، نماز نیاز مومن است، نماز نفس گداز مومن است، نماز چراغ گور مومن است، نماز پُر نور آفتابِ مومن است، نماز روح و راحت مومن است۔'' چنانچہ اس حقیقت کو اشعار کا جامہ بھی پہنایا ہے:

در نماز صد ہزاراں روح و راحت حاصل است
سر این معنی بداند ہر کہ ایندم قابل است
در نمازت چشم روشن میشود گفتۂ رسول
پیش چشم اہل باطن دان کہ ایندم واصل است
ہر نمازی گو نہ باشد اندر و سوز و نیاز
پیش من میدان نمازی آنچنین بی حاصل است

۵۔ تنبیہ القلوب:

یہ خواجہ حبی کشمیری کی ایک اور منظوم فارسی تصنیف ہے۔ اس کا موضوع بھی تصوف و عرفان ہے جس میں ایک مرید کے لئے مرشد کی اہم ترین ضرورت کو آشکار کیا گیا ہے یعنی سالک چاہے کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو لیکن حق تعالیٰ کو پہچاننے کی سعادت اُسے اپنے پیر کے ذریعے ہی نصیب ہوسکتی ہے۔ اس حقیقت کا مفہوم سمجھانے کی غرض سے آپ نے ایک طویل منظوم حکایت کا سہارا لیا ہے جس میں ایک کبوتر اور مرغ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ دونوں پرندے (اپنے مرشد) ہدہد کی صحبت میں جاتے ہیں۔ یہاں بطور مثال اس حکایت کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

بگفتا من نگویم ای کبوتر کہ در عرفانم منم از تو نکو تر
شبہہ ما ہد ہد است و خیز جویم بہ ہد ہد سر بسر این قصہ گویم
چگوید او برای خود درین باب کہ رای اوست روشن تر ز مہتاب
اگر او را نبودی عقل روشن چرا سلطان شدی برتو و من
بسوی شاہ ہدہد ہر دو رفتند چو مشکلہای خود را او را بگفتند

پیر و مرشد کی اہمیت کا تذکرہ کرنے کے بعد خواجہ حبی کشمیری نے ساز و سماع کے جائز اور حرام قرار دینے پر بحث و مباحثہ کیا ہے۔

٦۔ نسخۂ رسالۃ الانصاف

یہ نسخہ عربی زبان میں تحریر ہوا ہے۔ اس میں شریعت اور طریقت پر یوں گفتگو ملتی ہے۔ راہِ شریعت اپنانے والا گروہ عام مسلمانوں کا ہے اور راہِ طریقت پر چلنے والا گروہ خاص مسلمانوں کا ہے۔ شریعت کی پیروی کرنے والے اللہ کی راہ میں جدوجہد اور جستجو کرنے کی خاطر کسی مرشد کی رہبری کے قائل نہیں ہوتے جبکہ طریقت پر چلنے والے نہ صرف شریعت بلکہ طریقت کے اصولوں پر بھی کاربند رہتے ہیں۔ مثلاً طریقت کا اوّلین اصول یہ ہے کہ ایک مبتدی کو پیر کی رہبری میں آنا چاہیے کیونکہ بنا پیر کے وہ اپنی منزل پانے میں ناکام ہوگا۔ ایک سالک کو عین الیقین اور حق الیقین کی حقیقت تب ہی معلوم ہوسکتی ہے جب وہ اپنے پیر کی صحبت میں سلوک کے مختلف منازل طے کرلے۔ مختصر یہ کہ خواجہ حبی کی یہ تصنیف بھی تصوف کے اسرار و رموز کا ایک عمدہ و نادر نمونہ ہے۔ اس کے آخر میں امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی کی مدح میں اشعار کے علاوہ عشقِ حقیقی اور شرابِ معرفت کا تذکرہ ملتا ہے۔

صوفیانہ کلام

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ خواجہ حبی کشمیری صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ آپ کی شعر و سخن دانی کا اصلی جوہر عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ چنانچہ آپ کا دعویٰ ہے:

در دست ما فتادہ چو عشق تو در ازل
خالی ز عشق نیست ازاں روی یک غزل

ظاہر ہے کہ آپ کا کلام عشقِ حقیقی اور معرفت و عرفان کا ایک بحر بے کراں ہے، جس میں حق شناسی کے لعل و گوہر کثرت سے موجود ہیں۔ آپ کے ہر شعر سے عشقِ رب اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نعرہ بلند ہوتا ہے اور یہی عشق و آرزو آپ کو دو جہاں سے بے نیاز کردیتی ہے۔ نہ غم دنیا نہ غم جنت بس ایک ہی آرزو ایک ہی جستجو کہ اپنے محبوب کا دیدار نصیب ہوجائے اور اسی کے ساتھ فنا ہوجائے۔

خواہم فنای خویش بس از خدای خویش
لیکن بشرط آنکہ بہ بینم لقای دوست

ابدی سعادت مندی کو پانے کی خاطر ایک سالک کو اپنے مرشد کے ہر حکم کی تعمیل کرنی چاہیے کیونکہ بنا مرشد کے اس کٹھن راستے کو طے کرنا نہ صرف دُشوار ہے بلکہ محال ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مرد بے پیر درین رہ بہ جائی نہ رسد
نہ رسد تا کہ بہ یک راہ نمائی نہ رسد
ماشنید و بد یدیم زہر کس ہرجا
کہ بلا واسطہ بادشاہ گدائی نہ رسد

سالک کو چاہیے کہ شب و روز عبادت الٰہی میں بسر کرے۔ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ اپنے باطن کو تمام دنیاوی تمناؤں سے پاک کرے، تب ہی کہیں اس کی باطنی آنکھ وا ہوسکتی ہے اور وہ کار خانہ نہاں کے دریچہ میں جھانک سکتا ہے:

بصارت بباید درین بارگاہ
اگر کس رسید از بصارت رسید

یہی عشق وہ لازوال دولت ہے جس کا عکس خواجہ حبّی ہر چیز میں دیکھ لیتے ہیں:

درکون و مکان ہیچ نہ بینم جز عشق
پیدا و نہان ہیچ نہ بینم جز عشق
حاشا ز سر عشق غافل نہ مانم
چوں در دو جہاں ہیچ نہ بینم جز عشق

چشمہ معرفت اور گنجِ عرفان کی چابی حاصل کرنے کے لئے دل کو غیر کی یاد سے خالی اور زبان کو بیہودہ گوئی سے لگام دینی چاہیے۔ اس سلسلے میں حبّی فرماتے ہیں:

کلیدِ مخزنِ عرفان اگر گویم دو چیز آمد
دل از یادِ دگر خالی ز بیہودہ زبان فارغ

ایسا کرنے کے بعد ہی ایک سالک کے دل پر نور تجلی کی پرتو نمائی ممکن ہوسکتی ہے۔ غرض یہ کہ حبّی کشمیری کا پورا کلام صوفیانہ معاملات اور عرفان واردات کا مجموعہ ہے جس میں تصوف و سلوک کے تمام مراحل و منازل کی نشان دہی کی گئی ہے اور ہر بندۂ خاص کو شراب معرفت سے اپنی پیاس بجھانے کی تلقین ملتی ہے۔ شاعر موصوف کے اشعار نہ صرف اصولِ طریقت کے ہی موتیِ آب دار ہیں بلکہ شریعت کی غلامی میں بھی آپ فخر محسوس کرتے ہیں:

تن بہ شریعت غلام دل بہ طریقت خرام
جان بہ حقیقت مدام راہِ شہادت گرفت

مآخذ

۱- تاریخ حسن جلد سویم
۲- واقعات کشمیر
۳- تاریخ کشمیر از سیّد علی ماگرے
۴- تاریخ کبیر، محی الدین مسکین
۵- تاریخ شایق، عبدالوہاب شایق
۶- تحفۃ الفقراء، مرتبہ از راقمہ
۷- تذکرہ مشائخین کشمیر، مترجم راقمہ
۸- دیوان حبّی، حبیب اللہ حبّی کشمیری
۹- کشمیر، جی، ایم، ڈی صوفی
۱۰- تالیفات حبّی کشمیری
۱۱- حبیب اللہ حبّی کشمیری، مرحوم و مغفور سیّد محمد امین قادری نور اللہ مرقدہٗ
۱۲- کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء و ارتقاء، از راقمہ
۱۳- رُوح تصوف (شرح اُردو) از مولانا مفتی محمد شفیع ص:۱۸۱
۱۴- روح تصوف افاداتِ خواجہ بندہ نواز ترجمہ شبیر حسن چشتی نظامی، ص ۱۸۲_۱۸۳_۱۸۴_۱۹۰_۱۹۲_۱۹۶_۱۹۷_

شیخ محب اللہ الٰہ آبادی اور عہد شاہجہانی

پروفیسر محمد طاہر علی.........سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، اسلامیات وشوابھارتی یونیورسٹی، کولکاتہ

شیخ محب اللہ الٰہ آبادی ایک جید اور متبحر عالم اور عظیم المرتبت صوفی تھے۔ انہوں نے عہد شاہجہانی میں نظری تصوف کے ارتقاء اور بالخصوص وحدۃ الوجود کے احیا اور تجدید میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ شیخ کی زندگی اور ان کے عہد کا مطالعہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس دور میں دو مخالف صوفیانہ نظریات آپس میں متصادم ہو رہے تھے جس سے دنیائے تصوف میں بے حد دور رس نتائج پیدا ہوئے۔ شیخ کے نظریات علما وصوفیا کے حلقے میں ہمیشہ موضوع بحث بنے رہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ان کی زندگی اور صوفیانہ خدمات کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔ شیخ محب اللہ ۲ رصفر ۹۹۶ھ مطابق ۲۳ ردسمبر ۱۵۸۷ء کو اودھ کے ایک گاؤں صدر پور میں پیدا ہوئے۔ رحمان علی صاحب تذکرۂ علمائے ہند۱ اور ملا نظام الدین صاحب قاموس المشاہیر۲ نے جائے پیدائش سید پور لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ مرأۃ الاسرار۳ کے مصنف عبدالرحمٰن چشتی نے جو نہ صرف شیخ محب اللہ کے ہم عصر اور ان کے دوست بھی تھے، صدر پور لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکرم براسوی صاحب اقتباس الانوار۴، حکیم عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر۵ اور Contribution of India to Arabic Literature کے مصنف زبید احمد۶ نے بھی صدر پور ہی لکھا ہے۔

شیخ محب اللہ کے متعلق ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ شیخ محب اللہ گرچہ صدر پور میں پیدا ہوئے لیکن چونکہ الٰہ آباد میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال گزارے اور الٰہ آباد ہی کو اپنا مستقل مسکن اور تبلیغ کا مرکز بنایا، اس لئے وہ محب اللہ الٰہ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے، لیکن مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں مخبر الواصلین۸ کے حوالے سے انہیں اکبر آبادی لکھا ہے۔ مخبر الواصلین، ابوعبداللہ محمد فاضل نے ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں یعنی شیخ محب اللہ کی وفات کے صرف دو سال بعد ترتیب دی۔ حیرت ہے کہ ایک کتاب جو شیخ کی وفات کے صرف دو ہی سال بعد لکھی گئی اس غلط فہمی کا سبب بن گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مفتی غلام سرور لاہوری کو مخبر الواصلین کا کوئی ایسا نسخہ مل گیا ہوگا جس میں کاتب نے غلطی سے اکبر آبادی لکھ دیا ہے۔ لیکن اس غلط فہمی کا اعادہ بار بار ہوتا رہا۔ حدائق الحنفیہ میں فقیر محمد لاہوری۹ نے بھی اکبر آبادی ہی لکھا۔ ملا نظام الدین بدایونی نے قاموس المشاہیر۱۰ میں دو محب اللہ کا ذکر کیا، ایک اکبر آبادی دوسرے الٰہ آبادی۔ حد تو یہ ہے کہ معجم المصنفین مرتبہ عمر رضا کحالہ۱۱ میں بھی، جو ۱۹۵۹ء میں دمشق سے شائع ہوئی ہے، محب اللہ اکبر آبادی ہی لکھا گیا ہے۔ اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محب اللہ اکبر آبادی درحقیقت محب اللہ الٰہ آبادی ہی ہیں کیونکہ جو تصنیفات محب اللہ اکبر آبادی سے منسوب کی گئی ہیں وہ سب محب اللہ الٰہ آبادی کی ہیں اور دونوں کی تاریخ وفات بھی ایک ہی ہے۔

شیخ محب اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، اس کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں ملا عبدالسلام لاہوری کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ملا میر خراسانی اور سعد اللہ خاں، جو عہد شاہجہاں میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر مامور ہوئے، شیخ کے ہم درس تھے۔ مولوی وجیہ الدین نے بحر ذخار۱۲ میں اور نیاز احمد بن مولوی عمران احمد نے مقدمۃ المعارف۱۳ میں لکھا ہے کہ جب سعد اللہ خاں وزیر اعظم ہوئے تو انہوں نے ملّا میر اور شیخ محب اللہ کو دہلی بلایا۔ ملا میر تو نہیں گئے لیکن شیخ محب اللہ دہلی آئے اور سعد اللہ خاں نے انہیں نائب وزیر بنایا۔ اس بیان کی صحت میری نگاہ میں مشکوک ہے کیونکہ کسی ہم عصر مؤرخ نے شیخ محب اللہ کے عہدۂ وزارت کا ذکر نہیں کیا ہے۔

شیخ محب اللہ نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور مختصری مدت میں سلوک کے اعلیٰ مقامات طے کر لیے۔ ان کے

پیر و مرشد نے انہیں خاص الطاف و عنایات سے نوازا، جس سے شیخ ابوسعید گنگوہی کے دیگر مریدین کو رشک آنے لگا اور انہوں نے شکایت کی کہ اس نووارد پر اس قدر الطاف و عنایات کیوں؟ مولانا حافظ شاہ علی انور مقاصد العارفین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"و بعد چندی (شیخ ابوسعید) فرمودند محب الله بیاتر ابا خدارسانیدم و ولایت پور بتو ارزانی داشتم، عزیزان دیگر ملول خاطر شده عرض کردند که یا حضرت مایان ازمدتی محنت می کشیم و هر گز بز لال وصال نمی رسیم و گاهی در حق مایان چنین نفرمودند واین مرد جدید و لذت ریاضت ناچشیده را در طرفة العین چند ین نعمت ارزانی داشتند. فرمودند که محب الله کسی است که در یك دست چراغ و بیك دست آتش آورده همین که دم زدیم روشن شد ذالك فضل الله یوتیه من یشاء مارا دریں کار چه تاخیر که خدای تعالیٰ شتابی کرده "[14]

کچھ عرصے کے بعد شیخ ابوسعید نے فرمایا "محب اللہ آؤ! میں نے تمہیں خدا تک پہنچا دیا اور پورب کی ولایت تمہیں عطا فرمائی۔" دوسرے مریدین کبیدہ خاطر ہوئے اور عرض کیا 'یا حضرت! ہم لوگوں نے ایک مدت تک ریاضت کی لیکن وصال (خداوندی) کے آب شیریں تک ہماری رسائی نہ ہوسکی اور کبھی ہم لوگوں کے حق میں آپ نے ایسا نہ فرمایا اور اس نوآموز کو جس نے ریاضت کی لذت بھی نہیں چکھی، آپ نے چشم زدن میں ایسی نعمت سے نواز دیا۔ آپ نے فرمایا 'محب اللہ ایک ایسا شخص ہے جو ایک ہاتھ میں چراغ اور ایک ہاتھ میں آگ لے کر ہی آیا ہے۔ جوں ہی ہم نے پھونک ماری روشن ہوگیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ہم اُس کام میں کیسے دیر کرسکتے ہیں، جس میں خود خدائے تعالیٰ نے جلدی کی۔"

اس کے بعد شیخ ابوسعید نے انہیں خرقۂ خلافت سے نوازا۔ شیخ طریقت سے رخصت لے کر اپنے گھر صدر پور واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر نکل پڑے اور مختلف چشتی مشائخ کے مزارات کی زیارت کرتے ہوئے ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۶۲۸ء میں الہ آباد پہنچے اور اسی کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں وحدۃ الوجود کی مخالفت شدت سے ہورہی تھی۔ ابن عربی کا نظریۂ وحدۃ الوجود سب سے پہلے فخر الدین عراقی [15] کے ذریعہ ہندوستان پہنچا۔ فخر الدین عراقی بہاء الدین زکریا ملتانی [16] کے مرید تھے اور تقریباً ۲۵ سال ہندوستان میں رہے۔ زکریا ملتانی کے وصال کے بعد قونیہ چلے گئے جہاں صدر الدین قونیوی کی تمام صوفیا کی صحبت میں ابن عربی کے نظریات کی تفصیل لکھی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا کہ تقریباً ہندوستان کے تمام صوفیا اسی رنگ میں رنگے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ وحدۃ الوجود کے سب سے بڑے مخالف شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی [17]، ان کے والد عبدالاحد [18] اور ان کے پیر خواجہ عبدالباقی نقش بندی [19] بھی ایک زمانے میں وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ شیخ مجدد اپنے پیر باقی باللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

حضرت خواجہ ما قدس الله تعالیٰ سره چند گاه مشرب توحید وجودی داشتند و در رسائل و مکتوبات خود آں را اظهار می فرمودند آخر کار حق سبحانه و تعالیٰ بکمال عنایت خویش ازاں مقام ترقی ارزانی فرموده بشاهراه انداخته از ضیق این معرفت خلاصی داند."[20]

"ہمارے پیر قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ بھی کچھ عرصے تک وحدۃ الوجود کے قائل رہے اور اپنے رسائل و مکتوبات میں اس کا اظہار فرماتے رہے۔ آخر کار حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے کمال عنایت سے اس مقام سے آگے کی طرف ترقی عطا فرمائی اور انہیں اس شاہراہ پر ڈال دیا جہاں اس معرفت (یعنی معرفتِ توحیدِ وجودی) کی گھٹن سے نجات ملی۔"

اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں: "والد فقیر قدس

سرہ بظاہر برھمیں مشرب بودہ اند و برسبیل دوام ھمیں طریق اشتغال داشتند۔"[۲۱]

''اس فقیر کے والد قدس سرہٗ بھی بظاہر اسی مشرب (یعنی مشرب وحدۃ الوجود) کے پیروکار تھے اور ہمیشہ اسی راہ پر چلتے رہے (یعنی اسی عقیدے پر قائم رہے۔)''

خود اپنے متعلق ان کا بیان ہے:

"معتقد فقیر از خوردی با مشرب اهل توحید بود، فقیر را ازیں مشرب ازروی علم حظ وافر بود و لذت عظیم داشت تا آنکه حق سبحانه و تعالیٰ بمحض کرم خویش بخدمت محمد باقی قدس الله تعالیٰ سره رسانید و ایشان بفقیر طرقۂ علیا نقشبندیه تعلیم فرمودند بعد از ممارست ایں طریقه علیا دراندك مدت توحید وجودی منکشف گشت ، علوم و معارف ایں مقام فروان ظاهر گشتند وکم دقیقه از دقایق ایں مرتبه مانده باشد که آں را منکشف نگر دانیدند دقایق معارف شیخ محی الدین ابن العربی را کما ینبغی لایح ساختند و تجلی ذاتی که صاحب فصوص آنرابیان فرموده اسونهایت عروج جز آنرا نمی داند و درشان آں تجلی می گوید مابعد الا العدم المحض بآں تجلی ذاتی مشرف گشت"[۲۲]

''فقیر کم سنی ہی سے مشرب اہل توحید پر تھا اور اس مشرب میں فقیر کو علمی اعتبار سے بے انتہا مسرت اور لذت حاصل ہوتی تھی یہاں تک کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے محض اپنے کرم سے مجھے محمد باقی باللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچایا اور انہوں نے اس فقیر کو طریقہ نقشبندیہ کی تعلیم دی۔ اس بلند طریقے کی پیہم مشق سے مختصر مدت میں (مجھ پر) توحید وجودی منکشف ہوگئی۔ اس مقام کے علوم و معارف بے انتہا ظاہر ہوئے اور اس مرتبے کے گہرے نکات میں سے شاید ہی کوئی نکتہ ہو جو (مجھ پر) منکشف نہ کیا گیا ہو۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے عرفانی نکات کو بھی پوری طرح واضح کر دیا اور تجلی ذاتی جسے صاحب فصوص (یعنی ابن عربی) نے بیان فرمایا ہے اور عروج کی انتہا اس کے سوا نہیں جانتے اور اس تجلی کی شان میں کہتے ہیں **مابعد الا العدم المحض** (اس کے بعد عدم محض کے سوا کچھ نہیں) اس تجلی ذاتی سے بھی (فقیر) مشرف ہوا۔''

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ مجدد نہ صرف یہ کہ توحید وجودی کے قائل تھے بلکہ اس کا کشفی ثبوت بھی ان پر واضح ہو چکا تھا، لیکن بعد میں ان پر یہ منکشف ہوا کہ خالق ومخلوق میں عینیت نہیں ہے اور اس اعتبار سے وحدۃ الوجود کا اقرار حقیقت کے خلاف ہے۔ لہٰذا انہوں نے نہایت شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت شروع کی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں وحدۃ الوجود کی مخالفت سب سے پہلے مجدد الف ثانی نے کی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شیخ مجدد سے بہت پہلے خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے وحدۃ الوجود کی مخالفت کی تھی۔ خود شیخ مجدد کے عہد میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی وحدۃ الوجود کی دبی زبان سے مخالفت کررہے تھے لہٰذا مجدد کو پہلا مخالف نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ شیخ مجدد کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ جس ابن عربی نے اپنے نظریہ کی بنیاد کشف پر رکھی اور اس کی فلسفیانہ توضیح کی، اس طرح شیخ مجدد نے اس کی مخالفت بھی کشف ہی کی بنیاد پر اور فلسفیانہ انداز میں کی۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا نظریہ وحدۃ مشہود کے نام سے پیش کیا۔

فلسفۂ وحدۃ الوجود کا مختصر تعارف یہ ہے کہ بقول ابن عربی وجود صرف خدا کا ہے جو واجب الوجود ہے۔ عالم ممکن الوجود اور عدمی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حقائق امکانیہ کے لئے ابن عربی جب لفظ عدم استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد عدم حقیقی نہیں

بلکہ عدم اضافی ہے کیونکہ حقائق امکانیہ علمِ خداوندی میں ثابت ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابن عربی انہیں اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔ عفیفی کے بیان کے مطابق ابن عربی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اعیان ثابتہ کا لفظ تصوف میں استعمال اور رائج کیا۔ ۲۳

بہر حال اعیان ثابتہ چونکہ علم خداوندی میں ثابت ہیں اور علم خداوندی ابدی ہے لہٰذا اعیان بھی ابدی ہیں، قابل وجود ہیں اور خارج میں خدا کے وجود سے موجود ہیں۔ اس طرح ممکنات ذات خداوندی کے مظاہر ہیں۔ خالق نے جب اعیان مخلوق کو عالم وجود میں لانا چاہا تو اس نے اپنے وجود کی تجلی اعیان پر ڈالی جس سے وہ خارج میں موجود ہوگئے۔ اس طرح وجود صرف واجب کا ہے اور ممکن واجب کے وجود سے موجود ہے۔ گویا ایک ہی وجود دونوں میں جاری و ساری ہے اور یہی وحدۃ الوجود ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن عربی کا نظریہ شنکر اچاریہ کے فلسفۂ ویدانت سے متاثر ہے۔ میرے خیال سے یہ اعتراض دو وجہ سے قابل اعتنا نہیں ہے۔ اول یہ کہ اس کا واضح ثبوت نہیں ملتا کہ ابن عربی کے زمانے میں شنکر اچاریہ کی ویدانتی فلاسفی اسپین پہنچ چکی تھی۔ دوم یہ کہ دونوں فلسفوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ شنکر اچاریہ کے فلسفے کی بنیاد ہے "برہمہ ستیہ جگت متھیہ" برہمہ حق ہے اور عالم مایا اور موہوم ہے۔ ابن عربی عالم کو مایا نہیں سمجھتے بلکہ اس کے وجود کے قائل ہیں۔ وہ وجود حق کو وجود مطلق اور وجود اشیا کو وجود مقید کہتے ہیں، لیکن وجود کے یہ تعینات ان کے یہاں اعتباری ہیں ورنہ فی الحقیقت وجود ممکن عین وجود واجب ہے۔ اس کے علاوہ ذات و صفات میں بھی ابن عربی بالکلیہ عینیت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں صفت ذات کا جزوِ لاینفک ہے بلکہ صفت عین ذات ہے۔

شیخ مجدد نے ابن عربی کے ان نظریات کی سختی سے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا ممکن واجب کے وجود سے موجود نہیں ہے ورنہ ممکن واجب ہو جائے گا جو محال ہے۔ حقیقتاً وجود ممکن وجود واجب کا ظل اور پرتو ہے، عین وجود واجب نہیں۔ اسی طرح صفت ذات پر زائد ہے عین ذات نہیں۔ شیخ مجدد کی مخالفت سے وحدۃ الوجود کی مقبولیت کو سخت دھچکا پہنچا۔ اس موقع پر شیخ محب اللہ، ابن عربی کے صوفیانہ نظریات کے احیاو تجدید اور ترویج و اشاعت پر کمربستہ ہوئے۔ انہوں نے عربی اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ ان نظریات کی اس قدر تبلیغ کی کہ بعد میں انہیں "شیخ اکبر ثانی" یا "شیخ کبیر" کہا جانے لگا۔ رحمان علی تذکرہ علمائے ہند میں لکھتے ہیں:

"تحقیقات و تدقیقاتش در علم تصوف بدرجۂ اجتهاد رسیده بلکه می سزد که شیخ محی الدین العربی را شیخ اکبر و وی را شیخ کبیر گویند" ۲۴

"علم تصوف میں ان کی تحقیق و تدقیق اجتہاد کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا یہ مناسب ہے کہ شیخ محی االدین بن العربی کو شیخ اکبر اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں۔"

شیخ محب اللہ کے نظریات نے علمائے وقت کو برانگیختہ کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک بار علما نے شیخ محب اللہ کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ جب شیخ عبدالرشید جون پوری کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے آئے اور اپنے دلائل سے علما کو قائل کر کے قتل کا فتویٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح شیخ محب اللہ کی جان بچی، لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی لوگ انہیں ملحد و زندیق کہتے رہے۔ شاہنواز خاں نے مآثر الامراء میں لکھا:

"درزمان او تاحال اهل عناد به زندقه والحاد منسوب داشته هنگامه ها آراسته." ۲۵

"ان کے زمانے سے لے کر آج تک معاندین انہیں زندقہ اور الحاد سے منسوب کرتے رہے اور ہنگامہ برپا کرتے رہے ہیں۔"

ان مخالفتوں کے باوجود شاہی دربار میں ان کی کافی عزت تھی۔ شہزادہ داراشکوہ ان کو اپنا روحانی پیشوا سمجھتا تھا اور عرفان و تصوف کے مختلف مسائل سے متعلق ان کے پاس سوالات لکھ کر بھیجتا اور ان کے جواب سے راہ طریقت میں رہنمائی حاصل کرتا۔ جب داراشکوہ کو الٰہ آباد کی گورنری تفویض ہوئی تو اس نے شیخ محب اللہ کو لکھا:

"از گرفتن صوبه اله آباد بیش تر خوش حال از وجود شریف ایشان است." ۲۶

''صوبہ الہ آباد کی گورنری اس لئے بخوشی قبول کرلی کہ آپ کی ذات بابرکت یہاں موجود ہے۔''

خود شاہجہاں ان کا معتقد تھا اور ان سے ملنے کا بے حد مشتاق۔ چنانچہ ایک بار شاہجہاں نے شیخ محب اللہ کو خط لکھا:

"عرفان آگاہ و معارف جلوہ گاہ شیخ محب الله سلمه فرمان اطیعوا الله واطیعو الرسول و اولی الامر منکم نیك تصور نموده بیائید که شوق فوق الحد است۔"[۲۷]

''مسائل عرفان سے واقف اور جلوہ گاہ معارف شیخ محب اللہ سلمہ خدا کے اس فرمان کو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اس کی جو تم میں فرماں روا ہو، صحیح تصور کرتے ہوئے تشریف لائیے کہ ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔''

شیخ نے شاہی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت مہذبانہ اور دانشمندانہ جواب بھیجا:

"امر ولی الامر رسید، اثر محبت مفهوم گردید لیکن شخصی که از مرتبۂ اولیٰ و ثانی نبرآمده باشد بمرتبۂ ثالث چگونه رسد۔"[۲۸]

''فرمانروا کا حکم پہنچا، شدت محبت کا احساس ہوا لیکن جو شخص ابھی تک پہلی اور دوسری منزل ہی طے نہیں کر پایا ہے وہ تیسری منزل پر کیسے پہنچ جائے۔''

اس جواب سے شیخ کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ شیخ محب اللہ کافر و مومن سب کو قابل شفقت سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں لہٰذا سب پر شفقت و مہربانی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اپنی کتاب مناظر اخص الخواص میں لکھتے ہیں:

"پدر هر کسی از ما آدم صفی است پس هر کس واجب الرحمت و الشفقت باشد۔"[۲۹]

''ہم میں سے ہر شخص کے باپ آدم صفی اللہ ہیں لہٰذا ہر شخص پر رحمت و شفقت کرنی واجب ہے۔''

داراشکوہ نے الہ آباد کی گورنری کے زمانے میں سرکاری انتظامی امور سے متعلق آپ سے دریافت کیا کہ ریاست کے انتظامی امور میں ہندو اور مسلمان کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا جائز ہے۔؟ شیخ محب اللہ نے جواب دیا:

"فقیر کجا و نصیحت کجا حق آنست که اندیشۂ رفاهیت خلق خدا دامن گیر خاطر حکام باشد، چه مومن چه کافر که خلق خدا پیدائش خدا است سید این مقام که صاحب آن مقام بـه هر کس از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند رسول خدا است صلی الله علیه وسلم چناں که بیان یافت درفتوحات و وارداست درقرآن و ما ارسلناك الا رحمةً للعالمین۔"[۳۰]

''فقیر کہاں اور نصیحت کہاں! حق یہ ہے کہ خلق خدا کی رفاہیت کا خیال ہر وقت حکام کے دل میں ہونا چاہیے۔ کیا مومن اور کیا کافر، کیونکہ تمام مخلوق خدا ہی کی پیدا کردہ ہے اور دونوں جہان کے سردار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صالح و فاجر اور مومن و کافر سب پر رحم کرتے ہیں جیسا کہ فتوحات میں بیان ہوا ہے اور قرآن میں بھی وارد ہے۔ وما ارسلناک الا رحمةً للعالمین۔''

شیخ محب اللہ کے نزدیک انسان کا مرتبہ سب سے ارفع و اعلیٰ تھا۔ وہ بلا تفریق مذہب و ملت انسانیت کا درس دیتے تھے۔ ان کے یہاں ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ ساری مخلوق خدا کی تخلیق اور سارے انسان آدم کی اولاد ہیں، خدا خود رب العالمین اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس لئے تمام مخلوق خدا کے ساتھ رحم و مہربانی سے پیش آنا چاہیے اور تمام انسانوں کے ساتھ بھائی چارگی کا سلوک کرنا چاہیے۔ جب ہر انسان خدا کے وجود سے موجود ہے تو پھر انسان اور انسان میں تفریق کیوں؟ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت سبھی کو گلے سے لگاتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے معتقدین میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی

ایک بڑی تعداد تھی۔

شیخ محب اللہ اس بات کے شاکی تھے کہ کچھ صوفیائے وجودی، شریعت کا لحاظ نہیں رکھتے، وہ طریقت کو شریعت سے بالاتر سمجھتے ہیں اور شریعت کی پابندی اپنے لئے لازمی نہیں سمجھتے۔ اس طرح گویا الحاد و زندقہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔[۳۱]

حالانکہ ابن عربی نے خود شریعت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی تصنیفات کے بنظر غائر مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شریعت کو ہمیشہ اولیت دی اور اس پر عمل کرنے کی تاکید کی۔ شیخ محب اللہ بھی اسی کی تلقین کرتے ہیں اور مناظر اخص الخواص میں ان صوفیا پر جو طریقت اور وجد و حال کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں، زوردار الفاظ میں تنقید کرتے ہیں۔ وہ خود فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم سے ایسے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں جن میں ابن عربی کہتے ہیں کہ حقیقی صوفی وہی ہے جو حدود شریعت کے باہر نہیں جاتا اور ہمیشہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ شیخ محب اللہ خود بھی اسی پر زور دیتے ہیں۔ عارف و زاہد میں فرق بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

"حق همین است که از عارف هر چیز خوب باشد بعد از آن که کتاب و سنت دائماً در دست او باشد۔"[۳۲]

"سچ یہی ہے کہ عارف کی طرف سے ہر چیز بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ کتاب وسنت ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہے۔"

شیخ محب اللہ تو برملا کہتے ہیں کہ وہ شخص درویش ہی نہیں ہے جو عبادت واطاعت میں کامل نہیں ہے کیونکہ عبادت الٰہی اور اطاعت خدا ورسول درویشی کے لئے شرط لازمی ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"اطاعت و عبادت لازم درویشی است که اگر اطاعت و عبادت در کسی نباشد آن کس درویش نباشد۔"[۳۳]

"درویشی کے لئے اطاعت وعبادت لازمی ہے کیونکہ اگر کسی شخص میں عبادت واطاعت نہ ہو تو وہ شخص درویش نہیں ہے۔"

اسی طرح ایک جگہ وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ عبودیت اعلیٰ ترین مرتبہ ہے، اس سے بالاتر کوئی مرتبہ نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض عبودیت کے سبب سیادت مطلق حاصل ہوئی اور آپ مرتبہ خواجگی سے مشرف ہوئے۔ چنانچہ شیخ محب اللہ لکھتے ہیں:

"واجب است که برتو گفته شود که عبودیت مرتبهٔ اعلی ست که هیچ مرتبه فوق آن نباشد. رسالت پناهی صلی الله علیه وسلم بعبودیت محض سیادت مطلق یافت و مشرف شد بمرتبهٔ خواجگی۔"[۳۴]

"واجب ہے کہ تم کو یہ بتادیا جائے کہ عبودیت (بندگی الٰہی) اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔ کوئی مرتبہ اس سے بالاتر نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض عبودیت کے سبب سیادت مطلق پائی اور مرتبۂ خواجگی سے مشرف ہوئے۔"

ان اقتباسات سے بخوبی واضح ہے کہ شیخ محب اللہ ہندوستان میں وحدۃ الوجود کے سب سے بڑے مبلغ ہونے کے باوجود شریعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ان صوفیا کو جو وحدۃ الوجود کا حیلہ بنا کر اپنے کو شریعت کی پابندی سے آزاد سمجھ لیتے ہیں بری طرح پھٹکارتے ہیں، بلکہ ان کو سرے سے صوفی ہی ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ درحقیقت ابن عربی کے نظریات بالخصوص مسئلہ وحدۃ الوجود کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ وحدۃ الوجود کے حقیقی مفہوم کو پیش کرنے اور اس کے اسرار وغوامض کی توضیح وتشریح کے لئے عربی اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

شرح فصوص الحکم (عربی و فارسی)

ترجمۃ الکتاب جو المراتب الاربعہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

حاشیہ ترجمۃ الکتاب

انفاس الخواص

عقائد الخواص

المغالیط العامہ

التسویہ بین الافادہ والقبول

غایت الغایات

سرّ الخواص

طرق الخواص

رسالہ وجود مطلق

مختصر شرح فصوص الحکم

رسالہ ہفت احکام

شرح رسالۂ تسویہ

عبادات الخصواص

سہ رکنی

مناظر اخص الخواص

صاحب نزہۃ الخواطر نے ایک کتاب 'کتاب المبین' کو بھی شیخ محب اللہ کے نام منسوب کیا ہے۔ ۳۵

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی اپنے ایک مقالے میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ ۳۶ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رام پور رضا لائبریری میں شیخ محب اللہ کی کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے۔ اس نام کی ایک کتاب جو وہاں موجود بھی ہے تو اُس کے مصنف شیخ محب اللہ نہیں بلکہ محمد شفیع بہاری ہیں۔

اسی طرح پروفیسر بنی ہادی صاحب نے بھی ایک کتاب 'مفتاح العاشقین' کو شیخ محب اللہ الہ آبادی کی تصنیف بتایا ہے۔ ۳۷

یہ قطعی غلط ہے۔ مفتاح العاشقین شیخ محمود نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے مرید نے، جن کا نام بھی اتفاق سے محب اللہ تھا، ترتیب دیا ہے۔ نام کی یکسانیت کی وجہ سے پروفیسر بنی ہادی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ورنہ شیخ محمود نصیر الدین چراغ دہلوی اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے درمیان ایک طویل مدت کا فاصلہ ہے۔

بہر حال وحدۃ الوجود کے یہ سب سے اہم مبلغ، کثیر التصانیف، صاحب قلم اور عہد شاہجہانی کے عظیم المرتبت صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی ۹ رجب ۱۰۵۸ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۶۴۸ء کو واصل بحق ہوئے۔

حوالہ جات وتعلیقات

۱- علی، رحمان: تذکرۂ علمائے ہند، نول کشور پریس، ۱۹۱۴ء، ص-۱۷۵

۲- بدایونی، ملا نظام الدین: قاموس المشاہیر، نظامی پریس، بدایوں، جلد دوم، ص-۱۷۶

۳- چشتی، عبدالرحمٰن: مرآۃ الاسرار، قلمی نسخہ، بوہار کلیکشن، نمبر ۸۹، نیشنل لائبریری، کلکتہ

۴- براسوی، اکرم: اقتباس الانوار، قلمی نسخہ، رامپور، رضا لائبریری، فارسی تذکرہ صوفیا نمبر-۲۳۵۴

۵- لکھنوی، عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، ص-۳۲۲

۶- احمد، زبید Contribution of India to Arabic Literature، مکتبۂ دین ودانش، پنجاب، ۱۹۴۸ء، ص-۲۳۹

۷- لاہوری، مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، نول کشور، کانپور، ۱۹۱۴ء، جلد دوم، ص-۳۴۹

۸- فاضل، ابوعبداللہ محمد: مخبر الواصلین۔ اس کتاب میں ابتدائے اسلام سے لے کر مؤلف کے عہد تک کے بزرگان دین کی منظوم تاریخ وفات درج ہے۔

۹- لاہوری، فقیر محمد: حدائق الحنفیہ، حدیقہ-۱۱، نول کشور، لکھنؤ، ص-۴۱۲

۱۰- بدایونی، ملا نظام الدین: قاموس المشاہیر، بحولہ بالا، ص:۷۷-۱۷۶

۱۱- کحالہ، عمر رضا: معجم المؤلفین، المطبعۃ الترقی، دمشق، ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء، جلد-۸، ص-۱۷۹

۱۲- اشرف، وجیہ الدین: بحر زخار، قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، نمبر ۲۵۶، فارسیہ اخبار، یونیورسٹی کلیکشن (النصف الاول)

۱۳- احمد، نیاز: ابن مولوی عمران احمد، مقدمۃ المعارف، قلمی نسخہ، رضا لائبریری، رامپور

۱۴- ملاحظہ کیجیے: تصفیہ شرح تسویہ، شیخ محب اللہ کی کتاب تسویہ کی فارسی شرح مع اردو ترجمہ از مولوی محمد تقی حیدر۔ اس اقتباس کو محمد حسین مرادآبادی نے اپنی کتاب انوار العارفین میں بھی نقل کیا ہے۔

۱۵- فخر الدین عراقی ۶۲۷ھ میں ہمدان سے ہندوستان تشریف لائے۔ ۲۵ سال تک یہاں مقیم رہے اور ۶۵۲ھ میں ہندوستان سے قونیہ چلے گئے۔ ۶۸۸ھ میں انتقال کیا۔ قبر دمشق میں محی الدین ابن عربی کے مزار کے پیچھے واقع ہے۔

۱۶- شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، ۵۶۵ھ یا بروایت دیگر ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۵۸ھ میں وفات پائی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خواجہ فرید الدین گنج شکر کے خالہ زاد بھائی تھے۔
۱۷- شیخ صدر الدین عارف شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے صاحبزادے تھے۔ ۶۸۴ھ/ ۱۲۸۵ء میں وفات پائی۔
۱۸- شیخ احمد سرہندی، ۴رشوال ۹۷۱ھ مطابق ۲۶رمئی ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوئے اور ۲۸رصفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۰ردسمبر ۱۶۲۴ء کو انتقال کیا۔
۱۹- وفات ۱۰۰۷ھ مطابق ۹۸۔۱۵۹۷ء
۲۰- خواجہ عبدالباقی المعروف بہ خواجہ باقی باللہ ۹۷۱ھ مطابق ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۶۰۳ء میں انتقال فرمایا۔ اولین نقشبندی صوفیا میں تھے جو ہندوستان تشریف لائے اور سلسلہ نقشبندیہ کو فروغ دیا۔
۲۱- سرہندی، شیخ احمد، مکتوبات امام ربانی، نول کشور پریس، لکھنؤ، جلد اول، مکتوب نمبر-۴۳
۲۲- ایضاً مکتوب نمبر-۳۱
۲۳- ایضاً
۲۴- Afifi, A.E: Mystical Philosophy of Muhyid Din Ibnul Arabi, Shah Mohammad Ahshraf, Lahore, P.63
۲۵- علی، رحمان: محولہ بالا
۲۶- خاں، شاہ نواز: مآثر الامراء، جلد سوم، ص-۲۰۶
۲۷- مکاتیب داراشکوہ و شاہ محب اللہ، قلمی نسخہ، آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر-۲۰۴، رقعات عالم گیر، مرتب نجیب اشرف ندوی، جلد اول، ص-۳۲۵
۲۸- نظامی، خلیق احمد: تاریخ مشائخ چشت، ص-۲۲۶-۲۲۵
۲۹- ایضاً
۳۰- علی، حافظ محمد طاہر: مرتب مناظر اخص الخواص، شیخ محب اللہ الہ آبادی، منظر-۲۴، ص-۵۹۸، ناشر ریسرچ پبلی کیشن، وشوابھارتی، شانتی نکیتن، ۱۹۹۳ء
۳۱- مکاتیب داراشکوہ و شاہ محب اللہ، محولہ بالا
۳۲- مکتوبات امام ربانی، محولہ بالا، جلد اول، مکتوب نمبر ۴۳
۳۳- مناظر اخص الخواص، محولہ بالا، منظر دوم، ص-۲۳۰
۳۴- ایضاً ص-۹۸-۱۹۷
۳۵- ایضاً، منظر اول، ص-۸۷
۳۶- لکھنوی، عبدالحئی: نزہتہ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، جلد پنجم، ص-۲۳۵
۳۷- خان، ڈاکٹر یوسف حسین: شیخ محب اللہ الہ آبادی پر مقالہ جو ۱۹۶۴ء میں اورینٹل کانفرنس میں پڑھا گیا۔
۳۸- ہادی، بی: ڈکشنری آف انڈو پرشین لٹریچر، اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فاری آرٹس، ابھینو پبلی کیشن، نئی دہلی-۱۹۹۵ء، ص-۴۲۹

❁❁❁

تصوف اور مہاجر مکی

حضرت سید قمر الدین اشرف .... علی گڑھ

تصوف کیا ہے؟

صوف کے لفظی معنی اون (Wool) کے ہیں اور اسی سے لفظ صوفی نکلا ہے جس کے معنی ہیں اونی (Woollen)، لیکن یہاں صوفی سے مراد عارف باللہ (Islamic Mystic) سے ہے۔ تصوف کی تعریف (Definition) اہل دانش نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

- نفس کو لوازم عبودیت کی مشق کرانا ہی تصوف ہے۔ (جنید بغدادی)
- اخلاق حسنہ کا نام ہی تصوف ہے۔ (سرّی سقطی)
- ظاہر و باطن میں آداب شرعیہ کے ساتھ قائم ہونے کا نام تصوف ہے۔ (ابو حفص مدار نیشاپوری)
- اپنے مقصد کی ناکامی کو خدائے تعالیٰ کا مقصد جاننے اور اپنی مراد کو مراد حق کے تابع کرنے کا نام تصوف ہے۔ (شیخ عبدالقادر جیلانی)
- اخلاق و معاملات کو مہذب بنانے اور اپنے باطن کو شرک و کفر کی آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک کرنے کا نام تصوف ہے۔ (علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش)

پروفیسر رینالڈ اے نکلسن (Prof. Reynald A Nicholson) مشہور مستشرق کشف المحجوب کے حوالے سے تصوف کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"Some assert that the sufi is so called because he wears a woollen garment, others that he is so called because he is in the first rank. Others say because the sufi claims to belong to the ashab-i-suffa. Others again declare that the name is derived from safa (purity). These explanations of the true meaning of sufism are for satistying the requirements of etymology.Although each of them is supported by many suitable arguments.

Since the people of this persuasion have purged their morals and conduct and have sought to free themselves from natural taints on that accont they are called sufis"

(کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ "صوف" کا لباس استعمال کرتا ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ "صف اول" میں ہوتا ہے۔ ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ اصحاب صفہ کے ساتھ قیام کرنے یا ان سے والہانہ شیفتگی کی بنا پر انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ لفظ (صوفی) صفا سے مشتق ہے، لیکن یہ تمام لغوی معانی ہیں جو اصل معنی سے بہت بعید ہیں۔ اگر چہ ان تمام تعریفوں کی تائید میں بہت زوردار دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔)

اولیائے کرام کی شناخت:

دنیا میں جتنی بھی اعلیٰ درجہ کی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں ان پر یا ان کی پیکنگ پر ایک خاص طرح کی علامت یا نشان (Symbol) بنا ہوتا ہے جو اس شئی کی خوبی یا خاصیت کی ضمانت کا مظہر ہوتا ہے۔ مثال

کے طور پر دواخانہ طبیہ کالج علی گڑھ کی دواؤں کی پیکنگ پر ایک مخصوص اور ایک علیحدہ قسم کا نشان بنا ہوتا ہے جب کہ ڈابر (Dabur) کی دواؤں پر علیحدہ۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولیائے کرام کو بھی گارنٹی یا ضمانت کے طور پر ایک نشانی یا علامت عطا فرمائی ہے اور وہ علامت ہے "الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ کچھ غم)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریفہ میں ولیوں کے پہچان کی دو علامتیں بتلائی ہیں۔ اگر یہ دونوں علامتیں ان کے چہروں سے عیاں ہوں تو وہ ولی ہیں ورنہ کچھ اور۔ اور وہ علامات ہیں "نہ خوف اور نہ غم۔"

"ولی اللہ وہ ہے جو فرائض سے قرب الٰہی حاصل کرے اور اطاعت الٰہی میں مشغول رہے اور اس کا دل نور جلال الٰہی کی معرفت میں مستغرق ہو۔ جب دیکھے قدرت الٰہی کو دیکھے اور جب سنے اللہ کی آیتیں ہی سنے اور جب بولے تو اپنے رب کی ثنا ہی کے ساتھ بولے اور جب حرکت کرے تو اطاعت الٰہی میں حرکت کرے اور جب کوشش کرے تو اس امر میں کوشش کرے جو ذریعۂ قرب الٰہی ہو۔ اللہ کے ذکر سے نہ تھکے اور چشم دل سے خدا کے سوا غیر کو نہ دیکھے۔ یہ صفت اولیا کی ہے۔ بندہ جب اس حال پر پہنچتا ہے تو اللہ اس کا ولی و ناصر و معین و مددگار ہو جاتا ہے۔ متکلمین کہتے ہیں ولی وہ ہے جو اعتقاد صحیح مبنی بر دلیل رکھتا ہو اور اعمال صالحہ شریعت کے مطابق بجا لاتا ہو۔ بعض عارفین نے فرمایا کہ ولایت نام ہے قرب الٰہی اور ہمیشہ اللہ کے ساتھ مشغول رہنے کا۔ جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو کسی چیز کا خوف نہیں رہتا اور نہ کسی شئی کے فوت ہونے کا غم ہوتا ہے۔" (کنز الایمان مع خزائن)

سلوک الی اللہ:

ارشاد ربانی ہے کہ "جب میرا بندہ میری طرف ایک بالشت آگے بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو بالشت بڑھتا ہوں اور جب وہ ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ آگے بڑھتا ہوں اور جب کوئی شخص چل کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف بڑھتا ہوں"۔ اس ارشاد ربانی کے تناظر میں اولیائے کرام نے حق تعالیٰ تک رسائی کے لئے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ ان میں عبادات یعنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے علاوہ کچھ مزید اعمال بھی بتلائے ہیں جو تزکیۂ نفس میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ مزید اعمال ہیں اوراد، وظائف، مشاغل اور مراقبات وغیرہ۔ ان اوراد و وظائف کے توسل سے سالک مقام فنا پر پہنچ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں دنیا کی ہر شئی بے حقیقت اور ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔

سلسلۂ چشتیہ:

صوفیائے کرام کے بہت سے سلسلے ہیں۔ یہ سلسلے معاملات طریقت، مجاہدات تصوف، مشاہدات معرفت اور ریاضات راہ سلوک میں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی وجہ سے ہیں۔ مقصد کے اعتبار سے سب ایک ہیں۔ چونکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قلم آگے بڑھانے سے پہلے ایک سرسری نظر اس پر بھی ڈال لی جائے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے چشتی بزرگ خواجہ ابومحمد بن ابواحمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ آئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے اصل بانی مبانی شیخ ابواسحٰق حسنی اور ان کے اسلاف ہیں، لیکن درحقیقت ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت کا سہرا سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سر ہے۔ خواجہ صاحب پرتھوی راج چوہان کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر کو اپنا مستقر بنایا۔ خواجہ صاحب نے اپنے عمل نیز گفتار و کردار کے ذریعہ بلاتفریق مذہب وملت پیار ومحبت اور یگانگت کا ایسا نمونہ قائم کیا جس کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو اسلام کی اصل روح سے روشناس کر کے انہیں دعوت فکر دی۔ خواجہ صاحب کی تبلیغ وارشاد اور تعلیم وتربیت کے ذریعہ بندگان خدا کی کثیر تعداد نے ایمان کی دولت حاصل کی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی چشتی کے ہاتھوں پر بیعت کر کے سلسلہ چشتیہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

ولادت وخاندان:

منبع فیوض وبرکات، امام العارفین، شیخ المشائخ، حافظ، حاجی،

شاہ امداداللہ حنفی چشتی فاروقی کی ولادت باسعادت ۲۲/صفر ۱۲۳۳ھ بروز دوشنبہ قصبہ تھانہ بھون، ضلع سہارن پور میں ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم پڑتا ہے کہ دوشنبہ کی نسبت سے حاجی صاحب عشق رسول اپنے رگ و پے میں سموئے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کل ملا کر پانچ بھائی بہن تھے اور خود اپنے والد کی تیسری اولاد تھے۔ حاجی صاحب کا خاندانی شجرہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اسی نسبت سے حاجی صاحب اپنے نام کے ساتھ فاروقی بھی لکھتے تھے۔

تعلیم وتربیت:

حاجی صاحب کی عمر سات سال کی رہی ہوگی کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا، جس کی وجہ سے لاڈ پیار میں تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جاسکی۔ حاجی صاحب کے سوانح نگاروں کے مطابق انہوں نے فارسی، عقائد اور دینیات کی ابتدائی ضروری کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ تکمیل الایمان مولانا رحمت علی خاں سے، حصن حصین وفقہ اکبر مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے، مشکوٰۃ المصابیح مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے اور مثنوی مولانا روم مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی اور مولانا ابوالحسن کاندھلوی سے پڑھیں۔ علاوہ ازیں سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی نانوتوی کے ہمراہ جب دہلی گئے تو وہاں بھی حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا اور گلستاں کا سبق مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے پڑھا۔ جہاں تک درسی کتابوں کا تعلق ہے سوانح نگاروں کے مطابق حاجی صاحب نے کافیہ تک پڑھا۔ اس وقت کے نصاب کے مطابق کافیہ شرح فقہ اکبر اور مشکوٰۃ شریف کے بعد پڑھائی جاتی تھی۔

مثنوی مولانا روم اور مشکوٰۃ المصابیح کے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاجی صاحب فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے نیز یہ کہ جن علمائے کرام سے انہوں نے استفادہ کیا وہ سب کے سب اپنے عہد کے بحرالعلوم اور یگانۂ روزگار تھے۔ ان علمائے کرام کے فیضان صحبت کا ہی اثر تھا کہ جس نے حاجی صاحب کو پر مغز بنا کر آسمان علم و معرفت پر چمکا کرامتِ مسلمہ کی فکری توانائیوں کا مرکز بنا دیا۔ ذہن نشین رہے کہ اس عہد میں مضافات اور قصبات میں آج کل کی طرح باقاعدہ مدارس قائم نہ تھے اور حصول علم کے شائقین ایسے صاحب علم وفضل، جن کی شخصیت خود ایک ادارہ کی ہوتی، سے کسب فیض کرتے۔

اسرار معرفت:

اول اول حاجی صاحب نے مثنوی مولانا روم کو ایک ورد اور معمول کے طور پر مستقل اپنے مطالعہ میں رکھنا شروع کیا۔ مولانا روم کی مثنوی کے اندر جو یقین و معروفت کی آگ اور عشق ومحبت کی جو شمع فروزاں ہے اس سے اپنے باطن کو روشن اور مولانا روم کے سوزِ دروں سے اپنے دل کو آتش فشاں بناتے رہے۔

تلاش مرشد وشرف بیعت:

مثنوی مولانا روم کے مطالعہ سے عشق الٰہی کا جو شعلہ ان کے دل میں روشن ہوا اسے مستقل طور پر روشن رکھنے کے لئے ایک ایسے ہادی کی ضرورت تھی جو عارف کامل ہونے کے ساتھ متبع سنت بھی ہو۔ اس فن میں حاجی صاحب کی نظر انتخاب حضرت مولانا شیخ نصیر الدین نقش بندی دہلوی پر پڑی۔ لہٰذا ان سے بیعت ہوکر سلسلہ مجددیہ کے طریق پر اذکار و اشغال میں مصروف ہوگئے اور جلد ہی اجازت وخرقہ سے مشرف ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد میاں جیو نور محمد جھنجھانوی چشتی کے ہاتھوں پر بیعت کر کے سلسلۂ چشتیہ میں داخل ہوگئے اور ان کی خدمت بابرکت میں مستقل قیام فرما کر نور محمدی کا فیضان حاصل کیا اور راہِ سلوک ومعرفت کی تکمیل فرمائی اور اجازت وخلافت بھی حاصل کی۔

زیارت نبوی سے پہلی شرف یابی:

حضرت شاہ نصیر الدین کی وفات کے بعد حاجی صاحب کی طبیعت بے چین اور جذبۂ چشتیہ زوروں پر تھا۔ اسی درمیان خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مجلس عالی میں حاجی صاحب کے جد امجد حافظ بلاقی شاہ بھی حاضر تھے۔ انہوں نے حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجی صاحب کو میاں جیو نور محمد جھنجھانوی چشتی کے سپرد فرمادیا۔ اسی خواب کے بعد حاجی صاحب انتشار وحیرت میں مبتلا ہوکر میاں جیو نور محمد کی تلاش وجستجو کرتے ہوئے لوہاری نام کے گاؤں میں، جہاں میاں جیو نور محمد قیام پذیر تھے، پہنچ کر، ان کے قدموں میں گر گئے۔ حضرت میاں جیو صاحب قدس سرہٗ نے انہیں بیعت سے مشرف فرمایا۔

زیارت نبوی سے دوسری شرف یابی:

حاجی صاحب نے پہلی بار حج کا ارادہ فرمایا تو سفر سے پہلے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت فرمائی۔ خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجی صاحب سے فرمایا کہ ہمارے پاس آؤ۔ اللہ پر توکل کر کے حاجی صاحب سفر حجاز پاک کے لئے روانہ ہوگئے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر جب آپ نے منبر اور روضۂ اقدس کے درمیان "روضة من رياض الجنة" کے درمیان مراقبہ فرمایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر مقدس سے خود بصورت میاں جیو صاحب قدس سرہٗ نکلے اور عمامہ دستِ مبارک میں لئے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کے سر پر غایت شفقت سے رکھ دیا، کچھ نہ فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔ دربار محمدی سے اس سوغات کو لے کر آپ وطن تشریف لائے۔

رشد وہدایت کے دور کا آغاز:

جناب ڈاکٹر بصیر احمد صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ہمدرد اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی'' میں تحریر کیا ہے کہ حاجی صاحب کو خادم سے مخدوم بننے کی توفیق جبھی حاصل ہوئی جب انہیں دربار نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں طلب فرمایا گیا اور سر مبارک پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ شریف رکھا۔ اس کے بعد سے حضرت امداد اللہ حاجی امداد اللہ بنے اور آپ کی ذات بابرکت سے رشد وہدایت کا وہ باب کھلا کہ شاید باید علم دین کا فروغ ہو یا تزکیہ واحسان کی برکات وثمرات، جہاد فی سبیل اللہ کا میدان ہو یا اذکار واشغال کی خانقاہیں، اخلاص واخلاق معاملات وسیاسیات غرض وہ کون سا شعبہ ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں برصغیر ہند میں خصوصاً، عالم اسلام میں عموماً حاجی امداد اللہ اور ان کی جماعت کے بابرکت اثرات سے مستفید نہ ہوا ہو اور جہاں حاجی صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد وہدایت کا فیض نہ پہنچا ہو۔

حج سے واپسی کے بعد حاجی صاحب تھانہ بھون کی ایک مسجد میں، جسے ''پیر محمد والی مسجد'' کہتے تھے قیام پذیر ہوگئے۔ اسی مسجد سے حاجی صاحب کے ذریعہ ارشاد وہدایت کا چشمہ جاری ہوا۔ تشنگان معرفت اپنی پیاس بجھانے اسی مسجد میں آتے۔ اسی مسجد میں ذکر وشغل کی محفلیں گرم ہوتیں۔ اسی مسجد میں معرفت الٰہی کے متوالے تزکیۂ نفس کی بھٹی میں جل کر کندن بن کر نکلتے۔

جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے تقریباً دو سال بعد حاجی صاحب مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ حج کے زمانہ میں ہندوستانیوں کی بڑی تعداد حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی اور آپ سے فیوض وبرکات حاصل کرتی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہجرت کے بعد بھی حاجی صاحب کے رشد وہدایت کا فیض ہندوستان میں برابر جاری رہا۔ حاجی صاحب ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں مرض پیچش میں مبتلا ہو کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ تدفین قبرستان جنت المعلیٰ میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک سے چند قدم کے فاصلے پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے برابر عمل میں آئی۔

اذکار واوراد:

بیعت کے بعد حاجی صاحب اپنے شیخ کی صواب دید کے مطابق اشغال، اذکار، مجاہدات، ریاضات میں سلسلہ چشتیہ کے نہج پر راہ سلوک پر چل پڑے (تفصیلات سے گریز کیا جا رہا ہے۔ صاحب ذوق حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں حاجی امداد اللہ کی تصنیف ''ارشاد مرشد'' اور شیخ طریقت حضرت علامہ سید محمد جیلانی اشرف کی تصنیف ''کشف القلوب'' ملاحظہ فرمائیں)

مسلک ومشرب:

رشد وہدایت، ذکر واشغال اور نعتیہ کلام کے تعلق سے متعدد تصانیف بطور یادگار حاجی صاحب نے چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے آخری تصنیف ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' معلوم ہوتی ہے۔ حاجی صاحب کی یہ تصنیف ان کے مسلک ومشرب کی آئینہ دار ہے۔ ''فیصلۂ ہفت مسئلہ مع ارشاد مرشد'' کا ایک نسخہ مطبوعہ تیوی پریس، کانپور ۱۹۲۵ء میرے پاس موجود ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کی کہانی بڑی دلچسپ اور قاری کی توجہ کی طالب ہے۔ ہوا یہ کہ حاجی صاحب کے دو مریدوں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری (ضلع سہارنپور) کے درمیان محفل میلاد منعقد کرنے اور اموات پر فاتحہ درود وغیرہ کے تناظر میں بحث وتکرار شروع ہوگئی اور بات حد ادب کو پار کر کے آگے

نکل گئی۔ مولانا گنگوہی نے ان کے رد میں "براہین قاطعہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے رد میں مولانا رامپوری نے "انوار ساطعہ" کے نام سے دوسری کتاب لکھی۔ اپنے دو مریدوں کو اس طرح پہلوانی کرتے دیکھ کر حاجی صاحب کو بہت دکھ ہوا اور انہوں نے رفع شر کی غرض سے 'فیصلہ ہفت مسئلہ' کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس میں مولود شریف، فاتحہ، عرس و سماع، ندائے غیر اللہ، جماعت ثانیہ، امکان نظیر اور امکان کذب کل ملا کر ہفت یعنی سات مسائل کے تعلق سے اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔ قاری کی دلچسپی کے لئے اس فیصلہ کی چند جھلکیاں حسب ذیل ہیں:

محفل مولود:

محفل مولود میں شریک ہوتا ہوں بلکہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذت پاتا ہوں۔

ایصال ثواب:

ہیئت مروجہ ایصال ثواب کی کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں اور گیارہویں حضرت غوث پاک قدس سرہ، دسواں، بیسواں، چہلم، ششماہی، سالانہ وغیرہ اور توشہ حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی اور سہ منی حضرت شاہ بوعلی قلندر وحلوائے شب برأت اور دیگر طریق ایصال ثواب اسی قاعدہ پر مبنی ہیں اور مشرب فقیر کا اس مسئلہ میں یہ ہے کہ فقیر پابند اس ہیئت کا نہیں مگر کرنے والوں پر انکار نہیں کرتا۔

عرس وسماع:

مشرب فقیر کا اس امر میں یہ ہے کہ ہر سال اپنے پیر و مرشد کی روح پر ایصال ثواب کرتا ہوں۔ اول قرآن خوانی ہوتی ہے اور گاہ گاہ اگر وقت میں وسعت ہوئی تو مولود پڑھا جاتا ہے، پھر ما حضر کھانا کھلایا جاتا ہے اور اس کا ثواب بخش دیا جاتا ہے اور زوائد امور فقیر کی عادت نہیں۔ نہ کبھی سماع کا اتفاق ہوا نہ خالی نہ بہ آلات، مگر دل سے اہل حال پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔

نعت گوئی اور عشق رسول:

نعت گوئی ایک بڑا نازک فن ہے۔ سب کے بس کی بات نہیں۔ حاجی صاحب کے چند نعتیہ اشعار ان کی تخلیق 'گلزار معرفت' سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جس کا ہر ہر مصرع عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پکار کر گواہی دے رہا ہے۔

(۱)

ذرا چہرے سے پردے کو اٹھاؤ یا رسول اللہ
مجھے دیدار تک اپنا دکھاؤ یا رسول اللہ
خدا عاشق تمہارا اور ہو محبوب تم اس کے
ہے ایسا مرتبہ کس کا سناؤ یا رسول اللہ
جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں
بس اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ
پھنسا کر اپنے دام عشق میں امداد عاجز کو
بس اب قید دو عالم سے چھڑاؤ یا رسول اللہ

(۲)

کر کے نثار آپ پر گھر بار یا رسول
اب آ پڑا ہوں آپ کے دربار یا رسول
عالم، نہ متقی ہوں نہ زاہد نہ پارسا
ہوں امتی تمہارا گنہ گار یا رسول
دونوں جہاں میں مجھ کو وسیلہ ہے آپ کا
کیا غم ہے گرچہ ہوں میں بہت خوار یا رسول
ہو آستانہ آپ کا امداد کی جبیں
اور اس سے زیادہ کچھ نہیں درکار یا رسول

کتابیات

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱- کنز الایمان ترجمہ قرآن۔ از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ
۲- کشف المحجوب۔ (انگریزی ترجمہ) از رینالڈ اے نکلسن
۳- فیصلہ ہفت مسئلہ۔ از حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ
۴- گلزار معرفت۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۵- حالات وخدمات مشائخ چشتیہ۔ از ڈاکٹر رضی احمد کمال
۶- حقیقت تصوف اور حضرت بوعلی قلندر۔ از علامہ محمد جاوید
۷- تذکرہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ از ڈاکٹر بصیر احمد، صدر شعبہ اسلامیات، ہمدرد یونیورسٹی، دہلی

❁❁❁

امام احمد رضا اور علوم تصوف

مفتی محمد عیسیٰ رضوی قادری .... الجامعۃ الرضویہ مظہر العلوم، قنوج، یوپی

شیخ الاسلام والمسلمین مجدد دین وملت عظیم البرکت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کو جملہ علوم اسلامیہ پر کامل مہارت و دست رس حاصل تھی، ان کی حیات اقدس کا لمحہ لمحہ علوم دینیہ کی اشاعت و خدمات میں گزرا، ان کی زندگی شریعت وطریقت کی آبیاری میں بسر ہوئی، دین وسنت کی ترویج وتشہیر ان کا نصب العین اور مقصد حیات تھا، فروغ مذہب اور بقائے ملت کے لئے انہوں نے بے مثال قربانیاں پیش کیں، اسلامی افکار ونظریات کی روشنی میں دینی وملی امور ومعاملات کو استحکام بخشا، مراسم اسلامیہ کو استدلال کی زبان عطا فرمائی، قومی عروج و فلاح کے لئے عملی استقامت کے ساتھ علمی توانیاں صرف کیں، ان کے فیض وبرکت سے اسلامیان ہند کے فکر واعتقاد کی انجمن بارونق و پر بہار ہوگئی، یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ بزم علما کے صدر نشین تھے وہیں محفل صوفیا کے لئے روشن چراغ اور مینارۂ نور تھے۔ وہ نابغۂ روزگار وجود عبقریت وہمہ گیریت کا حامل وامین تھا، دنیائے علم وادب ان کے محاسن وکمالات کی آج بھی معترف ومداح ہے، ان کے علمی جاہ وجلال اور ان کی ذکاوت وذہانت کو دیکھ کر علمائے عرب وعجم حیران وششدر رہ گئے۔

پچھلی کئی دہائیوں میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ پر بہت کچھ لکھا گیا، علما وافاضل اور محققین ودانشوران ملت نے ان کی علمی تحقیقات وباقیات پر مختلف جہات سے نوع بنوع موضوعات پر لکھا، تا ہنوز لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری ہے، مجھے یقین ہے کہ ماضی کے اجالے میں مستقبل میں بھی لکھا جاتا رہے گا، میری معلومات کے مطابق اتنا لکھا گیا کہ کسی ایک اسلامی شخصیت پر آج تک اتنا نہیں لکھا گیا۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی اور گزاف نہیں بلکہ دیانت وسچائی کی تحقیق یہی ہے، مگر مختصر سی عمر میں انہوں نے جتنی خدمات دینیہ انجام دیں اور جو علمی اثاثہ چھوڑا، اُسے سمیٹنے میں محققین کو معلوم نہیں اور کتنا عرصہ لگے گا، وہ علوم ومعارف کے بحر بے کراں اور زہد وتقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔

امام احمد رضا قادری بریلوی کو پچاس سے زیادہ فنون پر عبور ودستگاہ حاصل تھی ان فنون پر ان کی تقریباً ایک ہزار تصانیف یادگار ہیں، لیکن مجھے یہاں پر امام احمد رضا بریلوی کے مختلف علوم وفنون پر تبصرہ یا ان کا جائزہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس مختصر سے مقالے میں اس کی گنجائش ہے، بلکہ علوم تصوف اور تعلیمات تصوف کے تعلق سے ان کی جو قلمی خدمات اور کارنامے ہیں ان پر گفتگو کرنی ہے، مگر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ امام احمد رضا بریلوی کے علوم تصوف پر خامہ فرسائی سے پہلے تصوف کے حقائق ومعارف اور اس کے آغاز وارتقاء پر اجمالی حیثیت سے بحث کی جائے تا کہ ان کے صوفیانہ افکار وخیالات اور عارفانہ تحقیقات ونظریات سمجھنے کے لئے قلوب واذہان قریب تر ہو جائیں۔

تصوف کا ضابطہ اور قانون دیرینہ ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں، اس پر پیغمبروں اور صدیقوں کا عمل رہا ہے، تصوف دین وایمان کی جان ہے۔

اہل طریقت کے یہاں تصوف کی تین قسمیں ہیں:

(۱) صوفی (۲) متصوف (۳) اور مشتبہ

(۱) صوفی وہ ہے جو اپنی ہستی فنا کر چکا اور اللہ کے ساتھ باقی ہے، خواہشات نفسانی کے قبضے سے باہر اور حقائق موجودات کا ماہر ہے۔

(۲) متصوف کی یہ شان ہے کہ ریاضت ومجاہدہ میں اس لئے سرگرم رہتا ہے کہ صوفیوں کے مراتب حاصل کر سکے اور قدم بہ قدم ان کی راہ چل کر اپنے معاملات ان کے ساتھ درست کرنا چاہتا ہے۔

(۳) اور مشتبہ کی یہ حالت ہے کہ اس میں صورۃً صوفیوں کے تو اکثر عادات ہوں مگر معنیً نہیں۔ روزہ، نماز، درود ووظائف ذکرو اشغال یا اور کوئی عمل وہ اس غرض سے نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ سے ملے بلکہ ان تمام آرائشوں کا مقصد جاہ طلبی اور حظوظ نفسانی ہے۔

اگر تصوف کی ابتدا پر غور کرو گے تو اس کو حضرت آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے پاؤ گے۔ اس عالم میں پہلے صوفی حضرت آدم علیہ

السلام ہیں ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا پھر اجتبا اور اصطفا کے مقام پر پہنچایا، خلافت عطا فرمائی، پھر صوفی بنایا۔ ان خاص معاملات کو اشارہ کے طور پر سنو کہ کس طرح صوفی بنائے گئے۔ مرید کو آغاز ارادت میں چلہ کرنا پڑتا ہے، اول اول طائف ومکہ کے درمیان میں چلہ کیا۔

خمرتُ طِینۃَ آدمَ بیدی اربعین صباحاً۔

میں نے اپنے ہاتھ سے آدم کی مٹی کو چالیس دنوں میں خمیر کیا۔

جب یہ تجرید کا چلہ ختم ہو چکا تو حق سبحانہ نے اس میں روح عنایت فرمائی اور عقل ودانش کا چراغ اس کے دل میں روشن کر دیا۔ پھر کیا، دل سے زبان تک وہ باتیں آنے لگیں کہ منہ سے انوار واسرار کے پھول جھڑنے لگے، جب آپ نے اپنا یہ رنگ دیکھا تو خوشی میں جھوم گئے خدا کا شکر واحسان بجالائے۔

حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے:

مَن اَخلص لِلّٰہ اَربعینَ صباحاً اظھرَ اللہ ینابیعَ الحکمۃ مِن قَلبہ علی لسانہ

جس نے خلوص قلب کے ساتھ چالیس دن خدا کے لئے خاص کر دیے اللہ تعالیٰ اس کی زبان اور دل سے حکمت کے چشمے جاری فرمائے گا۔

پھر آپ نے بجا آوری شکر واحسان کے بعد آسمان کا قصد کیا اور پہلے ہی جلوس میں ملائکہ کے سجود کی سلامی گزری، آپ کو اول خلافت میں یہ اعزاز مرحمت ہوا پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور مسافروں کی طرح بہشت کا قصد کیا اور تمام بہشت کو دیکھا بھالا، یہاں کے رموز واسرار سے آگاہی حاصل کی، کہا گیا کہیں اپنے جی سے کوئی بات نہ کر لینا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا، ذرا سنبھل کے چلنا، مرید کو خود کوئی اختیار نہیں، آپ نے سب کچھ سن لیا مگر از خود رفتگی اور انبساط کے عالم میں رو کے نہ رکے جرأت کر بیٹھے پھر کیا تھا غیب سے شمشیر عتاب کھنچی اور عصیٰ آدمُ رَبّہٗ فغویٰ (آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا وہ راہ نہ پائی، کنز الایمان سورہ طہ، ۱۲۱) سننے کو ملا، آپ چونک پڑے، عرق ندامت میں ڈوب گئے۔ اب بجز استغفار کے کوئی چارہ نہ تھا، جان و دل سے اس کام میں لگ گئے، ربّنا ظلمنا انفسنا، اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، صوفیوں کے استغفار کی اصل یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جو کچھ اسباب خواجگی مرحمت ہوئے تھے سب چھین لیے گئے، خلعت خلافت اتار لی گئی، اب جسم ننگا بے ستر تھا اور زبان پر استغفار، کہا گیا اے آدم اسی مفلسی کے ساتھ دنیا کا سفر کر، کیونکہ مرید کے لئے ضروری شرط ہے کہ جب اس سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو اس کو سفر کرنا پڑتا ہے۔ حضرت آدم نے تنہا دنیا کے سفر کا قصد کیا، جسم ننگا تھا، حکم ہوا اے آدم! ہر ایک درخت سے ایک ایک پتا مانگ، تین پتے آپ کو ملے، ان کو سی کر گدڑی بنالی، اسے پہن کر خود کو چھپا لیا اور اس خاکدان دنیا میں تشریف لائے مگر تین سو برس تک روتے رہے پھر دریائے رحمت خداوندی جوش میں آیا اور درجۂ اصطفا عطا کیا گیا، اِنّ اللّٰہ اصطفیٰ آدم اب کیا تھا تصفیہ کامل ہو گیا صوفی صافی بن گئے۔ وہ مرقع جو دریوزہ گری کے بعد پہنایا گیا تھا آپ اس کو نہایت عزیز رکھتے تھے آخر عمر میں وہ مرقع حضرت شیث علیہ السلام کو آپ نے پہنایا اور خلافت بھی سپرد کی چنانچہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طریقہ پر عمل ہوتا رہا۔ اور تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی، صوفیوں کا یہ بھی معمول ہے کہ کسی خاص جگہ پر بیٹھ کر آپس میں مل جل کر راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں چنانچہ صوفی صافی اول حضرت آدم علیہ السلام کی اس خلوت در انجمن کے لئے خانۂ کعبہ کی بنیاد پڑی، یعنی دنیا میں پہلی خانقاہ کعبہ مکرم ہے، اس سے پہلے کسی خانقاہ کا وجود نہ تھا، خرقہ اور خانقاہ کی اصل حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے قائم ہوئی،۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام نے دنیا میں صرف ایک کمبل پر اکتفا کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود ہمیشہ وہی ایک کمبل رکھا جو پہلی ملاقات میں حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو عنایت فرمایا تھا۔

طریقت میں پیر کے لئے بہت بڑی شرط یہ ہے کہ مرید کو اپنا خرقہ پہنانے کا لائق بنادے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمیشہ جامۂ صوف پہنا کرتے تھے۔ خانقاہ کی تاریخ تو معلوم ہو چکی۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے بیت المقدس کو خانقاہ بنایا۔ چنانچہ اور اور ملکوں میں بھی خانقاہیں بنائی گئیں جن میں عبادتیں کی جاتیں اور اسرار الٰہی کا بیان ہوا کرتا۔ پھر جب دور مبارک حضور سیدنا ونبینا سلطان الاولیاء والانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا آ پہنچا، حضور نے اسی طرح کمبل اختیار کیا، مِلّۃَ ابیکُم اِبرَاھیمَ (تمہارے باپ ابراہیم کا یہی طریقہ رہا اور ان کی روش بھی یہی رہی) اور اسی خانقاہ کعبہ کا

قصد کیا۔ علاوہ اس کے خود مسجد نبوی میں ایک گوشہ معین کر دیا۔ اصحاب میں وہ گروہ جو سالکان راہ طریقت بعنوان خاص تھا ان سے وہیں راز کی باتیں ہوا کرتیں، ان میں بعض پیر تھے اور بعض جوان، جیسے حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سلمان، حضرت معذ و بلال و ابوذر و عمار رضی اللہ تعالیٰ عنھم۔ ان حضرات کو خاص خاص اوقات میں آپ وہاں بٹھاتے اور اسرار الٰہی کی باتیں کرتے، ایسی ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں کہ بڑے بڑے فصحائے عرب اور عام صحابہ اس کے مغز تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔ اس خاص جماعت صوفیہ کے لوگ قریب قریب ستر اشخاص تھے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت وتکریم فرماتے تو ان کو ردائے مبارک یا اپنا پیراہن شریف عنایت فرماتے، صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا تھا۔

اب تم جان سکتے ہو کہ تصوف اور طریقت کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور اس کا تتمہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (مکتوبات صدی، مکتوب ۲۲)

امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور رسالہ میں لکھتے ہیں کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود تک صحابہ کے لقب کے سوا اور کوئی لقب ایجاد نہیں ہوا تھا کیونکہ شرف صحبت سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہوسکتا تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا لقب رائج ہوا، یہ زمانہ بھی ہو چکا تو بزرگان دین زاہد و عابد کے لقب سے ممتاز ہوئے، لیکن زہد وعبادت کا دعویٰ ہر فرقہ کو یہاں تک کہ اہل بدعت کو بھی تھا، اس لئے جو لوگ خاص اہل سنت و جماعت میں سے زاہد اور اہل دل تھے وہ صوفی کہلائے، یہ لقب دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے رواج پا چکا تھا۔

(رسالہ قشیریہ ذکر مشائخ طریقت)

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ سب سے پہلے صوفی کا لقب ابوقاسم صوفی کو ملا جنھوں نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی تھی۔

امام قشیری نے ایک دوسرے موقع پر تصوف کی وجہ تسمیہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس لفظ کے اشتقاق کے متعلق تین رائیں ہیں۔

(۱) بعض کا قول ہے کہ صحابہ میں سے جو لوگ اہل صفہ کہلاتے تھے یہ ان کی طرف نسبت ہے۔

(۲) بعض کے نزدیک اس کا ماخذ صفا ہے۔

(۳) بعض کے نزدیک صف۔

یہ بھی احتمال ہوسکتا تھا کہ صوف سے ماخوذ ہو جس کے معنی پشمینہ کے ہیں لیکن پشمینہ پوش ہونا اس فرقے کی کوئی خصوصیت نہیں۔

یہ تو لفظی بحث تھی، تصوف کی حقیقت اور ماہیت میں بھی نہایت اختلاف ہے۔ امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے میں حقیقت تصوف سے متعلق مختلف اقوال صوفیا نقل کیے ہیں۔

(۱) صوفی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو لیا ہے۔ (ذوالنون مصری)

(۲) جس کا جینا مرنا محض خدا پر ہو۔ (جنید بغدادی)

(۳) تمام اخلاق حسنہ کا جامع اور تمام اخلاق ردیہ سے بری۔ (ابومحمد جریری)

(۴) وہ شخص کہ نہ اس کو کوئی پسند کرے نہ وہ کسی کو پسند کرے۔ (منصور حلاج)

(۵) جو شخص اپنے آپ کو بالکل خدا کے ہاتھ میں دے دے۔ (رویم)

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے عوارف المعارف میں اسی قسم کے بہت سے اقوال نقل کر کے لکھا ہے، کہ ان میں سے کوئی تعریف جامع و مانع نہیں، بلکہ ہر بزرگ نے اپنے مذاق کی بناء پر تصوف کے مقامات میں سے کسی خاص مقام کی تعریف بیان کی ہے اور بعض حضرات نے زہد، فقر، تصوف تینوں کو خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ یہ تینوں تین مختلف چیزیں ہیں۔ تصوف در حقیقت زہد و فقر اور بعض اور اوصاف کے مجموعہ کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف ابتدا میں صرف زہد وعبادت کا نام تھا، زہد جس قدر بڑھتا گیا روحانی اوصاف یعنی صبر وشکر، توکل ورضا، انس ومحبت وغیرہ خود بخود پیدا ہوتے گئے، عبادت میں توجہ الی اللہ کا زور بڑھا تو مجاہدہ اور مجاہدہ سے کشف والہام اور بعض قسم کے خرق عادت کا ظہور ہوا۔ غرض رفتہ رفتہ تصوف بہت سی چیزوں کا مجموعہ بن گیا، لیکن یہ امر صاف طور سے طے نہ ہوا کہ ان میں سے تصوف کا اصلی حصہ کس قدر ہے۔ اسی بنا پر متقدمین سے ہر شخص نے تصوف کی نئی تعریف بیان

کی یعنی مجموعہ میں سے صرف ایک حصہ لے لیا۔ حجۃ الاسلام امام محمد غزالی سے پہلے تصوف میں سب سے زیادہ جامع اور علمی پیرائے میں جو کتاب لکھی گئی تھی وہ امام ابوالقاسم قشیری کا رسالہ تھا تا ہم اس رسالہ میں صرف ورع، تقویٰ، صبر وشکر وغیرہ کے عنوان قائم کیے گئے ہیں اور ہرایک عنوان کے نیچے قرآن مجید کی آیتیں اور بزرگوں کی حکایتیں لکھ دی ہیں، کسی چیز کی حد اور حقیقت نہیں بیان کی، مکاشفات اور روحانی ادراکات کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں۔ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمی طور پر اس فن کو مرتب و مدون کیا۔

علامہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

امام غزالی نے احیاء العلوم میں دونوں طریقوں کو جمع کیا چنانچہ ورع اور اقتدا کے احکام لکھنے کے ساتھ ارباب حال کے آداب اور طریقے بتائے اور ان کے مصطلحات کی شرح کی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم اور فن بن گیا حالانکہ پہلے اس کا طریقہ صرف عبادت کرنا تھا۔

تصوف کی حقیقت جو امام غزالی نے بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

تصوف شریعت کی طرح دو چیزوں سے مرکب ہے علم وعمل، لیکن یہ فرق ہے کہ شریعت میں علم کے بعد عمل پیدا ہوتا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

انسان کو اشیاء کا جو ادراک ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے استنباط، استدلال، تعلم، تعلیم سے حاصل ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غور وفکر کے بغیر دفعۃً ایک شی کا ادراک ہو جاتا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ اصطلاح تصوف میں اس کا نام الہام ہے۔

اس قسم کا ادراک صرف مجاہدہ اور تزکیہ نفس سے ہوتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان پہلے تمام تعلقات سے کنارہ کش ہو یعنی اہل وعیال، دوست واحباب، جاہ ودولت کسی چیز سے دل بستگی باقی نہ رہے اس کے بعد ایک گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ کسی چیز کا مطلقاً خیال نہ آنے پائے، اس کے ساتھ زبان سے اللہ اللہ کہتا جائے، رفتہ رفتہ یہ مشق اس قدر بڑھے کہ زبان میں حرکت نہ ہو اور تصور میں زبان سے اللہ کا لفظ نکلتا جائے پھر یہ تصور جمایا جائے کہ اللہ کا لفظ دل سے نکل رہا ہے یہ تصور اس حد تک پہنچائے کہ حرف وصوت کا خیال جاتا رہے اور اللہ کا تصور دل میں اس طرح اثر کر جائے کہ کسی وقت جدا نہ ہونے پائے۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو مکاشفہ شروع ہوگا ابتدا میں برق خاطف کی طرح آ کر نکل جائے گا پھر ترقی ہوتی جائے گی اور ثبات ودوام حاصل ہوگا۔

(احیاء العلوم جلد اول، بیان الفرق بین الالہام والتعلم)

صوفیائے کرام پر ایک مقام وہ آتا ہے کہ ان کے قلوب مجلی ومصفی ہو کر انوار وتجلیات ربانی کا گہوارہ بن جاتے ہیں پھر انھیں ایسا مکاشفہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اشیاء کے حقائق گویا ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ امام غزالی نے اس کو مثال میں یوں سمجھایا ہے:

ایک دفعہ روم وچین کے نقاشوں میں مقابلہ ہوا، دونوں اپنی اپنی فضیلت کے مدعی تھے، بادشاہ وقت نے آمنے سامنے کی دو دیواریں دونوں گروہ کے لئے مقرر کر دیں کہ ہر ایک اپنے حصہ کی دیوار پر اپنی صنعت کاری کا نمونہ دکھائے، بیچ میں پردہ ڈال دیا تا کہ ایک دوسرے کی نقل نہ اتارنے پائے، چند روز کے بعد رومی مصوروں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے، چینیوں نے کہا ہم بھی فارغ ہو چکے، پردہ اٹھایا گیا تو دونوں میں سر مو فرق نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ رومیوں نے بجائے نقاشی کے صرف یہ کیا تھا کہ دیوار کو صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا، پردہ اٹھا تو سامنے کی دیوار کے تمام نقوش ومناظر اس میں اتر آئے۔

امام غزالی علیہ الرحمہ اس مثال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ صوفیوں کے علوم کی یہی مثال ہے، وہ قلب کو اس قدر صاف اور مجلی کر دیتے ہیں کہ تمام معلومات خود اس میں منقش ہو جاتے ہیں:

مولانا روم نے بھی مثنوی شریف میں قلوب صوفیہ کی یہی تمثیل پیش فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

رومیاں آن صوفیانند اے پسر — نے زتکرار کتاب ونز ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہا — پاک ز آز وحرص وبخل کینہا

اے عزیز! رومی لوگ ان صوفی کی مانند ہیں جنھوں نے اپنے سینوں کو ایسا صاف وصیقل کیا ہے جو حرص ولالچ اور بخل وکینہ سے پاک ہیں، انہیں یہ صفائی قلب تکرار کتاب اور ہنر مندی سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ وہ زہد وتقوی اور مجاہدۂ نفس کی بنیاد پر اس مقام بلند پر پہنچے ہیں۔

تصوف اگرچہ در حقیقت صرف ایک قسم کا علم ہے یعنی علم باطن،

لیکن اس کے نتائج عجیب وغریب ہیں جو مقامات سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کے مدارج ومراتب میں اختلاف ہوتا ہے یعنی ہر شخص اپنے مذاق کے موافق کوئی خاص مقام اختیار کر لیتا ہے اور اس میں ترقی کرتا ہے مثلاً کسی پر توکل کی کیفیت طاری ہے، کوئی جہد کے مقام میں ہے، کوئی محو کے عالم میں ہے، کسی پر اثبات کا غلبہ ہے، کوئی خدمت خلق اور علوم دینیہ کی ترویج وتشہیر کے لئے وقف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت تصوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے اپنی تصنیف ''مقال عرفاء باعزاز شرع وعلماء'' میں لکھا ہے۔

(۱) عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ الربانی فرماتے ہیں:

التصوف انماھو زبدۃ عمل العبد باحکام الشریعۃ

(طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول۔ص:۴)

تصوف کیا ہے؟ بس احکام شریعت پر بندہ کے عمل کا خلاصہ ہے۔

(۲) سیدی ابوعبداللہ محمد بن خفیف ضبّی قدس سرہ فرماتے ہیں:

التصوف تصفیۃ القلوب واتباع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الشریعۃ

(طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول،ص ۱۲۱)

تصوف اس کا نام ہے کہ دل صاف کیا جائے اور شریعت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہو۔

تصوف طریقت ہی کو کہتے ہیں اور طریقت اس راستہ کا نام ہے جو خدا تک پہنچادے۔

(۳) حضور سید الاولیاء قطب الکونین سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اقرب الطرق الی للہ تعالیٰ لزوم قانون العبودیۃ والاستمساک بعروۃ الشریعۃ.

(بہجۃ الاسرار،ص:۵۰۔مصر)

اللہ عزوجل کی طرف سب سے زیادہ قریب راستہ قانون بندگی کو لازم پکڑنا اور شریعت کی گرہ کو تھامے رہنا ہے۔ (مقال عرفاء)

معلوم ہوا کہ طریقت کی اصل شریعت ہے، شریعت کے بغیر طریقت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ سالک اور صوفی کے لئے قوانین شریعت کی پابندی لازم وضروری ہے اس کے بغیر منازل طریقت کا عرفان ممکن نہیں، شریعت سے ہٹ کر حصول طریقت کا خیال سراسر الحادوزندقہ ہے، صوفیائے کاملین کی تاریخ زندگی گواہ ہے کہ انھوں نے ہر قدم پر شریعت مطہرہ کا خیال رکھا، زندگی کے ہر موڑ پر احکام شرع پر عمل کرنے کو مقدم جانا اور دنیا کو بھی عملی استقامت کے ساتھ یہی درس دیا کہ شریعت پر عمل کے بغیر درجۂ صوفیت کا حصول ممکن نہیں۔

مگر عہد حاضر کے بعض صوفیہ، جو اہل طریقت اور خانقاہی کہلاتے ہیں، طریقت کو شریعت سے جدا اور الگ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علمائے کرام شریعت والے ہیں اور ہم صوفیہ طریقت والے، شریعت کے جو احکام وقوانین ہیں وہ علمائے ظاہر اور عوام کے لئے ہیں، ہم تو اہل باطن ہیں ہم پر شریعت کی پابندی لازم نہیں (معاذ اللہ)، ہم طریقت کی ایسی منزل پر قدم رکھ چکے ہیں جہاں پہنچنے کے بعد شریعت کے احکام عائد نہیں ہوتے۔ عہد جدید کے صوفی بننے والے اپنی جہالت ولاعلمی سے اس قسم کی خرافات وہفوات بکتے ہیں جو شرع مقدس سے مذاق واستہزا کے مترادف ہے۔ کم سے کم اگر وہ یہ سوچ لیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ حضور غوث اعظم اور جنید وشبلی وغیرھم اولیائے کرام سے بڑا ولی امت میں کون ہوسکتا ہے، انھوں نے اپنی زندگیاں عبادات وریاضات کے لئے وقف کردی تھیں، قدم قدم پر انھیں شریعت مطہرہ کی پابندی ملحوظ خاطر تھی۔ اور یہ کہ تاج دار عرب وعجم محبوب کبریا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دونوں جہاں میں عالی رتبہ کون ہوسکتا ہے، آپ نے اپنی حیات اقدس میں پوری پوری رات عبادت الٰہی میں بسر فرمائی۔ مگر کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہم پر شریعت کے احکام ومسائل عائد نہیں ہوتے ہیں، ہم طریقت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں جبکہ ان کے قدموں کی برکت سے اہل دنیا کو شریعت وطریقت کا عرفان وشعور ملا اور حقیقت ومعرفت کی سوغات ملی۔ آج کل کے جاہل صوفیوں کا یہ کہنا کہ ہم اہل طریقت ہیں شریعت سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی وہ درست اور صحیح کہتے ہیں کیونکہ وہ درحقیقت شریعت سے دور اور راہ حق

سے بیگانہ الحاد و بے دینی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

دور حاضر کے اہل طریقت وصوفیہ اور خانقاہی حضرات کی اس قسم کی بدعنوانیت کو امام احمد رضا قادری بریلوی نے شدت سے محسوس کیا، تعلیمات صوفیہ سے انھیں قریب کرنے کی کوشش کی اور دلائل وشواہد کی روشنی میں ثابت فرمایا کہ شریعت وطریقت دو جدا جدا راہیں نہیں بلکہ دونوں ایک ہیں، دونوں کا منبع وسرچشمہ ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ شریعت ایک بحر نا پیدا کنار اور طریقت اس سے نکلی ہوئی ایک نہر ہے اگر طریقت کو شریعت سے الگ کر دیا جائے تو طریقت کی نہر بالکل معدوم اور خشک ہو جائے۔

شریعت وطریقت کے اتحاد وموافقت اور دونوں کے درمیان عدم فرق کو امام احمد رضا قادری بریلوی نے انتہائی تحقیق وتدقیق سے فاضلانہ اور عارفانہ انداز میں اپنی ایک تصنیف میں وضاحت وصراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہاں پر اس کے چند اقتباسات تسہیل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

شریعت تمام احکام جسم وجان وروح وقلب وجملہ علوم الٰہیہ ومعارف نامتناہیہ کو جامع ہے جن میں سے ایک ایک ٹکڑے کا نام طریقت ومعرفت ہے۔ ولہذا باجماع قطعی جملہ اولیائے کرام کے تمام حقائق کو شریعت مطہرہ پر عرض کرنا فرض ہے اگر شریعت کے مطابق ہوں، حق ومقبول ہیں ورنہ مردود وباطل۔ تو یقیناً قطعاً شریعت ہی اصل کار ہے، شریعت ہی مناط ومدار ہے، شریعت ہی کسوٹی اور معیار ہے۔

شریعت راہ کو کہتے ہیں، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا افضل الصلاۃ والتحیہ کا ترجمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ، یہ قطعاً عام ومطلق ہے نہ کہ صرف چند احکام جسمانی سے خاص، یہی وہ راہ ہے کہ پانچوں وقت ہر نماز بلکہ ہر رکعت میں اس کا مانگنا اور اس پر ثبات واستقامت کی دعا کرنا ہر مسلمان پر واجب۔ فرمایا ہے کہ اھد نا الصراط المستقیم، ہم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلا، ان کی شریعت پر ثابت قدم رکھ یہی وہ راہ جس کا منتہا اللہ ہے۔ قرآن عظیم میں فرمایا۔ انّ ربّی علیٰ صراطٍ مستقیم. (ھود،۵۶) اس سیدھی راہ پر میرا رب ملتا ہے۔

قرآن عظیم نے فرمایا:

وانّ ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہُ ولاتتبعوا السّبل فتفرّق بکم عن سبیلہ ذٰلکم وصّٰکم بہ لعلکم تتقون۔ (الانعام،۱۵۳)

اے محبوب! تم فرما دو کہ یہ شریعت میری سیدھی راہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے جدا کر دیں گے۔ یہ تمہیں تاکید فرماتا ہے تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔

دیکھو قرآن مجید نے صاف فرمایا کہ شریعت صرف وہ راہ ہے جس سے وصول الی اللہ ہے اور اس کے سوا آدمی جو راہ چلے گا اللہ کی راہ سے دور پڑے گا۔

یہ کہنا کہ طریقت نام وصول الی اللہ کا محض جنون وجہالت ہے۔ ہر دو حرف پڑھا ہوا جانتا ہے کہ طریق، طریقہ، طریقت راہ کو کہتے ہیں نہ کہ پہنچ جانے کو، تو یقیناً طریقت بھی راہ ہی کا نام ہے۔ اب اگر وہ شریعت سے جدا ہو تو بہ شہادت قرآن عظیم خدا تک نہ پہنچائے گی بلکہ شیطان تک، جنت میں نہ لے جائے گی بلکہ جہنم میں، کہ شریعت کے سوا سب راہوں کو قرآن عظیم باطل ومردود فرما چکا۔ لامحالہ ضرور ہوا کہ طریقت یہی شریعت ہے کہ اسی راہ روشن کا ٹکڑا ہے اس کا اس سے جدا ہونا محال ونا سزاوار ہے، جو اسے شریعت سے جدا جانتا ہے اسے راہ خدا سے توڑ کر راہ ابلیس مانتا ہے، مگر ہرگز طریقتِ حقہ، راہ ابلیس نہیں، قطعاً راہ خدا ہے تو یقیناً وہ شریعت مطہرہ ہی کا ٹکڑا ہے۔

شریعت کو قطرہ، طریقت کو دریا کہنا کسی مجنون پکے پاگل کا کام ہے کیونکہ شریعت منبع ہے اور طریقت اس میں سے نکلا ہوا ایک دریا، بلکہ شریعت اس مثال سے بھی متعالی ہے۔ منبع سے پانی نکل کر دریا بن کر جن زمینوں پر گزرے انھیں سیراب کرنے میں اسے منبع کی احتیاج نہیں، نہ اس سے نفع لینے والوں کو اصل منبع کی اس وقت حاجت، مگر شریعت وہ منبع ہے کہ اس سے نکلے ہوئے دریا یعنی طریقت کو ہر آن اس کی احتیاج ہے۔ منبع سے اس کا تعلق ٹوٹے تو یہی نہیں کہ صرف آئندہ کے لئے مدد موقوف ہو جائے فی الحال جتنا پانی آ چکا ہے چند روز تک پینے، نہانے، کھیتیاں باغات سینچنے کا کام دے، نہیں نہیں منبع سے اس کا تعلق ٹوٹتے ہی یہ دریا فوراً فنا ہو جائے گا، بوند تو بوند نم کا بھی نام نظر نہ آئے گا۔

نیز امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

شریعت مطہرہ ایک ربانی نور کا فانوس ہے کہ دینی عالم میں اس کے سوا کوئی روشنی نہیں، اس کی روشنی بڑھتے صبح اور پھر آفتاب اور پھر اس

سے بھی غیر متناہی درجوں زیادہ تک ترقی کرتی ہے جس سے حقائق اشیاء کا انکشاف ہوتا اور نور حق تجلی فرماتا ہے۔ یہ مرتبۂ علم میں معرفت اور مرتبۂ تحقیق میں حقیقت ہے۔ تو حقیقت میں وہی ایک شریعت ہے کہ باختلاف مراتب اس کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔

حاصل یہ کہ شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو ایک ایک سانس، ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ پر مرتے دم تک ہے اور طریقت میں قدم رکھنے والوں کو اور زیادہ، کہ راہ جس قدر باریک اس قدر ہادی کی زیادہ حاجت، اس لئے حدیث میں آیا ہے۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بغیر فقہ کے عبادت میں پڑنے والا ایسا ہے کہ چکی کھینچنے والا گدھا کہ مشقت جھیلے اور نفع کچھ نہیں۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم۔ ج ۵، ص ۲۱۹۔ بیروت)

یعنی عبادت کی صحت کے لئے علم کی ضرورت ہے علم کے بغیر شریعت کی باریکیوں پر اطلاع ممکن نہیں۔ امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔

دو شخصوں نے میری پیٹھ توڑ دی (یعنی وہ بلائے بے درماں ہیں) جاہل عابد اور عالم جو علانیہ بے باکانہ گناہوں کا ارتکاب کرے۔

اے عزیز! شریعت عمارت ہے، اس کا اعتقاد بنیاد، اور عمل چنائی، پھر اعمال ظاہرہ وہ دیوار ہیں کہ اس بنیاد پر ہوا میں چنے گئے۔ اور جب تعمیر اوپر بڑھ کر آسمانوں تک پہنچی وہ طریقت ہے، دیوار جتنی اونچی ہوگی نیو کی زیادہ محتاج ہوگی، اور صرف نیو کی بلکہ اعلیٰ حصہ اسفل کا بھی محتاج ہے اگر دیوار نیچے سے خالی کردی جائے اوپر سے بھی گر پڑے گی۔

احمق وہ جس پر شیطان نے نظر بندی کر کے اس کی چنائی آسمانوں تک دکھائی اور دل میں ڈالا کہ اب ہم تو زمین کے دائرے سے اونچے گزر گئے، ہمیں اس سے تعلق کی کیا حاجت ہے۔ نیو سے دیوار جدا کرلی اور نتیجہ وہ ہوا جو قرآن مجید نے فرمایا کہ اس کی عمارت اسے لے کر جہنم میں ڈھے پڑی۔

اسی لئے اولیائے کرام فرماتے ہیں صوفی جاہل شیطان کا مسخرہ ہے۔

حدیث میں آیا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے۔

(ترمذی ۲، ص ۹۳۔ ابواب العلم)

مطلب یہ ہے کہ بے علم مجاہدہ والوں کو شیطان انگلیوں پر نچاتا ہے، منہ میں لگام، ناک میں نکیل ڈال کر جدھر چاہے کھینچے پھرتا ہے اور وہ اپنے جی میں سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں۔

(مقال عرفاء باعزاز شرع وعلماء)

صوفی درحقیقت علم ظاہر و باطن کا سنگم و جامع ہوتا ہے اسی لئے وہ طریقت کو شریعت سے جدا راستہ نہیں سمجھتا۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ صوفیائے کرام کی ہر دور میں یہی تعلیم و تربیت رہی کہ شریعت و طریقت دونوں ایک ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی سے جدا اور الگ نہیں ہے۔ اولیائے کرام و اہل طریقت اور صوفیائے عظام کو شرعی قوانین و احکام اور ان کی باریکیوں کا اس قدر لحاظ و پاس تھا کہ ان کا کوئی قدم دائرہ شریعت سے باہر نہیں جاتا، نہ وہ اپنے کو احکام شرع سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ ان کا کردار، ان کی گفتار شریعت اسلامیہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی تھی، ان کے اقوال و افعال اہل اسلام کے لئے آئینۂ عمل اور نجات کے ضامن ہیں۔

یہ امر بھی مسلم ہے کہ علم طریقت، علم شریعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، جو علم شریعت کے بغیر طریقت کو سمجھنے یا صوفی ہونے کا دعویٰ کرے وہ شیطان کا کھلونا ہے۔

سید السالکین مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رضی اللہ عنہ ایک خاص مرید کے نام اپنے مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں:

> "برادرم شمس الدین، اللہ تم کو طالبین کی بزرگی کا درجہ عطا فرمائے۔ تم اس بات کا یقین کرو کہ جو شخص طریقت کا طلب گار ہو اس کے پاس شریعت کی پونجی ہونا ضروری ہے تاکہ قصبۂ شریعت سے شہر طریقت میں پہنچے، طریقت میں جہاں قدم درست ہو ملک حقیقت میں پہنچ جانا آسان ہے۔ جس بے علم نے شریعت ہی کو نہیں سمجھا ہے وہ طریقت کو کیا پہچانے گا اور جب طریقت ہی سے شناسائی نہیں ہے تو حقیقت تک کیوں کر رسائی ہوسکتی ہے۔ اس لئے بے علم و معرفت اور ناواقف شریعت کو اس راہ میں چلنے کی اجازت نہیں اگر اپنی خود رائی سے کوئی ایسا کرے گا تو وہ بھٹک کر رہ جائے گا اور اسی چکر

میں اس کی جان بھی چلی جائے گی، بالکل ناممکن ہے کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ سکے۔تم اس بات کا یقین کامل کر لو کہ اللہ تعالی کسی جاہل کو ولی نہیں بناتا، یہ مشائخ کا قول ہے اور قرآن شریف میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

ولم یکن لہ ولیّ مّن الذُلّ (الاسراء، ۱۱۱)

خداوند جل وعلا جاہل کو دوست کبھی نہیں بناتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جہالت سے بڑھ کر کوئی چیز ذلیل نہیں، یہ ساری ذلتوں کی جڑ ہے۔اللہ کی راہ میں قدم رکھنا دل لگی نہیں۔

بزرگوں کا قول ہے کہ سالک کو جب بارہ چیزوں کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے اس راہ کے لائق سمجھا جاتا ہے۔

علم توحید،علم معاملت ،علم معرفت ،علم حالت ،علم مکاشفت،علم مشاہدت،علم خطاب،علم سماع،علم وجد،علم معرفت روح،علم معرفت نفس،علم معرفت قلب۔

پھران علوم کے اصول وفروع کی واقفیت بھی ضروری ہے۔تم بزرگان دین کو کیا سمجھتے ہو،اپنی دستار فضیلت تہہ کر کے رکھو۔وہ اصحاب صاحب علم شریعت،صاحب علم طریقت ،صاحب علم حقیقت ہوتے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔''

(مکتوبات صدی،مکتوب ۲۳)

شریعت وطریقت کے درمیان حقیقی فرق تو نہیں ہے البتہ جو ظاہری و باطنی اور اعتباری فرق ہے اس کو مثالوں سے واضح کرتے ہوئے مخدوم جہاں حضرت شیخ یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

''شریعت دین کی ایک راہ کا نام ہے جو پیغمبر کے ذریعہ سے قائم ہوئی ہے۔لغت میں کشادہ راہ کو شارع کہتے ہیں۔راہ شریعت کو بھی خدا نے ایسی کشادہ بنایا ہے کہ اس سے ہزاروں راستے نکلتے ہیں۔طریقت کی راہ بھی شریعت ہی سے نکلی ہے۔شریعت وطریقت میں جو ظاہر و باطن کا فرق ہے اس کو ہم بیان کرتے ہیں تم اسی سے سمجھتے جاؤ۔

- شریعت میں توحید،طہارت ،نماز ،روزہ ،حج ،جہاد،زکوۃ،اور دوسرے احکام شرائع ومعاملات ضروری کا بیان ہے۔
- طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو، ان مشروع کی تہہ تک پہنچو،اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو،اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرو جیسے ریاکاری ہے، ہوائے نفسانی ہے،ظلم وجفا ہے،شرک وکفر ہے وغیرہ وغیرہ۔

اچھا اس طرح نہ سمجھے تو یوں سمجھو:

ش: ظاہری طہارت ، ظاہری تہذیب سے جس امر کا تعلق ہے وہ شریعت ہے۔
ط: تزکیۂ باطن،تصفیۂ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے۔
ش: کپڑے دھو کر ایسا پاک بنالینا کہ اس کو پہن کر نماز پڑھ سکیں یہ فعل شریعت ہے۔
ط: اور دل کو پاک رکھنا کدورت بشری سے یہ فعل طریقت ہے۔
ش: ہر نماز کے لئے وضو کرنے کو شریعت کا ایک کام سمجھو۔
ط: اور ہمیشہ باوضو رہنے کو طریقت کا دستورالعمل تصور کرو۔
ش: نماز میں قبلہ رو کھڑا ہونا شریعت ہے۔
ط: اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا طریقت ہے۔
ش: حواس ظاہری سے جن معاملات دینی کا تعلق ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھنا طریقت ہے۔
ط: اور جن معاملات دینی کو قلب وروح سے تعلق ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھنا طریقت ہے۔

انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کا یہی معمول رہا کہ دین کا جو کام خود کرتے ہیں وہی امت کو بھی حکم دیتے ہیں مگر بعض بعض اخلاق واعمال ایسے مہتم بالشان وکوہ وقار ہیں کہ اگر امت پر ان کا بوجھ ڈال دیا جائے تو ضعیف الحال امت پس جائے اس لئے آسانی کے خیال سے امت کو ان کی تکلیف نہیں دیتے اپنا ورد خاص بنالیتے ہیں اور معمول کر لیتے ہیں جیسے نماز تہجد،صدقہ نہ لینا،سیر ہو کر نہ کھانا، دنیا سے اعراض کرنا، جس سے زندگی باقی

رہے اتنے ہی کھانے پر قناعت کرنا، مکان ولباس بھی محض بقدر ضرورت رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس امر کے لئے امت کو مکلّف بنایا جائے وہ شریعت ہے اور جو کام ایسا ہے کہ تخفیف امت کے لئے انبیا علیہم الصلاۃ والسلام اپنی ذات کو اس کا پابند کرلیں اور لازمۂ احوال بنالیں وہ طریقت ہے۔"

(مکتوبات صدی، مکتوب ۲۵)

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شریعت کے درمیان کوئی تخالف و تضاد ہے، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ جو فرق بیان کیا گیا وہ ظاہر و باطن کا فرق ہے ورنہ دونوں ایک اور متحد ہیں۔ مگر بعض لوگ جس طرح شریعت و طریقت کے درمیان فرق وامتیاز کے قائل ہیں یوں ہی شریعت و حقیقت اور معرفت کے درمیان بھی تفریق وتخالف کے مدعی ہیں حالانکہ ان کے درمیان بھی کوئی تضاد و تغائر نہیں ہے، ان میں بھی اتحاد کی جلوہ فرمائی ہے۔ ایسے آزاد خیال لوگوں کی نسبت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ ایک مقام پر اختصار کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں: شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، میں باہم اصلاً کوئی تخالف نہیں اس کا مدعی اگر بے سمجھے کہے تو نرا جاہل ہے اور سمجھ کر کہے تو گمراہ بددین۔

(۱) شریعت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے اقوال ہیں۔

(۲) طریقت حضور کے افعال

(۳) حقیقت حضور کے احوال

(۴) اور معرفت حضور کے علوم بے مثال۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(فتاوی رضویہ قدیم، ج:۹، ص:۶۰، مطبع رضا اکیڈمی ممبئی)

مجھے عرض یہ کرنی ہے کہ اسی مضمون کو سمجھانے کے لئے بعض صوفیہ نے کئی کئی صفحات صرف کیے ہیں پھر اپنے مافی الضمیر کو صفحۂ قرطاس پہ نقل کیا ہے مگر امام احمد رضا بریلوی نے تصوف کی اس عظیم گتھی کو چند جملوں میں آسانی کے ساتھ سلجھا دیا ہے۔ ان کے تبحر علمی اور جلالت شان کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ان کی زندگی کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ احسان وتصوف اور احتیاط و تقوی کے باب میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، کیونکہ علم و عمل میں احکام شریعت کی پابندی اور اتباع سنت سے آپ کی پوری زندگی معمور ہے اور اکابر علما اور ابرار و صالحین کے فیضان نظر سے آپ کا ہر گوشۂ حیات پرنور ہے۔ آپ کی تصانیف و فتاوے میں فکر و اعتقاد اور علم و عمل سے متعلق مسائل تصوف اور رموز و اسرار طریقت جا بجا ملتے ہیں۔ دقائق تصوف کے حل میں آپ کی قلمی جولانی اور فکری نکتہ رسی بڑے بڑے باکمال اصحاب تصوف کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

افکار و قلوب کی تطہیر وتزکیہ کے لئے مزید ہم ان کی بعض تصانیف کے حوالے سے تعلیمات تصوف و سلوک کی چند خاص جھلکیاں پیش کررہے ہیں جن میں اسرار طریقت وتصوف کے لطائف و نکات مضمر و پنہاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ارباب طریقت کے لئے سامان ذوق اور اہل تصوف و عرفان کے لئے تسکین قلب و روح کا باعث ہوگا۔ نماز کے اسرار و نکات سے متعلق امام احمد رضا بریلوی رقم طراز ہیں:

نماز کے اکثر افعال واحکام ان اسرار وحکم پر مبنی ہیں جن کا مدار حقیقۃً صرف اہل قلوب کے روشن و بلند احوال پر ہے۔ عوام بھی صورت احکام میں ان کے شریک ہیں مثلاً:

- دن والی نماز میں اخفا واجب ہوا اور رات والی میں جہر، کہ رات آیت لطف ہے اور اس کی تجلی لطیف، اور دن آیت قہری ہے اور اس کی تجلی شدید۔ پھر قرآن کلام الٰہی کی تجلی جہری، تجلی سری سے بہت قوی وگرم۔ لہٰذا اعتدال وتعدیل کے لئے تجلی قہری کے ساتھ ٹھنڈی تجلی رکھی گئی اور تجلی لطفی کے ساتھ گرم۔
- جمعہ وعیدین میں دن ہونے کے باوجود جہر کا حکم ہوا کہ بوجہ کثرت حاضرین اُنس حاصل اور دہشت زائل، اور قلب بوجہ شہود خلق شہود تجلی سے قدرے ذاہل (غافل) بھی ہوگا۔ ساتھ ہی ایک ہفتہ کی تقصیرات جمع ہو کر حجاب میں ایک قسم کی قوت پیدا کرتی ہیں تو گاہے گاہے یہ علاج مناسب ہوا جو اپنی حرارت سے اسے گلا دے جیسے اطبا خطوط دقیقہ دیکھنے سے منع کرتے اور نادراً بغرض مشق وتمرین اسے علاج سمجھتے ہیں۔
- نماز کسوف میں گو جماعت کثیر اور وقفہ طویل ہے پھر بھی اخفا ہی رہا کہ وقت تخویف وتجلی جلال ہے اور وقفہ طویل ہے، جہر نہ ہو سکے گا۔

اسی لئے ہمارے نزدیک نماز جنازہ میں اصلاً قرأت نہیں کہ یہ ہیبت عظیم و تجلی جلال، تجلی شدید قرآنی سے جمع نہ ہو۔ اور جو قرأت کہتے ہیں وہ بھی جہر نہیں رکھتے کہ شدت پر شدت بڑھ جائے گی۔

- شب کو آٹھ رکعت تک ایک نیت سے جائز، اور دن کو چار سے زیادہ منع کہ سنت الٰہیہ ہے تجلی شیأً فشیأً وارد کرتے اور ہر ثانی میں اول سے قوی بھیجتے ہیں تو تجلی گرم نہاری کے ساتھ چار سے آگے تاب نہ آئے گی۔ اسی لئے ہر دو رکعت پر جلسۂ طویلہ کا حکم ہو کہ خوب آرام پالے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد ضروری ہوئی کہ لطف جمال سے حظ اٹھالے۔
- پچھلی رکعتوں میں قرأت معاف کہ تجلیات بڑھتی جائیں گی، شاید دشواری ہو۔
- منفرد پر جہر واجب نہیں کہ بوجہ تنہائی دہشت وہیبت زیادہ ہوتی ہے عجب نہیں کہ تاب نہ لائے تو اسے اس کے حال ووقت پر چھوڑ نا مناسب۔
- رکوع وجود میں قرأت قرآن ممنوع ہوئی کہ ان کی تجلی قیام سے اشد، دوسری تجلی شدید قرأت مل کر افراط ہوگی۔
- نیز قعود میں قرأت ممنوع ہوئی کہ وہ آرام دینے کے لئے رکھا گیا تجلی قرآنی کی شدت مل کر اسے مقصود سے خالی کر دے گی۔
- اسی لئے رکوع کے بعد قومہ کا حکم ہوا کہ اس تجلی قوی سے آرام لے کر تجلی اقوی کی طرف جائے ورنہ تاب نہ لائے گا۔
- اسی بنا پر بین السجدتین اطمینان سے بیٹھنا واجب کیا گیا کہ تجلی سجدۂ ثانیہ اور اشد و اعظم ہوگی۔ پے در پے اشد بر اشد آنے سے بنیان بشری نہ منہدم ہو جائے۔

عارف باللہ عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں نقل فرماتے ہیں:

حضور پر نور سید نا غوث اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے ایک مرید نے سجدہ کیا، جسم گھلنا شروع ہوا یہاں تک کہ گوشت پوست ہڈی پسلی کسی شی کا نشان نہ رہا صرف ایک بوند پانی کی زمین پر پڑی رہ گئی، حضور غوث اعظم نے روئی کے پھوئے سے اٹھا کر زمین میں دفن کر دی اور فرمایا سبحان اللہ تجلی کے سبب اپنی اصل کی طرف پلٹ گیا۔

(رسالہ ازھار الانوار من یم صلاۃ الاسرار۔ مشمولہ فتاوی رضویہ، جلد ۳ قدیم)

بندۂ مومن جب عبادت الٰہی اور عمل کا قصد وارادہ کرتا ہے تو اس پر شیاطین کا حملہ و پہرہ ہوتا ہے اور وہ وسوسوں میں گھر کر منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔ صوفیہ نے دفع وساوس کی مختلف تدابیر بتائی ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے دل و دماغ سے وسوسوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔

امام احمد رضا بریلوی سراج الاصفیاء اور علوم تصوف کی اشاعت میں یکتائے روزگار ہیں۔ لیکن یہ بڑے المیہ کی بات ہے کہ ان کے تصوف پر بے اعتنائیوں کا پردہ پڑ گیا اور وہ صرف ایک فقیہ بے بدل اور عاشق رسول کی حیثیت سے مشہور ہو گئے حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ بیک وقت عظیم مفسر، جلیل القدر محدث، نکتہ رس فقیہ، صاحب طرز مصنف، عبقری محقق، بے مثل مجدد، صاحب طریقت مرشد اور اہل دل صوفی وغیرہ سب کچھ ہیں۔ ان کے جس وصف کو بھی ذکر کیا جائے اسی میں وہ ممتاز و منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ کارگاہ ہستی میں ایسی ہستیاں کم جنم لیتی ہیں ایسی ہی شخصیات کے تذکرۂ جمیل سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور ان کے نقوش زندگی سے تاریخ کے صفحات آج بھی روشن و فروزاں ہیں۔ سردست یہاں پر صرف ادائے نماز میں دفع وساوس کے جو مؤثر طریقے ہیں انہیں ان کی تعلیمات کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جس وقت سونے سے اٹھے خیال کہ مجتمع تھا بجلی کی چال سے منتشر ہو جانا چاہتا ہے اگر پھیل گیا تو سمٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ معاً آنکھ کھلتے ہی پہلا کام یہ کرے کہ خیال کو روک کر تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھے یہ ابتدا اس کے خیال کی ہوگی تو دن بھر اس کی برکت اس کے خیال پر حاوی رہے گی۔

(۲) نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ بقوت باندھے جائیں، نفس کا معدن زیر ناف ہے اور یہاں سے وسوسے اٹھتے ہیں اور قلب کو جاتے ہیں اس لئے ائمہ شافعیہ رضی اللہ تعالی عنہم قلب کے نیچے پیٹ پر ہاتھ باندھتے ہیں کہ دشمن کا راستہ روکیں اور ہمارے ائمہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین ناف کے نیچے باندھتے ہیں کہ ابتدائے سرچشمہ کی بندش کریں، ہاتھ وقتاً فوقتاً ڈھیلے ہو جائیں گے، انھیں کس لیا کریں۔

(۳) نگاہ کے مواضع جو شریعت نے بتائے ہیں اس سے یہی

مقصود ہے کہ خیال پریشان نہ ہونے پائے اس کی پابندی ضروری ہے۔ قیام میں نگاہ جائے سجدہ پر رہے، رکوع میں پاؤں پر، قعود میں گود پر، سلام میں شانے پر۔

(۴) کان اپنی آواز سے بھرے رہیں۔

(۵) پڑھنے میں جلدی چاہیے کہ آہستہ ڈھیل کے ساتھ جو پڑھا جائے خیال کو انتشار کا میدان وسیع ملتا ہے اور جب جلد جلد الفاظ ادا کیے گئے اور صحت کا بھی لحاظ رہے تو خیال کو اس کی طرف سے فرصت ملے گی۔

(۶) ایک بڑی اصل یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک ہر جوڑ، ہر رگ نرم اور ڈھیلا ہو اور تصور میں زمین کی طرف متوجہ رہے، ہاتھ کھچے ہوئے نہ ہوں، مونڈھے اوپر کو نہ چڑھے ہوں اور پسلیاں سخت نہ ہوں، بدن کی وضع بھی وقتاً فوقتاً بدل جائے گی، لحاظ رکھیں، تبدل پاتے ہی فوراً ٹھیک کرلیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ قیام میں جھکا ہوا کھڑا ہو، یا رکوع میں سر نیچا ہو، یا سجود میں کلائی، یا بازو، یا زانوں کے خلاف وضع ہوں کہ یہ تو ممنوع ہے، بلکہ توجہ لیں ہر عضو زمین کی طرف جھکا ہوا ہو، پٹھے کھچے ہوئے نہ ہوں، نرم ہوں اور یہ تجربہ سے ظاہر ہو جائیں گے جس طرح بتا یا گیا سیدھا کھڑا ہو، تھوڑی دیر میں دیکھے گا کہ پٹھے سخت ہو گئے، شانے اور پسلیاں اوپر کو چڑھتے ہوئے معلوم ہوئے اور تصور ٹھیک کرتے ہی بغیر اس کے کہ بدن کو کوئی جنبش دے محسوس ہوگا کہ سب اعضا اتر آئے اور زمین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

(۷) اگر اذکار نماز کے معنی معلوم ہیں فبہا۔ ورنہ اتنا تصور جمائے رہے کہ میں اپنے رب کے روبرو کھڑا عاجزی کر رہا ہوں اور اس پر معین ہوگا گڑگڑانے کی صورت منہ بنانا، جب یہ وضع بدلے فوراً متوجہ ہوکر پھر بنالے، معاً خیال صحیح ہو جائے گا۔

(۸) وسوسے جو آئیں ان کے دفع کی کوشش نہ کرے۔ اس سے لڑائی باندھنے میں بھی اس کا مطلب حاصل ہے کہ بہر حال نماز سے غافل ہوکر دوسرے کام میں مشغول ہوا بلکہ معاً ادھر سے خیال اپنے رب کے حضور عاجزی کی طرف متوجہ کردے اور وسوسے کو یہ سمجھ لے کہ کوئی دوسرا بک رہا ہے مجھ سے کچھ کام نہیں، اگر زیادہ ستائے تو اسی عاجزی میں اپنے رب سے فریاد کرے۔ اس کا قاعدہ ہے کہ یاد الٰہی کرتے ہی بھاگ جاتا ہے۔

(۹) بڑا گر یہ ہے کہ پیٹ نہ خالی ہو نہ بھرا، اتنا خالی کہ بھوک پریشان کرے یہ بھی مضر ہوگا، بھرے کے ضرر کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہیں، افضل و اولیٰ تہائی پیٹ ہے۔

(حیات اعلیٰ حضرت ج ۳، ص ۸۸۔۸۹۔ مطبع بولٹن)

صوفیائے کرام اپنے مریدین ومتوسلین کی اصلاح وتربیت کا خاص خیال رکھتے۔ وعظ وتذکرے کے ذریعہ ان کے احوال وقلوب کی درستگی فرماتے تھے۔ ان کی تعلیمات سے نفوس پاکیزہ اور روحانیت مجلّیٰ و مصفّیٰ ہو جایا کرتی تھی۔ ہم امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے صوفیانہ انداز اصلاح کا منظر پیش کرنا چاہتے ہیں اہل نظر اور اہل دل کو اسے دیکھ کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ حرف فقیہ و عالم کے قلم کی جولانی ہے یا عارف باللہ وصوفی باکمال کی مؤثر بیانی؟

ایک شخص قیلولہ ایسے وقت کرتا کہ اس کی جماعت ظہر چھوٹ جاتی اور عذر یہ تھا کہ مجھے تہجد پڑھنا رہتا ہے جس کے لئے دن میں قیلولہ ضروری ہے، نہ کروں تو تہجد فوت ہو۔

ایسے شخص کے متعلق امام احمد رضا بریلوی فرماتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کب ایسے تہجد و قیلولہ کی طرف بلایا جن سے جماعت فریضہ فوت ہو؟ کیا قرآن وحدیث ایسے ہی تہجد کی ترغیب دیتے ہیں؟ کیا سلف صالح نے ایسے ہی قیام لیل کیے ہیں؟ حاشا وکلا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

یا ہذا۔ سنت ادا کیا چاہتا ہے تو بروجہ سنت ادا کر، یہ کیا کہ سنت لیجیے اور واجب فوت کیجیے۔ ذرا بگوش سن! اگرچہ حق تلخ گزرے، وسوسہ ڈالنے والے نے تجھے یہ جھوٹا بہانہ سکھایا کہ اسے مفتیان زمانہ پر پیش کرے جس کا خیال ترغیبات تہجد کی طرف جائے تجھے تفویت جماعت کی اجازت دے، جس کی نظر تاکیدات جماعت پر جائے تجھے ترک تہجد کی مشورت دے۔ مگر حاشا خدام فقہ وحدیث بتوفیقہ عزوجل حقیقت امر سے آگاہ ہیں ان کے یہاں عقل سلیم ونظر قویم دو عالم گواہ شہادت دے چکے ہیں کہ تہجد و جماعت میں تعارض نہیں، ان میں کوئی دوسرے کی تفویت کا داعی نہیں بلکہ یہ ہوائے نفس شریر وسوئے طرز تدبیر سے ناشی ہوا۔

یا ھذا۔ اگر تو وقت جماعت جاگتا ہوتا اور بطلب آرام پڑا رہتا

ہے جب تو صراحۃً گنہگار و تارک واجب اور عذر باطل میں کاذب ہے اور اگر ایسا نہیں تو اپنی حالت جانچ کہ یہ فتنہ خواب کیوں کر جاگا اور یہ فساد عُجاب کہاں سے پیدا ہوا؟ اس کی تدبیر کر۔

کیا تو قیلولہ ایسے تنگ وقت کرتا ہے کہ وقت جماعت قریب ہوتا ہے ناچار ہوشیار نہیں ہونے پاتا؟ یوں ہے تو اول وقت خواب کر۔ اولیائے کرام قدسنا اللہ باسرارھم نے قیلولہ کے لئے خالی وقت رکھا ہے جس میں نماز و تلاوت نہیں یعنی ضحوۂ کبریٰ سے نصف النہار تک۔ وہ فرماتے ہیں کہ چاشت وغیرہ سے فارغ ہوکر خواب خوب ہے کہ اس سے تہجد میں مدد ملتی ہے اور ٹھیک دوپہر ہونے سے کچھ پہلے جاگنا چاہئے، ظاہر ہے کہ جو پیش از زوال بیدار ہولیا اس سے فوت جماعت کے کوئی معنی نہیں۔

کیا اس وقت سونے میں تجھے عذر ہے؟ اچھا ٹھیک دوپہر کو سو۔ مگر نہ اتنا کہ وقت جماعت آجائے ایک ساعت قلیلہ قیلولہ بس ہے اگر طول خواب سے خوف کرتا ہے۔

(۱) تکیہ نہ رکھ، بچھونا نہ بچھا کہ بے تکیہ و بے بستر سونا بھی مسنون ہے۔

(۲) سوتے وقت دل کو خیال جماعت سے خوب متعلق رکھ کہ فکر کی نیند غافل نہیں ہوتی۔

(۳) کھانا حتی الامکان علی الصباح کھا کہ وقت نوم تک بخارات طعام فرو ہولیں اور طول منام کے باعث نہ ہوں۔

(۴) سب سے بہتر علاج تقلیل غذا ہے، پیٹ بھر کر قیام لیل کا شوق رکھنا بانجھ سے بچہ مانگنا ہے جو بہت کھائے گا بہت پئے گا جو بہت پئے گا بہت سوئے گا جو بہت سوئے گا آپ ہی خیرات و برکات کھوئے گا۔

(۵) یوں نہ گزرے تو قیام لیل میں تخفیف کر، دو رکعتیں خفیف و تام بعد نماز عشاء ذرا سونے کے بعد شب میں کسی وقت پڑھنی، اگر چہ آدھی رات سے پہلے ادائے تہجد کو بس ہیں۔ مثلاً نو بجے عشا پڑھ کر سو رہا دس بجے اٹھ کر دو رکعتیں پڑھ لیں تہجد ہوگیا۔

(۶) سوتے وقت اللہ عزوجل سے توفیق جماعت کی دعا اور اس پر سچا توکل۔ مولی تبارک وتعالی جب تیرا حسن نیت وصدق عزیمت دیکھے گا ضرور تیری مدد فرمائے گا۔ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔

(۷) اپنے اہل خانہ وغیرہم سے کسی معتمد کو متعین کر کہ وقت جماعت سے پہلے جگادے۔ ان ساتوں تدبیروں کے بعد کسی وقت سوئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ فوت جماعت سے محفوظی ہوگی۔

(فتاوی رضویہ ج ۳، ص ۳۳۰ تا ۳۳۲ ملخصاً۔ رضا اکیڈمی بمبئی)

امام احمد رضا بریلوی نے تہجد کے بہانے جماعت ظہر چھوڑنے والے سائل کو جس انداز سے انذار و تحذیر فرمائی اس کے پس منظر میں ہم صرف ارباب دین ہی نہیں اہل زبان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ اسلوب نگارش اور انداز تربیت عالمانہ ہے یا صوفیانہ؟ یہ فقیہ کے قلم کی جلوہ آرائیاں اور فتاوی کی زبان ہے یا صوفی کامل و عارف ربانی دل کی سچی آواز؟ اہل نظر کو یہ باور و تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ صرف مفتی محض یا عالم دین کے رشحات قلم کی رنگینیاں نہیں بلکہ یہ کسی ہادی شریعت وطریقت کے دردمند دل کا حقیقی پیغام ہے۔

اسی طرح کا ایک سوال امام احمد رضا بریلوی کی بارگاہ میں پیش ہوا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نفلی صدقات وخیرات تو کرتے ہیں مگر فرض زکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتے۔ اس سوال کے جواب میں حکم شرعی کی وضاحت کرتے ہوئے اٹھارہ حدیثیں بیان فرمائیں، پھر خالص صوفیانہ و مصلحانہ انداز میں ارشاد فرمایا:

زکوۃ نہ دینے کی جانکاہ آفتیں وہ نہیں جن کی تاب آسکے۔ نہ دینے والے کو ہزار ہا سال ان سخت عذابوں میں گرفتاری کی امید رکھنی چاہیے کہ ضعیف البنیان کی کیا جان اگر پہاڑوں پر ڈالے جائیں سرمہ ہوکر خاک میں مل جائیں۔ پھر اس سے بڑھ کر احمق کون کہ اپنا مال جھوٹے سچے نام کی خیرات میں صرف کرے اور اللہ عزوجل کا فرض اور اس بادشاہ قہار کا وہ بھاری قرض گردن پر رہنے دے۔ یہ شیطان کا بڑا دھوکا ہے کہ آدمی کو نیکی کے پردے میں ہلاک کرتا ہے نادان سمجھتا ہی نہیں، (سمجھتا ہے) نیک کام کر رہا ہوں اور نہ جانا کہ نفل بے فرض نرے دھوکے کی ٹٹی ہے، اس کے قبول کی امید تو مفقود اور اس کے ترک کا عذاب گردن پر موجود۔

اے عزیز! فرض خاص سلطانی قرض ہے اور نفل گویا تحفہ و نذرانہ۔ قرض ادا نہ کیجئے اور بالائی بیکار تحفے بھیجئے وہ قابل قبول ہوں گے؟ خصوصاً اس شہنشاہ غنی کی بارگاہ میں جو تمام جہان و جہانیاں سے بے نیاز ہے۔

اس شخص نے آج تک جس قدر خیرات کی، مسجد بنائی، گاؤں

وقف کیا یہ سب امور صحیح ولازم تو ہو گئے مگر بایں ہمہ جب تک زکوۃ پوری نہ ادا کرے ان افعال پر امید ثواب وقبول نہیں کہ کسی فعل کا صحیح ہو جانا اور بات اور اس پر ثواب ملنا، مقبول بارگاہ ہونا اور بات ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دکھاوے کے لئے نماز پڑھے نماز صحیح تو ہو گئی، فرض اتر گیا پر نہ قبول ہوگی نہ ثواب پائے گا بلکہ الٹا گنہگار ہو گا یہی حال اس شخص کا ہے۔

اے عزیز! اب شیطان لعین کہ انسان کا عدو مبین ہے بالکل ہلاک کر دینے اور یہ ذرا سا ڈورا جو قصد خیرات کا رہ گیا ہے جس سے فقراء کو تو نفع ہے، اسے بھی کاٹ دینے کے لئے یوں فقرہ سوجھائے گا کہ جو خیر قبول نہیں، تو کرنے سے کیا فائدہ؟ چلو اسے بھی دور کرو اور شیطان کی پوری بندگی بجالاؤ۔ مگر اللہ عزوجل کو تیری بھلائی اور عذاب شدید سے رہائی منظور ہے تو وہ تیرے دل میں ڈالے گا کہ اس حکم شرعی کا جواب یہ نہ تھا جو اس دشمن ایمان نے تجھے سکھایا اور رہا سہا بالکل متمرد وسرکش بنایا۔ بلکہ تجھے وہ فکر کرنی تھی جس کے باعث عذاب سلطانی سے بھی نجات ملتی اور آج تک کہ یہ وقف ومسجد وخیرات بھی سب مقبول ہو جانے کی امید پڑتی۔ وہ نیک تدبیر یہی ہے کہ زکوۃ نہ دینے سے صدق دل سے توبہ کیجیے، آج تک کی جتنی زکوۃ گردن پر ہے فوراً دل کی خوشی کے ساتھ اپنے رب کا حکم ماننے اور اسے راضی کرنے کو ادا کر دیجئے کہ شہنشاہ بے نیاز کی درگاہ میں باغی غلاموں کی فہرست سے نام کٹ کر فرماں بردار بندوں کے دفتر میں چہرہ لکھا جائے۔

مہربان مولی جس نے جان عطا کی، اعضاء دیئے، مال دیا، کروڑوں نعمتیں بخشیں اس کے حضور منھ اجالا ہو، نیکی صورت نظر آئے اور مژدہ ہو، بشارت ہو، نوید ہو، تہنیت ہو کہ ایسا کرتے ہی اب تک جس قدر خیرات دی ہے، وقف کیا ہے، مسجد بنائی ہے اس سب کی بھی قبول کی امید ہوگی کہ جس جرم کے باعث یہ قابل قبول نہ تھے جب وہ زائل ہو گیا انھیں بھی باذن اللہ شرف قبول حاصل ہو گیا۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۴ قدیم، ص: ۴۳۶۔۴۳۸۔ رسالہ اعزالاکتناہ، ملخصاً رضا اکیڈمی)

اس حکیمانہ بیان کے طرز نگارش سے امام احمد رضا بریلوی کی علوم تصوف پر مہارت ودست رس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا عرفان یہ تھا کہ انھوں نے حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت ورسالت کا حقیقی مقام ومرتبہ سمجھا اور اس کی قرار واقعی حیثیت سے دنیا جہان کے لوگوں کو آگاہ وآشنا کیا۔ جس نے شان رسالت میں ذرا بھی تنقیص یا توہین کی یا نازیبا کلمات کہے اس کے لئے تیغ برہنہ ثابت ہوئے، ایسا ایک حرف شکایت گوارا نہ کیا جو مقام نبوت کے خلاف تھا۔ وہ بحر توحید میں غرق اور فنافی الرسول کے مقام بلند پر فائز ومتمکن تھے۔ انھوں نے مسلمانان عالم کے دلوں میں عشق رسالت کی اسی شمع روشن وفروزاں کی جس کی پرنور شعاعوں سے انسانی ذہنوں کے ظلمت کدے منور وتابناک ہو گئے۔ ان کی علمی، تحقیقی اور تجدیدی خدمات وکارناموں کے سرسری جائزے کا بھی یہ موقع نہیں ورنہ میں ان کی حیات اقدس کے کچھ اہم گوشوں پر نظر ڈالتا۔ یہاں مجھے صرف یہ باور کرانا ہے کہ انھوں نے قومی اصلاح وتربیت اور معاشرتی فلاح وترقی کا جو خوشگوار فریضہ انجام دیا ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان کی زندگی لائق تقلید اور وہ بذات خود اہل سنت وجماعت کے لئے سرمایۂ عزت وافتخار ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ پچاس سے زائد بلکہ جدید تحقیق کے مطابق ۱۰۵ ایک سو پانچ علوم وفنون پر کامل اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان تمام فنون پر انھوں نے باضابطہ کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ ایک صوفی کامل کی حیثیت سے انھوں نے علوم تصوف پر بھی اپنی تصانیف یادگار چھوڑیں سلوک ومعارف کا قیمتی اثاثہ سالکین وعارفین کو عطا فرمایا۔ علوم تصوف کے تعلق سے انھوں نے جو بھی لکھا وہ ایقان وعرفان کے اجالے میں لکھا، اہل دل کے مانند زنگ آلود دلوں کی اصلاح وتطہیر فرمائی، گم کشتگان راہ کو نشان منزل اور تلاش وجستجو کا حوصلہ بخشا۔ ان کے فتاوے وتصانیف میں جابجا تصوف وسلوک، اسرار ورموز کا علمی مواد اور اصلاح وتربیت کا انوکھا پیغام ملتا ہے۔ تصوف کے ان منتشر مباحث ومضامین کو بالاستیعاب جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض علما نے یہ کاوش کی ہے اگر چہ وہ مختصر ہے مگر سراہنے کے لائق ہے۔

تصوف وسلوک پر امام احمد رضا بریلوی کی تصانیف وحواشی میری معلومات کے مطابق یہ ہیں، ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ:

(۱) کشف حقائق واسرار دقائق ۱۳۰۸ھ، تصوف آمیز اشعار کی تشریح اور بعض سوالات تصوف کا جواب۔

(۲) بوارق تلوح من حقیقة الروح ۱۳۱۱ھ، روح کیا شی ہے اس کی توضیح وتفصیل۔

(۳) التلطف بجواب مسائل التصوف ۱۳۱۲ھ، مسائل تصوف کا عارفانہ جواب۔

(۴) نقاء السلافة فی البیعة و الخلافة ۱۳۱۹ھ، بیعت و خلافت کے احکام ومسائل کی تفصیل۔

(۵) مقال عرفاء باعزاز شرع وعلماء ۱۳۲۷ھ، طریقت، شریعت سے جدا نہیں اس پر احکام شرع اور عارفین کے اقوال۔

(۶) ازھار الانوار من یم صلاة الاسرار ۱۳۰۵ھ، نماز غوثیہ کا ثبوت اور بہت سے اسرار ورموز کا بیان۔

(۷) ازھار الانوار من صباصلاة الاسرار ۱۳۰۵ھ، نماز غوثیہ کا طریقہ اور دیگر نکات ولطائف کا بیان۔

(۸) الوظیفة الکریمہ دعائے ماثورہ اور شب وروز کے وظائف کا مجموعہ۔

(۹) زھر الصلاة من شجرة اکارم الھداة ۱۳۰۵ھ، درود میں شجرۂ طیبہ کے اوراد۔

(۱۰) ماقل و کفی من ادعیة المصطفے ۱۳۰۴ھ، صبح وشام اور اوقات خاصہ کی کارآمد دعائیں۔

(۱۱) الفوز بالامال فی الاوفاق و الدعاء ۱۳۲۶ھ، اعمال و نقوش وتعویذات خاندانی وایجادی کا مجموعہ۔

(۱۲) شرح الحقوق لطرح العقوق ۱۳۰۷ھ، ابوین، زوجین اور استاد وغیرہ کے حقوق کی تفصیل۔

(۱۳) مشعلة الا رشادالی حقوق الاولاد ۱۳۰۹ھ، اولاد کے پیدا ہونے سے لےکر بالغ ہونے تک کے حقوق۔

(۱۴) اعز الاکتناہ فی رد صدقة مانع الزکوٰة ۱۳۰۹ھ، زکوٰۃ نہ دے کر صدقہ کرنے والے کو عالمانہ وصوفیانہ تنبیہ۔

(۱۵) الیاقو تة الواسطه فی عقد قلب الرابطه ۱۳۰۹ھ، تصور برزخ کا جواز اور شیخ سے رابطہ قلبی کا فائدہ۔

(۱۶) الزمزمة القمریة فی الذب عن الخمریة ۱۳۰۶ھ، قصیدۂ غوثیہ پر بعض جہال کے اعتراض کا رد۔

(۱۷) اعجب الامداد فی مکفرات حقوق العباد ۱۳۱۰ھ، کن عمل کے سبب حقوق العباد سے نجات مل سکتی ہے۔

(۱۸) ذیل المدعیٰ لا حسن الوعاء ۱۳۰۶ھ، دعا کے آداب، اوقات، مکانات، اور اسباب اجابت کا بیان

(۱۹) حاشیہ احیاء العلوم الدین۔

(۲۰) حاشیہ بہجۃ الاسرار۔

(۲۱) حاشیہ حدیقہ ندیہ۔

(۲۲) حاشیہ مدخل۔

(۲۳) حاشیہ کتاب الابریز۔

(۲۴) حاشیہ کتاب الزواجر۔

علم جفر وتکسیر کا تعلق بھی علم تصوف سے ہے اور یہ مشائخ وصوفیہ اور اولیائے کرام کے خاص علوم سے ہیں، ان فنون میں بھی امام احمد رضا بریلوی کی تصانیف ملتی ہیں خاص طور سے علم تکسیر میں تو موجد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ امام احمد رضا بریلوی کے مثل علم تکسیر کا جاننے والا کئی صدیوں میں پیدا نہیں ہوا تو بے جا نہ ہوگا۔ علم جفر وتکسیر چونکہ تصوف سے متعلق یا اس کا حصہ ہے لہذا ان دونوں فن میں ان کی جو تصانیف ہیں انھیں بھی تصانیف تصوف کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جفر وتکسیر میں ان کی تصانیف یہ ہیں:

(۱) اطائب الاکسیر فی علم التکسیر ۱۲۹۶ھ

(۲) الثواقب الرضویه علی الکواکب الدریه ۱۳۲۱ھ

(۳) الجداول الرضویه للمسائل الجفریه ۱۳۱۳ھ

(۴) الاجوبة الرضویه للمسائل الجفریه ۱۳۱۳ھ

(۵) رسالہ در علم تکسیر

(۶) ۱۱۵۲ مربعات

(۷) حاشیہ الدر المکنون۔

(۸) الوسائل الرضویه للمسائل الجفریه۔

(۹) مجتلی العروس و مراد النفوس

(۱۰) الجفر الجامع

(۱۱) اسهل الکتب فی جمیع المنازل۔

(۱۲) رساله فی علم الجفر۔

(۱۳) سفر السفر عن الجفر بالجفر۔

فن تصوف میں امام احمد رضا بریلوی کی اتنی ڈھیر ساری تصانیف کو دیکھ کر دنیا کو اس سچائی کا اعتراف ویقین کرنا پڑے گا کہ وہ اس فن کے بھی امام ہیں اور کہنا پڑے گا کہ انھوں نے جس فن پر توجہ دی اسی میں یکتائے روزگار ہو گئے۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہ کہتے ہیں کہ امام احمد رضا بریلوی ایک فقیہ اور عاشق رسول تھے وہ آئیں اور انصاف و دیانت کی آنکھوں سے ان تصنیفات کو دیکھیں۔ ان تصانیف کو دیکھ کر انھیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ واقعی وہ امام تصوف، غزالی عصر اور سرمایہ سُلمان وابوذر تھے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ امام احمد رضا بریلوی نے دیگر فنون متروکہ کی طرح فن تصوف کی بھی نشاۃ ثانیہ فرمائی، تعلیم تعلم کے ذریعہ اس کی اشاعت کی، اپنے حلقہ نشینوں اور ارادت مندوں میں تصوف وعرفان کی روح پھونکی، سالک کو صوفی بنایا، ظاہر پرست کو حقیقت ومعرفت کا لذت آشنا کر دیا۔

حیرت انگیز پہلو اور افسوسناک بات یہ ہے کہ مخالفین ومعاندین نے ان پر جہاں اختراعی اور بے بنیاد الزام لگائے وہیں ان کے محاسن وخوبیوں پر پردہ ڈالنے اور ان کی تحقیقات علمیہ کو بھی چھپانے کی لاحاصل کوششیں کیں۔ اپنوں کے جمود وتغافل اور کچھ بے توجہی کے سبب سے وہ اپنے ناپاک ومکروہ عزائم میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مگر اب بحمدہ تعالیٰ کئی دہائیوں سے علمائے اہل سنت اور محققین ملت بیدار ہیں جنھوں نے علم وتحقیق کے حوالے سے حیات امام احمد رضا کا گوشہ گوشہ اور ان کی اکثر تصانیف وتحقیقات کا ورق ورق روشن ومنور کر دیا۔ یقین جانیے علما ومحققین کی کدوکاوش اور حقانیت کی بدولت اعدا ومخالف سرگریباں ہو گئے اور ان کا ناطقہ بند ہو گیا۔

ہم یہاں پر ایک ایسے صاحب قلم کے تأثرات پیش کر رہے ہیں جن سے آپ کو یقین واذعان کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ امام احمد رضا بریلوی فی الواقع تاج الاصفیاء اور جماعت صوفیہ کے ممتاز فرد تھے۔ یہ وہ تأثرات ہیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئے، جنھیں دنیا نے اپنے سر کی انکھوں سے دیکھا اور پڑھا۔ ملاحظہ فرمائیں ہفت روزہ ''خطیب'' دہلی کے شمارہ نمبر ۱۱ جلد نمبر ۱ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۵ء میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے متعلق خواجہ حسن نظامی کے تأثرات:

''بریلی کے مولانا احمد رضا خاں صاحب جن کو ان کے معتقد مجدد مائۃ حاضرہ کہتے ہیں درحقیقت طبقہ صوفیائے کرام میں بہ اعتبار علمی حیثیت کے منصب مجدد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے ان مسائل اختلافی میں معرکے کی کتابیں لکھی ہیں جو سالہا سال سے فرقہ وہابیہ کے زیر تحریر وتقریر تھے اور جن کے جوابات گروہ صوفیہ کی طرف سے کافی وشافی نہیں دیے گئے تھے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص شان اور خاص وضع ہے۔ یہ کتابیں بہت زیادہ تعداد میں ہیں اور ایسی مدلل ہیں جن کو دیکھ کر لکھنے والے کے تبحر علمی کا جید سے جید مخالف کو اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی خصلت ہے جس کی ہم سب کو پیروی کرنی چاہیے۔ ان کے مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا کی تحریروں میں سختی بہت ہے اور بہت جلد دوسروں پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں مگر شاید ان لوگوں نے مولانا اسماعیل شہید اور ان کے حواریوں کی دل آزار کتابیں نہیں پڑھیں۔ جن کو سالہا سال صوفیائے کرام برداشت کرتے رہے، ان کتابوں میں جیسی سخت کلامی برتی گئی ہے، اس کے مقابلے میں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اب تک بہت کم لکھا ہے۔ جماعت صوفیہ علمی حیثیت سے مولانا موصوف کو اپنا بہادر صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔''

(بحوالہ: امام احمد رضا ارباب علم ودانش کی نظر میں)

اہل علم سے یہ بات مخفی و پوشیدہ نہیں ہے کہ چند مسائل میں امام احمد رضا بریلوی کو خواجہ حسن نظامی سے اختلاف تھا، جیسے مسئلہ سماع اور مسئلہ سجدۂ تحیت۔ یعنی خواجہ حسن نظامی مزامیر کے ساتھ سماع اور مرشد طریقت کے لئے سجدۂ تحیت وتعظیمی کے جواز ومشروعیت کے قائل تھے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی سماع مع مزامیر اور غیر اللہ کے لئے سجدۂ تحیت کو حرام وناروا سمجھتے تھے۔ یہ اختلاف کوئی نظریاتی واعتقادی نہ تھا بلکہ حکم شرع صادر کرنے میں حلت وحرمت کا فرق اور درست ونادرست کا

اختلاف تھا۔امام احمد رضا بریلوی کا طریقہ یہ تھا کہ حق کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھتی تو وہ بے چین ومضطرب ہوجاتے، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ،اس کے استیصال کے لئے ممکن تدابیر اختیار فرماتے اوراس آواز کو کچلنے کے لئے خرمن باطل پہ ان کا قلم برق خاطب بن کر گرتا ۔ان مسائل میں بھی انھوں نے آوازۂ حق بلند کیا اور اصلاح و درستگی کی کوشش فرمائی ۔ان مسائل کی تفصیل کے لئے امام احمد رضا بریلوی کے فتاوی اور یہ رسالے دیکھے جاسکتے ہیں ۔ان میں دلائل شرعیہ،نصوص ائمہ اوراقوال اکابر سے مسئلہ دائرہ کو ثابت واضح کیا گیا ہے:

(۱)مسائل سماع

(۲)اجل التحبیر فی حکم السماع و المزامیر۔۱۳۲۰ھ

(۳)الزبدۃ الزکیۃ لتحریم سجود التحیہ۔۱۳۳۷ھ

مجھے عرض یہ کرنی ہے کہ بعض مسائل میں اختلاف رائے کے باوجود خواجہ حسن نظامی کی نوک قلم سے امام احمد رضا بریلوی کے متعلق جو تاثرات ظاہر ہوئے وہ سو فی صد درست اور مبنی برحق ہیں۔

گہوارۂ علم وادب مرکز اہل سنت بریلی شریف میں تشنگان علم ومعرفت کی سیرابی کے لئے امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے ۱۳۲۲ھ میں ''جامعہ رضویہ منظر اسلام'' قائم فرمایا، اس میں دیگر علوم کی تعلیم کے ساتھ تصوف وعرفان کی بھی تعلیم ہوتی تھی، تصوف کے عقدہ ہائے لانیحل حل کیے جاتے بلکہ وعظ ونصیحت، رشد وہدایت، اوامر ونواہی، اوصاف حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ درس تصوف میں طلبہ کے علاوہ علما بھی شریک جماعت ہوتے تھے۔امام احمد رضا نے بذات خود بحرالعلوم ملک العلماء مولانا ظفرالدین رضوی بہاری مصنف ''حیات اعلیٰ حضرت'' کو بخاری شریف کا درس دے کر منظر اسلام کا تعلیمی افتتاح فرمایا۔پھر دیگر درسی کتب کے ساتھ انھوں نے تصوف کی بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔مزید وضاحت کے لئے ''حیات اعلیٰ حضرت'' کا یہ اقتباس پیش ہے۔

> ''اعلیٰ حضرت سے انھوں (ملک العلماء) نے صحیح بخاری، اقلیدس کے چھ مقالے، تصریح، تشریح الافلاک، شرح چغمینی تمام کرکے علم ہیئت، ریاضی، توقیت وتکسیر وغیرہ فنون حاصل کیے۔تصوف کی کتابوں میں ان سے عوارف المعارف اور رسالہ قشیریہ کا درس بھی لیا، ان اسباق میں طلبہ کے علاوہ علماء کی جماعت بھی شریک ہوتی تھی۔''
>
> (حیات اعلیٰ حضرت جلد اول، ص۵۹۔مطبع لوئٹن)

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمد رضا بریلوی نے علوم تصوف کے فروغ واشاعت میں نمایاں حصہ لیا، اس کے تحفظ وبقا کے لئے علما کی ایک جماعت تیار کی، وہ جانتے تھے کہ علم بلاعمل بے پھل درخت کے مانند ہے۔انھوں نے عملی بیداری کے لئے تصوف وروحانیت کی تعلیم کا انتظام کیا، علمائے ظاہر کو علم باطن سے آراستہ کردیا۔

مشائخ وصوفیہ کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے حلقہ ارادت میں آنے والوں کی اصلاح وتربیت کا خاص خیال رکھتے تھے، وعظ وتذکیر اور پند ونصائح کے ذریعہ ان کے احوال وقلوب کی اصلاح وتطہیر کی جاتی تھی، جو معتقدین ومتوسلین دور دراز مقامات کے ہوتے، انھیں مکتوبات کے ذریعہ آگاہ کیا جاتا تھا، یہی مکتوبات ان کے لئے پیغام عمل اور مشعل راہ ہوتے تھے۔مکتوب نویسی کی تاریخ صدیوں پرانی ہے، مکتوب نگاری کے ذریعہ ہدایت وارشاد کا طریقہ زمانہ قدیم سے رائج ہے۔یوں ہی ملفوظات صوفیا کی روایت بھی عرصہ دراز سے چلی آتی ہے۔سالکین کی تعلیم وتربیت میں ملفوظات اسلاف کا بھی بڑا دخل ہے۔مکتوبات سے زیادہ ملفوظات کی تالیف وتدوین کی توجہ دی گئی۔یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کی تاریخ میں ملفوظات کی تعداد خاص ہے۔بزرگوں کے مکتوبات بھی ذخیرۂ معلومات اور سرمایۂ تصوف ہیں۔جو مکتوبات معلوم اور دستیاب ہیں ان میں سے مکتوبات مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۸۲ھ کی مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی، مکتوبات بست وہشت اور شیخ مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۰۳۴ھ کی مکتوبات ربانی اور منتخبات مکتوبات مشہور ومعروف ہیں۔

دستور صوفیہ کے مطابق امام احمد رضا بریلوی بھی اپنے ارادت مندوں کی مکتوبات وملفوظات کے ذریعہ نصیحت واصلاح فرماتے۔دور دراز جگہوں کے وہ لوگ جو حاضر بارگاہ نہیں ہوسکتے تھے ان کی رہنمائی مکتوبات وخطوط کے ذریعہ ہوتی تھی۔امام احمد رضا بریلوی چونکہ خطوط کا جواب پابندی کے ساتھ تحریر فرماتے تھے۔معمول یہ تھا کہ کچھ علما مخصوص

کاموں کے لئے منتخب و مامور تھے۔ جس کے ذمہ جو کام تھا وہ اسی کو انجام دیتا تھا۔ جواباتِ خطوط کے لئے بھی بعض علما متعین تھے۔ جو خط جن باتوں کے متعلق ہوتا ویسے ہی شخص کو جواب لکھنے کے لئے دیا جاتا۔ لہٰذا خط جس مضمون کا ہوتا اس سے متعلق شخص ہی اس کا جواب لکھتا یا جواب لکھوا دیا جاتا، مگر جو خط خاص سلوک و تصوف کے متعلق ہو تا اس کا جواب بذات خود امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے تھے۔ حیات اعلیٰ حضرت کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت کو خطوط کے جواب کا بہت اہتمام تھا۔ اس خیال سے کہ خطوط ضائع نہ ہوں، حاجی کفایت اللہ صاحب ساکن محلہ بہاری پور (بریلی شریف) خادم خاص اعلیٰ حضرت نے ایک خوبصورت بکس ٹین کا بنوا کر رنگ کرآویزاں کر دیا جس میں ڈاکیہ خطوط پیکٹ وغیرہ ڈال دیا کرتا تھا اس میں برابر تالا لگا رہتا کہ کوئی ان خطوط کو نکال نہ لے، کنجی اس کی اعلیٰ حضرت کے پاس رہتی۔ عصر کی نماز پڑھ کر جب باہر آ کر تشریف رکھتے تو کنجی مجھے عنایت فرماتے، بکس کھول کر اس روز کی ڈاک سب لاکر حاضر کر دیتا اور ایک ایک خط پڑھنا شروع کرتا۔ اگر خط تصوف کے متعلق ہوتا اعلیٰ حضرت خود رکھ لیتے اور اس کا جواب بنفس نفیس خود تحریر فرماتے۔''

(حیات اعلیٰ حضرت ج ا، ص ۱۶۳۔ مطبع بولٹن)

صوفیہ کی زندگی ریاضت و مجاہدہ میں گزرتی ہے، اس راہ میں انھیں محنت شاقہ کا سامنا ہوتا ہے، نفس کشی کی صبر آزما گھڑیوں میں جسے ثابت قدمی میسر ہوتی ہے، رب کائنات کی رحمت بے پایاں سے وہ نوازا جاتا ہے، ورنہ اس خاردار وادی میں بڑے بڑے مجاہدہ کرنے والوں اور جفاکشوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، آزمائش و ابتلا کا ایسا دور آتا ہے کہ وہ منزل مقصود سے بھٹک جاتے ہیں۔ ہمیں امام احمد رضا بریلوی کی تعلیماتِ تصوف میں ریاضت و مجاہدے کی بھی تعلیم ملتی ہے وہ بذات خود تو مشغول مجاہدہ تھے ہی ان کے حلقۂ ارادت میں بھی اس کا اثر نمایاں تھا۔ ان کا زور قلم شریعت و طریقت کی گتھیاں سلجھانے میں صرف ہوا، جہاد بالقلم سے انھوں نے دشمنان دین کا سر قلم کر دیا۔ مجاہدہ سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں فرماتے ہیں:

''مجاہدے کے لئے کم از کم اسّی برس درکار ہوتے ہیں باقی طلب ضرور کی جائے۔ مقصود یہ ہے کہ جس طرح اس عالم میں مسببات کو اسباب سے مربوط فرمایا گیا ہے اسی طریقہ پر اگر چھوڑیں اور جذب و عنایت ربانی بعید کو قریب نہ کر دے تو اس راہ کی قطع کو اسی برس درکار ہیں اور رحمت توجہ فرمائے تو ایک آن میں نصرانی سے ابدال کر دیا جاتا ہے اور صدق نیت کے ساتھ یہ مشغول مجاہدہ ہو تو امداد الٰہی ضرور کارفرما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت، ۶۹)

وہ جو ہماری راہ میں مجاہدہ کریں ہم ضرور انھیں اپنے راستے دکھادیں گے۔

عرض کیا گیا، یہ اگر کسی کا ہوکر رہے تو ہوسکتا ہے کہ دنیوی ذرائع معاش اور دینی خدمات چھوڑنی پڑیں گی۔

فرمایا، اس کے لئے یہی خدمات مجاہدات ہیں بلکہ اگر نیت صالحہ ہے تو ان مجاہدوں سے اعلیٰ

امام ابواسحٰق اسفرائنی جب انہیں مبتدعین کی بدعت کی اطلاع ہوئی پہاڑوں پر ان اکابر علما کے پاس تشریف لے گئے جو ترک دنیا و مافیھا کر کے مجاہدات میں مصروف تھے۔ ان سے فرمایا، اے سوکھی گھاس کھانے والو! تم یہاں ہو اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتنوں میں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ امام یہ آپ ہی کا کام ہے ہم سے نہیں ہوسکتا۔ وہاں سے واپس آئے اور مبتدعین کے رد میں نہریں بہائیں۔''

(الملفوظ حصہ اول، ص: ۷۔۸، بریلی شریف)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے، ایک عالم صاحب کی وفات ہوئی ان کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا جنت عطا

کی گئی نہ علم کے سبب بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نسبت کے سبب جو کتے کو راعی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر وقت بھونک بھونک کر بھیڑوں کو بھیڑیے سے ہوشیار کرتا رہتا ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ ان کا کام ہے۔ سرکار نے فرمایا بھونکے جاؤ بس اس قدر نسبت کافی ہے۔ لاکھ ریاضتیں، لاکھ مجاہدے اس نسبت پر قربان، جس کو یہ نسبت حاصل ہے اس کو کسی مجاہدے، ریاضت کی ضرورت نہیں۔ (پھر فرمایا) اور اسی میں کیا ریاضت تھوڑی ہے، جو عزت نشیں ہوگیا۔ نہ اس کے قلب کو کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ نہ اس کی آنکھوں کو، نہ اس کے کانوں کو۔ اس سے کہئے جس نے اوکھلی میں سر دیا ہے اور چاروں طرف سے موصل کی مار پڑ رہی ہے۔"

(الملفوظ حصہ سوم، ص ۳۸۔ مطبع بریلی شریف)

خدمت دین، اشاعت مذہب و ملت عظیم مجاہدہ ہے اس کے تناظر میں آپ حیات امام احمد رضا کے شب و روز کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ انہوں نے پوری زندگی نصرت حق، حمایت مذہب و ملت، دین و سنت کی آبیاری اور امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح و تربیت میں ایسی ذمہ داری سے گزاری کہ ان صعوبت انگیز راہوں سے وہ آسانیوں کے ساتھ گزر گئے کہ نہ آبلہ پائی کے شکار ہوئے نہ زبان و بیان کی شگفتگی میں کوئی فرق پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی وفادار نسبت غلامی حاصل تھی کہ ناموس رسالت کی حفاظت و صیانت میں تن من دھن کی بازی لگادی، اسی کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ اس راہ میں نہ انہوں نے اپنوں کا خیال کیا نہ غیروں کی پرواہ، جس نے حدود شریعت سے باہر قدم نکالا یا شان اقدس میں گستاخی کی یا تنقیص و توہین آمیز کلمات کہے اسے تنبیہ کی اور اس کا ناطقہ بند کردیا۔ ان کی مساعی جمیلہ اور مجاہدانہ کردار سے مسلمانوں کے فکر و اعتقاد میں ثبات و استحکام پیدا ہوا۔

یہی وہ عظیم مجاہدہ تھا کہ ان کے مرشد طریقت نے کسی اور ریاضت و تزکیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ داخل سلسلہ فرمانے کے بعد روز اول ہی انہیں خلافت و اجازت عطا فرمائی اور فخر و مسرت سے فرمایا کہ "روز قیامت اگر احکم الحاکمین نے فرمایا آل رسول تو میرے لئے کیا لایا ہے؟ تو میں احمد رضا کو پیش کروں گا۔

اس سب کے باوجود امام احمد رضا بریلوی نے سلوک و طریقت کی تعلیم بھی باضابطہ حاصل فرمائی تھی۔

آپ خود فرماتے ہیں:

"جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ میں شرف بیعت سے مشرف ہوا۔ تعلیم طریقت حضور پر نور پیر و مرشد برحق سے حاصل کی۔ ۱۲۹۲ھ میں حضرت کا وصال ہوا تو قبل وصال مجھے حضرت سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری اپنے ابن الابن ولی عہد و سجادہ نشیں کے سپرد فرمایا۔"

(حیات اعلیٰحضرت قدیم ج ۱، ۴۴۔۴۵۔ بریلی شریف)

اس سے معلوم ہوا کہ پیر و مرشد سید آل رسول رضی اللہ عنہ نے تاحیات نہایت اہتمام و توجہ کے ساتھ طریقت کی تعلیم دی اور بعد کے لئے اپنے ولی عہد کے حوالے کردیا اس لئے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے ایسے منازل سلوک و معرفت بھی طے فرمائے جو مرشد کامل کی توجہ کے بغیر طے نہیں ہوتے۔

ہر ولی کے لئے صوفی کامل ہونا ضروری ہے اور ہر صوفی کامل درجہ ولایت پر فائز و گامزن ہوتا ہے۔ کسی بھی ولی کو مدارج علیا حاصل کرنے کے لئے سلوک کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے خواہ سیر الی اللہ کی منزل ہو یا سیر فی اللہ کی، دونوں منزل کی سیر ولی کے لئے ناگزیر ہے۔ امام احمد رضا بریلوی نے اختصار کے ساتھ ان مقامات و مدارج کی نشاندہی فرمائی ہے جو سالکین و واصلین کو درجہ بدرجہ حاصل ہوتے ہیں۔

آپ سے عرض کیا گیا کہ جب طالب سلوک کی راہ چلتا ہے تو درجات فقر میں اول کون سا درجہ حاصل ہوتا ہے پھر کون سا؟ فرمایا، صلحا، سالکین، قانعین، واصلین، اب ان واصلوں کے مراتب ہیں۔ نجباء، نقباء، ابدال، بدلا، اوتاد، امامین، غوث، صدیق، نبی، رسول، تین پہلے سیر الی اللہ کے ہیں باقی سیر فی اللہ کے، اور ولی ان سب کو شامل۔

(الملفوظ حصہ چہارم، ص ۲۲۔ قادری کتاب گھر بریلی)

مقالے کی طوالت دامن کشاں ہے ورنہ میں امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے تصوف اعتقادی اور تصوف عملی پر بھی گفتگو کرتا، یہاں پر ان کے تصوف علمی کی جو جھلکیاں پیش کی گئیں وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی

ہیں کہ امام احمد رضا بریلوی کے علوم بے کراں کے سامنے یہ جھلکیاں دو چار قطروں کے مانند ہیں۔

آخر یہ عرض ہے کہ علما اور صوفیہ کے گروہ ظاہری نظر میں دو جداگانہ گروہ متصور ہوتے ہو ہیں۔علما کی جماعت کو علمائے ظاہر سمجھا جاتا ہے اور صوفیہ کو علمائے باطن۔ میری نظر میں عہد حاضر میں یہ تفریق درست معلوم ہوتی ہے کیوں کہ موجودہ دور میں علمائے باطن کم پیدا ہوتے ہیں،لیکن قرون اولی میں یہ تفریق درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس خیر القرون میں علمائے باطن ہوا کرتے تھے،ان کی زندگیاں عبادات وریاضات اور مجاہدات شاقہ سے مالال ہوتی تھیں۔اس کے برخلاف عہد جدید میں علما تو پیدا ہوتے ہیں مگر ان میں عبادات ومجاہدات کا رجحان نسبۃً کم ہوتا ہے۔قرون سابقہ کے مثل علما میں اگر جذبۂ طاعت وبندگی پیدا ہو جائے تو آج بھی ہماری جماعت میں جنید وبایزید جیسے خدارسیدہ افراد پیدا ہو سکتے ہیں۔

امام احمد رضا بریلوی کا وجود علم ظاہر وباطن دونوں کا سنگم تھا۔ان کے علم وعمل،طہارت وتقویٰ،ریاضت ومجاہدہ،زہد وپرہیز گاری،عشق وعرفاں،خلوص وللہیت،خوف وخشیت،صداقت وراست بازی اور قول وفعل کی یکسانیت کو دیکھ کر عہد ماضی کے صوفیہ اور اسلاف واکابر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ آج کا ظاہر پرست انسان بھی استقامت فی الدین اور اخلاص عمل کی بنیاد پر روحانیت کا پیکر ہو سکتا ہے کیونکہ صوفیائے کاملین میں جنید وشبلی اور بایزید وغیرہ اولیائے کرام کوئی آسمان سے نہیں ٹپکے نہ زمین سے نکلے بلکہ ان کے وجود کو بھی انسانی خون سے نشو ونما ملی،وہ بھی انسانی بستی میں پروان چڑھے،پلے بڑھے مگر یہ کہ وہ فنافی اللہ ہو کر لا فانی جلووں میں گم ہو گئے جس سے ان کو ایسا ثبات ودوام حاصل ہوا کہ ان کا نام جریدۂ عالم پر نقش کالحجر ہو گیا۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۲۳۶ کا

عبد القادر بدایونی نے بھی مولانا کی وفات پر ایک پُر درد مرثیہ کہا ہے۔مولانا کے وصال بحق ہونے کے بعد ان کی نعش کی تدفین کے لئے ان کے بھائی اور پروردہ شیخ محمد حسن نے اپنی ملکیتی اور موروثی زمین (جو زینہ کدل سری نگر میں تھی) کے ایک رقبہ کو مقرر کیا۔ان کے مزار پر ایک روضہ تعمیر ہوا۔[۱۶]

مولانا شیخ یعقوب صرفی کی زیارت گاہ زینہ کدل سری نگر میں محلّہ ایشان صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ان کے یوم وصال پر ہر سال ان کے روضہ پر ایک عرس منعقد کیا جاتا ہے جس میں کشمیر کے عقیدت مند دور دراز علاقوں سے آ کر اپنی عقیدت کا خراج نذر کرتے ہیں اور درود واذکار اور ختمات واوراد میں شریک ہو کر فیض یاب ہوتے ہیں۔

مآخذ ومصادر:

۱۔ خواجہ جی،مقامات حضرت ایشان،مخطوطہ،ورق ب/۱۲۷
۲۔ مفتی محمد شاہ سعادت،حیات صرفی،مطبوعہ،ص:۱۰
۳۔ عبد الوہاب شائق،ریاض الاسلام،مخطوطہ
۴۔ شیخ یعقوب صرفی،مغازی النبی،مخطوطہ،ورق،ب/۵
۵۔ ایضاً،ورق ب/۴
۶۔ شیخ یعقوب صرفی،مسلک الاخیار،مخطوطہ،ص:۱۵
۷۔ مفتی محمد شاہ سعادت،حیات صرفی،چاپ لاہور،ص:۳
۸۔ شیخ یعقوب صرفی،مغازی النبی،ورق ا/۶
۹۔ شیخ یعقوب صرفی،مغازی النبی،مخطوطہ،ورق ا/۶
۱۰۔ دیوان صرفی بکوشش حبیب اللہ کامل،مطبوعہ سری نگر ۱۳۸۷ھ
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ مولانا شیخ یعقوب صرفی،مثنوی لیلیٰ مجنوں،مخطوطہ،ورق ا/۹
۱۳۔ خواجہ جی،رسالہ تصوف،مخطوطہ،ورق/۲۰۹
۱۴۔ ایضاً۔ورق ب/۲۰۹
۱۵۔ میر حسین قادری مؤلف فتوحات قادریہ نے آستانہ عالیہ کی تجدید عمارت کی
۱۶۔ لگتا ہے کہ اس خانقاہ کو اب ایک مسجد کی صورت میں تبدیل کیا گیا ہے اور مولانا صرفی کا روضہ اسی مسجد کے ایک حصے میں ہے۔

❁❁❁

عہد جدید کے نامور صوفی

مولانا شاہ عین القضاۃ نقشبندی لکھنوی

قاضی غلام صابر قدیری سندیلوی

شہر لکھنؤ جہاں اپنی تہذیب وثقافت، علمی سرگرمیوں اور انسانی رواداری و بھائی چارگی کے لئے سارے عالم میں مشہور ہے وہیں یہ تاریخی شہر صدیوں سے اولیائے کرام کا مسکن بھی رہا ہے، حضرت حاجی الحرمین شیخ قوام الدین چشتی سہروردی، قطب لکھنؤ حضرت مخدوم شاہ مینا، حضرت شاہ پیر محمد، حضرت شاہ دوست محمد عرف شاہ دوی اور نظریۂ وحدت الوجود کے عظیم شارح حضرت شاہ عبدالرحمٰن الموحد لکھنوی جیسے مشہور زمانہ بزرگان دین نے اپنی روحانی تعلیمات، اخلاقی سرگرمیوں، انسان دوستی، خدمت خلق اور محبت وآشتی کے پیغام سے اس شہر اور اس کے رہنے والوں کو مالامال کیا ہے۔ صوفیائے صافی کے اس مقدس قافلے میں حضرت مولانا شاہ سید عین القضاۃ نقش بندی کی پاکیزہ روحانی شخصیت بھی شامل ہے۔ آپ نے عہد جدید میں لکھنؤ شہر کی روحانی عظمت وشہرت میں زبردست اضافہ کیا اور لاکھوں بندگان خدا کو اپنے کمالات باطنی نیز ہزاروں تشنگان علوم دینیہ کو معرفت قرآنی سے فیضیاب کیا۔

لکھنؤ کے قدیم علاقے چوک بازار میں واقع مدرسہ عالیہ فرقانیہ اپنے قیام کی ابتداء سے شہر کی ممتاز علمی ودینی درسگاہوں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ قرآن کریم کی قرأت وتجوید سے متعلق اس معروف ادارہ کا نام آتے ہی اس کے بانی مولانا شاہ سید عین القضاۃ مجددی نقشبندی کا ذکر فوراً زبان پر آجاتا ہے۔ جدید لکھنؤ کے علما وصوفیا میں مولانا کی شخصیت بڑی نمایاں حیثیت کی حامل ہے، اب سے کچھ عرصہ قبل لکھنؤ میں متعدد ایسے لوگ حیات تھے جنھوں نے شاہ صاحب کی زیارت کی تھی۔ حضرت عین القضاۃ کا شمار شہر کی ان مقدس اور پاکیزہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اسلامی روایات اور تصوف کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے نیز یہاں کے عوام وخواص پر انسانیت، محبت، اخوت اور رواداری کے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

مولانا سید عین القضاۃ جنوبی ہند کے رہنے والے تھے۔ خاندانی اعتبار سے آپ صحیح النسب اور نجیب الطرفین سید تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت سیدنا غوث اعظم قدس سرہ سے ملتا ہے۔ مولانا کے آبا واجداد پہلے بے جاپور کے علاقہ گولکنڈہ میں رہتے تھے مگر بعد میں حیدرآباد دکن میں آباد ہو گئے تھے۔ مولانا کے والد ماجد حاجی سید محمد وزیر علی نہایت درویش صفت اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ خودداری ان کا خاص وصف تھی۔ سابق نظام دکن میر افضل الدولہ آپ کے بڑے معتقد تھے اور انہوں نے سید صاحب کو ایک موضع بطور معافی عطا کیا تھا۔ بعد میں سید وزیر علی کچھ عرصہ کے واسطے مکہ مکرمہ منتقل ہو گئے۔

مولانا شاہ عین القضا کی پیدائش حیدرآباد دکن میں ۲۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ مطابق ۳ نومبر ۱۸۵۸ء بروز چہارشنبہ ہوئی۔ ابھی تین سال کی ہی تھے کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا چنانچہ والد صاحب انھیں اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے گئے، مولانا نے اپنے بچپن کے گیارہ سال اسی مقدس شہر میں گزارے اور وہیں آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ جلد ہی ناظرہ قرآن سے فارغ ہو کر عربی، فارسی اور اردو سے بخوبی واقفیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے والد ماجد کے ہمراہ ہندستان واپس آ کر کچھ عرصہ بمبئی میں مقیم رہے۔ تھوڑے دنوں بعد آپ دونوں لکھنؤ آگئے جو اس وقت دینی علوم کا مشہور مرکز تھا۔ فرنگی محل کا شہرہ سارے عالم میں تھا۔ ان دنوں یہاں حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی کی شخصیت یکتائے روزگار تھی اور وہ اپنی عالمانہ عظمت، تقوی اور روحانی کمالات۔ کے باعث تیرہویں صدی ہجری کے مرتبہ مجددیت پر فائز شمار کیے جاتے تھے۔ کثیر تعداد میں دور دور سے طلبا آپ سے حصول علم کی خاطر لکھنؤ آتے تھے۔ سید وزیر علی صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر بیرون فرنگی محل گلی پارچہ میں (موجودہ کٹوریہ اسٹریٹ کی جانب) واقع مسجد ملا مبین میں قیام کیا اور اپنے بیٹے کو مولانا عبدالحئی صاحب کے حلقۂ درس میں شامل کرا دیا، سید عین القضاۃ صاحب ان کی شاگردی میں

بڑی ہی ذہانت، خوش طبعی اور نہایت ہی انہماک کے ساتھ تقریباً ایک دہائی تک کسب علم کرتے رہے۔ ۱۸۸۴ء میں جب مولانا عبدالحئی صاحب نے رحلت فرمائی تو مولانا عین القضاۃ صاحب کو ان کے شاگردوں میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ مولانا نے باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا سینکڑوں طلبا آپ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ آپ کو عربی اور فارسی زبانوں اور ادب پر عبور حاصل تھا۔ اس میدان میں آپ کو اس دور کے مشہور عالم اور ماہر ادبیات شمس العلما فخر ادب مولانا مفتی سید محمد عباس کی بھی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔

مولانا کو قرآن کریم سے قلبی لگاؤ اور عشق تھا اور اسی تعلق خاطر کی بنا پر آپ نے اس مقدس کتاب اللہ کی تعلیم کو وسیع پیمانے پر فروغ دینے کا عزم محکم کیا، اس مقصد کی تکمیل کے لئے آپ نے اپنے والد محترم کی حیات میں ان ہی کی سرپرستی میں ۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ فرقانیہ قائم کیا۔ عمارت کا سنگ بنیاد سید وزیر علی صاحب نے ہی رکھا۔ ۱۹۱۰ء میں عمارات بن کر تیار ہوئیں۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء کو جب وزیر علی صاحب کا انتقال ہوا تو اس وقت تک یہ مدرسہ معمولی حالت میں چل رہا تھا۔ سید صاحب کی تدفین اسی مدرسہ کے صحن کے ایک گوشے میں ہوئی۔ اس وقت تک اس مدرسہ میں چند مدرسین اور بہت کم تعداد میں طلبا تعلیم پاتے تھے۔ والد بزرگوار کے وصال کے بعد مولانا سید عین القضاۃ نے اس ادارے کو وسعت دینے کا منصوبہ بنایا۔ ناظرۂ قرآن، حفظ قرآن اور قرأت وتجوید کے ساتھ ساتھ دیگر اسلامی علوم کی تدریس کا انتظام بھی کیا گیا۔ مختلف میدانوں کے ماہر اساتذہ منتخب کیے گئے۔ درس نظامی کی تدریس بھی ہوتی تھی مگر قرآن کریم کے حفظ اور قرآت پر خصوصی توجہ تھی، تھوڑی ہی مدت میں یہ مدرسہ نہ صرف برصغیر بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی مشہور ہو گیا۔ ملک اور بیرون ملک کے مایہ ناز قراء اور فن تجوید کے ماہر اساتذہ کو اس درس گاہ کی خدمت کا فخر حاصل رہا ہے۔ قرآن پاک سے مولانا کا عشق اس درجہ پہنچا ہوا تھا کہ آپ ہر طالب علم سے بے حد محبت اور اساتذہ کا زبردست احترام کرتے تھے۔ جب طلبا آپ کو قرأت کے مختلف لہجوں میں قرآن کریم سناتے تو آپ نہایت خوشی اور وجد کے عالم میں کہتے کہ یہ ہمارے قوال ہیں۔ آپ کے اخلاق نے تمام اساتذہ کو آخر دم تک مدرسہ سے وابستہ رکھا۔

زندگی بھر مولانا نے مدرسہ کے جملہ اخراجات از خود برداشت کیے۔ اس وقت کا ماہوار خرچ کئی ہزار روپے سے کم نہ تھا۔ کہیں سے کسی قسم کا چندہ یا تعاون نہیں لیا جاتا تھا۔ کئی بار متعدد صاحب ثروت حضرات، تجار، روسا، امرا اور والیان ریاست نے مدرسہ فرقانیہ کی مالی امداد کی خواہش ظاہر کی مگر مولانا عین القضاۃ صاحب نے کبھی کسی کی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ ایک مرتبہ جب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال لکھنؤ تشریف لائیں تو انھوں نے مولانا سے ملاقات کی اور مدرسہ کی مالی خدمت کی خواہش ظاہر کی مگر مولانا نے یہ کہہ کر کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں یا میرا مدرسہ سوائے اللہ کے اور کسی کا محتاج نہیں۔ اس لئے آپ اس پیسے کو کسی اور نیک کام میں صرف کریں۔ اسی طرح ایک بار خان بہادر حافظ محمد حلیم صاحب رئیس اعظم کانپور نے مدرسہ کی امداد کے لئے دس ہزار روپیہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا مگر آپ نے اس کو قبول نہ فرمایا۔ مدرسہ کے واسطے مولانا نے ایک شاندار کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جس میں قرآنیات، احادیث، فقہ، عربی، فارسی اور اردو سے متعلق بے شمار کتابیں تھیں۔ طلبا کو اور بھی سہولتیں دستیاب تھیں۔ مستحقین کو وظائف دیے جاتے تھے۔ اگر چہ آپ کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا مگر مدرسہ کی جملہ ذمہ داریاں آپ خود پوری کرتے تھے۔ ہر سال فارغ التحصیل حفاظ وقرا کی شان دار تقریب میں دستار بندی ہوتی تھی اور انھیں اسناد وانعامات سے نوازا جاتا۔

جیسا کہ شروع میں عرض ہوا مولانا سید عین القضاۃ نے تعلیم سے فراغت کے بعد فرنگی محل میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب مدرسہ فرقانیہ قائم کیا تو وہاں بھی ابتدائی برسوں میں وہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ مولانا نہایت ہی ذہین اور اعلیٰ علمی ذوق کے حامل تھے۔ درس کے دوران آپ مختلف مسائل پر حواشی اور شرحیں تحریر فرماتے جاتے تھے۔ آپ ہر بات کو صحیح طریقہ پر سوچنے سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے عادی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر عبارت اور مقام کو سمجھانے میں پوری طرح ان کے استاد مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا رنگ جھلکتا تھا۔ چوں کہ مولانا عین القضاۃ صاحب کی طبیعت شروع سے ہی عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھی اس لئے درس وتدریس کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ پھر بھی آپ کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی

جن میں کچھ ممتاز شخصیتیں بھی ہوئیں جیسے شمس العلما حافظ محمد عبد المجید فرنگی محلی سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ، لکھنؤ کے اس وقت کے ممتاز عالم دین اور پیر طریقت نیز راقم الحروف کے زبردست کرم فرما مولانا ابوالقاسم محمد عتیق میاں صاحب فرنگی محلی کے والد ماجد شمس العلما ابوالمجاہد حضرت مولانا محمد عبد الحمید فرنگی محلی بانی مدرسہ قدیمیہ ٹکسال لکھنؤ، برصغیر کے مشہور عالم دین، آزادیٔ وطن کے عظیم مجاہد اور علی برادران رئیس الاحرار مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کے پیر طریقت اور ہم سب کے محبوب رہنما حضرت مولانا جمال میاں صاحب کے والد بزرگوار حضرت مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی، مولانا عبد الہادی انصاری نبیرۂ ملا مبین، شفاء الملک حکیم محمد وہاج الحق بانی جامعہ طبیہ وہاجیہ فرنگی محل اور حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحب فاروقی کا کوروی قائد و رہنما تحریک مدح صحابہ و بانی مدرسہ دار المبلغین پاٹانالہ لکھنؤ، حکیم خواجہ کمال الدین لکھنوی، حکیم مرزا محمد مہدی لکھنوی اور لسان الہند مرزا محمد ہادی المتخلص بہ حضرت عزیز لکھنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ مدرسہ کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد زبردست روحانی سرگرمیوں کے باعث مولانا عین القضاۃ صاحب کے علمی مشاغل کا سلسلہ تقریباً بند ہوگیا تھا تاہم آپ کی کئی تصانیف کے حوالے بھی کتب ورسائل میں ملتے ہیں۔ مثلاً حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت، مصنفہ ۱۸۸۵ء یعنی فارغ التحصیل ہونے کے بعد عربی زبان میں تحریر فرمائی۔ نخبۃ المعارف فی تحریم الاغنیۃ والمعارف، البیان الصائب فی تفسیر الغائب مطبوعہ ۱۹۰۴ء۔ نہایۃ الارشاد الی احتفال المیلاد، مطبوعہ ۱۹۱۹ء، جس میں نقلی و عقلی دلائل سے انعقاد محفل میلاد اور اس میں قیام کو مستحب ثابت کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور تصنیف 'فتویٰ جماعت نماز تہجد در ماہ رمضان المبارک' بھی ہے جس میں دوران رمضان شریف نماز تہجد با جماعت ادا کرنے اور اس میں قرآن پاک سنانے کو صحیح و جائز ثابت کیا ہے جیسا کہ آپ خود اس پر عمل پیرا تھے۔

مولانا عین القضاۃ صاحب کا ذکر جب اور جس انداز میں بھی ہوگا آپ کی اہتمام کردہ ان دعوتوں کا ذکر ناگزیر ہے جو آپ مختلف موقعوں پر کیا کرتے تھے۔ سال میں متعدد مرتبہ ان عام ضیافتوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ آپ کو یہ شوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ مولانا نے اس سنت پدری کو نہ صرف جاری و ساری رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ شروع میں یہ ضیافتیں چھ سات موقعوں پر ہوتی تھیں مگر بعد میں مدرسہ کے اخراجات میں زبردست اضافے کے سبب انہیں سال میں تین مرتبہ تک محدود کر دیا گیا۔ سب سے بڑی دعوت عام ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کے مبارک موقع پر ہوتی تھی جس میں دس بارہ ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ دوسری دعوت عام کا اہتمام گیارہویں شریف کے موقع پر ہوتا تھا اور تیسری عام دعوت اپنے پیر و مرشد کے سالانہ فاتحہ عرس کے موقع پر کرتے تھے۔ یہ دعوتیں نہ صرف شہر بلکہ لکھنؤ کے آس پاس کے علاقوں تک مشہور تھیں۔ شہر اور بیرون شہر کے ہزاروں لوگ ان دعوتوں میں شریک ہوتے اور اسے اپنے لئے باعث فخر سمجھتے۔

مولانا کا تعلق روحانی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سے تھا۔ آپ ترکیسر ضلع سورت (گجرات) کے مشہور نقشبندی بزرگ حضرت موسیٰ جی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور اس سلسلہ میں انہیں اپنے مرشد سے باقاعدہ خلافت واجازت حاصل تھی۔ پیر و مرشد سے اپنی بے پایاں روحانی وابستگی کا اظہار وہ اپنی محافل میں اکثر و بیشتر کیا کرتے تھے۔ شروع میں ان کے عرس کے موقع پر سورت تشریف بھی لے جاتے تھے مگر بعد میں جیسا کہ اوپر عرض ہوا لکھنؤ میں اپنے مدرسے میں ہی اپنے شیخ کا عرس کرتے تھے۔ آپ کو سلسلہ نقشبندیہ کے امام حضور سیدنا شیخ احمد سرہندی المعروف بہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے خصوصی باطنی تعلق تھا، چناں چہ مولانا عین القضاۃ صاحب ہر سال عرس مجدد کے موقع پر شرکت کی غرض سے اپنے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبا کا قافلہ سرہند شریف روانہ کرتے تھے تا کہ وہاں بموقع قرآن خوانی اور قل اپنے فن قرأت کا مظاہرہ کریں۔ مولانا اس مقصد کے لئے ہر سال کثیر رقم خرچ کرتے۔ شروع میں مولانا عربی میں حضرت مجدد کے شان میں ایک قصیدہ کہہ کر اور اسے خوشخط لکھوا کر یا کبھی کبھی چھپوا کر وفد کے ساتھ سرہند بھیجتے تھے۔ روانگی سے قبل لکھنؤ سرہند تک ریل گاڑی کی کئی بوگیاں ریزرو کروائی جاتیں اور جملہ سامان ضروریات ساتھ ہوتا۔ مولانا کا حکم تھا کہ لکھنؤ سے جو شخص بغرض شرکت عرس سرہند شریف حاضر ہو اس کو اس وفد کا مہمان بنایا جائے۔ سرہند میں بھی خاص قل

سے قبل ایک عام دعوت مولانا سید عین القضاۃ لکھنوی کی طرف سے کی جاتی۔ جس میں وہاں آئے ہوئے معزز مہمانان وزائرین اور مقامی علما ومشائخ بھی شریک ہوتے تھے۔ آپ نے درگاہ عالیہ مجددیہ سرہند شریف میں اس وفد کے قیام کی غرض سے متعدد کمرے اور مکان بھی تعمیر کرادیے تھے۔ بحمد اللہ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔

جیسا کہ ابتداء میں عرض ہوا مولانا عین القضاۃ صاحب کا رجحان اور میلان عبادت و ریاضت کی طرف شروع سے تھا۔ نماز پنج گانہ پابندیٔ وقت سے باجماعت ادا کرتے تھے۔ رمضان المبارک میں تراویح اندرون چوک واقع مسجد داروغہ حیدر بخش میں پڑھتے۔ تہجد کی نماز باجماعت مدرسہ فرقانیہ سے متصل مسجد میں پڑھتے جس میں دور دور سے لوگ آکر شریک ہوتے۔ عیدین اور نماز جمعہ آپ (اندرون سبزی منڈی چوک) کی مسجد میں ادا کرتے۔ ہر آنے والے کو نماز کی تاکید کرتے۔ مولانا احکام شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ آپ کا ایک ایک عمل شریعت کا تابع ہوتا۔ اگرچہ آپ اپنے مرشد کے باقاعدہ خلیفہ مجاز تھے مگر ساری زندگی شاید ہی کسی کو مرید کیا ہو۔ مولانا بڑے ہی قناعت پسند اور متوکل واقع ہوئے تھے۔ زندگی نہایت سادہ گزارتے تھے۔ غذائیں نہایت سادی قلیل اور سستی کھاتے۔ گراں اور قیمتی چیزوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے۔ کسی سے بھی اپنا ذاتی کام نہیں لیتے۔ کمرے میں صرف ایک ٹاٹ کا فرش بچھا ہوتا۔ ہر آنے والا خواہ امیر ہو یا غریب اسی ٹاٹ پر بیٹھتا۔ جاڑوں میں ایک یا دو کمبل پر اکتفا کرتے۔ آپ بڑے ہی خوش اخلاق واقع ہوئے تھے۔ ہر آنے والے کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ ہر مذہب وملت اور مسلک وفرقہ کے لوگ آپ کے پاس آتے اور آپ کے اخلاق سے متاثر ہوکر نہایت خوش خوش واپس جاتے۔ نماز عصر کے بعد سے نماز مغرب تک آپ کا دربار عام ہوتا۔ ہر شخص بلاتکلف اور بغیر اطلاع آپ کے پاس جاسکتا تھا۔ بعد مغرب آپ کسی سے بھی نہیں ملتے۔ کوئی بھی حاجت مند آپ کی خانقاہ سے غیر مطمئن واپس نہیں جاتا۔ بیماروں کو پانی دم کر کے دیتے۔ علما اور صالحین کا ہمیشہ کھڑے ہوکر استقبال کرتے تھے۔ ایثار وکرم کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو اپنے پیچھے نہ چلنے دیتے۔ مولانا کو شہرت، نمود اور تعریف سے سخت نفرت تھی۔ اگر کوئی آپ کے فیوض بیان کرتا یا آپ کی مدح سرائی کرتا تو آپ منع فرماتے۔ اگر کوئی شخص آپ کو ولی بتاتا تو آپ سخت ناراض ہوتے۔ اپنے اکثر کام آپ اپنے ہاتھوں ہی کرتے۔ خاص خاص خدمات آپ کے خادم خاص حاجی عبدالقادر انجام دیا کرتے تھے۔

زبردست عبادت وریاضت اور مجاہدات کی کثرت کے باعث مولانا کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اگرچہ عمر ابھی سرسٹھ سال کی تھی مگر کافی ضعیف معلوم ہوتے تھے۔ اس کے باوجود سوائے عام کمزوری اور ضعف اعضاء کے آپ کو کوئی مرض یا تکلیف لاحق نہ تھی۔ ۲ رجب المرجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء بروز چہارشنبہ کا واقعہ ہے کہ بعد نماز عصر ایک ممتاز ایرانی شیعہ عالم حضرت سید اسد اللہ نجفی شیرازی آپ کے پاس بغرض زیارت وملاقات آئے۔ تعارف ہونے پر مولانا نے انتہائی کمزوری کے باوجود حسب عادت ان کا کھڑے ہوکر استقبال کیا اور انہیں اپنے پاس اپنے سجادہ پر بٹھایا۔ دونوں میں علوم دینی اور معرفت الٰہی پر کچھ گفتگو ہوئی۔ ترک دنیا پر دونوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے اظہار کیا۔ بات چیت جاری تھی کہ مہمان ایرانی عالم نے مولانا سید عین القضاۃ کو اللہ رب العزت کی تعریف وتوصیف اور معرفت میں حضرت امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک قصیدے کے چند اشعار خوش الحانی سے سنانے کی خواہش ظاہر کی، اس قصیدہ میں ترک دنیا کی تعلیم بھی بیان کی گئی تھی۔ حضرت کی اجازت سے مولانا نجفی نے یہ اشعار سنانا شروع کیے جن کو سن کر عین القضاۃ صاحب وجد میں آگئے۔ جوں جوں مولانا اسد اللہ نجفی اشعار سناتے جاتے مولانا عین القضاۃ صاحب کے وجد اوران کی کیفیت حال میں اضافہ ہوتا جاتا۔ جب اس قصیدے کا چوتھا شعر۔

کلّ موتیٰ کلّ موتیٰ　　　　کلُّ فوتیٰ کلُّ دفنا

پڑھا تو مولانا فوراً قبلہ رو ہوکر سربسجود ہوگئے اور خاصی دیر تک اسی حالت میں رہے۔ جب دیر تک نہ اٹھے تو حاضرین محفل کو تشویش ہوئی اور انہوں نے دیکھا۔ مولانا سید عین القضاۃ صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی اور آپ ایک تارک الدنیا کی حیثیت سے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرچکے تھے۔ یعنی آپ وصال فرماچکے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ انتقال پرملال کی خبر عام ہوتے ہی معتقدین اور جاں نثاروں کا جم غفیر مدرسہ فرقانیہ کی طرف امنڈ پڑا۔ ہر خاص وعام سوگوار تھا۔

سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ ۳ رجب مطابق ۲۹ جنوری کو ہزاروں غم گساروں کی موجودگی میں نماز جنازہ ہوئی اور مولانا کو مدرسہ فرقانیہ کے صحن میں ان کے والد سید وزیر علی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا عین القضاۃ لکھنوی کی وفات پر لکھنؤ اور دوسری جگہوں کے متعدد نامور شعرا نے تاریخیں کہیں اور اپنی اپنی نظموں میں مولانا سے اپنی اپنی عقیدت کا اظہار نیز ان کے سانحہ ارتحال پر اظہار غم کیا۔ لیکن اس وقت کے مشہور شاعر اور دبستان لکھنؤ کے امام نیز حضرت مولانا کے شاگرد 'لسان الہند' مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کی کہی ہوئی تاریخ وفات اپنی جگہ پر بے مثال ہے۔ فارسی زبان میں کہے گئے یہ اشعار حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب علیہ الرحمہ کے مزار پر سرہانے کندہ ہیں۔

عین قضاۃ بحر کرامت — قلزم علم و چشمۂ حکمت
صوفی صافی مرشد کامل — فاضل فاضل عالم عامل
عین الاعیان درس اکابر — فرد زماں مولائے مفاخر
مہر سپہر فضل و شرافت — پایہ فراز علم و فضیلت
پردہ کشائے راز حقیقت — صدر نشیں محفل خیرت
کوہ تمکین آیت تقویٰ — نور نگین ملت بیضاء
مفتخر از وے علم عقلی — روشن ازوے بزم نقلی
سجدہ چکیدہ از پیشانی — رخت بہ بست از دار فانی
ہذا قول حسن محکم — موت العالم موت العالم
گل از باغ عرفاں چیدہ — گوشۂ خلوت رابگزیدہ
چوں غم او تا چرخ رسیدہ — جامۂ بہ خم نیل کشیدہ
گفت عزیز ایں سال رحلت — ''زیر زمیں شد مہر ملت''

۱۳۴۳ھ

مولانا سید عین القضاۃ صاحب کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے۔ آپ کا قائم کردہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ بحمد اللہ پوری شان وشوکت کے ساتھ درس قرآن کریم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ آپ کے وصال کے بعد سے مدرسہ کی جملہ مالی ذمہ داریاں عطریات کی مشہور زمانہ فرم اصغر علی محمد علی کے مالکان برداشت کرتے ہیں۔ جب ۱۹۳۸ء میں اپنے وطن سندیلہ سے اپنے والد بزرگوار قاضی اعظم علی صاحب مرحوم (المتوفی ۱۹۶۴ء) کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہوئے تو تمام اولیاء لکھنؤ کے مزارات مقدسہ پر حاضری دی۔ حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔ تب سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ حضرت مولانا اور آپ کے والد سید وزیر علی دونوں کے مزارات بالکل کھلے آسمان کے نیچے ایک کشادہ چبوترے پر واقع ہیں۔ مولانا کے مزار پر اس قدر روحانی کشش ہے کہ حاضر ہوتے ہی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میرے پیر و مرشد حضرت سیدنا مولانا شاہ عبد القدیر میاں پیلی بھیتی قدس سرہٗ (المتوفی ۷ مئی ۱۹۶۵ء) لکھنؤ تشریف لائے تو وہ بھی اولیائے لکھنؤ کے مزارات کی زیارت کی غرض سے مولانا شاہ عین القضاۃ صاحب کے مزار پر تشریف لے گئے اور کافی دیر مراقب رہے۔ بعد ازاں آپ نے حضرت مولانا کے بے حد روحانی اوصاف بیان فرمائے اور مجھ کو اس روحانی مرکز سے تعلق بنائے رکھنے کی ہدایت کی۔ بحمد اللہ یہ تعلق قائم و دائم ہے۔

چوں کہ اللہ رب العزت نے راقم الحروف کو نثر کے ساتھ نظم میں بھی اپنی بات کہنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے اس لئے وہ اپنے مندجہ ذیل اشعار میں حضرت مولانا عین القضاۃ علیہ الرحمہ سے اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔

اللہ اللہ کیا ہے شان حضرت عین القضاۃ
ہے دل ارباب حق میں عظمت عین القضاۃ
عاشق تجوید قرآں، بانی فرقانیہ
لحن و قرأت ہیں رہین نصرت عین القضاۃ
مرحمت فرما دیا تھا حق نے ان کو دست غیب
ہوگئی مشہور عالم دعوت عین القضاۃ

❁❁❁

سید المشائخ حضرت سید وامق میاں

سید اسلم میاں وامقی .... نائب سجادہ نشین، خانقاہ اشرفیہ وامقیہ، بریلی شریف

بریلی اپنی علمی وادبی قدر وعظمت کے اعتبار سے ہمیشہ ہندوستان کا اہم ترین خطۂ ارض رہا ہے، ہمالیہ کے دامن میں سایہ پذیر شہر بریلی ادبی، ثقافتی، معاشرتی ترقیات کے اعتبار سے بہت اہم ہے اگر ہم اس کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ شہر ادوار ماضی میں مشرقی تہذیب و تمدن کا سنگم اور ایشیائی علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ اس عظیم خطہ کا نام روہیلوں کی نسبت سے ۱۷۴۲ء میں روہیلکھنڈ رکھا گیا یہاں آج سے تین ہزار سال قبل آریاؤں کی حکومت تھی اور یہ علاقہ حکومت پانچال کا ایک اہم حصہ تھا جس کی راجدھانی شہر اہچھترا ویدوں کی تعلیمات کا مرکز تھا اور یہاں سے بڑے بڑے اپدیشک اور مبلغین بلخ و بخارا، افغانستان اور سمرقند بھیجے جاتے تھے۔

اس شہر پر ۱۷۰۷ء سے ۱۷۷۴ء تک روہیلہ نوابوں نے حکومت کی اور اس دوران انہوں نے اس منطقہ میں عدل و انصاف، مساوات، ادب پروری، مساجد ومقابر کی تعمیر بڑی فراخ دلی سے کی۔ اس حکومت کے روح رواں حافظ الملک حافظ رحمت خاں خود علمی وادبی میدان میں اپنا مقام رکھتے تھے اور ان کے اخلاف بطور خاص بلند پایہ شاعر اور عظیم ترین انشا پرداز تھے اس لئے اس خطۂ ارض میں ایسا علمی و ادبی ثقافتی وسماجی ماحول پیدا ہوا جس نے بریلی کو شاہکار تصانیف اور عدیم المثال تخلیقات سے نوازا۔ انہی علمی وادبی سرگرمیوں کے باعث ایران، افغانستان، سمرقند، بخارا، ترکستان اور بغداد کے بڑے بڑے نامور ادبا، شعرا اور صوفیائے کرام بڑی تعداد میں یہاں آئے اور یہاں علمی وادبی اور ثقافتی ماحول سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنا وطن عزیز قرار دیا۔ ایسی عدیم النظیر شخصیات میں جلال الدین خاں محدث، سید علی شاہ ترمذی، شاہ دانہ ولی، شاہ نیاز احمد نیاز، اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں محدث بریلوی، سعید اللہ خاں سر فہرست ہیں۔ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس کی علمی وادبی فضا نے ایسی کشش پیدا کی جس کی مستی آج بھی ان کے خوشہ چینیوں میں موجود ہے۔ اس منطقہ کا چپہ چپہ مبارک ومسعود روایات کا حامل ہے یہ جہاں پہلے اقوام کے لئے علوم و فنون کا علمبردار تھا اسی طرح آج بھی عوام الناس کی رہنمائی کر رہا ہے۔

بریلی کی خصوصیت یہ ہے کہ علوم ظاہری کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کا بھی مرکز ہے، تصوف، اخلاقیات، ولایت، ارادت کے بڑے بڑے جید امام اس سرزمین سے اٹھے ہیں جنہوں نے ادب وثقافت میں اہم کام کیے ہیں ان کے پیغام سے سارا عالم مستفید ہوا ہے۔

اس مذکورہ بالا جائزہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرزمین بریلی کی مناسبت سے خانوادۂ سید المشائخ حضرت سید وامق میاں نے جو علم وادب اور طریقت وسلوک میں جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً لائق صد تحسین ہیں اور ہندوستان میں ان کا بہت ہی غیر معمولی مقام ومرتبہ ہے۔ وامق میاں کے آباؤ اجداد کی وہ ذات گرامی ہے جنہوں نے روہیلکھنڈ بریلی کی سرزمین پر طریقت وسلوک کا چراغ روشن کیا جس کی لو ان کے فرزند ارجمند ظل علی عرف نشاط میاں اشرفی جیلانی نے تادم زیست مدھم نہ ہونے دیا۔

حضرت سید المشائخ کی ولایت باسعادت بریلی (روہیلکھنڈ) میں ہوئی۔ آپ نجیب الطرفین حسنی وحسینی سید ہیں۔ تیئیسویں پشت میں حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے توسط سے آپ کا آبائی سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد امجد حضرت سید قادری بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بغداد (عراق) سے روہیلکھنڈ وارد ہوئے اور یہاں خانقاہی نظام قائم کرنے کے ساتھ طریقت وسلوک کی ترویج واشاعت کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید مردان علی قادری اپنے عہد کی تاریخ ساز شخصیت تھی۔ عبادت وریاضت، زہد وتقویٰ، فقر وغنا، جود و

سخا، ایمان وایقان اور علم وعمل میں یکتائے روزگار تھے، علوم وفنون کا اکتساب والد ماجد سے فرمایا اور علم تکسیر، علم جفر اور شعر وشاعری میں مہارت کاملہ طبع سلیم کی بنا پر فرمائی اور طریقت وسلوک کے لئے کچھوچھہ مقدسہ کا رخ کیا اور ہم شبیہ غوث الاعظم اعلیٰ حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی میاں کچھوچھوی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور مرشد اعلیٰ آپ کے تقویٰ وطہارت اور علم وعمل کو دیکھ کر اجازت وخلافت سے نوازا۔ تین بار حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے جس کا اظہار انہوں نے اپنے نعتیہ دیوان ''توصیف سرکار عرب ۱۳۳۹ھ میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ۱۹۰۸ میں شہامت گنج بریلی میں خانقاہ وامقیہ اشرفیہ قائم فرمائی اور یہاں سے سینکڑوں تشنگان علوم وفنون کو سرفراز فرمایا۔ اس دور میں بریلی (روہیل کھنڈ) میں بڑے بڑے مدارس اور خانقاہیں تھیں مگر علوم وفنون کے تشنگان کثیر تعداد میں حاضر ہوکر علوم معقول اور شعر وشاعری میں کمال حاصل کرتے تھے۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد متعین کرنا بے حد مشکل ہے کیونکہ آپ کے عہد میں طلبا کے رجسٹر کا کوئی اہتمام نہیں تھا اور موصوف بھی خود ریا سے اجتناب کرتے تھے۔

سید المشائخ کو شریعت وطریقت میں جو بالغ نظری حاصل تھی اس کا اظہار آپ نے کبھی نہیں فرمایا۔ شریعت مطہرہ کی پاسداری میں انہوں نے جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں وہ ارباب علم ودانش پر مخفی نہیں۔ آپ نے شریعت وطریقت کی منازل اپنے والد ماجد سید مردان علی قادری اور سید اشرفی میاں جیلانی کی رہنمائی میں طے کی اور طریقت کے جس اہم مقام پر آپ پہنچے ہیں وہ بھی آپ کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ آپ نے اپنی روحانی تعلیم سے اپنے وابستگان کو اللہ ورسول کا خوف، اتباع سنت سے محبت، حرام وحلال کی تمیز، لب ولہجہ میں صداقت پیدا فرمائی۔ آپ کی بارگاہ عظیم سے خوشہ چینی کرنے والوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو آپ بھی برصغیر پاک وہند میں مشعل راہ ہیں۔

سید المشائخ بنیادی طور پر خانقاہی تھے انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس ماحول میں بزرگوں کی آمد، طریقت وسلوک کی رہنمائی، دعا تعویذ لینے والوں کا ہجوم، عقیدت مندوں کی بھیڑ، اعراس، نذر ونیاز جیسی رسومات کی بڑی اہمیت تھی آپ کا ان رسومات سے متاثر ہونا اور ان میں انہماک آپ کی حیات کا لازمی عنصر تھا ان سب کے باوجود ان کا ادبی پایہ بہت اعلیٰ تھا اور فن شاعری سے انہیں بڑی حد تک واقفیت تھی ان کی اس صلاحیت کا اندازہ ان کے نعتیہ دیوان ''توصیف سرکار عرب ۱۳۳۹ھ'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ نعت کا تقدس جذبات سے بعید اور بے راہ روی سے محفوظ ہے۔ بعض اصحاب شعر وسخن نعت میں لغویات سے کام لیتے ہیں ہیں جبکہ لغویات اور دیگر خارجی مضامین سے نعت کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی شاعری کا لب ولہجہ بالکل اسلامی رنگوں میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ سوز وگداز، فصاحت وبلاغت، جذب وکشش ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی اصول وضوابط کی کسوٹی پر کسا ہوتا ہے چونکہ سید المشائخ کی نعتیہ شاعری قرآن وحدیث کی روشنی میں ہوتی ہے۔

سید المشائخ کو اردو فارسی دونوں زبانوں میں مہارت کاملہ حاصل تھی اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار دونوں زبانوں میں فی البدیہہ فرماتے۔ فارسی شاعری میں وہ اپنا تخلص زائر اور اردو شاعری میں وہ اپنا تخلص وامق استعمال کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا محور پیغمبر اسلام کی ذات گرامی تھی اور ان کی والہانہ شاعری سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات تھے اور پاس ادب کا یہ عالم تھا کہ مکمل دیوان میں کسی بھی مقام پر لفظ ''محمد'' نہیں قلم بند فرمایا بلکہ اس لفظ کے تحریر کرنے کو خلاف ادب تصور کیا۔ آپ کی اردو شاعری کا تمام تر حصہ نعت، حمد، منقبت، رباعی، قطعات وغیرہ سے متعلق ہے اور اس دیوان کی خاص بات یہ ہے کہ آپ نے ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک ہر ردیف وقافیہ میں اپنے کلام کو پیش کیا ہے اس کی مثال اگر روہیل کھنڈ میں تلاش کی جائے تو مشکل سے ملے گی، آپ کا دیوان قلمی صورت میں خانقاہ وامقیہ ونشاطیہ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے مطالعہ سے موصوف کی شعر وشاعری میں خالص عشق رسول اور ذوق شاعری کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ کلام کے ہر ہر لفظ سے محبت رسول کا سوتا ابلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اسی کو وہ اپنی زندگی کا حاصل اور معراج کمال تصور کرتے ہیں۔ نعتیہ شاعری میں جذبات عشق ومحبت رسول، لفظ لفظ میں انسانی خون کی طرح دوڑ رہا ہے جس کے سبب ان کی شاعری منفرد دکھائی دیتی ہے۔

وامق میاں کی نعت گوئی میں عشق رسول کو فوقیت حاصل ہے یہی

وجہ ہے کہ وہ عشق رسول الفاظ کی شکل میں نوک قلم پر ظاہر ہوتا ہے:

عجب گرمیٔ حسن بازار داری ۔ دو عالم بہ یک دل خریدار داری
بایں حسن وخوبی چہ اطوار داری ۔ کہ خلاق خود را طلب گار داری
مہ خود ز پر تو بہ عالم درخشاں ۔ عجب جلوۂ حسن رخسار داری
نہ خواہد رسائی اسیر محبت ۔ بہ ہر پیچ کاکل چہ اسرار داری
نہ رنج و بلا بے خطر است زائر ۔ کہ چشم کرم بر سیہ کار داری
خطا کیش وامق بہ شان تو قرباں ۔ کہ دلداری ہر گنہ گار داری

فارسی شاعری کے مانند اردو شاعری بھی عشق رسول کی آئینہ دار ہے درج ذیل اشعار ان کی محبت رسول سے الفت اور والہانہ لگاؤ کا پتہ دیتے ہیں:

بندگی رب کی ہے واللہ اطاعت ان کی
بن گیا عاشق حق جس کو ہے چاہت ان کی
جن و انسان و ملک پر ہے حکومت ان کی
سب سے بڑھ چڑھ کر ہے دارین میں شوکت ان کی

☆☆

جسے خلد کہتا ہے کل جہاں، وہی پیارے نبی کا دیار ہے
وہی بزم کن کا سنگار ہے، وہی باغ جناں کی بہار ہے
جہاں بھیک پاتے ہیں بینوا، جہاں درد پاتے ہیں غمزدہ
وہی شہر مدینہ ہے مرحبا، میری جان اس پہ نثار ہے

سید المشائخ نے جہاں اردو اور فارسی میں طبع آزمائی فرمائی تو اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ فرمائی ان کے رشحات قلم مختلف موضوعات پر دستیاب ہیں، علم تکسیر اور علم جفر میں باقاعدہ کوئی کتاب یا رسالہ نہیں البتہ ان موضوعات سے متعلق منتشر اوراق ضرور خانقاہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں ان اوراق کے مطالعہ سے موخر الذکر کی علم تکسیر میں ہمہ گیر صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے افسوس اگر ان کی زندگی میں اس طرف توجہ کی گئی ہوتی تو شاید وہ سرمایۂ عظیم جس کے یہ منتشر اوراق شہ پاروں کے مانند ہیں تشنگان علوم وفنون کے لئے مشعل راہ ہوتے۔ سردست میں یہاں قرآنیات کے موضوع پر ان کی اس کاوش کا ذکر کروں گا جو قرآن کریم کا ترجمہ خانقاہ وامقیہ میں محفوظ ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شعر و شاعری اور طریقت وسلوک کے ساتھ ساتھ باطنی علوم میں بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ نے ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ آیت جس موضوع کو بیان کر رہی ہے اس علم کی اصطلاح میں اس کا ترجمہ فرمایا، اس سے قرآنیات میں ان کی بالادستی کا اندازہ ہوتا ہے، حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان کے معاصرین ہوں یا مابعد مترجمین قرآن انہوں نے اس بات کا خیال نہیں رکھا اگر آپ کا یہ ترجمہ زیور طبع سے آراستہ ہو جائے تو مترجمین قرآن کی صف میں ممتاز و دل نشیں تسلیم کیا جائے گا۔

حضرت وامق میاں نے پورے قرآن میں جہاں جہاں انسان کی ترقی سے متعلق آیات آئی ہیں ان کا ترجمہ اور لفظوں کا چناؤ اس علم کی اصطلاح کے مطابق فرمایا ہے جو علم اس آیت میں ظاہر ہو رہا ہے یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آپ کو علم قرآن پر مہارت تامہ اللہ کی عطا سے حاصل تھی۔

سید المشائخ نے پوری عمر تصنیف و تالیف، شعر و شاعری اور رشد وہدایت میں صرف کی اور عمر کے آخر میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور ترک حیوانات کے عمل ۱۳ برس گزارے۔ بعد نماز فجر آپ کا یہ معمول شریف تھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ ہزار مرتبہ درود پاک کا ورد فرماتے، ساتھ ہی سورۂ مزمل، سورۂ یٰسین، سورہ فاتحہ اور سورۂ جن کا بلاناغہ ورد فرماتے، عقیدت مندوں کا بیان ہے کہ آپ کے پسینہ سے عشق رسول کی بو آتی تھی اور لعاب دہن بھی معطر ہوتا تھا آپ سچے پکے عاشق رسول تھے اس لئے آپ کو مختلف کیفیات میں پایا گیا۔ ۹۰ سال کی طویل عمر پائی ۱۹۷۶ء کو عصر اور مغرب کے درمیان وفات پائی۔ آپ کی نماز جنازہ قطب شہر حضرت شاہ دانا ولی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار عالی میں قاضی ضیاء الاسلام اشرفی نے پڑھائی جس میں علمائے کرام احبا واقربا اور ہزاروں عقیدت مندوں نے شرکت کی اور بعد نماز عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں آپ کو خانقاہ وامقیہ اشرفیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

وصال کے بعد آپ کے فرزند ارجمند سید ظل علی عرف نشاط میاں اشرفی جیلانی کو خانقاہ وامقیہ کی سجادگی عطا کی گئی جسے موصوف نے تادم زیست اپنے خانوادہ کی وراثت کو بحسن وخوبی سنبھالے رکھا۔

❁❁❁

محدّث اعظم ہند کی شخصیت وخدمات

حضرت مخدوم سمناں کے نظام تعلیم وتربیت کی روشنی میں

مفکر ملت سید حسن مثنیٰ انورؔ کچھوچھوی ....الاشرف، اسمعیل گنج لکھنؤ

مغلیہ حکومت کے قیام سے پہلے عہد سلطنت میں جب کہ ہندوستان مختلف خاندانی وقار اور چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں منقسم تھا اور ہر ریاست دہلی کی مرکزیت کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں دست بگریباں تھی، اس وقت سید اشرف سمنانی ۷۰۸ھ میں سمنان کے محل سرائے سلطان میں مختلف بزرگوں کی دعاؤں کا مظہر بن کر پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار حضرت سلطان سید ابراہیم اور ان کی مادر مشفقہ حضرت سیدہ خدیجہ نے اپنے نومولود فرزند کی تعلیم وتربیت کی جانب خصوصی توجہ دی۔ سات سال کی عمر یعنی ۷۱۵ھ میں قرآن حکیم کو حفظ فرمایا اور قرأت سبعہ پر حاوی ہوگئے۔ ۷۲۲ھ یعنی چودہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون خواہ منقولات ہوں یا معقولات، کلام ہو یا فلسفہ، ادب ہو یا تاریخ، تصوف ہو یا دیگر علم الاساطیر سب پر کامل دستگاہ رکھنے لگے۔ آپ کے اساتذۂ کرام میں شیخ عمادالدین تبریزی، امام علاء الدولہ سمنانی، امام عبداللہ یافعی، شیخ عبدالرزاق کاشانی اور سید علی ہمدانی جیسے علمائے روزگار اور صاحبان بصیرت کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

تکمیل علوم وفنون کے دوسرے ہی سال یعنی ۷۲۳ھ میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شاہی سامان نشاط کے ساتھ پرورش پانے والا زندگی کے سنگینیوں کا بھی احساس وادراک کرے اور علم کتابی رکھتے ہوئے بھی ان حقائق کو دریافت کرے جو وجود آدم، تخلیق کائنات اور اس کی غرض وغایت، زمانے کے تغیرات، خالق ومخلوق کے باہمی ربط وتعلق، حیات انسانی کا نصب العین، حقیقت حیات اور حیات بعد الممات کے تصورات سے عبارت ہیں۔ حضرت سلطان سید ابراہیم کی وفات کے بعد ۷۲۳ھ میں آپ تخت نشین حکومت ہوئے اور دس سال تک تاجداری وجہاں بانی کے فرائض حسن وخوبی سے انجام دیے اور ظل ہمایوں سلطان سمنان سید اشرف کے نام سے دنیا آپ سے متعارف ہوگئی، لیکن باپ کی وفات کے بعد وجدانیات کی جو شمع دل میں روشن تھی، اس کی لو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اب ۷۳۳ھ میں سلطان سید اشرف سمنانی کی حیات مقدسہ کا پہلا دور ختم ہوا جو تمام تر ''کتاب خوانی'' پر مشتمل تھا اور دوسرا دور ان کے ''صاحب کتاب'' ہونے کا اعلامیہ بن کے آ رہا تھا۔

دوسرے دور کی ابتدا یوں ہوئی کہ سلطان سید اشرف سمنانی نے ایک اشارۂ غیبی پا کر تخت وتاج کو اپنے برادر خورد سید محمد کے حوالے کیا اور خود اپنی مادر مشفقہ سے اجازت لے کر پیر ومرشد کی تلاش میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ سمرقند، ملتان، اُچ شریف، دہلی اور بہار شریف ہوتے ہوئے دو سال کی پیادہ پائی کے بعد ۷۳۵ھ میں پنڈوہ شریف ضلع مالدہ (بنگال) پہنچے اور سلطان المرشدین حضرت شیخ علاء الحق والدین علیہ الرحمہ سے بیعت وخلافت حاصل کی۔ بارہ سال تک پیر ومرشد کی خدمت میں رہے۔ اس عرصے میں ادب واخلاص اور ریاضت ومجاہدہ کے وہ نادر نمونے پیش کیے کہ حضرت سلطان المرشدین جیسا پیر روشن ضمیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ حضرت شیخ نے بکمال لطف وعنایت وہ سارے علوم اور رموز حقائق کشف کر دیے جن کے لئے سلطان سید اشرف سمنانی نے تخت سمنان کو ٹھوکر لگا دی تھی۔

پنڈوہ شریف کی خانقاہ سے آپ سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی بن کے نکلے اور پیر کی نظر کیمیا اثر نے جلد ہی آپ کو اس منزل رفیع پر پہنچا دیا جہاں آپ 'غوث العالم' ہوئے اور 'محبوب یزدانی' کا آسمانی خطاب بھی حاصل ہوا۔ اسی لئے آج کا مؤرخ آپ کو حضرت غوث العالم، محبوب یزدانی، مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کے نام ولقب سے یاد کرتا ہے۔

حضرت مخدوم سمنانی تحریر کے میدان میں آئے تو کم وبیش سترہ کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور اکابرین علما سے خراج تحسین بھی حاصل

کیا۔ ان کتابوں میں قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ بھی ہے جسے حضرت نے ۷۲۷ھ میں اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ متن عربی کے ساتھ فارسی ترجمہ والا قلمی نسخہ حرم نبوی میں محفوظ تھا جو ایک مدنی صاحب کو دستیاب ہوا اور ان کی وساطت سے کراچی (پاکستان) پہنچا۔ مذکورہ قلمی نسخہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی حضرت سجادہ نشین سرکار کلاں کچھوچھہ شریف کے بدست مجھے موصول ہوئی جس کا انگریزی ترجمہ ان ہی کے حکم سے اسلامک اسٹڈیز سینٹر کے زیر اہتمام ہو رہا ہے اور سورۂ بقرہ کی طباعت ہو چکی ہے جو کم و بیش ڈھائی پارے پر مشتمل ہے۔

اسی طرح حضرت مخدوم سمنانی تقریر کی جانب متوجہ ہوئے تو بلیغ فکر اور دل نشیں اسلوب بیان نے ملفوظات کی شکل اختیار کر لی۔ سیاحت کی طرف رخ کیا تو ہندوستان کے طول و عرض کے علاوہ ترکستان، ایران، عراق، شام، جزیرۃ العرب، مصر اور روم بھی پہنچے۔ کہیں گم کردہ راہ کو راہ مستقیم پر لگا دیا، کہیں طالبان حق وصداقت کو انوار و برکات سے مالا مال کر دیا اور کہیں جابروں و ظالموں کے زیر سایہ سسکتی ہوئی انسانیت کو نئی زندگی عطا کی۔ بنگال کے ایک رعونت پسند جاگیردار نے جب سرکشی اختیار کی اور حق پسندوں کے لئے زمین تنگ کر دینے کا فیصلہ کیا تو یہ حضرت مخدوم سمنانی ہی کا قلب و جگر تھا کہ سلطان ابراہیم شرقی کو صورت حال سے مطلع کر کے دعوت یلغاری دی اور اسی طرح حضرت نے مظلوموں کے تحفظ و دفاع کی خاطر مذکورہ جاگیردار کے سارے فرعونی منصوبے خاک میں ملا دیے۔ یوں تو حضرت مخدوم سمنانی کی تبلیغی اور دعوتی سرگرمیوں کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ تاہم اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت کا نظام تعلیم و تربیت تین بنیادی باتوں پر مشتمل تھا۔ اول توحید و رسالت کا اقرار و تصدیق، دوم تحصیل علم، سوم افزائش عمل۔ یہاں تحصیل علم سے مراد علم شریعت اور علم طریقت دونوں ہیں تاکہ حیات و کائنات کے اسرار و معارف کی نقاب کشائی کی جا سکے اور افزائش عمل میں عبادت الٰہی اور خدمت خلق دونوں شامل ہیں۔

حضرت مخدوم سمنانی کا ارشاد ہے:

"اگر کوئی جان جائے کہ اس کی مدت عمر میں ایک ہفتہ سے زیادہ باقی نہیں ہے تو چاہئے کہ علم فقہ میں مشغول ہو کیونکہ علوم دین سے ایک مسئلہ کو جاننا ہزار رکعت نافلہ نمازوں سے بہتر ہے۔"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"توحید کے جان لینے اور ایمان کے پہچان لینے کے بعد پہلی چیز جس کا جاننا ہر بندہ پر واجب ہے وہ تمام عقائد شریعت و طریقت کا علم ہے۔"

تیسری جگہ فرماتے ہیں:

"علم حاصل کرو کہ زاہد بے علم شیطان کا تابع دار ہوتا ہے۔" اس سلسلے کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں: "ولی کی ایک شرط یہ ہے کہ عالم ہو، جاہل نہ ہو، اگر ولی کو علم نہ ہو گا تو بھلائی اور برائی کو نہ جانے گا اور اندھیروں نیز کدورتوں کے جنگل میں پریشان رہے گا۔"

تحصیل علم کے بعد حضرت مخدوم سمنانی کا سارا اصرار افزائش عمل پر ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت کے نزدیک "عالم بے عمل ایسا ہے جیسے آئینہ بے قلعی کے، کیونکہ جب تک علم کے آئینہ میں عمل کی قلعی نہ ہوگی احوال و مقامات کا چہرہ نظر نہ آئے گا اور لطافت قلبی نہ بڑھے گی۔" اسی خیال کو حضرت دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں:

"جس نے کسب مجاہدہ کا عمل نہ کیا دربار مشاہدہ تک نہ پہنچا۔"

حضرت کی یہی تبلیغ تھی کہ "بندے کو عبادت سے چارہ نہیں کیونکہ بندہ کو بندگی چاہئے اور کریم کو کرم سزاوار ہے اور بندہ بندگی میں ایسا ڈوب جائے کہ اس کے معاوضہ کا خیال نہ کرے بلکہ تعمیل حکم میں بندگی کرے اگرچہ بندگی میں آثار قبولیت نہ دیکھے پھر بھی باز نہ آئے۔"

عمل پر غیر معمولی اصرار کی یہ مثال بھی ملاحظہ ہو: "اگر لاکھ برس تک علم پڑھو اور ہزار بار کتاب الٹو پھر اس پر عمل نہ کرو اور اپنے کو اعمال کے لئے تیار اور رحمت الٰہی کے لائق نہ بناؤ تو خدا کی رحمت تم تک نہ پہنچے گی۔"

تصوف کے مرکزی نظریہ وحدۃ الوجود کی روشنی میں جہد و عمل کے اس پہلو کو بھی حضرت ہی کی زبان میں ملاحظہ کیجئے:

''خدمتِ مخلوق نشانِ سعادت است و کسے کہ در خدمتِ
مخلوق خوئے گیرد ہر آئینہ در خدمتِ خالق دلیر بود و بہ
نسبت مناظر ظہور صفات در مظاہر کائنات کہ مصادر اسماء
ذات اند خدمت مخلوق عین خدمت خالق بود۔''

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے سعی پیہم اور عمل مسلسل کا جو پیغام دیا ہے وہی تعلیمات صوفیا کی اصل روح ہے اور حضرت مخدوم سمنانی کے نظریہ سے انسانی افعال کا ارتفاع، خدمت خلق عین خدمت خالق بود کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

غرض تحصیل علم اور افزائش عمل سے متعلق مضامین لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور انہیں ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح حضرت مخدوم سمنانی نے کبر و نخوت، عناد و تنفر، جبر و تشدد، بخل و اسراف، امتیاز نسل و رنگ اور انسان کی طبقاتی تقسیم کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ ان صفاتِ رذیلہ کے بجائے حق و صداقت، عدل و دیانت، محبت و اخوت، فروتنی و میانہ روی، محاسبۂ نفس اور تزکیۂ ذات وغیرہ کو اپنا محبوب و پسندیدہ عمل بتایا ہے۔ حضرت مخدوم سمنانی کے اسی طرز فکر نے سماج کے فاسد اور مہلک عناصر کی اصلاح کی اور انسانیت کی اخلاقی اور روحانی سطح کو بلند کرنے میں حیرت انگیز رول ادا کیا۔ ان ہی جان دار اور غیر فانی قدروں پر حضرت مخدوم سمنانی کے نظام تعلیم و تربیت کی عمارت کھڑی ہے۔

۸۲۹ھ میں حضرت مخدوم سمنانی کا وصال ہو گیا اور حضرت نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں اپنے بھانجہ اور خلیفۂ اعظم حضرت مخدوم الآفاق مولانا الحاج سید عبدالرزاق نورالعین (متوفی ۸۷۲ھ)، جن کا سلسلۂ نسب حضرت محبوب سبحانی، غوث الصمدانی سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، کو اپنے تمام تبرکات علمیہ اور اعمال و وظائف کے گنج ہائے گراں مایہ کا امین و وارث بنا دیا۔ حضرت نورالعین سے ان کی اولاد میں دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور ہر عہد میں حضرت مخدوم سمنانی کا نظام تعلیم و تربیت نشو و ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتا رہا۔ البتہ ۱۲۶۶ھ میں اولاد نورالعین میں ایک گراں قدر اور عہد آفریں شخصیت کا ظہور ہوا جس نے مخدومی نظام تعلیم و تربیت کے ساتھ خانوادۂ اشرفیہ کو بھی ملک و بیرون ملک میں روشناس کرا دیا۔ میرا روئے سخن اعلیٰ حضرت، عظیم البرکت مولانا الحاج سید شاہ علی حسین اشرفی میاں صاحب سجادہ نشین آستانۂ اشرفیہ سرکار کلاں (المتوفی ۱۳۵۵ھ/ مطابق ۱۹۳۶ء) کی طرف ہے جن کی غیر معمولی روحانی توانائی فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی اور شخصیت کی مقناطیسی کشش و جاذبیت پر حضرت مخدوم سمنانی کے فیضان کا پرتو نمایاں طور پر ارباب فکر و بصیرت نے محسوس کیا ہے۔ شاید ہی وجہ ہے کہ انہیں ''مجدد سلسلۂ عالیہ اشرفیہ'' کے نام سے آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہٗ نے جب اعلیٰ حضرت اشرفی میاں قدس سرہٗ کو پہلی بار بریلی میں دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھے کہ ؎

اشرفی! اے رخت آئینۂ حسن خوباں
اے نظر کردۂ و پروردۂ سہ محبوباں

(بشیر القادری۔ ۱۷-۱۸)

علامہ اقبال کی خصوصی مجلس احباب کے ایک فاضل گرامی جناب سید غلام بھیک نیرنگ بارایٹ لا مرحوم، جو اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب کے مرید و خلیفہ بھی تھے، رقم طراز ہیں۔

''ملک ہند میں بنگال، مدراس، بمبئی، کاٹھیاواڑ، مارواڑ، دکن، اودھ، پنجاب اور سندھ، بیرون ملک ہند میں عدن، جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، حلب، مصر اور عراق ان جملہ علاقوں میں تین سو ضلع سے زیادہ کے لوگ اعلیٰ حضرت قبلہ و کعبہ کے سلسلۂ ارادت میں منسلک ہیں۔ اس وقت تک طبقۂ علما میں پچاس عالم سے زیادہ شرف خلافت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت قبلہ کعبہ کی سیر و سیاحت ضرب المثل اور اشاعت سلسلہ بے بدل سمجھی جاتی ہے۔ سلسلہ عالیہ اشرفیہ کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس سلسلۂ اشرفیہ کا اجرا اشرق سے غرب تک حضور قبلہ و کعبہ کی ذات بابرکات سے ہوا۔ اجرائے سلسلہ کے اعتبار سے آپ کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ کے آفتاب ولایت کا پرتو کہیں تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا''

(مقدمہ تحائف اشرفی ۔۹۔۱۰، مطبوعہ ۱۹۱۵ء)

اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی ولادت ۱۲۶۶ھ میں ہوئی ۔۱۲۸۲ھ میں فراغت علمی کے بعد اپنے برادر کلاں حضرت مولانا الحاج سید شاہ ابومحمد اشرف حسین صاحب سجادہ نشین سرکار کلاں سے بیعت وخلافت حاصل کی۔ ۱۲۸۵ھ میں حضرت سید شاہ حمایت اشرف بسکھاروی ابن حضرت سید شاہ تقی الدین اشرف سجادہ نشین سرکار حسینیہ کی دختر نیک اختر سے شادی ہوئی، جن کے بطن سے مولانا سید احمد اشرف اور سیدہ محمدی خاتون پیدا ہوئے۔اول الذکر حضور محدث اعظم ہند کے حقیقی ماموں، خسر، پیرومرشد اور سرپرست ونگراں تھے۔حضرت مولانا الحاج سید احمد اشرف اپنی وضع قطع ، رنگ روپ، مزاج کی نفاست ولطافت اور شخصیت کے جلال وجمال میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ان کا علم اکتسابی کم اور وہبی زیادہ تھا۔وہ عالم ربانی، عارف حقانی اور واعظ لاثانی تھے۔ان کے وعظ میں روح اور خیال دونوں کو عجیب بالیدگی میسر ہوتی تھی۔لاہور کے ایک جلسۂ عام میں ان کے وعظ کے دوران حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری کرسی صدارت سے بے تابانہ کھڑے ہوکر فرمانے لگے کہ ''فرزند! یہ تم نہیں بول رہے ہو بلکہ تمہارے بزرگوں کا فیضان تمہاری شکل میں بول رہا ہے۔''

حضرت مولانا احمد اشرف نے بیعت وخلافت اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور ان ہی کی نگہداشت میں روحانی ارتقاع کی منزلوں کو طے فرمایا۔آپ کا سن وفات ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء ہے۔

مولانا کی ہم شیرہ محمدی خاتون کا عقد ونکاح فاضل جلیل، جامع علوم وفنون حضرت علامہ حکیم سید نذر اشرف صاحب فاضل (المتوفی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) کے ساتھ ہوا۔حضرت علامہ فاضل علیہ الرحمہ خانوادۂ اشرفیہ حسنیہ سرکار کلاں کے ایک ممتاز عالم ومفکر وشاعر تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت ان کے حقیقی ماموں حضرت مولانا شاہ علی حسن جائسی علیہ الرحمہ کی آغوش میں ہوئی۔کتاب وسنت پر ان کی گہری نظر تھی اور حکمت وفلسفہ، تاریخ وسیر اور زبان وادب ان کے پسندیدہ ومحبوب ترین فنون تھے۔شاعری میں انہیں داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فارسی زبان میں ان کی ایک گراں قدر تالیف ''صحائف اشرفی'' ہے جس کا سن کتابت ۱۳۱۱ھ ہے اور جو بڑی تقطیع کے دوسو بہتر صفحات پر مشتمل ہے۔صحائف اشرفی میں ایک دیباچہ، ایک مقدمہ اور چار صحائف ہیں جن میں توحید، رسالت، شریعت اور طریقت کے مسائل کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔آخر میں ایک خاتمہ کتاب بھی ہے، جس میں خانوادۂ اشرفیہ کی ہر شاخ کے چار چار بزرگوں کو ولایت، جذب کامل، شہادت، امارت اور علم ظاہری کے خانوں میں تقسیم کرکے زبردست انتخابی نظر کا ثبوت دیا ہے۔

خانوادۂ اشرفیہ کی شاخ جائس کے علم ظاہری کے خانے میں جن چار بزرگوں کا ذکر کیا ہے ان میں اول حضرت علامہ سید غلام مصطفیٰ عرف ملا باسو، دوم حضرت ملا اشرف قلی، سوم حضرت ملا باقر ابن ملا باسو الملقب بفاضل الجائسی کی علمی خصوصیات وامتیازات کو پیش کرتے ہوئے آخر میں اپنے حقیقی ماموں کو ان لفظوں میں یاد کیا ہے:

''قدوۃ الابرار، عمدۃ الاخیار، زبدۃ الفضلاء، اسوۃ الکملاء، حامی شریعت، ماحی ضلالت، ذاتہ نعمۃ من نعمات اللہ، آیہ من آیات اللہ، مقبول ذوالمنن، پسندیدۂ پنجتن، فخر علمائے زمن سیدنا مولانا ومقتدانا سید شاہ علی حسن الشہیر بملا حسن سجادہ نشین۔''

حضرت مولانا سید شاہ علی حسن جائسی سجادہ نشین رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق علامہ فاضل کا یہ تاثر ان کے آخر دم تک قائم رہا اور وہ اکثر مباحث میں اپنے ماموں کے قول کو بطور سند وحجت پیش کرتے تھے، جس کا ایک عینی شاہد یہ راقم الحروف بھی ہے۔ بزرگ ماموں کی غیر معمولی محبت وشفقت اور الطاف بے پایاں نے سعادت مند بھانجے کو جائس کی سکونت اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا۔چنانچہ شادی کے بعد بھی وہ جائس ہی میں قیام پذیر رہے کہ ۱۳۱۱ھ میں علامہ فاضل کے گھر میں ایک بچہ کی ولادت ہوئی جس کا نام خاندانی بزرگوں نے محمد رکھا۔ جب چار سال چار مہینے اور چار دن کا سن ہوا تو خاندانی معمولات کے مطابق بسم اللہ خوانی کرائی گئی اور جائس کی علمی فضا میں نشوونما کا خصوصی انتظام کیا گیا لیکن جلد ہی وہ وقت آگیا کہ حضرت سیدہ محمدی خاتون کا دل جائس کے سماجی ماحول سے گھبرانے لگا۔زبان کے اجنبی لب ولہجے اور طرز معاشرت کی بیگانگی سے ان کی وحشت بڑھتی گئی۔آخر میں مجبور ہوکر انہوں نے اپنے بھائی اور باپ دونوں کو اپنے ضمیر کی آواز سنائی اور

یہ طے پایا گیا کہ کچھوچھہ شریف میں ایک نئے مکان کی تعمیر کے بعد سکونت کو تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور علامہ فاضل نے جائس کی سکونت ترک کر کے دوبارہ کچھوچھہ شریف کی مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ اب قدرتی طور پر حضرت سید محمد کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری ان کے والدین کریمین نے سنبھالی۔ ماں کے بڑے لاڈ و پیار سے پہلے چھ مہینے میں قاعدہ بغدادی اور پارۂ عم پڑھا اور پھر انتیس دنوں میں قرآن کریم کا ناظرہ ختم کرا دیا۔ ختم قرآن پر خاندان میں جشن مسرت منایا گیا اور شیرینی تقسیم ہوئی۔ علامہ فاضل نے اپنے لائق بیٹے کی تعلیم کو آگے بڑھایا۔ گلستاں، بوستاں، گلزار دبستاں، انوار سہیلی، قصائد عرفی و انوری اور دیوان حافظ وغیرہ کا درس دے کر فارسی زبان و ادب کا شناور بنا دیا۔ پہلے درس نظامیہ کی تکمیل کے لئے فرنگی محل لکھنؤ بھیجا جہاں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا چراغ درس و تدریس روشن تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا سید محمد کو معقولات کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی کی خدمت میں روانہ کیا۔ وہاں سے انہوں نے جلد ہی علامہ کی سند حاصل کر لی، پھر اپنے ماموں کی اجازت سے محدث سورتی حضرت علامہ وصی احمد صاحب کی درسگاہ میں پیلی بھیت پہنچے اور سند حدیث حاصل کی۔ مولانا، علامہ اور محدث ہونے کے بعد کار افتاء سیکھنے کے لئے فاضل بریلوی امام احمد رضا قادری کی خدمت میں کئی سال لگے رہے اور جب وہاں سے نکلے تو مولانا علامہ مفتی سید محمد محدث کے نام اور علمی خطابات سے اہل علم کا طبقہ واقف ہو چکا تھا۔ تحصیل علم کے بعد حضرت محدث اعظم کم و بیش دس سال درس حدیث دیتے رہے۔ (۱۹۲۳ء/۱۳۴۱ھ تا ۱۹۲۸ء/۱۳۴۶ھ) مجلہ اشرفی کی ادارت سنبھالی اور اس طرح فن صحافت کے بھی لذت آشنا ہوئے۔ مختلف علمی موضوعات پر ان کے تحریر کردہ مضامین مجلہ اشرفی کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ فن مناظرہ میں نوک تیر، قہر قہار اور اتمام حجت کے علاوہ بھی کئی کتابیں ہیں جن میں تقویٰ القلوب کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اسی کتاب میں مشہور مؤرخ سید سلیمان ندوی کو بھی ان کی تاریخ نویسی کی کمزوریوں سے آگاہ کیا ہے اور تاریخ و سیر کو کتاب و سنت کا تابع بتایا ہے۔ علاوہ ازیں ابن سعود کے مظالم، آثار و منسوبات کی بے حرمتی اور علمائے سوکی دسیسہ کاریوں کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے اور کتاب و سنت نیز اقوال ائمہ سے اپنے موقف کو مدلل کیا ہے۔

ان کی تقریروں اور خطبات کے درجنوں مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح ان کے فتاویٰ بھی یقین و اعتماد کی ایک منفرد شان رکھتے ہیں۔ حضرت محدث اعظم ہند کے تفقہ فی الدین اور فراست ایمانی پر ان کے معاصر علما ہمیشہ مسرور و مطمئن رہے۔ معاصر علما میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں صاحب، حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب، حضرت استاذ العلماء صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی، حضرت صدر الشریعۃ مولانا امجد علی صاحب، حضرت ملک العلماء مولانا ظفر الدین صاحب بہاری صاحب صحیح البہاری، حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب مفتی آگرہ، حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی اور حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب لاہور اور علامہ سید احمد کاظمی پاکستان وغیرہ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ محدث اعظم کی دینی اور علمی وجاہت و سربلندی کا ذکر کرتے ہوئے ایک قاموس نگار لکھتا ہے کہ:

> ''برعظیم میں بھی کئی محدثین معروف ہوئے ہیں جن میں شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، محدث روپڑی، محدث علی پوری، محدث کچھوچھوی زیادہ مشہور ہیں۔''

(اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص: ۱۳۱۵، مطبوعہ پاکستان)

حضرت محدث اعظم ہند کا ایک شعری مجموعہ ''فرش پر عرش'' ان ہی کی حیات مبارکہ میں طبع ہو کر عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ حضرت کی تمام تصنیفی سرگرمیوں میں ترجمہ قرآن کو بڑی فضیلت حاصل ہے جسے دیکھ کر امام احمد رضا نے فرمایا تھا کہ:

> ''شاہزادے! اردو میں قرآن لکھ رہے ہو!''

خدا کا شکر ہے کہ وہی ترجمۂ قرآن ''معارف القرآن'' کے نام سے چھپ کر پھیل رہا ہے۔ اکتساب علمی کے ساتھ ساتھ اور اس کے متوازی حضرت محدث اعظم ہند کو سلوک و تصوف کی تعلیم کے لئے بھی ایک ایسے استاذ کی ضرورت محسوس ہوئی جو نہ صرف یہ کہ علم کتابی رکھتا ہو

بلکہ اسرارِ باطنی کی راہیں جس پر منکشف ہوچکی ہوں۔ حضرت مولانا سید احمد اشرف کی صورت میں انہیں ان کا مطلوبہ استاد و رہبر مل گیا اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب کی موجودگی میں ان کی انتخابی نظر پکار اٹھی کہ

احمد حق نما دیا اشرف با خدا دیا
مجھ کو میرے کریم نے پیر بہت بڑا دیا
(فرش پر عرش-۱۵)

چنانچہ حضرت مولانا احمد اشرف صاحب نے بیعت و ارادت کے بعد محدث اعظم کو دو سال تک سخت ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رکھا اور پھر خلافت سے نوازا۔ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب نے بھی اپنی نگرانی میں آستانہ عالیہ اشرفیہ پر محدث اعظم سے چلہ کشی کرائی او سارے اعمال جلالی و جمالی نیز اوراد و وظائف بخش دیے۔ پیر و مرشد کے حکم سے وہ بعض مخصوص وظائف کے تادم آخر پابند رہے، جنہیں وہ مغرب و عشاء کے درمیان سفر و حضر میں انجام دیتے تھے۔ پیر و مرشد نے جب یہ دیکھا کہ علم سفینہ علم سینہ سے مخلوط ہو کر ایک اکائی بن گیا ہے اور اسے بھرپور توانائی حاصل ہوگئی ہے تو پھر محدث اعظم کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ مخدوم سمنانی کے نظام تعلیم و تربیت کے پیش نظر تحصیل علم کے بعد افزائش عمل کی روش اختیار کرو اور عبادت الٰہی کے ساتھ اللہ کی پھیلی ہوئی زمین پر خدمت خلق کا فریضہ اس طور سے انجام دو کہ وہ بھی خدمت خالق بن جائے۔ حالات گواہ ہیں کے حضرت محدث اعظم ہند اسی ڈگر پر تمام عمر چلتے رہے۔ ۱۹۲۸ء ر۱۳۴۷ھ تک وہ اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ جلسوں، جلوسوں، کانفرنسوں اور مناظروں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ برما، بنگال، بہار، اترپردیش، دہلی، پنجاب اور راجستھان کے علاقوں میں اعلاء کلمۃ الحق کی دھوم مچادی۔ بعد وفات مرشد وہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں کی ہمرکابی میں ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء تک اس سلسلے کو جاری رکھا اور جب وہ اس راہ میں یکہ و تنہا رہ گئے اور مخدومی مشن کی ترویج و اشاعت کی تمام تر ذمہ داریاں تنہا ان کے کاندھوں پر آگئیں تو عمر کے باقی پچیس سال پورے انہماک اور سرگرمی کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق میں صرف کردیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مغرب و مشرق اور شمال و جنوب کے علاوہ بیرون ملک میں بھی دین و سنت اور اشرفیت کا علم لہرانے لگا۔

یوں تو محدث اعظم کو دینی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے بڑا پر آشوب زمانہ ملا اور ان ہی کے دور میں اگر ایک طرف دہلی، پنجاب اور راجستھان کے دیہی علاقوں میں ارتداد کا فتنہ اٹھا اور شدھی تحریک چلی تو دوسری طرف قادیانیت کی قلابازیاں اور تو ہب کی غارت گریاں اُشوہ طرازیاں بھی تھیں۔ اگر ایک جانب انگریز حکمرانوں کی سیاسی چیرہ دستیاں اور معاشی استحصالیاں تھیں تو دوسری جانب محبان وطن کی سرفروشیاں اور تحریک آزادی کے سورماؤں کی للکاریں بھی تھیں، اگر ایک سمت مسلمانوں کا بڑا طبقہ سماجی اور تہذیبی زبوں حالی کا شکار تھا تو دوسری سمت ایک تحریک چلائی جارہی تھی کہ نغمۂ ہندی سے حجازی لے کو نکال دو۔ ان تمام روح فرسا مناظر کو محدث اعظم ہند نے بچشم خود ملاحظہ فرمایا اور ہر محاذ پر ایک مومن جاں باز کی طرح برسر پیکار رہے۔ شہر شہر، نگر نگر اور ڈگر ڈگر وہ پہنچے اور مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ ہزاروں گم کردہ راہ کو ہدایت سے آشنا کردیا اور مظلوم انسانیت کو صلاح و فلاح کا پیغام دیا۔

اسلامی انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ پاکستان کا مؤلف ص-۳۱۵ پر حضرت محدث اعظم ہند کے بارے میں رقم طراز ہے:

"آپ بیک وقت عالم، ادیب، خطیب، صوفی، شاعر، محدث اور پیر طریقت تھے۔ تمام سال تبلیغی دوروں میں مصروف رہتے۔ پانچ ہزار سے زائد غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اور کئی لاکھ مسلمان شرف بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔ عشق رسول آپ کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا.... مذہبی، تبلیغی اور سماجی کاموں کے علاوہ آپ نے سیاسی تحریکوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔"

فتنہ ارتداد کی روک تھام اور اس کی بیخ کنی میں حضرت محدث اعظم ہند کا تاریخی کردار مجلہ اشرفی کے سیکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں **الفقیہ** (امرتسر)، **ھمدم** (لکھنؤ) اور **الامان** (دہلی) جیسے روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کی پرانی فائلوں میں بھی اس

تاریخی کردار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

محدّث اعظم کا اہم ترین کارنامہ دین وسنت کی حفاظت وصیانت ہے۔ اس فریضہ کو انجام دینے کے لئے انہوں نے اپنی خداداد شان خطابت، علمیت اور روحانیت کا بحسن وخوبی استعمال کیا۔ قادیانیت اور وہابیت دونوں کے زور واثر کو گھٹا دیا اور ان کی پروردہ بدعقیدگی کو اس قدر نمایاں کردیا کہ اہل سنت و جماعت کا کوئی فرد اس کے دام فریب میں نہ آسکے۔ مختلف مقامات پر مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی پتھر رکھا اور ان کی سرپرستی قبول فرمائی۔ بعض مدارس کے لئے قانون و ضابطہ بھی مرتب فرمایا۔

اپنی سربراہی ونگرانی میں کئی تنظیمیں قائم کیں اور مسلمانوں کو اپنے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کو طے کرنے کے اصول وطریقے سکھلائے۔ وہ خود تمام عمر جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی شریف کے صدر رہے اور اسی پلیٹ فارم سے ان کی بیش تر دینی، سیاسی اور سماجی خدمات وابستہ ہیں۔

دین وسنیت سے ان کا تعلق خاطر گرویدگی کی حد تک پہنچ چکا تھا اور وہ تمام سنی مسلمانوں کو اپنے ہی کنبے کا فرد سمجھتے تھے۔ ایک صاحب نے ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا کہ حضور! آپ کے مرید کتنے ہیں؟ محدّث اعظم ہند نے برملا جواب دیا ہر سنی مسلمان میرا مرید ہے۔

حضرت کی شخصیت بڑی پروقار اور بارعب تھی۔ علمائے مخالفین ان کی صورت ہی دیکھ کر لرزاٹھتے تھے۔ اپنوں کو بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کے باوجود وہ بے حد رحیم الفطرت، حلیم الطبع اور روشن خیال تھے۔ گرتے ہوؤں کو سنبھالنا، انہیں آگے بڑھانا، مختلف گھرانوں کے باہمی افتراق وتشتت کو مٹانا، ملی مسائل کی پیچیدگیوں کو دور کرنا، دین وسنت کی بقا اور استحکام کی خاطر ہر ممکن اشتراک وتعاون کرنا ان کے مرغوب وپسندیدہ مشغلے تھے۔ اس ضمن میں وہ نہایت مخفی طور پر داد ودہش سے بھی کام لیتے تھے اور حکمت علمی سے بھی۔ وہ ہمیشہ محاسبہ نفس اور تزکیۂ ذات پر کڑی نگاہ رکھنے کا سبق سکھلاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ محاسبہ نفس کو ترک کردینے کے بعد ملت میں نئی نئی بیماریوں کو جنم لینے کا موقع ملتا ہے۔

محدّث اعظم کی ستر سالہ زندگی کے ۵۰ سال دین وملت کی مسلسل خدمت میں ہی گزرے اور ملت کی اسی خدمت نے انہیں ''مخدوم الملت'' بنادیا۔

وہ چار بار حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے اور آخری بار انہیں حج اکبر کی سعادت بھی نصیب ہوئی جس کا منظوم تذکرہ ''فرش پر عرش'' میں شامل ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا حج اپنے باوقار ماموں او رمقدس نانا کی معیت میں ادا کیا۔ اس وقت حجاز مقدس ترکی کی حکومت کے زیر انتظام تھا۔ ان مبارک مواقع پر انہیں مشائخ وعلمائے مکہ ومدینہ نیز بلاد اسلامیہ کے دیگر ممالک کے علما ومشائخ سے بھی گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ سادات مدینہ سے بھی رابطہ رہا جو نجدی حکومت کی جارحیت کے باعث خاموش زندگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مظلوم اہل مدینہ کی خدمت کو قابل رشک و سعادت سمجھو اور وسیلۂ نجات بھی۔ محدّث اعظم کی مجلسی گفتگو افادی نقطہ نظر سے کسی محفل پند و وعظ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ مجلسی گفتگو میں سنجیدگی اور منطقی توازن کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی کا بھی رنگ چھایا رہتا تھا۔ ان کی مجلس میں علما، مشائخ، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ، نواب وجاگیردار، تاجر اور صنعت وحرفت والے، کسان اور مزدور سب ہی شریک ہوتے تھے۔ سب کے سوالوں کے جواب دیتے اور سب کے شبہات کو رفع کرتے تھے۔ بسا اوقات وہ فکری تناؤ میں بذلہ سنجی کا ایسا رنگ بھر دیتے تھے کہ مسئلہ آسان تر ہوجاتا اور لوگ دل ہی دل میں لطف لیتے۔ بذلہ سنجی کی قوت اثر ونفوذ سے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دینا محدّث اعظم کا نمایاں وصف تھا۔

ان کی شان قناعت واستغنا بھی بے مثال تھی۔ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ ہزایکسلینسی گورنر آف ممالک متحدہ آگرہ واودھ جو انگریز تھا، نے محدّث اعظم کی علمی شہرت اور عوامی مقبولیت کے پیش نظر علامہ کو ایک اعزازی سرٹی فکیٹ سونپنے کے لئے مدعو کرنا چاہا تو آپ نے صاف معذوری ظاہر کردی۔ بالآخر مذکورہ سرٹی فکیٹ نواب محمد یوسف آف جون پور بارایٹ لاء کے سی-آئی-ای- کے بدست گورنر موصوف نے ارسال کردیا جسے میں نے خود دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت کی نگاہوں میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔

دوسرا واقعہ ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہے جو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قائداعظم محمد علی جناح کی مرضی لے کر حضرت محدث اعظم ہند کی خدمت میں پاکستان کے شیخ الاسلام کا منصب قبول کرنے کی پیش کش بھیجی تھی اور تمام اعلیٰ مراعات دیے جانے کا یقین دلایا تھا لیکن محدث اعظم ہند کی شان قناعت واستغنا نے یہی جواب لکھایا تھا کہ:

''میں ایک بڑے آستانے سے وابستہ ہوں اور صاحب آستانہ کے مشن کی ترویج واشاعت کا کام میرے ذمہ کیا گیا ہے، بس یہی وابستگی اور ذمہ داری میرے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے، لہٰذا آپ کسی اور کو تلاش کر لیں۔''

اس موقع پر حضرت مخدوم سمنانی کا یہ بلیغ ارشاد گرامی یاد آتا ہے کہ:

''عبدالرزاق وفرزندان اوراںجزاںہ الٰہی شریک ساختیم از حضرت نامتناہی درخواست کردہ ایم کہ اگر اولاد واحفاد عبدالرزاق قانع بودند ہرگز بکس محتاج نشوند۔''

(لطائف اشرفی، ج-۲، ص-۳۸۲)

اسی عبارت پُر بشارت اور فیض مخدومی کی بناء پر حضرت نورالعین نے اپنی تمام زندگی میں سلطان حسین شرقی نیز کسی امیر ورئیس کی پیش کی ہوئی معافی و جاگیر کو قبول نہ کیا اور عرصہ گاہ قناعت و استغنا میں جمیع مشائخ پر سبقت حاصل فرمائی۔ یہ پہلی مثال ہوئی۔ اور دوسری مثال گورنر یوپی اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کی پیش کش کے جواب میں موجود ہے۔ راقم الحروف کو اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب علیہ الرحمہ کا وہ خطبہ صدارت بھی یاد آرہا ہے جو انہوں نے شعبان ۱۳۴۳ھ مطابق مارچ ۱۹۲۵ء کو آل انڈیا سنی کانفرنس مرادآباد کے قیام کے وقت پیش فرمایا تھا۔ اس کانفرنس میں تین سو کے قریب صرف علمائے کرام و واعظان اسلام اور مفتیان کرام کا اجتماع تھا اور سندھ سے لے کر ہند کے تمام صوبے کے مقتدر حضرات تشریف لائے تھے، مذکورہ خطبۂ صدارت کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''مجھے جو غم کھائے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس مبارک بنیاد کے وقت میری عمر کا بڑا حصہ گزر چکا ہے اور ضعیفی وناتوانی نے اس طرح مجھے گھیر لیا ہے کہ میں آپ کا ایک عضو معطل ہو کر رہ گیا ہوں اور سخت شرمندہ ہوں کہ اس مقدس تحریک کو کوئی نذر پیش کر کے میں حق سے سبک دوش نہیں ہو سکتا ہوں۔ ہاں! میری اسی برس کی کمائی میں صرف دو چیزیں ہیں جن کی قیمت کا اندازہ اگر آپ میری نگاہ سے کریں گے تو ہفت اقلیم کی تاجداری ہیچ نظر آئے گی۔ یہ میری بڑی قیمتی کمائی ہے، جس پر مجھ کو دنیا میں ناز ہے، آخرت میں فخر ہوگا، جس کو میں کبھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتا، لیکن آج اعلان حق کے لئے میں اپنی ساری کمائی نذر کر رہا ہوں۔ میرا اشارہ پہلے اپنے لخت جگر ونورالعین مولانا الحاج ابوالمحمود سید احمد اشرف اشرفی جیلانی پھر اپنے نواسہ وجگر پارہ مولانا الحاج ابوالحامد سید محمد محدث اشرفی جیلانی کی طرف ہے جن دونوں کی ذات میری ضعیفی کا سرمایہ ہیں۔ میں آج ان جگر کے ٹکڑوں کو نذر پیش کرتا ہوں کہ اعلان حق میں حیات کی آخری ساعت تک سنت واہل سنت کی خدمت جو سپرد کی جائے اس میں میری تربیت وحقوق کا حق ادا کریں۔''

(ماخوذ از مجلۂ اشرفی بابت مئی ۱۹۲۵ء)

مذکورہ بالا اقتباس حضرت محدث اعظم ہند کی شان قناعت و استغناء کے اسباب وعوامل کو ظاہر کر رہا ہے۔ بلاشبہ یہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی دعاؤں، تمناؤں اور امیدوں کا ثمرہ تھا کہ جب انہوں نے محدث اعظم کو اعلان حق میں حیات کی آخری ساعت تک سنت واہل سنت کی خدمت کے لئے نذر پیش کیا تو محدث اعظم نے بھی ان کی تربیت وحقوق کا حق ادا کر کے ان کے ''ناز'' اور ''فخر'' کو اپنا سرمایۂ نجات بنایا اور ان کے ضعیفی کے سرمایہ یعنی اپنی ذات کو ارباب سیاست و اقتدار نیز اہلِ دول سے دور دور اور محفوظ رکھا۔ محدث اعظم کی دیگر خدمات کی طرح اس طرز فکر وعمل کو بھی ایک اونچا مقام حاصل ہے، جس پر حضرت مخدوم سمنانی کی تعلیم وتربیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

عمر کے آخری سالوں میں حضرت محدث اعظم ہند کے اکثر تبلیغی دورے گجرات اور شوراشٹر میں ہوئے اور یہاں کے عوام وخواص دونوں کو اپنے فیوض و برکات سے مالا مال کر دیا۔ احمد آباد کی خانقاہ

اشرفی، بورسد کی خانقاہ اشرفی اور آمود کے رانا فتح سنگھ اشرفی کی حویلی ان کی مستقل قیام گاہ رہتی تھی۔ وہ اپنے مختلف پروگرام کے پیش نظر مذکورہ قیام گاہوں کو بدلتے رہتے تھے۔ ضلع بھڑوچ اور اس کے اطراف و جوانب میں جب ان کے جلسے ہوتے تو رانا فتح سنگھ اشرفی میزبانی کے سواShadow کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ ان ہی کا بیان ہے کہ رانا خاندان کے لوگ اسلامی تہذیب و معاشرت سے بیگانہ تھے۔ ان پر راجپوتوں کے موروثی اثرات چھائے ہوئے تھے اور جاگیر دارانہ ذہنیت نے ان میں کافی بگاڑ پیدا کر دیا تھا لیکن محدث اعظم ہند کو دیکھنے کے بعد سب کا نشہ غرور ہرن ہو گیا اور بہتیروں نے ان کے دامن سے وابستہ ہو کر فلاح و نجات کی راہ اپنائی۔ خانقاہ اشرفی احمد آباد کے نگراں اور محدث اعظم مشن گجرات پردیش کے صدر عبدالوہاب اشرفی نے مجھے بتایا کہ گجرات میں محدث اعظم ہند کی آمد کے بعد ہی دین و سنیت کو مزید استحکام اور سلسلۂ اشرفیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ وہ غریبوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان سے ملنے کی اگر کسی نواب یا جاگیر دار یا صاحب ثروت نے خواہش ظاہر کی تو وہ اسی خانقاہ کی ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر ہم غریبوں کے بیچ ملاقات کی اجازت دیتے تھے۔ اس مساویانہ طرز عمل نے ملت کی شیرازہ بندی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

ان بیانات سے راقم الحروف کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت محدث اعظم خود فرماتے تھے کہ میرے نانا اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب قدس سرہٗ کے پاس تین چیزیں تھیں۔ زمینداری، سجادگی اور رجوع خلق۔ زمینداری اپنے دوسرے صاحبزادہ کو دی، سجادگی اپنے پوتے کو دی اور رجوع خلق میرے حصہ میں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں صاحب کے روحانی تصرف کی زندہ مثال محدث اعظم کی مرجع خلائق ذات تھی، جسے دیکھ کر لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے۔ ان کی حیات مبارکہ کے آخری تین مہینوں کے واقعات کا میں خود عینی شاہد ہوں کہ انہوں نے بستر علالت پر بھی دعوت و تبلیغ کے فریضے سے غفلت نہیں برتی اور نہ افزائش عمل میں کوئی کمی آنے دی۔ حضرت محدث اعظم ہند کی آخری تحریر ''حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین'' آیت مباہلہ پر ایک فاضلانہ تقریر ہے اور جو ماہنامہ المیزان میں میرے ہی زمانۂ ادارت میں شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح افزائش عمل کے باب میں ان کے معمولات بیماری کے عالم میں بھی ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء تک ویسے ہی رہے جس طرح حالت صحت و عافیت میں رہا کرتے تھے۔ نماز پنج گانہ کے ساتھ مخصوص اوراد و وظائف کی پابندی، لوگوں کی کثرت آمد و رفت، علمائے لکھنؤ سے مجلسی مذاکرے، باہری مہمانوں کی ضیافت، ضرورت مندوں کی امداد و اعانت، دوسروں کے کرب و اضطراب پر تڑپ اٹھنا اور اپنے کرب و اضطراب کو چھپائے رکھنا، دوسروں کی خدمت کے لئے مستعد رہنا اور اپنی خدمت کے لئے مجھے بھی ہٹا دینا۔ آج ان سب حقائق پر غور کرتا ہوں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ علامہ فاضل کی فکر و نظر اعلیٰ حضرت اشرفی میاں کی مشیخت اور روحانیت اور مولانا سید احمد اشرف کی بصیرت و معرفت کچھ اس انداز سے محدث اعظم کی شخصیت میں تحلیل ہو گئی تھی کہ اس پر مخدوم سمنانی کا فیضان ہمیشہ سایہ گستر رہا اور آج بھی آستانۂ محدث اعظم ہند اسی مخدومی فیضان کا آئینہ دار ہے۔

❁❁❁

صوفیہ کی صفات کا اجمالی جائزہ

ذاتِ احسن العلما کے حوالے سے

سید محمد اشرف قادری برکاتی ...... خانقاہ برکاتیہ بڑی سرکار، مارہرہ شریف

قدیم صوبہ متحدہ کے دارالسلطنت اکبر آباد سے ملحق ضلع ایٹہ کے مغربی حصے میں واقع صوفیائے کرام کی مشہور و معروف بستی مارہرہ شریف یعنی حضرت سید شاہ برکت کے پریم میں ڈوبی ہوئی پیم نگری میں خاص شاہراہ کے شمالی حصے میں وہ عظیم الشان درگاہِ بے کس پناہِ برکاتیہ ہے جہاں بڑوں بڑوں نے اپنے سرِ عقیدت خم کیے، جس کو اپنے دور کے اساطین طریقت نے اپنا مرکزِ عقیدت بنایا، جہاں سے نہ جانے کتنے تشنگان معرفت جامِ معرفت پی کر راہ ہدایت پا گئے، جو آج بھی برصغیر ہند میں لاکھوں عوام، سیکڑوں علما و مشائخ کا مرکز عقیدت و مرجع خلائق ہے۔ اسی دربرکات و خانقاہِ عالی شان کی مدح سرائی کرتے ہوئے امام اہل سنت فرماتے ہیں:

اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں
مانگتے تاج دار پھرتے ہیں

کیسے آقاؤں کا بندہ ہوں رضا
بول بالے مری سرکاروں کے

یہ درگاہ شریف، درگاہِ شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ کے نام نامی سے موسوم ہے اور سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کا کوئی ذی علم شخص ایسا نہیں جو اس درگاہ اور درگاہ سے وابستہ خانقاہ کی دینی و علمی اور ملی خدمات کا معترف نہ ہو۔ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ برصغیر ہند و پاک میں قادریہ سلسلہ کی یہ سب سے بڑی درگاہ ہے وہ اس لئے بھی کہ سلسلہ قادریہ کا اجرا اس خانقاہ کے مرشدانِ کرام اور خلفائے عظام کے ہاتھوں جس قدر عمل میں آیا، کسی دوسری خانقاہ کے مرشدان عظام اور خلفا کے ہاتھوں عمل میں نہیں آیا اور بحمدہ تعالیٰ اس امر کی اہل خانقاہ نے، رب تعالیٰ کا خصوصی فضل اور اس کے حبیب صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی نگاہ کرم تصور کیا۔

عہدِ شاہجہانی کے مشہور و معروف صوفی شاعر صاحب البرکات سلطان العاشقین حضرت سید شاہ برکت اللہ عشقی پیمی بلگرامی ثم مارہروی رضی اللہ عنہ کی اس درگاہ میں اپنے اپنے دور کے وہ اکابر و مشائخ آرام فرما رہے ہیں جن کی ایک نگاہِ التفات نے عام انسانوں کو خاص لوگوں کی صف میں لاکھڑا کر دیا۔ اسی خاندان عالی شان کے چشم و چراغ وگل سر سبد تھے حضور احسن العلماء۔

شیخ المشائخ احسن العلماء سراج الاصفیاء سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں صاحب قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء بروز اتوار نبیرۂ خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آلِ عبا قدس سرہٗ کے گھر میں یعنی سیدہ شہر بانو صاحبہ بنت حضرت سید شاہ ابوالقاسم اسماعیل حسن شاہ جی میاں قدس سرہٗ زینتِ سجادہ برکاتیہ کے یہاں ہوئی۔ اس مہر درخشاں نے ۷۱ برس تک اپنی روشنی سے خانوادے، مریدین، متوسلین، معتقدین کے دلوں کو منور کیا۔ تصوف و سلوک کے اس ماہ تاباں نے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی دل خوش کن چمک سے ہر اس شخص کو راحت دی جس نے ایک لمحہ ان کا چہرہ دیکھا۔ حضرت احسن العلماء قدس سرہٗ نے اپنی تمام تر صوفیانہ صفات کے ساتھ کامل ۵۴ سال سجادۂ برکاتیہ کو رونق بخشتے ہوئے مذہب اہل سنت اور مسلکِ شاہ برکت کی ترویج و اشاعت فرمائی۔ خود بھی صراط مستقیم پر فائز رہے اور اپنے مریدین اور متوسلین کو اس راستے سے بھٹکنے نہ دیا۔ سلوک کی شان بچپن سے عیاں تھی۔ ابھی شعور بھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہو پایا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کو اپنی حیات کی منزل بنا لیا تھا۔ آپ کو بیعت و خلافت اپنے نانا مجددِ برکاتیت حضرت شاہ اسماعیل حسن صاحب قدس سرہٗ سے تھی۔ حضرت شاہ جی میاں نے آپ کو اپنی حیات مبارکہ ہی میں اپنا جانشین نامزد کیا۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت شاہ جی میاں کے فرزند اور آپ کے حقیقی ماموں حضرت

تاج العلماء سید شاہ اولادرسول محمد میاں صاحب قدس سرہ نے آپ کو اپنا اور اپنے والد ماجد حضرت شاہ جی میاں کا سجادہ منتخب کیا اور مسندِ برکاتیہ عطا فرمائی۔ حضرت احسن العلماء نے اپنی پوری زندگی اپنے اکابر کے طریقۂ احسن پر گزاری اور وعظ وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنے بزرگوں کے مرتب کردہ تصوف کے اعلیٰ اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کا ہر لمحہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج واشاعت میں وقف فرماتے ہوئے وہ آفتاب شریعت، ماہتاب طریقت ۱۵/جمادی الآخر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۱/ستمبر ۱۹۹۵ء کو غروب ہوگیا جو لاکھوں مریدین ومتوسلین کے دلوں کا قرار تھا، ہزاروں علماو مشائخ کے دلوں کا نور اور اہلِ خاندان کے لئے باعثِ تسکین قلبی تھا۔

وہ کیسا عظیم لمحہ ہوگا کہ جب خانوداہ برکاتیہ کے عظیم بزرگوں نے اس ولی صفت انسان کا نام رکھا ہوگا، جس نام کے ہر حرف سے روحانیت، معرفت اور طریقت کی خوشبو آتی ہے۔ یعنی سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں۔ یہ نام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور سید حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ناموں کا ایسا بابرکت امتزاج ہے کہ حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ کی ساری زندگی انہیں پاک ناموں کی خدمات کے سانچے میں ڈھل گئی اور کیوں نہ ہو، ماں باپ دونوں کی طرف سے ایسا سچا نسب پایا کہ ان مقدس ناموں سے نسبت رکھنے والی صفات کے سچے وارث ومصداق بن گئے۔ اگر حضور احسن العلماء کے نام کے حروف پر غور کریں تو ہر ہر حرف میں ایسی ایسی صفات پوشیدہ ہیں جو صفاتِ صوفیا کا مظہر بھی ہیں اور تصوف کے اجزائے ترکیبی بھی۔ انھیں صفات کا عکس ان کی پوری زندگی میں بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔

برادر بزرگ محترم سید امین اشرف صاحب کچھوچھوی مدظلہ العالی کا حکم ملا کہ صوفیا نمبر کے لئے یہ فقیر بھی کچھ رقم کرے لہٰذا حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے سے یہ مضمون رقم کیا۔

یہ تمام خصوصیات جو رقم کی ہیں یہ نہ صرف ایک اولاد کا مشاہدہ ہے جو ان کی پاک صحبت میں رہنے سے حاصل ہوا بلکہ ان کے ہر چاہنے والے، ملنے والے، برتنے والے کا بھی یہی مشاہدہ اور تجربہ ہے کیونکہ صوفیا اور اولیا کی ذات تو خوشبو کی طرح ہوتی ہے جو اپنا پرایا نہیں دیکھتی اس کا تو کام بس فضا کو معطر کرنا ہوتا ہے۔ حضرت احسن العلماء کی شخصیت بھی اپنے پرائے سب پر یکساں مہربان اور شفیق تھی اور شاید جنہوں نے اس ذات گرامی سے استفادہ کیا ہے وہ سارے لوگ اس مضمون سے نہ صرف اتفاق کریں گے اور اپنی زندگی میں ان تمام صفات کو اپنا کر اپنی زندگی کو روشن کرسکتے ہیں۔

س	سید
ی	یادِ الٰہی
د	دل جوئی، دانش مندی
ش	شیریں بیانی
ا	الفتِ رسول
ہ	ہمت
م	محبت اولیائے کرام
ص	صدور کشف وکرامات
ط	طریقۂ اجداد پر عمل
ف	فضلا کی عزت وتوقیر
ی	یگانگتِ عامہ
ح	حلم
ی	یقین کی دولت
د	دین کی خدمت
ر	ریا سے نفرت
ح	حکمت کی باتیں کرنے کی عادت
س	سرداری
ن	نعمتوں کی تقسیم
م	مہمان نوازی
ی	یقین کی دولت
ا	انسان نوازی
ں	نمازوں کی کیفیت

مختصراً ان صفات کی شناخت ان کی شخصیت میں کی جارہی ہے۔

س-سیادت:

وہ ماں اور باپ دونوں کی جانب سے نجیب الطرفین زیدی سید

تھے۔ شجرۂ نسب بیان ہو چکا ہے۔ سیادت کا لفظ شرافت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مارہرہ شریف کے درو دیوار گواہ ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ شرافت کی اعلیٰ اقدار پر زندگی بھر عمل کیا بلکہ شرافت کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جو ان کے بعد آنے والی پیڑھیوں کے لئے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ کھانے کے دستر خوان سے لے کر منبر ومحراب تک وہ شرافت کی تمام اعلیٰ اقدار کے حامل رہے۔ کبھی بازار میں کھڑے ہو کر کسی سے طویل گفتگو نہیں کی، کبھی بازار میں کھڑے ہو کر کوئی چیز نہیں کھائی، کبھی انکساری کا دامن نہیں چھوڑا، کبھی کسی کے غیاب میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جو ان کے منہ پر نہ کہہ سکتے ہوں۔ معاشی طور پر کیسے ہی حالات رہے ہوں، لیکن خاندانی وضع داری پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔

ی-یادالٰہی:

اللہ کی یاد ان کا ہر دم کا وظیفہ تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ کا نام لیتے۔ اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے، فجر سے بہت پہلے بیدار ہو جاتے اور یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ گھریلو گفتگو تک میں اللہ کی ذات وصفات کا زیادہ سے زیادہ ذکر رہتا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اس سے غافل نہیں رہے۔ آخری روز دن بھر کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے اور عشاء کے وقت جب جان جان آفریں کے سپرد کی تب بھی ہونٹوں پر یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم کی تکرار تھی اور دم واپسیں اللہ اللہ کہتے ہوئے اس دارِ فانی کو الوداع کہا۔ گھر کے بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ بچپن ہی سے جب کہ بالغ بھی نہیں ہوئے تھے پنج وقتہ نماز کے پابند ہو چکے تھے، قرآن عظیم کے حافظ تھے اور اللہ کی اس عظیم کتاب کا ورد ان کا معمول تھا۔

د-دل جوئی، دانش مندی:

ان کے سینے میں سب کے لئے شفقت ومحبت کے دریا لہریں لیتے تھے، اعزہ ہوں کہ احباب، علمائے کرام ہوں کہ مشائخ عظام، خدام ہوں کہ عوام، بزرگ ہوں کہ خرد، ان کی محبت کا فیضان عام تھا، کسی کو پریشان دیکھتے تو خود بے چین ہو جاتے اور جب تک اس کی پریشانی رفع نہ ہوتی اس کی دل جوئی کرتے رہتے۔ خانقاہ کے خدام کو اگر تنبیہ کے طور پر ان کی اصلاح کے پیش نظر کبھی ڈانٹ دیا تو ڈانٹنے کے بعد خود بے چین ہو جاتے اور حتی الوسع اس خادم کی دل جوئی کرتے۔ سید رفیع الدین مرحوم جو گھر کے پرانے خادم اور کارندے تھے، اکثر حضور احسن العلماء کی تنبیہ سے مشرف ہوتے، پھر خود ہی تھوڑی دیر بعد ان کی دل جوئی کر دیتے اور اتنے احسن طریقے سے کرتے کہ ڈانٹ کھانے والا انتظار کرتا کہ کاش ہماری بھی ایسی قسمت ہو کہ میاں کبھی ہمیں بھی ڈانٹیں۔

اعزہ سے ان کے منصب اور رشتے کے لحاظ اور تناسب سے احترام کرتے اور اگر کسی سے شاکی بھی ہوتے تو اس کا اظہار نرم الفاظ اور مدہم لہجے میں کرتے تا کہ ان کے مطمح نظر کی ترسیل بخوبی ہو جائے اور خواہ مخواہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اپنے بدقسمت وبدترین دشمن کا ذکر بھی شیریں الفاظ اور متبسم لہجے میں کرتے۔ اگر ان کے کسی دشمن کی بھی غیبت ان کے سامنے ہوتی تو وہ مضطرب ہو جاتے اور موضوع بدل دیتے۔

کوئی حد ہے بھلا اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اپنے بچوں کو بہت چاہتے تھے اور ان بچوں میں اپنے بھائی اور بہنوں کے بچوں کو بھی شامل سمجھتے تھے۔ ہم میں سے کسی سے ناراض ہوتے تو بلا مبالغہ ہم پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، لیکن یہ ان کی شفقت کو گوارہ نہیں تھا کہ ایسی کیفیت تادیر قائم رہے، تھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے بات شروع کر دیتے اور اس انداز سے مخاطب کرتے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ تھوڑی دیر پہلے اس پیکر جمال پر رنگِ جلال چھایا ہوا تھا۔

اگر کسی کو ملول دیکھتے تو فکر مند ہو جاتے اور اس کے ملال کا سبب جاننے کے بعد تلافی کی کوئی صورت پیدا کر دیتے۔

اپنے برادر حقیقی کا خط نہ ملنے پر اپنی بھانجی سیدہ حمیرا خاتون کو ۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اس بار نہ جانے کیا بات ہے حسین میاں سلمہٗ بالکل خاموش ہیں۔ میں نے بمبئی پہنچنے سے اب تک انہیں ۳ خطوط بھیجے۔ ان کے ہاتھ سے کسی کی رسید تک نہیں ملی، فکر ہے۔ دعاہائے خیر برابر کرتا رہتا ہوں۔ اگر خدانخواستہ میری طرف سے انہیں کوئی رنج پہنچا ہو تو مجھے بے تکلف مطلع کر دیں، اس کی تلافی بہ احسن وجوہ ہو جائے گی۔ انشاء اللہ،

باقی سب خیریت ہے۔

اچھا خدا حافظ ماموں جان"

ان کی دل جوئی کے واقعات کہاں تک بیان کروں، جس شخص کو بھی ان کی قربت کا فیض حاصل ہوا، وہ بذات خود حضور احسن العلماء کی اس ممتاز صفت کا شاہد ہے۔

ان کے کسی ملازم کی طبیعت خراب ہو جاتی تو بہ نفس نفیس اس کے گھر جا کر عیادت کرتے، ملازم شرمندہ ہو جاتا تو اس کا اضطراب دور کرنے کے لئے کہتے کہ آپ کی ناسازی طبع کی وجہ سے آپ کو کئی دن سے دیکھا نہیں تو سوچا آج چل کر آپ سے مل لیں۔ ملازم کا چہرہ یہ سن کر بشاش ہو جاتا اور آدھی بیماری ان جملوں سے ہی دور ہو جاتی۔

دانش مندی:

خداداد صلاحیت اور مرشد مجازی حضرت تاج العلماء علیہ الرحمۃ و الرضوان کا فیض تربیت تھا کہ باری تعالیٰ نے ان کے لئے دانش کی دولت ارزاں کر دی تھی۔ اپنے بچپن سے لے کر آخری دم تک سیکڑوں مرحلے آئے، لیکن انہوں نے کبھی ہوش کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ جوش کے بھی قائل تھے لیکن جوش میں مبالغے سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ وہ اکثر ایک بلیغ جملہ استعمال کرتے:

"اتنا بھاگ کر نہ چلو کہ گر پڑو"

سمجھنے والے جانتے ہیں کہ اس جملے میں کیا اسرار ہیں۔ اس صاحب بصیرت کے دل کی آنکھوں نے مستقبل کا نقشہ دکھ لیا تھا۔ خانقاہوں میں سیاست کے دخول سے خانقاہوں کی عظمت پر جو حرف آتا ہے، اس سے واقف تھے، وہ مرض کے اسباب سے بھی واقف تھے اور اس کے علاج آشنا بھی تھے۔ پیرزادے اگر جاہل ہوں تو ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے عقیدت کے جال کا فائدہ سب سے پہلے پارٹی بندی والے سیاست داں ہی اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے شروع سے ہی اپنی اولاد کو ابتدائی گھریلو دینی تعلیم اور مدرسے کی پابندی کے بعد اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کیا تھا کہ جہالت کا اژدہا خانقاہی عظمتوں کو نہ نگل سکے۔ وہ اپنی اولاد میں دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا امتزاج دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بفضلہ تعالیٰ اپنے بازو کی کمائی کھائے اور مریدین کی نذر پر نظر نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ان کی دعائیں قبول فرمائیں۔ وہ اکثر نصیحت کرتے کہ بازار میں کبھی وقت نہ گنوانا، اس کے بجائے باغ اور جنگل کی سیر و تفریح کا لطف لینا اور اس کے لئے وہ ضروری سامان بھی فراہم کرتے۔ وہ کاموں کو صرف اسی حد تک پھیلاتے جسے آسانی سے سمیٹا بھی جا سکے۔ اعراس ہوں یا شادی بیاہ کی محفلیں، وہ اپنی دنیاوی بساط کے اندر ہی سارے کام کرتے، کسی سے چندہ مانگنے کی نوبت نہیں آنے دیتے۔

خانقاہ، درگاہ و مساجد میں انہوں نے بہت تجدید کاری کی اور خود نئی عمارات بھی تعمیر کرائیں۔ عمارت تعمیر کرنے سے پہلے معمار کو بلا کر تخمینہ لیتے اور اگر دیکھتے کہ معمار کے تخمینے سے ڈیوڑھا موجود ہے، تب کام شروع کراتے، بتاتے تھے کہ بیٹا معمار حضرات شروع میں کم تخمینہ بتاتے ہیں تاکہ کام شروع کرا دیا جائے، بعد میں کام کرانے والا کسی نہ کسی طرح قرض ادھار لے کر مکمل کرا ہی لے گا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کا یہ خیال بالکل درست ہوتا تھا۔

اعراس کی تاریخوں کو موسم کے پیش نظر زائرین اور کارکنان کی سہولت کی خاطر تبدیل کر دیتے اور تحریری طور پر اعلان فرما دیتے۔ البتہ اصل تاریخ پر خانقاہ میں مقامی طور پر فاتحہ نیاز ضرور کرا دیتے۔ تاریخ پر اصرار کرنے کے مقابلے میں وہ زائرین عرس اور کارکنان تقریب کی آسانی اور سہولت کو پیش نظر رکھتے۔

فتنے فساد کی جگہ سے خود بھی دور رہتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ وہ ایسی جگہوں پر جانے سے احتراز کرتے جہاں اس بات کا رتی بھر بھی اندیشہ ہو کہ فتنہ یا فساد ہو سکتا ہے۔ وہ طبعاً امن پسند اور عافیت خواہ تھے۔ گھر میں زمین داری کا بھی سلسلہ تھا۔ مقدمات کا زمین داری سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی تلقین فرماتے کہ جہاں تک ہو سکے آج کے کورٹ کچہری کے ماحول میں مدعی بن کر نہیں جانا چاہیے۔ وہ اللہ سے دعا کرتے کہ خدا دشمن کو بھی کورٹ کچہری سے دور رکھے۔

وہ جب بھی کسی کام کا ارادہ کرتے تو اس کے منفی پہلو پر پہلے غور کر لیتے۔ اپنے مریدوں اور بچوں کو بھی ان کی یہی نصیحت تھی کہ مثبت پہلو تو بہت چمک دار ہوتے ہیں، سامنے نظر آ جاتے ہیں لیکن منفی پہلو تہ

اندر رہتے ہیں۔ ان کو بھی خوب اچھی طرح جانچ لینا چاہیے، پھر کسی کام کا ارادہ کرنا چاہیے۔

اپنے تبلیغی دوروں میں منتظمین کو خاص طور سے ہدایت کر دیتے کہ جب تک میں قطعی طور سے دن اور تاریخ کے ساتھ حامی نہ بھرلوں میرا نام اشتہار میں نہ دیجیے گا۔ خدانخواستہ کسی وجہ سے نہ آسکا تو آپ کی اور میری دونوں کی بدنامی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر وہ کسی وجہ سے جلسے میں شرکت نہ کرپاتے تو کسی کو بھی منتظمین پر حرف گیری کا موقع نہ ملتا اور اگر شرکت کر لیتے تو سب انہیں دیکھ کر سرشار ہو جاتے اور سامعین بھی منتظمین کا شکریہ ادا کرتے کہ اشتہار میں نام نہ ہونے کے باوجود آپ لوگوں نے حضور احسن العلماء کو جلسے میں بلالیا۔ اسی لئے وہ کسی جلسے کے لئے پیشگی کرایہ نہیں لیتے۔ کوئی ارسال کر دیتا تو منی آرڈر واپس کر دیتے۔

بڑے ابا حضور سید العلماء علیہ الرحمۃ اور قصبے کے چیئرمین بابو اوم پرکاش کے درمیان ایک کھیت کے سلسلے میں مقدمہ تھا۔ برسوں وہ مقدمہ چلتا رہا۔ نوعیت کچھ ایسی تھی کہ فریقین کے پاس کاغذات کمزور تھے۔ بڑے ابا علیہ الرحمۃ مقدمے سے بیزار ہو گئے اور پاپا علیہ الرحمۃ سے فرمایا للّٰہ! اب ہم سے یہ مقدمہ نہیں لڑا جاتا۔ پاپا نے فرمایا: ٹھیک ہے، آپ فکرمند نہ ہوں میں مقدمہ لڑوں گا۔ اس کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے پیروی کرانے لگے، کافی اخراجات بھی ہوئے، اس درمیان ۱۹۷۴ء میں بڑے ابا علیہ الرحمۃ نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔ بڑے ابا کے جانشین ہمارے بھائی صاحب حضرت حسنین میاں مدظلہ سرکاری ملازمت میں تھے۔ احسن العلماء علیہ الرحمۃ نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا اور بابو اوم پرکاش کو گھر پہ بلا کر بھائی صاحب سے ملاقات کرائی اور کہا کہ یہ عمر میں آپ کے بیٹے کے برابر ہیں۔ آپ کو زیب نہیں دے گا کہ آپ ان سے مقدمہ لڑیں، بہتر ہوگا کہ فیصلہ کرلیں۔ اسی دن بابو اوم پرکاش نے نصف نصف پر فیصلہ کرلیا اور وہ قصہ ختم ہوا، ورنہ گھر کی زمین، کاغذات کی کمزوری اور فریق مخالف کی دنیاوی طاقت کی وجہ سے یا تو مکمل طور سے ہاتھ سے جاتی رہتی یا پھر گرام سبھا کے ہتھے لگ جاتی۔ بفضلہ تعالیٰ آج وہ زمین بھائی صاحب مدظلہ کے قبضے میں ہے اور سرسبز ہے۔

قصبے کی ایک مسجد میں خنزیر کاٹ کر ڈالنے کا واقعہ بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح حضور احسن العلماء نے ایک بڑے فتنے کی سرکوبی فرمائی تھی۔

مسجد برکاتی میں آثار متبرکہ ہیں جن کی اعراس میں زیارت ہوتی ہے۔ یہ آثار متبرکہ بڑی سرکار کے صاحبزادگان کی ملکیت بدرجہ مساوی ہیں لیکن ان کی حفاظت کا دنیاوی انتظام حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ کے سپرد تھا جو اب حضرت امین ملت مدظلہ العالی کے سپرد ہے۔ ایک بار خاندان کے کچھ بدافراد کی سازش کے نتیجے میں آثار متبرکہ کی چوری ہوگئی لیکن بفضلہ تعالیٰ فوراً شناخت ہو کر تمام آثار متبرکہ کی ریکوری Recovery ہوگئی اور دادا حضرت سید شاہ آل عبا علیہ الرحمۃ خلیفہ حضرت سید ابوالحسین احمد نوری علیہ الرحمۃ کی سپردگی میں ایک ایک چیز دے دی گئی جو بفضلہ تعالیٰ واپس اپنی اپنی جگہ پر بخیر و خوبی پہنچ گئی۔ اس واقعہ کے پیش نظر حضور احسن العلماء کو یہ کبھی گوارہ نہیں ہوتا کہ کوئی مسافر خانقاہ میں آئے اور مسجد میں قیام کرے۔ وہ مسجد کے آداب اور شریعت کے مسائل بتا کر اس مسافر کو مسجد میں قیام کرنے اور سونے سے منع فرماتے اور خانقاہ کا کوئی کمرہ کھلوادیتے تاکہ وہ مسجد میں قیام کرنے کے بجائے خانقاہ میں قیام کرے، کیونکہ مسافر کے چہرے پر تو لکھا ہوتا نہیں کہ یہ عام زائر ہے یا چور، مسافر بھی خوش رہتا اور آثار متبرکہ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی بخیر و خوبی پوری ہو جاتی۔

کبھی بھی کسی خانقاہ یا وہاں کے افراد کی برائی نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح خانقاہی نظام کمزور ہو جاتا ہے اور اس کا نقصان آخری طور پر مذہب اہل سنت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ آج کے ماحول کے پس منظر میں ان کے اس خیال کو ذرا اپنے تصور میں رقصاں کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا ایک ایک لفظ کس کس زاویے سے لشکارے مار رہا ہے۔

ملازمین کا بہت خیال فرماتے تھے۔ وہ اس کی تخصیص نہیں کرتے تھے کہ ملازمین، ان کے ذاتی ملازمین ہیں یا درگاہ و مسجد کے خادم ہیں۔ ان کی خوشی، غمی، بیماری سب میں ان کا خیال رکھتے تھے۔ معینہ تنخواہ کے علاوہ ہر ملازم کو نقد یا جنس کی شکل میں اتنا عطا کر دیتے کہ وہ اصل تنخواہ سے زیادہ ہو جاتا۔ بفضلہ تعالیٰ آج ان کے ہر ملازم کے پاس مارہرہ شریف جیسے چھوٹے سے قصبے میں پختہ اور آرام دہ مکان موجود ہے اور تمام ملازمین کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ آج ان کے پردہ فرمانے کے پانچ سال بعد بھی جب بھی کوئی خادم ان کا ذکر کرتا ہے تو آب دیدہ ہوجاتا ہے۔ حضور احسن العلماء کا خیال تھا کہ گھر کے ملازمین اگر خوشحال رہیں گے تو اللہ تعالیٰ خوش ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ ملازم بھی وفادار رہے گا اور اپنی آنے والی نسل کو اپنے سے بہتر مقام پر لے جانے کی کوشش کرے گا۔

ش- شیریں بیانی اور جوہر خطابت:

۱۹۴۲ء سے لے کر سفر آخرت سے کچھ پہلے تک مسجد برکاتی میں نماز جمعہ سے پہلے آدھے گھنٹے کا وعظ فرماتے۔ قصبے کے افراد کے علم و ضرورت کے مطابق بہت سمجھا سمجھا کر دین کی باتیں بتاتے، دنیا کی باتیں سمجھاتے، لہجہ اتنا نرم ہوتا کہ لوگ کہتے کہ میاں بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ ان بیانات میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل بھی ہوتے، الفتِ رسول کا ذکر بھی ہوتا اور دنیا میں جینے کے آداب بھی ہوتے۔ مسجد برکاتی میں ان کے بیان کردہ مواعظ کے سیکڑوں کیسٹ حافظ شریف احمد برکاتی کے پاس ہیں۔ انہیں یکجا کر کے کتابی صورت میں مرتب کرلیا جائے تو علم و معرفت کے صدہا موتی ایک بڑے سے ہار میں گندھ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضور احسن العلماء ایک بے مثال مقرر تھے۔ ان کے بیان میں سلاست، تلقین، خطابت اور تفہیم کے پہلو بہت روشن تھے۔ انہوں نے اپنے پیہم چوبن برس تک خانقاہ برکاتیہ کی جامع مسجد برکاتی کے منبر سے رہنمائی فرمائی۔ اگر ان کی تقاریر کے موضوعات اور طرز خطابت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نکات سامنے آتے ہیں۔

ان کے موضوعات میں توحید، حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، محبت اولیائے کرام، پابندی فرائض کی تلقین، حقوق العباد کی پاسداری، فتنوں سے دور رہنے کی نصیحت، شعائر اسلامی پر اصرار، مخلوق خدا سے محبت، شہدائے اسلام او راولیائے کرام کے واقعات سے اولوالعزمی کے نتائج اخذ کرنا، بری رسومات سے پرہیز، حصول علم پر زور وغیرہ شامل تھے۔ اسلامی تاریخ ان کا مستقل موضوع تھا جس پر وہ بے تکان تقریر کرتے تھے۔

مندرجہ بالا موضوعات کی ادائیگی کے لئے ان کی خطابت نے جن اسلحہ جات کا انتخاب کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

آیات قرآنی، احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، تاریخ اسلام، صحابہ کے واقعات، سعدی، جامی، رومی کے حسب موقع اشعار، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی تصنیف 'حدائق بخشش' کے برمحل اشعار، تسہیل بیان کے لئے مترادفات کا استعمال، چھوٹے چھوٹے جملوں کا عام فہم انداز میں استعمال، عربی گرامر کی نزاکتوں سے سامعین کو بے تکلف کرنا۔

حضرت والا کی خطابت میں بڑی روانی تھی۔ ان کی آواز بلند اور گونج دار تھی، مائک کے بغیر ان کی تقریر دور دور تک سنی جاتی تھی۔

ان کی خطابت کا اعلیٰ ترین جوہر یہ تھا کہ وہ آیات قرآنی سے اپنے مدعا کی تائید و تصدیق کرتے چلتے تھے۔ قرآن کریم کے متن اور مفاہیم پر ان کا استحضار ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسرا وصف جس کا بیان ضروری ہے کہ ان کی خطابت میں کہانی یا افسانے والی یکسوئی، یک رُخا پن اور تسلسل نہیں تھا بلکہ ان کی خطابت میں داستان جیسی علویت، پھیلاؤ اور گمبھیرتا تھی، لیکن وہ ''بات یہاں سے شروع ہوئی تھی'' فرما کر پھر اپنے موضوع پر لے آتے تھے۔ ان کی خطابت کا سامع ان کا مقتدی نہیں رہتا تھا، ہم سفر بن جاتا تھا اور جب وہ ان کی خطابت کے میدان میں ان کے ساتھ داخل ہوتا تھا تو دیر تک ان کے ساتھ مختلف ''مقامات'' کی سیر کرتا تھا۔ کہیں توحید کی وادیوں سے گزر رہا ہے، کہیں حب رسول کے گلستانوں میں سیر کر رہا ہے، کہیں سلوک و معرفت کے مرحلے ہیں، کہیں تاریخ وادب کے دریا بہہ رہے ہیں، کہیں فرائض وواجبات کے نظارے ہیں تو کہیں حقوق العباد کے ماہ پارے ہیں۔ آواز کا زیر و بم، مقامی الفاظ کا بے تکلفانہ استعمال، جذبے کی شدت اور فکر کی حدت سامع کو ایک عجیب وغریب دنیا میں لے جاتی تھی اور جب وہ اس دنیا سے واپس آتا تو دیکھتا تھا کہ حضور احسن العلماء کا نورانی چہرہ سامنے اور وہ دست دعا بلند کیے ہوئے اپنے رب کے حضور میں اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے تمام زمانے کے لئے دعا مانگ رہے ہیں۔ سامع کا سفر ختم ہوتا اور وہ دیگر سامعین کی 'آمین' میں اپنی آواز ملا دیتا تھا۔

اعزہ، احباب، مریدین اور متوسلین کے علاوہ اپنے خدام سے بھی بہت شیریں بیانی سے پیش آتے، تعویذ لینے والے افراد ناوقت آتے تو کبھی ماتھے پر شکن تک نہ لاتے۔ البتہ اتنا کہہ دیتے کہ جمعہ کے

دن مجھے چھٹی دے دیا کرو۔ علم نفسیات کا ایک کلیہ ہے کہ بچوں سے محبت وشفقت کرنے والا شخص دل کا بہت نیک ہوتا ہے۔ ان کو دیکھ کر اور برت کر علم نفسیات کے اس کلیے پر یقین اور زیادہ جم جاتا۔ وہ بہت واضح گفتگو کرتے تھے۔ الفاظ پورے مخارج کے ساتھ ادا کرتے اور گفتگو کے تقاضے کے مطابق لہجے میں اتار چڑھاؤ کا خیال رکھتے۔ کوئی مشکل لفظ منہ سے ادا ہوتا تو فوراً اس کے آسان مترادفات کے ڈھیر لگا دیتے تا کہ سامنے والا بات کو اچھی طرح سمجھ لے۔ گفتگو میں اکثر عربی، فارسی اور اردو کے اشعار بھی پڑھتے، عربی میں حضرت حسان بن ثابت، فارسی میں رومی وسعدی اور اردو میں میر اور اعلیٰ حضرت کے اشعار بے تکان پڑھتے۔

سیرت نبوی کے واقعات سناتے، اسلامی تاریخ کی باتیں بتاتے اور خاندانی واقعات پر روشنی ڈالتے۔ احباب کے مجمع میں ہوں تو جس گاؤں کا ہے، اسی کے لحاظ سے اس سے بات کرتے۔ وہ اس بات کی قطعی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے تھے لیکن رب کریم کا ان پر کرم تھا کہ ان سے متعلق ہر شخص سمجھتا تھا کہ میاں ہم کو بہت چاہتے ہیں۔

انہوں نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور متواتر پانچ چھ گھنٹے تک تقریر کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ وہ خطبے کے بعد قرآنی آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے پھر ان کا مفہوم آسان زبان میں بیان کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے کچھ شعر پڑھتے اور پھر خطاب کا وہ جلوہ دیکھنے کو ملتا کہ جس زمین میں بات کرتے، وہ آسان ہو جاتی۔ ان کی آواز بہت شیریں اور دور تک سنائی دینے والی تھی۔ ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ بغیر مائیکروفون کے مجمع کے آخری کنارے تک بہ آسانی سنا جاتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بڑے ابا علیہ الرحمۃ کا چہلم تھا اور حضور والد ماجد قدس سرہٗ نے قل کے وقت بیان شروع کیا۔ جلسے میں حضور مفتی اعظم ہند، حضرت برہان ملت، حضور مجاہد ملت، مولانا مشتاق احمد نظامی جیسے جید علمائے کرام موجود تھے۔ حضور احسن العلماء نے لفظ 'قـل' پر گفتگو فرمائی اور دوران گفتگو مجمع ان کے چہرے کی طرف ساکت وجامد بنا دیکھتا رہا اور وہ قرآنی آیات سے ثابت کرتے رہے کہ 'قل' میں کیسی کیسی نعمتیں پنہاں ہیں۔ 'قل' میں محبت ہے 'قل' میں پناہ ہے اور 'قل' میں وحدت ہے۔ جس وقت وہ اپنی تحقیق پیش کر کے تصدیق کے طور پر قرآنی آیات پڑھتے تو مجمع سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھتا۔ مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے جب مندرجہ بالا اکابرین وعلمائے کرام حضور احسن العلماء کے وعظ کو سن کر انہیں کیسی محبت اور عقیدت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور غالباً دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ حضور سید العلماء جیسے جید واعظ کا وصال ہو گیا لیکن بفضلہٖ تعالیٰ خانقاہ برکاتیہ ابھی خالی نہیں ہوئی بلکہ خاندان کے بزرگوں کے روحانی فیض میں اب حضور سید العلماء کا فیض روحانی بھی شامل ہو گیا کہ آج نائب شاہ برکت اللہ روحانیت ومعرفت کے کیسے بیش قیمت موتی لٹا رہا ہے۔

اپنی آخری علالت کی پہلی رات میں، جو رمضان المبارک کی ۲۷ رویں شب تھی، بھی ایک عجیب وغریب عالم تھا۔ شیریں بیانی، روحانیت اور معرفت کی دو آتشہ کے ساتھ جذب کے پیالے میں تقسیم کی جا رہی تھی اور مسجد کھڑک کے حجرے سے بلند ہونے والے نعرے باہر سڑک پر سنے جا رہے تھے۔

ان کی خطابت کی جلوہ سامانی کا بیان پڑھنا ہو تو آئیے مولانا محمد عبدالمبین نعمانی قادری سے رجوع کریں جو اپنے مضمون 'حضور احسن العلماء والمشائخ ، ایک نادر روزگار شخصیت' میں رقم طراز ہیں:

''۱۰ر محرم الحرام ۱۴۱۰ھ/۱۳ر اگست ۱۹۸۹ء روز یکشنبہ کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جب برادر گرامی حضرت مولانا بدرالقادری (مبلغ انگلستان) کی ہمراہی میں پہلی بار مارہرہ شریف حاضر ہوا، وہاں پہنچنے کے بعد اپنے احساسات کیا رہے، یہ تو الگ موضوع ہے۔ صبح کے وقت جب ہم لوگ آستانے کی مسجد میں پہنچے تو اچانک اعلان سنا کہ آج دسویں محرم ہے۔ آج بانی سلسلہ برکاتیہ حضرت سید شاہ برکت اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عرس مقدس ہے اور حضور احسن العلماء خطاب فرمائیں گے۔ یہ اعلان سنتے ہی دل کی کلیاں کھل اٹھیں، عقیدتوں کا خمار اور بڑھ گیا۔ آستانہ جات کی حاضری کی سعادت کے ساتھ ساتھ حضور احسن العلماء کی زیارت کا جو اشتیاق دلوں میں تھا، اس کی تکمیل امید وبیم کے حیز سے نکل کر یقین کے اجالے میں آچکی تھی۔ اگرچہ اس سے قبل

حضرت کی دو بار زیارت کا شرف حاصل ہو چکا تھا، لیکن وہ زیارتیں صرف دید کی حد تک محدود تھیں، گفت وشنید کی نوبت ونعمت سے محروم تھے۔ اب آگے اس سفر موجب ظفر کی مختصر روداد مولانا بدرالقادری صاحب کے سفر نامے 'جادہ ونزل' سے انہیں کے قلم عقیدت رقم سے ملاحظہ کیجیے:

''آج ان شہباز انِ معرفت کے مقدس آستانے نگاہوں کے سامنے تھے۔ مسرت و شادمانی سے دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ جذبات کی عجیب کیفیت تھی، خانقاہ شریف کے صدر دروازے سے بہت پہلے رکشہ سے اتر گئے اور پیدل چل کر آستانہ بوسی کرتے ہوئے پہلے مسجد میں داخل ہوئے۔ غسل ولباس میں مصروف تھے کہ خادم نے آکر خبر دی۔ آج عاشورہ محرم ہے۔ قرآن خوانی شروع ہو چکی ہے، خانقاہ برکاتیہ میں آج سید الشہدا، نوشاہ گلگوں قبا شہید کربلا رضی اللہ عنہ کی فاتحہ کے ساتھ امام الاولیاء حضرت مولانا سید شاہ برکت اللہ مارہروی علیہ الرحمۃ کا عرس بھی ہے۔ خانقاہ برکاتیہ کے موجودہ سجادہ نشین بقیۃ السلف حضرت علامہ سید شاہ حسن میاں صاحب قبلہ دامت برکاتہم کی ملاقات اور زیارت بھی سفر کا خاص مقصد تھا۔ نعمانی صاحب راستے میں بتا رہے تھے کہ باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ چند لمحوں کی زیارت ہو جائے تو بھی غنیمت ہے۔ ہم عمر ہا عمر کے پیاسے مگر اس بارگاہ کی چند بوندوں کو بھی دریاؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔ خدا نے کرم ایسا کیا کہ عاشورہ کی تاریخ خاص حضرت حسن میاں کے وعظ کی تاریخ نکلی۔ اب ہم لوگ مسجد ہی میں تھے کہ کاس گنج کے مولانا قاری صغیر احمد صاحب برکاتی تشریف لائے۔ تعارف ہوا اور انہیں کے ہمراہ ہم لوگ خانقاہ شریف میں حاضر ہوئے، نعت خواں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی نعتیں پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں حضرت حسن میاں صاحب قبلہ تشریف لائے۔ ملاقات کی، پھر کیا تھا تقریر شروع ہوئی۔ ڈھائی گھنٹے تک تصوف وتاریخ اور معارف وحقائق پر گھن گرج کی بارش ہوتی رہی اور تقریباً پوری تقریر کے مخاطب اول ہم ہی لوگ تھے۔

(جادہ ومنزل از مولانا بدرالقادری شائع کردہ المجمع الاسلامی مبارک پور۔ ص۔۴۷۹-۴۸۰)''

اس محفل کا اختتام بھی حسب روایت اہل سنت صلوٰۃ وسلام اور دعا پر ہوا پھر شیرینی تقسیم ہوئی، اس واقعے کی خاص بات جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس محفل میں دو ڈھائی گھنٹے کی تقریر کے بعد بھی صلوٰۃ وسلام خود احسن العلماء ہی نے پڑھا اور سلام بھی کون وہی امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ کا جاں نواز، ایمان افروز، عشق آگیں اور مشہوم انام اسلام یعنی ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' اور آخر میں اضافے کے طور پر جب سرکار احسن العلماء نے یہ شعر پڑھا

ڈال دی قلب میں عظمت مصطفیٰ
سیدی اعلیٰ حضرت پہ لاکھوں سلام

تو میری آنکھوں میں عقیدت ومسرت کے آنسوامنڈ آئے کہ واہ رے امام احمد رضا کی مقبولیت کہ ان کے آقازادوں کی ان سے عقیدت ومحبت جس پر ہزار جان قربان ہونے کو جی چاہتا ہے اور سچ پوچھیے تو امام احمد رضا خاں علیہ الرحمۃ کی ان کی سرکاروں میں یہی مقبولیت ہے جس نے ان کو چار دانگ عالم میں محبوب ومقبول بنا دیا۔

۱- الفتِ رسول:

وہ الفتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یا اللہ اور یا رسول اللہ منہ سے نکلتا۔ سیرت پاک پر گفتگو کرتے تو آنکھیں وفور محبت سے بھیگ جاتیں۔ اپنے وعظ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتے تو ہم لوگوں کو محسوس ہوتا گویا ہم چشم تصور سے آقائے دو جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو ان کا چہرہ کھل جاتا۔ حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا ذکر فرماتے اور فوراً ہی کسی فارسی شاعر یا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کا کوئی شعر پڑھ دیتے اور وہ شعر اس موضوع سخن کے لحاظ سے اتنا مناسب ہوتا کہ

سننے والے کے دل کی کلی کھل اٹھتی، جب سلام کا وقت آتا تو بہت جوش و خروش اور بلند آواز سے ترنم کے ساتھ سلام پیش فرماتے۔ شدت جذبات کا یہ عالم ہوتا کہ پیشانی مبارک پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے بہنے لگتے۔ سنتوں پر عمل کرنے میں بہت رغبت تھی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت ان کا بایاں قدم پہلے اندر گیا ہو یا باہر آتے وقت دایاں قدم پہلے باہر آیا ہو۔

کھانا کھاتے وقت سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا خیال رکھتے۔ حتیٰ کہ نشست تک میں اس بات کی احتیاط رکھتے کہ کھانا کھاتے وقت حضور کے جس طریق نشست کا ذکر احادیث میں آیا ہے اسی طرح کی نشست ہو۔

کھانے کی پلیٹ میں اپنے سامنے والے حصے سے شروع کرتے جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ روٹی کو کبھی دانت سے کاٹ کر نہیں توڑتے تھے۔ ایسا کرتے کسی کو دیکھتے تو فوراً سرزنش کرتے، روٹی کا نوالہ روٹی سے کیسے علیحدہ کیا جائے، کر کے سمجھاتے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت کا مطلب ہے ان کی اتباع، ان کی اتباع کا مطلب ہے ان کے عمل اور قول کے مطابق عمل کرنا، وقت رحلت بھی وہ اس سے غافل نہیں رہے۔ رحلت سے تھوڑی ہی دیر پہلے انہوں نے ایک پیالے میں پانی منگا کر مجھے حکم دیا کہ ان کے ماتھے اور چہرے پر پانی لگاؤں۔ مدارج النبوۃ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل اسی سے ملتا جلتا عمل فرمایا تھا جس کی شہادت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پر انہوں نے کسی قسم کا کمپرومائز (سمجھوتہ) نہیں کیا۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ سے حضور احسن العلماء کو جو ایک مخصوص والہانہ محبت تھی، وہ بھی غالباً عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دین تھی۔ مسلک اعلیٰ حضرت کی اساس الفت رسول اور عظمت نبی پر قائم ہے۔ اسی لئے تو حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ نے وقت آخر سے دو تین دن پہلے اپنے بچوں کو جو وصیت کی وہ یہ کہ:

"مسلک اعلیٰ حضرت پر مضبوطی سے ڈٹے رہنا، میرا جو مرید اس مسلک سے ہٹ جائے، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔"

(الفاظ میرے ہیں لیکن مفہوم وہی ہے جو حضرت امین ملت مدظلہ العالی نے مجھے بتایا کہ اس وصیت کے وقت میں اسپتال کے اس کمرے میں موجود نہیں تھا۔ رفیق ملت سید نجیب حیدر سلمہ موجود تھے۔)

وہ مسلک اعلیٰ حضرت کو عشق رسول، عظمتِ نبی اور اپنے بزرگوں کے اقوال سے جدا نہیں جانتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرۂ شیرانہ جس دلیری، استقامت، مداومت اور تسلسل سے خانوادۂ برکات کے ان دو بزرگوں یعنی حضور سید العلماء علیہ الرحمۃ اور حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ نے لگایا، اس کی سعادت ان کے زمانے میں شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آئی ہو۔ دراصل مسلک اعلیٰ حضرت کے پردے میں وہ الفتِ رسول کا نعرہ لگاتے تھے، عظمتِ نبی کا پرچار کرتے تھے۔

۵۔ ہمت:

ایک بار ہم سب بذریعہ ریل گاڑی سیتاپور جارہے تھے۔ پیلی بھیت کے اسٹیشن پر والد محترم کی کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک چور نے ہاتھ مارنا چاہا۔ گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور رات کا وقت تھا۔ آگے میلانی کا اسٹیشن تھا اور ترائی کا گھنا جنگل۔ جیسے ہی اس نے گھڑی پر ہاتھ مارا، والد محترم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، چور گھبرا گیا کہ ٹرین چل پڑی تھی۔ اسی حالت میں اسے تنبیہ کی۔ اس نے توبہ کی اور معافی کا خواستگار ہوا۔ والد محترم نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، ورنہ وہ بری طرح زخمی ہو جاتا۔ ہاتھ کے ذریعے اس کا پورا وزن سنبھالے رہے اور کھڑے ہو کر دوسرے ہاتھ سے زنجیر کھینچ کر ٹرین روکی، تب اس کا ہاتھ چھوڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء کا ہے۔

۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء کا واقعہ ہے کہ ہم، بیرون خانقاہ کمرہ موسومہ بہ مدرسہ کے سامنے والے حصے میں بیٹھے تھے کہ پیچھے کی گلی میں زکریا دادا مرحوم کے افتادہ گھر سے عجیب طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم لوگوں کو کچھ خوف محسوس ہوا۔ فرمایا چل کر دیکھیں کیا بات ہے۔ سب سے آگے وہ خود، پیچھے ہم لوگ اندھیری گلی میں زکریا دادا مرحوم کے گھر تک پہنچے۔ گھر کے بند دروازے کے پیچھے سے برابر آوازیں آرہی تھیں۔ والد محترم نے خبردار کیا تب بھی وہ آوازیں بند نہیں ہوئیں۔ فرمایا

لگتا ہے کوئی کتا پھنس گیا ہے، دیوار سے جھانک کر دیکھو۔ تب میں نے رائفل ہاتھ میں لے کر دیوار سے جھانک کر دیکھا تو واقعی ایک کتا تھا جو راستہ نہ ملنے کی وجہ سے بے چینی میں دروازے پر پنجے چلا رہا تھا۔ خیر! دروازہ کھلوا کر اسے آزاد کرایا گیا۔

الحاج عتیق احمد برکاتی بتاتے ہیں:

''میاں میں اتنی ہمت تھی کہ چمن گنج سے جاج مئو تک
پیدل چلے جاتے تھے۔ وہ بھاگنے کی رفتار سے چلتے تھے
اور ہم بچے ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے چلتے تھے۔''

اخیر عمر میں اپنے غریب مریدوں کی دل جمعی کے لئے ان کی دعوت قبول کر لیتے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کو تین تین، چار چار منزل تک چڑھنا ہوگا۔ وہ سانس کے آزار اور دل کی بیماری کے باوجود خداداد ہمت کے بل بوتے پر اپنے غریب مرید کی دل دہی کی خاطر یہ تکلیف گوارہ فرماتے۔

م۔محبت اولیائے کرام:

اولیائے کرام سے انہیں بے حد محبت تھی۔ خصوصاً حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ حدائق بخشش (اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کلام) انہیں زبانی یاد تھا۔ حمد و نعت کے بعد وہ چھانٹ چھانٹ کر غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبتیں بے حد والہانہ انداز میں پڑھتے تھے۔

زندگی کے آخری دن سے تین روز قبل گیارہویں شریف کی محفل اسپتال کے کمرے میں سجائی۔ حضرت امین میاں مدظلہ العالی سے فرمایا کہ بیٹا حضور غوث پاک کی منقبت پڑھو۔ ''واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا'' حضرت امین میاں نے منقبت پڑھی۔ اس شعر کو دوبار پڑھوایا۔

سارے اقطاب جہاں کرتے ہیں کعبے کا طواف
کعبہ کرتا ہے طواف درِ والا تیرا

پھر فرمایا:

''بیٹا ہم تو 'ان' کے موروثی غلام ہیں''۔ لفظ 'ان' کے استعمال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضور غوثِ پاک کی زیارت اپنے ماتھے کی آنکھوں سے فرما رہے تھے۔

جب کسی اجنبی علاقے میں تشریف لے جاتے تو پوچھ پوچھ کر اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتے۔ حاضری دیتے وقت وہ اپنے اسلاف کے طریقوں پر ہی عمل کرتے اور کسی ایسی بات کا ارتکاب نہ کرتے جس کو دیکھ کر کوئی بدعت کا الزام لگا سکے۔

اپنے خانوادہ کے بزرگوں میں حضور صاحب البرکات رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور شمس العارفین اچھے میاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر بہت تواتر کے ساتھ کرتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ حضور صاحب البرکات کے فارسی اور ہندی شعر پڑھتے پڑھتے ان پر حال کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ محل سرائے زنانہ کے صحن میں اپنے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے حضور صاحب البرکات کا یہ شعر بہت دیر تک وارفتگی کے ساتھ پڑھتے رہے۔

حالتے رفت کہ پنہاں ہمہ پیدا گشتہ
شورِ منصور زہر پردہ ہویدا گشتہ

یکا یک ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اس دوران انہوں نے کسی ایسی زبان کے کچھ جملے بولے جو ہم نہیں سمجھ پائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کیفیتِ خاص سے واپس آئے۔

ولی کے بارے میں ہم ان سے پوچھتے کہ ولی کی کیا پہچان ہوتی ہے۔ فرماتے کہ جسے دیکھ کر خدا یاد آ جائے وہ ولی ہے۔

ص۔صدورِ کشف و کرامات:

ان کی کرامات کا ذکر کروں تو ایک دفتر نا کافی ہوگا، لیکن خانوادۂ برکات کے صاحبزادگان اپنے بزرگوں کی کرامات کا بیان عموماً نہیں کرتے۔ ان کے ہزارہا مرید ان کی آنکھوں دیکھی کرامات بتانے کے لئے بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہیں۔ ان کے ایک چاہنے والے برادرم عبدالواحد نور محمد قادری برکاتی گونڈلوی کا تحریری بیان من و عن نقل کرتا ہوں۔

''میری عمر قریب ۷ یا ۸ سال رہی ہوگی برابر یاد نہیں، زیادہ سے زیادہ ۹ سال ہوگی تب گونڈل میں، میں اور میرے بڑے بھائی محمد ابراہیم تاج العلماء محمد میاں صاحب سے بیعت ہوئے۔ آپ کا چہرۂ مبارک اتنا نورانی تھا کہ اپنے تو اپنے غیر بھی دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے۔ آپ کا رعب اس قدر تھا کہ بڑے بڑے حضرات باادب ہاتھ باندھے کھڑے رہتے، لیکن ہم بچے بلا جھجک آپ کے پاس پہنچ جاتے، دست بوسی کرتے اور باادب بیٹھ جاتے، آپ بڑی شفقت سے باتیں کرتے، نماز پڑھنے کی تاکید کرتے، اسکول کی پڑھائی پر توجہ

دینے کی تلقین کرتے وغیرہ۔ اس وقت ہم سوچتے آپ تو اتنے پیار سے ہم سے باتیں کرتے ہیں پھر بھی یہ حضرات کیوں اتنا جھکتے ہیں، اس وقت اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں پاتے۔

انہیں کے ساتھ ان کے بھانجے سید مصطفیٰ حیدر حسن میاں صاحب بھی تشریف لاتے۔ گورا نورانی چہرہ، داڑھی مبارک کے سیاہ بال، باوقار شخصیت نظر آتے تھے۔

گونڈل دو، تین سال میں ایک مرتبہ آتے ۸ یا ۱۵ روز رہ کر چلے جاتے، لیکن جب مارچ ۱۹۶۵ء میں، میں ممبئی میں مستقل رہنے آ گیا تو اکثر دست بوسی کا شرف حاصل ہوتا، آپ ممبئی میں اپنے بڑے بھائی حضرت سید العلماء سید آل مصطفیٰ علیہ الرحمۃ کے پاس کھڑک کی مسجد میں ٹھہرتے۔

ایک بار ممبئی کے کھجور کے مشہور تاجر حاجی عثمان بھائی معروف بہ حاجی بابو کے یہاں شادی کی تقریب کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ حضرت کے ٹھہرنے کے لئے ایک بڑا ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کا انتظام مع مریدوں اور ملازم کے لئے کیا گیا۔ آپ جب اپنے بڑے بھائی سے ملنے کھڑک کی مسجد میں گئے تو آپ کے بڑے بھائی کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ چھوٹا بھائی میرے پاس نہ رہ کر کہیں اور رہے۔ سید میاں نے یہ بات اپنے بھائی سید مصطفیٰ حیدر حسن میاں سے کہی تو آپ بھائی کی محبت میں تمام آسائش چھوڑ کر بھائی کے قریب مسجد کے حجرہ میں آ گئے۔ کتنا پیار تھا ان دونوں بھائیوں میں۔

حضرت مجھے بہت چاہتے تھے حالانکہ میں اس قابل کہاں۔ یہ اللہ کا کرم تھا جس نے آپ کے دل میں مجھ ناچیز کے لئے اتنی محبت پیدا کر دی تھی، اس کے لئے میں اس ذات پاک کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔ ان کے ساتھ بیتے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا حضرت میرے قریب ہی ہیں، میں انہیں نہیں دیکھ سکتا پر وہ مجھے ضرور دیکھتے ہیں۔

میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا، میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور خوش خبری سنائی کہ حضرت میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور والدہ کی پسند پر اس کا نام محمد یعقوب رکھا ہے، آپ نے دست مبارک اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، آپ کی خوشی کو دیکھ کر یوں لگا جیسے آپ کے یہاں پوتا پیدا ہوا ہے، مجھے مبارک باد اور بہت ساری دعائیں دیں۔ پوچھا کتنے بیٹے ہوئے، میں نے جواب دیا، حضرت یہ پہلا ہی تو ہے۔ اس پر فرمایا دوسرا ابھی بیٹا ہی ہے۔ آج بھی حضرت کی شہادت کی وہ انگلی جسے اٹھا کر آپ مجھ سے یہ کہہ رہے تھے، نظروں کے سامنے ہے۔ میں نے یہ بات کسی سے نہ کہی، کچھ عرصہ بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ حضرت ممبئی میں ہی تھے، رمضان شریف کا مہینہ تھا، میں نے حضرت سے کہا میرے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے، آپ بچے کا نام تجویز فرمائیں تو آپ نے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، مجھے مبارک باد دی اور دعائیں دیں اور پوچھا کہ کتنے لڑکے ہوئے میں نے جواب میں عرض کیا: حضور یہ دوسرا لڑکا ہے، آپ نے اسی طرح شہادت کی انگلی اٹھائی اور فرمایا تیسرا بھی لڑکا ہے۔ میں اسپتال اپنی بیوی اور بچے کی خیریت معلوم کرنے گیا تو بیوی سے کہا حضرت نے یعقوب کے بعد کہا تھا دوسرا بھی لڑکا ہے تو محمد شعیب کی تشریف آوری ہوئی۔ اب حضرت نے تیسرے لڑکے کی خبر دی ہے تو بیوی بولی بس دو لڑکے بہت ہیں، میں نے کہا حضرت نے کہا ہے تو اس میں انشاء اللہ فرق نہ ہوگا۔ پھر تیسرا بھی لڑکا ہوا۔ اس وقت حضرت ممبئی میں نہ تھے۔ بیس دن بعد تشریف لائے، میں خدمت میں حاضر ہوا عرض کی کہ میرے یہاں لڑکا ہوا ہے، آپ نے اسی طرح شکر ادا کیا، مبارک باد اور دعائیں دیں اور پوچھا کتنے لڑکے ہوئے میں نے کہا یہ تیسرا لڑکا ہے۔، آپ نے کہا ہاں بس: اب ایک لڑکی کی ضرورت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی کہ جس نے تین یا دو یا کم سے کم ایک لڑکی کی بھی پرورش کی، اس کو جنت کا مژدہ ہے۔ میں نے کہا دعا فرمائیں، آپ نے فرمایا ابھی نہیں پہلے انہیں بڑا کر لو، اس کے بعد میرے یہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔

دوسرا واقعہ یوں ہے: میں روزانہ بعد نماز عشاء حاضر خدمت ہوا کرتا تھا۔ ایک دن معمول کے مطابق گیا، دست بوسی کی اور بیٹھ گیا۔ حضرت نے پوچھا: عبدالواحد کیسے ہو؟ میں نے جواب میں عرض کیا: اللہ کا کرم اور آپ کی دعا ہے، آپ نے دوبارہ پرسش کی، گھر میں سب کیسے ہیں؟ میں نے وہی جواب دیا، یہ پوچھنا ان کا معمول تھا۔ اس دن پھر پوچھا بچے کیسے ہیں، میرا جواب وہی تھا، پھر پوچھا بچے کیسے ہیں، مجھے تعجب ہوا کہ حضرت بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اب جواب

دینے میں میری آواز نرم پڑگئی۔ حضرت نے فرمایا: گھر جاؤ وقت کافی ہوگیا ہے اور تاکید کی کہ سیدھے گھر جاؤ، میں وہاں سے چل دیا گھر پہنچا تو بیوی چھوٹے بچے محمد عرفان کو گود میں لئے بیٹھی تھی، مجھے دیکھتے ہی کہا: بچے کو دیکھو کتنا بخار ہے، بچہ بخار سے تپ رہا ہے میں نے کہا رات کے بارہ بج رہے ہیں، اس وقت کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا، صبح ہوتے ہی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔

مجھے ایک بار کچھ سامان خریدنے کا حکم دیا۔ فرمایا: بہت ضروری نہیں ہے جب بھی فرصت ملے لاکر دے جانا، عشاء بعد تو آتے ہی ہو، میں نے صبح کو وہ چیزیں لاکر پیش کردیں، ساتھ ہی بقایا رقم ۳۷ روپے ۲۵ پیسے بھی دینے تھے، پر جیب میں چونی نہ تھی تو میں نے اٹھنی رکھ دی اور حضرت کو حساب پیش کردیا۔ آپ نے سرسری طور پر پرچی دیکھی کہ کیا کیا منگوایا تھا، پھر ٹوٹل پر نظر پڑی تو فرمایا مجھے چونی تمہیں دینی ہے۔ میں نے کہا حضرت رہنے دیں چونی کی کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا حساب تو حساب ہے، تمہارا ہے تو تم لے لو، میرا ہے مجھے دے دو، اب حضرت ریزگاری ڈھونڈنے لگے، مل نہیں رہی تھی، میں نے پھر کہا حضرت رہنے دیں، آپ نے جواب میں فرمایا: بخشش دے رہے ہو یا حساب؟ بہت پریشان ہوئے، ریزگاری کی وہ پوٹلی ملنے کو تیار نہیں، یہاں تک آپ پسینہ پسینہ ہوگئے، اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا حضرت وہ اٹھنی ہی مجھے دے دیں، اس پر آپ میری طرف پلٹے، چہرے پر مسکراہٹ اور لہجے میں ہلکی سی ڈانٹ۔ وہ میری چونی، تمہیں کیوں دوں؟ مجھے ہنسی آگئی۔ نہ تو میری چونی خود رکھتے ہیں اور نہ اپنی چونی مجھے دیتے ہیں۔ آخر میں وہ پوٹلی ملی اور میری چونی مجھے عطا فرمائی۔''

جناب محمد اکبر قادری لکھتے ہیں:

محمد مشتاق برکاتی کھجور والا ممبئی میں رہتے ہیں۔ وہ حضرت والا کی کئی کرامتیں بیان کرتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ وہ ایک موقع کی دوکان لینا چاہتے تھے اور اس کا سودا ہوگیا، بیعانہ وغیرہ دے دیا گیا مگر دوکان مالک لالچ میں آکر مکر گیا۔ مشتاق بھائی مایوس ہوکر حضرت والا کے پاس آئے، سارا واقعہ بتایا۔ حضرت والا نے فرمایا: مشتاق بھائی! دل چھوٹا مت کیجیے، وہ دکان آپ ہی کو ملے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

مشتاق بھائی بتاتے ہیں کہ گونڈل میں ایک صاحب ہیں، ان کا پاسپورٹ نہیں بن رہا تھا۔ کافی تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے۔ ایک دن حضرت والا کے پاس حجرۂ کھڑک میں آئے اور اپنی پریشانی بیان کی۔ حضرت والا نے ان کے ماتھے پر اپنی انگشت شہادت سے کچھ لکھ دیا اور فرمایا اب جائیے گا۔ آپ کا کام ہوجائے گا۔ اسی دن ان کا پاسپورٹ بن گیا۔

ط۔ طریقۂ اجداد پر عمل:

وہ طریقہ اجداد کے بہت بڑے عامل تھے۔ روز مرہ کی باتوں میں تو نہیں لیکن معاملات، عبادت واخلاق میں وہ اپنے اجداد واسلاف کی سچی تصویر تھے۔ خاندانی روایتوں کے حافظ بھی تھے اور عامل بھی۔ حضور تاج العلماء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہیں بہت محبت وعقیدت تھی۔ وہ ممکنہ حد تک حضور تاج العلماء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقہ کی پیروی کرتے تھے۔ احتیاط اور میانہ روی کی دولت غالباً انہیں اپنے خال محترم علیہ الرحمۃ والرضوان سے ہی ملی تھی۔

ف۔ فضلا کی عزت وتوقیر:

وہ علمائے دین کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنے مریدین ومتوسلین کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے، غالباً اسی لئے ان کے وصال کے موقع پر حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں صاحب مدظلہ العالی نے یہ شعر کہا ہے۔

علم واہل علم کی توقیر تھی شیوا ترا
جانشیں میں ہو نمایاں جلوۂ زیبا ترا

(علامہ اختر رضا خاں از ہری میاں)

ان کی علما نوازی کا ذکر فقیہ عصر شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق قادری برکاتی امجدی علیہ الرحمۃ سے سنیے:

''حضرت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس عہد کے پیروں کے برخلاف علما کا ان کی شایان شان پورا پورا احترام فرماتے۔ عرس مبارک میں یہ منظر قابل دیدنی ہوتا کہ عرس مبارک کے اجلاس عام میں حضرت خود اور خاندان کے تمام افراد زمین پر ہوتے اور علمائے کرام تخت پر۔''

(اہل سنت کی آواز ۱۹۹۵ء صفحہ ۴۷)

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ علمائے کرام انہیں نذر پیش کرتے تو وہ اپنی طرف سے کچھ اور ملا کر انہیں نذر کر دیتے، جس وقت وہ علمائے کرام کے ساتھ ہوتے اس وقت عربی ادب اور مسائل فقہ پر خوب خوب گفتگو کرتے۔

حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات بابرکات تھی جس نے خانقاہ برکاتیہ کو بیسویں صدی کے نصف آخر میں دیگر امتیازات کے ساتھ، علمائے کرام کی عزت وتوقیر کے امتیاز کو قائم رکھا۔

حضرت علامہ محمد احمد اعظمی مصباحی، شیخ الجامعۃ، الجامعۃ الاشرفیہ تحریر فرماتے ہیں:

''......یہ امتیاز بعد کے مشائخ میں بھی قائم رہا اور حضرت احسن المشائخ نے بھی پورے طور سے اس کو برقرار رکھا۔ دین میں صلابت، عقائد میں اخلاص، الحب للہ والبغض فی اللہ میں صداقت ہی کا یہ اثر تھا کہ اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم قدست اسرارہم کا ذکر بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ کرتے، ان کے فتاویٰ کو حرز جاں بناتے۔ ان کی عظمتوں کا تذکرہ ہوتا تو بس سنتے ہی جایئے، کوئی مرید باصفا یا محب بے ریا جو بیان کرتا، اس سے زیادہ اس جانشین پیران بزرگ کی زبان حق ترجمان سے چرچا ہوتا۔ سچی بزرگی کی نشانی یہی ہے......''

(رسالہ اہل سنت کی آواز، جلد دوم۔صفحہ۔۶۱)

حضرت مولانا محمد عبدالمبین قادری یوں رقم طراز ہیں:

''اور آخر میں اضافے کے طور پر جب سرکار احسن العلماء علیہ الرحمۃ نے یہ شعر پڑھا۔

ڈال دی قلب میں عظمت مصطفیٰ
سیدی اعلیٰ حضرت پہ لاکھوں سلام

تو میری آنکھوں میں محبت وعقیدت کے آنسو امنڈ آئے کہ واہ رے امام احمد رضا کی مقبولیت کہ ان کے آقازادوں کی ان سے محبت وعقیدت جس پر ہزار جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے اور سچ پوچھیے تو امام احمد رضا کی ان سرکاروں میں یہی مقبولیت ہے۔ جس نے ان کو چاردانگ عالم میں محبوب ومقبول بنادیا۔''

(رسالہ اہل سنت کی آواز، جلد دوم۔صفحہ۔۶۷)

ی۔یگانگت عامہ:

والد گرامی عام لوگوں سے بھی بہت خلوص ومحبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بعض اوقات عوام الناس کے لئے وقف کر دیے تھے۔ وہ ان اوقات کی پابندی فرماتے۔ ان اوقات میں ان کے پاس جو بھی آتا، وہ حسب مراد ان سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے ہی لے جاتا۔

دوران تعلیم جب میں علی گڑھ کے لئے عازم سفر ہوتا تو صدقے کے طور پر کچھ روپے دیتے اور فرماتے جو بھی ضرورت مند نظر آئے دے دینا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اہل ہنود کو بھی۔ فرمایا ہاں، اہل ہنود میں بھی کوئی ضرورت مند نظر آئے تو دے دینا۔ پھر فرمایا کہ یہ صدقات واجبہ میں نہیں ہے جس کا مصرف صرف مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔ یہ صدقہ نافلہ میں ہے جو کسی بھی غریب ضرورت مند کو دیا جاسکتا ہے۔

ایک بار گھر کی مہترانی کسی تیوہار پر حق مانگنے آئی۔ نہادھو کر صاف لباس پہنے ہوئے تھی۔ نجیب میاں سلمہٗ اس وقت دو ڈھائی برس کے ہوں گے۔ مہترانی نے از راہ شفقت نجیب میاں کو گود میں لے لیا اور بازار تک ہو آئی۔ شام کو پڑوس کی کچھ عورتوں نے اعتراض کیا کہ آج مہترانی نے نجیب میاں کو گود میں اٹھایا۔ میرے والد کریم نے فرمایا: کسی کو اس میں کیا شکایت؟ مہترانی صاف ستھری تھی، لباس بھی صاف تھا، اس نے جذبہ شفقت میں نجیب حیدر کو گود میں لے لیا۔ اگر کوئی بھی منع کرتا تو اس کی دل شکنی ہوتی۔

اس واقعے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ کس طرح بابری مسجد کی شہادت کے سانحے کے موقع پر حضور احسن العلماء نے سیکڑوں عوام کو کئی دن تک خانقاہ میں رکھ کر حفاظت اور خورد ونوش کا انتظام فرمایا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کے خلوص ومحبت کے بادل سب پر یکساں برستے تھے۔ وہ عوام وخواص کا امتیاز نہیں کرتے تھے۔ البتہ جہاں عزت وتوقیر کا معاملہ ہوتا وہ سامنے والے کے شایان شان عزت وتوقیر کرتے، لیکن جہاں تک جود وکرم کا معاملہ تھا وہ عوام کے تئیں کچھ زیادہ ہی تھا کہ عوام کو اس کی

ضرورت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ح-حلم وانکسار:

دینے والے نے انہیں حلم وانکسار کی دولت سے خوب خوب نوازا تھا۔ حضرت علامہ مفتی شریف الحق صاحب قدس سرہٗ کا بیان پہلے گزر چکا کہ وہ کس طرح حلم وتواضع کا سلوک روا رکھتے تھے۔ قصبے میں اگر کسی غریب کی لڑکی یا لڑکے کی شادی کی دعوت ہوتی تو رکشے پر بیٹھ کر اس کے گھر جا کر تقریب میں شرکت کرتے، صاحب خانہ انہیں دیکھ کر کھل کھل اٹھتا۔

اپنے گھر آئے مہمان کو عزت کے ساتھ بیٹھاتے، پہلے پانی پلواتے پھر چائے وغیرہ سے تواضع کراتے۔ اگر آنے والوں کی تعداد بیس بھی ہوتی تب بھی ماتھے پر شکن نہیں آتی، بس اتنا کہتے کہ چھوٹا قصبہ ہے، اطلاع دے کر آتے تو آپ کو اتنی زحمت نہ ہوتی۔

میں نے اپنی آنکھ سے انہیں گھر سے ناشتے کی ٹرے لے کر ملازمین کو ناشتہ دیتے دیکھا ہے۔ ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ی-یقین کی دولت:

اللہ تعالیٰ نے انہیں یقین کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا۔ کیسا ہی برا وقت سامنے کیوں نہ آجائے، وہ یقین اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ یہی فرماتے کہ اللہ نے چاہا اور اس کے چاہے سے اس کے رسول نے، سب معاملات بہتر ہو جائیں گے۔ ان کے اسی یقین کا کرشمہ ہوتا کہ معاملات کا رُخ اچھائی کی طرف مڑ جاتا۔

وہ دوسروں کو بھی یقین اور امید کی دولت کی اہمیت بتاتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ کسی بھی معاملے میں ناامید ہونا گناہ ہے۔

ایک کم فہم نے ان کی زندگی میں ان پر کئی مقدمات کیے۔ وہ ہر بار یہی کہتے ؎

سن لیں اعدا میں بگڑنے کا نہیں
وہ سلامت ہیں بنانے والے

ہر مقدمے پر وہ یہی فرماتے کہ مدعی انشاء اللہ تعالیٰ نامراد ہوگا او رمنہ کی کھائے گا۔ بفضلہ تعالیٰ ہر مقدمے کا یہی انجام ہوا۔ سپریم کورٹ کا آخری مقدمہ بھی ان کے وصال کے بعد ان ہی کے حق میں فیصل ہوا اور مدعی کا مقدمہ خارج ہوا۔

برسات کے موسم میں اگر بارش رک جاتی تو صدر دالان کے درمیان در میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے۔ ان کی آنکھوں میں یقین کا نور ہوتا تھا، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے۔ ایک ہی دو دن میں اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ رحمت کا پانی برسا دیتا، جل تھل ہو جاتا۔

میں سول سروس کے امتحان میں بیٹھا، دعا کے لئے عرض کی۔ دعا فرمائی اور کہا: محنت کرو، اچھی امید رکھو، اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین کرو، انشاء اللہ تعالیٰ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوگے۔ بفضلہ تعالیٰ یہی ہوا۔

مثالیں اور واقعات بیان کرنے پر آؤں تو صفحات کم پڑ جائیں گے۔ مختصر یہ کہ ان کی ایمانی قوت نے ان کے دل میں یقین اور امید کے ایسے چراغ جلا رکھے تھے جن کی لو آخر دم تک مدھم نہیں پڑی۔

د-دین کی خدمت:

یہ وہ بات ہے جس پر بہت تفصیل سے لکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن اختصار کی نیت سے یہ باب شروع کیا ہے۔ ان کی خدمات دین متین کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- خود دین کی خدمت کرنا۔

۲- دوسرے خدمت کرنے والوں سے تعاون کرنا۔

۳- دین کی خدمت کرنے والوں کی تقریراً اور تحریراً حوصلہ افزائی کرنا۔

تبلیغِ دین کے سلسلے میں اس مرد باصفا نے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ شہروں کے نہیں، جہاں پیروں کو سب طرح کا آرام نصیب ہوتا ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے قریوں اور دیہات کے متعدد سفر کیے۔ آج بھی جس کے گواہ جناب منشی پھول خاں صاحب گلولوی مدظلہ العالی بقید حیات ہیں۔ وہ خدمتِ دین کے میدان میں تن من دھن تینوں کے ساتھ اترتے تھے۔ وہ صرف زبانی خدمت میں یقین نہیں کرتے تھے۔

دین کی خدمت کرنے والے دوسرے حضرات کے ساتھ بھی پرخلوص تعاون کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی نے تحریر فرمایا ہے کہ جب وہ حضرت سے ملنے حجرۂ کھڑک بمبئی میں گئے اور ذکر کیا کہ وہ ایک مفید کتاب طبع کرانے بمبئی آئے ہوئے ہیں تو حضرت نے فوراً اپنے پاس سے ایک ہزار روپے عطا کیے۔ مولانا مصباحی مدظلہ نے فرمایا کہ حضرت میں اس لئے آپ کے پاس نہیں آیا

تھا اور یہ کہ کتاب کے طبع ہونے کا انتظام ہو چکا ہے۔ حضرت نے فرمایا پھر بھی رکھ لیجیے۔ بہت سے کام ہونے ہیں۔

اسی طرح وہ دین کی خدمت کرنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ کوئی بڑے کام کا بیڑا اٹھا کر ان کے پاس آتا تو اس کے منصوبے کو مکمل طور پر سنتے۔ مشورہ دیتے، اونچ نیچ بتاتے اور دعا فرماتے۔ کبھی کبھی یہ بھی فرماتے کہ مثبت پہلو تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔ منفی معاملات کی شناخت کر کے ان کا سد باب پہلے کر لیجیے، اللہ تعالیٰ یہ کام آپ کے ہاتھ سے ضرور کرائے گا۔ ایسے بے شمار مدارس ہیں، حضرت احسن العلماء جن کے ساتھ حتی الوسع تعاون فرماتے۔

اب حضرت امین ملت مدظلہ اپنے والد گرامی کی اسی روایت پر گامزن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم خاص سے انہیں عمر، صحت اور سکون قلب کی دولتوں سے حصہ فراواں عطا فرمائے۔ (آمین بجاہ الحبیب الامین صلی اللہ علیہ وسلم)

ح-حکمت کی باتیں کرنے کی عادت:

میرا بچپن سے یہ مشاہدہ رہا کہ والد گرامی خوش مزاج اور شیریں بیان ہونے کے باوجود کبھی بھی بے معنی باتوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ ان کے مزاج میں بھی حکمت کے موتی پروئے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ موقع محل کے اعتبار سے اور مخاطب کی علمی صلاحیت کے مطابق اس سے گفتگو فرماتے۔ کبھی قرآن کریم کا حوالہ دیتے، کبھی حدیث نبوی سے کوئی بات ثابت فرماتے، کبھی اسوۂ صحابہ سے دلیل لیتے اور کبھی اولیائے کرام کی حکایتوں سے مفید مطالب ونتائج اخذ کر کے بتاتے۔

وہ جدید علوم کو بھی حکمت کی راہ کا روڑہ نہیں سمجھتے تھے۔ گفتگو میں اکثر جدید علوم کی اصطلاحوں کے حوالے پے در پے دیتے چلے جاتے، مسجد برکاتی میں مسلسل ۵۴ سال تک نماز جمعہ سے پہلے وعظ کی محفل میں انہوں نے جو حکمت کے موتی لٹائے ہیں، کاش ان کو جمع کر دیا جائے تو ملت کے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ہاتھ آ جائے۔

وہ علما سے علمی گفتگو فرماتے، شعرا سے ادبی زبان میں مکالمہ کرتے، عوام سے سہل اور سلیس زبان میں گفتگو کرتے اور بچوں سے بچوں کی محدود الفاظ والی لغت میں بات کرتے۔ رابطے کی زبان کو مخاطب کے علم وتربیت کے مطابق استعمال کرنے کا عجیب وغریب کمال، اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔

س-سرداری:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں انہیں سرداری کی عزت سے سرفراز فرمایا تھا۔ علمائے کرام کی محفل ہو یا مشائخ کی مجلس، وہ ان میں سردار محسوس ہوتے تھے۔ بہت سے دینی اور دنیاوی معاملات ایسے ہوتے جن میں ان کو حکم بنایا گیا اور ان کے طے کیے معاملات کو فریقین نے تسلیم کیا۔ حضور مفتی اعظم قدس سرہٗ کے وصال کے بعد بریلی شریف کے نظم وانتظام کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی حضور احسن العلماء قدس سرہٗ کو حکم بنایا گیا تھا۔

حضرت علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس وقت دنیائے سنیت میں ان کی ذات تمام علمائے اکابر واصاغر کے لئے مرجع ومقتدا کی حیثیت رکھتی تھی۔ مفتی اعظم قدس سرہٗ کے زمانے میں جب کوئی سنگین اختلاف رونما ہوتا تو فیصلے کے لئے نگاہیں مفتی اعظم کی طرف اٹھتیں، ان کے بعد یہ اعزاز صرف حضرت احسن المشائخ کے حصے میں آیا۔

(اہل سنت کی آواز، خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء صفحہ ۶۲)

ن-نعمتوں کی تقسیم:

یہ صفت وہ تھی جو انہیں اپنے جد کریم فخر موجودات، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں خوب خوب عطا ہوئی تھی۔ وہ نعمتوں کو تقسیم کر کے استعمال کرنے کے موقف والوں میں ایک تھے۔ اس خصوص میں روحانیت، علمیت، خلوص، دنیاوی مال ودولت سب کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اس صفت کے اتنے زیادہ گواہ موجود ہیں کہ میں اپنے قلم کو روکتا ہوں۔ صرف ایک بات بتانا چاہوں گا جو مارہرہ سے باہر والوں کے علم میں نہ ہوگی۔

باغوں سے پھل آتے وہ تقسیم ہوتے، کھیتوں سے سبزی آتی تو وہ محلے میں بانٹی جاتی، کھیتوں کی زمین ٹیوب ویل کے پانی سے سیراب ہوتی تھی لیکن وہ اناج تقسیم کرتے وقت آسمانی پانی سے سیراب ہونے والی دھرتی کا حساب لگا کر اناج تقسیم فرماتے تھے۔ مرحبا اس احتیاط پر اور مرحبا اس سخاوت پر۔

م-مہمان نوازی:

وہ اپنے وقت کے بہت بڑے مہمان نواز تھے۔ جب تک مہمان کو کھانا نہ کھلوادیتے انہیں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ خانقاہ میں اگر بے وقت بھی کوئی مہمان آجاتا تو چیں بہ جبیں نہ ہوتے تھے۔ مہمانوں کی خدمت کے لئے اوران کے آرام کے خیال سے انہوں نے ایک وسیع وعریض مہمان خانہ، خانقاہ برکاتیہ میں تعمیر کرایا۔ حالانکہ وہ حصہ خانقاہ کا سب سے زیادہ آرام دہ حصہ ہے لیکن اس مہمان خانے سے ذاتی طور پر آرام اٹھانے ایک بار بھی اس میں نہیں گئے۔ سید نجیب حیدر سلمہٗ کی شادی کے موقع پر باہر کے مہمانوں سے ملنے صرف ایک بار کھڑے کھڑے گئے او رل کروا پس آگئے۔ انہیں غالبًا اپنے قدیم مکان میں ہی آرام ملتا تھا۔

اپنے وصال سے دوماہ پہلے انہوں نے خانقاہ میں دوسرا مہمان خانہ تعمیر کرانے کا ارادہ کیا اوراس کی ابتدا بھی کرادی۔ بعد میں یہ مہمان خانہ حضرت امین ملت مدظلہ العالی نے مکمل کرایا۔

انہیں یہ بات گوارا نہیں تھی کہ کوئی مہمان اگر ناوقت آئے تو انہیں اس کی اطلاع نہ دی جائے۔ جی-بی-پنت اسپتال میں دوران علالت بھی وہ کبھی کبھی مجھے تنبیہ کرتے تھے کہ انہیں دیکھنے اورعیادت کرنے جو لوگ آتے ہیں، انہیں آنے سے روکا نہ جائے کیونکہ وہ لوگ پیسہ اور وقت خرچ کرکے بہت دور دور سے آتے ہیں۔ یہ وصال سے دوتین روز قبل ہی کی بات ہے۔

ا-انسان نوازی:

انسان نوازی کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھتا۔ اپنے ملازمین کی عیادت کرنے بھی بہ نفس نفیس ملازمین کے گھروں پہ جاتے اور دعا پڑھ کر اور کچھ نقد دے کر تشریف لاتے۔ یگانگت عامہ کے ذیل میں کئی باتوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے اس بات میں قلم کو یہیں پر روکتا ہوں۔

ن-نمازوں کی کثرت:

بچپن میں جب رات تین ساڑھے تین بجے میری آنکھ کھلتی تو اس کی وجہ وہ آوازِ گریہ ہوتی جو والد کریم کا معمول تھا۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ بالغ ہونے سے پہلے باجماعت نماز کے پابند ہو چکے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اسپتال میں اپنے وصال سے دوتین روز قبل تک بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور برادرم عزیزی سے فرمایا کہ بھئی گواہ رہنا ہم نے اس وقت کی نماز پڑھ لی ہے۔ عبادت وریاضت میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھے۔ اوراد وظائف میں ان ہی طریقوں کی اتباع کرتے تھے جن کی بزرگوں سے سلسلہ بسلسلہ اجازت ملی ہوئی تھی۔ قصبے میں جب بارش کی کمی ہوتی تو نمازیوں کو جنگل لے جاکر نماز استسقا پڑھتے اور دوسرے ہی روز بارش کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

حضرت احسن العلماء کی چند عادات مبارکہ کا ذکر:

۱- ہتھیلی رخسار کے نیچے رکھ کر داہنی کروٹ لے کر اس طرح سوتے تھے کہ گھٹنے تھوڑے سے مڑے ہوتے تھے۔

۲- گرمی بہت مانتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کنویں یا نل سے پانی کھینچ کر بالٹی بھر کر نہاتے اور گیلی تہبند پہنے پہنے بان کے ننگے پلنگ پر لیٹ جاتے اوراس سے پہلے پلنگ پر بھی پانی کے چھڑکاؤ کا اہتمام کرتے تھے۔

۳- ٹرین سے سفر کرنا ہوتا تو وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پر پہنچ جاتے۔ کار سے سفر کرنا ہوتا تو صبح صادق کے وقت گھر سے نکل لیتے تھے۔

۴- کھانا کھاتے وقت سیدھی ٹانگ کی پنڈلی کو کھڑا رکھتے اور بائیں ٹانگ کی پنڈلی کو موڑ کر فرش یا پلنگ پر رکھتے تھے۔

۵- سفر پر جاتے وقت اپنی ہمشیرہ صاحبہ جو گھر میں مستقل رہنے والے افراد میں سب سے بزرگ تھیں، کے پاس آکر بتاتے کہ میں فلاں جگہ جارہا ہوں اور انشاءاللہ فلاں تاریخ کو واپسی ہوگی۔

۶- سفر پر جانے سے پہلے آیات قرآنی پڑھ کر دستک دیتے اور درگاہ شریف پر فاتحہ پڑھ کر سفر کی ابتدا کرتے۔ واپسی میں بھی درگاہ برکاتیہ پر سواری روک کر اتر کر فاتحہ پڑھ کر گھر میں داخل ہوتے اوراپنی ہمشیرہ صاحبہ کے پاس جاکر سلام کرتے۔

۷- وعظ کی محفل میں خطبۂ مسنونہ کے بعد آیات قرآنی پڑھ کر درود شریف پڑھ کر اور پڑھوا کر آیات قرآنی کا ترجمہ کرتے، پھر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی کسی نعت کے چند اشعار پڑھ کر مضمون بیان فرماتے۔ دوران تقریر سامعین سے بھی سوال کرتے جاتے۔

۸- اپنے ملازمین پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ملازم عمر میں بڑا ہوتا تو ''آپ'' سے مخاطب فرماتے تھے۔ معینہ تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً ملازمین کو نوازتے تھے۔ عید، بقرعید میں ان کے لباس بھی

تیار کراتے تھے۔ ملازمین سے حسب موقع فرحت آمیز گفتگو بھی کرتے جس سے ملازمین کے چہرے فرطِ خوشی سے کھل جاتے تھے۔

۹- صحت نے جب تک ساتھ دیا، باغ کی سیر کو جاتے تھے۔

۱۰- کلی کرتے وقت دونوں ہتھیلیوں کا گھیرا بنا کر منہ کی آڑ اس طرح کر لیتے کہ کلی کا پانی گرتے وقت نظر نہ آئے اور پانی کی چھینٹ بھی اِدھر اُدھر نہ گرے۔

۱۱- ۲۹ تاریخ کو چاند دیکھنے کا اہتمام ضرور کرتے، چاہے مطلع ابر آلود ہی کیوں نہ ہو۔

۱۲- عید کا پہلا چاند دیکھ کر اپنے بزرگوں کے پاس جا کر سلام کرتے۔

۱۳- اپنی اہلیہ صاحبہ سے ہمیشہ بہت نرم، شیریں اور شگفتہ لہجے میں گفتگو کرتے، کسی نے آج تک ان کو اپنی اہلیہ سے تیز لہجے میں بات کرتے نہیں سنا۔

۱۴- کھانے میں مونگ کی دال، پَرْوَل کی ترکاری اور بکری کا گوشت مرغوب تھا۔ گوشت میں سبزی پسند فرماتے تھے۔ مکا کے موسم میں بھٹوں پر لیموں لگا کر نمک کے ساتھ کھانا بھی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ امرود کا کچالو بھی پسند تھا۔ بیسن کی روٹی بھی شوق سے کھاتے تھے۔

۱۵- مرمت، تعمیر یا قلعی کا کام ہمیشہ مسجد برکاتی سے شروع کراتے۔

۱۶- چھوٹے چھوٹے گود کے بچوں کو خوب مسوس مسوس کر پیار کرتے تھے۔

۱۷- کبوتروں کو اپنے ہاتھ سے دانہ ڈالتے تھے اور ان کے برتن میں پانی بھرتے تھے۔

۱۸- کھیت سے اناج آتے ہی عشر نکال کر مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شریعتِ مطہرہ نے جتنا بتایا ہے، اس سے زیادہ اناج صدقہ کرتے تھے۔

۱۹- کوئی ان سے قرض لیتا اور وقت پر ادا نہیں کر پاتا تو اس کو خوب سے خوب مہلت دیتے۔ اگر اس کے حالات خراب ہوتے تو پھر تقاضہ ہی نہیں کرتے تھے، معاف فرما دیتے تھے۔

۲۰- اپنے مریدوں کو کاروبار پر اکساتے اور اس سلسلے میں مالی تعاون بھی کرتے۔

۲۱- بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے وحشت کا اظہار کرتے اور بلند آواز میں قرآنی آیات ورد کرتے۔ طوفان کے موقع پر قبلہ رو کھڑے ہو کر اذان دیتے تھے۔

۲۲- عید، بقرعید کے موقع پر بچوں اور ملازمین کو عیدی تقسیم کرتے تھے۔ اپنے مریدوں کو بھی عیدی دیتے تھے۔

۲۳- نماز اول اوقات میں ادا فرماتے تھے۔ مرضِ وصال میں اسپتال کے اندر نمازوں کی ادائیگی بفضلہٖ تعالیٰ جاری رہی۔

۲۴- ۱۹۶۸ء تک پان بہت شوق سے کھاتے تھے۔ پان میں اصغر علی لکھنؤ والی عمدہ تمبا کو استعمال کرتے تھے۔ اپنے برادر محترم حضور سید العلماء قدس سرہٗ کے کہنے پر ایک ہی دن میں نہ صرف یہ کہ تمبا کو چھوڑ دی بلکہ پان بھی چھوڑ دیا۔ اس طرح کی مستقل مزاجی کی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

۲۵- دوپہر میں کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ پسند فرماتے تھے۔

۲۶- بیشتر اوقات ٹوپی اوڑھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو سوتے وقت بھی ٹوپی سر پر ہی ہوتی تھی۔

۲۷- لباس کے معاملے میں جوانی میں بڑے عرض کا پاجامہ اور موسم کے اعتبار سے شیروانی پسند تھی۔ آخر کے ۲۵ برسوں میں شیروانی چھوڑ دی تھی، اس کی جگہ صدری استعمال فرماتے تھے۔ آخر کے ۲۵ برسوں میں پاجامہ بھی کم استعمال فرماتے تھے، تہبند ہی زیادہ پسند فرماتے تھے۔

۲۸- دوا کھاتے وقت اللہ شافی واللہ کافی کا ورد فرماتے۔

۲۹- بزرگوں کا خصوصاً حضور تاج العلماء علیہ الرحمۃ کا ذکر کرتے وقت اکثر گلوگیر اور آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ بزرگوں میں سب سے زیادہ حضور تاج العلماء علیہ الرحمۃ کو ہی چاہتے تھے۔ مرض وصال میں امین ملت نے سوال کیا کہ آپ کو سب سے زیادہ کون یاد آتا ہے تو جواب دیا کہ بَبّا (حضور تاج العلماء علیہ الرحمۃ کو افرادِ خانہ بَبّا کے نام سے یاد کرتے تھے)

۳۰- باغ کی فصل اُٹھنے کے بعد اگر کسی وجہ سے بیوپاری پورا پیسہ ادا نہ کر پاتا اور پیسہ چھوڑنے پر اصرار کرتا تو بے دریغ معاف فرما دیتے تھے۔

۳۱- فجر کے وقت سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بیدار ہو کر عبادت کا اہتمام

فرماتے اور ذکر واذکار میں محنت کرتے اور گریہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے بچپن میں ہم بچے ڈر جاتے تھے۔

۳۲- رمضان شریف میں ہلکا افطار کرتے اور تراویح پڑھانے کے بعد ہی کھانا کھاتے تھے۔

۳۳- مسجد برکاتی میں تراویح ختم کرنے کے بعد رمضان شریف کی آخری تاریخوں میں قصبے کی کئی مسجدوں میں پنج سورے کے ساتھ تراویح کی جماعت کی امامت فرماتے۔

۳۴- اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت بھی کھنکھار کر اطلاع دیتے کہ میں اندر آرہا ہوں۔

۳۵- اپنے سسرالی اعزہ سے بہت شگفتگی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ میرے خالہ زاد بھائی پروفیسر اختر ظہیر رضوی (گاما بھائی) کی شوخیوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اپنے برادر نسبتی سید محمد آفاق نقوی مرحوم ومغفور سے بھی بہت شگفتگی وشیفتگی کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ اپنے سارٹھو بھائیوں سے بہت لطف کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ حضور احسن العلماء کے تمام سارٹھو بھائی انہیں شاہ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

۳۶- جب تک صحت نے ساتھ دیا پیدل چلنا بہت پسندیدہ فعل رہا۔ الحاج عتیق احمد برکاتی کان پوری بیان کرتے ہیں: ''میاں چمن گنج سے جاج مئو تک پیدل جاتے اور اس رفتار سے جاتے کہ ہم بچوں کو دوڑ دوڑ کر ساتھ نبھانا پڑتا۔''

۳۷- گھر کے دروازوں کو رات کے وقت جب بند کرنا مقصود ہوتا تو فرماتے جاؤ دروازے مامور کردو۔ جب کھانا کھا چکتے تو فرماتے کھانا بڑھالو۔ یہ نہیں فرماتے کھانا اٹھالو، کیوں کہ کھانا اٹھالو کا جملہ رزق اٹھنے کے محاورے کے لحاظ سے برے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لالٹین یا چراغ بجھانے کے لئے حکم دیتے تو فرماتے چراغ بڑھادو۔ یہ معمولات تھے جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی گئی۔ یہ ان کا وہ حسن ادب تھا جو اپنے بزرگوں کی پاکیزہ صحبت میں میسر آیا تھا۔

۳۸- نماز میں گلے تک کرتے کے بٹن بند رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ آستین چڑھا کر نماز پڑھنے کو منع فرماتے تھے۔ اسی طرح پتلون کے پائنچے چڑھا کر نماز پڑھنے کو بھی منع فرماتے تھے۔ عمامہ پہنتے تو سخت اہتمام کرتے کہ ٹوپی نظر نہ آئے۔

۳۹- مزدوروں کو دن میں ایک بار سے زیادہ چائے پلواتے۔ اگر گرمی کا موسم ہوتا تو لسی پلواتے۔ یہ وطیرہ ہمیشہ جاری رہا، مرض وصال میں بھی۔

۴۰- اکثر اپنے چھوٹوں کی محفل میں بزرگوں کے واقعات بہت دلچسپی کے ساتھ سناتے۔ حکایتوں میں واقعات کی ترتیب ہمیشہ یکساں رہتی۔ یہ واقعات ان کی زبان سے اتنے تواتر کے ساتھ سنے ہیں کہ بہت سی خاندانی روایتیں ان کے بچوں کو ازبر ہوگئی ہیں۔ شاید یہی ان کا بھی مقصد رہا ہو کہ علم سینہ درسینہ کی روایت خاندان میں ختم نہ ہو۔

۴۱- چھپکلی سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ کوئی نشان دہی کرتا کہ آپ کے پلنگ پر چھپکلی ہے تو اسے بہت آہستگی سے ہٹا دیتے تھے۔ وحشت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

۴۲- شعرا میں حضرت حسان، جامی، سعدی، مولانا روم، خسرو، میر، غالب، داغ اور سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کے اشعار پڑھتے۔ اشعار پڑھتے وقت ایک عجیب جذبے کی سی کیفیت طاری ہوجاتی۔ یہی حال تب ہوتا جب وہ حضور صاحب البرکات کے اشعار پڑھتے تھے۔ خصوصاً ان کے ترجیع بند کے اشعار۔

۴۳- صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اولیائے کرام میں حضور غوث پاک، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضور صاحب البرکات رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر سب سے زیادہ فرماتے تھے۔

۴۴- سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیغمبروں میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرماتے۔

۴۵- مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں کبھی مزارات کا بوسہ لیتے دیکھا ہو۔

۴۶- خود کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کے لئے پابندی سے ریڈیو پر خبریں سنتے تھے۔ شب جمعہ میں پاکستان ریڈیو سے میلاد بھی

بہت شوق کے ساتھ سنتے تھے۔

۴۷- مہمانوں کی ضیافت بہت شوق سے فرماتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ گھر پر آنے والا کھانا کھا کر جائے یا کم از کم ناشتہ ہی کرلے۔ وہ بھی نہیں تو چائے تو ضرور پی کر جائے۔

۴۸- دستاویزات اور خاندانی کتابوں کے نادر نسخوں کے بارے میں اکثر ہم بچوں کو تشریحی وضاحت کے ساتھ بتاتے تھے کہ فلاں چیز فلاں فلاں الماری میں ہے۔ اکثر یہ جملہ بھی کہتے۔ یاد رکھو میرے بعد یہ بات بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

۴۹- رات کو عشا کے ایک گھنٹے بعد سونے کے لئے لیٹ جاتے تھے کہ فجر سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بیدار ہونے کی عادت تھی۔

۵۰- کسی بھی امتیاز کے حصول پر دعاؤں کے علاوہ مادی انعامات سے ضرور نوازتے تھے۔ عم محترم حضرت حسین میاں صاحب مدظلہ نے جب داڑھی رکھی تو اس خوشی میں پانچ سو روپے کا انعام عطا ہوا۔

۵۱- تعویذ دینے اور نمک، شکر، پانی دم کرنے میں بہت فیاض تھے۔ قرب وجوار، دور و نزدیک کے مرد اور عورتوں کا خانقاہ میں تانتا لگا رہتا۔ اللہ کے کلام کی برکت سے سبھی کی مرادیں بھی خوب پوری ہوتی تھیں۔ کوئی ناسمجھ تعویذ لے کر اگر ان کی طرف رقم بڑھاتا تو ہنس کر اس سے کہتے کہ اس کی مٹھائی لے کر اپنے گھر لے جانا۔

۵۲- بزرگوں کے یوم وصال کے روز درگاہ معلی میں جا کر ایصال ثواب ضرور کرتے اور اکثر یہ محفل کی شکل میں ہوتا تھا۔

۵۳- اپنے مریدوں (جن کو وہ ''احباب'' کے نام سے یاد کرتے تھے) سے ان کے اہل خاندان کی خیریت ضرور دریافت فرماتے تھے اور روزگار، تعلیم اور دیگر معاملات کے سلسلہ میں انہیں مفید مشورے بھی دیتے تھے۔

۵۴- کار میں ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھتے اور تحدید لگا دیتے کہ ۵۵-۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار پر گاڑی نہ چلائی جائے۔

۵۵- جہالت سے نفور رہتے تھے اور علم واہل علم کی بہت توقیر فرماتے تھے۔ علم دینی کے علاوہ علم دنیا کے بھی قدردان تھے۔

۵۶- غریبوں سے محبت فرماتے تھے لیکن غربت مرغوب نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ مفلسی ہو تو اس زمانے میں انسان عبادت بھی ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔ وہ رہبانیت بھی ناپسند فرماتے تھے۔ ارشاد فرماتے تھے کہ اسلام کا سبق متوازن زندگی گزارنا ہے۔

۵۷- ہمیشہ مخاطب کے علم وفہم اور زبان دانی کی صلاحیت کے مطابق گفتگو فرماتے۔ وعظ میں اگر کوئی مشکل اصطلاح آجاتی تو اس کے آسان مترادفات کے ڈھیر لگا دیتے۔ مخاطب کا چہرہ دیکھ کر اندازہ کرتے کہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں، جب مطمئن ہو جاتے تب مضمون آگے بڑھاتے۔

۵۸- صبر پر حد درجہ عامل تھے۔ ہزاروں افراد اس کے گواہ ہیں کہ انہوں نے صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اپنی بڑی بیٹی کو شب میں دفن کیا اور صبح بقرعید کی نماز پڑھا کر خطبہ پڑھ کر ایک نظر تازہ قبر پر ڈالی اور تمام افراد کو بقرعید کی مبارک باد پیش کی۔

۵۹- از خود اپنی جسمانی تکلیفوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ کوئی تیماردار عیادت کرنے والا یا ڈاکٹر پوچھتا تب البتہ تفصیل سے بتاتے لیکن وہ بھی اس حد تک نہیں کہ پوچھنے والا پچھتانے لگے۔

۶۰- روپئے پیسے بہت بے ترتیبی سے رکھتے تھے۔ تکیے کے نیچے، گدے کے نیچے، چادر کے نیچے، ڈائری میں، رومال میں سرہانے، پائینتی غرض ہر جگہ کچھ نہ کچھ نقدی رکھی رہتی تھی، سب کو سمیٹ کر یکجا کرنے کی کوشش کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ بحرالعلوم مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ حضور احسن العلماء روپئے کو اپنے پیروں کے نیچے رکھتے تھے۔ بحرالعلوم سچ فرماتے ہیں۔ یہی ہم اولادوں کا بھی مشاہدہ رہا۔

۶۱- مسجد کھڑک بمبئی کے حجرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس میں میرے بھائی صاحب علیہ الرحمۃ کی روح کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

۶۲- سفر سے واپس ہوتے تو سب کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتے۔ میرے لئے اکثر بنیاین اور رومال لے کر آتے تھے۔ ہمشیرہ صاحبہ اور اہلیہ صاحبہ کے لئے کپڑے لے کر آتے تھے۔ ملازمین کو بھی حسب فرمائش چیزیں لاکر دیتے تھے۔ بچپن میں ان سے اگر کوئی فرمائش کی تو فوراً قبول فرمائی۔ بمبئی سے مارہرہ شریف آنے میں دیر تھی۔ بڑے ابا علیہ الرحمۃ پہلے آنے والے

تھے۔ انہیں کے ذریعہ بھیج دی تا کہ میرا انتظار لمبا نہ کھنچے، یہ فرمائش ایئر رائفل سے متعلق تھی۔

۶۳- قفل لگا کر اسے اچھی طرح کھینچ کر دیکھتے تھے کہ صحیح لگ گیا۔

۶۴- بازاروں میں گھومنا پسند نہیں تھا۔ بچوں کو نصیحت کرتے کہ بازار میں گھومنے پھرنے سے بہتر ہے کہ فیلڈ میں جا کر کھیلو اور کھیتوں ،باغوں کی سیر کرو۔

۶۵- معذوروں کی مدد کرنے میں بہت حریص تھے۔ کئی معذور افراد ان سے اپنا مقررہ اپنے اپنے معینہ وقت پر وصول کرتے تھے۔

۶۶- چبا چبا کر بات کرنے کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ فرماتے تھے جو بھی کہنا ہے کھل کر کہو، واضح انداز میں کہو، وہ خود بھی بہت واضح انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔

۶۷- روز نامچہ پابندی سے لکھا کرتے تھے، جب مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو رجسٹروں کے بجائے چھوٹی چھوٹی ڈائریوں پر یاد داشت لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اعراس میں علمائے کرام خصوصاً بڑے ابا حضرت سید العلماء علیہ الرحمۃ کے وعظ کے نوٹس ضرور تیار کرتے تھے۔

۶۸- عرس قاسمی کی تیاری بہت جوش وخروش کے ساتھ کرتے تھے۔ دراصل 'عرس قاسمی' کے لئے حضور تاج العلماء کی نصیحت ووصیت بھی یہ یہی تھی کہ اس عرس کو اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے۔ یہ عرس قاسمی جن خاندانی روایات اور شرعی حدود کی پابندیوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اس کے بارے میں ایسی ہی وصیت کی جائے اور اسے ایسے ہی اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ جانشین کو توفیق وطاقت، صحت وزندگی عطا فرمائے۔ آمین، بجاہ الحبیب الامین صلی اللہ علیہ وسلم

۶۹- عرس قاسمی برکاتی کے ایام میں ہم لوگوں نے انہیں صرف آخری دن زیارت آثار متبرکہ کے بعد کھانا کھاتے دیکھا۔ وہ بھی ایک مٹی کے پیالے میں چند بوٹیاں اور تندور کی دو روٹیاں۔

۷۰- وہ مقدمات کو شخصی تعلقات کے درمیان حائل نہیں ہونے دیتے تھے اور مدعی، مدعا علیہ سے ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۳۱۶ کا

تصوف، ادب، شعر وموسیقی، تذکرہ اور تاریخ نگاری اور علوم اسلامی کی کوئی تاریخ اہل بلگرام کے تذکرے سے خالی نہیں رہ سکتی۔ یہاں کے مشائخ وقت نے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دینی کاموں کو فروغ دینے میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ ہندوستان میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم جب بھی تصوف اور اس کے اسرار ورموز سے واقفیت کا ذکر آئے گا تو بلگرام کا حوالہ تاریخ کی کتابوں میں ضرور ملے گا۔ اسی لئے تو اورنگ زیب عالم گیر جیسے بادشاہ نے سادات واسطیہ اور شیوخ عثانی (سادات بلگرام) کے متعلق یہ مشہور فقرہ کہا تھا" سادات بلگرام واجب الاحترام"۔

❁❁❁

بزرگانِ مہرولی شریف

فاروق ارگلی .... نئی دہلی

یہ مہرولی شریف ہے، وہ مقدس بستی جو نائب سلطان الہند، خواجۂ خواجگان، آفتابِ ولایت حضرت خواجہ غریب نواز، حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی سلطنت کا پایۂ تخت بنی۔ بڑی بڑی بادشاہتیں تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہوگئیں لیکن روحانیت کے عظیم تاجداروں کی یہ لافانی بادشاہتیں آج بھی برقرار ہیں اور ہمیشہ قائم و دائم رہیں گی۔ انسانی دلوں پر حکومت کرنے والے وہ روحانی تاجدار، جن کا دستور عشق الٰہی، جن کا قانون انسان اور انسان کے درمیان ہر طرح کی تفریق مٹا کر احترامِ آدمیت، حق و صداقت اور خالق کائنات کی عظمت کا پرچم بلند کرنا، جن کا عمل تھا انسانی سماج کو نفرت، عداوت، برائی اور بداخلاقی کے اندھیرے مٹا کر نیکی، امن، یکجہتی، محبت اور سلامتی کے نور سے جگمگا دینا، ان بزرگوں کے مقدس حالات اور ان کی نورانی تعلیمات آج بھی روشنی کے مینار بن کر ہمیں بھلائی کا راستہ دکھا رہی ہیں۔

سرزمین مہرولی شریف کا یہ مقدس مقام جس جگہ تاجدار روحانیت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما ہیں، خواجہ نے اپنی زندگی میں ہی پسند فرمایا تھا، آپ نے فرمایا تھا: اس جگہ سے محبت کی مہک آتی ہے، نائب سلطان الہند کی پسند کی گئی اس پاکیزہ زمین کے چپے چپے پر لاتعداد مردانِ حق قطب معرفت کے گرد روشن ستاروں کی طرح آرام فرما ہیں، تو آیئے، ہم ان پاک ہستیوں کی زیارت سے دل و نگاہ کو منور کریں۔

کرم کی بدلیاں رحمت کی بارش نور کا عالم
دیارِ دوست میں شانِ مشیت اور ہی کچھ ہے

یہ ہے حضرت خواجہ کے بڑے صاحبزادے حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزار شریف، آپ صاحب کمال بزرگ تھے، تاحیات اپنے عظیم والد کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور یہ قبر شریف ہے حضرت خواجہ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت سید محمود کی جو سات سال کی عمر میں ہی چل بسے تھے۔ اور یہ ہے جاں نثار قطب الاقطاب حضرت شیخ بدر الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ، آپ غزنی کے رہنے والے تھے۔ آپ کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزنی میں آپ نے عالمِ خواب میں سرکار دوعالم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر ایک نوجوان درویش کو تھما دیا۔ سرکار دو جہاں نے فرمایا ''اے بدر الدین تو اس درویش کا مرید ہوجا'' شیخ بدر الدین فرماتے ہیں، وہ درویش نوجوان تھے، ریشِ مبارک تھوڑی تھوڑی چہرے پر نمودار ہورہی تھی۔ ان کا نام خواجہ قطب الدین تھا۔ جناب شیخ تلاشِ حق میں ہندوستان پہنچے، لاہور ہوتے ہوئے دہلی آئے، یہاں قطب صاحب کی زیارت کی، یہ وہی نورانی چہرہ تھا جسے خواب میں سرکار نے انہیں دکھایا تھا۔

شیخ نے بارگاہ قطب الاقطاب میں مرید ہونے کی گزارش کی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا ''بدر الدین! تُو تو اُسی رات کو میرا مرید ہوگیا تھا جب سرکار نے تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا''۔ آپ حافظ قرآن تھے، خانقاہ کی امامت آپ کے سپرد ہوئی۔ تمام عمر عبادت و ریاضت میں اپنے مرشد کی پیروی میں بسر کی۔ حضرت شیخ نے طویل عمر پائی۔ آپ اپنے عہد کے مردانِ کامل میں شمار ہوتے تھے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ آپ کا بے حد احترام کرتے تھے، سماع سے آپ کو بے حد شغف تھا، محفل سماع میں وجد طاری ہوجاتا تو رقص کرنے لگتے تھے۔ عالم ضعیفی میں، جب چلنے پھرنے سے بھی معذور تھے، سماع سنتے تو رقص کرنے لگتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا '' حضرت! اس کمزوری کی حالت میں اس طرح وجد میں آکر رقص کس طرح کرنے لگتے ہیں؟'' فرمایا: ''میں کب ناچتا ہوں،

عشق نچاتا ہے۔'' ایک بار دہلی میں بارش بہت کم ہوئی، بادشاہ التمش نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا'' جب تک بدر الدین زندہ ہے دہلی میں قحط نہیں پڑے گا''، یہ فرمانا تھا کہ آسمان پر بادل چھا گئے اور جھما جھم بارش ہونے لگی۔ حضرت امام الدین ابدال آپ کے خلیفہ و جانشین ہیں۔

اور یہ آستانہ ہے بزرگِ کامل سلطان التارکین حضرت قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا۔ ناگور شریف میں قیام فرمایا۔ سلطان التمش نے ناگور کا قاضی بنایا، خواجہ قطب کی محبت میں دہلی آگئے۔ آپ سلسلۂ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ آپ کا خاندانی نام شیخ محمد بن سلطان عطا محمد تھا۔ والد اپنی ریاست کے حکمراں تھے۔ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے انہوں نے حکومت کی ذمہ داریاں بیٹے کے سپرد کردیں۔ ایک بار شکار میں آپ نے ایک ہرن کا پیچھا کیا اور تیر چلا کر اسے زخمی کیا، جب آپ زخمی ہرن کے پاس پہنچے تو اس کی آواز سنی'' اے عزیز! تو پروردگار کا بندہ ہے، مجھ بے گناہ کو کیوں مارا؟ اس کا اپنے پروردگار کو کیا جواب دے گا؟'' اس کے بعد آپ نے تخت و تاج اور عیش و راحت کی زندگی سے ترک تعلق کر کے درویشی اختیار کرلی۔

دہلی میں آپ خواجہ قطب کے ساتھ عبادت و ریاضت اور خلق اللہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ سماع سے آپ کو عشق تھا۔ آپ صاحب تصنیف تھے، آپ کی کتابوں میں شرح اسمائے حسنیٰ، شرح چہل حدیث اور کتاب سنتِ احباب مشہور ہیں۔ آپ نے لمبی عمر پائی، ۹ رمضان المبارک ۶۴۳ھ کو آپ نے تراویح میں قرآن پاک کا ختم فرمایا، نماز تراویح کے بعد سجدہ شکر ادا کیا اور اسی سجدے کی حالت میں وصال ہوگیا۔ حضرت شیخ شاہی موئے تاب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ محمود موئینہ دوز رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر بزرگ آپ کے خلفا تھے۔ یہ حضرات بھی اسی پاک سرزمین پر آرام فرما ہیں۔

یہ ہے حضرت سید نورالدین مبارک غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اقدس، سلطان التمش نے آپ کو شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ آپ عالم باعمل اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ دہلی والے احتراماً آپ کو میرِ دہلی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آپ غزنی سے ہندوستان تشریف لائے تھے، آپ کی بزرگی کے بارے میں حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت مبارک غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ حضرت شیخ محمد اہل شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض نعمت حاصل کیا تھا، پھر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے خرقۂ خلافت پہنا۔

حضرت روشن چراغ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ شیرازی کے مریدوں میں ایک سوداگر تھا۔ اس نے ایک دن حضرت شیرازی سے عرض کیا کہ اس کے گھر بیٹا تولد ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا'' کل فجر کے وقت اسے میرے پاس لانا'' شیخ مبارک کے والد اس مجلس میں موجود تھے، ان کو بھی اللہ نے اِنہی دنوں فرزند عطا فرمایا تھا۔ وہ بھی اگلی صبح کو اپنے بیٹے کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوگئے، اس وقت شیخ نماز ادا کر رہے تھے، سوداگر تب تک وہاں پہنچا نہیں تھا، شیخ نے جوں ہی نماز پوری کی، انہوں نے اپنا بیٹا سامنے کردیا۔ آپ نے ایک نگاہِ کرم اس خوش نصیب بچے پر ڈالی اور تمام روحانی نعمتیں عطا فرمادیں۔ تھوڑی دیر میں سوداگر اپنا بچہ لے کر وہاں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ نے فرمایا'' تو نے دیر کردی'' یہ نعمتیں اس سیدزادے کی قسمت میں تھیں۔

آپ نے تمام عمر رشد و ہدایت اور عبادت و ریاضت میں بسر کی، ۶۳۲ھ میں آپ واصلِ حق ہوئے۔

یہ مزار اقدس ہے حضرت قاضی حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت شیخ شاہی موئے تاب رحمۃ اللہ علیہ کا جنہیں قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روشن ضمیر کا لقب عطا کیا تھا۔ آپ کی عظمت و بزرگی اور روحانی کمالات بہت ہیں۔ خیر المجالس میں مذکور ہے کہ ایک بار کسی کام سے آپ کے احباب کسی مقام پر لے گئے اور وہاں انہوں نے قیام کیا اور ساتھیوں نے کھیر تیار کی۔ جب دسترخوان لگا، حضرت شاہی نے کھانے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ اس کھانے سے خیانت کی بو آتی ہے۔ ساتھیوں نے عرض کیا:'' حضرت! ہم نے ہرگز خیانت نہیں کی، لیکن ان دو اصحاب نے جو کھانے کی تیاری میں لگے تھے، عرض کیا: '' جب دودھ ابل رہا تھا تو ضائع ہوجانے سے بچانے کے لئے پتیلی

سے کم کر کے انہوں نے پی لیا تھا"۔ آپ نے فرمایا: "دوستوں کے آگے کھانا رکھنے سے پہلے جو خود کھالیتا ہے وہ خیانت کرتا ہے"۔

آپ نے کوئی عذر قبول نہیں کیا۔ دونوں ساتھی شرمندگی سے سر جھکائے کھڑے رہے، گرمی کا موسم تھا، دونوں پسینے سے بھیگ گئے، آپ نے ان کی حالت دیکھ انہیں معاف کر دیا۔ پھر خون نکالنے والے فصاد کو بلوا کر اس سے کہا: "جتنا میرے ساتھیوں کا پسینہ بہا ہے اتنا خون میرے جسم سے نکال لے" سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ حضرت شاہی موئے تاب کو اپنے دوستوں سے اتنی محبت تھی کہ ان کے پسینے کے بدلے اپنا خون بہا دینے کا حکم دیا، اور آداب شریعت کا یہ لحاظ تھا کہ ان کی عذر خواہی قبول نہ کی۔

اور یہ ہے اپنے عہد کے جلیل القدر، ولی کامل حضرت شیخ محمود موئینہ دوز رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مزار شریف، آپ حضرت خواجہ سید حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ کے مرید خاص اور حضرت قطب الاقطاب کے عقیدت مند اور عزیز دوست تھے، جنہیں سالہا سال تک ایسے بزرگ کی صحبت اور محبت ملی ہو ان کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ آپ کے وصال کے بعد حاجت مند آپ کے مزار کے قریب ایک پتھر لے جا کر رکھ دیا کرتے تھے، منت پوری ہونے پر پتھر کے وزن کے برابر شکر کا تبرک تقسیم کیا کرتے تھے۔

اور یہ ہے حضرت مولانا فخر الدین فخر پاک کا آستانہ مبارک۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں ہیں۔ آپ ۱۱۲۶ھ میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی جید عالم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ آپ کی والدہ کا تعلق حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان سے تھا جن کا آستانہ شریف گلبرگہ شریف میں مشہور عالم ہے۔ حضرت فخر پاک اوائل میں دہلی تشریف لائے، یہاں آپ نے شریعت، سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کی اور اسی شہر میں رہ کر اپنے بزرگوں کے روحانی و حقانی پیغام کو عام کرتے رہے۔ ۷۳ سال کی عمر شریف میں ۲۷ جمادی الثانی کو پردہ فرمایا اور جوار قطب الاقطاب میں آرام فرما ہیں۔

یہ ہے تاج الاولیاء حضرت شیخ مخدوم سماء الدین سہروردی دہلوی کا آستانہ مبارک۔ آپ کا شجرۂ نسب بارہ واسطوں سے صحابی رسول حضرت معاویہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ۸۰۸ھ میں ملتان میں ہوئی۔ آپ نے حضرت شیخ کبیر الدین اسمٰعیل شیخ کبیر علیہ الرحمہ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور ترک سکونت کر کے رن تھمبور اور پھر بیانہ میں رہے اور خلق اللہ کو راستی و نیکوکاری کا درس دیتے رہے۔ بعد میں آپ سلطان بہلول لودی کے زمانے میں تشریف لائے۔ سلطان آپ کا بے حد معتقد تھا۔

سلطان بہلول لودی کا لڑکا نظام خاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور استدعا کی کہ وہ حضرت سے میزان الصرف پڑھنا چاہتا ہے۔ سبق کے بہانے اس نے اَسْعَدَکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَین کے معنی پوچھے۔ آپ نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تجھے دونوں جہانوں میں نیک بخت کرے۔ شہزادہ نظام خاں نے عرض کیا پھر فرمایئے، آپ نے پھر وہی بات کہی، اس طرح تین بار کہلوانے کے بعد شہزادے نے دست بوسی کی اور عرض کیا: میں یہی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ دعائیہ کلمات نکلیں۔ آپ اُس کے حسن ادب سے اس قدر خوش ہوئے کہ دعا دی: "تو سکندر وقت ہو" اور دعا کی برکت سے نظام خاں بادشاہ بنا اور سکندر لودی کے نام سے مشہور ہوا۔

آپ نے اپنی ساری عمر عبادت و ریاضت اور خلق اللہ کو صراط مستقیم دکھانے میں صرف کی۔ آپ فرمایا کرتے: "یقیناً تین لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام سے محروم رہیں گے، ایک وہ بوڑھے جو گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، دوسرے وہ جوان جو بہ امید توبہ، گناہ سے باز نہیں آتے اور تیسرے وہ حکمراں جو جھوٹ بولتے ہیں۔"

جمادی الاول ۹۰۱ھ میں آپ واصل حق ہوئے۔ وفات سے قبل آپ نے خواب میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ حوض شمسی کے کنارے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں یہ جگہ تمہاری ہے۔ اللہ اللہ یہ مہرولی شریف کی سرزمین کس قدر نورانی اور کس قدر مقدس ہے۔

❁❁❁

مشائخ بلگرام: تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر حمیرا محمود آفریدی .... لکچرر شعبۂ اردو، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ

خواجہ عماد الدین اور سید محمد صغریٰ بلگرام میں بسنے والے پہلے مشائخ ہیں۔ یہ دونوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سنجری رحمۃ اللہ علیہما کے مرید تھے۔ خواجہ عماد الدین کا انتقال بقول میر غلام علی آزاد بلگرامی ۶۳۲ھ میں ہے۔ ان کا مزار بلگرام میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام ہیں۔ التمش کے حکم سے آپ نے ۶۲۷ھ میں ایک بلند ٹیلہ پر چھوٹا سا قلعہ بھی تعمیر کیا تھا۔ وہاں ان کی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق دہلی میں مسلمانوں کے فتح سے قبل یہ علاقے مسلمانوں نے فتح کر لئے تھے مثلاً قنوج اور بلگرام وغیرہ۔ شاہان شرقی نے لودیوں کو شکست دے کر اپنی آزاد حکومت بلگرام میں قائم کر لی۔ اٹھارہویں صدی تک بلگرام اپنے علما، صوفیا اور مشائخ کی وجہ سے یہ شرف حاصل کر چکا تھا کہ یہاں دور دراز سے طلبا اپنے علم کی پیاس بجھانے آتے تھے، مہاجر مکی اور شیخ عبد اللطیف اعظمی نے قنوج اور بلگرام ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔

بلگرام کے قدیم صوفی قاضی محمد یوسف عثمانی گازورونی ہیں آپ کو فاتح بلگرام بھی کہا جاتا ہے۔ التمش کے عہد میں ابوالفرح واسطی کے جانشین سید محمد صغریٰ یہاں آئے تھے اور بلگرام میں انہیں دونوں بزرگوں کی اولاد مرجع خلائق ہے۔ یعنی سادات واسطیہ اور شیوخ عثمانی جن کے پاس قضا کا محکمہ رہا، لیکن فضل و کمال اور شہرت میں سادات ہمیشہ سبقت لئے رہے ہیں۔ مغلیہ عہد میں انہوں نے علوم دین اور تصوف نیز موسیقی اور شاعری کی طرف توجہ زیادہ رکھی۔ انتظامی امور اور سیاسی مسائل سے الگ رہے۔ غالباً اسی لئے اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور فقرہ ان کے لئے زبان زد ہوا ہے کہ ''سادات بلگرام واجب الاحترام مانند چوب مسجد بیت الحرام نہ سوختنی نہ فروختنی''

بلگرام کی سرزمین پر جن عظیم شخصیتوں نے جنم لیا ان میں سے ایک ممتاز ہستی سید مرتضیٰ بلگرامی کی بھی ہے۔ عربی لغت القاموس کی شرح تاج العروس آپ ہی سے منسوب ہے۔ دوسری اہم شخصیت میر عبدالجلیل بلگرامی کی ہے۔ آپ اورنگ زیب کے وقائع نگار تھے۔ فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبانوں میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ عربی میں ان کی مہارت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پوری قاموس انہیں حفظ تھی۔ ان کے بیٹے سید محمد شاعر بلگرامی بھی یکتائے روزگار تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کے نواسے ہیں جن کی شخصیت علم و فضل اور کمالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ممتاز اور قد آور ہے۔

آزاد بلگرامی کی پیدائش ۱۷۰۴ء میں ہوئی۔ متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف ''روضۃ الاولیاء'' ہے اس کتاب میں خلد آباد دکن کے مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ سن تالیف ۱۱۶۱ھ ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور عالم نے تذکرہ، تاریخ، اسماء الرجال کا کام نہیں کیا۔ اُن کی اور ان کے شاگردوں کی تصانیف کی بدولت اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی علمی اور ثقافتی تہذیب و تاریخ کا اہم مواد محفوظ ہو گیا ہے۔ میر علی آزاد بلگرامی کا انتقال ۱۷۸۶ء بمقام اورنگ آباد ہوا۔ آپ وہیں خلد آباد میں فوائد الفواد کے جامع امیر حسن علاء سنجری کے مزار کے احاطے میں مدفون ہیں۔ میر عبدالواحد بلگرامی بھی اسی مردم خیز (بلگرام) قصبے کے فرزند تھے آپ کی تصنیف ''سبع سنابل شریف'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب فن سلوک و عقائد میں ایک بلند پایہ تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب اُردو میں دیدہ زیب کتابت و معیاری طباعت کے ساتھ اسلامی بک اسٹال پر دستیاب ہے۔ پہلی بار یہ کتاب مطبع نظامی کانپور سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوئی تھی۔ میر عبدالواحد بلگرامی نے اصطلاحات تصوف میں بھی متعدد رسائل تصنیف کیے۔

بلگرام کے علمائے تصوف میں ایک اور قد آور شخصیت میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کی ہے۔ انہوں نے ۱۱۴۳ھ کو دہلی میں انتقال کیا اور بستی حضرت نظام الدین اولیا میں سپرد خاک ہوئے۔ شیخ عبد الواحد بلگرامی کا ذکر عبد القادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ آپ ہندی کے اچھے شاعر اور فن موسیقی میں کامل درک رکھتے تھے۔ اسی مناسبت سے ابو الفضل نے "آئین اکبری" میں رقم کیا ہے کہ "بلگرام والے موسیقی کے اچھے نقاد ہوتے ہیں۔"

سلسلۂ چشتیہ میں میر عبد الواحد، شیخ صفی الدین سائی پوری سے بیعت تھے۔ یہ قنوج میں رہتے تھے اور عبد القادر بدایونی نے ۹۷۷ھ میں آپ سے ملاقات کی تھی۔ سو سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہے۔ سن وصال ۱۰۱۷ھ ہے۔ میر عبد الواحد بلگرامی کے چار فرزند میں سے ایک میر عبد الجلیل بلگرامی ہیں، یہ آزاد بلگرامی کے نانا میر عبد الجلیل سے مختلف ہیں جن کا ذکر آچکا ہے۔ آپ نے مارہرہ میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی اور وہیں انتقال کیا۔ شاہ برکت اللہ پیمی کا ہندوی کلام شائع ہو چکا ہے۔ میر عبد الجلیل کے پوتے تھے۔ شاہ صاحب کی ایک کتاب "عوارف ہندی" بھی اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے یہ کتاب ہندی زبان کی کہاوتوں کے پیرائے میں ہے۔ یہی پیرائے اظہار شاہ برکت پیمی نے صوفیانہ خیالات کو عوام تک پہنچانے کا اہم ذریعہ بنایا اور اس طرح انہوں نے گویا تصوف کو عوامی زندگی سے جوڑ دیا۔ آپ کا ہندی کلام "پیم پرکاش" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ سید آل احمد مارہروی شاہ برکت پیمی کے بیٹے اور سجادہ نشین تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مکتوب الیہ صاحب علم مارہروی بھی شاہ برکت کے چشم و چراغ ہیں۔

مرزا غالب ہی کے شاگردوں میں غلام حسین قدر بلگرامی ہیں جن کے نام غالب نے متعدد خطوط تحریر کیے ہیں۔ سید فرزند احمد بلگرامی سے اردو ادب کے قاری خوب واقف ہوں گے۔ ان کا تحریر کردہ ایک ضخیم تذکرہ "شعراء جلوہ خضر" کے نام سے دو جلدوں میں آب حیات کے طرز پر شائع ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کے اوّل تک سر سید احمد خاں کے دو ممتاز رفقا بلگرام ہی کے باشندے تھے یعنی عماد الملک سید حسین بلگرامی اور نواب محسن الملک جو مدتوں محمڈن کالج علی گڑھ کے سکریٹری اور ٹرسٹ رہے، انہوں نے شیعہ مذہب کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا اور رد شیعیت میں ایک ضخیم کتاب "آیات بینات" لکھی۔ یہ کتاب گرچہ مدلل ہے لیکن اس کی عبارت عاری نہیں بلکہ مغلق ہے۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی ۱۹۰۷ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کے ممبر منتخب کیے گئے تھے۔ اس وقت تک کسی ہندوستانی کو اتنا بڑا مرتبہ ملنا مشکل تھا۔ عماد الملک کے نواسے علی یاور جنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پھر مہاراشٹر کے گورنر رہے۔

سید علی بلگرامی تمدن ہند و تمدن عرب کے مترجم کی حیثیت سے علمی دنیا میں خوب جانے اور پہچانے جاتے ہیں، پیدائش پٹنہ کی (۱۸۵۱ء میں ہے) ہے۔ آپ کو گیارہ بارہ زبانوں کا علم تھا، سنسکرت کے ایسے عالم تھے کہ مدتوں مدراس یونیورسٹی کے ممتحن رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی نے انہیں مراٹھی زبان کا ریڈر مقرر کیا تھا، ۱۸۹۳ء میں انگریزی حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ عربی کتاب کلیلہ و دمنہ جسے ابن مقفع نے فارسی کے ذریعے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے اصل سنسکرت قصہ کا سراغ بھی لگایا تھا اور ایک رسالہ "در تحقیق کلیلہ و دمنہ" تحریر کیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کا انتقال ضلع ہردوئی میں ہوا۔ میر سعادت علی خاں حیدر آبادی جو عراق اور ترکی میں ہندوستان کے سفیر رہے، سید علی بلگرامی ہی کے نواسے تھے۔

بلگرام خاندان کے ممتاز افراد میں نواب ہوش یار جنگ ہوش بلگرامی تھے جن کے سوانحی خاکے "مشاہدات" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ نظام کی ریاست میں معتمد تعمیرات تھے۔ تحریک خدام کعبہ اور خلافت تحریک میں نمایاں حصہ لینے والے اُردو کے اچھے شاعر سید وصی احمد بلگرامی تھے جنہوں نے ۱۹۴۱ء میں کلکتہ میں انتقال کیا۔ سید ہادی بلگرامی اسٹیٹ آرکائیوز حیدر آباد کے ڈائرکٹر رہے۔

جن خانوادوں اور مشائخ سے بلگرام کا نام عزت سے لیا جاتا ہے وہ اب برصغیر میں دور دور تک جا بسے ہیں، کوئی پٹنہ میں ہے، کوئی دہلی میں، کوئی کراچی میں۔ بعض حیدر آباد اور علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ بلگرام نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی علمی و ثقافتی تاریخ و تہذیب کو روشن اور تابناک بنایا اور عروج و ترقی دلانے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔

باقی صفحہ: ۳۱۱ پر

باب پنجم
تحقیق تصوف
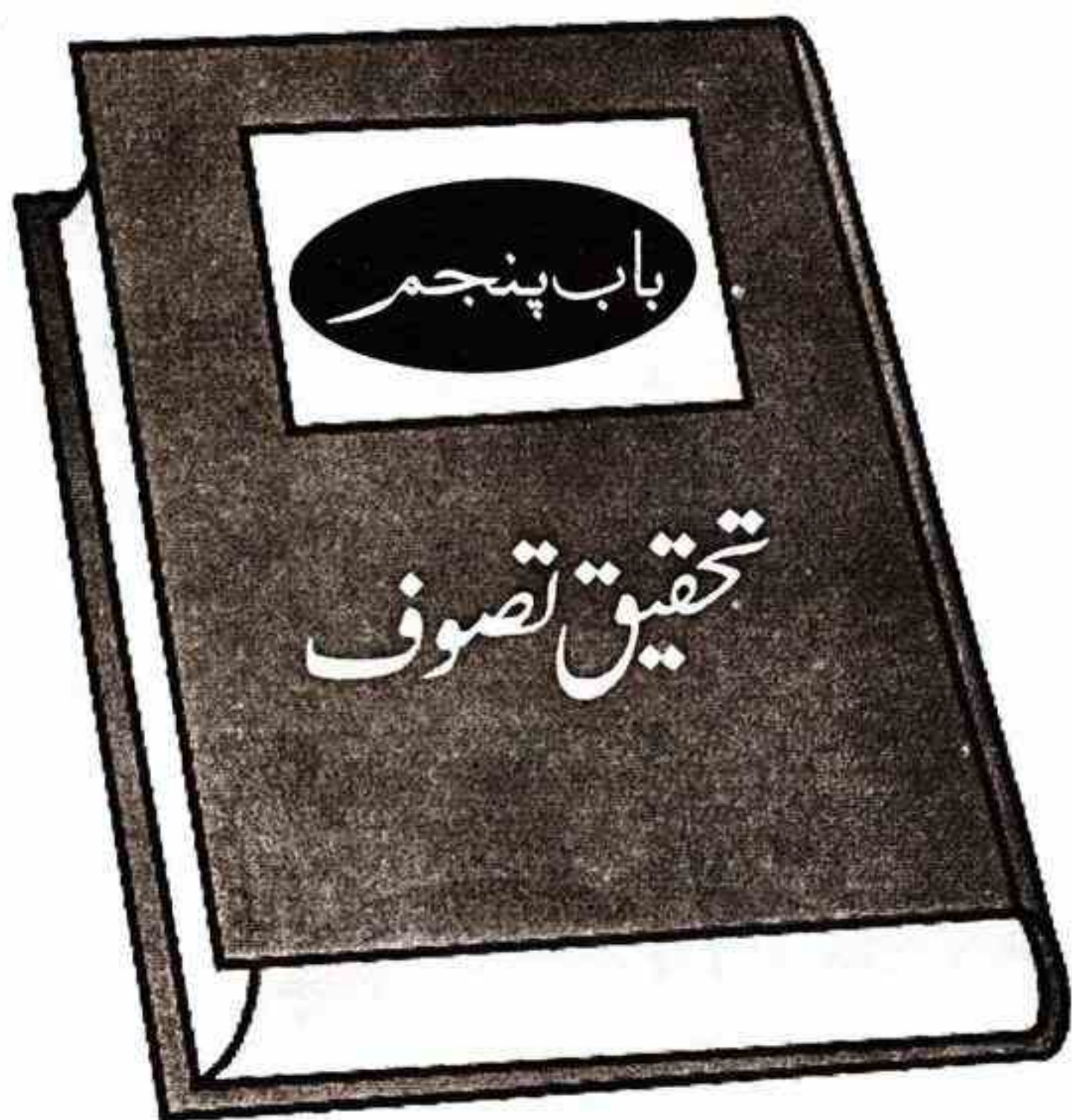
مکتوبات حضرت مخدوم جہاں

قسط اوّل

حضرت سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی ...... سجادہ نشیں خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، بہار

مکتوب یا خط کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اس کی صحیح نشاندہی مشکل ہے لیکن شاید جب سے انسان نے لکھنا سیکھا تبھی سے خط اور مکتوبات کی بھی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ بائبل میں بہتیرے خطوط منقول ہیں۔ قرآن کریم میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا مضمون منقول ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تبلیغ و دعوت کی غرض مختلف شاہان و مملوک کے نام اپنے مکاتیب روانہ کئے تھے۔ صوفیائے کرام نے بھی اثبات سنت میں مریدین و متوسلین کی تعلیم ورہنمائی کی غرض سے مکاتیب کے ارسال فرمانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ حضرت عین القضاۃ ہمدانی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی کے مکتوبات کے مجموعے مشہور و معروف ہیں۔

ہندوستان میں حضرت خواجۂ خواجگان سیدنا معین الدین حسن سنجری چشتی اجمیری (م ۶۳۳)، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، حضرت خواجہ بہاء الدین ذکریا ملتانی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر اجودھنی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ) کی مکتوب نگاری کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ان کے مکاتیب کے کسی مجموعے کا تا ایں دم تحریر علم نہیں۔ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی (م ۷۲۴ھ) کے مکاتیب کا مجموعہ محفوظ ہے لیکن علم تصوف وعرفان کی مکاتیب کے ذریعہ جیسی توسیع واشاعت حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نے فرمائی وہ بے مثال ہے اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے بھی آپ کے مکاتیب اپنی مثال آپ ہیں۔ جتنی بڑی تعداد میں آپ کے مکاتیب ملتے ہیں اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کسی دوسری شخصیت کے مکاتیب مل سکیں اور اگر مل بھی جائیں تو کسی ایک شخص کے نام دو دو سو مکتوب لکھنے والی شخصیت یقیناً آپ کی اکیلی شخصیت ہوگی۔

مکاتیب کی تعداد:

سب سے زیادہ مکاتیب حضرت مخدوم جہاں نے اپنے عزیز ترین مرید وخلیفہ اور جانشیں حضرت مولانا مظفر بلخی (م ۸۰۳ھ) کو لکھے جن کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مخدوم حسین بن معز نوشہ توحید بلخی (م ۸۴۸ھ) لکھتے ہیں:

''دو لیست چند مکتوب شیخ الاسلام شیخ شرف الدین منیری کہ بجانب شیخ مظفر مرحوم بود اجازت نبود یکسے بنماید چوں وقت رحلت شیخ شد فرمود مکتوب مذکور در کفن بنہد ہمہ در کفن پیچند مگر چند مکتوب ازاں بخط خدمت شیخ بر داعی ماند کہ نسخہ آں در ہیچ کتاب نیست۔ چوں سخنان غریب بود دایں درویش راتحفہ نمود انتساخ کردہ''

مخدوم حسین بن معز نوشہ توحید کے پاس محفوظ رہ گئے خطوط ہی مکتوبات بست وہشت کے نام سے معروف ہیں۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کے بعد سب سے زیادہ مکاتیب حضرت قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کے نام ملتے ہیں۔ مکتوبات صدی کے نام سے مشہور و معروف مجموعہ مکاتیب میں ۹۸ مکاتیب آپ ہی کے نام ہیں۔

مکتوبات دوصدی میں مختلف لوگوں کے نام دو سو خطوط ہیں ان کے علاوہ صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے ایک اور مجموعہ مکاتیب کے انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہونے کی اطلاع دی ہے جس میں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام ۱۲۵ خطوط ہیں۔ (میری تحقیق کے مطابق یہ مجموعہ حضرت مخدوم جہاں کے بجائے حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔)

اس طرح تقریباً ۶۲۵ عدد مکتوبات کی تو باضابطہ اطلاع مہیا ہوتی جن میں سے ۴۵۳ دستیاب ہوتے ہیں۔

"فوائد رکنی" میں جسے حضرت مخدوم جہاں نے خود اپنے مکاتیب کا بہترین انتخاب فرمایا ہے، کچھ ایسے مکاتیب کے بھی منتخب حصے ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے ہیں، جس سے کسی اور مجموعہ مکاتیب کے بھی وجود کا واضح پتہ چلتا ہے۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن آپ کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت مخدوم الملک کے خاندان والے ان کے تصانیف کی تعداد سترہ سو بتاتے ہیں"۔

مکاتیب وملفوظات کے مجموعوں کو بھی شامل کرنے کے بعد مہیا تصانیف کی کم وبیش ۳۰ تک پہنچی ہے ایسے میں ۷۰۰ تصانیف کی تعداد پر شبہہ وارد ہوتا ہے میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ تعداد آپ کے مکاتیب کی ہے اور یہ عین قرین قیاس ہے کیوں کہ ۶۲۵ عدد مکتوبات کے پتہ چلنے کے بعد ۷۰۰ مکتوبات کا ہونا عین ممکن ہے۔

مکتوبات کی افادیت:

شطاریہ سلسلہ کے مشہور ومعروف بزرگ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری (م ۹۷۰ھ) اپنی تالیف "اوراد غوثیہ" میں فرماتے ہیں:

"اگر مرشد حاضر نباشد مکتوبات شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری مطالعہ کند تا فریب نفس ووسواس خناس دریابد"۔

چشتیہ سلسلہ کے معروف شیخ وقت اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے جانشیں حضرت خواجہ نصیر الدین محمود دہلوی (م ۷۵۷ھ) کو حضرت مخدوم جہاں کے عزیز ترین خلیفہ حضرت مولانا مظفر بلخی کے ذریعہ مکتوبات کا ایک نسخہ مطالعہ کے لئے دستیاب ہوا بعد مطالعہ جب آپ نے وہ نسخہ حضرت مولانا مظفر بلخی (م ۸۰۳ھ) کو واپس کیا تو یہ کہتے ہوئے لوٹایا کہ:

"خدمت شیخ مسلمانی مارا برخاک زدہ وزنا رہائے مارا پیدا کردہ است"۔[۱]

اکبر کے نورتنوں میں سے ایک ابوالفضل بھی ان مکتوبات کی افادیت کا اقرار کرتے ہوئے کہتا ہے:

"فراواں تصانیف ازو یادگار ازاں میاں مکتوب او درسر شکنی نفس آزمودن دارد"۔[۲]

چشتیہ صابریہ سلسلہ کے عظیم المرتبت شیخ حضرت جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی (م ۷۶۵) ان مکتوبات کی افادیت اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:

"مخدوم کے مکتوبات کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر انوار الٰہیہ کی بارش ہو رہی ہے"۔[۳]

حضرت مخدوم جہاں خود اپنے مکاتیب کی افادیت کی جانب اس طرح اشارہ فرماتے ہیں:

"وہ جانتے ہو معرفت الٰہی کے دریا کی کشتی اور ملاح کون ہے؟ عشق اس دریا کی کشتی ہے اور اللہ کی عنایت ملاح ہے۔ اس دریا میں طرح طرح کے خطرات ہیں۔ خوفناک معاملہ ہے۔ ایسے میں کیا کروگے؟ اس فقیر کے کلمات سامنے رکھو۔ امید ہے کہ ان کلمات کے مطالعہ سے اس دریا کے طلاطم سے جس کی موجیں آدم خور ہیں سلامتی کے ساتھ نکل جاؤ اور اس دریا کو پار کرنے میں جو بھی مشکل سامنے آئے ان کا حل انہیں کلمات میں تلاش کرو۔ آں برادران کلمات کے معانی سے واقف ہو چکے ہیں، ان کے اشاروں اور قوانین سے واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ کے وقت یہ تصور رہے کہ کاتب حروف کی زبان سے سن رہے ہو"۔[۴]

رضی الملک محمود کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

"اس مکتوب کے مطالعہ سے مدد و اعانت ہوگی اور شیطانی وسوسوں کے دفع کرنے میں طاقت ملے گی"۔[۵]

قاضی شمس الدین کو لکھتے ہیں:

"اے بھائی زندہ تو حقیقتاً وہ ہے جو ان کے سایۂ دولت میں ہے یا ان لوگوں کے کلمات اور کتابوں کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جس کو نہ یہ میسر ہے اور نہ وہ، تو وہ نفس کافر کی قید میں ہے"۔[۶]

مکتوبات کی مقبولیت:

حضرت مخدوم جہاں کے مکاتیب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیا شاہ اور کیا گدا سبھی نے اسے پسند کیا اور ہر طبقے کے لوگوں

میں اس کی افادیت تسلیم کی گئی۔ حضرت مخدوم کی حیات میں ہی آپ کے مکاتیب کے مجموعوں کی کئی کئی نقلیں تیار ہو چکی تھیں اور ساری اسلامی دنیا میں پھیل چکی تھی۔ ملتان کے اُچ میں حضرت مخدوم جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاں (م ۷۸۵) تک بھی اس کی ایک نقل پہنچ چکی تھی اور حضرت مخدوم جہانیاں نے اس کے مطالعہ کے لئے اپنے معمولات کو ترک کر دیا تھا چنانچہ آپ کا یہ معمول تھا کہ ہر سال یا دو سال پر آپ اپنے معتقد سلطان فیروز شاہ تغلق سے ملنے کے لئے دہلی تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن مکتوبات مخدوم جہاں کے مطالعہ کے لئے آپ نے سارے معمولات کو ترک فرمایا تھا اور خلوت نشین ہو گئے تھے۔ ۸

عہد تغلق کے پورے ہندوستان میں جہاں جہاں بھی علمی و روحانی مراکز تھے وہاں وہاں حضرت مخدوم جہاں کی حیات میں ہی آپ کے مکاتیب مرکز فکر ونظر بن گئے تھے اور اس کی شہرت ومقبولیت عام ہو چکی تھی۔ دہلی سلطنت کے بام و در بھی آپ کے مکاتیب کی شہرت سے لاعلم نہیں تھے چنانچہ سلطان محمد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) کے نام ایک خط میں حضرت مخدوم جہاں فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری تحریروں میں سے دو جلدیں
آں برادر کے پاس پہنچ گئی ہیں"۔ ۹

صرف یہی نہیں بلکہ ان دو جلدوں کے مطالعہ کے بعد حضرت مخدوم جہاں کی تحریروں نے سلطان محمد بن تغلق کا تجسس اور اعتقاد اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ خود اس نے حضرت کی خدمت میں ایک مکتوب اس خواہش کا اظہار والتماس کرتے ہوئے لکھا کہ:

"خط سے علیحدہ صوفیوں کے علم میں سے کچھ لکھا
جائے"۔ ۱۰

سلطان محمد بن تغلق کا خواہر زادہ داور ملک حضرت مخدوم
جہاں کے مکتوبات کا عاشق تھا اور حضرت مخدوم کو اپنے
مکتوب میں ملک المشائخ اور قطب الاولیا کے القاب
سے مخاطب فرماتا تھا ۱۱

حضرت مولانا مظفر بلخی قدس سرہ، حضرت مخدوم سے بیعت کے بعد دہلی تشریف لے گئے تو ان کے ہمراہ، حضرت کے مکاتیب کا ایک مجموعہ دہلی پہنچا جسے آپ نے مطالعہ کی غرض سے عاریتاً حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م ۷۵۷) کو پیش فرمایا۔ کچھ دنوں کے بعد جب حضرت شیخ نصیر الدین نے یہ نسخہ مولانا بلخی کو واپس کیا تو ان مکتوبات کے بارے میں ان کی زبان پر یہ کلمات تھے۔

"خدمت شیخ مسلمانی مارا بر خاک زدہ وزنار بائے مارا
پیدا کردہ است" ۱۲

حضرت مخدوم جہاں کے مکتوب کی مقبولیت سرحدوں کو پھلانگتی ہوئی پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی دنیا کی اکثر لائبریریوں میں حضرت مخدوم جہاں کے مکاتیب کے قلمی نسخے محفوظ ہیں سیاسی انقلابات نے بھی حضرت مخدوم کے مکتوبات کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آنے دی چنانچہ سلاطین مغلیہ بھی حضرت مخدوم کے مکتوبات کے مطالعہ سے مشرف ہوئے تھے بالخصوص اورنگ زیب کے مطالعہ میں آپ کے مکتوبات کا ایک منتخب مجموعہ باالالتزام رہا کرتا تھا۔ ۱۳

مکتوبات میں مخدوم کا عجز وانکسار:

غیر معمولی مقبولیت وشہرت کے باوجود حضرت مخدوم جہاں کی ذات پاک میں غرور وتکبر اور عجب کا شائبہ تک نہ تھا اکثر وبیشتر مکاتیب میں نہایت بھی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنا ذکر کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"اس فقیر کو بس لکھنے لکھانے سے اور کچھ زیادہ نہیں دیا گیا
ہے بس اتنا ہی ہے کہ اس خوان پر نعمت پرا کر لوگوں کو
بٹھائے بیچارہ نانبائی ہاتھ پاؤں جلاتا ہے اور کھانے
دوسرے لوگ کھاتے ہیں"۔ ۱۴

ایک مکتوب میں غیر معمولی عجز وانکساری کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اے بھائی! جو شخص اپنے غم واندوہ میں مبتلا ہو اور جس
کا حال اس درجہ خستہ ہو کہ وہ بیچارہ کہے۔

نمی دانم کرانم بدیں صورت گرفتارم
نہ من ہندو نہ مسلم نہ من مرتد نہ بدکارم

وہ دوسرے کو کیا یاد کرے گا اور کیا کس کو تلقین کرے گا
.... وہ جو بت خانہ میں پیدا ہوا بت خانہ میں

پرورش پائی اور بتوں کے آگے سجدہ میں عمر تمام کیا وہ کیا
کہے اور اس کا حال کیا ہوگا؟........ یہ تمام حال خود اپنا لکھا
گیا ہے یہ کوئی عبارت آرائی نہیں کی گئی ہے۔''۱۵

سلطان محمد بن تغلق کے بھانجے داور ملک نے اپنے خط میں آپ کے لئے ملک المشائخ اور قطب الاولیاء لکھا تو اسے اس طرح جواب عنایت فرمایا:

''شرف منیری جو سگ بارگاہ علما ہے سلام وتحیت ہزاروں
ہزار خجلت و شرمندگی اور ہزاروں ہزار معذرت و
سرافگندگی کے ساتھ صدر کی جناب میں پیش کرتا ہے
عرض یہ ہے کہ یہ خاک سار سگ روسیاہ کون ہوتا ہے کہ
جناب صدر اس وجہ تواضع (عاجزی) کے ساتھ خط میں
اس کا تذکرہ کریں لیکن ہاں یہ اس حکایت کے مانند ہے
جو لوگوں نے مشک سے کہا تجھ میں ایک عیب ہے اس
نے پوچھا وہ عیب کیا ہے؟ کہا تو اپنی خوشبو ہر شخص کو
پہنچاتا ہے، اہل اور نااہل کی تمیز نہیں کرتا۔ مشک نے کہا
میں یہ نہیں دیکھتا کہ یہ شخص کون ہے اور کس رتبہ کا ہے
بلکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں کون ہوں ورنہ یہ اہل ادبار و
خذلان کون ہوتا ہے کہ جناب صدر اس کو ملک المشائخ
قطب الاولیا کے القاب سے یاد کریں اور خود کو اس کے
معتقد کی حیثیت سے پیش کریں۔ افسوس صد افسوس اس
بے اقبال کا معاملہ تو یہ ہے کہ شقاوت و ادبار،
خاکساری، بت پرستی وزنارداری کی لعنت سے آگے نہیں
بڑھا ہے اور لوگوں کو اس بے اقبال کے متعلق اور اس
کے مخذول کی منافقی سے دوسرا ہی گمان ہوتا ہے۔''۱۶

شیخ اسحٰق مغربی، حضرت مخدوم جہاں کے علو مرتبت سے متاثر ہو کر بہار آ گئے تھے اور حضرت کی اجازت سے ہی ایک غیر آباد علاقے میں گوشہ نشیں تھے ان کو ایک مکتوب میں حضرت مخدوم جہاں عاجزی کے ساتھ اپنا حال اس طرح لکھتے ہیں:

''اگر چہ اس بے اقبال نے بہت چاہا کہ ہندوستان سے
قدم باہر نکالے اس طرح مسلمانوں کی صحبت اور
درویشوں کی خدمت میں رہ کر شاید مسلمان ہو جائے
لیکن اس نے موقع نہ دیا آخر کار اس بے اقبال کا حال کیا
ہوگا خدا ہی جانتا ہے ابھی تک زنار بندی گردن سے دور
نہیں ہوئی ہے توحید کا جمال دیکھنے میں نہیں آیا اور اہل
کفر وشرک کے درمیان بت پرستی میں عمر گزر رہی ہے
جس قدر اپنا جائزہ لیتا ہوں ہر سمت سے سوائے بت،
زنار وکفر شرک، نفس کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے
فریاد فریاد فریاد المدد المدد المدد............ میرا حال تو
عجب ہے، کوئی شیخ کہتا ہے کوئی آ کر مرید ہوتا ہے کوئی
ملک المشائخ لکھتا ہے کوئی قطب الاقطاب کہتا ہے اور
اس عالی جناب کا یعنی اپنا حال یہ ہے کہ ابھی تک گردن
سے نفس کی زنارداری نہیں اتری ہے اپنی کیا فضیحتی
ہے''۔۱۷

قاضی زاہد اپنے خط میں حضرت مخدوم جہاں کو اپنا حال زار بیان کرتے ہیں اور درماندگی وافسردگی کا اظہار کرتے ہیں تو حضرت مخدوم ان کو اس طرح جواب دیتے ہیں:

''خود میری اپنی عمر بھی گزر گئی، موت پہنچ گئی آخرت کا
سفر درپیش ہے خوف وحیرانی طاری ہے کہ جس وقت
ملک الموت آئیں گے اور وہ اللہ رب العزت سے
پوچھیں گے الٰہی اقبض روح ھذا العبد بالسعادۃ
ام بالشقاوۃ (الٰہی اس بندے کی روح سعادت پر قبض
کروں یا شقاوت پر؟) کچھ خبر نہیں کہ اس وقت کیا
جواب آئے گا۔''۱۸

مولانا محمود نے حضرت کی خدمت میں بڑی عقیدت اور تعریف وتوصیف کے ساتھ ایک خط لکھا تو حضرت نے اس کا جواب اس طرح عنایت فرمایا:

''آں برادر نے اپنے حسن ظن کی بنا پر اس شخص کی جس
کی صفت میں افرایت من اتخذ الٰہہ ھواہ ہے،
توصیف مقبولین کی نعمت اور مقربین بارگاہ پاک کی
صفت سے کی ہے اور اس میں غلو کیا ہے اور زحمت بھی

گوارہ فرمایا ہے، اسے پڑھا۔ آں برادر کو اپنے اس حسن ظن کا ثواب اور اجر ملے گا۔ انشاء اللہ۔

لیکن اے بھائی لیس الخبر کالمعائنۃ (سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی چیز کے جیسی تو نہیں ہوتی) یہ فقیر اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہے لیکن جب ظن المومن لا یخطی (مومن کا نیک گمان غلط نہیں ہوتا) منقول ہے تو امید بہت زیادہ ہوتی ہے اور اسے نیک فال سمجھتا ہوں۔" [19]

ایک مکتوب میں حضرت مخدوم کو ایسا محسوس ہوا کہ بات طویل ہوگئی ہے حالاں کہ درحقیقت ایسا نہ تھا لیکن احساس ہوتے ہی کس طرح معذرت کے بجائے توبہ واستغفار تک کرنے لگتے ہیں ملاحظہ ہو:

"بات سے بات نکلتی ہے اور گفتگو لمبی ہوتی جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ اس میں بھی نفس کا حظ شامل ہے استغفر اللہ استغفر اللہ عاقبت بخیر ہو۔" [20]

مکتوبات میں مخدوم کا غیظ وغضب:

مکتوبات میں ایسے مواقع شاذ ونادر ہی ملتے ہیں جب کہ حضرت مخدوم کے قلم مبارک نے کسی کے لئے بدبخت وعتاب اور غیظ وغضب کے الفاظ لکھے ہوں اور جب کبھی ایسا موقعہ آیا بھی ہے تو وہ البغض للہ کے حکم کے تحت چنانچہ ایک دفعہ حضرت مخدوم کا ایک مکتوب جو مولانا صدرالدین کے نام تھا اس مقام کے قاضی کی نگاہ سے گزرا تو وہ اس خط کے مضمون پر کماحقہ فکر کے بغیر ہی معترض ہوا تھا۔ اس کے اعتراض کی اطلاع حضرت مخدوم جہاں کو ملک خضر کے ایک مکتوب کے ذریعہ ملی تو آپ نے ملک خضر کو اس قاضی کے بارے میں لکھا:

"اے بھائی اگر اس بیچارے میں سعادت کی بو ہوتی اور مردان خدا کے دین کا ایک ذرا بھی حصہ ملا ہوتا تو آج وہ غریب اس چھری سے ذبح نہیں ہوتا من جعل قاضیا فکانما ذبح بغیر سکین (جس کو قاضی بنایا گیا تو گویا وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا) چوں کہ وعید شرع کی چھری کا ذبح کیا ہوا ہے اس لئے مردہ ہے۔ کہاں وہ اور کہاں ان کا دین وہ ابھی شیر خوار بچہ ہے بلکہ ماں کے پیٹ میں ایک لوتھڑا ہے، یہ بھی نہیں باپ کی پشت میں ایک قطرہ ہے، یہ بھی نہیں بلکہ عدم میں بھی عدم ہے۔ وہ بیچارہ مخنثوں کے دین سے بھی واقف نہیں، مردان خدا کے دین کی اس کو کیا خبر۔ ایک بزرگ نے کہا ہے۔

گبذار فضول گر ابوجہل ۔۔۔ در دین محمدی نیاید

اے بھائی منکران اہل مکہ اسی طرح اپنے لئے بینائی، گویائی اور شنوائی کا دعویٰ کرتے تھے تو ان کے اس دعویٰ کی رد میں ان کے لئے یہ جواب آیا صم بکم عمی اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ علماء آخرت علماء دنیا کو اسی طرح جانتے ہیں اور سب کو معذور سمجھتے ہیں اس لئے کہ جس کے پاس گویائی اور بینائی ہے وہ اندھے بہرے اور گونگے کو معذور قابل معافی جانتے ہیں۔ کہتے ہیں اسلام اس وقت تر و تازہ تھا جب تک علمائے دنیا پیدا نہیں ہوئے تھے جب علمائے دنیا پیدا ہوئے تو اسلام کو خلل پڑ گیا چنانچہ ایک بزرگ نے شیطان کو دیکھا کہ بیکار بیٹھا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا تعجب ہے کہ تجھے فارغ دیکھتا ہوں؟ اس نے کہا علماء دنیا ظاہر ہوگئے ہیں اب میرا کام نہیں رہا۔ جانتے ہو علمائے دنیا کون ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو بادشاہوں کی روٹی کھاتے ہیں اور امراء سلاطین کے در کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہیں اور جو آخرت کی کمائی کا وسیلہ ہے ایسے دنیا کے حصول کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں اے لوگوں کے حق میں ہے۔

علم کز بہر کاخ و باغ بود ۔۔۔ ہمچو مرد زد را چراغ بود

افسوس ہوا اور ملال بڑھا۔ استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ۔" [21]

ملک خضر نے اپنے خط میں قاضی کے اعتراض کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ شیخ سلیمان نے قاضی کو خوب خوب جواب دیا اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن قاضی نہ مانا چنانچہ حضرت مخدوم فرماتے ہیں:

"شیخ سلیمان نے اپنے اوپر زحمت کیوں کی۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال ابوجہل کو

دعوت دی کوئی فائدہ نہ ہوا وہ بیچارہ جو شرع کی چھری سے ذبح کیا ہوا ہے وہ مذبوح مردہ ہے۔ شیخ سلیمان کی دلیلوں اور گفتگو کو وہ کیسے سن سکتا ہے۔" ۲۲

صدر العلماء مولانا حمید الملت والدین حضرت مخدوم جہاں کی صحبت میں رہ چکے تھے ان کے بارے میں حضرت مخدوم کو جب یہ خبر ملی کہ انہوں نے عہدہ قضا قبول کرلیا ہے تو حضرت مخدوم نے ایک مکتوب میں ان کی اس طرح خبر لی:

"سنا ہے کہ برادر عزیز نے قضا کے عہدہ کی مشغولی قبول کرلی ہے قضا کے خطرہ کو جانتے ہوئے اتنے بڑے خطرہ میں جب کہ ایسی کوئی انتہائی حاجت بھی نہ تھی خود کو اس میں کیسے ڈال لیا یہ کھٹک دل میں پیدا ہوتی ہے کہ تحصیل علم کے وقت ہی برادر عزیز کی نیت میں حصول جاہ و مرتبہ کا خلل ضرور پیدا ہوا ہے ورنہ علم اور علم کے ثمرات سے محرومی آپ کے وجود میں نہ آتی حق سبحانہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر حق میں مشغول نہ ہوتے یہ مصرع مشہور ہے ع

علمی کہ راہ بحق ننماید جہالت است

برادر عزیز نے اپنے لئے یہی درست سمجھ لیا ہے کہ کل قیامت کے دن قاضیوں کے زمرہ میں اٹھائے جائیں۔ افسوس ہزار افسوس خبردار خبردار عمر کا آخری حصہ ہے فرصت کو غنیمت جانیے جس طرح اور جس عنوان سے ہو خود کو اس زمرہ سے نکالئے اور اپنے کئے ہوئے کی توبہ واستغفار سے تدارک کیجیے۔ مقدمات، فوجداری اور دیوانی کے فیصلے کی کتابوں کے مطالعہ اور اس کی بحث سے کنارے ہوجایئے مشائخ طریقت کے مکتوبات ارباب تصوف، کے ملفوظات ان کی تصنیفات کو سامنے رکھیے حق سبحانہ وتعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوجایئے۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ کے ذکر کے ذریعہ نفس پرستی سے نکل آئیں گے اور خدا پرست ہوجائیں گے ....

اس صحبت کی پاسداری جو برادر عزیز سے رہی ہے برادر عزیز کو مال ومرتبہ سے الفت پیدا ہوچکی ہے ظاہر ہے کہ یہ باتیں پسند نہ آئیں گی اور لکھنا برباد ہوجائے گا لہٰذا چند سطروں پر خط مختصر کردیا۔" ۲۳

مولانا صدر الدین کو حضرت مخدوم جہاں بہت عزیز رکھتے تھے برابر خطوط آتے اور جاتے رہتے تھے۔ لیکن ایک بار حضرت مخدوم کو اطلاع ملی کہ مولانا صدر الدین نے سونار گاؤں کے نائب قاضی کا عہدہ قبول کرلیا ہے تو مخدوم نے ان کی اس طرح سرزنش فرمائی:

"اے بھائی عمر پچاس ساٹھ کے قریب پہنچ گئی۔ اس عمر میں عہدۂ قضا اور درس وتدریس اور بحث ومباحثہ میں مشغول ہونے کا کیا موقع ہے سب کو آگ میں جھونک دیجیے، کتاب وکاغذ کو کنارے ڈال دیجیے قلم توڑ ڈالیے، دوات انڈیل دیجیے، اپنے اصل کام کا غم کیجیے جہاں تک ممکن ہوسکے اس میں کوشش کیجیے اس ظلمت کدہ سے ایمان سلامت لے جایئے۔

ہرچہ جز حق بسوز غارت کن
ہرچہ جز دیں از و طہارت کن" ۲۴

مکتوبات کے مطالعہ کا طریقہ وادب:

حضرت مخدوم جہاں کے بعض مخلص مریدین کو اپنے مکتوبات کے پڑھنے اور زیر مطالعہ رکھنے کے آداب بھی از راہ کرم تحریر فرمائے ہیں مثلاً دولت آباد کے عہدہ قضا پر فائز قاضی حسام الدین کو لکھے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"اس فقیر کے مکتوبات کا نسخہ وہاں دولت آباد میں جس کے پاس ہو اپنے لئے اس کی نقل کرالیں اور ہمیشہ مسلسل پڑھا کریں اور بار بار غور وخوض کے ساتھ مطالعہ میں رکھیں ان شاء اللہ اس مذہب کے اصول وفروع اور اس گروہ صوفیہ کی روش اور ان کے معاملات اس کے مطالعہ سے معلوم ہوں گے"۔ ۲۵

ملک شمس الدین کا خط نذر و تحفے کے ساتھ شیخ سلیمان لائے اور حضرت مخدوم جہاں سے ملک شمس الدین کے خط کا جواب تحریر فرمانے کی التجا کی تو آپ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے نام ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں آپ نے مکتوبات کے مطالعہ کے آداب بھی

بیان کیے:

''اس فقیر کے مکتوبات وملفوظات جو وہاں پہنچے ہیں انہیں آداب کے ساتھ مطالعہ کیجیے اور اس پر اپنی وسعت قوت کے مطابق عمل کیجیے......اس قانون کے تحت کہ قلم بھی زبانوں میں سے ایک زبان ہے القلم احد اللسانین ملفوظات ومکتوبات کا وظیفہ اس تصور یعنی برزخ میں کرو کہ اس فقیر کی زبان سے سن رہے ہو۔'' ۲۶

ملک خضر ۲۷ کے نام لکھے ایک مکتوب میں حضرت مخدوم جہاں یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ

''بار بار اس مکتوب کو پڑھیں۔'' ۲۸

جو تحریر آں برادر کے پاس پہنچی ہے اسے حضور دل کے ساتھ مطالعہ میں رکھو رسم و عادت اور قصہ کہانی کی طرح نہیں۔ تنہائی میں مطالعہ کرو تو بہتر ہے۔'' ۲۹

مکتوبات کی تالیف:

علم تصوف وعرفان کے جملہ موضوعات ومسائل مکتوبات کے پیرائے میں سیر حاصل گفتگو ممکن ہے؟ شاید حضرت مخدوم جہاں سے قبل ایسا تصور ممکن نہ تھا لیکن مخدوم جہاں نے اسے عملاً انجام دے کر ایک تاریخی حقیقت بنا دیا۔ خط، مکتوب، رقعہ وعریضہ کے لئے ہمیشہ آسان اور زود فہم پیرایۂ بیان لازم وملزوم رہا ہے۔ اگر خط بھی فلسفیانہ گتھیوں اور دقیق مسائل کے پیچ وخم کا خوگر بن جائے تو پھر وہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن خط نہیں ہوسکتا۔ حضرت مخدوم کی سب سے بڑی خوبی اور عدیم المثال صفت یہ ہے کہ آپ نے گنجلک اور دقیع مضامین کو بھی خط کے پیرایۂ بیان اور جامے میں اتنا آسان، سہل اور لطیف کر کے بیان فرما دیا ہے کہ کہیں پر نہ تو مکتوب کی صنف نے دم توڑا ہے اور نہ مضمون کی روح مجروح ہوئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صنف مکتوب نگاری بھی حضرت مخدوم جہاں کی مرہون منت ہے اور راہ تصوف وعرفان بھی حضرت مخدوم جہاں کی مرشدانہ تحریر سے روشن وتاباں ہوا تھی ہے۔ حضرت مخدوم جہاں نے اس انوکھے میدان میں کس طرح اور کس جانفشانی کے ساتھ یہ حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے خود اس پر بہت ہی کم گویا ہوئے ہیں لیکن خال خال اس جانب اشارہ فرمایا ہے چنانچہ اس جہان آب وگل میں آب زر سے لکھی جانے والی خدمات کے بعد رخصت ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا کہوں، قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے، کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں، خط میں، میں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے، ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہو چکی ہے، انہیں کے خاطر اتنا کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی ورنہ کون لکھتا؟'' ۳۰

ایک مکتوب میں اپنی اس حیرت انگیز تصنیفی خوبی پر انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ یوں گویا ہوتے ہیں:

''اس فقیر کو بس لکھنے لکھانے سے اور کچھ زیادہ نہیں دیا گیا ہے بس اتنا ہی ہے کہ اس خوان پر نعمت پر لاکر لوگوں کو بٹھائے، بیچارہ نانبائی ہاتھ پاؤں جلاتا ہے اور کھانا دوسرے لوگ کھاتے ہیں'' ۳۱

آپ کے مکتوبات کی دن رات پھیلتی شہرت نے اس کے دائرہ کو بہت پھیلا دیا تھا۔ بے شمار خطوط آتے اور آپ سب کو پڑھ کر خود اپنے دست مبارک سے حسب حال وحسب مقام جواب ارقام فرماتے اور اس میں خون جگر جلاتے پھر اس کے ارسال فرمانے میں کوشش بلیغ فرماتے چنانچہ امام تاج الدین طاہر کو لکھتے ہیں:

''لکھنا یہ ہے کہ جس وقت آں عزیز کا خط آیا، اس کا جواب ظفر آبادی جوان کے معرفت بھیجا گیا جب دوسری بار آپ کا خط ملا اس کا جواب بھی ایک عزیز جو قصبہ اُندلی جارہے تھے ان کے معرفت بھیجا گیا تیسری بار پھر آپ کا مکتوب پہنچا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خط لے جانے والوں نے یہ جواب نہیں پہنچایا آخر تیسری بار خط کا جواب برادرم مولانا مظفر کی معرفت بھیجا جارہا ہے۔ انشاءاللہ یہ آپ تک پہنچ جائے گا'' ۳۲

قاضی شمس الدین حاکم چوچہ، جن کو حضرت مخدوم بے حد عزیز رکھتے تھے اور انہیں کے نام لکھے گئے مکاتیب سب سے زیادہ مشہور و معروف اور مقبول ہوئے ہیں، ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''واضح ہو تمہارے خطوط پہنچتے رہے، چند بار تم نے لکھا

ہے کہ میں تمہیں خط نہیں لکھتا شاید دل سے بھلا دیا گیا ہوں حاشا و کلا ایسی بات دل میں نہ لاؤ کیوں کہ یادکرنے کا تعلق دونوں جانب سے ہوتا ہے جیسا کہ اس بارے میں یہ قول ہے القلوب تتقاضی والسرایر تتناجی (طرفین کے دل ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اسرار ایک دوسرے سے مخاطب رہتے ہیں) خط کا لکھنا یہ تو تقدیری ہے ظاہری عذر یہ ہے کہ اگر کوئی تمہاری طرف جاتا ہے تو مجھے کیا خبر؟ جب تک جانے والا خاص طور سے آکر یہ نہ کہے کہ میں وہاں جا رہا ہوں اس وقت تک یہ جاننا مشکل ہے۔ خط نہ لکھنے کا اصل سبب تو یہ ہے نہ وہ جس کا خیال تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے'' ۳۳

لیکن بعض مکاتیب ایسے بھی ارسال فرمائے ہیں جس میں خط کو پوشیدہ رکھنے کی تاکید ہوتی چنانچہ ایک مکتوب میں ہدایت فرماتے ہیں کہ:

'' مطالعہ کے بعد اس خط کو چاک کر دینا تاکہ ہذیان بکنے والے یاوہ گو اپنی یاوہ گوئی میں ملوث نہ کر لیں'' ۳۴

ایک خط میں یوں تاکید فرماتے ہیں:

'' یہ خط ہر شخص کو نہ دکھلائیں تاکہ اپنی بیہودگیوں میں ملوث نہ کر دے'' ۳۵

امام افتخار کے نام لکھے ایک خط میں ذرا وضاحت کے ساتھ احتیاط کی تاکید کرتے ہیں:

'' بدتمیزوں فضولیوں اور دودھ پیتے بچوں کی طرح جو لوگ ہیں ان سے خط کو محفوظ رکھنا تاکہ وہ لوگ اپنی فضول بکواس میں آلودہ نہ کریں اور جو لوگ اہل ہیں ان سے نہ چھپائیں اور بچا کر نہ رکھیں اس لئے کہ علم جس طرح نا اہلوں کو دینا حرام ہے اس طرح اہل سے اسے روک رکھنا بھی حرام ہے'' ۳۶

شیخ جمال الدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں دوٹوک ہدایت دیتے ہیں کہ

'' ان خطوط اور نامے کو دوسرے لوگ نہ دیکھیں اور کسی دوسرے کے ہاتھ نہ پڑے راقم کی ہدایت ہے'' ۳۷

حضرت مولانا مظفر بلخی (م ۸۰۳ھ) حضرت مخدوم جہاں کے چہیتے مرید خلیفہ و جانشین تھے، حضرت مخدوم جہاں پر مولانا مظفر بلخی نثار وفدا ہوتے تھے تو حضرت مخدوم جہاں بھی انہیں اپنی جان اور حاصل زندگی مانتے تھے۔ جب کبھی حضرت مولانا مظفر بلخی کا عریضہ یا خط آتا حضرت مخدوم جہاں فرماتے:

'' آں عزیز کے مکتوب کے آجانے سے موانست عظیم کا حال پیدا ہو جاتا ہے القلوب تتقاضی والضمائر تتناجی والله بفضله یسهل اسباب الملاقات'' ۳۸

حضرت مخدوم جہاں کے وہ مکتوبات جو حضرت مولانا مظفر بلخی کے نام ہیں ان کا معیار باعتبار بلندی معنی و مضامین معرفت سب سے بلند ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مکتوب میں حضرت مخدوم یہ تاکید تحریر فرما دیتے تھے کہ:

'' مکتوبات من ہمہ حل مشکلات ومعاملات آں برادراست باید کہ کسے رانہ نماید کہ موجب افشاء سر ربوبیت گردد'' ۳۹

ایک اور مکتوب میں اس طرح فرماتے ہیں:

'' اس مکتوب کو غور و خوض سے مطالعہ میں رکھیں تاکہ جاہلوں کی پیری شیخی، مریدی، درویشی جو اس زمانہ میں ظاہر ہوئی ہے اور ان کے فتنوں سے زمانہ بھر گیا ہے وہ سب سامنے آجائیں'' ۴۰

دولت آباد میں مقیم قاضی حسام الدین کو اپنے مکاتیب کی افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اس فقیر کے مکتوبات کا نسخہ وہاں دولت آباد میں جس کے پاس ہو اپنے لئے اس کی نقل کرالیں ہمیشہ مسلسل پڑھا کریں اور بار بار غور و خوض کے ساتھ مطالعہ میں رکھیں۔ انشاء اللہ اس مذہب کے اصول و فروغ اور اس گروہ صوفیہ کی روش اور ان کے معاملات اس کے مطالعہ سے معلوم ہوں گے کیوں کہ قلم زبانوں میں سے ایک زبان ہے مرید یا تو پیر کی زبان سے سنے یا پیر کے قلم

سے معلوم کرے اگر زبان سے سننے میں معذوری ہے تو قلم سے سننا چاہیے اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے اس کا طریقہ یہی ہے" ۴۱

قاضی شمس الدین کو اپنے مکتوب کے مطالعہ کے فوائد اس طرح بتاتے ہیں:

"انشاء اللہ تعالیٰ اس خط کے مطالعہ سے معانی دل پر خود بخود منکشف ہوں گے اور ایک دن اپنا کام کر جائیں گے۔" ۴۲

ایک مکتوب میں اس مکتوب کی تاثیر یہ بتاتے ہیں:

"بار بار اس خط کو پڑھیے تاکہ صبر کرنے اور اس کی رضا پر راضی رہنے میں اعانت و مدد حاصل ہو"۔ ۴۳

حضرت مخدوم جہاں اپنے ایک عزیز مرید جمال الدین کو لکھے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ان چند سطروں میں فوائد بہت ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ تم فرزند کے حصہ میں آتا ہے یا نہیں اللہ بہتر جانتا ہے"۔ ۴۴

مولانا تقی کے نام لکھے مکتوب میں حضرت فرماتے ہیں:

"اس گروہ صوفیہ کے کلمات روئے زمین میں خدائی لشکر ہیں ان کے یہ کلمات نامرد کو مرد اور مرد کو شیر بنا دیتے ہیں"۔ ۴۵

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اہل تصوف کی تمام تصنیفات کا خلاصہ اور نوع بنوع ان کے کلمات اور صوفیہ کے کاموں کا مجموعہ مکتوب میں لکھ کر بھیج رہا ہوں" ۴۶

مکتوبات کا مزاج:

حضرت مخدوم جہاں کی مکتوبات نویسی کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ آپ مکتوب الیہ کے معیار عقل و فہم کے مطابق ہی مضامین و معانی قلم بند فرماتے ہیں چنانچہ بعض مکاتیب ایسے ہوتے جن کے مضامین عام ہوتے اور انہیں حاضر مریدین کو نقل کر لینے کا حکم دیتے اور اس طرح کئی نقلیں تیار ہو جاتیں اور بعض کے نام ایسے مکاتیب ہوتے جس میں یہ ہدایت ہوتی کہ یہ مکتوب صرف تمہارے لئے ہے کسی غیر کو دکھانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ملک خضر کے نام مکتوب میں انہیں یہ ہدایت دیتے ہیں کہ

"بار بار اس مکتوب کو پڑھیں اور اس خط کی ایک نقل والدہ نظام الدین غفر اللہ لہ کو بھیج دیں۔" ۴۷

قاضی حسام الدین کو اپنے مکتوب کے دولت آباد میں موجود نسخے کی نقل کرا کر اپنے مطالعہ میں رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ ۴۸ قاضی شمس الدین کے نام لکھے گئے خطوط کو خانقاہ معظم میں حاضر مریدوں کو نقل کر لینے کی ہدایت تھی چنانچہ حضرت زین بدر عربی مکتوبات صدی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"اور آپ کے خدمت گاروں اور خادموں نے جو اس وقت وہاں حاضر تھے ان مکتوبات کو نقل کر کے اس مجموعہ کو اسی ترتیب سے مرتب کر لیا تاکہ جب توفیق رفیق ان کے شامل حال ہو تو ان کو عمل پر آمادہ کر لے اور بھیدوں کو تلاش کرنے اور صدق و خلوص رکھنے والے اس سے دولت حاصل کریں اور اس کو سعادت ابدی اور نعمت سرمدی تصور کریں اور اس جہان کے درجات کی ترقی اور اس جہان کے لئے اپنا مونس جانیں۔" ۴۹

بعض مکاتیب میں یہ ہدایت بھی ہوئی کہ اگر مکتوب کے بعض مقامات کی تہہ تک فہم کی رسائی نہ ہو تو فلاں بزرگ یا عالم کی مدد لے سکتے ہو مثلاً قاضی شمس الدین کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"اگر کوئی مشکل ہو تو قاضی صدر الدین سے اچھی طرح حل مطالب کر لیں اس دعا گو کی یہ ہدایت ہے چوں کہ قاضی صاحب مذکور وہاں موجود ہیں ان کی موجودگی میں کوئی مشکل نہیں رہے گی" ۵۰

مکتوبات صدی

فارسی زبان میں حضرت مخدوم جہاں کے ایک سو مکاتیب کا مجموعہ ہے جن میں ۹۸ مکاتیب قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کے نام ہیں اور دو مکتوب قاضی صدر الدین کے نام ہے وجہ تسمیہ اس مجموعہ مکاتیب کا نام " مکتوبات صدی" کیوں پڑا کچھ سمجھ میں نہیں آیا اگر

باعتبار عدد پڑا تو ''صد مکتوبات'' ہونا چاہیے تھا واللہ اعلم۔ متقدمین کے یہاں اس مجموعے کا نام مکتوبات صدی نہیں ملتا ہے۔ دسویں صدی ہجری تک کے متعدد قلمی نسخے میری نگاہ سے گذرے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی اس مجموعے کا نام ''مکتوبات صدی'' مرقوم نہیں ملا پتہ نہیں کب اور کیسے اس مجموعے کو مکتوبات صدی کہا جانے لگا اور شاید دوسرے مجموعے کو اسی مناسبت اور اسی انداز پر ''مکتوبات دو صدی'' مشہور کر دیا گیا۔

اس مجموعے کو متقدمین نے ''مکتوبات قدیمہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے کیوں کہ یہ مجموعہ خانقاہ معظم میں حضرت مخدوم جہاں کے سجادہ نشیں ہونے کے بعد سب سے پہلے صفحۂ قرطاس پر آیا۔

سن تالیف:

حضرت مخدوم جہاں نے کس سن میں یہ مکاتیب تالیف فرما کر قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کو روانہ فرمائے اس میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مکتوبات صدی کی جملہ طباعت میں (جس میں متن بھی شامل ہے اور ترجمہ بھی) موجود حضرت زین بدر عربی کے پیش لفظ میں سن تالیف کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

''وباوقات مختلفہ از خطہ بہار صانہا اللہ تعالیٰ عن الافات وعن البواء در شہور سنہ سبع واربعین وسبع مأتہ در قصبہ مذکور برسائل مذکور فرستادن فرمود''۔

(ترجمہ) ''اور اوقات مختلفہ میں خطہ بہار سے، اللہ تعالیٰ اس کو آفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ رکھے، ۷۴۷ھ میں سائل مذکور کو ارسال فرمایا۔''

لیکن کتب خانہ ریاست کپورتھلہ میں موجود مکتوبات صدی کا ایک نادر نسخہ مذکورہ سن تالیف ۷۴۷ھ پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے کیوں اس نسخہ مذکورہ میں خود مکتوب الیہ حضرت قاضی شمس الدین کا پیش لفظ موجود ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ میرے شیخ نے مجھے یہ خطوط ۷۴۹ھ کے مہینوں میں لکھے۔ حیدر آباد کی معروف اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری (آصفیہ لائبریری) میں موجود مکتوبات صدی کے دو قدیم خطی نسخے بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ان دونوں نسخوں میں بھی حضرت زین بدر عربی کا ہی پیش لفظ ہے لیکن بجائے ''سبع واربعین وسبع مأتہ'' کے تسع واربعین وسبع مأتہ'' ملتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ''تسع'' سہو کتابت کی وجہ سے ''سبع'' بن گیا ہو۔

مکتوبات صدی کے مرتب حضرت زین بدر عربی ہیں جنہوں نے حضرت مخدوم جہاں کے ایک سو مکتوبات کو بغیر کسی تحریف و تنسیخ کے اپنے پیش لفظ کے ساتھ یکجا فرما دیا ہے۔ حضرت زین بدر عربی کے پیش لفظ سے مکتوبات صدی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

''سپاس بی پایان و ستایش فراوان مر حضرت آں خداوندی را کہ دلہای عارفان را با نوار مشاہدہ جمال باکمال و مکاشفات جلال لایزال آراستہ گردانید و ہمہ وقت در نظارۂ عجائب و غرائب اسرار غیبی مستغرق و مدہوش داشت ....''

اپنے پیش لفظ کے بعد حضرت زین بدر عربی نے ایک فہرست بھی مکاتیب کے عناوین کی مرتب فرما دی ہے جو اس طرح ہے:۵۱

مکتوب اول	در توحید
مکتوب دوم	در توبہ
مکتوب سوم	در خشنود کردن خصمان
مکتوب چہارم	در تجدید توبہ
مکتوب پنجم	در طلب پیر
مکتوب ششم	در اہلیت شیخی
مکتوب ہفتم	در ارادت
مکتوب ہشتم	در ولی
مکتوب نہم	در ولایت
مکتوب دہم	در کرامت
مکتوب یازدہم	در احوال صدیقان و نماز برائے قضاء حاجات
مکتوب دوازدہم	در انوار
مکتوب سیزدہم	در کشف
مکتوب چہاردہم	در تجلی
مکتوب پانزدہم	در وصول
مکتوب شانزدہم	در سالک و مجذوب
مکتوب ہفدہم	در غلط گاہ سالک

مکتوب ہژدہم	درغلط گاہ مردمان
مکتوب نوزدہم	درمرض ظاہر وباطن
مکتوب بیستم	درفضل انبیاء براولیا علیہم السلام
مکتوب بیست یکم	درزلات انبیاء علیہم السلام وزیارت اہل قبور
مکتوب بیست دوم	دراہل تصوف
مکتوب بیست سوم	درطلب طریقت
مکتوب بیست چہارم	درارکان طریقت
مکتوب بیست پنجم	درشریعت وطریقت
مکتوب بیست ششم	درشریعت وحقیقت
مکتوب بیست ہفتم	درمتابعت رسول
مکتوب بیست ہشتم	درترتیب مشغولی باغاز
مکتوب بیست نہم	درطہارت
مکتوب سی ام	درطہارت بعبارت دیگر
مکتوب سی یکم	درنیت
مکتوب سی دوم	درنماز
مکتوب سی سوم	درروزہ
مکتوب سی چہارم	درزکوۃ
مکتوب سی پنجم	درحج
مکتوب سی ششم	دردعا
مکتوب سی ہفتم	درعبادت
مکتوب سی ہشتم	دربندگی کردن
مکتوب سی نہم	دربندگی کردن بعبارتی دیگر
مکتوب چہلم	درکلمہ طیبہ
مکتوب چہلم یکم	درذکرالایمان عریان
مکتوب چہلم دوم	درصدق ایمان
مکتوب چہلم سوم	درشکر اسلام
مکتوب چہلم چہارم	درشرک خفی
مکتوب چہلم پنجم	درمعرفت
مکتوب چہلم ششم	درمحبت
مکتوب چہلم ہفتم	درعلامت محبت
مکتوب چہلم ہشتم	درحکم محبت وعشق
مکتوب چہلم نہم	درذکر طالب
مکتوب پنجاہ	درطلب حق
مکتوب پنجاہ یکم	درطریقت الی اللہ
مکتوب پنجاہ دوم	درکفت ورفت
مکتوب پنجاہ سوم	در ہمت و در فضیلت سہ وقت در روز جمعہ و خواندہ سورۂ اخلاص وآیات فان تولوا فقل حسبی اللہ دھکان بار بعداز ہر فریضہ
مکتوب پنجاہ چہارم	درتحریص مرید
مکتوب پنجاہ پنجم	درصحبت قاضی صدرالدین ودرتحریص برعلم
مکتوب پنجاہ ششم	دراول مرتبۂ مرید
مکتوب پنجاہ ہفتم	دراول مرتبہ مرید بعبارتی دیگر
مکتوب پنجاہ ہشتم	دراحوال مسلمان
مکتوب پنجاہ نہم	دراخلاق حمیدہ
مکتوب ششتم	درتفکر
مکتوب ششت یکم	درتجرید وتفرید
مکتوب ششت دوم	درتجرید وتفرید بعبادتی دیگر
مکتوب ششت سوم	درپاک داشتن راہ دین
مکتوب ششت چہارم	درتقویٰ
مکتوب ششت پنجم	درصدق
مکتوب ششت ششم	درنسب آدم علیہ السلام
مکتوب ششت ہفتم	درکمان نیک
مکتوب ششت ہشتم	درمعاد
مکتوب ششت نہم	درتعلق باسباب وترکیب آں
مکتوب ہفتادم	درصحبت بااین طایفہ
مکتوب ہفتاد یکم	درخدمت
مکتوب ہفتاد دوم	درپاکیزہ گردانیدن اخلاق مذمومہ
مکتوب ہفتاد سوم	درطمع و نماز بنیت خوشنودی خصمان در روز عاشورہ
مکتوب ہفتاد چہارم	درتفسیر دنیا ونماز ودعا برای کفارت نماز بافوت

شدہ

مکتوب ہفتادپنجم	درترک دنیا
مکتوب ہفتادششم	درسعادت وشقاوت
مکتوب ہفتادہفتم	درسرقدر
مکتوب ہفتادہشتم	درخوف ورجا
مکتوب ہفتادنہم	درروح
مکتوب ہشتادم	دردل
مکتوب ہشتادیکم	درنفس
مکتوب ہشتاددوم	دردل
مکتوب ہشتادسوم	درریاضت نفس
مکتوب ہشتادچہارم	درمجاہدت وسیاست نفس
مکتوب ہشتادپنجم	درہجران نفس
مکتوب ہشتادششم	درباخودساختن
مکتوب ہشتادہفتم	درتفاوت اقلام
مکتوب ہشتادہشتم	درغفلت
مکتوب ہشتادنہم	درحسرت ونماز ودعا ودرود درروز جمعہ برائے قضاء حاجات وکفایت مہمات
مکتوب نہم	درمعالجت ونماز ودعاء درود جمعہ برای دفع درویشی وحصول نیک بختی ویافتن خلعتہای دینی ودنیاوی
مکتوب نودیکم	درلباس
مکتوب نوددوم	درملامت
مکتوب نودسوم	درسماع
مکتوب نودچہارم	درعزلت
مکتوب نودپنجم	درحکم جداشدن ازخلق
مکتوب نودششم	درچھلّہ
مکتوب نودہفتم	درمرگ
مکتوب نودہشتم	دروعدہ وعید
مکتوب نودنہم	درذکردوزخ
مکتوب صدم	درذکربہشت

قاضی شمس الدین:

قاضی شمس الدین مکتوب الیہ مکتوبات صدی کے احوال وسوانح حیات سے متعلق بدقسمتی سے کچھ زیادہ معلوم نہیں۔لیکن اتنا یقینی ہے کہ آپ حضرت مخدوم جہاں کے قدیم ترین مریدین میں سے تھے اس لئے کہ آپ کے نام جومکاتیب روانہ کئے گئے وہ مکتوبات قدیمہ کہلاتے ہیں ظاہر ہے کہ دوسرے مریدین ومعتقدین کے نام لکھے گئے خطوط مکتوب جدید کہلاتے ہیں۔قاضی شمس الدین اپنی ذمہ داریوں کی وجہ کر برابر خدمت اقدس میں رہنے سے قاصر تھے اس لئے بار بار مکتوبات کے ذریعہ تعلیم وتربیت کے لئے درخواست فرماتے تھے جیسا کہ حضرت زین بدری عربی مکتوبات صدی کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

> ''جب قاضی شمس الدین، حاکم قصبہ چوسہ نے، جوآپ کے مرید میں مسلسل اور بار بار درخواست کی جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ بیچارہ وقت کی مجبوریوں اور زمانہ کی معذوریوں کی وجہ سے اپنے مخدوم کی مجلس سے دوراور پیر کے فیض خدمت سے، جودینی اور دنیاوی علوم کے حصول کا ذریعہ ہے، محروم ہوگیا ہے، عاجزی سے التماس کرتا ہے کہ علم سلوک کے ہر باب میں اس بندے کی سمجھ کے موافق اگر کچھ تحریر کیا جائے تو اپنا حصہ اولا فرق حاصل کرلے۔''

قاضی شمس الدین کی بار بار کی فہمائش کوحضرت مخدوم جہاں ہی ان کے نام ایک خط میں اس طرح دہراتے ہیں:

> ''واضح ہو بار بار تقاضا تھا کہ کچھ لکھ کر بھیجا جائے اوراس میں خاص ارشاد وتنبیہ بھی ہو کچھ درماندگی دل کا اظہار بھی تھا اسی بناپر چند مکتوب مسلسل بھیجے گئے۔''[۵۲]

قاضی شمس الدین ساری مصروفیتوں کے باوجود کبھی کچھ وقت نکال کر ضرور حضرت مخدوم جہاں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے چنانچہ ملفوظات میں خال خال آپ کی حاضری کا بھی ذکر ملتا ہے۔آپ حضرت مخدوم جہاں کے وصال کے وقت بھی موجود تھے بلکہ حاضرین سے الوداعی مصافحہ ومولجہ کی ابتداء حضرت مخدوم نے آپ ہی سے فرمائی تھی۔حضرت زین بدرعربی مخدوم کے وفات نامے میں ارشاد

فرماتے ہیں:

''بعدازاں مخدوم حجرہ سے صحن حجرہ میں تشریف لائے اور تکیہ کا سہارا لیا تھوڑی دیر کے بعد دست مبارک پھیلائے، جیسے مصافحہ فرمانا چاہتے ہوں آپ نے قاضی شمس الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیر تک لیے رہے پھر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ خدام کو رخصت کرنے کا آغاز انہیں سے ہوا۔''

کچھ دیر بعد قاضی شمس الدین پھر حضرت مخدوم جہاں کے قریب آکر مؤدب بیٹھے تو مولانا شہاب الدین اور ہلال وعتیق نے حضرت مخدوم کی خدمت میں عرض کیا کہ مخدوم! قاضی شمس الدین کے باب میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ تو حضرت مخدوم نے فرمایا:

''قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا کہوں قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں۔ خط میں، میں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہو چکی ہے انہیں کے خاطر اتنا کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی ورنہ کون لکھتا۔'' ۵۳

وفات نامہ حضرت مخدوم جہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی شمس الدین کے ایک بھائی قاضی نور الدین بھی تھے اور وہ بھی حضرت مخدوم جہاں کے چہیتے تھے اور کافی عرصہ مخدوم کی صحبت میں رہ کر مخدوم کی خدمت کی سعادت حاصل کی تھی۔ قاضی نور الدین بھی مخدوم کے وصال کے وقت موجود تھے۔

قاضی شمس الدین کے نام مکتوبات دوصدی میں بھی ۱۴ مکاتیب شامل ہیں جن میں ۵ مکاتیب وہی ہیں جو مکتوبات صدی میں شامل ہیں۔

مکتوبات صدی کا پہلا مکتوب اس طرح شروع ہوتا ہے:

''برادر شمس الدین اکرمہ اللہ فی الدارین بداند کہ اہل طریقت توحید را بر چہار درجہ نہادہ اند درجہ اول آنست کہ بزبان لا الہ الا اللہ بگوید و بدل اعتقاد ندارد ایں توحید منافقانست فردا ہیچ سود ندارد۔ درجہ دوم انکہ بزبان لا الہ الا اللہ بگوید و در دل اعتقاد بدین دارد بتقلید چوں عامی یا بنوعی از دلیل چوں متکلم وایں قالب وصورت توحید ست علی التحقیق''

مکتوبات صدی کا اختتام یعنی ۱۰۰ اویں خط کی انتہا یوں ہوتی ہے:

''رزقنا اللّٰہ بفضلہ و کرمہ ولجمیع المومنین والمومنات بحرمت انبیائہ و اولیائہ وصلی اللّٰہ علی محمد والہ وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین وعلی ملائکتہ وعلی عبادہ الصالحین ولاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم''

ابیات

خالقا بیچارۂ راہم ترا	ہمچو مور لنگ درگاہم ترا
دین زدستم رفت دنیا گمشدہ	صورتم نا ماندہ معنی گم شدہ
لی تنی بی دولتی بیجا صلی	بینوائی بیقراری بیدلی
من نہ کافر نے مسلماں ماندہ ام	درمیان ہر دو حیراں ماندہ ام
نہ مسلمانم نہ کافر چون کنم	ماندہ سرگردان و مضطر چون کنم
یارب اشک وآہ بسیاریم ہست	گر ندارم، ہیچ ایں یاریم ہست
ہم تن زندانیم آلودہ شد	ہم دل محنت کشم فرسودہ شد
ماندہ ام در چاہ زندان پای بست	درچنین جاہم کہ گیرد جز تو دست
پاک کن ایں گردِ رہ از جان من	پس بشواز اشک من دیوان من
گرچہ بس آلودہ در راہ آمدم	عفو کن گر حبس و از چاہ آمدم

حواشی

۱۔ مکتوبات مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی
۲۔ آئین اکبری، جلد ۳، ص ۱۷۲
۳۔ معارف نمبر ۶، جلد ۸۴، ۱۹۵۹ء
۴۔ فوائد رکنی، فائدہ ۱۵
۵۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۵۵
۶۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۳۲
۷۔ تاریخ فیروز شاہی، باب ۱۵
۸۔ مناقب الاصفیا، ص ۱۳۲
۹۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۲۰۷
۱۰۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۲۰۷
۱۱۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۹۶
۱۲۔ مکتوبات مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی
۱۳۔ معارف نمبر ۶، جلد ۸۴، ۱۹۵۹ء
۱۴۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۶۹
۱۵۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۱۰۷
۱۶۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۹۶
۱۷۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۹۴
۱۸۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۳۹
۱۹۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۱۴۷
۲۰۔ مکتوبات دوصدی، مکتوب ۶۶

باقی صفحہ: ۳۴۱ پر

کشف المحجوب پر ایک نظر

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی ....D-59 میڈیکل کالونی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری علیہ الرحمۃ والرضوان کو برِ صغیر کا سلطان الاولیاء تسلیم کیا جاتا ہے۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگانِ دین ہی نہیں دوسرے سلاسل کے اولیا اور وابستگانِ سلسلہ نے بھی حضرت خواجہ اجمیر کے حضور سر نیاز خم کرنے اور ان سے اکتساب فیض کو ضروری سمجھا ہے، لیکن خود حضرت خواجہ اجمیر نے جس آستانے پر سر نیاز خم کیا جہاں چالیس دن رہ کر چلہ کشی کرتے ہوئے اکتسابِ نور اور فیوض و برکات کیا وہ آستانہ عالیہ مخدوم الاولیاء حضرت ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الجلابی، ہجویری ثم لاہوری کا ہے جسے عرف عام میں ''داتا دربار'' اور صاحب دربار کو ''داتا گنج بخش'' کے نام سے جانا جاتا ہے بقول اقبال ؎

سیّد ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم

روایت ہے کہ ''گنج بخش'' کا یہ خطاب پہلی بار حضرت خواجۂ اجمیر کی زبان مبارک سے ہی ادا ہوا تھا۔ آپ نے آستانہ عالیہ سے رخصت ہوتے وقت صاحب مزار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

خطاب کے یہ الفاظ ایسے مقبولِ بارگاہ ہوئے کہ آپ عوام میں ''داتا گنج بخش'' کے نام سے ہی معروف ہیں۔ حضرت سلطان الہند کا حجرۂ اعتکاف تاحال روبروئے مزار اقدس موجود ہے۔

حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ برِ صغیر کے اوّلین مبلغین اسلام میں سے ہیں جن کا مزار مبارک لاہور میں تقریباً ایک ہزار سال سے مرجع خواص و عوام ہے، اسی طرح ان کی تصنیفِ جلیل ''کشف المحجوب'' اہلِ تصوف کے لئے سامانِ بصیرت اور سرمۂ چشم ہے اور بقول محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ والرضوان مرشد کامل کی عدم موجودگی میں رہنمائے کامل ہے۔

تمام تذکرہ نگار عہد بہ عہد ان کا ذکر انتہائی ادب و احترام سے کرتے اور ان کے حضور بھرپور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ ہر عہد کے صوفیائے کرام اور حاملین شریعت و طریقت ہی نہیں امرا و سلاطین بھی آپ کے آستانہ عالیہ پر حاضری کو سعادت اور حصولِ فیوض و برکات کا ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔

افغانستان کے مشہور شہر غزنی کے مضافات میں جلّاب اور ہجویر دو بستیاں یا دو محلے ہیں۔ حضرت والا ان دونوں بستیوں میں رہے اس لئے وطنی نسبت جلابی اور ہجویری ہے۔ تبلیغ اور ارشاد کا مرکز لاہور کو بنایا اور وہیں وصال فرمایا۔ نسبی اعتبار سے سیّد ہیں۔

آپ کا سال ولادت متعین نہیں ہے۔ ۴۰۰ھ یا اس سے ایک دو سال قبل یا بعد میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ سن شعور کو پہنچنے پر آپ نے اکتسابِ علوم میں محنت شاقہ کی۔ آپ کی تصانیف اور شخصیت کی عظمت اس کی مظہر ہے کہ آپ علوم ظاہری و باطنی کے بحر ذخار تھے۔ حضرت والا سلسلۂ جنیدیہ میں حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ ان کے علاوہ متعدد علمائے عصر اور صوفیائے وقت سے آپ نے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ امور فقہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے مقلد تھے اور ان کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے۔ آپ کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات تو نہیں ملتیں اور اس سلسلہ میں اختلافات بھی ہیں لیکن آپ نے عائلی زندگی بھی گزاری تھی۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ فی الوقت صرف کشف المحجوب دستیاب ہے لیکن یہی تصنیف واحد تصوف کی بہترین اور بنیادی کتب میں سرفہرست سمجھی جاتی ہے اس سے حضرت والا کی نو دوسری کتب کے نام معلوم ہوتے ہیں ان میں سے ایک ''دیوان'' اور دوسری کتاب ''منہاج الدین'' کو

آپ کی حیات مبارکہ میں ہی کسی سارق نے اپنے نام منسوب کرلیا تھا جس کا خود آپ نے ذکر وافسوس فرمایا ہے۔ بقیہ کتب اب ناپید ہیں لیکن کشف المحجوب جیسی عظیم الشان تصنیف آپ کے نام وکام کو شہرتِ عام و بقائے دوام دلانے کا ایک ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

مختلف دیار وامصار کی سیر وسیاحت کے بعد آخر میں آپ نے لاہور کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ اس وقت یہ علاقہ غزنی کی حکومت کے ماتحت تھا گو کہ باشندوں کی غالب اکثریت ہنود کی ہی تھی۔ لاہور میں آپ نے ایک مسجد اور قیام گاہ کی تعمیر کرائی اور اہلِ پنجاب کو اسلام کی طرف راغب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ آپ کی تبلیغ واشاعت نے صدہا لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کردیا۔ لاہور میں ہی آپ کا وصال ہوا لیکن سالِ وصال بھی سالِ ولادت کی طرح اختلافات کا شکار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۴۶۵ھ تا ۴۶۹ھ کے کسی سال میں آپ کا وصال ہوا تھا۔

''کشف المحجوب'' مسائل شریعت وطریقت اور حقیقت و معرفت کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس سے اولیائے متقدمین اور صوفیائے عصر کے حالات وواقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تصوف پر فارسی میں لکھی جانے والی کتب میں اسے اولیت کا فخر حاصل ہے۔ اسے ہر عہد کے اہلِ علم ودانش نے تصوف کی بے مثال و بے نظیر کتاب تسلیم کیا ہے۔ اس کا مطالعہ عرفان وایقان میں اضافہ کرتا ہے اور بندگانِ خدا کو خدا کے قریب تر کردیتا ہے۔ یہ عوام وخواص دونوں کے لئے معتبر رہنما ہے۔ یہی ''کشف المحجوب'' کا امتیاز وشرف ہے۔ یہی خوبی اسے اعلیٰ وممتاز درجہ دلاتی ہے اور یہی اس کی سدابہار مقبولیت کی وجہ ہے۔ اس کے برعکس ''فصوص الحکم'' جیسی کتب خواہ کتنی ہی وقیع اور علم وحکمت سے لبریز ہوں صرف خواص بلکہ اخص الخواص کے لئے ہی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتی ہیں عوام تو کجا معمولی استعداد کے افراد بھی ان سے حیرانی وپریشانی بلکہ گمراہی میں بھی مبتلا ہوسکتے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مطابق:

''امام قشیری کی طرح شیخ ہجویری نے تصوف کو اسلامی شریعت سے قریب لانے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ کے خیالات میں بڑی صفائی اور اندازِ بیان میں بڑی گیرائی ہے۔ تصوف کی کتابیں اب تک عربی میں تھیں اس لئے عوام کو استفادہ کا موقع بہت کم تھا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی، حقیقی تصوف کو عوام تک پہنچانے میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے۔'' [1]

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہ، نے ''کشف المحجوب'' کے متعلق بڑی مختصر مگر اہم، وقیع اور جامع رائے پیش کی ہے۔ حضرتِ والا کا ارشاد ہے:

''اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں را مطالعہ کند اورا پیدا شود'' [2]

اگر کسی کو پیر (معلم ورہنما) میسر نہ ہوتو وہ اس کا مطالعہ کرے میسر ہوجائے گا بعد کے تمام مصنفین اور اہلِ تصوف نے ''کشف المحجوب'' کی عبارات وخیالات نقل کیے ہیں۔ ملک الشعراء بہار نے ''سبک شناسی'' میں اس کی واضح مثالیں پیش کی ہیں۔'' [3]

صاحب ''کشف المحجوب'' نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ شریعت و طریقت میں مطابقت ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ یا متصادم بتانے والوں کو گمراہی وکم علمی کا شکار بتایا ہے اس سلسلہ میں حضرت سہیل بن عبداللہ تستری کے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ آپ کی شان میں علمائے ظاہر نے کہا ہے: ''ھو جمع بین الشریعة والحقیقة۔'' یعنی انھوں نے شریعت وحقیقت میں اتحاد کرکے دکھایا۔ اس پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''لیکن یہ کہنا ان اربابِ ظواہر کا غلط ہے اس لئے کہ کوئی صوفی ایسا نہیں جو شریعت وطریقت میں فرق کرتا ہو اس لئے کہ شریعت بغیر حقیقت کے مکمل نہیں اور حقیقت بغیر شریعت کے حقیقت نہیں ہوسکتی۔'' [4]

اس سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت رب عزاسمہ نے شریعت وطریقت وحقیقت کو متحد کیا ہے تو اولیائے کرام کا اس میں فرق کرنا محال ہے۔ اس سے لامحالہ یہ بات ضروری ہوگی کہ جب فرق حقیقت وشریعت میں سمجھا جائے گا تو ایک کو رد کرکے

دوسرے کو قبول کرنا ہوگا اور یہ یاد رکھو کہ ردِّ شریعت الحاد خالص ہے اور ردِ حقیقت شرک، جیسے کہتے ہیں لا الٰہ الا اللہٗ حقیقت ہے اور محمد رسول اللہ شریعت۔ اگر کوئی چاہے کہ ایمان صحیح رکھ کر ایک کو دوسرے سے جدا کردے، ہرگز نہیں کرسکتا اور اس کی یہ خواہش باطل محض ہوگی۔'' ۵

''کشف المحجوب'' حضرت شیخ ہجویری کی حیات مبارکہ میں ہی مشہور و مقبول ہوگئی تھی اور اس کے متعدد قلمی و خطی نسخے مختلف دیار و امصار میں پہنچ گئے تھے۔ آج بھی کئی لائبریریوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف فارسی میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے بلکہ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو میں اس کے بیس سے زائد ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے دو ترجمے اس وقت پیشِ نظر ہیں ایک عبدالرحمان طارق کا ہے جسے مدنی کتب خانہ چوک گنپت روڈ لاہور نے تیسری بار شائع کیا ہے۔ دوسرا ترجمہ علامہ ابوالحسنات محمد احمد قادری کا ہے جسے ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور نے تیسری بار شائع کیا ہے۔ اس مقالے میں اُردو ترجمے اسی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اصل فارسی نسخہ جو اس وقت پیشِ نظر ہے اسے روسی مستشرق ژوکوفسکی نے ترتیب و تصحیح سے آراستہ کیا ہے اور ادارۂ انتشارات امیر کبیر تہران نے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں بھی اس کے کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے معتبر پروفیسر نکلسن کا سمجھا جاتا ہے جو ۱۹۴۵ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا اور اتنا مقبول ہوا تھا کہ مختلف مقامات سے اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل اس وقیع، عظیم الشان اور قابلِ قدر کتاب کا تجزیاتی مطالعہ پیشِ خدمت ہے۔

کتاب کا کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوا ہے جس میں پہلے عربی میں حمد الٰہی اور صلوٰۃ وسلام بدرگاہ سیّد الانام صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ سبب تالیف کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

''ابوسعید ہجویری نے مجھ سے کہا کہ اہلِ طریقت و تصوف کی کیفیت اور ان کے مقامات و مذاہب بیان کر اور اربابِ تصوف کے اشارات ظاہر کر اور یہ بھی واضح کر کہ اللہ جل مجدہٗ کی ذات و صفات کے ساتھ ربط محبت کیوں کر ہوتا ہے اور اس کا لطف بے کیف قلوب صوفیا پر کس طرح متکیف ہوتا ہے اور اس کی ماہیت معلوم ہونے سے عقول کا حجاب اور اس کی آشنائی سے نفس کی منافرت اور اس کی ضیا وصفا سے روح کو آرام کیوں کر ہے۔'' ۶

فرماتے ہیں کہ:

''میں نے استخارہ کیا اور اپنی دلی آرزو کے مطابق ثابت قدم ہو کر اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔'' ۷

کتاب کی تسمیہ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

''اس کتاب کا نام میں نے اس لئے ''کشف المحجوب (۴۵۹ھ)'' رکھا کہ جو کچھ کتاب میں ہے اس کی ترجمانی اس کتاب کا نام ظاہر کردے۔ جس کی چشم باطن کھلی ہو تو وہ جب کتاب کا نام سنتا ہے تو جان لیتا ہے کہ اس میں کیا کیا مضامین درج ہیں۔'' ۸

قدیم مصنف عموماً کتاب پر اپنا نام نہیں لکھتے تھے۔ آپ نے شروع میں ہی اپنا نام اور تعارف دیا ہے اور اس کے دو سبب بتائے ہیں۔ ایک عمومی اور دوسرا خصوصی۔ پہلی اور عوامی وجہ تو یہ ہے کہ جب کم علم کوئی نئی کتاب دیکھتا ہے اور اس پر مصنف کا نام و پتہ نہیں ہوتا تو وہ اس کتاب کو اپنے نام سے منسوب کر کے شائع کر دیتا ہے حالانکہ ہر ایک مصنف کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس کا نام زندہ رہے اور پڑھنے والے اسے دعائے خیر میں یاد کرتے رہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

''خود مجھے دوبار یہ تلخ تجربہ ہوا ہے ایک بار ایک شخص نے میرے اشعار کا دیوان مجھ سے لیا جس کا میرے پاس دوسرا نسخہ بھی نہیں تھا۔ کچھ ہی دن بعد اس نے میرے نام کی جگہ اپنا تخلص لگا کر اسے شائع کر دیا اور میری تمام محنت ضائع ہوگئی۔ دوسری بار میں نے ایک کتاب فنِ تصوف میں 'منہاج الدین' لکھی۔ اسے ایک متصوف نے لے کر اپنے نام سے شائع کر دیا حالانکہ اہلِ علم پر یہ

حقیقت ظاہر ہوگئی اور اس کا خوب مذاق بھی اُڑا۔"
دوسری وجہ آپ نے یہ بتائی ہے کہ خواص اہلِ علم جب کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو اوّل مولف کا نام معلوم کرتے ہیں۔ اگر وہ اسے محقق اور عالمِ فن جانتے ہیں تو اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ و اشاعت میں کوشاں ہوتے ہیں۔"۹

ہم تو سمجھتے ہیں کہ آج یا گذشتہ دو تین صدی سے یہ حال ہے لیکن حضرت شیخ ہجویری تقریباً ہزار سال قبل فرماتے ہیں:

"ہمارے اس زمانے میں علم حقیقت و معرفت مندرس اور معدوم جیسا ہوگیا ہے۔ علمانے صورتِ طریقت کو اس کی اصلیت کے خلاف ظاہر کر کے عوام کی بینات بدل دیے ہیں۔ یہ علوم خواص کے لئے بھی مشکل ہیں لیکن آج عوام بھی کہنے لگے ہیں کہ ہم حق شناس عارف ہیں۔ مدعی تصوف و عرفان اپنے دعوے میں اس قدر محو ہوگئے ہیں کہ معانی حقیقی حل کرنے میں عاجز ہیں۔ پیر و مرید دونوں نے مجاہدہ چھوڑ دیا ہے اور محض اپنے وہم وظن کا نام مشاہدہ رکھ لیا ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

"مدعیان کاذب نے لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھانسنے کے لئے چند الفاظ صوفیا کے یاد کر لئے ہیں اور اصل مفہوم نسیاً منسیاً کر ڈالا۔ دل میں انکار کے سوا کچھ نہیں اور اسے وہ نعمت جانتے ہیں۔"۱۰

زمانہ کی ناقدری علم وفن کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رب العزت جل مجدہٗ نے ہمیں بھی ایسے زمانے میں پیدا فرمایا کہ اہالیانِ زمانہ حظوظ حرص وہوا کو شریعت بنا بیٹھے اور طلب جاہ اور ریاست وتکبر کو عزت وعلم سمجھ لیا اور ریاکاری ونمائش کو خوف الٰہی قرار دے لیا اور بغض و حسد و کینہ کو حلم و بردباری بنالیا۔ لڑائی، جھگڑا، کمینہ پن کا نام غیرت رکھ لیا۔ مجادلہ کا نام مناظرۂ دین رکھ لیا، نفاق کے معنی زہد کر لئے اور غنائے باطل کو ارادت بتانے لگے۔

ہذیان و بکواس کا نام معرفت رکھ لیا۔ حرکتِ دل بڑھ جانے کو قلب جاری ہونا کہہ دیا۔ دل میں جو خطرات پیدا ہوتے ہیں، ان کا نام الہام وحدیث نفس بنالیا۔ الحادِ خالص کو فقر کہہ دیا، جحودِ حق یعنی سہل انگاری کو صفوت کہہ ڈالا۔ زندقہ کا نام فنا فی اللہ ہونا رکھ لیا۔ ترکِ احکامِ شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عین طریقت بنا بیٹھے۔ آخرش ارباب معنی واہلِ سلوک ان دیدہ دلیروں سے الگ ہوگئے اور اغیار نے عوام پر غلبہ پالیا۔"۱۱

کیا ان میں کوئی بات اور احوال ایسے ہیں جو آج کل کے علما، صوفیا اور فقرا کی غالب اکثریت میں نہ پائے جاتے ہوں؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ آج یہ امراض دو چند اضافے کے ساتھ موجود ہیں اور معاشرے کو مسموم کر رہے ہیں۔

حضرتِ والا حقیقی اور مصنوعی اہلِ سلوک کے رویہ اور طرزِ عمل میں اختلاف اور تضاد کی وجہ بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ اسرار الٰہیہ بذریعۂ عقل سمجھنا مشکل بلکہ محال ہیں اسی وجہ سے لطائف حق سے روح انسانی محجوب ہوگئی ہے اور مجسمۂ انسانی اپنے برزخ وجود سے دور ہوگیا ہے۔"۱۲

مقدمہ کے آخر میں اس عزم کا اظہار فرماتے ہیں:

"اب میں اصل کتاب شروع کرتا ہوں اور مقصود طالب کو مقاماتِ خاص اور حجاب ہائے گونا گوں سے ظاہر کروں گا اور بیانِ لطیف کے ساتھ حکایاتِ فن سناؤں گا، فرامین مشائخ کرام کو اس سے تطبیق دوں گا اور ابوابِ فن کی عبارات کو نہایت موزوں صورت میں چسپاں کروں گا۔ احوالِ بزرگانِ دین اور حالاتِ مقربین سے مفہوم کتاب سمجھانے میں امداد لوں گا تا کہ طالب مفہوم کی مراد فہم پوری ہو، تا کہ علمائے ظاہر امداد دیں۔ علاوہ بریں جو بھی دیکھے جان لے کہ طریق تصوف کتنا ہموار ہے اور شجرۂ طریقت کی کس قدر مضبوط جڑیں ہیں اور اس کی شاخیں کیسی بار آور ہیں اور ہر کوئی سمجھ سکے کہ

تصوف تمام علوم کی اصل ہے اور اس سے علمائے تصوف ہمیشہ اپنے مریدوں کو تحصیل علم کی ہدایت کرتے رہے ہیں اور لہو ولعب و ہزلیات کی پیروی سے روکتے رہے ہیں اور اس فن کی ترویج وترغیب سے ان کی تصانیف بھری ہوئی ہیں جن میں وہ مضامین ہیں جو انھیں منجانب اللہ وارد و صادر ہوئے۔''[۱۳]

یقیناً حضرتِ والا اپنے عزم و ارادے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے کتاب کو اس قدر عمدہ مضامین اور دل چسپ پیرایۂ بیان سے مالا مال کیا کہ ہر دور میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی ہی گئی اور اسے ''پیرودست گیر'' مانا گیا۔

کتاب ۳۹/ ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کا ایک عنوان ہے اور اس کے ذیل میں اسی سے متعلق امور پر بحث کی گئی ہے اور سبق آموز حکایات شامل کی گئی ہیں۔ کچھ ابواب مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ طویل ابواب کو فصول اور کشف وغیرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ان میں ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔

(۱) **پہلا باب:** ''اثباتِ علم'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں علوم کی حیثیت، مقام، ضرورت و اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ علوم کی اقسام بیان کی گئی ہیں اور علوم نافع وغیر نافع کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''علم اس قدر حاصل کرنا ضروری ہے جس سے حوائج شرعیہ پورے ہوسکیں۔ علوم غیر نافع سے خود حضور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے۔''**اعوذ بک من علم لاینفع** '' (اے اللہ! میں غیر نافع علوم سے تیری پناہ مانگتا ہوں)''

(۲) **دوسرا باب:** ''اثباتِ فقر'' ہے۔ فقر کیا ہے؟ فقیر کسے کہتے ہیں؟ فقر وغنا میں کیا فرق ہے؟ اس راہ پر چلنے والوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ صوفیا کے مختلف طبقات اور افراد نے فقر کو کس طرح اختیار کیا؟ ان سب مباحث کو بڑی خوبصورتی سے اور مختلف سبق آموز حکایات کے سہارے بیان کیا ہے۔

(۳) **تیسرا باب:** ''تصوف'' کے عنوان سے ہے۔ عنوان ہی مظہر ہے کہ اس میں تصوف کے موضوع پر عظیم الشان اور علمی مباحث ہیں۔ اس کے معانی و مطالب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حقیقی اور نقلی صوفیا کے فرق واضح کیے گئے ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ:

''آج کے دن تصوف کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور حقیقتاً کچھ نہیں رہا۔ ایک دن وہ تھا کہ تصوف حقیقتاً خالص تصوف تھا اور نام ونمود نہ تھی یعنی عہد صحابۂ کرام اور سلف صالحین رحمہم اللہ میں تصوف نام کا نہ تھا بلکہ حقیقتِ تصوف کا پرتو ہر کس وناکس میں تھا۔ اب وہ انحطاطی دور آیا ہے کہ تصوف کا نام تو باقی ہے مگر معنی حقیقی معدوم ہیں یعنی اعمال تو صوفیوں کی نقل میں ہورہے ہیں اور رسمی صوفی بہت مشہور ہیں مگر ان کے دعاوی تصوف میں بالکل مجہول ہیں۔''[۱۴]

جب پانچویں صدی ہجری میں یہ حال ہو چکا تھا تو اب تقریباً ہزار سال بعد پندرہویں صدی ہجری میں کیا ہورہا ہے؟ تصوف اور صوفی کس منزل میں ہیں؟ کیا کہا جائے۔''خود بنگر حال مپرس''۔

منکرین تصوف کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اگر بین تصوف کے منکر ہو تو یہ انکار تمام احکام شرعیہ اور انبیائے کرام کا ہے اور ان کے خصائل ستودہ کا انکار لازم آتا ہے......اس کتاب میں ہم تمھیں ہدایت کرتے ہیں کہ تم حق تصوف کی رعایت رکھو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور سچے صوفیوں کے ساتھ نیک اعتقاد رکھو۔''[۱۵]

(۴) **چوتھا باب:** ''خرقہ پوشی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں خرقہ کی حقیقت و حیثیت اور شرائط کا بیان ہے، انبیائے عظام، صحابۂ کرام اور سلف صالحین کی خرقہ پوشی کی عادت اور طریقے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن لوگوں نے خرقہ پوشی کو محض وقت کا فیشن سمجھ کر اختیار کیا یا اس کے ذریعہ نفع اندوزی کی ہے تو ان کی بھرپور مذمت بھی کی گئی ہے اور آخر میں انھیں یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے:

''یادرکھو جو کوئی لباس اولیا کو کسب دنیا کے لئے آلہ بنائے گا وہ اپنے لئے آفت مول لے گا۔ فقرا صوفیا کا اس میں زیادہ نقصان نہیں۔''[16]

(۵) **پانچواں باب:** ''فقر و صفوت'' کے موضوع پر ہے۔ اس میں دونوں کی تعریف اور فرق کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دونوں میں اصل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مختلف احوال میں مختلف کیفیات ظاہر ہوتی ہیں۔

(۶) **چھٹا باب:** ''ملامت اور اس کے احوال و مقام'' سے بحث کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

''ملامت مخلوق سے پیشوائے امت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی محفوظ نہیں رہے۔ اعلان حق کے ساتھ ہی آپ کو الصادق اور الامین کے ساتھ مجنون، کاہن، کاذب، جادوگر، اور نہ جانے کن کن بے ہودہ القاب و انداز اور ذہنی و قلبی تکالیف سے سابقہ پڑا۔ یہی سنتِ الہیہ رہی ہے کہ اس کے برگزیدہ بندوں کو ملامت مخلوق کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہوتے ہیں وہ مخلوق میں مذموم و مقہور رہتے ہیں اور جو مخلوق میں پسند کیے جاتے ہیں وہ اللہ کے مقہور و مغضوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے بعض مشائخ طریقت نے راہِ ملامت کو پسند کیا اور عوام کی ملامت و مذمت کو اس لئے بہتر جانا کہ ان سے مخلوق دور رہے گی اور انھیں دنیاداری، غرور و تکبر سے نجات ملی رہے گی کیونکہ محبوب خلائق ہونا خطرے سے خالی نہیں اس کی بدولت غرور و تکبر پیدا ہونے کا قوی امکان ہے اور غرور و تکبر سے بڑھ کر کوئی آفت اور کوئی حجاب نہیں۔''

(۷) **ساتواں باب:** ''صحابۂ کرام'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں خلفائے راشدین مہدیین کی متصوفانہ خصوصیات اور انداز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) **آٹھواں باب:** ''اہلِ بیت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں حضرات حسنین کریمین، امام زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر المعروف بہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہم کی خصوصیات اور صفات بیان کی گئی ہیں۔

(۹) **نواں باب:** ''اصحاب صفہ'' پر ہے۔ مختصر ہے اور اس میں اہلِ صفہ کی اجمالی خصوصیات اور ۲۲ ر اصحاب صفہ کے نام دیے گئے ہیں۔

(۱۰) **دسواں باب:** ''ائمہ تابعین'' رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عنوان سے ہے۔ اس میں حضرت اویس قرنی، حضرت ہرم بن حیان، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن المسیب رحمہم اللہ اجمعین کا تذکرہ ہے۔

(۱۱) گیارہواں باب: ''تبع تابعین تا بہ زمانہ حال ہے۔'' کے عنوان سے اس میں حضرت حبیب عجمی، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت ذوالنون مصری، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی، حضرت مالک بن دینار، حضرت امام ابوحنیفہ النعمان، حضرت ابراہیم ادھم، حضرت بایزید بسطامی، حضرت معروف کرخی، حضرت منصور بن حلاج، حضرت شبلی جیسے باسٹھ مشہور و معروف تبع تابعین کا تذکرہ اور ان کی خصوصیات ہیں۔

(۱۲) **بارہواں باب:** ''صوفیائے متاخرین'' کے عنوان سے۔ اس میں حضرت ابوالعباس، احمد بن محمد قصاب، حضرت علی دقاق، حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی جیسے دس صوفیائے متاخرین کا تذکرہ ہے۔

(۱۳) **تیرہواں باب:** ''مختلف ممالک کے مشائخِ متاخرین'' ہے۔ اس میں تین اہل شام و عراق، چھ اہل فارس، نو اہل قہستان و آذربائیجان و طبرستان و کش، تین اہل کرمان، نو خراسان، سات ماوراء النہر اور سات غزنین کے مشائخ عظام کے نام اور ایک ایک دو دو جملوں میں ان کی خصوصیات کا بیان ہے۔

(۱۴) **چودھواں باب:** سب سے طویل باب ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اس کا عنوان ''صوفیا کے مختلف مکاتب و مذاہب'' ہے۔ حضرت شیخ کے مطابق:

صوفیا کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں دس مقبول اور دو مردود ہیں۔ دس مقبول فرقوں کے طریق عمل مختلف ہیں مگر اصول و

فروع شرع اور عقیدۂ توحید میں سب متفق ہیں۔ ان میں فرقہ محاسبیہ، فرقہ قصاریہ، فرقہ طیفوریہ، فرقہ جنیدیہ، فرقہ نوریہ، فرقہ سہیلیہ، فرقہ حکیمیہ، فرقہ خرازیہ، فرقہ خفیفیہ اور فرقہ سیاریہ کے طریق عمل، اوراد و وظائف اور خیالات و نظریات پر سیر حاصل گفتگو ہے۔ دو مردود فرقوں میں انھوں نے فرقہ حلولیہ کے دو گروہوں کو شامل کیا ہے۔ ان میں سے ایک ابوحلمان دمشقی سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا فارس سے۔ چونکہ ان کے عقائد و نظریات نظریۂ توحید سے متصادم ہیں اس لئے انھیں مردود قرار دیا گیا ہے۔

ان فرقوں کے عقائد و نظریات اور افکار و اعمال پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ضمناً تصوف اور شریعت کی مختلف اصطلاحات اور ذیلی عنوانات مثلاً حقیقت رضا، مقام و حال، سکر و صحو، حقیقت ایثار، حقیقتِ نفس و معنی وہوا، مجاہدہ نفس، حقیقت ہوا، اثباتِ ولایت، اثباتِ کرامت، معجزہ اور کرامت، مدعی الوہیت سے ظہورِ معجزہ، کراماتِ اولیا، انبیا کی اولیا پر فضیلت، انبیا اور اولیا کی فرشتوں پر فضیلت، فنا، بقا، غیبت و حضور، جمع تفرقہ روح کی بحث پر تفصیلی بحث اور مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

اسی باب سے مختلف حجابوں کا کشف شروع ہوتا ہے۔ کشف حجاب اوّل معرفت الٰہی کی شرائط میں، کشف حجاب دوم توحید، کشف حجاب سوم ایمان، کشف حجاب چہارم طہارت اسی باب میں ہیں اور ان موضوعات پر خوب دادِ تحقیق دی گئی ہے۔

(۱۵) **پندرھواں باب:** ''توبہ اور متعلقات توبہ'' ہے۔ اس میں توبہ کی تعریف، توبہ کی قسمیں اور حقیقی توبہ کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ عوام و خواص کی توبہ کا فرق واضح کرتے ہوئے حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ عوام کی توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور خواص کی غفلت سے۔ اسی باب میں کشف حجاب پنجم ''نماز'' ہے جس میں متعلقات نماز پر عمدہ بحث اور معلومات یکجا کی گئی ہے۔

(۱۶) **سولھواں باب:** ''محبت اور متعلقات محبت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں محبت کے معنی و مفہوم کی وضاحت ہے، اس کی قسمیں ہیں اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی میں کشف حجاب ششم زکوۃ ہے جس میں ''زکوۃ'' اور اس کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۷) **سترھواں باب:** ''جود و سخا'' ہے جس میں سخاوت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ضمنی عنوان کشفِ حجاب ہفتم ''روزہ'' ہے جس میں روزے کی ضرورت و اہمیت اور بزرگانِ دین کے روزوں کے احوال ہیں۔

(۱۸) **اٹھارھواں باب:** ''بھوک اور اس کے احکام'' پر مشتمل ہے۔ اس میں بھوک سے متعلق صوفیا کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور صفائی نفس کے لئے بھوک کی ضرورت و اہمیت بتائی گئی ہے۔ اسی میں کشف حجاب ہشتم ''حج'' ہے، جس میں حج کے مسائل اور سلف صالحین کے سفر حج کا بیان ہے۔

(۱۹) **انیسواں باب:** ''مشاہدہ'' ہے جس میں مشاہدہ کی مختلف کیفیات کا بیان ہے۔ اسی میں کشف حجاب نہم ''صحبت اور اس کے آداب و احکام'' ہے جس میں نیک صحبت کے اثرات اور ضرورت پر گفتگو ہے۔

(۲۰) **بیسواں باب:** ''صحبت اور متعلقات صحبت'' ہے۔ اس میں بھی اچھی صحبت کی اہمیت اور فوائد اجاگر کیے گئے ہیں۔

(۲۱) **اکیسواں باب:** ''آداب صحبت'' پر روشنی ڈالتا ہے۔

(۲۲) **بائیسواں باب:** ''آدابِ صحبتِ اقامت'' پر مشتمل ہے۔

(۲۳) **تیئسواں باب:** ''آداب صحبتِ سفر'' بیان کرتا ہے۔

(۲۴) **چوبیسواں باب:** ''کھانے کے آداب'' پر مشتمل ہے۔

(۲۵) **پچیسواں باب:** ''چلنے پھرنے کے آداب'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲۶) **چھبیسواں باب:** ''سفر و حضر میں سونے کے آداب بیان کرتا ہے۔

(۲۷) **ستائیسواں باب:** ''بولنے اور چپ رہنے کے آداب'' پر مشتمل ہے۔

(۲۸) **اٹھائیسواں باب:** ''آدابِ سوال و ترک سوال'' پر مشتمل ہے۔

(۲۹) **انتیسواں باب:** ایک طویل باب ہے جو نہ صرف ''آدابِ نکاح و تجرد'' پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ اس میں کشفِ حجاب دہم بھی ہے جو ''اصطلاحاتِ صوفیا'' کے بیان پر مشتمل ہے جن میں حال اور وقت مقام اور تمکین محاضرہ اور مکاشفہ اور ان کا فرق، قبض اور بسط

اوران میں فرق محبت اورڈراوران میں فرق، قہر اور لطف اوران کا فرق، نفی اور اثبات اوران میں فرق، مسامرہ اور محادثہ اوران میں فرق، علم الیقین عین الیقین اور حق الیقین اور ان کے درمیان فرق، علم اور معرفت اوران میں فرق، شریعت اور حقیقت اوران میں فرق کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ الحق، الحقیقت، الخطرات، الوطنات، الطمس، الرمس، العلائق، الوسائط، الزوائد، الفوائد، الملجا، المنجا، الکلیہ، اللوائح، اللوامع، الطوالع، الطوارق، النجوی، الاشارات، الایماء، الوارد، الانتباہ، الاشتباہ، القرار، الانزعاج، الخاطر، العالم، المحدث، آلۂ القدیم، الازل یا الاول، الابد، الذات، الصفہ، الرسم، التسمیہ، النفی، الاثبات، الشیئان، الضدان، الغیر ان، الجوہر، العرض، الجسم، السوال، الجواب، الحسن، القبیح، السفر، الظلم، العدل، الملک، الخاطر، الواقع، الاختیار، الامتحان، البلاء، التحلی، العمل، التجلی، التخلی، الشرود، القصود، الاصطناع، الاصطفاء، الاصطلام، الرین، الغین، التلبیس، الشرب، الذوق جیسی بہتر اصطلاحات کی ایک ایک دو جملوں اور مختصر عبارات میں وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کشف حجاب یازدہم "سماع" بھی ہے۔

(۳۰) **تیسواں باب:** "سماع قرآن اور اس کے متعلقات" کو موضوع گفتگو بنایا ہے اس میں آیات قرآنی کے اثرات بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح ان آیات نے سامعین کی کایا پلٹ کردی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ تو بہت مشہور ہے ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ اور دیگر سامعین پر ان کے بڑے گہرے اثرات ہوئے ہیں۔

(۳۱) **اکتیسواں باب:** "سماع شعر اور اس کے متعلقات" سے بحث کرتا ہے۔ اشعار کی اہمیت اوران کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اچھے اور بُرے مفید یا مضر اشعار کی پہچان بتائی گئی ہے۔

(۳۲) **بتیسواں باب:** "سماع لحن ونغمہ" کے عنوان سے ہے اس میں آواز کے حسن واثر کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ خوبصورت اور پراثر آواز کا جادو انسانوں پر ہی نہیں جانوروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اس قسم کے کئی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

(۳۳) **تینتیسواں باب:** "احکام سماع" پر ہے لحن داؤدی کا حسن واثر مشہور ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"جو سماع تابع حق ہو وہ مکاشف حق ہوتا ہے اور جو نفس کے تابع ہو وہ محجوب ہوتا ہے۔ تاویل سے تعلق پیدا کرتا ہے اس کا ثمرہ کشف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے بزرگوں اور اہل حال کے ارشادات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت شبلی علیہ الرحمہ والرضوان کا قول، قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے:

"السماع ظاهره فتنة و باطنه عبرة فمن عرف الاشارة وحل له استماع العبرة والا فقد استدعى الفتنه و تعرض للبلية"

سماع بظاہر فتنہ ہے اور بباطن عبرت جو اس کے اشارات کا فہم حاصل کرلے اس کے لئے سماع عبرت حلال ہے ورنہ وہ فتنہ اپنے لئے بلا رہا ہے اور بلاؤں کے لئے اپنے کو پیش کررہا ہے۔ یعنی جس کا دل بالکل حدیثِ حق میں مستغرق نہیں اس کے لئے سماع بلا ہے اور وہ مورد آفات ہے۔ ۱۷

(۳۴) **چوتیسواں باب:** "اختلاف سماع" سے بحث کرتا ہے ایک گروہ کے نزدیک سماع آلۂ غیب ہے تو دوسرے کے نزدیک آلۂ حضور ہے۔ جو سنانے والے سے سنا جائے وہ آلۂ غیب ہوتا ہے اور جو یار سے سنا جائے وہ آلۂ حضور۔

(۳۵) **پینتیسواں باب:** "مقاماتِ سماع" کی نشان دہی کرتا ہے اس باب میں حضرت شیخ کا رجحان اس طرف نظر آتا ہے کہ سماع کے معائب اور اس کی بدولت عوام کی گمراہی کے خوف سے ترکِ سماع ہی اولی ہے۔

(۳۶) **چھتیسواں باب:** "وجد، وجود، تواجد" کے عنوان سے ہے۔ یہ باب بھی سماع اور اس کے نتائج وعواقب سے بحث کرتا ہے۔

(۳۷) **سینتیسواں باب:** "رقص اور متعلقاتِ رقص" ہے۔ جوش سماع کا نتیجہ رقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"جاننا چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کچھ اصل نہیں البتہ بطریق ہزل ہو تو لغو ہے اس لئے کہ جب کوشش کرکے کیا جائے تو سب عقلاء اسے لہو کہتے ہیں۔" ۱۸

مزید فرماتے ہیں:

"ناچنا شرعاً عقلاً برا ہے۔ سب لوگوں نے اسے مومن سے محال مانا ہے اور کہا ہے کہ افضل لوگ ایسا کام نہیں کرتے۔"[19]

(۳۸) **اڑتیسواں باب:** "جامہ دری" سے متعلق ہے۔ یہ بھی جوشِ سماع کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ جوش وجذبات میں آ کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں اس سلسلے میں حضرت والا نے مختلف کیفیات اوران کے احکام کا ذکر کیا ہے۔

(۳۹) **انتالیسواں باب:** یہ آخری باب ہے جو "آدابِ سماع" کے عنوان سے ہے۔ حضرت شیخ نے سماع کے آداب وشرائط بیان کرکے سماع کو مندرجہ ذیل قیودات سے مقید کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

- جب تک ضرورت نہ ہو، سماع نہ کرے اوراسے عادت نہ بنائے۔ سماع تاخیر سے ہونا چاہیے تاکہ اس کی عظمت برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اچھے سے اچھا کام بہت زیادہ ہونے لگتا ہے تو اس کی قدر ومنزلت جاتی رہتی ہے۔
- سماع کے وقت پیر ومرشد کی موجودگی ضروری ہے۔
- محفل سماع میں عوام کو شریک نہ کیا جائے۔
- قوال پاکباز ہو فاسق نہ ہو۔
- قلب مکروہات دنیوی سے خالی ہو۔
- طبیعت لہوولعب کی جانب آمادہ نہ ہو۔
- کسی قسم کا تکلف نہیں کیا جائے۔

اس عظیم اور پرمغز کتاب کا عمیق مطالعہ اور جائزہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ چند مقامات میں ابہام کے باوجود کہ جنھیں سمجھنا اور سمجھانا آسان نہیں بحیثیت مجموعی اپنے موضوع پر یہ ایک مفصل، جامع اور بہترین کتاب ہے، ہدایت ورہنمائی کا عمدہ ذریعہ ہے۔ عام طور سے اس قسم کی کتب میں محققین کے اقوال وحکایات نقل کردینے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا لیکن حضرت مخدوم ہجویری نے بڑی ہی محققانہ ومجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات وروایات مکاشفات ومجاہدات وغیرہ کو بھی قلم بند کیا ہے اور مسائل ومباحث سلوک پر ناقدانہ نظر ڈالنے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ اسی لئے اس کتاب کی حیثیت محض مجموعہ حکایات وواردات کی نہیں بلکہ ایک مفصل ومستند محققانہ تصنیف کی ہے۔ بلاشبہ یہ اپنے موضوع پر ایک قاموس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس کی اولیات وخصوصیات پر نظر ڈالی جائے تو یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مسائل شریعت وطریقت اور حقیقت ومعرفت کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اولیائے متقدمین اور صوفیائے کاملین کے بابرکت حالات اوران کی مقدس تعلیمات کا خزینہ ہے۔ فارسی زبان میں تصوف واحسان کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں اوّل واعلیٰ ہونے کا فخر وشرف اسی کتاب کو حاصل ہے۔ اس کے مطالعہ سے دولتِ عرفان وایقان حاصل ہوتی ہے۔ حجابات اٹھتے اور انکشافات ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ اسم بامسمّٰی ہے۔

اس نادر وبے مثال کتاب کو ہر دور میں ایسی قبولیت وپذیرائی حاصل ہوئی ہے جو بہت ہی کم کتب کے حصے میں آتی ہے۔ یہ کاملین کے لئے رہنما اور عوام کے لئے مرشد کامل کا فرض ادا کرتی ہے۔

اسے ہر دور کے اولیاء اللہ، صوفیائے کرام اور مصنفین ومحققین نے بے مثل کتاب قرار دیا ہے اور اسے بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اس کے مطالعہ کو وجہ سعادت سمجھا ہے۔

مولانا جامی اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است ولطائف وحقائق بسیار درآں کتاب جمع کردہ است۔"[20]

شہزادہ داراشکوہ کہتے ہیں:

"کشف المحجوب" مشہور ومعروف است وہیچ کس رابراں سخن نیست ومرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں درزبان فارسی تصنیف نہ شدہ۔"[21]

حوالہ جات

۱- تاریخ مشائخ چشت۔ خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی، بار اول، ۱۹۹۳ء۔ ص:۹۸

۲- دُرر نظامی (قلمی)۔ مرتبہ شیخ علی نمود جاندار

۳- دیکھیے، سبک شناسی۔ جلد دوم۔ محمد تقی بہار (ملک الشعراء) بار دوم، تہران

۴- کشف المحجوب (اردو) مترجم۔ علامہ ابوالحسنات محمد احمد قادری، ضیاء القرآن، پبلی کیشنز، لاہور۔ بار سوم، ۱۴۱۰ھ

۵- ایضاً،ص:۲۸۵
۶- ایضاً،ص:۷۵
۷- ایضاً،ص:۶۶
۸- ایضاً،ص:۷۱
۹- ایضاً،مقدمہ،ص:۶۷
۱۰- ایضاً،ص:۶-۷۵
۱۱- ایضاً،ص:۷۷
۱۲- ایضاً،مقدمہ،ص:۷۹
۱۳- ایضاً،ص:۱-۸۰
۱۴- ایضاً،ص:۱۳۸
۱۵- ایضاً،ص:۱۳۸
۱۶- ایضاً،ص:۱۵۶
۱۷- ایضاً،ص:۲۱۶
۱۸- ایضاً،ص:۲۳۸
۱۹- ایضاً،ص:۲۲۸
۲۰- نفحات الانس،عبدالرحمٰن جامی۔مطبوعہ کلکتہ،ص:۳۸۵
۲۱- سفینۃ الاولیاء۔شہزادہ محمد داراشکوہ۔مطبوعہ کانپور،ص:۱۶۴

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۳۴۷ کا

ہندوستان میں تمام سلاسل کے صوفیاء نے مل جل کر اتفاق واتحاد کے ساتھ تبلیغ کا کام کیا، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ رکھا، آپس میں اچھے روابط کا سراغ ملتا ہے۔اس لئے ایک خانقاہ کا شیخ اپنے سلسلے کے علاوہ اپنے مریدوں کو دیگر سلاسل کی خلافت واجازت سے بھی نوازتے تھے اس کا چلن آج بھی ہے۔ ہاں! کچھ دنیادار قسم کے صوفی جو دراصل ننگِ سلسلہ وتصوف ہیں اپنا کاروبار چمکانے کے لئے ایک دوسرے پر چھینٹا کشی کا مشغلہ اپنائے ہوئے ہیں۔لیکن حقیقی صوفیا کی تعلیمات نے لوگوں کے ذہن کو روشن کیا اور عرفان خداوندی عطا کیا۔آپسی میل جول سے رہنے کا ڈھنگ عطا کیا۔ پنجاب کے معروف بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر ارشاد فرماتے ہیں:

ماسقیمان کوئی دل داریم   رخ بہ دین و دین نمی آریم

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۳۳۱ کا

۲۱ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۵۰
۲۲ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۵۰
۲۳ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۵۸
۲۴ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۴۴
۲۵ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۹۱
۲۶ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۵۲
۲۷ ملک خضر بہرام شاہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شکارخانہ کا افسر اعلیٰ تھا (تاریخ فیروز شاہی، باب ۱۳)
۲۸ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۳۶
۲۹ فوائد رکنی، فائدہ ۱۴
۳۰ وفات نامہ حضرت مخدوم جہاںؒ
۳۱ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۲۹
۳۲ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۵۶
۳۳ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۲۶
۳۴ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۹۰
۳۵ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۱۵
۳۶ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۲۸
۳۷ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۵۵
۳۸ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۷۱
۳۹ مقدمہ مکتوبات بست وہشت
۴۰ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۸۴
۴۱ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۹۱
۴۲ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۳۸
۴۳ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۵۳
۴۴ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۱۵۵
۴۵ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۲۰۵
۴۶ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۹۰
۴۷ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۳۶
۴۸ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۹۱
۴۹ مقدمہ مکتوبات صدی
۵۰ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۲۱
۵۱ یہ فہرست اس نسخے سے منقول ہے جو خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے اور اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے قدیم اور عہد مصنف کا نسخہ ہے۔میری تحقیق کے مطابق اس نسخے کے کاتب خود زین بدر عربی ہیں۔
۵۲ مکتوبات دوصدی،مکتوب ۲۱
۵۳ وفات نامہ مخدوم جہاںؒ

❁❁❁

بقیہ صفحہ:۳۶۶ کا

۷۔ مولانا رومی کا پیام عشق، پروفیسر لطیف اللہ
۸۔ انوارالعلوم، مترجم محمد عالم امیری
۹۔ بوستان معرفت (مثنوی مولانا روم) دفتر اول
۱۰۔ مثنوی مولانا روم دفتر اول
۱۱۔ مثنوی مولانا روم دفتر دوم
۱۲۔ مثنوی مولانا روم دفتر سوم
۱۳۔ مثنوی مولانا روم دفتر چہارم
۱۴۔ مثنوی مولانا روم دفتر پنجم
۱۵۔ مثنوی مولانا روم دفتر ششم
۱۶۔ تصوف کی جمالیات۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

❁❁❁

صوفیہ وسلاطین دکن کے تعلقات پر ایک نظر

ڈاکٹر فاطمہ زہرا بلگرامی ...... ریڈر شعبۂ تاریخ ویمنس کالج، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

ہندوستان صدیوں سے صوفیوں اور سنتوں کا مسکن رہا ہے اور صوفیوں کی آمد ورفت کا سلسلہ صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جنوبی ہند بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہ سکا۔ ان کی خانقاہوں، جماعت خانوں اور درگاہوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا رہا اور رفتہ رفتہ پورے ہند میں پھیل گیا۔

صوفیا نے اپنے پیغام میں انسانی ہم دردی، مذہبی رواداری اور آپسی بھائی چارگی کا درس دے کر دکن کی سماجی، مذہبی اور ثقافتی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

قرون وسطیٰ میں جن سلاسل صوفیا کا تعلق بلاد دکن سے رہا، اُن میں چشتی، جنیدی، قادری، شطاری اور نقشبندی قابل ذکر ہیں۔ ذیل کے مضمون میں صوفیائے دکن اور سلاطین کے تعلقات کا ایک مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔

بارہویں صدی کے اواخر اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں دکن میں جو صوفیا آچکے تھے اُن میں میران سید حسین اور سید علاء الدین قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سلطان علاء الدین خلجی کی دیوگیر کی مہم (۱۲۹۶) کے دوران جو صوفیائے کرام آئے، ان میں امیر حسن سنجری شامل تھے جو شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔[۱] شیخ کی مجالس میں اکثر دکن کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ ان کے دو مرید خواجہ عزیز الدین اور شیخ زادہ کمال الدین دیوگیر اور مالوہ آئے تھے اور وہاں چشتی سلسلے کی آبیاری کی۔[۲] اس کے علاوہ جنیدی سلسلے کے صوفیا بھی دکن میں موجود تھے۔ محمد بن تغلق نے جب پایۂ تخت دہلی سے دیوگیر تبدیل کیا جو نہایت خوبصورت علاقہ تھا اور جس کو وہ رہائشی کالونی بنانا چاہتا تھا، اس وقت بہت سے مشائخ اور علما دکن آگئے جن میں مشہور صوفیا شیخ برہان الدین غریب، امیر حسن سنجری، سید یوسف حسینی، خواجہ حسین اور خواجہ عمر تھے۔

بہمنی دور کے سلاطین نے صوفیا کی بہت قدر و منزلت کی۔ اس زمانے کے مشہور چشتی بزرگ سید محمد گیسودراز (۱۴۲۲۔۱۳۲۱) تھے جنہوں نے گلبرگہ میں سکونت اختیار کی۔ فیروز شاہ بہمنی (۱۴۲۲۔۱۳۹۷) نے کچھ گاؤں آپ کی خانقاہ کے اخراجات کے لئے وقف کردیے۔ احمد شاہ ولی بہمنی (۳۶۔۱۴۲۲) بھی آپ کا معتقد تھا۔ سید گیسودراز نے حدیث، تفسیر اور تصوف پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔[۳] صوفی حلقوں میں آپ کی تصانیف کا بہت چرچا تھا، آپ کے تعلقات ہم عصر صوفیا مثلاً سید اشرف جہاں گیر سمنانی سے بھی تھے اور باقاعدہ خط و کتابت تھی۔

سلطان علاء الدین حسین بہمنی شاہ (۵۸۔۱۴۳۶) شیخ بہاء الدین دولت آبادی کا قدردان تھا۔ سلطان کے جشن تاج پوشی میں شیخ محمد رکن الدین شریک تھے جو جنیدی سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ محمد شاہ اول (۷۵۔۱۳۵۸) کے شیخ زین الدین شیرازی سے دوستانہ مراسم تھے۔ مشہور مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کا فرمانا درست ہے کہ دہلی سلطنت کی تباہی کے بعد جو صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں۔ انہوں نے صوفیا کو قریہ و گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔ اس کے عوض صوفیوں نے رائے عامہ کو ہموار کیا اور اخلاقی قدروں کی پاسداری کی۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صوفیائے دکن نے شمالی ہند کے صوفیا کے برخلاف اپنی دیرینہ روایات سے انحراف کیا اور خانقاہوں کے لئے مالی امداد قبول کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادیٔ رائے ختم ہوئی اور وہ شمالی ہند کے صوفیا کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکے۔

دکن میں ۱۸ ویں صدی میں مشہور چشتی صوفی شیخ نظام الدین تھے جو شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے خلیفہ تھے۔ آپ نے کچھ وقت بیجا پور، برہان پور اور شولاپور میں گزار، اپھر اورنگ آباد آگئے۔ اُمرا سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔ مکتوبات کلیمی میں بہت سے خطوط آپ کے نام ہیں۔ احمد شاہ ولی بہمنی (۳۶۔۱۴۲۲) نے جب بیدر کو اپنا دارالسلطنت (۱۴۲۴) بنایا تو بغداد، کرمان اور ملتان سے علما و مشائخ کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چشتی اور جنیدی صوفیوں کا اثر کم ہوا۔ ایران، عراق

اور وسط ایشیا سے صوفیائے کرام آنے لگے۔ جن میں قادری اور شطاری سلسلے کے بزرگان دین شامل تھے۔ رچرڈ ایٹن ۴ نے دکن میں صوفیوں کی آمد کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کیے ہیں:

(۱) سلطان ابراہیم عادل شاہ (۱۶۲۷۔۱۵۸۰) کی سرپرستی اور علم دوستی کی وجہ سے علما وصوفیا یہاں آکر علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔

(۲) اکبر کی گجرات کی مہم (۱۵۷۲ء) سے جو سیاسی انتشار پیدا ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صوفیا وہاں سے بیجاپور آگئے۔ سندھ سے بھی صوفیائے کرام برہان پور میں آکر آباد ہوگئے۔

(۳) ۱۶۰۹ میں جب بیدر بیجاپور میں شامل ہوگیا تو ابراہیم شاہ نے مزید صوفیوں کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس کے جانشین محمد عادل شاہ (۱۶۵۷۔۱۶۲۷)، علی عادل شاہ (۷۲۔۱۶۵۷) اور سکندر عادل شاہ (۸۶۔۱۶۷۲) نے قادری اور شطاری سلسلے کے صوفیوں کی سرپرستی کی اور دکن کے مختلف شہروں میں مثلاً بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، گوگی پٹن پھری، رائے چور، وارنگل، اڈونی، نیلور، حیدرآباد، برہانپور، میں صوفیا کی خانقاہیں، مدارس اور بعد وفات مزارات و درگاہیں قائم ہوگئیں۔ ۵

قادری سلسلہ جس کی داغ بیل شیخ عبدالقادر جیلانی (۱۱۶۶۔ ۱۰۷۸) کی وفات کے بعد بغداد میں ان کے خلفا نے ڈالی تھی، پندرہویں صدی کے وسط میں جنوبی ہند پہنچ چکا تھا۔

منگولوں کے حملہ (۱۲۵۸) کے باوجود بغداد قادری سلسلے کا مرکز بنا رہا اور تیرہویں و پندرہویں صدی کے دوران یہ سلسلہ مراقش، اسپین، سوڈان، الجیریا، ترکستان، قسطنطنیہ، وسط ایشیا، چین، افغانستان، ایران و ہند تک پھیل گیا۔ شمالی ہند میں اس کے بانی مخدوم محمد غوث جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۱۷۱۵) تھے اور جنوبی ہند میں شاہ نعمت اللہ ولی کے جانشینوں نے نعمت اللٰہی سلسلے کو، جو قادری سلسلے کی ایک شاخ ہے، فروغ پہنچایا۔

شاہ نعمت اللہ ولی (۱۴۳۱۔۱۳۲۹ء) خود ہندوستان نہیں آئے البتہ اپنے پوتے شاہ نور اللہ (وفات ۱۴۳۶) بن خلیل اللہ کو سلطان شہاب الدین احمد شاہ ولی بہمنی (۳۶۔۱۴۲۲ء) کے دربار میں بھیجا۔ شاہ نعمت اللہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شاہ خلیل اللہ اور دو پوتے شاہ حبیب اللہ (وفات ۱۴۵۷) اور شاہ محب اللہ (وفات ۱۴۸۶) دکن آئے۔ بہمنی شاہزادیوں سے شادیاں کیں۔ بیدر میں قیام پذیر ہوئے اور نعمت اللہ ولی کے سلسلے کو فروغ دیا۔ ۶ غرض کہ پندرھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی کے وسط تک لاتعداد صوفیائے کرام ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز کے علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوئے اور دکن کے حکمرانوں نے ان کی سرپرستی کی۔ مضمون کی طوالت کے خیال سے یہاں چند ناموں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ شیخ بہاء الدین قادری، سلطان محمود شاہ خلجی (۶۹۔۱۴۳۶ء) کے عہد میں مانڈو آئے۔ لیکن جلد ہی دولت آباد اور پھر وہاں سے برہان پور چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ گلزار ابرار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ مالوہ کے گورنر سے کسی سیاسی وجوہ کی بنا پر ناخوش تھے۔ آپ کے خلیفہ شیخ جلال محمد قادری تھے۔ جن کی وفات برہان پور میں ۱۵۱۹ میں ہوئی۔ شیخ ابراہیم ملتانی اور شیخ فتح اللہ ملتانی بھی پہلے مانڈو آئے، شیخ بہاء الدین کے مرید ہوئے اور علاء الدین ثانی (۵۸۔۱۴۳۶ء) کے عہد میں بیدر آئے۔ اور قاضی القضاۃ کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوئے، یہیں ۱۴۶۰ء میں وفات پائی۔ ۷ بیدر کے مشہور صوفیا میں سید شاہ اسماعیل قادری گھوڑ واری شریف کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان کے تعلقات علاء الدین ثانی سے اچھے تھے مگر ہمایوں شاہ کے ظالمانہ رویہ سے آپ نالاں تھے۔ آپ کی وفات (۱۴۶۶ء) و تدفین گھوڑواری شریف بیدر میں ہوئی۔ سید زین الدین گنج نشیں (وفات ۱۴۵۷ء)، شاہ موسیٰ قادری (وفات ۱۴۶۸ء)، سید شاہ ابوفیض قادری (وفات ۱۴۸۵ء) یہ سب پندرہویں صدی سے تعلق رکھتے تھے۔

نعمت اللٰہی سلسلے کے متعلق ڈاکٹر اطہر عباس رضوی ۸ کا خیال ہے کہ ان کی آمد سے دکن کے سماج میں ایرانی اثرات نمایاں ہونے لگے اور سید محمد گیسودراز کے جانشینوں کا اثر کم ہوتا چلا گیا۔ پروفیسر این شیمل ۹ بھی تقریباً اسی رائے سے متفق ہیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر سلیمان صدیقی ۱۰ کے نظریہ کے مطابق دکن میں نعمت اللٰہی سلسلے کے صوفیا زیادہ مقبول نہ تھے، کیونکہ وہ یہاں کی سماجی و ثقافتی زندگی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے، ان کا حلقہ صرف سلاطین و اُمرا تک محدود تھا، عوام سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے۔ اس طرح وہ اپنی اہمیت اور افادیت کھو رہے تھے۔ برخلاف اس کے شیخ ابراہیم ملتانی کا خاندان عروج پر تھا اور قادریوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ اس وقت کے دکن کے

صوفیا میں مخدوم شمس الدین ملتانی، شیخ اسحٰق ملتانی، شیخ ابراہیم مخدوم جی، سید شاہ چاند حسینی، شیخ جمال، شیخ قاسم برہانپور، شیخ طاہر بن یوسف، سید اسماعیل نیلوری، شاہ عبداللہ قادری، شیخ لطف اللہ قادری، شاہ ابوالحسن قادری، حضرت شاہ قاسم قادری، شاہ مصطفیٰ قادری شامل تھے۔[11]

بارہویں صدی میں بالخصوص دور شاہ جہانی میں قادریوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ داراشکوہ خود بھی ملا شاہ بدخشی سے قادری سلسلہ میں بیعت تھا اور اس کے دیوان میں قادری تخلص کے ساتھ جابجا اشعار شیخ عبدالقادر جیلانی، میاں میر اور ملا شاہ کی تعریف میں ملتے ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں قادریوں کا اثر کچھ کم ہوا۔ کیونکہ بادشاہ کا جھکاؤ نقشبندیوں کی طرف تھا۔ اس کے باوجود ابوالفتح شمس الدین ملتانی، جو مخازن قادریہ کے مصنف ہیں، اٹھارہویں صدی میں رقم طراز ہیں کہ سلسلۂ قادریہ کے جاننے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔[12]

اٹھارہویں صدی ہی کے دو مشہور صوفی سید یوسف اور حضرت شاہ شریف تھے جو بطور سپاہی مغل فوج میں داخل ہوئے۔ دونوں بزرگ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کے ساتھ کسی معرکہ میں دکن آئے تھے اور فوجی خدمات انجام دیں۔ آخر کار مریدوں کے کہنے سے استعفا دے دیا۔ یوسف صاحب کی وفات ۱۷۸۹ء میں ہوئی۔ اس کے بعد جلد ہی شریف صاحب داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ حیدرآباد میں ان کی درگاہ مرجع خلائق دکن ہے۔[13]

آج بھی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو جابجا پائے جاتے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں گیارہویں شریف بڑے تزک واحتشام سے منائی جاتی ہے۔ شیخ عبدالقادر کا خرقہ، جبّہ، دستار، مصلا، دوتھی اور دیگر تبرکات، کیتھل شریف، کشمیر، لاہور اور اوچ شریف میں موجود ہیں۔

آپ کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، خواجہ بختیار کاکی، حضرت مخدوم صابر کلیری، سید بندہ نواز گیسو دراز جیسے بزرگان دین نے آپ کی مدح سرائی کی ہے اور شیخ عبدالقادر بدایونی، شیخ عبدالحق دہلوی، شاہ ابوالمعالی قادری نے بھی آپ کی ستائش کی ہے۔ سلطان باہو، داراشکوہ اور پیر وارث شاہ نے بھی شیخ عبدالقادر جیلانی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔[14] الغرض کہ آج بھی آپ کی ذات مجموعۂ کمالات ہے۔

مندرجہ بالا سلاسل صوفیا کے علاوہ سولھویں صدی میں دکن میں شطاری سلسلے کے صوفیوں کی آمد ہوئی۔ ہندوستان میں اس کے بانی شاہ عبداللہ شطاری تھے۔ یہ سلسلہ جلد ہی گجرات سے دکن پہنچ گیا۔ اس کے مشہور بزرگ سید محمد غوث گوالیاری تھے (وفات ۱۵۶۳ء)۔ صوفی منش ہونے کے ساتھ ساتھ آپ اعتدال پسند بھی تھے۔[15] مختلف عقائد کے لوگوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ آپ نے خود کو ہندوستانی تہذیب سے ہم آہنگ کیا۔ سنسکرت کتابوں کے تراجم کیے جن میں "امرت کنڈ" مشہور ہے۔

محمد غوث شطاری کے علاوہ شیخ عارف، شیخ شمس الدین، شیخ ودود، شیخ ولی محمد رحمہم اللہ نے اس سلسلے کو پھیلایا۔ برہان پور نہ صرف چشتی بلکہ شطاری سلسلے کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ جہاں سندھ کے بہت سے صوفیا آکر آباد ہوگئے تھے۔ جن میں سے بیشتر شطاری تھے اور کچھ سلسلۂ قادریہ سے بھی بیعت تھے مثلاً شیخ ابراہیم قادری، شیخ محمد طاہر اور شیخ عیسیٰ۔ آپ حضرات صاحب تصانیف تھے۔ بالخصوص شیخ عیسیٰ کی تخلیقات میں حاشیہ وشرح شامل ہیں۔[16] آپ کے بیٹے عبدالستار شطاری اور نقشبندی سلسلے سے بیعت تھے۔

شطاری سلسلے کے ایک مشہور بزرگ شیخ برہان الدین شطاری تھے۔ اورنگ زیب نے آپ کے جماعت خانے میں قیام کیا اور اس سے متصل مسجد تعمیر کرانے کے لئے جگہ بھی دی۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے لئے جو جنگ کی تھی اس میں آپ سے دعا کی بھی درخواست کی تھی۔ حالانکہ آپ سیاست سے دور رہتے تھے۔ دنیاداروں سے ملنا پسند نہیں فرماتے۔ پھر بھی کچھ امرا خاص کر شائستہ خاں آپ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ فتوح بھی آپ کی خانقاہ میں فوراً تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اور جماعت خانے کا ہر فرد اپنی روزی خود مہیا کرتا تھا۔ آپ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل تھے اور دور دراز سے لوگ آپ کے مدرسے میں آتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۶۷۲ء میں ہوئی۔ باوجود آپ کے منع کرنے کے مریدوں نے جائے وفات پر گنبد بنوا دیا۔ مختصر یہ کہ دکن میں مختلف سلاسل کے صوفیا یہاں کی علمی، ادبی، مذہبی وثقافتی زندگی میں سرگرم عمل رہے۔

بقول خلیق احمد نظامی صاحب دکن کے لوگ کلاسیکی ادب سے

واقف تھے۔ یہاں کلاسیکی کتابوں کی تدریس ہوتی تھی۔ جن میں شیخ فریدالدین عطار، شیخ شہاب الدین سہروردی، مولانا جلال الدین رومی، امام غزالی، ابن عربی، امام قشیری، مولانا نورالدین جامی کی تصنیفات شامل ہیں [17]۔ اس کے علاوہ ۱۷ ویں صدی میں بے شمار کتابیں عربی، فارسی اور دکھنی زبان میں لکھی گئیں۔

محمود گاواں علم و ادب کی سرپرستی میں یکتائے روزگار تھا۔ اس نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ مگر انہوں نے آنے سے معذرت کر لی اور فصوص الحکم جو ابن عربی کی مشہور کتاب ہے اس کی تفسیر محمود کو بھیجی۔ [18] محمود گاواں کی خط و کتابت خواجہ عبیداللہ احرار سے بھی تھی جو نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔

درحقیقت صوفیا نے دکن کے سماج میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ سادگی، مساوات، آپسی میل جول پر زور دیا۔ دوھرے، چکی نامے، چرخے نامے لکھے گئے جن کے ذریعے صوفیانہ تعلیم دی گئی۔ دکنی ادب میں اردو اور ہندی الفاظ بھی شامل تھے جس کی وجہ سے ایک مشترکہ زبان اور کلچر وجود میں آیا۔ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ سے مبرا عوامی زبان لوگوں کے دلوں میں براہ راست اتر جاتی تھی۔ شیخ برہان الدین غریب، سید محمد گیسودراز، شاہ ابوالحسن قادری، شمس العشاق شاہ میران جی قادری اور شیخ برہان شطاری نے زبان کی ترویج و ترقی میں حصہ لیا۔ بیش تر صوفیا ترک دنیا کو ناپسند کرتے تھے۔ ان صوفیا نے لوگوں کے بیچ رہ کر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔

مضمون کے اختتام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منگولوں کے حملے کے بعد جب سیاسی انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا، عوام کا ذہنی سکون غارت ہو چکا تھا اس وقت لوگوں نے صوفیا کے حلقۂ آغوش میں پناہ لی۔ ان کے دائرے، جماعت خانے، درس گاہیں، خانقاہیں، اور درگاہیں شمالی ہند سے جنوب دکن تک قائم ہو گئیں۔ یہ خانقاہیں اور جماعت خانے نہ صرف تہذیب و تمدن کا مرکز تھے بلکہ تعلیمی درسگاہیں تھیں، شائستگی و پاکیزگی کا بہترین نمونہ تھیں۔ روحانیت کی فضا تھی جہاں بلا تفریق مذہب و ملت لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ تبادلۂ خیالات، سے آپسی رواداری، انسانی ہمدردی کو جلا ملی۔ نہ صرف عام دنوں میں بلکہ عرس کے موقعوں پر انسانوں کا جم غفیر عوام میں صوفیا کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا غماز ہے۔

REFERENCES

(1) K.A.Nizami:Sufi Movement in the Deccan,Article,Published in the 'History of Medieval Deccan' (1295-1724)editor Prof.H.K. Sherwani, Dr.P.M. Joshi. The Govt. of Andhra Pradesh Hyderabad, 1974,pp.176-77.

(2) Medieval Deccan History. C.f. Sulaiman Siddiqui's article, "Royal Policy and Patronage of Sufi Shrines in Khuldabad". See commemoration volume in the Honour of P.M.Joshi ed. H.A. Nayeem, T.R. Desouza, Bombay 1996,p.77.

(3) Sufi Movement in the Deccan,p.187.

(4) Richard Eaten:Sufis of Bijapur,Princetion University Press Princetor,1978, P. 57,73,75

(5) For further details: See author's book , History of the Qadiri Order in India, Delhi,p.55-89.

(6) History of the Qadiri Order in India,p.37.

(7) For their biographical details: History of the Qadiri Order in India, Delhi,2005,pp.42-43.

(8) A History of Sufism in India , vol.11, Dehli 1983,p.56.

(9) Islam in the Indian subcontinent,p.97

(10) The Bahmani Sufis. pp.153-54,157-58.

(11) History of the Qadiri Order in India, Chapter 11, pp. 54-74.

(12) Makhazin-i-Qadriyah, MS No. 919, Oriental Manuscript library Hyderabad.

(13) History of the Qadiri order in India, 76-77.

(14) History of the Qadri order in India, pp.10-11.

(15) For further details,"Sufi Movement in the Deccan,"p.190.

(16) "Sufi Movement in the Deccan" p.191. History of the Qadiri order in India, pp.62-64.

(17) "Sufi Movement in the Deccan,"p.197.

(18) Ibid,p.197.

❁❁❁

سلاسل اربعہ پر ایک نظر

ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی علیگ .... سابق کورٹ ممبر فیکلٹی آف تھیولوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلام نے خالق کائنات کا تصور بحیثیت الوہیت رب العالمین کے پیش کیا ہے اور پیغمبر آخر خاتم النبیین کو رحمۃ العالمین کہا ہے جب اللہ واحد رب العالمین ہے اور اس کا آخری پیغمبر، رحمۃ للعالمین ہیں لازماً اس دین کے پیروکاروں کو ان ذوات مقدسہ کی ان صفاتِ عالیہ سے متصف ہونا ہی چاہیے بلکہ مخلوق کائنات کے ساتھ اسی روش کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیے۔ چند ناگزیر حالات میں بدرجہ مجبوری معرکہ آرائیوں کے علاوہ پیغمبر اسلام نے ہمیشہ امن و آشتی کی شمع کو فروزاں رکھا اور اس شمع کو ہمیشہ فروزاں رکھنے کی ترغیب و تلقین بھی اپنے پیروکاروں کو دی۔ انداز شہنشاہی نے ہمیشہ دور رہنے والے سیاست کے مکروفریب سے گریزاں اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار رہنے والے صوفیائے کرام نے ہمیشہ رحمۃ للعالمین کی تعلیمات اور وصیت کو گلے لگائے رکھا۔ انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے آپ کو عبادت وریاضت تک ہی مصروف رکھا۔ درویشانہ زندگی گزاری بقدر ضرورت اون یا موٹا چھوٹا لباس کا استعمال کیا۔ قرآن کریم میں جس راستے کو تقرب اور حدیث میں ''احسان'' کہا گیا اسی راہ کے مسافروں کو بعد کے عہد میں کسی خاص پس منظر کے تحت صوفی کہا جانے لگا۔ تصوف حقیقی قرآن وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام کی رحلت اور خلفائے راشدین کے انتقال کے بعد حصول تخت حکومت کے لئے مسلمانوں نے جو انداز اپنایا اور اگر اس میں معرکہ کربلا کے علاوہ جنگ جمل اور جنگ صفین کو بھی شامل کرلیا جائے جس قدر خوں ریزی ہوئی اور آپسی تفرقہ بازی کا سلسلہ دراز ہوا ان حالات میں اگر صوفیائے کرام خالصاً لوجہ اللہ مختلف ملک ومقامات میں نہ پھیلتے اور اپنی خانقاہوں کا قیام کرکے اسلام نہ پھیلاتے، دین اسلام کا ایک روشن رخ جو رواداری، مروت، اخلاص، صبر، ایثار، بھائی چارگی، اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل تھا یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پردہ خفا میں ہوتا۔ یہ احسان ہے تمام صوفیائے، خاصان خدا کا کہ انہوں نے عوام الناس کو عالمی پیمانے پر اسلام کے اس سنہرے پہلو سے متعارف کرایا۔ صوفیائے کرام نے عملی اور نظری اسلام کے دونوں پہلو پر کام کیا اور ان پر عمل کرکے لوگوں کے لئے روشن مثال پیش کی۔

صوفیا اپنے سلسلے کا تسلسل وتعلق خلفائے راشدین کے واسطے سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑتے ہیں۔ باقاعدہ اپنے شجرہ ارادت وخلافت میں اس کو ضبط تحریر میں لاکر عیاں کرتے ہیں۔ یوں ان کی اصل چار پیر اور چودہ خانوادوں میں سمٹ کرآجاتی ہے جو حضرت علی سے ہوکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ عرب اور غزنی وغوری حکمرانوں سے بہت پہلے صوفیا ہندوستان میں وارد ہوگئے تھے۔ حضرت حلاج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ہندوستان تشریف لائے تھے۔ نویں صدی کے آخر سے لے کر چودھویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں مختلف سلاسل کے صوفیا نے اپنی اپنی خانقاہوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ خدمت خلق میں مصروف ہوکر انسان سازی کررہے تھے۔

ہندوستان میں تصوف کے چاروں سلسلوں کا وجود پایا جاتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ سلسلہ چشتیہ، ۲۔ سلسلہ سہروردیہ، ۳۔ سلسلہ قادریہ، ۴۔ سلسلہ نقشبندیہ

چشتی سلسلہ ہندوستان میں سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی ذات سے فروغ پایا۔ تسلیم کیا جاتا ہے کہ برصغیر کی ولایت من جانب اللہ آپ ہی کو تفویض کی گئی۔ آپ کے مشاہیر خلفا میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور رئیس الغرباء والفقراء سلطان التارکین حضرت صوفی حمید الدین ناگوری کے علاوہ اور بھی مشاہیر شامل ہیں۔ خواجہ غریب نواز سے پہلے اس سلسلے کے ایک بزرگ

حضرت مودود یوسف چشتی کا بھی ہندوستان آنا بتایا جاتا ہے جو تاریخی اعتبار سے مزید تحقیق چاہتا ہے۔ داتا گنج بخش حضرت علی عثمان ہجویری کے وجودِ مسعود سے لاہور شرف یاب ہے، آپ خواجہ صاحب سے پہلے ہندوستان تشریف لا چکے تھے۔ مورخین نے سلسلۂ چشتیہ کے کچھ نمایاں خصوصیات میں، عشق الٰہی، سوز و گداز، محبت شیخ کی غیر معمولی اہمیت، انسان دوستی، خدمت خلق، دلدوزی اور دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری وشفقت اور حکومت و بادشاہوں سے بے تعلقی اور ان سے دور رہنا وغیرہ ہے۔ چشتی سلسلہ کے بزرگان دین نے ہندوستانی عوام کے مزاج وذہن اور نفسیات کو سب سے بڑھ کر بہتر انداز میں سمجھا اسی لئے یہ سلسلے ہندوستان کا سب سے مقبول ومعروف ترین سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کے شیخ میں خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ شیخ فریدالدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، خواجہ گیسودراز، خواجہ کمال الدین گجراتی، خواجہ شیخ سراج، شیخ سارنگ، شاہ مینا، شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، فخر جہاں شاہ فخر الدین دہلوی، پیر پٹھان، خواجہ سلیمان ہانسوی، شاہ نیاز بریلوی جیسے کثیر مشاہیر شامل ہیں۔

سہروردی سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے ہوتے ہوئے حضرت علی کے واسطہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ آپ کی تصنیف عوارف المعارف، تصوف حقیقی کے متعلق ایک جامع کتاب ہے بلکہ یہ علم تصوف کا 'دائرۃ المعارف' ہے۔ یہ سلسلہ ہندوستان میں آپ کے ایک باکمال خلیفہ اور بزرگ بابا شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے ذریعہ خوب پھلا پھولا۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ حمید الدین ریحانی ۱۰۹۴ء میں ناگور تشریف لاکر جینیوں کے درمیان تبلیغ کا کام بڑے حکیمانہ انداز میں کیا۔ اس سلسلے کی ایک شاخ فردوسیہ کے ایک بزرگ مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بہار شریف میں رہ کر مگدھ اور اطراف میں زبردست تبلیغی خدمات انجام دیا۔ آپ نے فاصلاتی نظام تعلیم کو سب سے پہلے ہندوستان میں اپنے مکتوبات کے ذریعہ متعارف کرایا، مکتوبات صدی، دوصدی، نیست وہست اور بھی کئی کتابیں آپ کی اس بات پر شاہد ہیں۔ اس سلسلہ کی اہم خصوصیات کثرت ذکر وشغل، صدق واخلاص اور وعظ ونصیحت وغیرہ ہیں۔ اس سلسلے کی خانقاہیں بھی ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔

قادریہ سلسلہ حضرت غوث اعظم میر میراں محی الدین جیلانی کی ذات اقدس سے منسوب ہے یہ سلسلہ آپ سے ہوکر حضرت علی کے توسط سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی آمد ہندوستان میں آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرزاق کے خلفاء کے ذریعے ہوا۔ جنوب میں اور خاص کر حیدر آباد میں اولاد غوث کے مزارات بکثرت ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں بھی اس سلسلے کا کافی فروغ ہوا۔ اس سلسلے کی عظیم خانقاہیں ملک کے مختلف اطراف میں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی خصوصیت توحید وتفویض ہے۔ توحید سے مراد وہ آخری درجہ ہے جو تمام صوفیہ کا آخری نصب العین ہے۔ تفویض سے مراد انسان اپنے اختیار سے باہر آجائے اور اپنا ظاہر وباطن، قصد وارادہ سب کچھ اللہ کے سپرد کردے۔ اس سلسلے میں بھی ذکر وتذکیر، عمل اور اخلاص کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ریاکاری سے بچنے کی بڑی تلقین کی گئی ہے۔

نقشبندی سلسلہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی کے ذریعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے توسط سے رسول ختم المرسلین سے مل جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ بڑی آن وشان کے ساتھ پھیلا۔ اس سلسلے کی متعدد خانقاہیں ہندوستان کے طول وعرض میں ملتی ہیں۔ ہندوستان میں اس سلسلے کی نمایاں شخصیتوں میں حضرت خواجہ باقی باللہ اور ان کے مرید وخلیفہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ہیں۔ مجدد الف ثانی نے ایک نیا تصور وحدۃ الشہود وحدۃ الوجود کے مقابلے میں پیش کیا۔ انہوں نے ایک اور نظریہ ''قومت'' یا قیوم زماں کا بھی پیش کیا۔ مگر تاریخی اعتبار سے ان کو بہت زیادہ مقبولیت نہیں ملی خود اسی سلسلے کے بعد کے بزرگ جیسے حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابرین نے وحدۃ الوجود فلسفہ کی زندگی بھر نشر واشاعت کی۔ اس سلسلے کے صوفیا حکمرانوں، امرا اور طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھنے کے قائل ہیں تاکہ ان کی اصلاح کی جاسکے۔ اس معاملے میں ان کی نیت اچھی ہے۔ اس سلسلے کی خاص خوبی عمل بالعزیمت، پابندی شریعت، ذکرِ خفی اور لطائف ستہ پر توجہ ہے۔

باقی صفحہ: ۳۴۱ پر

فتح الکنوز : ایک جائزہ

علامہ شاہ شبیہ انور علوی .... خانقاہ کاظمیہ، قلندریہ، کاکوری، لکھنؤ

قرآن مجید اور حدیث شریف کی عظمت و فضیلت کے بعد اولیائے کرام، حضرات صوفیہ قدست اسرارہم جو حقائق و معارف اور اسرار و رموز کے گنج ہائے گراں مایہ کے فتح باب کرنے والے ہیں ان کے ارشادات اور معجز بیان کلام کو جو برتری و سروری اور تاثیر و اثر انگیزی حاصل ہے وہ محتاج بیان ہے ہی نہیں۔ عارف رومی نے فرمایا ہے۔

گفتۂ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اگر چہ اللہ کے بندہ کے منھ کی بات ہے مگر حقیقتاً وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے)

حدیث قدسی ہے کہ لایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ . فاذا احببتہ کنت لہ سمعاً الذی یسمع بی الخ ۔ میرے بندہ اپنے نوافل امور کی ادائیگی کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور پھر جب اس کو چاہنے لگتا ہوں تو اس کا کان، آنکھ، ہاتھ سب کچھ بن جاتا ہوں وہ مجھ ہی سے سنتا، دیکھتا چھوتا، چلتا، پھرتا ہے۔ یعنی اس کا ہر فعل و عمل میرا فعل بن جاتا ہے۔ یداللہ فوق ایدیھم ۔ (سورۃ الفتح آیت: ۱۰) ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔ وما رمیتَ اِذ رمیتَ ولکن اللّٰہَ رمٰی (سورۃ الانفال آیت: ۱۷) جب آپ نے پھینکا تو دراصل آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکا تھا وغیرہ سے یہی مراد ہیں۔

حضرات صوفیہ کا نثری و منظوم کلام تصنع و تکلف سے پاک، از دل خیزد بر دل ریزد (دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے) کا مصداق اور اخلاص و للّٰہیت سے لبریز ہوتا ہے۔ حضرت حق تعالیٰ نے ہر دور میں بکثرت افراد کو ولایت کے مرتبہ پر فائز فرما کر ان کے احوال، واردات و مکاشفات او رمشاہدات کو عام فرمایا اور عامۃ الناس کو بھی ان کے فیوض و برکات سے فیض یاب ہونے کی سعادت ارزانی فرمائی۔ ان بزرگوں کے ملفوظات کو ارشادات، اقوال و فوائد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء) نے ان ملفوظات و فوائد کی زمانہ قدیم سے اہمیت کے سلسلہ میں فرمایا کہ اگر کسی شخص کو کسی وجہ سے کامل شیخ نہ مل سکے تو وہ اہل سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور ان کے مطالب و مباحث کی پیروی کرتا رہے۔ ''اگر کسے را شیخ کامل نہ باشد کتاب اہل سلوک پیش خود دارد و متابعت آں نماید'' (راحت القلوب)۔ مزید برآں حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہی نے بھی اس کی تاکید فرمائی کہ کتاب مشائخ و ارشاداتِ ایشاں کہ در سلوک راندہ اند، رنظرمی باید داشت (فوائد الفواد)۔ مشائخ کرام کی کتاب اور ان کے ارشادات، جو انہوں نے سلوک کے باب میں فرمائے ہیں، مطالعہ میں رکھنے چاہیے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی (۲۹۷ھ/۹۰۹ء) نے فرمایا کہ مردان خدا کے ذکر اور ان کے ارشادات سے مریدین و طالبین کو اعانت اور ان کے شکستہ قلوب کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دنیا اور اہلِ دنیا کی محبت دل سے نکلتی ہے۔ آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اس کے لئے زادراہ جمع کرنے کا عزم بھی پیدا ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام نے چودہ سو سالہ تاریخ میں انسانیت کی بقا کی بڑی انتھک کوششیں کیں۔ مقصد حیات سے انجان و نابلد لوگوں کو زندگی کا مقصد ذہن نشین کرایا اور یہ باور کرایا کہ تخلیق کا صرف یہی مقصد نہیں کہ کھاؤ، پیو، چین و آرام کی زندگی گزارو، کاروبار دنیا میں مست رہو اور موت آئے تو دنیا سے خالی ہاتھ چل دو۔ اس سب کے لئے انہوں نے تقریراً، عملاً اور تحریراً، بڑی کوششیں کیں اور بکثرت کتب و رسائل بھی تصنیف فرمائے۔ ''فتح الکنوز'' بھی اس زریں سلسلہ کی ایک اہم کڑی

ہے جس میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء-۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء)، شیخ نجم الدین کبریٰ (۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء)، شیخ نجم الدین دایہ (۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء) نیز شیخ عبدالوہاب شعرانی (۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء) وغیرہ کی کتابوں سے ایسے بہت سے مفید امور جمع کیے گئے ہیں جو تصوف کے مبتدیوں ومنتہیوں کے لئے ضروری ہیں۔ حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی قدس سرہٗ (۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء-۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) نے ان کو ۲۰ رفصول میں عربی زبان میں یکجا فرمایا تھا۔ بعد ازاں ان کے گرامی قدر صاحبزادہ غوث ملت حضرت شاہ تراب علی قلندر تراب کاکوروی قدس سرہٗ (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء-۱۲۷۵ھ/۱۸۸۵ء) نے ان تمام مطالب کو فارسی کا جامہ پہنایا تھا۔ لیکن اکیسویں صدی میں جب فارسی کیا اردو ہی اجنبی زبان کی جگہ لے رہی ہے۔ اس قسم کی تحریریں، استفادہ سے دور ہو رہی ہیں۔ عصر حاضر میں اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ حیات انسانی کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کرنے کے لئے بزرگوں کے ان ملفوظات، مواعظ اور فوائد کو ایسے زبان میں پیش کیا جائے جس سے استفادۂ عام کی راہیں ہموار ہوں۔

ذیل کی سطور میں فتح الکنوز کی ۲۰ رفصلوں میں سے چند فصلوں کا اختصار پیش کیا جا رہا ہے، جس سے کتاب کی عظمت و اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ کریں۔

پہلی فصل: اس میں شیخ اکبر کی بعض وصیتیں ہیں جو آپ نے بعض سالکین وطالبین کو فرمائیں۔ "بندہ پر سب سے پہلے حضرت حق تعالیٰ کی توحید فرض ہے۔ اس کے مخالف و شریک کا وجود نہیں۔ اس جیسا نہ کوئی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا۔ وہ آج بھی وہی اور ویسا ہے جیسا اور جو تھا۔ انبیا و رسل جو کچھ لائے ہیں اور جن کی خبر دی ہے ان پر دل و جان سے ایمان لانا ہے۔ قرآن و حدیث میں جو کچھ ہے علاوہ اس کے کسی کو کسی پر فضیلت مت دو۔ اہل طریقت اور اکابر سے جو کچھ سنا ہے اس پر ایمان لاؤ خواہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ تمام انسانوں کے ساتھ حسن ظن رکھو۔ ان سے ایذا و تکالیف کو برداشت کرو، خاموشی کو اپنا شعار بناؤ۔ اپنا بوجھ کسی پر مت ڈالو، اپنے نفس کے لئے کسی کی نرمی قبول نہ کرو، اپنی رہائش ولباس وغیرہ میں کشادگی نہ کرو۔ اس لئے کہ نفس جب عادی ہو جاتا ہے تو پھر اس کا قلع قمع مشکل ہوتا ہے۔ کم کھانے پینے کو اپنے لئے لازم کرلو۔ بغیر نیند کے غلبہ کے مت سو۔ قرآن اس طرح پڑھو کہ بایاں ہاتھ اُس پر رکھو اور دایاں ہاتھ حروف پر پھیرو اور ایسی آواز سے پڑھو کہ خود سن سکو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ سوال کی آیت پر سوال کرو، عبرت کی آیات پر استغفار کرو، مومنین کے اوصاف پڑھو تو اپنی حالت پر غور کرو۔ اگر ان کی صفات میں سے کچھ اپنے میں پاؤ تو شکر کرو اور جو صفات تم میں نہیں ہیں ان کو پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ جو کافروں کے حال میں آیات ہیں، اُن سے پناہ مانگو۔ جو نیک نیک کام کرو، یہ سمجھ کر کرو کہ یہ عمر کا آخری کام ہے۔ جب ایسا کرو گے تو تمہارا عمل مقبول ہوگا۔ ہمیشہ پاک وصاف رہو۔ دوسروں کو آرام پہنچاؤ۔ ان کی تکالیف کو دور کرو۔ حیوانات و بے زبانوں پر بھی رحم و کرم کرو۔ ان کی برداشت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ رکھو۔ اپنے اوپر احسان لازم کرلو۔ ذکر واستغفار کرنے کے عادی بنو۔ کیوں کہ اگر گناہ کے بعد ہوگا تو اُسے مٹادے گا اور اطاعت کے بعد ہوگا تو نور علیٰ نور۔ تقویٰ کو علانیہ و پوشیدہ طور پر لازم کرلو۔ اللہ سے اللہ کی پناہ مانگو اعوذ بک منک میں تیری خوشنودی کی تیری گرفت سے پناہ مانگتا ہوں۔ تم اس دنیا کی طرف کیوں راغب ہو جو اس کی غضب کی ہوئی ہے۔ الدنیا جیفة و طالبها کلاب (دنیا مردار ہے جس کے طلب گار کتے ہوتے ہیں)۔ اس سے رغبت اٹھالو اور اس میں زہد اختیار کرو۔ اس پر مطلق بھروسہ نہ کرو دونوں جہاں کی خوش بختی اور سعادت اسی میں ہے۔

دوسری فصل: گناہوں کی شامت کے بارہ میں ہے: شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ خوب سمجھ لو کہ ہر وہ مومن جو گناہ کرتا ہے اُسے دس چیزوں کا نقصان ہوتا ہے۔

۱۔ بدبختی، اطاعت وفرمانبرداری سے باز رکھتی ہے۔
۲۔ اگر اطاعت کرتا ہے تو اس میں حلاوت وشیرینی نہیں پاتا۔
۳۔ اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔
۴۔ جسم خشک ہو جاتا ہے۔
۵۔ بدن سست ہو جاتا ہے۔ عبادت وریاضت میں کاہلی کرتا ہے۔

۶۔ رزق سے برکت جاتی رہتی ہے۔
۷۔ بددل اور مخلوق سے ڈرنے والا ہوجاتا ہے۔
۸۔ اچانک عذاب آجاتا ہے یا خشک سالی یا بارش آجاتی ہے۔
۹۔ اس کے چہرہ کی خوبصورتی وشادابی کم ہوجاتی ہے۔
۱۰۔ اس کی زندگی میں بدبختی آجاتی ہے۔ دوسرے بھی اس کی طرح فاسق ہوجاتے ہیں۔ اس کی موت کے بعد اس کی اولاد برباد ہوجاتی ہے۔ تم اللہ سے پناہ مانگو۔ یہ بھی خوب سمجھ لو کہ تین لوگوں کو موت کے وقت ایمان کا خطرہ رہتا ہے۔

۱۔ وہ جو ایمان کے جانے سے بے خوف ہوتا ہے
۲۔ وہ جو ایمان میں بدعتوں کی آمیزش کرتا ہے۔
۳۔ وہ جو مسلمانوں پر ظلم کرتا اور ان کو تکلیفیں پہنچاتا ہے۔

ظلم سے بدتر کوئی گناہ نہیں اگر مہلت نہ دی جائے تو وہ ہرگز بخشا نہ جائے گا۔ فرعون کے زمانے میں اس کے آدمیوں نے ایک حاملہ عورت کو بے گناہ پکڑا اور اتنا مارا کہ اس کا حمل ساقط ہوگیا۔ اس عورت نے حق تعالیٰ سے فریاد کی کہ تو سورہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ جب فرعون غرق ہوا تو اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ظاہر ہوا کہ ہم نہ سورہے ہیں نہ بیدار ہیں۔ ہم مہلت دیتے ہیں چھوڑتے نہیں ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ۳؍دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ (۱) باپ کی دعا بیٹے کے حق میں (۲) مسافر کی دعا (۳) مظلوم کی دعا

مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے خوب کہا ہے

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دُعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

(مظلوموں کی آہوں سے ڈرو کہ دعا کرتے وقت قبولیت، حق کے دروازہ سے استقبال کے لئے آتی ہے)

اللہ تعالیٰ کی عنایت کی دو نشانیاں ہیں۔ (۱) پہلے سے پاکدامنی (۲) بعد کی توبہ، اس کا کیسا کرم ہے کہ سو سال کے گناہوں کو ایک توبہ سے بالکل مٹا دیتا ہے۔ شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری (۶۱۸ھ) فرماتے ہیں۔

تو یقین می داں کہ صد عالم گناہ
از تفِ یک توبہ برخیزد زراہ

بحرِ احسان چوں در آید موج زن
محو گرداند گناہ مرد و زن

(یقین جانو کہ گناہ کے سیکڑوں عالم ایک ہی توبہ میں راہ سے دور ہوجاتے ہیں کیوں کہ احسان وکرم الٰہی کا سمندر جب ٹھاٹھیں مارتا ہے تو عورت مرد سب گناہوں کو بہالے جاتا (مٹا دیتا) ہے۔)

تیسری فصل: میں شیخ کے لئے جن آداب وشرائط کا ہونا ضروری ہے ان کا بیان ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

شیخ اکبر قدس سرہ اس سلسلہ میں صراحت فرماتے ہیں کہ شیخ کو خطرات نفسانی، شیطانی، ملکی اور ربانی سے کما حقہ واقفیت ضروری ہے کہ یہ خطرات کہاں سے اور کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ امراض اور ان کے علاج جانتا ہو نیز یہ بھی کہ کون سے وقت کون سی ریاضت ومجاہدہ مرید سے کرائے۔ والدین کی طرح اولاد اور گھر والوں کے تعلقات پہچانے اور تدبر اختیار کرے کیوں کہ مرید کے تمام امراض ان ہی علائق سے لاحق ہوتے ہیں۔ شیخ پر لازم ہے کہ وہ مرید کو بے مہار نہ چھوڑ دے کہ بغیر حکم کے کوئی کام کرے۔ مرید سے سرزد ہوئے گناہ اور غلطی پر اُسے عتاب کرے اور سزا دے۔ اگر شیخ یہ دیکھے کہ مرید دلیلیں دیتا، حجت کرتا اور کلام میں اس کی طرف رجوع نہیں کرتا ہے تو اسے اپنے سے دور کردے۔ کیوں کہ وہ دوسرے مریدین کو بھی خراب کرتا ہے اور خود بھی فلاح نہیں پاتا۔ نیز اگر شیخ یہ دیکھے کہ مرید کے دل سے اس کی خدانخواستہ عزت ختم ہوگئی ہے تو اس کو اپنے سے دور کردے کیوں کہ وہ بدترین دشمن ہے کہ دشمن سے ایک بار بچو اور جان پہچان والے سے ہزار بار۔ شیخ کو تین مجلسیں کرنا چاہیے۔ ایک عام جس میں تمام مریدین ہوں۔ اس میں شرعی آداب کی پابندی، اس کا احترام اور نتائج و معاملات سے مطلق صرف نظر نہ کرے۔ دوسری خاص محفل جس میں اذکار واشغال اور خلوت وریاضات نیز راستوں کی وضاحت کرے۔ تیسری اپنے لئے جس میں حضرت حق کے لئے ایک خاص وقت مقرر کرے کیوں کہ خلوتوں سے اُسے جو کچھ حاصل ہوا ہو وہ مخلوق کی صحبتوں سے ختم نہ ہوجائے۔ اس لئے کہ خلوت کی برکت اور ماسوا کے چھوڑ دینے سے اُسے یہ سب حاصل ہوا۔ مرید اگر خواب، مکاشفہ یا مشاہدہ بیان کرے تو وہ اس سے کچھ نہ کہے بلکہ عمل کا حکم دے کہ اس

سے اور اعلیٰ وارفع کی طرف ترقی کرے ورنہ وہ نفس کی وجہ سے اس پر مغرور ہو جائے گا اور شیخ کی عزت اس کے دل سے جاتی رہے گی جس کی وجہ سے وہ مطرود اور محجوب ہو جائے گا۔ ایسے شخص کا کہیں ٹھکانہ نہیں (نعوذ باللہ منہ)

شیخ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ مریدین کو اپنے کھانے، پینے سونے اور دیگر حرکات وسکنات سے مطلع نہ کرے کیوں کہ وہ اپنے کمزور عقیدہ کے سبب شیخ کے ذوق یقین کو حقیر و معمولی جانیں گے جو ان کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ شیخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اگر کسی کو اپنے سے بلند مقام پر پائے تو اس کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرے اور اپنے مریدین واحباب کو اس کا حکم دے کہ اس کی خدمت میں رہیں۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو مصنف نہ ہوگا بلکہ دنیا کا طالب ہوگا اور اللہ کے راستہ میں ناقص۔ حدیث شریف ہے کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ہماری پیروی کرتے الخ............

صاحب "مرصاد العباد" نے شیخ میں بیس صفات کا ہونا ضروری لکھا ہے:

۱۔ علم شریعت میں جو کچھ امر و نہی ہے اس سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اہل سنت وجماعت کے عقائد ہوں۔

۳۔ عقل ہو یعنی معاشِ دینی ودنیوی میں کمال ہو۔

۴۔ سخاوت ہو (مالدار بھی ہو، فضل الٰہی سے بغیر تلاش کے کیوں کہ مفلس شیخ سے کیا ہوگا اور مرید کا دل اس سے کیوں کر فارغ ہوگا جس کا وہ محتاج ہوگا)

۵۔ بہادر ہو تاکہ مخلوق کی ملامت سے نہ ڈرے۔

۶۔ پاکدامن ہو، تاکہ مریدوں کو اس سے خطرہ نہ ہو اور ان کی ارادت میں خرابی نہ ہو۔ کیوں کہ مبتدی اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنی تاویل سے فساد کی صورت کو دفع کر دے۔

۷۔ سوائے خاص ضرورت کے دنیا کی طرف متوجہ نہ ہو۔ مرید کے مال سے لالچ وطمع کو اٹھا لے۔

۸۔ مریدین پر شفقت کرے اور نرمی ومدارات سے پیش آئے۔ ایسا بوجھ اس پر نہ ڈالے جس کے اٹھانے کی طاقت اس میں نہ ہو۔

۹۔ بردباری۔ شیخ کو بردبار اور بارکش ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہر بات میں جلد غصہ آجانے والا۔ مریدوں کو تکلیف نہ پہنچائے سوائے ضرورت کے مطابق۔ انہیں ادب کی تعلیم دے۔

۱۰۔ عفو ودرگزر۔ اگر مرید سے خلاف طریقت وشریعت کوئی معاملہ دیکھے تو عفو ودرگزر کرے اور خیر خواہی ونصیحت کا رویہ اختیار کرے۔

۱۱۔ حسن خلق۔ اچھے اخلاق والا ہوتا کہ مریدین اس سے حسن اخلاق کا سبق لیں اور بھاگیں نہیں۔ کیوں کہ مرید، شیخ کے احوال واخلاق کا آئینہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ ایثار۔ مریدین کی ضرورتوں اور مصالح کو اپنے اوپر ترجیح دے اور اپنے حصہ کو ان پر ایثار کرے۔

۱۳۔ کرم۔ شیخ میں ولایت کا کرم ہوتا ہے کہ مریدوں کو ولایت کے کرم سے ولایت بخش سکے۔

۱۴۔ توکل میں کمال ہو، تاکہ مریدین کے رزق کی وجہ سے وہ افسوس نہ کرے اور ان کو بھی اسباب معیشت کا خوف نہ ہو۔

۱۵۔ تسلیم۔ شیخ کو غیب تسلیم کرنے والا ہونا چاہیے، یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے لائے جو چاہے لے جائے۔ نہ مریدین کے آنے سے حرص کرے اور نہ ان کے جانے سے کام میں سستی کرے، گویا ان کی آمد ورفت سے موٹا ولاغر نہ ہو۔

۱۶۔ رضا بالقضاء پر سختی سے عمل کرے۔

۱۷۔ وقار۔ مریدین کے ساتھ وقار ودبدبہ سے پیش آئے تاکہ گستاخ ودلیر نہ ہو سکیں اور ان کے دلوں سے شیخ کی عظمت نہ جائے جو ارادت میں خلل کا باعث ہو۔

۱۸۔ سکون یعنی کاموں میں عجلت نہ کرے، مرید میں آہستگی سے تصرف کرے۔

۱۹۔ ثبات۔ اسے چاہیے کہ تمام کاموں میں ثابت قدم اور درست عزیمت رہے تاکہ مرید اس سے خرابی نہ دیکھے۔

۲۰۔ ہیبت۔ شیخ کو پُر ہیبت ہونا چاہیے تاکہ مریدین کے دل میں اس کی وقعت وہیبت اور عظمت قائم ہو اور اس کی ولایت وہیبت کی وجہ سے مرید کے تصرفات میں شیطان کا گزر نہ ہو سکے۔

چوتھی فصل: مرید کے آداب وشرائط سے متعلق ہے (یہ بھی شیخ

اکبراور شیخ نجم الدین کبریٰ کے ارشادات سے ماخوذ ہیں)۔ مرید کو شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیے تا کہ اس کی عزت اس کے دل میں رہے۔ ناپسندیدگی سے بیعت نہ کرے جو کچھ دیکھے اس پر اعتراض نہ کرے، با ادب رہے، شیخ کے احکام کی نافرمانی نہ کرے اور اس بات کی تاویل نہ کرے، شیخ کے مصلے پر پیر نہ رکھے اور اس کے کپڑے نہ پہنے۔ اس سے کوئی جواب نہ مانگے کہ یہ بے ادبی و گستاخی ہے۔ اپنے قلبی معاملات شیخ سے نہ چھپائے اگر پوشیدہ رکھے گا تو ہلاک ہوگا کیوں کہ مرید بمنزلہ بیمار کے ہے اگر بیمار اپنے مرض کو طبیب پر نہ ظاہر کرے گا تو وہ کیا دوا دے گا۔ مرید کو شیخ کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے جیسا مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں۔ اس کا کوئی ارادہ اس کا اپنا نہ ہو۔ نہ اپنے نفس کے لئے کوئی تدبیر کرے بلکہ اس کا اردہ شیخ کا ارادہ ہے۔ شیخ کے کسی کلام میں بحث نہ کرے۔ اگر چہ مرید ہی حق بجانب ہو۔ شیخ پر اعتراض حرام ہے۔

مردود ہیں طریق طریقت سے وہ مرید
کرتے جو مرشدوں پہ عتاب و خطاب ہیں

مرید کو فضول نظر سے اسی طرح بچنا چاہیے جس طرح فضول گفتگو سے بچتا ہے۔ شیخ کے سامنے اس طرح بیٹھے جس طرح چور سزا کے لئے لایا جاتا ہے۔ مرید اپنے پیر کو شریعت حق سے واقف جانے اور بہ ظاہر کوئی بڑی بات اس سے دیکھے تو اپنے نفس کا قصور جانے۔ جب اولیاء اللہ کے مرتبہ کو عوام نہیں سمجھ پاتے تو علمائے ظاہر کیا جان سکیں گے۔ شیخ اگر مرید کو کسی کام کا حکم دے تو ہرگز توقف نہ کرے بلکہ بجالائے اور نہ کوئی شرط کرے۔

ایک شیخ سے ایک برا کام سرزد ہوا اس نے مرید سے کہا تو نے مجھے اس کام میں دیکھا مجھے چھوڑ دے اور کوئی دوسرا شیخ تلاش کر۔ مرید نے کہا میرے دل میں کچھ نہیں ہے میں نے آپ کی صحبت علم باللہ کے سبب اختیار کی ہے میں نے آپ کو عالم طریقت جانا نہ کہ معصوم۔ اس اعتقاد کی وجہ سے مرید ایسا کامیاب ہوا کہ کاملین میں سے ہو گیا۔ مرید کو امانت دار اور اسرار کا چھپانے والا ہونا چاہیے اور بغیر شیخ کے حکم کے کسی بھید کو نہ ظاہر کرے۔

شیخ نجم الدین کبریٰ نے مرید کے لئے ۲۰ صفتیں تحریر فرمائی ہیں: (۱) توبہ، تمام خلاف شریعت باتوں سے سچی توبہ کرے، چاہے شان و شوکت ہو، چاہے مال و اسباب۔ (۲) تجرید، تمام علائق نسبی وجسی وغیرہ سے مجرد ہو، تا کہ اس کا دل ان میں نہ اٹکے۔ ان من ازواجکم واولادکم عدواً لکم فاحذروھم (سورۃ التغابن آیت:۱۴) (۳) اہل سنت و جماعت پر اعتقاد رکھنے والا ہو اور ائمہ سلف کے مذہب پر ہو۔ (۴) تقویٰ، پرہیز گار ہو، کھانے پینے میں احتیاط کرے، مبالغہ نہ کرے۔ جہاں تک ہو سکے عزیمت کے ساتھ کام کرے۔ (۵) صبر، تصرفات اور امر و نہی شریعت پر صابر ہو۔ سختیاں برداشت کرے سستی و رنجیدگی کو اپنے پاس نہ آنے دے۔ (۶) مجاہدہ، نفس کے ساتھ نرمی نہ کرے اور اس کے مقصد کو نہ پورا ہونے دے۔ کیونکہ نفس کی مثال بھوکے شیر کی ہے اگر اس کو کھلاؤ گے تو وہ قوت پا کر تم کو کھا جائے گا۔ (۷) بہادری، بہادر و دلیر رہے تا کہ نفس کے ساتھ جنگ میں ٹھہر سکے اور شیطان کے مکر وحیلہ سے ڈرتا رہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں شیاطین اور جنات اور انسان بہت ہیں جن کے قہر وظلم کو بغیر بہادری کے دور کرنا ممکن نہیں۔ (۸) بذل وایثار، خرچ کرنے والا ہونا چاہیے کیوں کہ کنجوسی بڑی قید اور بڑا پردہ ہے۔ بعض مقامات پر دنیا و آخرت کو اور بعض جگہ جان کو قربان کر دینا چاہیے۔ (۹) جواں مردی، مرید کو جواں مرد ہونا چاہیے تا کہ ہر شخص کے حق کو اپنے مقام پر بقدر کشادگی کے ادا کرے۔ حق کی ادائیگی میں کسی سے لالچ نہ رکھے۔ انصاف دے اور انصاف طلب نہ کرے۔ (۱۰) صدق، اپنے معاملہ کی بنیاد سچائی پر رکھے۔ اللہ اور مخلوق کے ساتھ راستی اختیار کرے اور جھوٹ و خیانت سے دور رہے۔ (۱۱) علم، اتنا علم حاصل کرے کہ فرائض کے عہدہ سے جو اس کے اوپر واجب ہیں باہر آ سکے اور زیادتی کی طلب میں کوشش نہ کرے کہ راہ سے پھر جائے اور بے فائدہ علم حاصل کرنے میں مشغول نہ ہو۔ (۱۲) نیازمندی، کسی بھی مقام پر نیاز کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اگر مقام ناز پر گر پڑے تو تکلف سے خود کو عالم نیاز پر لے آئے کہ نیاز عاشق کا اور ناز معشوق کا مقام ہے۔ (۱۳) عیاری، اس راہ میں چالاک وعقلمند رہے کیوں کہ اس میں بہت خطرناک کام اور وجوہات پیش آتے ہیں۔ جان سے خوف نہ کھائے اور روزانہ ہزار بار اپنے سر کو اس کے پیروں تلے رکھ سکے۔ (۱۴) ملامت،

مرید کو ملامت صفت و قلندر سیرت ہونا چاہیے۔ یہ وہ ملامت نہیں جو خلاف شریعت کام کرے بلکہ ملامت یہ ہے کہ نام و ننگ اور تعریف و برائی رد و قبول خلق اس کے نزدیک یکساں ہوں اور خلق کی دوستی و دشمنی سے موٹا دبلا نہ ہو۔ اضداد کو ایک رنگ میں شمار کرے۔ تمام مخلوق کے ساتھ صلح کے ساتھ رہے اور اپنے نفس کے ساتھ جنگ کرے۔

زین روئے کہ راہِ عشق را ہے تنگ ست
نے صلح بخود ہست نہ باکس جنگ ست
شد در سر نام و ننگ عمر ہمہ خلق
اے بیخبراں چہ جائے نام و ننگ ست

(عشق کا راستہ، تنگ راستہ ہے اس لئے نہ اپنے ساتھ صلح نہ کسی کے ساتھ لڑائی۔ صرف نام و ننگ کے واسطے مخلوق کی پوری عمر گزری گئی اے بے خبرو! کیا یہ نام و ننگ کی جگہ ہے (۱۵) عقل، ضروری ہے کہ عقل کے استعمال سے اس کی حرکات مضبوط ہوں اور شیخ کے حکم اور مرضی کے بغیر کوئی حرکت اس سے وجود میں نہ آئے۔ (۱۶) ادب، مودب و مہذب ہو اور کشادگی و ظرف کی راہ اپنے اوپر بند رکھے۔ شیخ کے حضور میں وقار، سکون اور تعظیم سے بیٹھے جب تک وہ کچھ نہ پوچھے نہ کہے اور جو کچھ کہے نرمی، سکون و سچائی سے کہے اور ظاہر و باطن میں شیخ کے اشاروں کا منتظر رہے۔ (۱۷) حسن خُلق، اچھی عادت و خصائل والے دوستوں سے میل جول رکھے، ناک بھوں نہ چڑھائے، بدمزاجی نہ کرے اور تکبر، فخر غرور، دعویٰ اور طلب جاہ سے دور رہے۔ تواضع و خدمت کے ساتھ بڑے دوستوں سے اور شفقت و دلداری، مہربانی اور مراعات سے چھوٹے دوستوں سے پیش آئے۔ دوستوں پر اپنا بوجھ نہ رکھے۔ (۱۸) تسلیم، ظاہر و باطن میں شیخ کی ولایت کے تصرفات کو تسلیم کرنے والا ہو۔ (۱۹) اپنے تصرف کو چھوڑ دے اور شیخ کے امر و نہی میں ایسا ہو جیسا مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں۔ (۲۰) سپردگی، مرید پر لازم ہے کہ وہ اس راہ میں مکمل طور پر اپنے وجود سے اُٹھ جائے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کردے۔ سچے دل سے کہے " **افوّض امری الی اللّٰہ**"، میں اپنا کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ سپردگی عبادت کے لئے ہے نہ کہ بہشت کے لئے نہ دوزخ کے خوف سے اور نہ کمال کی وجہ سے۔ ارادت میں کسی مکھی سے بھی کم نہ ہو کہ اسے جس قدر بھگاتے ہیں وہ واپس آتی ہے۔

تا دل رقم عشق تو بر جاں دارد
باران بلا بر سر دل می بارد
جاناں بسرت کز تو نگر دانم رو
در عشق ہزار زیں بروئم آرد

(جب تک دل تیرے عشق کی تحریر جان پر رکھتا ہے بلاؤں کی بارش دل پر ہوتی رہتی ہے۔ اے محبوب! تیرے سر کی قسم تجھ سے رو گردانی نہ کروں گا۔ عشق میں اس طرح کی ہزاروں بلائیں آئیں گی۔)

پانچویں فصل: میں شیخ سے مرید کی ضرورت کا بیان ہے: مرید و سالک کی ضروریات شیخ کامل سے بہت سی وجوہات کی بنا پر ہیں۔ (۱) ظاہر ہے راہ کعبہ پر بغیر راہ شناس و رہبر کے نہیں جا سکتے۔ باوجود اس کے کہ کعبہ جانے والا خود راستہ دیکھنے والی آنکھ کا مالک ہو۔ (۲) ظاہری راہ پر ڈاکو بہت ہیں بغیر محافظ نہیں جا سکتے اور راہِ حقیقت میں دنیوی زیب و زینت، خواہشات نفس و ہوا وغیرہ تمام کے تمام رہزن ہیں۔ (۳) اس راہ میں لغزشیں، آفات و شبہات اور عقبات بے شمار ہیں۔ بہت سے تنہا جانے میں شبہات و شکوک میں گرے اور ان کا دین و ایمان برباد ہوا۔ (۴) اس راہ کے مسافروں کو طرح طرح کے موانع و الجھنیں پیش آئیں گی۔ ایسے میں ایک شیخ کامل کی ضرورت ہے جو اپنی ولایت کے تصرف سے مرید کو ان الجھنوں و موانع سے بچائے۔ (۵) اس راہ میں جانے والے لوگوں کے لئے عیش اور امراض پیدا ہوتے ہیں بعض میں فاسد مادہ پیدا ہوتا ہے اور وہ مغلوب کر دیتا ہے جس سے طلب و ارادت کا مزاج انحراف پذیر ہو جاتا ہے تو طبیب حاذق کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاکہ وہ صحیح علاج کرے اور مادہ کی تسکین و مرض کے ازالہ کی تدابیر کرے۔ (۶) سالک، راہ سلوک میں بعض ایسے مقامات پر پہنچتا ہے جہاں روح لباس بشریت سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اگر شیخ کی ولایت کا تصرف جو لطف حق کی صورت میں ہے اس کا دست گیر نہ ہو تو زوال ایمان کا خوف رہتا ہے۔ ایسے میں شیخ اپنی ولایت کے تصرف سے اُسے اس پندار سے باہر نہ لائے تو اسے ان عوائق سے کسی طرح چھٹکارہ نہ ملے گا۔ (۷) اس راہ کے سالک پر غیب سے شہادت ظاہر ہوگی اور وقائع اس پر اور ایسے

اسرار ظاہر ہوں گے جن سے وہ واقف نہ ہوگا، ایسی صورت میں غیب شناس شیخ کی ضرورت ہے جو اپنے اور اس کے وقائع کی تعبیر کر سکے۔ (۸) سالک مبتدی کا سفر چیونٹیوں سے بھی کمتر سفر ہے بلکہ بعض مقامات کو تو اڑ کر عبور کرنا ممکن ہے۔ سالک کی حیثیت انڈے کی اور مرشد و شیخ کی پرندہ کی ہے کہ جب تک انڈا اور بچہ پرندوں کے پروں و سایہ میں پرورش نہیں پاتا پرواز کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ (۹) راہ تصوف کا سلوک ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ اور ذکر اسی وقت مفید ہوتا ہے جب شیخ تلقین کرے۔ (۱۰) ظاہری بادشاہوں کے حضور میں بھی بغیر وسیلہ کے قرب حاصل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو کسی مقرب کے ذریعہ۔ اگرچہ جس کو قرب حاصل ہوتا ہے وہ بادشاہ کے قابل نہیں بھی ہوتا پھر بھی اس صاحب وسیلہ کی وجہ سے بادشاہ اُسے اپنا قرب بخشتا ہے۔ بالکل اسی طرح بادشاہ حقیقی کے حضور میں مشائخ و اولیا کی عزت و آبرو ہوتی ہے۔

چھٹی فصل: میں راہ سلوک کے جواں مردوں کی تعریف، ان کی پہچان، آداب سماع اور بعض دوسری نصیحتوں کا بیان ہے۔ مثلاً زبان اور لغزشوں سے درگزر نہ کرنے پر مواخذہ ہے۔ شریعت میں ان کی معافی نہیں ہے۔ اپنے آپ نفس سے انصاف کرے اور کسی سے اپنے انصاف کی تعریف نہ چاہے، لوگوں کے ساتھ رحمت، شفقت اور خیر خواہی سے پیش آئے، نہ یہ کہے کہ یہ چیز میری ہے، یہ میرا ہے، عورتوں کے میل جول سے حتی الوسع پرہیز کرے، نوجوانوں کی صحبت سے بھی اجتناب کرے کہ اس میں آفات ہیں۔ گفتگو، نظر، کھانے پینے میں پرہیز ضروری ہے۔ اپنے سے اعلیٰ پر اعتراض نہ کرے۔ سالک، شیخ کی خدمت میں بغیر وضو نہ حاضر ہو، کسی گناہ گار کے حق میں بدگمانی نہ کرے ہوسکتا ہے کہ وہ توبہ کیے ہوئے ہو۔ اگر کوئی خود کو بغیر دوسرے کو جانے اس سے افضل و برتر سمجھے تو وہ دھوکہ میں ہے۔ تہذیب اخلاق میں کوشش چاہیے۔ سائل کو واپس نہ کرے، محارم و شبہات سے پرہیز کرے، دوسروں پر ایثار کرے، مسلمانوں کے حق میں دعا کرے، تمام ذی روح پر رحم کرے، لوگوں کی اچھائیاں ظاہر کرے، برائیاں چھپائے، عوام و خواص کی خدمت کو فرض جانے، تکلیف دہ چیز کو راہ سے ہٹا دے۔ دشمن کی بدی پر خاموش رہے۔

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

دفع ایذا جس قدر ہو آپ سے کرتے رہو
دور کردو گر پڑا ہو راہ میں خار ببول
یارو! دشمن کی بدی پر کچھ نہ بولو چپ رہو
عیب اس کو کرنے دو تم کچھ نہ بولو چپ رہو

اپنا حق کسی پر نہ دیکھے اور سب کا حق اپنے پر دیکھے۔ بدشگونی چھوڑ دے، اگر کوئی قرض مانگے تو دے دے اور ہرگز کسی سے تذکرہ نہ کرے اور وہ لوٹائے تو حتی الامکان واپس نہ لے وغیرہ۔

ساتویں فصل: میں شیخ نجم الدین کبریٰ کی تحریروں سے ذکر اور اس کے آداب و شرائط بیان فرمائے ہیں کہ بغیر آداب و شرائط کے ذکر افادیت سے خالی ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ارادت سچی ہو، دوسری راہ سلوک کی طلب اور تیسری خلق سے وحشت اور ذکر سے انسیت ہو۔ چوتھی شرط گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرنا ہے۔

ذکر آداب میں باوضو ہونا بلکہ اگر غسل کیے ہو تو افضل ہے، نجاست، ظلمت اور حرمت سے پاک لباس پہننا، گوشہ تنہائی اور اندھیرے میں بیٹھنا کہ یکسوئی ضروری ہے قبلہ رو بیٹھنا وغیرہ۔ پھر ذکر تقلیدی و تحقیقی کا بیان ہے۔

آٹھویں فصل: میں ذکر کے نتائج اور برکتوں کا بیان ہے۔ اسی ضمن میں حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ فرماتے ہیں:

عمریست کہ در راہ تو پائے ست سرم
خاک درِ تو بدیدگاں می سپرم
زاں روئے کنوں آئینہ روئے توام
کز دیدۂ تو بروئے تو می نگرم

(ایک عمر گزر گئی کہ تیری راہ میں میرا سر نگوں ہے۔ تیرے در کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگا رہا ہوں چونکہ میں تیری ذات کا آئینہ ہوں جب بھی تجھ پر نظر ڈالتا ہوں تو گویا اپنے کو دیکھتا ہوں۔)

جب نورِ حق، نورِ روح پر عکس ڈالتا ہے تو نور کا مشاہدہ شہود کے ذوق کی آمیزش سے مشاہدہ میں ظاہر ہوتا ہے اور جب نورِ حق بغیر روحانی و قلبی حجاب کے شہود میں آتا ہے تو بے رنگی، بے کیفی، بے حدی، بے مثلی بے نہایتی و بے ضدی اور بے مثلی ظاہر ہوتی ہیں اور تمکین و تمکن

اوراس کے لوازم ہوجاتے ہیں۔

نویں فصل: میں بعض غیبی واقعے اور خواب کا ذکر ہے کہ جب سالک ریاضت ومجاہدہ ونفس وقلب کا تصفیہ شروع کرتا ہے تو اسے ملک وملکوت پر عبور حاصل ہوجاتا ہے اور ہر مقام پر حال کے مناسب اس کو وقائع اور کشف ظاہر ہوتے ہیں۔ بعد ازاں خوابات کی تفصیل اوران کے اقسام کا بیان ہے۔

دسویں فصل: میں تجلیات الٰہیہ اوران کی مختلف اقسام کا بیان ہے۔ ذات وصفات کے ظہور کی تجلی حضرت الوہیت سے عبارت ہے۔ راہ تصوف کے سالکین کو یہاں اکثر مغالطہ ہوتا ہے۔ تجلی روحانی اور رحمانی کے درمیان یہ فرق ہے کہ تجلی روحانی، حدوث کی علامت رکھتی ہے اوراُسے فنا کرنے کی قوت نہیں ہوتی لیکن تجلی رحمانی اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ تجلی روحانی سے غرور وپندار ظاہر ہوتا ہے اور ہستی کا گھمنڈ بڑھ جاتا ہے۔ طلب میں نقصان ہوتا ہے لیکن تجلی رحمانی میں یہ چیزیں ختم ہوجاتی ہیں۔ ہستی نیستی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور طلب وتشنگی میں زیادتی ہوجاتی ہے۔

سوز دلِ خستم زوصالش نہ نشست
ویں تشنگی از آب زلالش نہ نشست
نیرنگِ وجودِ ماز ہستی برخاست
وزسر ہوس عشق جمالش نہ نشست

(مجھ خستہ دل کا سوز اس کے وصال سے بھی ختم نہ ہوا اور یہ پیاس اس کے میٹھے صاف پانی سے نہ بجھی۔ ہمارے وجود کا نیرنگ ہستی سے اُٹھ گیا، لیکن سر سے اس کے جمال کے عشق کی ہوس نہ گئی)

پھر فرماتے ہیں کہ اگر مریدی کی صفت سے تجلی کرے گا تو حضرت ابوعثمان حیری کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ ہوگا کہ آپ نے فرمایا تیس سال سے جو کچھ میں چاہتا ہوں وہی اللہ چاہتا ہے۔ اگر صفت بصری سے تجلی کرے گا تو ویسا ہوگا جیسا شاہ تراب علی قلندر فرماتے ہیں:

زاں روے کنوں آئینہ روے توام
کز دیدۂ تو بروئے تو می نگرم

(اب چوں کہ میں تیرے چہرہ کا آئینہ ہوں اس لئے تیری نگاہ سے تجھے دیکھ رہا ہوں)

مزید برآں اگر صفات کبریا عظمت وقہاری سالک کے دل کی ولایت پر متجلی ہوں گی تو اس نے جو کچھ پایا ہوگا گم کردے گا۔ اس پر خوف، حیرت اور دہشت طاری ہوجائے گی اور علم ومعرفت، جہل و ناواقفیت میں تبدیل ہوجائے گی، لیکن یہ جہل علم سے بھی بلند ہے۔ اسی بناپر **رب زدنی تحیراً** (میرے رب مجھ میں حیرت بڑھا) فرمایا گیا۔ اس مقام پر سالک دریا صفت ہوجائے گا۔ اس کا تمام وجود اس حدیث شریف میں مستغرق ہوجائے گا۔ تشنگی سے اس کے لب خشک رہیں گے اور آنکھیں پُرنم۔ حضرت شاہ تراب علی قلندر اسی مقام سے فرماتے ہیں:

اے لعل لبت بخونِ دلہا تشنہ
چشم تو بدیدار تو چوں ماتشنہ
ہر دم چشم بروئے تو تشنہ ست
ایں طرفہ کہ دریا شدو دریا تشنہ

(تیرے لب لعل دلوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ تیری آنکھیں تیرے ہی دیدار کو ہماری طرح تشنہ ہیں۔ ہر گھڑی میری آنکھیں تیرے دیدار کی پیاسی ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دریا، ہوکر دریا پیاسا ہے۔)

اگر صفت کبریا قہاری تجلی کرے تو موجودات پر قیامت کرے گی جیسا کہ تجلی قہاری کے ظہور میں **کل شئی ھالک الا وجھہٗ** (سورۃ القصص: ۸۸) (اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہوجانے والی ہے) اور **لمن الملک الیوم** (سورۃ الغافر:۱۶) (آج ملک کس کا ہے) کی ندا ہوگی اس وقت اور نہ کوئی پکارنے والا ہوگا نہ جواب دینے والا، لیکن صفت الوہیت اس خطاب کا جواب دے گی کہ **للہ الواحد القھار** (صرف اللہ کے لئے جو واحد وقہار ہے)۔ یہ خوب جان لو کہ اس کی راہ بغیر اس کی عنایت اور جذبہ کے نہیں ہے۔

اے دل ایں رہ بہ قیل وقالت نہ دہند
جز بردر نیستی و صالت نہ دہند
وانگاہ دراں ہوا کہ مرغاں وے اند
تابا پروبالی پروبالت نہ دہند

(اے دل! تجھے یہ راستہ قیل و قال سے نہیں دیں گے۔ نیستی کے دروازہ پر پہنچے بغیر وصال نہ دیں گے۔ اس وقت اس ہوا میں جہاں اس کے پرندے ہیں جب تک تو پروبال کی طاقت رکھتا ہے تجھے پروبال نہ دیں گے۔)

حواشی

۱- حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر علوی کا سلسلۂ نسب والد ماجد حضرت شاہ محمد کاشف چشتی قدس سرہ کی طرف سے حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم تک اور والدہ ماجدہ کی جانب سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ عم بزرگوار سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ آپ مخدوم زادگانِ کاکوری (اولادِ حضرت قاری مخدوم نظام الدین قادری عرف شاہ بھکاری، ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء تا ۸/ذی قعدہ ۹۸۱ھ/۲/مارچ ۱۵۷۴ء سہ شنبہ) کے ایک نام ور فرد تھے۔ ۱۷/رجب ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۵/اگست ۱۷۴۵ء یک شنبہ کو اودھ کے مشہور و مردم خیز قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ولایت و بزرگی اور عظمت کے نشانات بچپن سے ہی ظاہر تھے۔ عام رواج کے مطابق ابتدا سے تحصیل علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ عبد العزیز کاکوروی سے پڑھیں پھر بقیہ تمام علوم مروجہ کی تعلیم و تحصیل ملا حمید الدین محدث کاکوروی، شارح سلم العلوم ملا حمد اللہ سندیلوی اور مولانا غلام یحییٰ بہاری سے کی۔

بچپن سے ہی دنیا کی بے ثباتی کا دل پر ایسا گہرا نقش ہو چکا تھا کہ کسی چیز پر دل نہ جمتا تھا۔ یادِ الٰہی اور خشیت کا اس درجہ غلبہ ہو گیا کہ دنیاوی علائق کی طرف ذرا التفات نہ رہا۔ والد ماجد نے جوان صالح کا یہ رنگ دیکھا تو اس خیال سے ان کے ماموں مظفر الدولہ تہور جنگ بخشی ابو البرکات خاں عباسی، جو نواب شجاع الدولہ بہادر کی فوج میں بڑے عہدہ دار اور ناظم گورکھپور تھے، کے ساتھ کر دیا کہ دنیاوی بکھیڑوں میں الجھ کر شاید قلب سوزاں کی تپش کچھ کم ہو مگر وہاں بھی آپ کا دل نہ لگا۔ فوج کے ایک اور صاحب دل ساتھی شاہ مظہر حسین صاحب نے بکسر کی جنگ میں انگریزوں کی فتح اور ہندوستانیوں کی شرم ناک شکست کی واضح الفاظ میں پیش گوئی کی۔ مزید برآں ایک دن بخشی صاحب مذکور کے بھائی بخشی رفعت اللہ خاں نصرت جنگ سے حضرت سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی (۱۷/ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ/۲۳/نومبر ۱۷۸۲ء شنبہ) کا ذکر سنا اور ایسے بے قرار ہوئے کہ بغیر کسی کو اطلاع دیے وہاں سے پیدل الہ آباد کو روانہ ہو گئے۔ حضرت نے کشف باطنی سے آپ کی آمد جان کر اپنے اہل و عیال کو اس کی اطلاع دی اور خود بدولت بھی ملاقات کے اشتیاق میں ہو گئے۔ دیکھتے ہی فرمایا: "بیا بیا دورانِ باخبر در حضور ونزدیکان بے بصر دور" (آو آو، جو باخبر ہیں وہ اگر چہ جسمانی طور پر دور ہیں مگر قریب ہیں اور بے بصر اور اندھے قلوب والے نزدیک ہونے کے باوجود دور ہیں) گویا بعد مکانی کوئی چیز نہیں۔ آپ کی باطنی کیفیت اور نسبت جبی ملاحظہ فرما کر اگلے ہی روز سلسلہ عالیہ قادریہ میں مرید فرمایا اور وطن واپس جانے کا حکم دیا۔ پھر دس سال کی محنت اور سخت ریاضتوں اور مجاہدات کے بعد تمام سلاسل طریقت کی اجازت و خلافت کبریٰ سے سرفراز فرمایا اور خاندانی نعمتیں و برکات ارزانی فرمائیں۔ نیز آپ کے حق میں بہت سی بشارتیں دیں جن کا ظہور آپ کی حیات ظاہری اور اس کے بعد بھی اب تک ہوتا رہا ہے۔ حضرت شاہ ابو سعید رائے بریلوی خلیفہ شیخ محمد عاشق پھلتی خلیفہ و مرید شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہم وغیرہ نے بھی سلسلہ نقشبندیہ کی اجازت خلافت عطا کی اور اپنے اجازت نامہ میں نہایت تعریفی و توصیفی کلمات درج فرمائے۔ دنیاوی علائق سے یکسر بے تعلق رہنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر والدہ ماجدہ اور حضرت پیر و مرشد قدس سرہ کے حکم سے مجبور ہوئے، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تاکہ برکات کاظمی سے آئندہ آنے والی نسلیں بھی محروم نہ رہیں۔

کاکوری میں مستقل قیام کر کے عرفان وللّٰہیت اور اخلاق کی ایسی شمع روشن کی جس سے بکثرت گم گشتگانِ راہ، ہدایت یافتہ ہوئے۔ مسلمانوں، ہندوؤں سب کو اپنے باطنی فیوض و برکات سے مالا مال کیا۔ امرا و فقرا، سب ہی حلقہ بگوش ہوئے۔ مہاراجہ ٹیکت رائے، لالہ مجلس رائے، لالہ شتاب رائے، بنی رام، منشی فیض بخش علوی مؤرخ اودھ، ملا قدرت اللہ بلگرامی، شیخ طفیل علی فوج دار، قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں علوی، مفتی خلیل الدین خاں علوی سفیر شاہ

اودھ، حافظ معزاللہ، شیخ زین العابدین جیسے مشاہیر حلقہ بگوشوں کی ایک طویل فہرست ہے۔

درس و تدریس، تزکیۂ نفس و تجلیۂ روح اور تصفیۂ باطن میں بیش تر وقت صرف فرمانے کے علاوہ طریقت میں ایک رسالہ ''معمور داشتن اوقات'' مرتب فرمایا۔ کاکوری کے مشہور نغز گو شاعر مولوی محی الدین خاں ذوق (۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) نے اردو زبان میں اس کی شرح ''توثیق المقاصد'' کے نام سے لکھی۔ دوسری منظوم تصنیف نغمات الاسرار معروف بہ سانت رس ہے جس میں ۵ ہزار سے زائد اودھی و بھاشا کے اشعار ہیں جن میں حقائق و معارف بڑے دل نشین و موثر پیرایہ میں نظم فرمائے ہیں۔ ان میں سے نصف اشعار جد محترم بقیۃ السلف حضرت استاذی و مولائی حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی نے اپنے سلیس اردو ترجمہ و شرح کے ساتھ شائع فرمائے۔ ان کے علاوہ مریدین و طالبین کے نام فارسی زبان میں مکتوبات بھی ہیں جو ۱۳۲۸ھ میں اپنے تاریخی نام ''مفاوضات'' سے طبع ہو چکے ہیں۔

علاوہ ازیں ایک عالم کو آپ نے اپنے فیض صحبت و کیمیا نظری سے مالا مال فرمایا اور کاکوری و قرب و جوار کی فضا کو زمزمۂ حق سے معمور کر دیا۔

زمینِ تو شود عالم نمازی

ہمہ اطفال بگذارند بازی

(آپ کی برکت سے ایک عالم نمازی و پرہیز گار بن گیا بلکہ بچوں تک نے اپنی فطری جبلت کھیل کود چھوڑ کر حق کی طرف رُخ کر لیا)

آپ کے تفصیلی حالات کے لئے اصول المقصود، نجات العنبر یہ من انفاس القلندریہ، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، اذکار الابرار، تذکرۂ مشاہیر کاکوری، سخنوران کاکوری، تذکرہ گلشن کرم وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ ۲۰/ربیع الثانی ۱۲۲۱ھ مطابق ۷/جولائی ۱۸۰۶ء دوشنبہ کو تریسٹھ سال کی عمر میں کاکوری میں آپ کا وصال ہوا۔

۲- حضرت غوث ملت لسان الحق شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ کے بڑے صاحبزادہ ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد کے آئینہ کمالات تھے۔ تمام علوم متداولہ کی تعلیم و تحصیل اپنے زمانے کے اکابر علما سے حاصل کی۔ والد ماجد سے مکمل تربیت باطنی اور تصوف کی تعلیم حاصل کی اور صغر سنی سے ہی خاندانی اذکار و اشغال اور ریاضات و مجاہدہ کے پابند ہو گئے۔ خانقاہ کے تمام امور کی انجام دہی بھی والد محترم نے آپ کے سپرد فرمائی۔ ظاہری و باطنی تعلیم سے فراغت کے بعد والد ماجد کے مرشد زادہ حضرت شاہ مسعود علی قلندر الہٰ آبادی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور والد ماجد کے وصال ۱۲۲۱ھ کے بعد سجادۂ کاظمیہ کو زینت بخشی اور ایک طویل عرصہ تک (۴/جمادی الاول ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۰/دسمبر ۱۸۵۸ء جمعہ) ایک عالم کو فیض یاب فرمایا۔

شاہ تراب علی قلندر تراب کاکوروی کے پہلے فارسی، اردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہیں جن کا کلام متعدد مرتبہ شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ آپ نے اودھی زبان میں بھی ٹھمری، دوہے وغیرہ منظوم فرمائے جن میں پریم رس کو بڑے سلیقہ سے بیان فرمایا۔ یہ کلام حضرت استاذی و مرشدی مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ کے عالمانہ و عارفانہ مقدمہ کے ساتھ ''امرت رس'' کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ شاعری کے علاوہ آپ نے بیش بہا مصنفات کے ذریعہ بھی ایک عالم کی اصلاح و تربیت فرمائی جن میں اصول المقصود، مجمع الفوائد، فتح الکنوز، مقالات الصوفیہ، اسناد المشیخت، مطالب رشیدی، کشف المتواری، شرائط الوسائط، مجاہدات الاولیاء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مطالب رشیدی فلسفہ اخلاق میں بے حد جامع و مفید عام و خاص تصنیف کی ہر دور میں ضرورت و اہمیت افادیت رہی۔ حضرت مرشدی و ملجائی و قبلتی مولانا شاہ محمد مصطفیٰ حیدر قلندر عطر اللہ تعالیٰ مضجعہ الاطہر نے اس کا سلیس اردو ترجمہ فرمایا جو دو مرتبہ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ شرائط الوسائط، طریقت، اس کے اصول و ضوابط اور آداب کے ضمن میں ایک اہم ترین تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ استاذی و مرشدی وجدی حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی نے فرمایا جو زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوا ہے۔

مقالاتِ صوفیہ کا اردو ترجمہ برادر عزیز مولوی حافظ شبیب انور عرف عمیر حیدر سلمہ نے کیا ہے، چھپ چکا ہے۔ فتح الکنوز کو اردو زبان کا پیرہن راقم سطور احقر کے ذریعہ ملا۔ واللہ ولی التوفیق۔ ۱۲ منہ

❁❁❁

مکتوبات اشرفی ایک نظر میں

ڈاکٹر محمد موصوف احمد اشرفی .... شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت سید مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رضی اللہ عنہ، ولادت ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء وفات ۲۸ محرم الحرام ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء بمقام کچھوچھ، ضلع فیض آباد (امبیڈکر نگر، یوپی) سمنان کے سلطان تھے۔ سلسلۂ نسب، سادات نوربخشیہ سے جاملتا ہے۔ آپ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "مادرزادولی تھے اور علم لدنی کے دروازے آپ پر کشادہ تھے۔" سات قرأت کے ساتھ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف کا حفظ مکمل کیا۔ چودہ سال کی عمر میں تمام علوم منقول و معقول سے فارغ التحصیل ہوئے اور صحاح ستہ و دیگر احادیث کی کتابوں کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ والدگرامی سلطان سید ابراہیم نوربخشی کے وصال کے بعد سلطنت کے اراکین نے آپ کو تخت پر بٹھایا۔ باوجود سلطنت کی ذمہ داری نبھانے کے، آپ کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ آپ اکثر شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی، شیخ اصیل الدین قیلوی اور دیگر مشائخ وقت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت خضر علیہ السلام سے متعدد بار بالمشافہ ملاقات رہی۔ انہوں نے آپ کو چودہ سلاسل سے خلافت واجازت بیعت عطا کی۔ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی نماز جنازہ آپ ہی نے پڑھائی۔ مخدوم اشرف نے اپنے زمانے کے تمام (۱۹۲) مشائخ وقت شیخ جلال الدین بخاری، شیخ علاء الدولہ سمنانی، میر سید علی ہمدانی، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، میر صدر جہاں، شیخ مبارک گجراتی، خواجہ حافظ شیرازی، شیخ رکن الدین شہباز، سید تاج الدین اودھی، شیخ عبدالملک وغیرہ کی صحبت پائی، ان سے فیض یاب ہوئے اور ان میں سے بعض مشائخ کی تربیت بھی کی۔

آپ کی بزرگی اور مناقب میں مرآۃ الاسرار کے مصنف شیخ عبد الرحمن چشتی رقم طراز ہیں:

"آن سلطانِ مملکت دنیا و دیں۔ آں سر حلقہ عارفانِ ارباب یقیں، آں محبّ ومحبوب خاص ربانی، غوث الوقت حضرت میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ۔ آپ یگانۂ روزگار تھے اور شانِ رفیع، ہمت بلند، کرامات وافر کے مالک تھے۔"

میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی کا بیشتر حصہ بنگال (پنڈوہ شریف) اور اودھ میں گزرا۔ سیر وسیاحت سے غیر معمولی دلچسپی رہی۔ تقریباً تیس سال تک سفر میں رہے۔ آپ نے ایک سفر "مسکون" کا ہمراہ، میر سید علی ہمدانی کیا۔ متعدد بار دنیا کا سفر کیا اور مختلف شخصیات ومخلوقات سے ملاقات کی اور ہم کلام ہوئے۔ میر سید اشرف شیخ علاء الحق والدین پنڈوی چشتی قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلسلہ مشیخت وہدایت کو آپ ہی نے ازسرنو زندہ کیا۔ آپ کثیر تصانیف بزرگ ہیں۔ مکتوبات اشرفی اور لطائف اشرفی کے علاوہ درجنوں کتابیں آپ سے منسوب ہیں۔ مثلاً شرح فصوص الحکم، شرح ہدایہ (فقہ)، شرح عوارف المعارف، نحو اشرفیہ، فتاویٰ اشرفیہ، تفسیر نوربخشیہ، رسالہ غوثیہ، مرآۃ الحقائق، ترجمہ قرآن پاک بہ زبان فارسی، رسالہ تصوف واخلاق، رسالہ قبریہ وغیرہ۔

غوث العالم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کی غیر معمولی تصانیف میں لطائف اشرفی کو جو شرف قبولیت حاصل ہوا، ان کی دیگر تصانیف کو نہیں ہوا لیکن ان کی دوسری اہم تصنیف مکتوبات اشرفی ہے۔ مکتوبات اشرفی کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں ایک طویل خط مخدوم صاحب کے مکتوبات سے من وعن نقل کیا ہے۔ یہ خط قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام رقم کیا گیا ہے۔ یہ خط فرعون کے حالت ایمان پر مرنے کے استفسار کے جواب میں ہے۔ مکتوبات اشرفی کے اس خط پر اخبار الاخیار کے مصنف نے سکوت اختیار کیا ہے۔

مکتوبات اشرفی کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے تمام مشاہیر علما ومشائخ، بادشاہ وقت، امرا مثلاً قاضی شہاب الدین دولت

آبادی، سلطان ابراہیم شاہ شرقی، نور قطب عالم پنڈوی، ہوشنگ خاں، سالار سیف الدین انچولی، صیف خاں حسام الدین، مولانا علاّم الدین جائسی، شیخ رکن الدین جونپوری، میر صدر جہاں، شیخ عبد الملک، شیخ عمر، شیخ عثمان شیخ رضی، شیخ کبیر، شیخ راجا، مولانا کریم الدین ردولوی، ملک محمود، شیخ خیر الدین انصاری وغیرہ کے استفسار پر تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ مکتوبات سید اشرف جہاں گیر سمنانی کا گراں قدر سرمایہ ہیں جنہیں آپ نے اپنے ارادت مندوں کی طرف سے بھیجے گئے دقیق مسائل کے استفسار کے جواب میں رقم کیا ہے۔ یہ خطوط مشکل مسائل دینی و دنیوی امور کے حل کے لئے آپ نے عنایت فرمائے ہیں۔

مکتوبات اشرفی کے جامع اول آپ کے اہم خلیفہ حضرت نظام الدین یمنی ہیں۔ آپ ۷۵۰ھ میں مخدوم صاحب کی بیعت ارادت میں داخل ہوئے۔ جامع ثانی، جانشین مخدوم اشرف سیدنا عبد الرزاق نور العین ہیں۔ مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی کے مکتوبات کا مطالعہ حق تعالٰی کی شانِ ربوبیت اور تصوف کی رمزیت و ماہیت اور ایمائیت کو سمجھنے کا موثر ذریعہ اور نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ ان مکتوبات میں صوفی کے قلب کی تسکین کا سامان، سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو و آرزو کے مقاصد کا حصول شامل ہے۔ علمائے وقت کے اصرار و تقاضے پر بعض دقیق فقہی اور صوفیانہ مسائل کے علاوہ مشکل اشعار کی تعبیر و توجیہ بھی مخدوم پاک نے فرمائی ہے۔ مثلاً خواجہ امیر خسرو کے شعر، ابوسعید ابوالخیر کی رباعی اور شیخ شرف الدین پانی پتی کے بیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ذیل میں خسرو کے ایک شعر کی تعبیر و تشریح مخدوم صاحب کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے:

زدریائے شہادت چوں نہنگ لا برآرد ہو
تیمّم فرض گردد نوح را در عین طوفانش خسرو

”جاننا چاہیے کہ متقدمین میں سے فضلائے روزگار کے اشعار کے مضمون اور شعرائے متقدمین کے گفتار کا مفہوم صوفیہ کے مشارب میں سے ایک مشرب ہے۔ پیش کردہ اشعار کی ترکیب اور ان ابیات کی غرض سمجھنے کے لئے اولاً اس گروہ کے اصطلاحات کو سمجھنا پڑے گا۔ کیوں کہ بغیر اس کے مقصود و مفہوم کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

دریائے شہادت سے مراد موجوداتِ عینیہ ہیں۔ جب دریائے محیط نہایت نہیں رکھتا تو اس کے مقابلے میں ہُو آتا ہے اور یہ عالم غیب سے عبارت ہے۔ نہنگ اضافتِ بیانیہ ہے۔ ماسوا الٰہی کی نفی اور نامتناہی کا نقش کھینچنا ہے۔ ہر وقت موحد موجودات کے آئینہ سے رخسارۂ وحدت کے مشاہدہ اور حجلۂ کائنات سے عذارِ حقیقت کے مشاہدہ میں استغراق حاصل کرتا ہے۔ اس استغراق سے ایک قسم کی رائی و مرئی رخسار و آئینہ سے قائم ہوتی ہیں۔ جسے شعر میں تیمم کہا گیا ہے تیمم کے معنی بمقتضاء فتیمموا صعیداً طیباً خاک کی طرف (قصد اور) توجہ کرنا ہے اور وہ خاک جمیع مکنونات عینیہ و خارجیہ کی بنا ہے۔ اس سے مراد وحدت ذاتیہ اور صرف 'ہُوِیہ' ہے۔ پس موحد کے لئے ضروری ہے کہ ظہور صفاتیہ کے اعتبار سے جمیع مکنونات میں اسے دیکھنا اور جاننا ہے کہ اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے اور اس کے علاوہ کوئی مشہود نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو اسما و صفات کی صورت سے ظاہر ہے اور اس (مقام پر) کے سوا کوئی موجود حقیقی نہیں جس کا مشاہدہ کیا جائے۔ بلکہ وہی ہے جو بصورت اسماء و صفات ظاہر ہے۔ بذات واجب و لازم ہے اور صورت و پیکر سے منزّہ اور معرّا ہے۔

نوح عبارت ہے صاحب مشاہدہ کی ذات سے۔ فرض وقت ہے کہ دریائے ظہور کے عین مشاہدہ کے وقت خاک احدیت سے تیمم کر کے پاک ہونا ہے یعنی ذاتِ احدیت کو جاننا، پس موحد تمام اوقات میں باہمہ یا بے ہمہ کی کشاکش سے آزاد ہوتا ہے مگر جس وقت فنا کی موج آتی ہے، اوج بقا کا تلاطم اسے اچک لیتا ہے اور موج سے باہر کر دیتا ہے اور بقا کی بے خودی جو فناء الفناء کے طوفان سے اٹھتی ہے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔

دوسرا معنیٰ اصحابِ شغل و اربابِ عمل کے مطابق یہ ہے کہ دریائے شہادت سے مراد اشھد ان لا الہ الا اللہ ہے کیوں کہ جب طالب صادق نفی و اثبات کے کلمہ میں تکرار پر مداومت ظاہر کرتا ہے اور اس کے معانی پر غور و فکر کے ذریعے ماسوائے حق کے سب کو دیکھتا ہے اور بجانب اثباتِ ذاتِ مطلق کی بقا دیکھتا ہے، تو کثرت سے انوار الٰہی کے مقصود کا ملاحظہ کرتا ہے۔ جیسا کہ طالب صادق اس مشہود میں شرف فنا سے مشرف اور ذاکر واثق اس وجود میں عرف ہباسے معرف ہوتا ہے اور نوح سے مراد بھی صاحبِ مشاہدہ ہے کہ جو دولتِ فناء الفناء تک پہنچا

ہے، بمقتضائے فتیمموا صعیداً اس وقت اس پر فرض ہے کہ فناء الفناء کے عین میں بقا کی طرف رجوع کرے کہ خاک اسی سے عبارت ہے یا اس دولت سے جو اس نے پائی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مبادا وہ تجلی اس کے لئے مستقل ہو جائے اور وہ مجذوب بن کر رہ جائے کہ اس کے ذریعے سالکان راہ کی تربیت نہ ہو سکے۔ کیوں کہ سالک جب تک راہِ سلوک طے کر کے شرف جذبہ سے مشرف نہ ہو، دوسرے سالکوں کی رہنمائی نہیں کر سکتا اور بحرِ نزول سے ساحل شعور تک نہیں پہنچ سکتا اور بغیر اس دریا کا غوطہ کھائے ہوئے عین ثابتہ سے نکل کر واصل بحق نہیں ہو سکتا اور انا جعلناک خلیفه کے بمصداق تخت خلافت پر متمکن نہیں ہو سکتا، سے ارباب طلب کی ہدایت میسر نہیں آ سکتی۔

۳۹ ویں مکتوب کا موضوع حضرت ابوسعید ابوالخیر کی رباعی کے معانی و مطالب پر مبنی ہے۔ یہ مکتوب صدر الدین کی جانب سے استفسار کے جواب میں رقم کیا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر کی ۸۰ سے زائد (بیش تر) رباعیاں کسی نہ کسی مسئلے کی عقدہ کشائی کا بدل ہیں۔ لوگوں نے آپ کی رباعیات کی برکت سے بہت ساری مصیبت اور پریشانی سے نجات حاصل کی ہیں۔ مخدوم اشرف کا ارشاد ہے کہ ''اس کا گوہر ہر شخص پر روشن نہیں ہوتا ہے۔'' یعنی آپ کی رباعی کی تفہیم و تعبیر او رتشریح ہر کس و ناکس کے بس سے باہر ہے، جو ہری اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ ذیل میں ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی رباعی اور اس کے مطالب پیش کیے جاتے ہیں:

حورا بنظارہ نگارم صف زد — رضوان زتعجب کفِ خود بر کف زد
یک خال سیہ برآں رخان مطرف زد — ابدال زبیم جنگ در مصحف زد

یہ رباعی ارتفاع علل و انقماع خلل کے لئے ہے۔ یعنی اس رباعی کی برکت سے بیمار صحت مند ہوتا ہے، جو کوئی کسی مصیبت یا پریشانی بشمول علالت میں مبتلا ہو تو یہ رباعی پڑھے، صحت یاب ہوگا اور اسے فیض حاصل ہوگا۔ ذیل میں مخدوم صاحب نے اس رباعی کے جو مطالب و معانی بیان کیے ہیں وہ نقل کیے جاتے ہیں:

حورا: اس سے مراد روحانیہ ملکیہ ہے

نگار: اس سے مراد روحانیہ انسانیہ ہے کہ روحِ انسانی و پیکر روحانی وصال یار کے شوق میں زیبائے پرستہ کا نگار و عنائے پیوستہ کا شعار بن کر عروسانِ عرصۂ فلک و فرشتگانِ عرصۂ ملک کی صفوں میں صف بنائے کھڑی ہے۔

رضوان: اس سے مراد کشورِ بہشت کے معمار و حورانِ نیک سرشت لشکر کے سردار ہیں۔ یہ سب روحِ انسانی کا مرتبہ کمال دیکھ کر اور جسمِ انسانی کا حسن و جمال دیکھ کر نہایت حیرت و غایت سے دست بر دست اور کف پر کف مارتے ہیں۔ فقرِ محمدی ہے کہ روحانیہ انسانیہ محبوبیہ کے خال کے رخسار سے مستعار ہے۔ **لقوله علیه السلام الفقر سواد الوجه الدارین** ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق کہ فقر دارین میں چہرے کی سیاہی ہے۔ جب سالک صادق کے لئے راہِ سلوک میں عدم سے درجہ نہایت کچھ شرائط کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی اور طالب واثق کے لئے درگاہِ سلوک میں نقد سے رتبہ غایت کچھ وسائط سے واصل نہیں ہوتی، تو اس وقت کمال درجہ کی موت اس کے حال کے تقاضا کے مطابق اسے اشارہ دیتی ہے تاکہ وہ اپنے عین ثابتہ کے خورشید صفت زدہ سے اور صورِ علمیہ کے بحر جاوید مثال کے قطرہ سے پیوست ہو جائے اور عیانِ موجودات میں سے ہر عین، صورت ہائے ممکنات میں سے ہر صورت، کل عین ثابتہ مصطفوی میں سے جز اور جملہ صور علمیہ نبوی میں سے ریزہ ہو جائے۔ ہر گاہ کے طالب درویش کی آخری منزل اپنے عین ثابتہ تک رسائی ہے۔ کیوں کہ کل شئ یرجع الی اصله (ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) اس سے عبادت ہے۔ دستِ پیوند خالی کو چہ ہے کہ اس نے اپنے حصول روحانیہ کے رخسار پر رکھا ہے اور نقطۂ مثال ہے کہ اس نے اپنے حصول کے عذار پر رکھا ہے۔

ابدال: اس سے مراد وہی روحانیہ ہے اور لفظ ابدال کا اطلاق اس کی حالت کی تبدیل و تغیر کی بنا پر ہے کہ رتبہ ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کو پہنچی یا باعتبار درجہ ابدالیہ کے لئے، کیوں کہ اس طائفہ (مخدوم اشرف) کے نزدیک یہ رتبہ بہترین مراتب اور خوب ترین مناصب میں سے ہے۔ اس کی روحانیہ کو ابدال کہا ہے۔

مصحف: اس سے مراد اس روحانیہ انسانیہ کا مرتبہ جامعیہ و درجہ مثالیہ کا وصول ہے۔ تفرقہ کے خوف سے نکلی اور اپنی جمع وحدت سے موصوف ہوئی۔ اس حالیہ جمعیت کو مصحف کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر بشر جو اس کتاب کی آیت تلاوت کرتا ہو وہ اس راز سے ضرور واقف ہوگا۔

پس جو کوئی بیمار کے لئے اس رباعی کو پڑھے گا، تو اسے فرحت حاصل ہوگی اور بے تابی و پریشانی کے لئے جو کوئی پڑھے گا تو اسے ضرور مسرت حاصل ہوگی اور یہ قاعدہ حکمائے سالفہ واطبائے بالیہ کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ بیمار کے لئے مسرت وفرحت موجب صحت ہے۔لقولہ علیہ السلام " لقاء الخلیل شفاء الخلیل" ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ''دوست کی ملاقات دوست کے لئے شفا ہے۔''[۲]

مکتوب نمبر ۳۱ شرف الدین پانی پتی رحمۃ اللہ کے معانی بیت (شعر) سے متعلق ہے۔ اس مکتوب میں بھی حضرت کے دوسرے مکتوب کی طرح شعر کے مطلب کی وسعت اور گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے کہ کس طرح آپ نے بیت کی تشریح وتعبیر کی ہے:

چندانکہ از روئے تو در سینہ جای کرد
واللہ کہ آرزوئے خدایم محقر است

ترجمہ: جس قدر تو نے اپنی آرزو کو سینہ میں رکھا ہے واللہ کہ میرے خدا کی آرزو مختصر ہے۔

ہر چند کہ آں حضرت مرتبہ واحدیت میں اپنے اندر کمالاتِ اسما وصفات، اجمال وتفصیل میں ظہور علمی رکھتے ہیں۔اگر چہ وہ درگاہ اسمائے الٰہیہ میں اور اپنے درجات کہنے میں وجوب وامکان کو پہنچا ہے۔لیکن یہ کمال ظہور ارواح، مثال، اجسام واشباح میں سے ہر ایک انسان کامل کے مظہر کے خاصہ میں سے ہے۔ یہ اتصال کہاں سے ہوگا کہ صدور اشباح وخیال واحتشام جمعیت برزخیہ کا خاصہ ہے۔لکل مقام معلوم (ہر ایک کے لئے مقام معلوم ہے) سے اسی کی جانب اشارہ ہے۔''[۳]

سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے جملہ ۷۴، مکاتیب جو اصحاب کو تحریر کیے گئے، انہیں دریائے معرفت کا دُرّ نایاب اور درجات عالیہ کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔عرض کیا جا چکا ہے کہ مکتوب اشرفی کے جامع اول حضرت اشرف کے خلیفہ اور مرید خاص حضرت شیخ نظام الدین یمنی ہیں اور جامع ثانی حضرت کے جانشین اول مخدوم الآفاق سید عبدالرزاق نور العین ہیں۔ مکتوب کا مخطوطہ آج بھی کچھوچھہ شریف کے سجادہ نشین اور بسکھاری شریف کے سجادگان کی ملکیت میں محفوظ ہے۔اس کے علاوہ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مخطوطہ کلکشن میں محفوظ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام مخطوطات کا تقابلی جائزہ لے کر اس کی تصحیح کر لی جائے اور صحیح متن کے ساتھ مع ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ مخدوم اشرف کے مخفی اسرار ورموز تک عوام وخواص کی رسائی ممکن ہو سکے۔

مکتوبات اشرفی کی اہمیت کا سبب یہ بھی ہے کہ ان خطوط کے ذریعے آپ نے اکابر صوفیائے کرام کی تعلیمات کو عام کیا۔ سلطان الوقت اور مشائخ عظام اور مقربین الٰہی کے اشکال وابہام اور مسائل کا تدارک فاصلاتی نظام تعلیم (Distance Education) کے ذریعہ کیا۔آپ نے ان خطوط میں اپنے پیش رو اولیائے کرام مثلاً خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بالخصوص خواجہ نظام الدن اولیاء اور شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کے اسلوب کو اپنایا اور ان کے طرز اظہار وبیان کو منبع تسلیم کیا اور ان میں قیمتی گوہر تزئین کیے۔ قرآنی متشابہات اور متصوفانہ متشابہات واشعار کا کثرت سے استعمال کیا۔ ہوشنگ خان کے نام مکتوب میں مخدوم اشرف نے انہیں سلطنت کے امور سے متعلق چند مفید مشورے دیے، نقل کیا جاتا ہے:

'' اے بھائی دولتِ خلافت، خلافت ہائے معنوی میں سے ایک صورت ہے۔ کیوں کہ اس کی خلعت غوثِ روزگار کے قدم زیبا پر ہے اور شوکتِ سلطنت، منزلت کی دس نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ کیوں کہ اس کا علم قطب ادوار کے قدم پر ہے۔ پس اس دولت کو نعیم سنی (عمدہ) میں سے ایک نعمت اور اس شوکت کو ولیم ہنی (نفیس) میں سے ایک وسیلہ شمار کرنا چاہیے، کیونکہ ہر سر اُس میں نہیں ہے اور قبا ہر ایک پر نہیں ہے۔

امیر جو کہ پیشوائے قوم ولشکر ہوتا ہے اسے چاہیے کہ لذات و شہوات سے اپنے آپ کو بچائے اور حتی الامکان شعار اسلام کی پابندی کرے۔ خاص طور پر شراب نوشی سے پرہیز کرے، کیوں کہ اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے اور رائے ثاقب اور فکر صائب کے سوا اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے۔ ہر معاملات میں نہایت ہی چاق وچوبند رہے۔

تمام مہمات ومصالح میں سرکردہ گروہ سے مشاورت ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ " وشاورھم فی الآمر'' اور معاملات میں باہم مشورہ کریں۔ جب کسی کام پر

باہم اتحاد و اتفاق ہو جائے تب اسے نافذ کرنا چاہیے۔

امت کی تعلیم کے واسطے انبیائے کرام نے مشورہ کیا ہے۔ تفہیم زمرہ کے لئے اصفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ اجمعین نے رائے طلب کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے استصواب رائے مستحب ہے اور اس کے ذریعہ کام بہتر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسانی عقول متفاوت ہیں۔ افکار بشری متجاوز الادراک ہیں اور فہم خلق ایک دوسرے کے مغائر ہے۔اس لئے اس میں سوچنے کا موقع مل جاتا ہے۔'' ۴

۳۲واں مکتوب ساداتِ ہند کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔آپ نے اس خط میں برصغیر ہند و پاک کے تمام سادات کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ تقریباً ۳۰ سے زائد مقامات کے سادات اور اس کے علاوہ دیگر سادات کرام جو مختلف جگہوں پر بسے ہوئے ہیں، ان سب کے حسب و نسب پر مخدوم صاحب نے کلام کیا ہے اور ان سب کا آئینہ پیش کیا۔مکتوب ہذا کے حوالے سے ذیل میں کچھ سادات کا ذکر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

۷۔ از آں جملہ سادات سامانیہ جو کہ مشہور النسب ہیں۔ یہ سب سلطان محمد توختہ کی اولاد سے ہیں۔

۸۔ از آں جملہ سادات گیسو دراز کہ ان کا سلسلہ حضرت محمد گیسو دراز سے ملتا ہے اور لقب گیسو دراز کا، ہند سے نہیں بلکہ ولایت سادات سے آیا ہے۔ غایتِ عالی شان کی تصنیفات راتبہ و تالیفات لائقہ اخبر تصانیف حضرت میر کی ہے۔ جس میں انہوں نے وحدتِ وجود مطلق میں کچھ اشارہ حضرت فصوص الحکم (ابن عربی) کی نسبت کیا ہے۔ فقیر نے اس میں کچھ تغیر مزاج بھی کیا ہے اور کچھ دلائل عقلیہ و نقلیہ جو ان میں نہیں تھے، حضرت امیر تیمور کے سامنے ظاہر کیا۔ ان کے سیر میں اصلاح کیا ہے۔ اول سیر کہ بجانب حضرت میر ہے اور سیر ثانی حضرت شاہ ید اللہ و شاہ صفی اللہ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے۔

۹۔ از آں جملہ ساداتِ نوہتہ جو مشاہیر روزگار و معارف ہر دیار میں سے ہیں۔ کشف و کرامات میں سلاطین و خواتین کے نزدیک مقبول الطوائف ہیں۔

۲۳۔ طبقہ دیگر سادات حسینان امام حسن مثنیٰ کی اولاد ہیں، فرزند الآفاق، سید عبد الرزاق (نور العین) مدعمرہ انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔'' ۵

حاصل کلام یہ ہے کہ مکتوب اشرفی میں کل ۷۴ مکاتیب ہیں۔ علاوہ ازیں خاتمہ، تتمہ اور تکملہ بھی ہے۔ ابتدا میں مقدمہ بھی مشمول ہے۔ میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے خطوط کی اہمیت و معنویت کا اندازہ عہد سلطنت کے ان جلیل القدر مشائخ، صوفیا، علما، بادشاہ اور امرائے وقت کے ناموں سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن کے استفسار کے جواب میں یہ خطوط ارسال کیے گئے ہیں۔ شعرا کے اشعار کی رمزیت، ایمائیت اور تعبیر و تشریح کا معاملہ ہو کہ علوم ظاہر و باطن، منقول اور معقول کے دقیق مسائل کی عقدہ کشائی، بادشاہت وقت کی مہم جوئی اور عدل و انصاف کا واقعہ ہو کہ فتح و نصرت اور سلطنت کے فروغ کا مسئلہ، ان سب پر مخدوم اشرف نے خامہ فرسائی کی ہے اور ان سب اکابر روزگار کی رہبری و رہنمائی کی ہے۔ فاصلاتی تعلیم کو عام کرنے اور رواج دینے میں یہ خطوط میل کے پتھر ثابت ہوئے۔

بلاشبہ مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ایک عبقری شخصیت بن کر نمودار ہوئے اور اپنے علم، عمل، کردار، خدمت خلق اور خلق کی حاجت روائی کے سبب مخدوم العالم، غوث العالم اور محبوب یزدانی کے مرتبے پر پہنچے۔ آپ نے تصوف اسلامی اور سلسلہ مشیخت چشتیہ کا احیا کیا اور ایک نیا سلسلۂ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی تعلیمات و ہدایات کو مستحکم اور عام کرنے کے لئے درگاہ رسول پور کچھوچھہ شریف کو مرکز رشد و ہدایت عطا کیا۔ آپ کا آستانہ آج بھی حاجت مندوں کے لئے باعثِ رحمت و برکت ہے۔

لیک انار باغِ سمناں را
لذتِ دیگر است از ہر جای

حوالے

۱۔ مکتوب نمبر ۲۳۔ مکتوبات اشرفی حصہ اول، ص: ۱۵۹ تا ۱۶۲، ترجمہ: حضرت مولانا عبد الستار صاحب۔

۲۔ مکتوبات اشرفی: ترجمہ شاہ محمد ممتاز اشرفی، ص: ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲۔

۳۔ مکتوب نمبر ۳۱، ص: ۳۲۳۔۳۲۴ ترجمہ: ممتاز اشرفی

۴۔ بحوالہ مکتوبات اشرفی، بنام ہوشنگ خان، ص: ۲۹۴۔۲۹۵

۵۔ مکتوب اشرفی، مکتوب ۲۳، ص: ۳۳۶

○○○

عصر حاضر میں مثنوی معنوی کی اہمیت

پروفیسر لطف الرحمن .... بھاگل پور، بہار

عصر حاضر صنعتی تمدن سے عبارت ہے۔ صنعتی تمدن سائنس کا زائیدہ ہے۔ سائنس ایک تجربی علم ہے۔ حقیقت پسندی اس کا مزاج ہے۔ معروضیت اس کی فطرت۔ صنعتی تمدن نے ایک بورژواژی معاشرے کی تشکیل کی، جس کا بنیادی مقصد حصول زر، حصول اقتدار اور تفریح وتفنن ہے۔ بورژواژی سماج نے اپنی تعمیر کے لئے ایک دیوہیکل سماج کو جنم دیا، جس نے اجتماعی انسان پیدا کیے۔ انفرادیت معدوم ہوگئی۔ سائنس کی انتہا پسندی یعنی سائنسیت نے صنعتی تمدن کو میکانکی تمدن میں بدل دیا، جس نے انسان کی بنیادی فطرت کو کچل دیا۔ آدمی ایک حساس منفرد وجود کی بجائے ایک شے یا چیز بن کر رہ گیا۔ جو بازار میں خرید وفروخت کی ایک جنس ہے۔ آج آدمی نیم انسانی، نیم حیوانی یا اشیا کی سطح پر جینے پر مجبور ہے۔ آدمی کی حیوانی جبلتیں بے لگام ہو چکی ہیں۔ عصر حاضر تشدد کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ جدید معاشرے کا ایک دل خراش المیہ یہ ہے کہ تشدد کو عالمی سطح پر دستوری وآئینی حیثیت حاصل ہے۔ جس نے دہشت گردی کو عام کر دیا ہے۔ دہشت گردی مختلف سطحوں پر روزانہ ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کا سبب بن رہی ہے۔ مذہبی دہشت گردی، تہذیبی دہشت گردی، لسانی دہشت گردی، سرکاری دہشت گردی، اکثریت کی دہشت گردی اور ایٹمی دہشت گردی، جن میں سے بعض کو یو این او کی تائید وتوثیق حاصل ہے۔

عصری معاشرے پر اس تمام صورت حال کا بے حد منفی اثر مرتب ہوا ہے۔ آدمی اپنی داخلیت اور اپنے باطنی وجود سے محروم ہوگیا ہے۔ جس نے اس کو ایک چلتی پھرتی مشین بنا دیا ہے یا ایک بڑی مشین کا چھوڑا سا پرزہ۔ مشین۔ ''جو ایک محدود دائرے میں حرکت پر مجبور ہے۔ مشین کوئی زندہ دھڑکتا ہوا وجود نہیں رکھتی۔ نہ وہ خواب دیکھ سکتی ہے اور نہ اس میں جذبہ محبت اور تخلیقی اپج کی صلاحیت ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر آزادانہ عمل وحرکت سے قاصر فرد کسی جماعت یا گروہ میں ضم ہونے پر مجبور ہے۔ وہ داخلیت اور انفرادیت سے محروم تقلید اور CONFORMITY کی راہ پر چل رہا ہے۔ نتیجتاً ہر شئے سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا ہے۔'' (جدیدیت کی جمالیات صفحہ ۱۶۹)

آدمی ایک داخلی، وجدانی، احساساتی اور جمالیاتی وروحانی وجود بھی ہوتا ہے۔ موجودہ میکانکی معاشرے میں جس کی مکمل نفی ہوگئی ہے۔ آدمی کی داخلی شخصیت کا رشتہ مذہب اور ادب سے تھا۔ مذہب کے ماورائی افکار نے اخلاقی اور روحانی قدروں کی تشکیل کی تھی۔ ادب کے تخیلی رجحان نے جمالیاتی قدروں کو فروغ دیا تھا۔ سائنس کی معروضیت، خارجیت اور حقیقت پسندی نے ان دونوں عظیم الشان انسانی اداروں کو معنویت سے محروم کر دیا۔ مذہب رسم وروایت اور ادب تفریح وتفنن کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ نتیجتاً انسانی مستقبل اپنی معنویت اور اپنے امکانات سے محروم ہو چکا ہے۔ یعنی مستقبل پر موجودہ نسل آدمی کا یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ بے معنی مستقبل بے حد خطرناک شے ہے۔ لیکن بے یقین مستقبل تو زوال انسانیت کی علامت ہے۔ اس میں کسی شک اور شبہے کی گنجائش نہیں کہ اکیسویں صدی عدم انسانیت کا استعارہ بنتا جا رہا ہے۔ عدم، عدم، عدم — قیامت کبریٰ۔

موجودہ نظام زر میں انسان کی باطنی باز آبادکاری وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ سائنس، چاند، سورج اور زہرہ ومریخ کی سیاحی کرا سکتی ہے، لیکن باطنی کائنات کی بے کرانیوں کی سیاحی صرف مذہب اور ادب کے ذریعہ ممکن ہے۔ کسی بھی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تنظیم نو کے مقابلے میں آج آدمی کی بنیادی ومرکزی ضرورت روحانی بیداری اور داخلیت کی باز آبادکاری ہے۔ اس راستے کی تلاش آج وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، جو انسان کو اس کی حیوانی جبلتوں کی بھول بھلیوں سے نکال کر خیر اور معصومیت ونیکی کی منزلوں کی طرف گامزن کر دے۔ انسانی تاریخ داخلی آزادی اور روحانی تجلیوں کی مسلسل کوششوں سے

عبارت ہے، حضرت عیسیٰ مسیح اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جوملکوتی روشنی انسانی نسلوں تک پہنچی ہے، وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جس نے انسان کواپنی ذات کے عرفان کی توفیق وجرات بخشی تھی۔ موجودہ مادہ پرست سماج میں اس ملکوتی روشنی کو بیکار اور فضول شئے سمجھ کرنظرانداز کردیا گیا ہے۔

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ انسانوں نے مادی اور فطری وسائل کواپنی خواہشوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے میں بے پناہ کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن انسانی رشتوں کومضبوط اور بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ آج انسانوں کا باہمی شخصی رشتہ اقتصادی و مادی مفادات پر مبنی ہے۔ جس نے بے چہرہ انسانی بھیڑ پر مشتمل معاشرے کوفروغ دیا ہے۔

اس پس منظر میں مثنوی معنوی مولوی کی بے پناہ اہمیت ہے۔ امریکہ کے میکانکی تمدن میں رومی کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ امریکہ جدید میکانکی تمدن کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ المیہ یہ ہے کہ امریکہ کے لوگ نیم انسانی یانیم حیوانی سطح پر جی رہے ہیں۔ آدمی کا خارجی وجود سب کچھ نہیں۔ اس کا داخلی وجود بھی ہوتا ہے جوزیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی نفی عالم انسانیت کی مکمل تباہی وبربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مقام مسرت ہے کہ امریکیوں میں بھی داخلی وجود کروٹیں لینے لگا ہے۔ اسپین (SPAN) مئی، جون 2005 کے شمارے میں انجم نعیم کا مضمون ---- ''امریکہ میں صوفی ازم کی روایت'' امریکیوں کی بدلتی ہوئی روش زندگی کا ایک روشن ثبوت ہے۔ اسلام کے تصور اخوت ومحبت اور انسانی ہمدردی و یگانگت کے احساس کورومی کے متصوفانہ تجربات کی روشنی میں عام شہریوں سے روشناس کرانے کی مستحسن کوشش اس مضمون کی خصوصیت ہے۔ امریکہ کے جدید ترین میکانکی معاشرے میں انسانی اتحاد واخوت اور روحانی روایت کا نیا مکالمہ مثبت نتائج کا حامل ہے۔ جومشرق ومغرب کے درمیان داخلی افہام وتفہیم کے ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب اور خاص طور پرامریکہ میں اسلام کی معاشرتی، سیاسی اور داخلی و روحانی تعلیمات کی تفہیم و آگہی روز بروز مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ یقین ہے کہ رومی کی صوفیانہ روایت اور روحانی وراثت اسلام کی تفہیم میں زیادہ بہتر کرداراداکر سکے گی اور میڈیا کی پھیلائی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔

مغرب اور خصوصاً امریکہ کا جدید میکانکی معاشرہ داخلی بحران اور روحانی انتشار کے ہاتھوں نیم جان ہو چکا ہے۔ رومی کی شاعری اور صوفیانہ وجدانی کیفیت ایسے بے شمار افراد کے لئے بے پناہ کشش کا باعث رہی ہے جواس بے خودی کی تلاش میں ہیں جوروح کائنات سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ جرمن شاعر ہینس منکے کی نگاہ میں ——

''ہمارے آج کے سیاہ دور میں رومی واحد امید ہیں۔''

تصوف کی بنیادی خصوصیت اس کا پیام عشق ہے، جس میں دشمن اور دوست کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ علمائے سوء نے عقیدہ ومسلک کی بنیاد پر معاشرے میں اختلاف وعداوت کے زہریلے بیج بودیے تھے۔ مختلف مذاہب کے درمیان جنگ وجدل کی بات تو پرانی تھی، خود مسلمانوں کے مختلف مسلکوں اور فرقوں میں خوں ریزی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ تاریخ کے خونیں اوراق جس کے گواہ ہیں۔

مگر صوفیانہ ربودگی وفتادگی اور اخوت و دردمندی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے عالم گیر اتحاد انسانی کے جذبے کومقبول ومحمود بنادیا، جس میں مولوی رومی کی شاعری اور صوفیانہ بے خودی نے مرکزی کردارادا کیا، جس نے معاشرے کی اخلاقی وانسانی قدروں پرخوش گواراثرات مرتب کیے۔ چنانچہ مندرجہ طرز فکر واحساس عام ہوا۔

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ماغیر ازیں گناہے نیست
مئے خور ومصحف بسوز وآتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن
در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست
از یک چراغ کعبہ وبت خانہ روشن است
عارف ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر
پروانہ چراغے حرم و دیر نداند
زیمن عشق بہ کونین صلح کل کر دم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

مشرق میں آمریت وشہنشاہی کی دیرینہ روایت نے غلامانہ ذہنیت کو

عام کر دیا تھا۔عوام الناس کا تو خیر ذکر ہی کیا اپنے وقت کے جید علما وفضلا بھی بادشاہوں کی چشم وابرو کے اشاروں پر رقص فرما رہے تھے،مگر تصوف نے آدمی کی عزت نفس،خودداری وسر بلندی،حق گوئی وبے باکی کے جذبہ و احساس کو بیدار و مستحکم کیا اور انسانی عظمت وفضیلت کے نغمے بلند کیے۔

سرمایہ تو ملک چہ داند و زپایہ تو فلک چہ داند
آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زند
روشن دلاں خوشامد شاہاں نہ گفتہ اند آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود

اس انقلاب نے ایک ایسے معاشرے کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا،جس میں رواداری،امن وآشتی،حق گوئی،خودداری،عزت نفس، خلوص و ہمدردی،وسیع المشربی،اخوت ومحبت کے جذبہ واحساس کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل وفروغ میں مثنوی معنوی نے مرکزی حصہ لیا۔مولانائے روم نے تمثیلی پیرائے میں مذکورہ قدروں کو عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔

مولانا روم سیرت نبوی کے ایک واقعہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر امت مسلمہ کو حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

کافراں مہمان پیغمبر شدند وقت شام ایشاں بہ مسجد آمدند
رو بہ یاراں کرد سلطان راد دستگیر جملہ شاہان و عباد
گفت اے یاران من قسمت کنید کہ شمار پر از من و خوئے منید
ہر یکے بارے یکے مہماں گزید درمیاں بد یک شکم زفت عنید

تمثیل کا ماحصل یہ ہے کہ جو بد اطوار رسول اکرم کا مہمان ہوا۔اس نے اولاً تو سارے گھر کا کھانا کھالیا۔ رات میں اس نے کمرے میں نجاست کردی۔صبح دروازہ کھلا تو شرمندگی کے باعث فرار ہوگیا۔ مگر اپنا قیمتی بت بھول گیا۔اس کو لینے واپس آیا تو دیکھا کہ آں حضرت خود اس نجاست کو صاف کر رہے ہیں۔حالانکہ صحابہ کرام اس خدمت کی انجام دہی پر مصر تھے۔مگر آپ نے منع فرمادیا۔

رسول خدا کے اس سلوک نے مذکورہ شخص کے باطن کو روشن اور متحرک کردیا اور وہ ایمان کی روشنی سے سرفراز ہوا۔

مولانا روم نے ایک بد آواز مؤذن کی تمثیل سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ مسلمان عملاً جس کردار و مزاج کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔اس سے دوسرے مذہب کے ماننے والوں پر منفی اور مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اسلام کی اصل مسخ ہو رہی ہے۔اس مذہب کی طرف کشش تو خیر کیا ہوگی۔ برعکس اس کے خلاف نفرت و عداوت کا جذبہ پرورش پا رہا ہے:

ایں حکایت یاد گیرا اے تیز ہوش صورتش بگذار معنی را نیوش
یک موذن داشت بس آواز بد شب ہمہ شب می دریدے حلق خود
خوب خوش بر مرد ماں کردہ حرام درصداع افتادہ ازوے خاص وعام
کودکاں ترساں از ودر جامہ خواب مرد و زن ز آواز او اندر عذاب
پس طلب کردند اورا در زماں اقچہا دادند و گفتند اے فلاں

تمثیل کا مفہوم یہ ہے کہ ایک گاؤں کے لوگوں نے ایک بد آواز مؤذن سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کو حج پر روانہ کر دیا۔راستے میں گاؤں کی مسجد ملی۔اس نے اذان دی۔کچھ دیر بعد ایک مجوسی کچھ تحفے لے کر آیا اور دریافت کیا کہ مؤذن کہاں ہے۔اس کی نذر یہ تحفے کرنے ہیں۔لوگوں نے سبب پوچھا تو کہا کہ میری لڑکی یوں تو بہت نیک طبع اور باشعور ہے۔مگر پتا نہیں وہ کس طرح اسلام کی طرف مائل ہوگئی۔ بہت تاکید وتہدید کی گئی،لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔آج مؤذن کی آواز سے وہ اتنی گھبرائی کہ اس نے دریافت حال کیا کہ آواز کیسی تھی۔جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی عبادت کا یہ ایک طریقہ ہے اور جب اس کو اس کا یقین ہوگیا کہ بات درست ہے تو اسلام سے نفرت ہوگئی۔ جو کام ہم لوگ کسی طرح نہ کر سکے تھے مؤذن کی وجہ سے چشم زدن میں ہوگیا۔ہم ان کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں اور یہ تحفہ لائے ہیں۔

خلوص کی ماہیت وحقیقت کی وضاحت ممکن نہیں۔لیکن مولانا رومی نے حضرت علی کے ایک واقعے کو تمثیل کے رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ خلوص کی ماہیت واصلیت کی بے ساختگی تاثر کے ساتھ روشن ہوگئی ہے۔

از علی آموز اخلاص عمل شیر حق را داں منزہ از دغل
در غزا بر پہلوانے دست یافت زود شمشیرے بر آور دو شتافت
او خیو انداخت بر روئے علی افتخار ہر نبی و ہر ولی
در زمیں انداخت شمشیر آں علی کرد اور اندر غزایش کاہلی الخ
گشت حیراں آں مبارز زیں عمل از نمودن عفو و رحم بے محل

تمثیل کا مفہوم یہ ہے کہ ایک جنگ میں حضرت علی نے ایک کافر کو قابو میں کر کے چاہا کہ اس کا سر قلم کردے۔لیکن اس نے آپ کے دہن شریف

پر تھوک دیا۔ حضرت علی نے تلوار رکھ دی اور اس کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کافران کے طرز عمل پر سخت متحیر ہوا اور اس معافی کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھ کو لوجہ اللہ قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن تیری یہ حرکت مجھ کو ناگوار ہوئی اور مجھے غصہ آ گیا۔ اب تجھ کو قتل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنی خواہش نفسانی کی تسکین کے لئے تجھ کو قتل کیا۔ میرا اخلاص عمل باقی نہ رہا۔ اس حکایت سے صرف خلوص کا معیار ہی قائم نہیں ہوا، بلکہ بغیر کسی منطقی دلیل و برہان کے خلوص کی ایک میزان مقرر ہوگئی۔ جس پر ہر شخص اپنے عمل کے کیف وکم کا اندازہ کرسکتا ہے۔

اللہ کے بندے خاص طور پر صوفیائے کرام عیب جوئی کو سخت برا جانتے ہیں۔ مولانا رومی نے اس انسانی کمزوری کو ایک تمثیل کے ذریعے پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عیب جوئی میں خود انسان سے حماقتیں سرزد ہوجاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تمثیل تو 'شیر اور خرگوش' کی ہے اور دوسری ایسے چار مسلمانوں کی ہے، جو عیب جوئی کے عادی تھے۔ اتفاق سے چاروں مسجد میں گئے اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اتنے میں مؤذن آیا تو ان میں سے ایک نے اس سے کچھ پوچھ لیا۔ دوسرے نے تبصرہ کیا کہ نماز میں بولنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ تیسرے نے کہا کہ اس کو الزام دینے سے کیا حاصل خود تم نے نماز میں بات کر کے نماز توڑ ڈالی۔ چوتھے نے کہا، شکر ہے کہ میں کچھ نہ بولا۔ بقیہ کی نمازیں تو ٹوٹ ہی گئیں۔ اس طرح چاروں کی نمازیں ٹوٹ گئیں۔

مثنوی معنوی کی ہر حکایت سبق آموز بھی ہے اور ایک صحت مند اور درد مند معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں معاون بھی۔ یعنی بہ حیثیت مجموعی مولانا رومی کی شاعری اور صوفیانہ روایت آفاقی انسانیت دوستی، اخوت و ہمدردی، رواداری، وسیع المشربی، داخلی صحت و شادمانی اور باہمی اخلاص و دردمندی کا ایسا مصدر و منبع ہے جو عصر حاضر میں انسانی قافلے کی منزل مقصود تک معتبر رہنمائی کرسکتا ہے۔ قدیر زماں صاحب کا یہ خیال سنجیدہ توجہ کا طالب ہے۔

''آج یورپ اور امریکہ میں ان کے اشعار کا چاروں طرف پرچار ہو رہا ہے۔ یہاں درویش رقصاں کی چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ خانقاہوں میں ہر سال سماع کا اہتمام ہوتا ہے، اس سے تو ساری دنیا واقف ہے۔ تصوف میں سماع کا جواز اس بنیاد پر کیا گیا ہے، یہ محبت اور آفاقی قدروں کا استعارہ ہے۔'' (تصوف بیک نظر صفحہ ۷۶)

مولانا رومی کے دیوان شمس تبریز، فیہ مافیہ اور مثنوی معنوی میں پیام عشق اور جہان عشق کی وضاحت کی گئی ہے۔ جس میں انہوں نے اس طرز فکر کا ساحرانہ اور اپر اثر اظہار کیا ہے کہ عشق دراصل امن و آشتی سے عبارت ہے۔ عاشق انسان دوست ہوتا ہے۔ وہ تمام نسلی، لسانی، تہذیبی، قومی، علاقائی، مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی امتیازات سے بلند اور منزہ ہو کر الخلق عیال اللہ کے اصول پر گامزن رہتا ہے۔ اس کی منزل مقصود ذات باری ہے۔ اس منزل تک رسائی کے لئے خدمت خلق اور محبت خلق ناگزیر ہے۔ وہ حضرت انس اور حضرت عبد اللہ کی روایت کی روشنی میں اس حدیث شریف پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کے نزدیک محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبے سے اچھائی کرے۔

مولانا رومی دانش نورانی و دانش بُرہانی کا حسین و جمیل اور معتدل و متوازن امتزاج تھے۔ ان کی تعلیمات عصر حاضر کے خارجی، میکانکی اور زر پرست معاشرے میں داخلیت کے ارتقا کی بہترین بنیاد فراہم کرتی ہیں جن سے اس عہد بیمار کی صحت گم گشتہ کے سراغ کی راہیں روشن ہوسکتی ہیں۔ عالم انسانیت کے لئے ان کا بنیادی پیغام یہی ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

مولانا رومی کی شاعری اور زندگی آج کے مادہ پرست سماج میں اس اخلاقی، روحانی انقلاب کا بہترین ذریعہ ہے، جو اس کائنات میں انسانی وجود کے تحفظ کی ضمانت ہوسکتا ہے۔

کتابیات

مقالے کی تحریر میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا

۱۔ سوانح مولانا روم
۲۔ 'A Golden treasury persian poetry' by M.S. Israeli
۳۔ تصوف بیک نظر، قدیر زماں
۴۔ جدیدیت کی جمالیات، لطف الرحمٰن
۵۔ Recovery of Faith by S. Radha Krishnan
۶۔ 'The Present Crisis of Faith' by S. Radha Krishnan

باقی صفحہ: ۳۴۱ پر

مناقب الاصفیاء اور سیر الاولیاء

چشتی و فردوسی اختلاف کی حقیقت

سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی .... سجادہ نشین، خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ

ہندوستان میں صوفیائے کرام کے باضابطہ تذکرے کی تاریخ اب تک کی تحقیق کے مطابق سیر الاولیاء سے شروع ہوتی ہے جسے سید محمد مبارک علوی کرمانی المعروف بہ امیر خورد کرمانی نے فارسی زبان میں ۷۶۱ھ سے ۷۷۰ھ کے درمیان ترتیب دیا تھا۔ سیر الاولیاء سے جمالی کے سیر العارفین تک تذکرۂ صوفیا کا سفر مناقب الاصفیاء کا ذکر کیے بغیر ادھورا اور ناقص ہے۔ سیر الاولیاء کی شہرت اور چکا چوند اپنی جگہ، لیکن مناقب الاصفیاء بھی اپنی خوبیوں کے اعتبار سے کسی طرح بھی سیر الاولیاء سے کمتر نہیں ہے۔ اگر سیر الاولیاء سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کے احوال وکوائف کا احاطہ کرتی ہے تو مناقب الاصفیاء سلسلۂ فردوسیہ وکبرویہ وسہروردیہ کے عالی مرتبت مشائخ کے تذکرے کا حق ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر سیر الاولیاء میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے اکابر کے افکار وخیالات اور تعلیمات وملفوظات کو بڑی خوبی کے ساتھ مرتب فرمایا گیا ہے تو مناقب الاصفیاء میں سلسلۂ فردوسیہ کے مشائخ کرام کی گراں قدر تعلیمات اور بیش قیمت افکار وخیالات کو بڑی چابک دستی کے ساتھ برمحل پیش کیا گیا ہے۔

مصنف سیر الاولیاء کی وفات کو مشکل سے ستر پچھتر سال گذرے ہوں گے کہ دہلی سے کم وبیش گیارہ سو کیلومیٹر دور صوبہ بہار میں سیر الاولیاء کے نشان راہ پر چل کر ایک ایسا تذکرہ وجود میں آ گیا جس نے نہ صرف یہ کہ تذکرہ نگاری کی راہ میں ایک سنگ میل قائم کر دیا بلکہ اپنے بعد اس فن میں داخل ہونے والوں کے لئے ایک بہترین اور لائق تقلید مثال بھی قائم کر دی۔

مشائخ صوفیا کے تذکرے کا جو سفر سیر الاولیاء سے شروع ہوا وہ کم وبیش پچھتر برسوں کے اندر مناقب الاصفیاء میں کس منزل تک جا پہنچا اس کو سمجھنے کے لئے دونوں تذکروں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

سیر الاولیاء میں تذکرہ نگاری کا مرکز حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ) کی ذات والا صفات ہے اور مناقب الاصفیاء میں تذکرہ نگاری کا مرکز حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری (۷۸۲ھ) کی ذات بابرکات ہے، لیکن اس پس منظر میں دونوں ہی تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے سلسلے کے پیران شجرہ کے حالات کو پیش کیا ہے، مگر سیر الاولیاء کے مقابلے میں صاحب مناقب الاصفیاء نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا ذکر محض ضمناً اور تبرکاً نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے شجرے کی ابتدا کے مطابق حضور سید کل رحمت عالم صلی اللہ علیہ السلام اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے مختصر لیکن جامع تذکرے سے مناقب کا آغاز فرمایا ہے۔ ایک مرید یا مسترشد جو اپنے سلسلے کے جملہ پیران عظام یا مشائخ کرام سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو، اسے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جاننے کے لئے دوسری کتابوں کے بھروسے چھوڑ دیا جائے تو میرے خیال میں یہ ایک اچھی اور صحت مند کوشش نہیں ہوگی۔ اس لحاظ سے صاحب مناقب الاصفیاء نے اپنے سلسلے کے مریدین کے لئے شجرے کے تمام اسمائے گرامی پر معلومات فراہم کر کے صاحب سیر الاولیاء سے زیادہ مفید قدم اٹھایا ہے۔ مزید یہ کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت حضرت علی پر مناقب الاصفیاء میں جو اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ محض رسمی نہ ہو کر بڑی معلومات افزا اور تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان دونوں موضوعات پر مناقب الاصفیاء میں جو مواد موجود ہے وہ بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی اور ان پر دیدہ ریزی سے بے نیاز کر دینے والا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

سلسلۂ فردوسیہ کا شجرہ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ ولی تراش سے

اوپر بعینہٖ سلسلہ کبرویہ کا شجرہ ہے اور حضرت ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی سے اوپر بعینہٖ سلسلۂ سہروردیہ کا شجرہ ہے اور حضرت جنید بغدادی سے اوپر بعینہٖ سلسلۂ قادریہ کا شجرہ ہے۔ اس لئے مناقب الاصفیاء وہ قیمتی اور قدیم فارسی تذکرہ ہے جو نہ صرف سلسلۂ فردوسیہ کے مشائخ کا احاطہ کرتا ہے بلکہ سلاسل کبرویہ، سہروردیہ وقادریہ کے اکابر مشائخ کے احوال وکوائف کا بھی ترجمان ہے، نیز حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی سے مستفید النعمت سلاسل کے لئے یکساں طور پر مفید وکارآمد ہے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ صاحب تذکرہ، معاصرین بزرگوں یا قریب العہد شخصیتوں کے حالات کے ساتھ ساتھ، اگر قدیم بزرگوں کے حالات بھی لکھ رہا ہے تو وہ ان قدیم بزرگوں کے تذکرے کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکروں میں وہی حصہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو مصنف کے قریب العہد شخصیتوں سے متعلق ہوتا ہے۔ بقیہ تذکرے صرف زیب داستاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن مناقب الاصفیاء میں سلسلۂ فردوسیہ کے جملہ مشائخ کے حالات قلم بند کرنے میں افراط وتفریط نظر نہیں آتی، بلکہ سبھی کے سوانح حیات اور ملفوظات کو جمع کرنے کی کوشش تذکرہ نگار نے یکساں طور پر کی ہے اور سبھی کے حالات کو حتی الوسع جمع فرمالیا ہے۔

مناقب الاصفیاء کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف کو جس شخصیت کے احوال یا افکار وخیالات سے متعلق اختلاف رائے کا علم ہوا ہے تو اسے پوری ایمان داری کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس پر طرفین کے خیالات کو نقل کر کے منصفانہ بحث کی بھی کوشش کی ہے۔

مناقب الاصفیاء نہ صرف فردوسی سلسلے کے وابستگان کو ان کے مشائخ سلسلہ سے واقف کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے، بلکہ یہ غایت مقصد وکوشش بھی ہے کہ سلسلۂ فردوسیہ کے مزاج وآہنگ کی بھی وضاحت ہو جائے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس کے مؤلف کی گراں قدر شخصیت سامنے آتی ہے، جو نہ صرف تذکرہ نگار ہے بلکہ سلسلۂ فردوسیہ کے فیوض وبرکات اور مزاج وآہنگ کا بھی اچھا پارکھی ہے اور اپنے مقام ومرتبے سے نزول کرتے ہوئے متوسط درجے کے مرید کی ذہنی واعتقادی تربیت کے لئے اس نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔

مناقب الاصفیاء کا فارسی متن:

مناقب الاصفیاء کا فارسی متن پہلی بار مطبع نور الآفاق کلکتہ سے طبع ہوا تھا لیکن اس کے متن کی تحقیق اور موجودہ خطی نسخوں سے تطابق کا کام ہنوز باقی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق اس کا سب سے قدیم خطی نسخہ (سنہ کتابت: ۱۱۴۸ھ) خانقاہ بلخیہ رائے پورہ، فتوحہ، پٹنہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ بقیہ جتنے نسخے پائے جاتے ہیں سب بعد کے ہیں۔ مناقب الاصفیاء کا پہلا اردو ترجمہ مولانا سید شاہ ابو صالح محمد یونس شعیبی فردوسی صاحب نے کیا تھا جسے دو جلدوں میں مکتبہ دار الرشاد مہانند پور، دیپ نگر ضلع پٹنہ (موجودہ نالندہ) نے ۱۳۸۴ھ میں شائع کیا تھا۔ اب یہ بھی نایاب ہے۔

مناقب الاصفیاء کے خطی نسخوں میں فرق متن کا ایک اندازہ مکتوبات صدی مطبوعہ ۱۲۸۷ھ سے ہوتا ہے جسے مولوی محمد اکرام صاحب آروی کی فرمائش پر مطبع علوی لکھنؤ نے چھاپا تھا۔ اس طباعت کے اختتام میں مناقب الاصفیاء کا حضرت مخدوم جہاں کے حالات پر مشتمل حصہ بھی شامل کر دیا گیا ہے تا کہ مکتوبات کے قارئین صاحب مکتوبات کے حالات سے بھی واقف ہو جائیں۔ اسی مشمولہ اقتباس میں مناقب الاصفیاء کی مندرجہ ذیل عبارت پر جو حضرت مخدوم جہاں کی تعلیمی سرگرمی اور ازدواجی زندگی سے متعلق ہے، حاشیہ ثبت کیا گیا ہے:

"در آنچہ درسنار گانوں در علم مشغول بود مرض حادث شدہ بود اطبائے آں مقام گفتند دوائے ایں مرض جماع است برائے دفع مرض کنیزکے ۱ ـ داشت ازاں کنیز ک یك پسر شد"

ایک دوسرا اختلاف متن جو سرسری مطالعہ میں سامنے آیا وہ مناقب الاصفیاء کے پہلے مطبوعہ اردو ترجمے کو سامنے رکھنے پر واضح ہوتا ہے۔ مطبوعہ فارسی متن اور مطبوعہ پہلے اردو ترجمے کا وہ حصہ جہاں شیخ عز کاکوی اور شیخ احمد بہاری کا ذکر ہوا ہے ملاحظہ ہو:

"ایں ہر دو بزرگان در عھد دولت سلطان فیروز در دھلی رفتند در توحید سخنھای

فراخ و شطح گفتند علمای دهلی بر سلطان فیروز گفتند که این هر دو سخنهای می گویند که شایان کشتنی شده اند سلطان محضر ساخت همه اکابر شهر جمع کرد همه اجماع کردند آن هر دو بزرگان را کشتند شهری همچون دهلی مجمع مشایخ و علما و فضلا و باد شاهی چون سلطان فیروز معتقد درویشان کسی را ایں مقدار نشد که ایں هر دو بندگان را به بهانه دیوانگی هم رها کنانیدی"

(ص:۱۳۰)

''ان ہی دونوں کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ یہ لوگ شہر دہلی گئے وہ سلطان فیروز کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ان دونوں بزرگوں نے توحید میں تفصیل سے باتیں شروع کردیں اور شطحیات بولنے لگے۔ علمائے دہلی نے سلطان فیروز سے شکایت کی اور کہا کہ یہ دونوں ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے لائق قتل ہوگئے ہیں۔ سلطان نے محضر طلب کیا، تمام اکابرین شہر کو جمع کیا، تمام لوگوں نے اجماع کیا اور یہ دونوں بزرگوار قتل کردئے گئے۔ مونس القلوب میں ہے، دونوں بزرگوں کے قتل کے بعد شاہ نے دہلی دروازے پر لکھ دینے کا حکم دیا کہ احمد بہاری اور عز کاکوی جو خدائی کا دعویٰ کرتے تھے ہماری بارگاہ جہاں پناہ میں سزا کو پہونچے، دہلی ایسا شہر مشائخین، علما اور فضلا کی کثرت، سلطان فیروز جیسا درویشوں کا معتقد بادشاہ لیکن کسی سے یہ نہ ہوسکا کہ ان دونوں بزرگوار کو دیوانگی کا بہانہ کرکے رہا کردیں'' (ص:۱۰۴)

اس ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم (ابوصالح محمد یونس شعمی) کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں مونس القلوب (ملفوظات حضرت احمد لنگر دریا بلخی م ۸۹۱ھ) کی عبارت بھی درج متن تھی جب کہ مطبوعہ فارسی متن اور اس کے قریب و بعد کے خطی نسخوں میں وہ عبارت نہیں ملتی۔

صاحب مناقب الاصفیاء اور زمانہ تالیف

مناقب الاصفیاء میں مصنف نے نہ تو اپنا نام ہی کہیں درج کیا ہے اور نہ کوئی ایسا واقعہ یا واضح رشتہ بیان کیا ہے جس سے مصنف کا تعارف ہو سکے لیکن یہ زبان زد خاص و عام ہے کہ مناقب الاصفیاء کے مصنف حضرت مخدوم شاہ شعیب بن جلال منیری ثم شیخپوروی (م ۸۲۴ھ) ہیں۔ حضرت مخدوم جہاں کے دادا حضرت شیخ اسرائیل اور حضرت مخدوم شعیب کے دادا شیخ عبدالعزیز دونوں حضرت امام محمد فقیہ کے صاحبزادے تھے۔

تلاش مصنف میں مناقب الاصفیاء میں داخلی شہادت کی جستجو کرتے ہوئے باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

(الف) مصنف نے کہیں بھی حضرت مخدوم جہاں (م ۷۸۲ھ) کی حیات میں ان کے دیدار سے مشرف ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ حضرت مخدوم جہاں کی حیات طیبہ سے متعلق واقعات کو مندرجہ ذیل حوالوں سے نقل کیا ہے۔

''از راویان حکایت سماعت''، ''نیز سماع است''، ''القصہ''، ''از کاملان دانندہ شنیدہ شدہ است''، ''نقل است''۔

(ب) مصنف نے کہیں بھی حضرت مولانا مظفر بلخی (م ۸۰۳ھ) کی حیات میں ان کے شرف دیدار سے مشرف ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے احوال سے متعلق تذکرہ بھی اس حوالے سے کیا ہے، جس حوالے سے حضرت مخدوم جہاں کے حالات نقل کیے ہیں۔

(ج) مصنف نے حضرت مخدوم حسن بن معز نوشۂ توحید بلخی، جن کے زمانۂ حیات میں مناقب الاصفیاء کی تالیف کا آغاز ہونا طے ہے، سے بھی کوئی واقعہ یا اقوال بذات خود نقل نہیں کیا ہے بلکہ ''سماع است'' کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یا پھر ان کے ملفوظات و مکتوبات سے نقل کیا ہے۔

(د) مصنف حضرت مخدوم حسن دائم جشن بلخی (م ۸۵۵ھ) کے معاصرین میں تھے۔

(ہ) مشہور تذکرۂ صوفیا 'مراۃ الاسرار' کی تالیف (۱۰۶۵ھ) کے وقت اس کے مؤلف شیخ عبدالرحمن چشتی کے سامنے مناقب الاصفیاء موجود تھی لیکن ان کے پیش نظر نسخہ بھی مصنف سے لاعلمی کا

اظہار کررہا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"الغرض مناقب الاصفیاء نام کتابی است بغایت معتبر کہ یکی از خلفای سلسلہ شیخ شرف الدین جمع کردہ واکثر احوالات شیخ وجمیع پیران سلسلہ فردوسیہ مفصل دراں ذکرہ کردہ است"

(مرآۃ الاسرار قلمی مملوکہ خانقاہ منعمیہ)

مناقب الاصفیاء کے زمانہ تالیف کے سلسلے میں داخلی شہادتوں کے ذریعہ درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(الف) مناقب الاصفیاء کی تالیف کا آغاز حضرت مخدوم حسین بن معز نوشۂ توحید بلخی (م ۸۴۴ھ) کے اخیر زمانۂ حیات میں ہوا۔ چنانچہ اس تذکرہ کا آغاز عربی خطبۂ حمد ونعت کے بعد اس طرح ہوتا ہے:

"اما بعد چوں شجرۂ پیران بندگی مخدوم شیخ الاسلام والمسلمین بدر الحق و الحقیقۃ والدین شیخ حسین معز شمس بلخی متع اللہ المؤمنین بطول بقائہ وادام علیھم نعمۃ لقائہ"

(ب) مناقب الاصفیاء کی تالیف کا سلسلہ حضرت مخدوم حسین بن معز نوشۂ توحید بلخی کی وفات (۸۴۴) کے بعد تک چلتا رہا کیوں کہ اس میں حضرت مخدوم حسین بن معز بلخی کے ملفوظات گنج لا یخفیٰ کا حوالہ کئی مقامات پر آیا ہے جس کی آخری مجلس میں یہ ذکر ملتا ہے:

"روز سہ شنبہ اول وقت ظہر بیست چہارم ماہ ذی الحجہ سنہ اربع واربعین وثمان بودکہ جان مبارک اور افی معقد صدق عند ملیک مقتدر معراج شد طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ.........."

(ج) مناقب الاصفیاء میں مکتوبات حسین نوشۂ توحید بلخی کا ذکر وحوالہ بھی موجود ہے جس کی ترتیب حضرت مخدوم حسن کی زندگی میں شروع ہوگئی تھی، لیکن اس میں اخیر زمانہ حیات تک کے مکاتیب یکجا ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ کی تکمیل بھی ۸۴۴ھ میں ہوئی۔ ان مکتوبات کے جامع خود صاحب مکاتیب کے صاحبزادے اور جانشین مخدوم حسن دائم جشن بلخی ہیں۔ اس سے بھی یہ قیاس قوی ہوتا ہے کہ مناقب الاصفیاء کی تکمیل ۸۴۴ھ کے بعد ہوئی۔

(د) مناقب الاصفیاء میں مخدوم حسن دائم جشن بلخی (م ۸۵۵ھ) کی تالیف رسالہ لطیف المعانی (کذا) کا ذکر بھی موجود ہے جس میں گرچہ سال تالیف درج نہیں لیکن کئی وجوہ سے یہ قیاس اغلب ہے کہ اس رسالہ کی تالیف بھی ۸۴۴ھ کے آس پاس ہوئی ہوگی۔

(ہ) حضرت مخدوم حسین بن معز بلخی کے پوتے حضرت شیخ احمد لنگر دریا بلخی (م ۸۹۱ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ 'مونس القلوب' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں جا بجا حضرت مخدوم جہاں، حضرت مولانا مظفر بلخی اور دوسرے فردوسی مشائخ کا تذکرہ ہوا ہے اور گراں قدر اطلاعات فراہم کی گئی ہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر کہیں بر سبیل تذکرہ بھی مناقب الاصفیاء کا نام یا حوالہ نہیں آیا ہے۔ اس لئے اگر یہ مان بھی لیں گے کہ مونس القلوب کے وجود میں آنے سے پہلے مناقب الاصفیاء کی تالیف ہو چکی تھی تو یہ ماننا ہوگا کہ اس وقت تک یہ کتاب بالکل غیر معروف تھی۔

مناقب الاصفیاء کئی اعتبار سے نہایت بیش قیمت تالیف ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ بہار میں مرتب ہونے والا فارسی کا یہ پہلا تذکرہ ہے اور ہندوستان میں تذکرۂ صوفیا میں سیر الاولیاء اور قوام العقائد کے بعد شاید اسی کا نمبر ہو۔ نویں صدی ہجری کی ادبیات فارسی ہندی کا مہیا ذخیرہ بہت بڑا نہیں ہے۔ مناقب الاصفیاء اس لحاظ سے معاصر ادب کا ترجمان ہے اور نویں صدی ہجری میں شمالی ہندوستان میں بول چال کی فارسی زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ مناقب الاصفیاء کے مطالعہ کے بعد اس کے مصنف کا ذولسانین ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ عربی زبان پر قدرت اور افکار وخیالات کی بلندی کی غمازی کرتا ہوا مناقب الاصفیاء کا مقدمہ بلا شبہ بہت خوب ہے۔

مناقب الاصفیاء کی زبان عمومی طور پر سلیس اور شستہ ہے۔ خاص طور پر واقعہ نگاری میں تکلف آمیز زبان سے پرہیز کیا گیا ہے اور کم الفاظ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظر نگاری اور مقصد کی وضاحت کی گئی ہے۔ حضرت ابو نجیب سہروردی کا ایک واقعہ کس سلاست کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"نقل است از شیخ ابو مسعود رومی رحمة الله علیه کی گفت وقتی برابر شیخ ابو النجیب سهروردی رضی الله در بغداد در بازار سلطان میگذ شتم ناگاه شیخ نظر کرد بریك گو سپندی پوست باز کرده آویخته نزدیك قصاب بایستاد وگفت این گوسپند مرامی گوید که من مردارم در حال قصاب بیهوش شد چوں بهوش باز آمد اقرار کرد بصحت قول شیخ و بر شیخ توبه کرد"

مناقب الاصفیاء کی فارسی انشاء پر حضرت مخدوم جہاں کی فارسی انشاء کی گہری چھاپ ہے اور یہ اثر یقیناً حضرت مخدوم جہاں کی تصنیفات سے گہرے تعلق اور کثرت مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ صاحب مناقب الاصفیاء نے ایک مقام پر ملتقط احیاء علوم الدین کا ایک عربی اقتباس نقل کیا ہے اور پھر اس کا فارسی ترجمہ بھی فرمایا ہے۔ ترجمہ پڑھنے سے حضرت مخدوم جہاں کی شرح آداب المریدین کی فارسی نثر اور انشاء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

"واما التوحید فقد جعل الآن عبارة عن صنعة الکلام ومعرفة طریقة المجادلة والاحاطة بمنا قضات الخصوم والقدرة علی التشدق بتکثیر الاسولة واشارة الشبهات وتالیف الالزامات وکان التوحید فی العصر الاول عبارة عن امر آخر لا یفهم اکثر المتکلین وان فهموه لم یصنعوابه وهوا ان یری الامور کلهامن الله تعالیٰ رویه یقطع التفاته عن الاسباب والوسائط فلا یری الخیر والشر والنفع والضرر الامنه وهذا مقام شریف احدی ثمراته التوکل کما سیاتی بیانه فی کتاب التوکل ومن ثمراته ترک شکایة الخلق وترک الغضب علهم والرضا والتسلیم بحکم الله تعالیٰ وهذا من مقامات الصدیقین."

"یعنی واما توحید پس بدرستی که گرد انیده شد اکنون عبارت از صنعت بحث ومعرفت طریق مجادله ودر گرفتن مناقضات خصمان و قدرت بر اظهار فصاحت به بیسار کردن سوالها والگیختن سببها وجمع کردن الزامها وبود توحید در عصر اول عبارت ازامری دیگرکه فهم نکنند آں امر رااکثر متکلمان و اگر فهم کنند آن امر را پس موصوف نشوند بد ان آن امر انست که بینند کارهاهمه از خدایتعالیٰ دیدنی که قطع کند التفات بیننده را از سببها وواسطها پس نه بینند خیر راوشر را ونفع ر او زیان را مگر از خدای واین مقام بزرگ است یکی از ثمرات این مقام توکل است چنانچه زود بیاید بیان آن در کتاب توکل و از ثمرات این مقام ترک شکایت خلق است وترک غضب است بر ایشان و رضا وتسلیم است بحکم خدایتعالیٰ واین مقام از مقام صدیقا نست."

سیر الاولیاء کی ایک غلط روایت کی نشاندہی

فقہ اور عقائد کی بنیاد پر جو مسلک اور مکتبۂ فکر اسلامی تاریخ میں وجود میں آئے ان کے پیروؤں اور متبعین میں اختلاف کے شدت کی افسوسناک داستان چلی آرہی ہے۔ لیکن صوفیائے کرام کے سلاسل جو مزاج وآہنگ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے طریقۂ کار جدا جدا ہیں، ان میں ایسا اختلاف دیکھنے میں نہیں آتا بلکہ ایسے اتحاد قلبی وروحی کی مثالیں ملتی ہیں جو بلا شبہ پیروی واتباع کے لائق ہیں۔ جہاں کہیں انہیں فروعی اختلاف کا سامنا ہوتا ہے تو اس سے پہلے کہ اس میں شدت آئے وہ یہ اعلان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

نہ ایں کار می کنم نہ انکار می کنم

اور جہاں کہیں بنیادی اختلاف کی بات ہوتی ہے تو وہ خواہ صوفیا کا لبادہ اوڑھے ہوئے لوگوں ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو، ان کے خلاف سارے سلاسل کے صوفیا سینہ سپر اور قلم برداشتہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر حلول واتحاد کے مردود قرار دینے میں ہر سلسلے کے صوفیا بیک آواز ہیں۔ اس لئے صوفیائے کرام کا یہ نعرہ ان کے قول وعمل کا آئینہ ہے کہ

الفقراء کنفس واحدۃ

ہندوستان میں جن صوفیائے کرام نے تبلیغ ودعوت کا اہم فریضہ انجام دیا ان کے اندر بھی یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی اور ان کے مشن کی کامیابی کا یہ سب سے بڑا راز بھی ہے۔ چشتی مشائخ، سہروردی وکبروی صوفیا کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ چنانچہ چشتی مشائخ کے ملفوظات میں نہ صرف حضرت شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہروردی (م ۶۳۲ھ) کی خوب تعریفیں ملتی ہیں بلکہ ان کی مشہور زمانہ کتاب عوارف المعارف چشتی خانقاہوں اور جماعت خانوں میں خصوصیت کے ساتھ شریک درس تھی۔ سہروردی المشرب صوفیا کی وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ خواجہ حمید الدین ناگوری سہروردی (م ۶۴۳ھ)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے نہ صرف ہم نوالہ وہم پیالہ تھے بلکہ سب سے بڑے قدر دانوں میں سے ایک تھے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے مریدوں کو پاکپتن کی جانب بھیجتے تو خواجہ فرید الدین گنج شکر سے فیض روحی واستفادہ کی وصیت کرتے اور اگر بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کا کوئی مرید ملتان کی جانب سفر کرتا تو اسے خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کی ولایت سے حاضری واستفاضہ کا قاعدہ خود بابا فرید سکھا کر بھیجتے۔ اگر کہیں مختلف سلاسل یا معاصر صوفیا کے درمیان اختلاف رائے یا معاصرانہ چشمک کی نادر مثال ملتی بھی ہے تو وہ جز وقتی طور پر یا صرف مبتدی مریدین کے درمیان پائی جاتی ہے، خود شیخ طریقت کا دامن کہیں آلودہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا اگر کہیں کسی تذکرے میں خود شیخ طریقت پر ایسا کوئی الزام نظر آئے تو اسے ان اصولوں پر جانچے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے، جو کسی روایت کو ثقہ سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسی ہی ایک روایت سیر الاولیاء کے مشہور اور رائج متن میں موجود ہے اور جسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے لے کر خواجہ حسن نظامی دہلوی تک سارے تذکرہ نگار نقل در نقل کرتے چلے آتے ہیں۔

سیر الاولیاء کی محولہ معترضہ روایت پر تنقید وکلام کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی، لیکن صاحب مناقب الاصفیاء نے اس روایت پر تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

سیر الاولیاء

"عرض می دارد کاتب حروف بر آنجملہ کہ شیخ رکن الدین فردوسی رابخدمت سلطان المشایخ (خواجہ نظام الدین اولیا) چندان اخلاص نبود و او از شہر آمد بود ہم درکنار آب چون در حد کیلو کھری مقامی ساختہ است وشیخی بنیاد نہادہ پسران او راکہ چون نو خاستہ بودند و مریدان او را بابندگان سلطان المشایخ نقارے بود کرّات در کشتی سوار و سماع گویان ورقص کنان زیر خانہ سلطان المشایخ می گذشتند۔ روزے بطریق بعد از نماز پیشین در کشتی سوار باجمعیت وسماع ورقص کناں از پیش خانۂ سلطان المشایخ میگذ شتند سلطان المشایخ بدولت بربام جماعت خانہ مشغول نشستہ و والد کاتب حروف رحمۃ اللہ علیہ در آن مجلس پیش ایستادہ بود چون باغلبہ شو رو سماع کہ در کشتی می کردند در نظر مبارک سلطان المش ائخ در آمدند، فرمودند سبحان اللہ سالہا یکیدرین کار خون میخورد وجان خودفدائے این راہ میکند ودیگر ان نو خاستہ اندومیگویند تو کیستی کہ مانہ ایم دست مبارک خویشتن بآستین مبارک بر آورد و جانب ایشاں اشارت کرد کہ حالا برو ہمیں کہ کشتی پسران شیخ

رکن الدین بآن غوغا زیر خانه خود رسید از کشتی بآن غوغاز برخانه خود رسید از کشتی فرود آمدند خواستند غسلے کنند همینکه برلب آب در آمدند در حال غرق شدند بنده این حکایت از خدمت سید السادات سید حسین عم خود سماع دارد"

مناقب الاصفیاء

"خواجه رکن الدین فردوسی برکت صحبت وخدمت او (خواجه بدر الدین سمر قندی) کمال حاصل کرد مشایخ عصر برروش وطریقت او غبط داشتند شیخ نظام الدین رحمته الله علیه پاکتر از ان بود که ازوی حسد بیاید اما معامله مرید ان ومعتقد ان او حسد بود منتظر مصایب و حوادث می بودند اگر چیزی از مصائب روزگار و حوادث دهر بخواجه رکن الدین فردوسی رسیدی زبان دراز می کردند ومی گفتند که این مصیبت واین حادثه خواجه رکن الدین را حادثه از نفس شیخ نظام و گرانی دل او رسید ومعلوم است که تمام خلق دهلی معتقد شیخ نظام الدین بودند همه را همت حسد بر خواجه رکن الدین بود، معلوم نیست این حسد مریدان ومعتقدان شیخ نظام الدین از چه بود ومنشاء این چیست والله اعلم میان این هر دو بزرگان مناظره در دین بوده باشد معتقدان و مریدان شیخ نظام الدین آن مناظره را عداوت می پنداشتند و دل بر حسد می گماشتند لیکن خواجه رکن الدین فردوسی در مشاهده حق چنان مستغرق بود که پیش او همه معذور بودند و هر نیك و بد که او را می رسید همه از حق میدید و بحق میدید."

سیر الاولیاء میں جس تیور کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے ترجمے میں اس کا رنگ اور بھی بلا بل ہو گیا ہے۔ اعجاز الحق قدوسی صاحب کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''کاتب حروف عرض کرتا ہے کہ شیخ رکن الدین فردوسی کو سلطان المشائخ سے چنداں اخلاص نہ تھا وہ شہر سے آکر دریائے جمنا کے کنارے حدود کیلو کھری میں مقیم ہو گیا تھا اور یہیں اپنی مرشدی کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اس کے دو بیٹے جو بالکل نوجوان تھے ان کو اور اس کے مریدوں کو آپ سے بغض تھا۔ وہ اکثر کشتی میں سوار ہو کر گاتے ناچتے سلطان المشائخ کے بالا خانے کے نیچے سے گزرتے تھے۔ ایک روز وہ بہت سے لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر ظہر کی نماز کے بعد گاتے بجاتے سلطان المشائخ کے گھر کے سامنے سے گذرے۔ سلطان المشائخ جماعت خانے کے بالا خانے پر ذکر و شغل میں مشغول بیٹھے ہوئے تھے۔ کاتب الحروف کے والد رحمۃ اللہ علیہ اس مجلس میں آپ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس شور و شغب کی وجہ سے سلطان المشائخ کی نظر کشتی کے لوگوں پر پڑی۔ آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا کہ سبحان اللہ! ایک شخص سالہا سال سے اس کام میں اپنا خون جگر کھا رہا ہے اور اپنی جان اس راہ میں فدا کر رہا ہے اس راہ کے دوسرے نئے آنے والے اسے کہتے ہیں کہ تم میں کون سا سرخاب کا پر ہے، جو ہم میں نہیں۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک آستین سے نکالا اور ان کی جانب اشارہ کر کے فرمایا، اب جاؤ۔ عین اس موقع پر شیخ رکن الدین کے بیٹوں کی کشتی آپ کے گھر کے نیچے پہنچی۔ لڑکے شور مچاتے ہوئے کشتی سے اترے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ دریا میں غسل کریں۔ جیسے ہی وہ دریا کے کنارے پہنچے غرق ہو گئے۔ بندے نے یہ

حکایت اپنے چچا سید السادات سید حسین سے سنی تھی“
(ص: ۲۶۷)

اگر سیر الاولیاء کی یہ اکلوتی روایت کسی غیر معروف شیخ رکن الدین فردوسی سے متعلق ہوتی تو نا قابل غور ہو سکتی تھی لیکن حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے نام سے عہد سلطنت کے صرف اور صرف ایک بزرگ معروف ہیں جو اپنے زمانے کے مسلم الثبوت اولیائے کرام میں شمار کیے گئے ہیں۔ صوفیائے کرام کے معروف و مستند تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ لاکھوں لوگ اس سے منسوب و ماخوذ سلسلۂ فردوسیہ سے وابستہ ہیں۔ ان کے پیر و مرشد حضرت خواجہ بدر الدین غزنوی، دہلی کے مقبول و معروف صوفی بزرگوں میں ایک تھے۔ ان کے خلیفہ و جانشین حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی جیسے کامل درویش تھے جن کے خلفاء میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری جیسے محقق اور شیخ زمانہ اور حضرت عالم بن علا اندر پتی جیسے عظیم فقیہ و مفتی (صاحب فتاوی تاتارخانی) کا نام نامی سرفہرست ہے۔ اگر یہ روایت حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے بعض مریدین یا بیٹوں کی نااتفاقی یا تعصب تک بس ہوتی تو قابل غور ہو سکتی تھی لیکن خود حضرت رکن الدین کی ذات کو نشانہ بنانے کی کوشش کے نتیجے میں یہ روایت بالکل نا قابل یقین ہو گئی ہے۔

اس نا قابل یقین حکایت کو اپنے چچا سید السادات سید حسین سے سننے کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن چونکہ وہ خود اس کے چشم دید گواہ نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے کس سے سنا اس کی وضاحت ضروری تھی۔ پھر چچا سے جو حکایت سنی گئی وہ تو ”ایک روز“ سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس سے پہلے جو اطلاع یا اپنی رائے شیخ رکن الدین سے متعلق دی گئی ہے اس کی سند کیا ہے؟ اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ کسی شخصیت کے بارے میں جو رائے ذاتی تجربے یا مشاہدے کی بنا پر قائم کی گئی ہو وہ قابل غور ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ سماعت یا حکایت کے نتیجے میں قائم ہو تو اس کا یقینی ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔

ایک اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی دوسرے ماخذ سے حضرت شیخ رکن الدین فردوسی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے درمیان کسی اختلاف یا رنجش یا عدم اخلاص کا پتہ نہیں چلتا بلکہ بعض ماخذ تو اس کے برخلاف ان دونوں شخصیتوں کے درمیان محبت و اخلاص کی گواہی دیتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس روایت کے پایۂ استدلال کا چو میں ہونا اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔

صاحب مناقب الاصفیاء کے لئے اس روایت کے سلسلے میں بڑی نا قابل یقین صورت حال تھی۔ انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ انہیں ایسی کوئی اطلاع کسی دوسرے ذریعہ یا ماخذ سے نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس غیر ثقہ روایت کی تاویل انداز و قیاس کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"معلوم نیست ایں حسد مرید ان و معتقد ان شیخ نظام الدین از چہ بود و منشاء ایں چیست واللہ اعلم. میان ایں ہر دو بزرگان در دین بودہ باشد و مرید ان شیخ نظام الدین آن مناظرہ را عداوت می پند اشتند و بر دل حسد می گماشتند۔"

مناقب الاصفیاء کی پر خلوص تاویل کرتی ہوئی عبارت سے بھی یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ سیر الاولیاء میں پیش کردہ روایت بالکل بے حقیقت اور نا قابل اعتبار ہے، کیوں کہ اگر ایسا کوئی اختلاف یا رنجش یا عدم اخلاص کا وجود ہوتا تو صاحب مناقب الاصفیاء کے دل میں فردوسی النسبت ہونے کی بنا پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے ایک قسم کا حسد موجود رہتا یا پھر دوری ہی جھلکتی لیکن مناقب الاصفیاء کی عبارت اس کے برخلاف خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی عظمت و بزرگی کے اظہار سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پاکتر ازاں بود کہ ازوی حسد بیاید"

اس سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے کہ جس اختلاف یا عدم اخلاص کی روایت سیر الاولیاء میں پائی جا رہی ہے، اگر اس میں کچھ حقیقت ہوتی تو اس سے فردوسی المشرب حلقہ زیادہ اچھالتا یا نقل کرتا، اس کے برخلاف ان کے یہاں ایسی کسی صورت حال کی کوئی اطلاع نہیں ملتی اور اسے حیرت انگیز طور پر اکلوتا چشتی ماخذ پیش کر رہا ہے جبکہ سلسلہ چشتیہ کی شہرت و مقبولیت کا آفتاب ان دنوں عروج پر تھا۔ یہ ایک

نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو مشہور اور عظیم ہوتا ہے وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرتا ہے، کیونکہ اس کی شہرت وعظمت ثابت ہو چکتی ہے اور وہ ایسی چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کے مقابلے میں جو کم مشہور اور غیر معروف ہوتا ہے وہ ایسی باتوں کو زیادہ پرزور بنا کر اور بار بار دہراتا رہتا ہے تاکہ وہ اسی بنا پر کم سے کم شہرت کے ساتھ منسلک رہے۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ فردوسی ماخذات میں حضرت خواجہ نظام الدین اور حضرت رکن الدین فردوسی کے مابین کسی اختلاف یا عدم اخلاص کا عدم وجود یہ ثابت کر رہا ہے کہ سیر الاولیاء کی اکلوتی روایت یقیناً کسی تحریف یا غلط فہمی یا سہو ہی کا نتیجہ ہے۔

اس سلسلے میں خود حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ)، جو بذات خود حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے خلیفہ کے خلیفہ ہیں، کے ملفوظات سب سے بڑے ثبوت ہیں جن میں مختلف مقامات پر حضرت مخدوم جہاں نے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کا ذکر نہایت قدر و منزلت کے ساتھ فرمایا ہے اور بارہا ان پر سائل کے اعتراض کی تردید و تاویل فرمائی ہے۔ حضرت شیخ رکن الدین فردوسی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مابین کیسے تعلقات و مراسم تھے، اس سلسلے میں بھی حضرت مخدوم جہاں کا مندرجہ ذیل بیان سیر الاولیا، کی متذکرہ حکایت کالعدم قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اس سے قبل دہلی میں حضرت شیخ رکن الدین (فردوسی)، شیخی یعنی بزرگی میں مشہور و معروف ہوئے ہیں، اپنے پیروں کا عرس کرتے تھے، بلکہ آپ ہی نے دہلی میں (اپنے بزرگوں کے) عرس کو عام کیا۔ اس زمانہ میں شیخ نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ غیاث پور میں نو وارد تھے، وہاں ایک خاص جگہ میں قیام فرماتے تھے۔ ابھی تک آپ کی شہرت نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی دولت و نعمت میں روز افزوں ترقی تھی۔ حضرت شیخ رکن الدین، حضرت شیخ نظام الدین (اولیا) کو عرس میں شرکت کی دعوت دیتے تھے اور آپ عرس میں تشریف لاتے تھے۔ ہمارے شیخ کی والدہ ایک بزرگ عورت تھیں۔ نعمتوں سے مالا مال تھیں۔ یہاں تک کہ لوگ ان کو بھی شیخ کہتے تھے۔ ایک دن شیخ رکن الدین سے فرمانے لگیں۔ سنتی ہوں کہ غیاث پور میں شیخ نظام الدین بدایونی رہتے ہیں وہ کیسے ہیں اور انہیں کس طرح دیکھ سکتی ہوں؟ شیخ رکن الدین نے فرمایا کہ میں انہیں عرس میں بلاؤں گا، گھر میں ایک خاص جگہ ان کے لئے مخصوص کر دوں گا۔ ان کو وہاں پر لا کر بٹھاؤں گا۔ اور آپ کو جہاں پر کہوں وہاں پر بیٹھ جائیں گی۔ میں بھی اس مجلس میں رہوں گا، انگلی سے اشارہ کر دوں گا کہ یہی ہیں۔ حضرت نے ویسا ہی کیا۔ والدہ کو اسی جگہ لے جا کر بیٹھا دیا جہاں پر کہا تھا اور خود اس مجلس میں چلے گئے جہاں شیخ نظام الدین (اولیا) تشریف فرما تھے۔ وہیں پر سے انگلی سے اشارہ کر دیا کہ یہی ہیں۔ حضرت کی والدہ نے ان کو دیکھ لیا اور پھر اپنی جگہ پر چلی گئیں۔ اس کے بعد شیخ رکن الدین نے ان سے دریافت کیا کہ شیخ نظام الدین کو دیکھا، کیسا پایا؟ حضرت کی والدہ نے فرمایا کہ میں نے ان کی پیشانی میں ایسا نور دیکھا کہ (جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ) دہلی میں وہ کارنامہ انجام دیں گے جو کسی نے نہیں کیا۔''

(خوان پر نعمت، ملفوظات مخدوم جہاں، مدت جمع ۷۵۱-۷۴۹ھ)

حضرت مخدوم جہاں کے مذکورہ بیان کے بعد ایک بار پھر سیر الاولیا، کی جانب واپس لوٹا جائے تو ناقابل یقین زیر بحث حکایت سے متصلاً ٹھیک پہلے ایک روایت اس طرح ملتی ہے:

> ''ایک دفعہ شیخ نور الدین فردوسی نے اپنے تین مریدوں کو سلطان المشائخ کی خدمت میں بھیجا کہ میں نے شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین کی روح پر فتوح کے ایصال ثواب کے لئے کچھ کھانا پکوایا ہے۔ از راہ بندہ نوازی آپ بھی تشریف لائیں۔ پھر ان تینوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر سلطان المشائخ، شیخ ہیں، تو مجھے کھانے کی کوئی چیز عنایت فرمائیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ مجھے کپڑا عنایت ہوگا۔ تیسرے نے کہا کہ

بزرگوں کا امتحان نہیں کرنا چاہیے اور اس قسم کی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ جب یہ تینوں سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم حاضر نہ ہوسکیں گے کیوں کہ آج ہم نے خود کھانا پکوایا ہے لیکن ہمارا دل تمہاری مجلس میں ہوگا۔ ابھی یہ بات ہورہی تھی کہ ایک شخص دہی کا ایک دیگچہ اور چار ٹنکے لے کر حاضر ہوا۔ سلطان المشائخ نے خادم سے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دو۔ پھر اس شخص سے فرمایا کہ تم نے کھانے کی چیز اور روپے کے لئے دل میں سوچا تھا۔ پھر خادم سے فرمایا کہ اس دوسرے آدمی کے لئے کپڑا لاؤ اور اس کو دو۔ پھر تیسرے شخص سے فرمایا کہ اہل دل کی خدمت میں اسی طرح آنا چاہیے، جس خیال کے ساتھ تم آئے ہو اور خادم کو حکم دیا کہ دو ٹنکے اس کو بھی دو۔"

ٹھیک اس واقعہ کے بعد "کاتب حروف عرض کرتا ہے" سے روایت معترضہ شروع ہوتی ہے۔ حضرت مخدوم جہاں کا بیان اور سیر الاولیاء کی یہ دونوں روایتیں پڑھنے کے بعد یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ شیخ نور الدین فردوسی سہو کاتب ہے اور وہ دراصل شیخ رکن الدین فردوسی ہی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ شیخ رکن الدین فردوسی کی وسعت قلبی اور وسیع المشربی کا یہ عالم تھا کہ اپنے پیران سلسلہ کے علاوہ دیگر مشائخ کرام کے ایصال ثواب کے لئے بھی کھانے پکواتے اور مجالس کا اہتمام فرماتے تھے اور ان مجالس میں خواجہ نظام الدین اولیا بنفس نفیس شرکت فرماتے تھے اور اگر جانے سے معذور ہوتے تو اس طرح فرماتے کہ:

"میں حاضر نہ ہوسکوں گا۔۔۔ لیکن میرا دل تمہاری مجلس میں ہوگا"

لہذا حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے درمیان کسی قسم کے عدم اخلاص یا رنجش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ دونوں بزرگوں کے مراسم دیرینہ اور خوش گوار تھے۔

حضرت شیخ رکن الدین فردوسی اور ان کے بھائی نیز مرید وخلیفہ حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مخلصانہ وبرادرانہ مراسم تھے، اس کا اندازہ لطائف اشرفی (ملفوظات حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی) سے بھی ہوتا ہے کہ جب مخدوم جہاں شیخ شرف الدین الدین احمد یحییٰ منیری، حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں بہ نیت بیعت حاضر ہوئے تو حضرت سلطان المشائخ نے یہ کہہ کر رخصت فرمایا کہ

"برادرم شرف الدین نصیب ارادت وحصول سلوک شما برادرم نجیب الدین فردوسی است بروید که ایشاں مترصد قدوم شما و منتظر حضور معلوم اند"

شیخ رکن الدین فردوسی کے بھائی اور مرید وخلیفہ حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی کو "برادرم" کہہ کے مخاطب کرتے اور ان کے پاس شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری جیسے شاندار واعلیٰ مستقبل والے نوجوان (سیمرغیست، نصیب دام مانیست) کو ارادت وتربیت کے لئے بھیجنے سے کسی اختلاف یا رنجش کی بو آتی ہے یا محبت واخوت کی خوشبو؟

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نے اپنے ملفوظات میں جس عقیدت ومحبت کے ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے پیرومرشد حضرت خواجہ فرید الدین مسعود اجودھنی قدس سرہما کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک اسی طرح حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ نے اپنے ملفوظات میں حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے پیرومرشد حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی اور ان کے پیرومرشد حضرت شیخ سیف الدین باخرزی کا ذکر نہایت عقیدت اور وارفتگی کے ساتھ فرمایا ہے۔

حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے پیرومرشد اور مربی حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی سے خواجہ نظام الدین کے کیسے مراسم تھے، اسے خود سیرالاولیاء کے مصنف اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"کاتب حروف نے اپنے والد سے سنا تھا کہ شیخ بدر الدین سمرقندی نہایت بزرگ تھے اور شیخ سیف الدین باخرزی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے شیخ نجم الدین کبریٰ کو

پایا تھا۔ سید زائر الحرمین تھے۔ حافظ اور دانش مند تھے۔ جس میں یہ کمال ہوں اس کی فضیلت کا کیا پوچھنا۔ سماع کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے۔ بغیر سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیا) کے سماع نہ سنتے تھے۔''

حضرت شیخ بدر الدین سمرقندی کا وصال ہوا تو شیخ رکن الدین فردوسی ان کے لائق جانشین ہوئے اس موقعہ پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بنفس نفیس ایصال ثواب کی مجلس میں تشریف لے گئے تھے، ملاحظہ ہو سیر الاولیا کی عبارت:

''جب شیخ بدر الدین سمرقندی رحمت حق سے جا ملے تو ان کو سنگولہ میں دفن کیا گیا۔ تیسرے روز سلطان المشائخ تشریف لائے۔ سماع کی مجلس منعقد ہوئی۔ سلطان المشائخ ذرا دیر سے پہنچے۔ اس لئے دوسرے قبرستان کے احاطے میں تشریف فرما ہوئے۔ جب اہل مجلس کھڑے ہوئے تو آپ بھی کھڑے ہوئے۔ مجلس کے بعض حاضرین نے عرض کیا کہ آپ کے اور مجلس کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔ آپ نے فرمایا کہ اہل مجلس کی مواقفت کرنا ضروری ہے۔'' (ص:۵۵۶)

خود مناقب الاصفیاء میں حضرت شیخ رکن الدین فردوسی کے پیر و مرشد اور شیخ الشیخ حضرت شیخ سیف الدین باخرزی کے حالات زیادہ تر خواجہ نظام الدین اولیا سے منقول ہیں۔ یہ سارے حوالے اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے پیران کے فردوسی اکابر و مشائخ بشمول خواجہ رکن الدین فردوسی سے دیرینہ و پرخلوص تعلقات تھے۔ اس کے برخلاف سیر الاولیاء کی اکلوتی حکایت کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

سیر الاولیاء ہندوستان میں قدیم ترین تذکرۂ صوفیہ ہے اور اس کی اہمیت مسلم ہے، لیکن اس کے متن کی گہرائی سے چھان پھٹک نے جدید محققین کو تحریف کا واضح اشارہ دیا ہے اور وہ لوگ سیر الاولیاء کے متن کو 'الف' سے 'ی' تک مستند ماننے پر تیار نہیں ہیں، چنانچہ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''کتاب کا نام سیر الاولیا فی محبت الحق جل وعلا ہے (سیر بروزن خیر) اس کی تالیف کے بارے میں اندازہ یہ ہے کہ ۷۵۲ھ سے شروع ہو کر ۷۹۰ھ تک کار تالیف جاری رہا۔ اس میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کا ذکر ہے جو ۷۸۹ھ میں واقع ہوئی۔ مؤلف سیر الاولیا کا انتقال ۷۷۰ھ میں ہو چکا تھا، یہ اضافے زمانہ مابعد میں کسی نے کیے ہوں گے .... سیر الاولیا کا اردو ترجمہ دوبارہ ہو چکا ہے مگر فارسی متن کی تحقیق و تدوین جیسی ہونی چاہیے ابھی تک نہیں ہوئی۔ اس میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور شخصی اغراض سے کچھ تحریف و الحاق بھی ہوا ہے۔

(مقدمہ قوام العقائد، ص:۱۲)

سیر الاولیاء میں سنین کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی فرماتے ہیں:

''سیر الاولیاء میں بعض سنہ صریحاً غلط ہیں''

(حاشیہ نقد ملفوظات ص:۱۲۷)

حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر سے خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت ملنے کی تاریخ بھی سیر الاولیاء میں غلط مندرج ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کی تحقیق ملاحظہ ہو:

''سیر الاولیاء، ص:۱۱۶ میں خلافت ملنے کی تاریخ ۱۳ر رمضان ۶۶۹ھ ملتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے اور درر نظامی کی روایت یعنی ۶۶۰ھ صحیح معلوم ہوتی ہے''

(حاشیہ نقد ملفوظات ص:۱۳۸)

حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی کے وصال کا ذکر سیر الاولیاء میں موجود ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاف گوئی کے ساتھ فرماتے ہیں:

''سیر الاولیاء ص:۱۱۷ میں یہی واقعہ ہے مگر شیخ جمال ہانسوی کا نام نہیں لکھا "بزرگ بود از خلفائے شیخ شیخ العالم" لکھا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے نام حذف کر دیا ہو۔ کتابوں میں اس طرح کی تحریفیں ہمیشہ ہوتی آئی ہیں اور سیر الاولیاء میں تو یقیناً ہوئی ہیں''

(حاشیہ نقد ملفوظات، ص:۱۵۴)

پروفیسر نثار احمد فاروقی پر ہی بس نہیں، مشہور مؤرخ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی بھی سیر الاولیاء کے سلسلے میں اپنے ایک مقالے میں بڑی صاف گوئی سے اظہار خیال فرماتے ہیں:

''خواجہ معین الدین چشتی کا فوائد الفواد میں بہت کم ذکر ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے اخیر میں میر خورد نے سیر الاولیا میں کچھ زیادہ ذکر کیا ہے لیکن یہ بھی غلط روایت سے پاک نہیں ہے۔ شیخ محمد اکرام نے سیر الاولیا بعد کے تذکروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ اجمیر میں فتح دہلی کے پہلے پرتھوی راج کے زمانے میں سکونت پذیر ہوئے لیکن ان بہتر ماخذوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں سیر الاولیا کے برعکس شہادت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر صدر الصدور۔'' (اردو میں تاریخ نویسی ص:۱۹۹)

اس لئے سیر الاولیاء کی پیش کردہ اطلاع اگر کسی دوسرے مستند ماخذ میں بھی پائی جاتی ہے تو اس کے صحیح ودرست ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اگر کسی دوسرے مستند ماخذ میں اس کے برخلاف اطلاعات ملتی ہیں تو اس کے مقابلے میں سیر الاولیاء کی روایت نا قابل قبول اور ساقط الاعتبار ٹھہرے گی۔ سیر الاولیا میں اکابر کی ڈگر سے تعصب اور بغض سے بھری اطلاع کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبدالرحمن ابن ملجم نے، جو امیر معاویہ کی طرف ہو گیا تھا عین نماز میں اپنی زہر آلود تلوار سے آپ کو سخت زخم لگایا۔'' (ص:۷۹)

حضرت امام حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بارے میں یہ اطلاع سیر الاولیاء میں ملتی ہے کہ

''امیر المومنین حضرت امام حسین کی بیوی جعدہ بنت اشعث کندی نے امیر معاویہ کے اشارے سے کسی نہ کسی ترکیب سے موقع پاکر زہر دے دیا'' ص ۱۲

لہٰذا میری ناقص رائے میں [illegible] چلی آرہی یہ خلش حضرت شیخ رکن الدین فردوسی اور خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہما کے درمیان کچھ تھا، آج بالکل دور ہو گئی اور دونوں مستند بزرگوں کے درمیان جو خلوص اور ارتباط قلبی تھا وہ بالکل واضح ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب.

مناقب الاصفیاء کے نادر ماخذات

مناقب الاصفیاء میں معروف ماخذات کے علاوہ کچھ ایسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو اب بالکل نا پید ہیں تا دم تحریر ان کے بارے میں لاعلمی ہے مثلاً

برہان الاتقیا	مصنفہ	لا معلوم
رسالہ بیدار نامہ	''	خواجہ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی
مصفّی	''	مولانا علی کمال دانشمند
سراج العارفین	ملفوظات	خواجہ نظام الدین اولیا

کاش مناقب الاصفیاء میں یہ سب ہوتا

مناقب الاصفیاء نہ صرف سلسلۂ فردوسیہ کی تاریخی دستاویز ہے بلکہ بہار میں صوفیائے کرام کی مہتم بالشان تبلیغ ودعوت کا سب سے پرانا ریکارڈ بھی ہے۔ بہت سارے واقعات اور حالات ہم صرف مناقب الاصفیاء کی وجہ کر جان پائے ہیں۔ اس دور سے متعلق بہتیرے نقوش مناقب الاصفیاء کے مطالعہ کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن بعض معاملات میں اس کے باوجود بھی مایوسی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ رکن الدین فردوسی اور حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی سے متعلق بہت کم معلومات بلکہ نا کے برابر اطلاعات مہیا ہیں، اس سلسلے میں مناقب الاصفیاء بھی مایوس کرتی ہے۔ حضرت مخدوم جہاں کی جائے پیدائش، سن پیدائش، تاریخ پیدائش اور یوم ولادت کچھ بھی مناقب الاصفیاء میں درج نہیں۔ حضرت مخدوم کے اباواجداد سے متعلق بھی مناقب الاصفیاء کی خاموشی کھلتی ہے۔ حضرت مخدوم جہاں کے نانا قاضی شہاب الدین کے متعلق بھی صرف ایک سطر کی رسمی اطلاع حیرت انگیز ہے۔ اگر اس جانب صاحب مناقب الاصفیاء نے ایک ذرا مزید توجہ فرمائی ہوتی تو تاریخی اعتبار سے مزید احسان ہوتا۔ حضرت مخدوم جہاں کی تصانیف کا جائزہ تو درکنار موجود ودستیاب تصانیف کی کوئی فہرست بھی نہیں پیش کی گئی ہے۔ مکتوبات قدیم (مکتوبات صدی) ،معدن المعانی اجوبہ کا کوئی اور شرح آداب المریدین کے علاوہ کسی تصنیف کا نام تک مناقب الاصفیاء میں نہیں آیا۔ حضرت مخدوم جہاں کے وصال کے بارے میں بھی مصنف نے وصیت نامہ کے علاوہ مزید

کوئی اطلاع فراہم نہیں کی ہے۔ کیفیت نماز جنازہ وتدفین وما بعد تدفین پر بالکل خاموش ہے۔ سیر الاولیاء جس کے نشان راہ پر چل کر مناقب الاصفیاء تالیف ہوئی اگر اس کی بھی پیروی کی گئی ہوتی تو حضرت مخدوم جہاں کے عزیز واقربا اور خلفا کے متعلق بڑی نادر معلومات یکجا ہو جاتیں۔ لیکن افسوس مناقب الاصفیاء کے مصنف نے اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں فرمائی۔ یہی کچھ حال حضرت مولانا مظفر بلخی قدس سرہ کے حالات کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے کہ مناقب الاصفیاء کا متن حضرت مولانا مظفر بلخی کے واقعہ وصال پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر مخدوم حسین سے متعلق بھی کچھ معاصر چشم دید حالات ضمناً جمع کر لیے گئے ہوتے تو یہ بڑے کارآمد اور بیش قیمت ہوتے۔ لیس للانسان الا ماسعی.

حاشیہ

۱- ''در اکثر نسخه مناقب الاصفیاء چنیں مرقوم است که (استاذ حضرت مخدوم که داشت آں را به نکاح مخدوم در داد و از کنیز که مذکور فرزندے متولد خواهد شد که نامش ذکی الدین کرد) در بعض نسخه چنیں مرقوم است که (چوں حضرت اوستاد اشارتے به نکاحش از دختر خود شان شد و حضرت مخدوم از فرط شوق تکمیل علم ظاهر و باطن انکار کردتا آنکه به مرضے مبتلا شد که با تفاق اطباء علاجش جز نکاح نبود لهذا با دختر اوستاد کد خدا شد وفرزندی ازان متولد شد نامش ذکی الدین کرده سپرده خویش فرمود)''

❁❁❁

ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ یہ **صوفیہ نمبر** سب کے لئے سامان تزکیہ ثابت ہو

حافظ محمد جمشید عالم قادری واراکین کمیٹی

مدرسہ گلشن مدینہ

مقام و پوسٹ سرسی، وایا نان پور، ضلع سیتا مڑھی، بہار

صوفی کوریڈور

''ملٹی کلچر ہندوستان میں صوفی درگاہوں سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ قومی ایکتا، ملکی سالمیت، امن وشانتی، محبت واخوت، عدم تشدد ورواداری، اہل مذاہب کا انسانی واخلاقی بنیادوں پر احترام وتکریم جیسے امور کو بڑھاوا دینے میں وہ مقدس جگہ بہت موثر ومفید ثابت ہوگی جہاں بلاتفریق مذہب وملت عوام حاضری دیتے ہیں۔ جہاں دن ورات دکھی دلوں کا علاج، روح کو سکون، نفرت کی جگہ محبت تقسیم ہوتی رہتی ہے اور وہ ہیں ''صوفی درگاہیں'' ہمارا یقین ہے کہ ہندوستان کا تھینک ٹینک (Think Tank) مستحکم وموثر لائحہ عمل تشکیل دے اور مرکزی و صوبائی حکومتیں عدل ومساوات کے ساتھ اس لائحہ عمل کی بجا آوری کا فریضہ انجام دیں تو ہمارے دیش میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی، دہشت گردی اور فرقہ پرستی کا گراف کم سے کم ہوتا جائے گا اور ہم 2020ء میں ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں ضرور دیکھ سکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تمام میڈیا کے ذمہ داروں سے ہماری اپیل ہے کہ بمبنگ کلچر کے خلاف صوفی تحریک میں موثر ومثبت حصہ داری ادا کریں۔ ہم نے ہندوستان اور اس کے صوبوں میں ''صوفی کوریڈور'' اور ''صوفی بیلٹ'' کی نشان دہی کی ہے، جن کی تعداد 500 ہے۔ ہمارے سروے کے مطابق صوفی درگاہوں کی یہ فہرست نامکمل ہے، سروے کا سلسلہ جاری ہے۔''

بحوالہ صوفی جرنل (پہلی سالانہ رپورٹ) 2007، ص: 37

تمل ناڈو کے 'اروی ادب' میں تصوف

علیم صبا نویدی .... مدیر اعلیٰ 'نور جنوب' چناپٹی

اسلامی دنیا میں تصوفانہ فلسفے کی ترویج کی روشنی میں تمل ناڈو میں تصوفانہ خیالات کی ترویج اور صوفیوں کی خدمات پر ہم آسانی سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مستشرقین میں سے اکثریت کا خیال ہے کہ نوافلاطونی فلسفے اور ہندو ویدانت کے خیالات کے اثرات کے باعث اسلامی تصوف کی بنیاد پڑی۔ یہ دراصل اسلامی تصوف سے بے بہرہ ہونے والوں ہی کا تصور ہے۔ انھوں نے اسلامی تصوف کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔

اسلامی تصوف کی بنیاد کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے قرآن وحدیث سے ہمیں کافی ثبوت ملتے ہیں۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں اسلامی تصوف کے سمجھنے میں بہت زیادہ مدد و معاون ہیں۔ مثلاً سورۃ النور (پینتیسویں سورہ، 24 ویں آیت) تصوف کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالنے میں مددگار ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا مقالہ ''مشکوۃ الانوار'' کی بنیاد اسی آیت پر رکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم ہی تصوف کا اہم ترین منبع ہے۔ آیت الکرسی ایک اور اہم ترین آیت ہے (2:3) جس میں اہم ترین روحانی حقیقتوں کو سادیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ہمیں احادیث نبوی سے بھی اسلامی تصوف پر روشنی ملتی ہے۔ کئی احادیث قدسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گہری حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے ہمیں تصوف سے قریب کیا ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں بڑی گہری حقیقتیں سمجھائی ہیں۔

(الف) صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ہریرہ نے بتایا ''میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے دو پیالے بھرے۔ میں نے ایک پیالے سے ایک حصہ تمھیں عطا کیا۔ اگر میں تم پر دوسرے حصے کی ماہیت فاش کردوں تو تم مجھے قتل کردو گے۔''

(ب) جب صحابی رسول حضرت عمر بن خطاب نے وفات پائی تو ان کے فرزند حضرت عبداللہ نے کہا کہ علم کے نو حصے وفات پا گئے اور انھیں معلوم تھا کہ اس قول سے پیچیدگی بڑھے گی تو انھوں نے صراحت کرتے ہوئے کہا کہ علم سے ان کی مراد معرفت الٰہی ہے نہ کہ علم فقہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صرف عباسی خلیفہ مامون (218-170ھ/ 833-786ء) کے دور میں بعض یونانی اور آریائی فلسفیانہ خیالات نے اسلامی دنیا کو اپنی طرف مائل کیا اور اس کے کچھ حصے عربی زبان میں ترجمے بھی کیے گئے۔ مگر اس دور میں اسلامی تصوف بہت عروج پا گیا تھا اور حضرت حسن بصری (110-21ھ/ 729-621ء)، حضرت رابعہ (وفات 135ھ/ 752ء)، بایزید بسطامی (وفات 261ھ/ 874ء) حسین ابن المنصور الحلاج (310-244ھ/ 922-858ء) جیسے صوفیا نے ایک دنیا کو متاثر کیا تھا۔

تمل ناڈو میں اور نیز سرندیپ میں اسلام کی روشنی عرب تاجرین اور صوفی بزرگوں کی آمد سے پھیلی۔ ان علاقوں کے مسلمان اس دور میں آئے ہوئے ان عربوں اور صوفیوں کے حقیقی روحانی وارث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑی گہرائی اور بڑی دلچسپی سے تصوف سے اپنا رشتہ استوار کیا۔

سرندیپ اور تمل ناڈو کے مسلمان ادبا اور علما نے اپنی تحریروں میں عرفان وتصوف کے موضوعات پر کافی نظر ڈالی۔ انھوں نے شرعی احکامات واصول کی ذرا بھر بھی خلاف ورزی کو روا نہیں رکھا۔ بادی النظر میں اس علاقہ کے اروی (تمل) علما نے اپنے غیر مسلم ہم عصروں سے اختلاف کرتے ہوئے بعض باتوں میں بعض اصولوں کی حد درجہ پابندی کی جن میں سے بعض یہ ہیں:

(1) وحدت پر اور حضور پر نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر ماننے پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ عرفان وتصوف کی نمایاں اور اولین

تخصیص ہے۔

(2) دنیوی زندگی فانی ہے اور یہ مختصر مدت کے لئے ہے اور حیات بعدالممات کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار دنیوی اعمال کے مطابق ہے۔

(3) اسلام کی بین الاقوامی برادریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ ساری انسانیت ایک ہے جس میں ذات پات نا قابلِ اعتنا ہے اور ہرانسان ایک ہی باپ، حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے۔

(4) تصوف اسلام کا روحانی پہلو ہے۔ جب تک انسان اپنے شعور میں رہتا ہے، صوفی یا ولی ہونے کے باوجود، اس پر شریعت کی پابندی لازمی ہے۔

تصوف اور رہبانیت میں بہت سی باتوں میں بعد ہے۔ راہب دنیا سے رابطہ توڑ کر خدا کی ذات میں فنا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تصوف کو اس تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ رہبانیت ہرگز ہرگز تصوف کے مترادف نہیں ہوسکتی۔ ایک صوفی اور ایک راہب میں بہت سی باتوں میں اختلاف ہے۔ فنافی الذات ہونا صوفی کا بھی شیوہ ہے اور اس فنائیت میں کسی طرح بھی خودکشی یا دنیا کوشی سے کام نہیں لیا جاتا، اروی صوفی کسی بھی صورت میں رہبانیت کو اپنے قریب آنے نہیں دیتا۔ براہ راست عرب اور فارسی مسلمان اہل اللہ ہی سے مستفید ہوا۔ اس نے پوری طرح سے آریائی رہبانیت یا نو افلاطونی فلسفے سے خود کو بے نیاز رکھا۔ اور آخرالذکر زمرے والوں سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ بعض عرب علما کے معقولاتی رویہ سے بھی سروکار نہیں، مثلاً ابوالاعلی المعاری (449۔363ھ/ 1057۔973ء) اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین (1399۔1307ھ/ 1978۔1889ء) جن کی تحریریں اسلامی عقائد اور اعمال سے بالکل منحرف ہیں۔ نیز اروی علما بعد کے اسلامی عالموں مثلاً مولانا مودودی کے بعض نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ نیز ہندوستانی ہندو فلسفوں اور خصوصاً تمل ناڈو کے فلسفیوں کے 'مایا فلسفہ' کی تشریح و تبلیغ کو بھی اروی علما نے رد کیا۔ 'مایا فلسفہ' دھن دولت، دنیاوی عیش وعشرت، جنسی زندگی اور خاندانی زندگی سے تنفر ظاہر کرتا ہے اس لئے وہ ان سب سے دامن بچانے کی تلقین کرتا ہے کیونکہ انھیں وہ اخلاق سوز قرار دیتا ہے اور اس کے لئے ذات کی نفی کرتے ہوئے اور جائز عیش و آرام سے دور رہتے ہوئے فنا ہو کر پوجے جانے والے دیوتا میں ضم ہونے پر زور دیتا ہے۔ سرندیپ اور اروی مسلمان صوفی اور اہل قلم اس نظریہ کے بالکل خلاف تھے۔ انھوں نے جائز حدوں میں دنیاوی عیش و آرام کی اجازت دی۔ انھوں نے 'فنائیت' میں اپنی ذات کو بالکل ختم کردینے سے زندگی کو ختم کردینے والے نظریہ سے بالکل اختلاف کیا۔ ''فنا'' سے مراد زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بالکل نفس کی ہوس کا خاتمہ مراد ہے۔ اس سے اللہ سے قرب حاصل کر کے اس کے ذریعہ اس کی مخلوقات سے محبت کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ ''فنا'' میں وہ نفیِ ذات نہیں جو ہندو فلسفہ نے بتایا ہے، بلکہ وہ نفیِ ذات ہے جس میں قرب الٰہی حاصل ہو اور ذاتِ بحت کی خصوصیات سے انسانی ذات مستفیض ہو۔ ذاتِ الٰہی سے قرب کے لئے اور اس ذات سے محبت کے لئے فنافی اللہ لازمی ہے اور اس کے لئے فنافی الرسول لازمی ہے۔ اور ''فنافی الرسول'' کے لئے ''فنافی الشیخ'' بہت ضروری ہے۔ اس سلسلہ کو اروی علما نے ''فناء الفناء'' کا نام دیا۔ اس فناء الفناء سے بندہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ ''بقا'' کے درجہ کو پہنچ کر آخری حدوں میں 'لِقا'' کی منزل پالیتا ہے۔

مذکورہ بالا صوفی خیالات کی ترویج کرنے والے شیوخ نے ''ذکر'' و ''فکر'' کو مقصد کی حصولی کے لئے بہت ضروری قرار دیا۔ ذکر اور فکر کے کئی طریقوں کو مریدوں میں واضح کیا تاکہ وہ ہر لحہ ذات کے قریب رہیں اور زندگی میں دیگر امور کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ قرب کی منزلوں کو طے کرنے والے امور میں بھی برابر لگے رہیں۔ اس علاقے کے جن شیوخ نے ایسے طریقے اختیار کیے ان میں سے بعض اہم ترین نام یہ ہیں:

1. ولی صفت شیخ صداقت اللہ۔(1115۔1042ھ/ 1703۔1632ء)
2. نوح ولی۔(متوفی 1156ھ/ 1743ء)
3. عمرولی۔(1216۔1162ھ/ 1801۔1748ء)
4. کایل پٹنم تیکا صاحب۔(1272۔1191ھ/ 1855۔1775ء)
5. کیلاکرے تیکا صاحب۔(1262۔1192ھ/ 1850۔1778ء)
6. امام العروس۔(1316۔1232ھ/ 1898۔1816ء)

7. شیخ مصطفیٰ سرندیپی۔(1305۔1252ھ/ 1887۔1836ء)
8. کاشاواتے عالم۔(متوفی 1314ھ/ 1898ء)
9. صاحب الخلوۃ سیّد عبدالقادر۔(1331۔1264ھ/ 1913۔1848ء)وغیرہم۔

خالق ومخلوق کے تعلقات:

اروی علما نے خالق کے ساتھ مخلوق کے کسی بھی مرحلے میں ضم ہوجانے کی نفی کی ہے۔ اسلام میں خالق کے ساتھ مخلوق کے ضم ہوجانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اعلان نہیں کیا ہے۔سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کوئی صوفی وولی خواہ کتنا ہی روحانی عروج حاصل کرلے وہ کبھی اللہ کی ذات میں ضم نہیں ہوسکتا۔ بندہ بندہ ہی رہے گا اور اللہ اللہ ہی۔ سب سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ قرب الٰہی حاصل کرلے۔ بندہ روحانی عروج میں اللہ کی ذات کا قرب ہی حاصل کرتا ہے۔ روحانی طور پر وہ جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی اسے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ذاتِ الٰہی، اس کے اسما، اس کی صفات بندے کی فہم ورسائی سے بالاتر ہیں۔ چاہے بندہ روحانی طور پر بلند ہوکر ایک صوفی سے ایک ولی کیوں نہ بن جائے وہ اللہ کا بندہ ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے تصور وقیاس کی اصلی حدوں اور اس کی روحانی اعلیٰ عظمتوں کے باوجود اس کے فہم و ادراک سے بعید ترین ذات ہے۔ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (1034۔971ھ/ 1624۔1563ء) کے الفاظ ہیں:

هُوَ سُبْحَانَه' وَرَاءُ الوَرَاءِ
ثُمَّ وَرَاءُ الوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الوَرَاءِ

اس قول کو کیلیا کرے کے ایک عالم مخدوم میران ولی (1247۔1183ھ/ 1831۔1769ء) نے اپنے والد مرحوم جمال محمد ولی پر لکھے گئے ایک قصیدہ میں تحریر کیا ہے۔اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ رسائی کی حدوں سے بہت دور ہے۔ پھر وہ دوریوں کی حدوں سے بھی دور ہے اور پھر ان حدوں۔سے بھی دور ہے۔

قرآن کریم نے بھی تصریحی لفظوں میں اعلان کیا ہے۔
سُبْحَانَه' و تَعالیٰ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوّاً کَبِیراً۔(17:43)
یعنی پاک ہے اور اعلیٰ ہے اس کی ذات اس سے بھی زیادہ جتنا وہ لوگ (اس کے بارے میں) کہتے ہیں۔

امام العروس نے اپنی تصنیف ''مغانی'' میں اشارہ کیا ہے کہ تخلیق کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ویسا ہی ہے جیسا وہ پہلے تھا اور کایل پٹنم کے تیکا صاحب اور صاحب الخلوۃ نے بھی اپنی تحریروں میں اللہ تعالیٰ سے متعلق اس طرح کا قول نقل کیا ہے۔هُوَ الآنَ کَمَا کَانَ۔

وہ (ذاتِ بحت) اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا (بعدِ تخلیقِ کائنات)

امام العروس اپنی تصنیف ''رِیاضةُ التَّصوُّف'' میں صفحہ 21 پر یوں رقم طراز ہیں:

(ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ کی بیس لازمی صفات میں سے ایک (صفت) یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ساری مخلوقات کے بالکل عین خلاف ہے۔(مُخَالِفَةُ لِلحَوَادِثِ)۔اللہ تعالیٰ نے بحیثیتِ خالق اپنے ارادے سے خلق کیا ہے۔ وہ ایک ہے اور اس کی مخلوقات کئی ہیں۔نہ اس کا آغاز ہے اور نہ اختتام۔(قَدِیمٌ وَبَاقِی) مگر اس کی مخلوقات کا آغاز بھی ہے اور اختتام بھی۔''

کئی واضح صفات یعنی (خصوصیات) بشمولیت حسبِ ذیل، اللہ اور اس کی مخلوقات کے درمیان از راہِ تعلق ہمیشہ بغیر کسی تبدیلی کی جوں کے توں رہیں گی۔

اللہ	مخلوق
خالق	مخلوق
رازق	مرزوق
مالک	مملوک
قادر	عاجز
قوی	ضعیف
صمد	محتاج
معبود	عبد

اللہ کی صفات مثبت ہیں۔ حیات، علم، سمع، بصر، ارادہ، کلام، قدرت اور ان خصوصیات میں وہ لامتناہی ہے جبکہ اس کی مخلوق منتہی ہے اور اس کی اپنی صفات نہیں ہیں۔اس کی صفات اللہ تعالیٰ کی صفات کے عین مقابل ہیں۔

تخلیق کی وجوہات:

ازروئے اسلام ذیل کی حدیث میں وجہ تخلیق خود خالق کے الفاظ میں یوں ہے:

كُنْتُ كنزاً مَخفِيًا فَاَحببتُ اَن اُعرَفَ فَخَلَقتُ الخَلقَ لِكَى اُعرَفَ۔

میں ایک مخفی خزانہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ پہچانا جاؤں۔ اس لئے میں نے تخلیق کی تا کہ میری پہچان ہو (جائے)۔ یہ حدیث عرفانیات میں بہت اہم ہے اور اس میں تصوف کے راز مضمر ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مثنوی میں اس حدیثِ قدسی کو لے کر ایک باب باندھا ہے۔ اروی صوفیا نے بھی اس حدیث پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

سلطان عبدالقادر جو "مستان صاحب یا گنرا گوڈی مستان" Kunna Kudi Mastan کے نام سے بہت مشہور ہیں (1254۔1207ھ/ 1838۔1792ء) وہ کیلاکرے کے تیکا صاحب ولی کے شاگرد اور مرید تھے۔ نیز وہ عربی اور اروی زبانوں کے زبردست شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر عرفانیات سے بھرپور ہزاروں اشعار کہے ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "قَصِيدَةُ الاَروِيَّة فِى عِرفانِ العَشرِيَّة" میں (صفحہ 563، 564 پر) اور نیز "مَجموعُ المستانية" میں (صفحہ 295 پر) اللہ تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے جو اشعار کہے ہیں ان کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

- کیا تو اپنی یکتائی (فردانیت) کی حالت میں ہے؟
- کیا تو اپنی سبحانیت کی حالت میں ہے؟
- کیا تو اپنی وحدت میں کثرت (شُهُودُ الكثرةِ فِى الوَحدَةِ)۔ کی حالت میں ہے؟
- کیا تو اپنی کمالیت کی حالت میں ہے؟
- کیا تو ذات یکتائی کی حالت میں ہے؟
- کیا تو اس نقطہ میں ہے جو الف ہے
- کیا تو عالمِ ملکوت میں ہے؟
- کیا تو عالمِ اسفل میں ہے؟
- بتا اے رحیم و کریم، تو ان حالتوں میں سے کس حالت میں ہے؟

ایک اور اروی عارفہ شاعرہ رسول بی بی Rasool Bivi نے مذکورۂ بالا حدیثِ قدسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک نظم تحریر کی ہے جس میں اس حدیث کی ترجمانی کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔

"میں" "فردانیت میں" "میں" تھا
پھر "میں" نے رحم (رحمِ مادر) پیدا کیا
اس غرض سے کہ معروف ہو جاؤں
اس طرح کہ "میں" اور تو کی دوئی ہو
اس وقت رحم کے اندھیارے میں
تخلیق کے جذبہ میں
ہر ایک کو آغوش میں لیتے ہوئے نور کی طرح حقیقت پھلانگ پڑی، مقدس "میں" نے
تمام عالموں اور تمام سمتوں میں تکثیر کے ساتھ
بطور "فرد دیگر" خود کی تردید کر لی
"میں" تاہم کسی حرف میں ایک نقطہ کی طرح منفرد، یکتا و تنہا رہا

تنزلات:

مستان صاحب علیہ الرحمہ نے مراتب النزول سے متعلق بڑی وضاحت کی ہے اور یہ توضیح اہلِ عرفان کی خاص زبان میں (یعنی ان کی اصطلاح میں) خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

ذاتِ بحت اپنے تعارف کے لئے جب نزول کرتا ہے تو "الاٰن كَمَا كَان" ہی کی شان میں رہتے ہوئے مختلف عالموں کی سیر کرتا اور کراتا ہے۔

ذاتِ بحت اپنی خالص وجودیت یعنی ذَاتُ الكِبرِيَاء المَحض" سے نزول کرتا ہے۔ پہلی حالت میں وہ "كنزُ مخفی" تھا۔ غیر تقسیم پذیر یکتائی میں اس کی ذات "مَسكُوتٌ عَنهُ القَدِيمُ العَمَاء" ہے (وہ آنکھوں پر اندھے پن کی طرح رہ کر آنکھوں کو چوندھیانے والی ضیا بن جاتا ہے)

جب وہ پہلا نزول کرتا ہے تو اس کی شان 'احدیت' یعنی مطلق یکتائی کی ہوتی ہے۔

اس سے 'وحدت' کی شان کا پرتو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کثرت میں یکتائی والی شان ہے۔

اور پھر "واحدیت" کی شان ہے۔ "وحدت" ابتدائی مکانات

اور ''واحدیت'' ثانوی امکانات کی دو عرفانی اصطلاحات ہیں۔

اس کے بعد کا نزول ''عالم الارواح'' ہے۔ یہ مقدس عالم کی لازمی شرط ہے۔ عالم ارواح کے بعد عالم اجسام ہے۔ یہ عالمِ عناصر ہے۔

اس کے فوراً بعد ''عالم الانسان'' ہے۔ یہاں آ کر ذات، بلا نزولِ دیگر جمال وجلال کا پورا روپ دھار لیتی ہے۔

یہ تنزلات تخلیق کے تمام مراحل کا ایک جائزہ ہیں مگر ذاتِ بحت اب بھی اپنی یکتائی کے ساتھ جیسی تھی ویسی ہی ہے اور اس میں نہ کوئی تبدیلی ہے اور نہ کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

اس کی شان ''الآن کما کان'' اب بھی اس کے حق میں بالکل درست ہے۔

امام العروس نے اپنے طور پر تنزلات کی توضیح کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مراتب النزول لاتعداد ہیں۔ بعض صوفیا نے ان کی چالیس منزلیں متعین کی ہیں اور بعض نے ان کا اختصار کر کے محض سات منزلیں قرار دی ہیں۔

(i) پہلی منزل ''احدیت'' کہلاتی ہے (یہ منزل غیر توضیحِ صورت کی حامل ہے اور نہ اس کا مشاہدہ ممکن ہے)۔ اس منزل کو پانچ اور ناموں سے موسوم کرتے ہیں:

(1) مَرتبَةُ العَمَاء۔
(2) مَرتبةُ تَعَيُّن۔
(3) مَرتبةُ الاطلاق۔
(4) مَرتَبَةُ ذَاتِ البحت
(5) مَرتَبَةُ ذَاتِ السَّاذج

صوفیا نے بغیر توضیح کے محض ان ناموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس منزل کے نام کا ذکر امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث سے ماخوذ ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ہمارا رب حق قبل از تخلیقِ مخلوقات کہاں (کس صورت میں) تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ ''عماء'' میں (یعنی اندھیرے میں تھا) (اس حدیث سے یہ مراد نہیں لینا چاہیے کہ رب حق تعالیٰ جو خود نور ہے اندھیرے میں تھا مگر تخلیق خود اندھیرے میں تھی)

(ii) دوسری منزل ''وحدت'' کہلاتی ہے یہ پہلا تعین یا امکانِ اوّل ہے۔ اس منزل کے بھی دیگر نام بیان کیے گئے ہیں:

(1) حقیقتِ محمدی (الحقیقةُ المُحمَّدِيَة)
(2) شوؤن ذات (شُئُونُ ذَاتِيَّة)
(3) تعیّن اوّل (التعین الاوّل)

(iii) تیسری منزل ''واحدیت'' ہے۔ اس تنزل کے دیگر نام یہ ہیں:

(1) حقیقتِ آدم (حَقِيقَةُ ادمْ)
(2) اعیانِ ثابتہ (اَعيَانِ ثَابِتَه)
(3) تعیّن ثانی
(4) عالم ارواح (عَالَمِ الاروَاح)

(iv) چوتھی منزل عالم لاہوت (عالم الاھوت) ہے (اس میں اللہ کے اسما، اس کی جلالیت، جمالیت، نور محمدی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے)

جلالیت اور جمالیت ان دونوں صفات کے توازن میں نور محمدی کی ضرورت ہے۔ صوفیا نے ان کو برملا بیان نہیں کیا ہے۔ محض پیرومرشد ہی کی تلقین سے مرید پر اس کی وضاحت ممکن ہوسکتی ہے۔ تاہم ان دونوں کی توضیح ایک حد تک ہی کی گئی ہے۔

(v) پانچویں منزل ''عالم المثال'' ہے۔ اس کو ''عالم الجبر'' بھی کہتے ہیں۔

(vi) چھٹی منزل ''عالم الاجسام'' ہے۔ یہ چار عناصر سے بنا ہے (مٹی، پانی، ہوا، آگ)۔ اس عالم کو عالم شہادت بھی کہتے ہیں۔

(vii) ساتویں منزل: ''عالم الانسان'' ہے۔ یہ ''عالم ناسوت'' بھی کہلاتا ہے۔

عارف ان منزلوں کی سیر کرتا ہے، یہ سیر ''مبداء'' سے ہوکر ''معاذ'' پر ختم ہوتی ہے۔ اسی کو عارفین سلوک کی منزلیں کہتے ہیں۔

(کئی عالموں سے آخری عالم تک آنے ہی کی دلیل میں امام العروس نے یہ آیت قرأت کی ''ثُمَّ رَدَدنَاهُ اَسفَلَ السَّافِلِين''

امام العروس کے خیال میں انسان کی بنیاد ''مبداء'' میں ہے۔ یہ نزول کی آخری منزل ہے جو ''منکوس'' ہے۔ اس کی ضد ''معاذ'' ہے جو ''معکوس'' ہے۔ ''عروج'' ارتقائی شان ہے۔ ''معاذ'' نزولی شان ہے۔

اردو مسلم عرفا نے تصوف کے تین مکتب خیال طے کیے ہیں۔

(1) وجودی مکتبِ خیال: اس خیال کے حامی شیخ اکبر حضرت محی

الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ تصور ''وحدۃ الوجود'' سے موسوم ہے۔(1240۔1164ء/638۔560ھ)

(2) شہودی مکتب خیال: حضرت علاء الدولہ سمنانی اس کے حامی ہیں۔ اس تصور کی وضاحت حضرت عبدالکریم جیلی (1428۔1365ء/832۔767ھ) نے کی ہے۔ اس مکتب خیال کی سب سے زیادہ حمایت کرنے والوں میں حضرت مجدد الف ثانی (1624۔1563ء/1034-971ھ) کا نام گرامی آتا ہے۔ یہ تصور ''وحدۃ الشہود'' سے موسوم ہے۔

(3) متکلمین کا مکتب خیال: امام ابومنصور الماتریدی الحنفی اس کے حامی ہیں (متوفی 944ء/333ھ)۔

ہر مکتب خیال میں کئی اولیا صفت عارفین گزرے ہیں۔ معروف اروی عارفین پہلے مکتب خیال ہی کے حامی ہیں۔ ان میں سے بعض ہیں:

شیخ صداقت اللہ، محمود طیبی، عمر ولی، دونوں تیکا صاحبان اور سرندیپ میں ان کے خلفا (مثلاً کشاوتی عالم، شیخ مصطفیٰ ولی، مستان صاحب، امام العروس، صاحب الخلوت)۔ ان تمام صوفیائے کرام نے صرف وجودیت کی تلقین وترویج کی۔

نور محمدی:

اسلامی تصوف میں ''نور محمدی'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک کائنات کی تخلیق کا باعث ''نور محمدی'' ہی ہے۔ یہی تمام تخلیقات میں اولین تخلیق ہے۔ مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ تصور محض تیسری صدی ہجری میں پہلے پہل صوفیائے کرام میں رائج ہوا جب کہ قرآنی آیت (7:157) اس تصور کے آغاز کے ثبوت میں ہے۔ شیخ صداقت اللہ نے اپنی تصنیف ''وتریہ'' میں بتایا ہے۔ قرآن کریم سے پیشتر کے صحیفوں تورات، زبور اور انجیل میں اس کا اظہار ہے۔ اروی علما میں اس تصور کی پوری حمایت ملتی ہے۔ امام العروس، محمد غوث از میلا پالیم وغیرہ نے اس تصور کی ترویج کی۔

اروی تصوف میں موت کی دو قسموں پر بھی بحث کی گئی ہے یعنی:

(1) المَوتُ الحقیقی (2) المَوت الارادی۔

امام العروس کہتے ہیں، موتِ حقیقی میں جسم اور روح کے درمیان رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ موت ارادی صرف اولیا سے ممکن ہے۔ وہ جسم سے کئی نفسانی خواہشات کو کاٹ کر نکال دیتے ہیں اور جسم کو موت حقیقی کے قریب کر دیتے ہیں۔ اسی قسم دوم موت کی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

مُوتُوا قبل ان تموتوا۔ (موت سے پہلے موت کا تجربہ کر لو)

مولی محی الدین عالم (متوفی 1940ء/1360ھ) نے اپنے شیخ سید محمد سرندیپی المعروف بہ کولمبو عالم صاحب (متوفی 1912ء/1331ھ) پر ایک مرثیہ ان دونوں اموات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق سے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ (حضرت ابوبکر) وہ شخص ہیں جو چلتی پھرتی میت ہیں۔

ولکن المنیۃ موتتان
ارادی کطبعی قضی
وَھذَا فِی العُمُومِ وَذاکَ خاصٌ
بحقِ العَارِف الصمد البھیّ
فَیا طُوبیٰ لِمَن ذاق الارادی
فعُقباہ باسرع کلّ شئی
فھذا مَا اُشیر لنا الیہ
بموتُوا قبلَ موتکُمُ الشئی
وَھذا سِرُّ تسمیۃ النبیّ
لصَاحِبہ بذا المیتِ المَشیّ

اروی عارفین جب کبھی کسی عارف کی موت کا ذکر کرتے ہیں، تو اس حادثہ کے لئے:

اِنتقل اِلیٰ دار الاٰخِرۃ. (دار الآخرت کی طرف انتقال)

اِحتجب نفسہٗ. (خود پر حجاب ڈال لیا)

وارَی الوَریٰ فی ثریٰ.

(خود کو دنیا کی نظر سے بچانے کے لئے مٹی سے ڈھانک لیا)

جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ امیر العلما سلیمان ولی نے ایک ولی صفت صوفی المعروف بہ لبّے اپّا پر لکھے ایک مرثیہ میں واری الوریٰ فی ثریٰ کا جملہ استعمال کیا ہے:

وارِی الوریٰ فی ثریٰ قایل وراہٗ وریٰ
رند الاسیٰ زندنار فِی خشاخشم

سینی محمد عالم کیلاکرے (1854۔1780ء/1271۔1194ھ) نے ولی صفت ابوبکر توندی پر لکھے ایک مرثیہ میں یوں لکھا ہے:

غَرَّ الدَّرِیٰ فِی الکِرِ کَرِیٰ کرِیٰ بذارا
وَارِیٰ الوریٰ بشریٰ تندِی ذَالقمرَا

وجود یہ مکتب کے صوفیا کرام کے خیالات کے حامی اروی صوفیا میں مشہور صوفیا کے نام یہ ہیں:

شیخ صداقت اللہ، محمود طیبی، عمرولی، شیخ مصطفیٰ صاحب، مستان صاحب، امام العروس، صاحب الخلوت۔

مکتب وحدت الشہود کے قائل صوفیا میں ہمیں کوئی معروف شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ یہی حال متکلمین کا ہے۔ صوفی عبدالمجید (ازکوڈی کل پالیم) (1983۔1906ء/1404۔1324ھ) لکھتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک جادۂ تصوف پر قدم رکھ نہیں سکتا جب تک اس میں یہ تین خصوصیات پیدا نہیں ہو جاتیں:

(1) اَلعَجزُ الکُلِّی، مکمل عجز (انکساری)
(2) اَلجَھلُ الکُلِّی، مکمل جہل (جہل مطلق)
(3) التَّوَاضُعُ الکُلِّی مکمل تواضع (خاطرداری)

کیلاکرے کے شیخ احمد "عبدالقادر (1976۔1891ء/1397۔1309ھ) جو شیخ نایگم کے نام سے معروف ہیں، اپنا نام جب بھی لکھتے تھے تو یہ جملے ضرور لکھتے:

"العبد العاصی العاجز الجاھل"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی انکساری پر توثیقی کلمات بیان فرمائے ہیں: فَھُوَ سُبحَانَہٗ مَنْ لَم یَجعَل لِلخَلقِ اِلَیہِ سَبِیلاً اِلَّا بالعجزِ عَن مَعرِفَتِہٖ۔

اس تحریر سے ہمیں یہاں اختتام میں چند خاص باتیں اروی عرفا سے متعلق بیان کرنی ہیں، وہ یہ کہ:

- اروی صوفیا نے شریعت وطریقت کی پوری پابندی کی ہے۔
- وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کے متلاشی ہیں۔
- ان کی زندگیاں بہت سادہ اور عیوب سے پاک ہیں۔
- ان کی تعلیم وتلقین میں بلا کی جاذبیت اس لئے پائی جاتی ہے کہ وہ قول وعمل دونوں میں سچے تھے۔
- وہ رواداری کے قائل تھے۔
- ذات پات اور بھید بھاؤ سے بہت دُور تھے۔
- ان کے ہاں خلوص عمل اور خلوصِ ارادی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔
- ایک اللہ والا ہزار عالموں سے بہتر تھا۔
- ان کی معیت میں معمولی شخص بھی سلوک کی منزلیں طے کر کے ولی صفت بن جاتا تھا۔
- یہ صوفیا کرام ظاہری علما کے عین ضد تھے۔ انھیں نہ ہی اپنے علم و فضل کا گھمنڈ تھا اور نہ ہی وہ خود کو کسی سے اعلیٰ اور ارفع سمجھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ تمل ناڈو (اور سرندیپ) میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا اور آج بھی غیر مسلموں کے ہاں ان کا وقار اور ان کی عظمت برقرار ہے۔ ان کے باعث ان علاقوں میں امنِ عام قائم رہا اور کئی اولیائے کرام پردہ کر جانے کے بعد بھی لوگوں پر اپنا روحانی اثر ڈال رہے ہیں اور ہمیشہ ڈالتے رہیں گے۔

❁❁❁

تصوف کا ارتقائی سفر اور عصر حاضر کی شعری روایات

ڈاکٹر بشریٰ اعجاز ..... کشمیر

فاطمہ نیشاپوری نے دار کے نیچے محو عبادت منصور حلاج سے پوچھا تھا ''یا شیخ تصوف کیا ہے؟'' منصور کی آواز بمشکل اس تک پہنچ پائی، اس نے کان لگا کر سنا ہونٹ ہل رہے تھے اور منصور کہہ رہے تھے، ''جو آج دیکھا اور جو کل دیکھو گے'' فاطمہ نے سوال کیا، آپ لوگوں کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتے؟'' مگر جواب فاطمہ نیشاپوری تک پہنچ نہیں پایا کیونکہ عناصر مل کر انا الحق کہہ رہے تھے اور کائنات میں یہی آواز آرہی تھی، انا الحق، انا الحق۔

صوفی کون ہے، حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب میں ایک اہلِ طریقت بزرگ کا قول درج ہے۔ جن کو محبت پاک صاف کر دیتی ہے، وہ صافی ہوتا ہے اور وہ جو اللہ کے عشق میں ڈوب کر ماسواسے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صوفی ہوتا ہے۔

عباسی دور حکومت میں عشق وعشرت کی فراوانی تھی ظلم و جبر کا دور دورہ تھا اور انسانی زندگی بالکل ارزاں ہو گئی تھی، ایسے میں صوفیانہ تحریک کا آغاز ہوا جس نے اول اول خواہشات کو پابہ زنجیر کر کے سادگی اختیار کرنے کی وہ راہ دکھائی جس کے مختلف مراحل اور منازل میں توبہ، صبر، شکر، خوف، فقر، زہد، توکل، شوق اور انس کو خاص اہمیت حاصل تھی، اسلامی تصوف کی یہ روایت سعدی، ابراہیم ادھم، جنید بغدادی، بایزید بسطامی اور منصور حلاج، ذوالنون مصری سے لے کر ایران کے مولانا جلال الدین تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ماخذ میں سے اہم ترین ماخذ قرآن حکیم ہے۔ اسلامی تصوف کے مطابق انسان کا آئینہ دل گدلا اور گرد آلود ہے لہٰذا قابل نہیں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی روشنی منعکس ہو، لیکن جب انسان اپنے آئینہ دل کو ریاضت اور طریقت یا محبت کی مدد سے صاف وشفاف کر لیتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا نور منعکس ہونے لگتا ہے۔ اس کے مطابق انسان کو اللہ کی طرف پیش قدمی نہیں کرنی ہے، بلکہ اپنی ذات کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ سیل انوار قبول کر سکے یعنی اسی سطح پر پہنچ جائے جہاں قطرے کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور انسان اپنی شان کلی کا ادراک کر کے جگمگا اٹھتا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی تصوف کا نفوذ فارسی زبان کی ترویج واشاعت سے ہوا، عربی کے شاعر ابن الفارض اور فارسی شعرا سنائی، عطار، رومی اور حافظ نے اپنی شاعری میں اس جوش وخروش سے عشق حقیقی کے مضامین مجازی پیرائے میں بیان کیے کہ تصوف گھر گھر پھیل گیا۔ ابن الفارض مشہور وجودی صوفی شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کے شاگرد تھے۔ چشتیہ صوفیہ نے وجودیت پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی اور اس کے حوالے سے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفا نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی۔ ڈاکٹر تاراچند کے مطابق بھگتی تحریک پر مسلمان صوفیہ کے نظریات نے گہرے اثرات ثبت کیے۔

وشنو بھگتی تحریک جنوبی ہندوستان سے شروع ہوئی اور اس کا سب سے بڑا علمبردار رامانج تھا۔ آریا پدری نظام کا علمبردار تھا اور ثقافتی اعتبار سے اس کی حالت دوریس کے مسافر کی سی تھی۔ یہ مسافر ہندوستان کے مادری نظام سے قریب تر چلا آیا اور یوں اس نے ہندوستانی تہذیب کو (جو عورت سے مشابہ تھی) نوید وصل دی لیکن ایک فطری ردعمل کے تحت وہ وصل کے فوراً بعد فرار کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے فلسفے میں پناہ ڈھونڈی، پراکرت ادب میں ایک مختصر سا گیت اس صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ ''رات مسافر کے لئے گھاس بچھاتے ہوئے بڑی بیزاری سے بڑبڑا رہی تھی۔ بھور سے اسی گھاس کو سمیٹتے ہوئے وہ رو رہی تھی۔'' فارسی شعرا کی طرح اردو میں میر درد، سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، پشتو میں رحمان بابا اور پنجابی میں خواجہ فرید نے وجد آور اسالیب میں وحدت الوجود اور عشق حقیقی کے مضامین پیش کیے ہیں۔ شاہ مولوی غلام رسول بابا بلھے شاہ، علی حیدر ملتانی، حضرت سلطان باہو، میاں محمد بخش وحدت الوجودی سلسلے کے

صوفی شاعر تھے۔ صوفیائے کرام کے مطابق دل میں غم کا بسیرا روح سے اس ازلی جدائی کے باعث ہے جو راہ کل سے جدا ہو کر وجد ملنے کی وجہ سے ہوا۔ روح اپنی اصل سے دور ہو کر غم زدہ ہے۔

آ کھاں وے دل جانی پیار وے
مینوں کیہا چینک لایا ای
میں تیں وچ نہ ذرا جدائی
ساتھوں اپنا آپ چھپایا ای
مجھاں آئیاں رانجھا یار نہ آئیا
پھوک برہوں ڈوں لایا ای
ہیں نیڑے میلوں دور کیوں دسنا ایں
ساتھوں اپنا آپ چھپایا ای

کہتے ہیں جدائی، عشق کی واردات کو حرکت اور عمل کی ترغیب اور لالچ دینے کے لئے سب سے بڑی طاقت ہے اور آگے کے سفر میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ وصل میں بھی فراق کی کیفیت باقی رہنی چاہیے تاکہ انسان کا دل ہمیشہ روشن رہے۔

یہ کبھی چھپا ہوا اور کبھی ظاہر ہوتا محبوب، دل سے آنکھوں اور آنکھوں سے دل کے رستے دل میں چھپنے کا تماشا کرتا ہے۔ روح کو ازلی جدائی کے کچوکے لگاتا ہے۔ وصل میں شادکام ہو کر بھی العطش، العطش کے نعرے لگاتا ہے۔

نہ جیواں مہاراج میں تیرے بن نہ جیواں کی دہائی دیتا، ہستی سے نیستی کا سفر شروع کرتا ہے تو پھر اس کے سینے میں ازلی غم کی آنکھ کھل جاتی ہے اور کبھی بند نہیں ہوتی، غم کی یہ آنکھ اسے موہوم جنتوں کی تلاش میں جاگنے اور جاگتے رہنے پر اکسائے رکھتی ہے۔ وہ سو نہیں سکتا کبھی بھی اور اس کا شمار جاگنے والوں میں بھی نہیں ہوتا۔ مگر آج کا انسان پچھلی صدیوں کے انسان کی طرح موہوم جنتوں کی تلاش میں نکلا ہوا انسان نہیں بلکہ اس دور کی تیز مشینی چال کا ایسا کل پرزہ ہے جس کا ماضی حال اور مستقبل Market Economy کے پاس گروی رکھا جا چکا ہے۔ بیچو اور خریدو اور بیچو کی نفسا نفسی میں اس کا معاشرتی وجود کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ معاشرتی وجود کمپیوٹر، انٹرنیٹ، کارپوریٹ کلچر، کیپٹل ازم، ملٹی نیشنل اور گلوبلائزیشن کی چکا چوند میں اپنی اصل شناخت ڈھونڈ رہا ہے۔

اور المیہ یہ کہ اس ہاؤ ہو میں وہ یہ بھی بھول گیا ہے کہ اس کی تلاش بھی وہی جنت ہے جہاں سے وہ کبھی نکالا گیا تھا۔ وہ تو شاید یہ بھی بھول چکا ہے کہ اسے کہاں جانا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ کون ہے جو کہہ رہا ہے تمہیں محبت کا واسطہ مجھے ناامید نہ لوٹاؤ۔ مگر کیا کریں اس کے مسائل بھی تو بڑے پیچ دار ہیں لالچ، بغض، حسد، کینہ، تفریق، طبقاتی کشمکش، علاقائی کشمکش، فرقہ واریت، عصبیت، انتہا پسندی، تشدد، قرض، غربت، عدم مساوات، جبر، استحصال، جہالت، بیماریاں، ناانصافی، ایٹمی ہتھیاروں کا ڈر اور نہ جانے کیا کیا۔ آہ بے چارہ آدم گھر سے کیا خریدنے نکلا تھا اور کیا لے کر لوٹا۔ اس خرید و فروخت میں اس سے تو اس کے خواب تک چھین گئے۔ کھلونوں کے لالچ میں گھر سے نکلنے والا ابھی دکان سے خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا۔ شاید اسے یہ یاد ہو کہ سپر پاور اگر منہ میں روٹی کا نوالہ دیتی ہے تو سر پر کارپٹ Bombing بھی کرتی ہے۔ قرضوں میں نسل در نسل قیمتیں ہڑپ کر لیتی ہے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر غلامی کرتے ہوئے جان کی امان مانگتے ہوئے اس سے بابا بلھے شاہ کی زبانی یہی کہا جا سکتا ہے:

بازی گر کیمہ بازی کھیڈی
مینو پتلی وانگ نچایا

اور

حرص حیران کر سٹیا ایں	تینوں اپنا آپ بھلایا سؤ
پادشاہیوں سُٹ کنگال کیتو	کر لکھ تو ککھ وکھایا سؤ
بلھے شاہ تماشے یورو دیکھو	سمندر نوں کنجڑی پایا سؤ

مادی ترقی کی اس دوڑ نے آج انسان کو روحانیت سے دور کر دیا ہے۔ بزرگوں اور ان کی شعری روایتوں سے دور کر دیا ہے اور روحانی طور پر پژمردہ، بیمار، تھکا ہوا، ڈرا ہوا، اپنے سائے سے بھی خوف کھاتا ہوا ایسا وجود بنا دیا ہے جو یہ تک بھول چکا ہے کہ مقصد آدمیت کیا تھا اور اس کا منتہا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے اس کی ساری جدوجہد جسم سے شروع ہو کر پیہم جسم پر ہی ختم ہوتی ہے۔ مادہ، مادے سے مل کر فنا ہو جاتا ہے اور یہ فنا ہو جانا اتنا پست، ادنیٰ اور معمولی ہے کہ اس کے بعد اس بقا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جو انسان کی اصل منزل اور اس کا منتہا تھی۔ اب اگر اس سارے پس منظر میں اردگرد کے حالات پر اک طائرانہ نظر

ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ اس دور کے انتشار، بدنظمی، عدم مساوات، قدروں اور اداروں کے زوال نے افراد کے اندر معمول کی زندگی پیدا کرنے کے ان امکانات کو ختم کر دیا ہے جو زندگی سے لگاؤ اور وابستگی پیدا کرتے ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ ایک خیال کے مطابق فارغ البالی کا زمانہ 'روشنی' کی تلاش اور روحانی طور پر توانائی حاصل کرنے کا ہوتا ہے جب کہ بدامنی اور شکست و ریخت کا دور دکھ کی گرفت سے نجات پانے کا ہوتا ہے۔ مگر ہمیں اپنے ہاں منفی رویہ زیادہ مقبول دکھائی دیتا ہے۔ لوگ روشنی کی تلاش سے کہیں زیادہ اندھیرے سے نجات پانے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ویدانت، بھگتی اور اسلامی تصوف کا وہ پہلو زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے جو بے ثباتی اور موت کی ارزانی کے ساتھ ساتھ دکھ کی گرفت سے نکلنے کے لئے کسی مسیحا کی آمد کا منتظر ہے۔ مسیحا یا ہادی کے انتظار کی روایت بہت پرانی ہے جو اول اول زرتشت مذہب کے ساؤ شیان Saoshyant، بدھ مت کے Maitreya، وشنو مت کے اوتار کال کن Kalkin اور بعد از ان مسیح اور امام مہدی کی صورت میں پروان چڑھتی ہے مگر یہ روایت ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے پر منتج ہو تو منفی ہے، لیکن اگر مسیحا کی آمد کے لئے زمین ہموار کرنے کی صورت اختیار کرے تو مثبت ہے اور اس مثبت طاقت کی آج کے انسان کو سخت ضرورت ہے۔ یہ مثبت قوت اسے روحانیت سے مل سکتی ہے مگر اس کے لئے اسے اپنے اردگرد بنے ہوئے مادی ترقی، مادی کامیابی، مادی ترغیبات اور جدید مادی آسائشوں کا جال توڑنا ہوگا۔ تیز رفتاری سے آگے اور آگے جانے کی جلدی میں اسے تو یہ خبر بھی نہیں رہی کہ اس کے اپنے پاؤں کے نیچے اس کی حیات پھسلی جا رہی ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں مارا جا رہا ہے۔ رکنا، ٹھہرنا، سوچنا اور پیچھے رہ جانے والوں کو ساتھ لے کر چلنا بھی کبھی اخلاقی حمیت میں شامل تھا مگر اب صوفیا کی شعری روایت کے مطابق لفظ اپنی بہترین صورتوں میں انسان کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں، غم واندوہ کے مارے سر جھکائے ہوئے، آنسوؤں کا بوجھ سمیٹے ہوئے، پروقار، سوز دروں سے کھیلتے ہوئے آگ پکڑنے کو تیار، خواجہ فرید کی زبانی سے اس کی حالت کچھ ان الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔

ہے گالھ عجب ہے حال عجب ہے چال عجب ہے گھات عجب
حرکات عجب سکنات عجب اشغال عجب اوقات عجب
آفات عجب خدشات عجب صدمات عجب حسرات عجب
آغاز عجب انجام عجب ہے شام عجب پر بھات عجب
بن عشق دے ایہہ کلمات عجب

اور عشق کیا ہے۔ یہ جاننا بھی تو ضروری ہے۔ جیسے مرنے کے لئے جینا ضروری ہے اور جیئے بغیر مرا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی طرح خود کو پہچاننے کے لئے عشق ضروری ہے۔ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آج کا انسان عشق سے بھاگا ہوا کیوں ہے۔ حالانکہ عشق تو ابن السبیل ہے، کائنات کا سچ ہے، حیرت حسن ہے۔ انسان کا انجام اور آغاز ہے، میری منزل ہے تیری منزل ہے۔

صوفیا کہتے ہیں عقل سے بھید نہیں کھلتے۔ بھیدوں کی کنجی عشق کے پاس ہے۔ اس لئے کہ عشق کو حق کی معرفت نصیب ہو جاتی ہے اور وہ صانع تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

گیا ایمان عشقے دیوں پاروں، ہو کر کافر رہئے ہو
گھت زنار کفر واگل وچ بت خانے وچ بہیئے ہو
عاشق پڑھن نماز پرم دی جیں وچ حرف نہ کوئی ہو
جیہاں کہاں نیت نہ سکے، اوتھے دردمنداں دل ڈھوئی ہو

اور میاں محمد بخش فرماتے ہیں:

بال چراغ عشق دا میرا روشن کردے سیناں
دل دے دیوے دی روشنائی جولے وچ زیناں

اسی مضمون میں پیر وارث شاہ کا خیال دیکھیے:

خاک پھکیاں قند دا سواد آوے مزہ عشق دل الیہ تاثیر دائی
لباں مرشداں عشق دا راز مشکل جویں راہ وچ حال فریدائی

مگر سپر پاور کہتی ہے کیسا عشق، کہاں کا عشق، اہم ہم ہیں ہماری طاقت اہم ہے، ہماری طاقت کے مقرر کردہ معیار اہم ہیں۔ Economic Industry کہتی ہے ہم اہم ہیں، کمپیوٹر، ایٹم اور ورلڈ بینک بھی اہمیت کے چارٹ پر Top Priority پر ہیں، جسم، جسم کی لذتیں، منڈی اور منڈی کا مال، مادّی خواہش، ضرورتیں اور

حسرتیں بھی اہم ہیں تو پھر خدا اور انسان کیا ہووے؟ جب کہ حقیقت کہتی ہے یہ عالم آدم کے وجود کے بغیر بے روشن آئینہ تھا۔ آدم ہی اس عالم کی روشنی ہے۔ آدم یعنی انسان تو پھر اس کے ہاتھ بند ھے ہوئے کیوں ہیں؟ اس کی تقدیر بکی ہوئی کیوں ہے؟ وہ مختلف نظاموں، قانونوں، دائروں، طاقتوں، ڈالروں، اوقاتوں اور آسائشوں کے درمیان ڈولتا ڈگمگاتا کیوں پھرتا ہے؟ زمین پر اس کے پاؤں لگتے کیوں نہیں؟ وہ جڑ کیوں نہیں پکڑ رہا ہے؟ پھل پھول کیوں نہیں رہا ہے؟ روحانی طور پر اتنا خالی اور بنجر کیوں ہے؟ اس کا دامن اس قدر تہی کیوں نظر آتا ہے؟ ضرورتوں کے سامنے اس کی گھگھی کیوں بند ہوتی ہے؟ جب کہ آدم ہی اس عالم کی روشنی ہے "بندے آپ نوں پچھان جسے تیں اپنا آپ پچھاتا سائیں دا ملن اسان"۔ مگر بندے کا اپنے آپ کو پہچاننا آسان کہاں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کے شعور کی ہارڈ ڈسک میں مادّی ترقی کا پروگرام فیڈ ہو چکا ہو۔ نئی صدی کے چیلنجوں کی صورت میں اسے کئی طرح کے خوف تھما دیے گئے ہیں، عارضی اور بے مقصد کامیابیوں میں اسے الجھا دیا گیا ہے، اس کی آنکھوں پر ضرورتوں کی پٹی باندھ کر اسے خواہشات کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا گیا ہے، پھر بھلا ایسے میں سائیں، سے ملنا کہاں آسان ہوتا ہے۔ سائیں روح ازل، جس کی پہچان سے نفس کو اعلیٰ درجے کی ترقی حاصل ہوتی ہے اور وہ بے اختیار کہتا ہے نہ ہمارے دل نے تمہارے سوا کسی کو اپنے اندر جگہ دی اور نہ ہی ہماری خواہشوں نے تمہارے سوا کسی اور کی خواہش کی۔

سن توں نی! کال مریندا ای
ہر بجھ لے گا یک ویندا ای
ڈھونگے جل وچ پچھی وسدی
اوس پچھی توں جال ڈھوڈیندا ای

مولانا جلال الدین رومی کی صفت درویشی ہے جس کی اس اکیسویں صدی میں ضرورت ہے۔ اور ان کے نغمۂ عشق ہی سے آج کے انسانوں پر لگے مادیت کا داغ دھویا جا سکتا ہے۔ بابا بلھے کہتے ہیں۔

تیرے عشق نے ڈیرا میرے اندر کیتا
بھر کے زہر پیالہ میں تاں آپے کیتا

جھبدے بوہڑیں وے طبیباں نہیں تاں میں مرگئی آں

شاہ حسین نعرہ لگاتے ہیں:

نی سیئو اسیں نیناں آکھ لگے

بابا فرید کی آواز ابھرتی ہے:

خاک نہ نندیئے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تھے سوئیاں اپر ہوے

خواجہ غلام فرید کی آواز آتی ہے:

ین میں رانجھن ہوئی رہیا فرق نہ کوئی
ہیر سلیتی چوچک بیٹی ونج کس جا کھڑوئی

فاطمہ نیشاپوری دار کے نیچے محو عبادت منصور حلاج سے پوچھتی ہے۔ "یا شیخ تصوف کیا ہے؟" اور سپر پاور ایٹم بن کا بٹن دبا دیتی ہے۔ مہیب گڑگڑاہٹ، خیرہ کن چمک، تباہی اور پھر ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے، خاموشی کے اک مختصر وقفے کے بعد کائنات کے ذرے ذرے سے آواز ابھرتی ہے انا الحق، انا الحق، مشرق سے روشنی کی لکیر پھوٹتی ہے اور خاموشی چلانے لگتی ہے،

جھبدے بوہڑیں وے طبیباں نہیں تاں میں مرگئی آں
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا وے

بابا بلھے شاہ نے اپنے مرشد شاہ عنایت قادری سے پوچھا رب تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ مرشد ذات کے آرائیں تھے۔ اس وقت کھیت میں سبزیوں کی پنیری لگا رہے تھے۔ انہوں نے پنیری زمین سے اکھاڑی اور دوسری جگہ لگاتے ہوئے فرمایا، بلھیا، رب دا کیہ پاونا ایدروں، پٹنا اور ودر لاونا!

❁❁❁

صوفیہ نمبر کی آئندہ اشاعت کے لئے موصولہ مضامین

	مقالات	مقالہ نگاران
۱-	اعلیٰ حضرت کے آباو اجداد اور سجادگان: تصوف کے آئینے میں	ڈاکٹر محمد اعجاز انجم لطیفی
۲-	عالم پناہ شاہ نیاز	محمد مصطفیٰ زاہد نیازی
۳-	شاہ کمال قادری کیتھلی (سوانحی خاکہ)	پروفیسر غلام یحییٰ انجم
۴-	تمل ناڈو میں صوفیا کی آمد اور خدمات	ڈاکٹر جاوید حبیب
۵-	جلال الدین رومی اور علامہ اقبال	الطاف احمد اعظمی
۶-	تصوف اور سلوک کے مقامات	مفتی محمد معراج الدین فاروقی
۷-	خدمت خلق اور خانقاہوں کا کردار	ڈاکٹر مولانا حسن رضا خاں پٹنہ
۸-	صوفیہ اور تصور حیات انسانی	ڈاکٹر امام اعظم
۹-	شیخ نورالدین نورانی	پروفیسر محمد اسحاق خاں
۱۰-	قرآن اور وحدۃ الوجود (مخدوم سمناں کے نقطۂ نظر سے)	پروفیسر سید وحید اشرف
۱۱-	سلسلہ قادریہ کے حوالے سے ہندوستان میں اشاعت اسلام	پروفیسر غلام یحییٰ انجم
۱۲-	نظام الدین اولیاء کا خانقاہی نظام اور اس کے اثرات	محمد شمیم اختر قاسمی
۱۳-	حضرت شیخ محمود شبستری اور ''گلشن راز''	پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی
۱۴-	اقبال اور رومی	علامہ مفتی جلال الدین صاحب
۱۵-	تصوف مخالف رجحانات: تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی علیگ
۱۶-	ویدانتی وحدانیت، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود	شمیم طارق
۱۷-	تصوف اور تصور جہاد	ڈاکٹر محمد احمد ۔اے۔ایم۔یو
۱۸-	صوفیائے کرام اور ان کی دینی خدمات	عبدالرشید اشرفی بھاگل پوری
۱۹-	شاہ تراب علی قلندر علوی اور ان کی اردو شاعری	پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی
۲۰-	کشف المحجوب پر ایک نظر	رئیس احمد نعمانی
۲۱-	عقیدۂ توحید میں آمیزش: ایک بڑی آزمائش	شمیم طارق
۲۲-	حضرت نظام الدین اولیاء اپنے پیر و مرشد کی بارگاہ میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی
۲۳-	شاہ مجیب اللہ قادری پھلواری	ہلال احمد قادری
۲۴-	مشائخ دیوبند و سہارن پور پر سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اثرات	محمد شمیم اختر قاسمی

۲۵- حیاتِ خاصانِ خدا ہمارے لئے نمونۂ کامل	مولانا ریاض الدین وجیہی
۲۶- بابا فریدالدین گنج شکر کے چند خلفا و مریدین	ڈاکٹر مسعود انور علوی
۲۷- تصوف کی تفہیم میں چند اہم کتابیں	ڈاکٹر مسعود انور علوی
۲۸- برصغیر میں صوفیا کی آمد اور اس کے اثرات	ڈاکٹر شمیم اختر وسی
۲۹- خاندان برکات کی خدمات جلیلہ	مولانا محمد ارشاد احمد مصباحی
۳۰- صوفیا اور خدمت خلق	ڈاکٹر موصوف احمد
۳۱- فلسفہ، سائنس اور تصوف	پروفیسر محسن عثمان ندوی
۳۲- شیخ طریقت حضرت جیلانی میاں	پروفیسر سید امین اشرف علی گڑھ
۳۳- خواجہ معین الدین چشتی	محمد عبدالحلیم شرر
۳۴- مخدوم عبدالحق ردولوی حیات وخدمات	حضرت سید نیر میاں سجادہ نشین
۳۵- مخدوم اشرف کی سوسالہ حیات پر ایک نظر	حضرت سید حسن مثنیٰ انور
۳۶- میر عبدالواحد بلگرامی (سوانحی خاکہ)	ڈاکٹر غلام سرور بھاگل پوری
۳۷- مخدوم اشرف سمنانی (سوانحی خاکہ)	سید شمیم اشرف
۳۸- تذکرۂ مشائخ رام پور	مولانا محمد ناصر رامپوری
۳۹- ہندوستان میں صوفی خانقاہوں کی رفاہی خدمات	محمد شہباز عالم مصباحی
۴۰- حضرت دیوان شاہ	پروفیسر محی الدین مونس
۴۱- تذکرۂ مشائخ پورنیہ وکشن گنج	مولانا محمد رفعت رضا مصباحی
۴۲- عباسی دور کے نامور صوفیہ	مولانا محمد ارشاد عالم نعمانی
۴۳- اودھ کے مشاہیر صوفیہ ومشائخ	مولانا محمد ظفرالدین برکاتی
۴۴- ممبئی کی خانقاہوں کے کتبے	مفتی محمد علاء الدین رضوی

نوٹ: صوفیہ نمبر کی آئندہ اشاعت کے لئے مضامین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ اہل قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ تصوف واہل تصوف کے علمی، فکری، تحقیقی وتدقیقی گوشوں اور انسانیت نواز پیغاموں پر مضامین سپرد قرطاس کریں اور ادارہ کو جلد از جلد روانہ کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں انہیں شامل کیا جاسکے۔ ہمیں آپ کے مضامین کا انتظار رہے گا.............(ادارہ)

ترسیل مقالات ورابطہ کا پتہ

صوفی فاؤنڈیشن

1543، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002